محمد

محسنِ انسانیت ﷺ

نعیم صدیقی

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
اردو بازار لاہور

ترتیب مضامین

مقدمہ 'پیغام' نصب العین اور تاریخی مقام

مقدمہ 'پیغام' نصب العین اور تاریخی مقام

محسن انسانیتؐ ---- مکی دور ---- (مد و جزر)

محسن انسانیتؐ ---- مدنی دور ---- (تاریخ موڑ مڑتی ہے)

----تلواروں کی چھاؤں میں----

----اور اجالا پھیلتا ہی گیا----

عرض ناشر

سیرۃ نبویؐ پر اب تک بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں' کچھ مفصل ہیں اور کچھ مختصر۔ محترم نعیم صدیقی صاحب کی یہ تالیف ان میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ قلیل عرصہ میں یہ اس کتاب کا اٹھائیسواں ایڈیشن ہے۔ طباعت و اشاعت کے اخراجات میں ہوشربا اضافہ کے باوجود اب اسے کمپیوٹر کی حسین کتابت پر اپنے روایتی انداز میں شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین اس ترمیم شدہ ایڈیشن کو پسند فرمائیں گے۔

چند الفاظ

از مؤلف

اسلام کا تحریکی شعور برابر اس ضرورت کو محسوس کرا رہا تھا کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان ---- محمد صلی اللہ علیہ و سلم ---- کی زندگی کا مطالعہ نئے انداز سے کیا جائے۔ ایک ایسا انداز جو سرور عالم صلی اللہ علیہ و سلم اور آج کے انسان کے درمیان حائل ہونے والے مختلف پردوں کو اٹھا دے۔ وہ مقدس زندگی مجرد ایک فرد کی سوانح نہیں ہے۔ بلکہ وہ عظیم ترین تہذیبی تحریک کی آئینہ دار ہے۔ اسی کے واسطے سے ہم قرآن کا ترجمہ عمل کی زبان میں پڑھ سکتے ہیں اور اسی کی روشنی میں ہم اجتماعی انقلاب کی کٹھن راہوں کو طے کر سکتے ہیں جن پر سے ہو کر انسانیت اسلامی نظام کی جنت تک پہنچ سکتی ہے۔

یہ ضرورت تو اپنے ہم مسلک بزرگوں اور رفیقوں کی طرح ہمیشہ میرے سامنے رہی' لیکن اپنے متعلق یہ گمان بھی نہ گزرا تھا کہ میں اس میدان میں اپنی کوتاہی علم و عمل کے ساتھ کوئی مفید خدمت بھی سر انجام دے سکوں گا۔ یہ جو کچھ میں تیار کر کے پیش کر سکا ہوں یہ محض توفیق الٰہی کا ظہور ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے حضورؐ کی پوری حیات طیبہ پر ایک اجمالی نظر ہو جاتی ہے اور حالات اور واقعات اس ترتیب سے سامنے آتے ہیں کہ آدمی خود اس دور میں شریک ہو جاتا ہے' اور اپنے آپ کو حق و باطل کی کشاکش میں حصہ دار محسوس کرتا ہے۔ پھر ان فضاؤں سے لوٹتا ہے تو ایمان و کردار کی نئی روح اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یہی اس کتاب کی خصوصیت ہے۔

قابل ذکر امر یہ ہے کہ تصحیح بھی کی گئی ہے' اور ناموں وغیرہ پر اعراب بھی لگا دیئے گئے ہیں۔

خدا اس کوشش کو قبول فرمائے اور اسے مسلمانوں اور تمام انسانوں کے لیے ذریعہ خیر و برکت بنائے۔

نعیم صدیقی

لاہور' یکم جنوری ۱۹۶۰ء

مزید چند الفاظ

از مؤلف

میں اپنے قلم کی طرح صاحب "ن --- والقلم" کی بارگاہ عاجز نواز میں سجدہ شکر میں سرافگندہ ہوں جس نے ایک ادنیٰ بندے کی کم علمی اور کوتاہ عملی کے باوجود اس پر خود اس کے تصورات سے دسیوں گنا وسیع تر کرم کر کے ایک ناچیز سی سعی سیرت نگاری جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قبولیت سے بہرہ مند کیا۔ بغیر کسی تقریب یا خصوصی اشتہار بازی کے چند برس میں اس مقام تک پہنچایا کہ اس کا ۲۰واں ایڈیشن نکل رہا ہے۔ اس دوران میں سیرت پاکؐ پر کئی اچھی چیزیں سامنے آئیں جن کے کمالات پر میں خود عش عش کرتا ہوں --- خصوصاً نقوش کا "رسول نمبر" جو پورا ایک دفتر علم و عقیدت ہے' یا "پاکستان اسٹیٹ آئل" کی طرف سے شائع کردہ کتاب "سیرت احمد مجتبیٰ" یا "الرحیق المختوم" بڑی قابل قدر کاوشیں ہیں۔ ان جملہ مساعی میں سے میرے پروردگار دلنواز نے "محسن انسانیتؐ" کو ایک مقام خاص عطا فرمایا۔ اپنے بندوں کی آخری صف کے آدمی پر یہ حیرت ناک عنایت فرما کر اللہ تعالیٰ نے میرے اس چراغ امید کی لو اکسادی ہے کہ وہ مجھے آخرت میں بھی اپنے پر محبت کرم اور شفاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرور نوازے گا۔

چلتے چلتے میں یہ ضرور ذکر کر دینا چاہتا ہوں (بالکل بلا فخر) کہ ناقدین اور قارئین کی نگاہوں سے یہ حقیقت اوجھل رہ گئی کہ میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کے جنگی تصادموں (بخلاف مشرکین قریش و یہود) کو "سول وار" قرار دے کر اس بحث کا قطعی خاتمہ کر دیا ہے کہ کوئی حملہ جارحانہ تھا یا دفاعی---- اور مسئلہ جہاد کے بارے میں مستشرقین اور معاندین کے من گھڑت اعتراضات کا خاتمہ کر دیا ہے۔ پھر حضورؐ کی کثرت ازدواج کا مسئلہ اچھالا جاتا تھا' میں نے اس کی جو توجیہ و توضیح کی ہے وہ بھی بحثوں کا رخ بدل دینے والی ہے۔ تیسری بات یہ کہ سردار دو عالمؐ جنگوں میں دشمنوں کا کم سے کم جانی نقصان چاہتے تھے' بلکہ عین حالت دشمنی میں مکہ پر جب قحط طاری ہوا تو آپؐ نے اپنے علاقے سے غلے کی رسد بھی جاری کرائی اور امدادی رقم بھی بھجوائی۔ پھر یہ کہ حضورؐ نے کس درجے کا معیار نظم و اخلاق اور کردار عدل و احسان اپنی جماعت کے فرد فرد میں قائم کیا اور کتنا بڑا حصہ اس طاقت کا ہے جس نے ۹ سال کی معرکہ آرائی کے بعد دس لاکھ مربع میل سے زائد رقبہ کے لوگوں کو اعلیٰ انسانی اوصاف اور قدروں سے آراستہ کر دیا۔ کچھ خصوصیات اور بھی ہیں مگر میں قصیدہ در شان خود نہیں کہہ رہا۔

میں اس کتاب کے موقر پبلشر یا اس کے لیے کوئی بھی کام کرنے والوں' اس کے فروخت کنندگان' اس کے قارئین کرام' اس کے تبصرہ نگاروں اور خاص طور سے اس کی غلطیوں سے آگاہ کرنے والوں' نیز تصحیح کے کام میں مولانا عبدالوکیل صاحب کے تعاون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے' سب کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کرتا ہوں اور سب سے اپنے لیے ایسی ہی دعا کی توقع کرتا ہوں۔

نعیم صدیقی

۱۷ فروری ۱۹۹۴ء

گذارشات مولف

(کتاب کے ۲۸ویں اشاعت کے موقع پر)

آج جبکہ اس مبارک کتاب کا نیا ایڈیشن ہمارے نئے جواں ہمت پبلشر جناب محمد فیصل کے ہاتھوں نکل رہا ہے' یہ ایک نئے تجربے کا آغاز ہے --- اور جس محبت و شوق سے محمد فیصل صاحب نے میری کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے' اس کے تحت چند اہم کتابیں ایک قلیل مدت میں وہ تیار کر چکے ہیں' اور کچھ زیادہ والہانہ جذبے سے وہ بہت جلد محسن انسانیت' کا ۲۸واں ایڈیشن مارکیٹ میں لا رہے ہیں۔ خدا ان کے دوستانہ اور ناشرانہ تعاون کو جانبین کے لیے مبارک کرے۔

اس موقع پر میں "محسن انسانیت" و میری دیگر کتب کے ناشر ادارے (اسلامک پبلی کیشنز) اور اس کے کار پردازوں اور کارکنوں کی محنتوں اور کوششوں کا اعتراف کرتا ہوں جو ایک مدت سے وہ کرتے رہے ہیں۔

اس لمحے میں تہ دل سے اللہ تعالیٰ کی بندہ پروری اور عاجز نوازی کا بے حد سپاس گزار ہوں جس نے میری ادنیٰ سی خدمت' یعنی سیرت نگاری جناب رسالت مآب محمد ﷺ کو قبولیت عامہ سے ایسا سرفراز فرمایا کہ میں حیرت و استعجاب سے دیکھتے ہوئے ہر سانس کے ساتھ شکر ادا کرتا ہوں۔

یہ ایک ایسی جذبہ' دل اور فکر دماغ کی آئینہ دار کتاب تھی کہ جس کے لیے نہ کوئی تقریب منعقد ہوئی' نہ اس پر مقالات لکھوائے گئے' نہ تبصروں کا ہی خصوصی اہتمام ہوا' بلکہ صورت واقعہ کچھ ایسی تھی کہ میں نے کاغذ کی اس ناؤ کو اشاعتی دریا کی طوفانی موجوں میں بغیر کسی پتوار اور بادبان کے ڈال دیا' جہاں اسلاف و اخلاف کے عظیم الشان کارنامہ ہائے سیرت پاک کے پر شکوہ سفینے موجوں کا سینہ چیرتے ہوئے رواں دواں تھے۔ ایسے میں میری نگاہیں دو تین ایڈیشنوں سے آگے نہیں جاتی تھیں۔ لیکن میں اس منظر کو تحیر و تشکر سے دیکھ رہا تھا کہ یہ کمزور سی ناؤ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ اور اس کی وجہ میری سمجھ میں یہی آسکی کہ اس کشتی میں سرور کائنات و انسانیت کے کارنامہ عظیم کی جھلکیوں کا ریکارڈ رکھا ہوا ہے اور

جس محبت و خلوص' سوز و ساز اور فکر و کاوش سے میں نے اسے مرتب کیا ہے اس کی جاں گدازی کو میں ہی جانتا ہوں ---- مگر یہ جاں گدازی' جاں نوازی بھی ہے۔ للہ الحمد والمنة

یہ ایک مردِ مومن مولانا ماہر القادری کی ایک مخلصانہ پیشین گوئی کا جامہء حقیقت میں جلوہ گر ہونا بھی ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کی پر زور تحریک بھی انہوں نے کی۔ پھر مسودہ کے مکمل ہو جانے پر ان سے تقریظ لکھوائی گئی۔ اس کے آخر میں انہوں نے لکھا (کتاب کے اندر ملاحظہ ہو) کہ

"نعیم صدیقی نے کاغذ پر جو نقوش بنائے ہیں' وہ ان شاء اللہ دلوں پر منتقل ہوتے چلے جائیں گے۔ اس طرح ان کا نام اور کام زندہ رہے گا۔" (۱۵ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ الفاظ لکھتے ہوئے شاید مرحوم اور میرے خیر خواہ بزرگ ماہر صاحب کی وجدانی نگاہ لوحِ تقدیر کے کسی کونے پر جا پڑی ہو۔

اس کتاب کی غیر معمولی پذیرائی کے علاوہ اس پر جو سب سے بڑی داد مجھے ملی اور جسے میں نمائشی اعزازات سے ہزار درجہ بلند قرار دیتا ہوں' وہ ایک عجیب واقعہ ہے۔

ہوا یوں کہ میں چند برس قبل منصورہ سے ادارہ معارف اسلامی میں "شعبہ تذکرۂ سید مودودی" اور ماہنامہ ترجمان القرآن کے ایڈیٹر کی دوہری ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے اپنے دفتر میں ظہر سے قبل کام کر رہا تھا کہ دو اصحاب ملاقات کے لیے داخل ہوئے۔ تعارف سے معلوم ہوا کہ قدرے معمر لووارد باپ تھے' اور ساتھ ان کا نوجوان بیٹا۔ علیک سلیک اور ابتدائی باتوں کے بعد' معلوم ہوا کہ اسلامیان مقبوضہ کشمیر کی قتل گاہ سے آئے ہیں جہاں چھوٹی سی کمزور قوم زندگی' آزادی اور اپنے دین کی سربلندی کے لیے ظلم و استبداد کے خلاف معرکہ آرائے جہاد ہو کر شہادت کے پھول کھلا رہی ہے۔ والد نے یہ قصہ سنایا کہ ان کے ہم نشیں بیٹے نے ایک شام کو یہ فیصلہ سنایا کہ میں کل صبح جا کر عیسائی بن جاؤں گا' کیونکہ مسیحی مبلغوں نے مجھے زچ کر دیا ہے۔ والد نے بے بسی سے کہا: اچھا' بیٹا! تم جیسے مناسب سمجھتے ہو کرو' مگر میں ایک آخری بات تم سے کہتا ہوں۔ انہوں نے محسن انسانیت کی جلد نکالی اور کہا کہ آج کی رات تم اسے پڑھ لو۔ پھر صبح جیسے تمہارا جی چاہے کرنا۔ بیٹے نے "بہت اچھا" کہہ کر کتاب لے لی' اور کمال ہے کہ راتوں رات اس نے پڑھ ڈالی۔ صبح اٹھا تو والد سے پہلی بات یہ کہی کہ میں اب عیسائی نہیں بنوں گا' مسلم رہوں گا --- محمد ﷺ کا امتی! گھر کی فضا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کتاب نے ایک نوجوان کو طاغوتی دریا میں ڈوبنے سے بچالیا۔ اس قصے کی تائید نوجوان بیٹے نے بھی کی۔ دونوں نے بتایا کہ ہم خاص اس وجہ سے آپ سے ملنا چاہتے تھے۔

اور میری روح تلاطم خیز مسرت سے دوچار ہو گئی۔ میں نے اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار اس دھیمی سی دعا سے کیا کہ خداوند کریم مجھ کو اور آپ دونوں کو رحمت و مغفرت سے نوازے۔ میرا حافظہ تیز نہیں۔ قصہ ماضی کا ہے اور الفاظ حال کے۔ مگر مفہوم درست ہے۔

بعد میں میں نے باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ اگر آپ "محسن انسانیت" کے اس اثر کو قبول فرمالیں کہ اس کے مطالعہ نے تیرگی کی لہروں میں چھلانگ لگانے پر تلے ہوئے تیرے آخری رسولؐ کے امتی کو ڈوبنے سے بچایا تو اے آقائے حقیقی' مجھے محسن انسانیتؐ کی حقیقی قیمت وصول ہو گئی۔ تیری رحمت پر مجھے یقین ہے کہ تو اتنی سی خدمت پر میرے گناہوں کو محو کر کے مجھے مغفرت کی سند عطا کر دے جس پر محمد رسول اللہؐ کی شفاعت کی مہر لگی ہو۔

کیا معلوم' اور کن کن دلوں اور دماغوں پر میری ناچیز کوشش کے جامع یا جزئی مبارک اثرات پڑے ہوں گے۔

"دوسرا تحسینی واقعہ یہ کہ ایک مرتبہ جنرل ضیاء الحق شہید" اپنے نقشہء کار کے تحت' منعقد کردہ مرکزی (اسلام آباد) جلسہء سیرت میں تقریر کرتے ہوئے (جسے میں ریڈیو پر سن رہا تھا) لکھے ہوئے خطاب کو چھوڑ کر مقدمہء محسن انسانیتؐ کا ایک صفحے سے زیادہ متن پڑھ گئے۔ میں نے جب ریڈیو سے یہ الفاظ سنے کہ "وہ زندگی سے کٹے ہوئے ایک درویش کی سرگزشت نہیں ہے" تو مجھے اپنی تحریر یاد آ گئی' کیونکہ میں جانتا تھا کہ متذکرہ الفاظ لکھنے والا نعیم صدیقی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ میں نے پاس رکھی ہوئی کتابوں میں سے محسن انسانیتؐ کو نکالا اور متعلقہ مقام دیکھا' جنرل صاحب بڑی خود اعتمادی سے پڑھتے جا رہے تھے۔ (ہو سکتا ہے' مرتب تقریر نے میری عبارت شامل کر دی ہو) مجھے تو بس یہ خوشی تھی کہ میرے خیالوں کے کچھ ابرپارے مرکزی جلسہء سیرت کے حاضرین کے ذہنوں میں پہنچ رہے تھے۔

تیسری حوصلہ افزا قابل اعتماد اطلاع یہ کہ جب روس سرخ اندھیروں میں اچھی طرح ڈوبا ہوا تھا تو یہاں سے لوگ تعلیم' سفارتی فرائض اور دیگر وجوہ سے جاتے رہتے۔ ایک دوست نے وہاں سے واپسی پر مجھ سے دو عجیب باتوں کا ذکر کیا۔ ایک یہ کہ ماسکو میں جماعت اسلامی کی چھوٹی سی تنظیم موجود ہے۔ دوسری یہ کہ حکومت نے اپنی سرکاری لائبریری میں محسن انسانیتؐ کا نسخہ اور اس کا ترجمہ کرا کے رکھا ہوا ہے۔ یہ سوائے اول درجے کے سرکاری ذمہ داروں کے' اور کسی کو دیکھنے کی اجازت نہیں۔ اس کا مقصد یہ تحقیق کرنا ہے کہ وہ کیا خاص وجوہ ہیں کہ یہ کتاب نوجوانوں پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کا توڑ کیا جائے۔ تب مجھے مولانا مودودیؒ کی کئی سال پہلے کی بات یاد آئی کہ وقت آنے والا ہے کہ تحریک اسلامی ایک دن واشنگٹن اور نیویارک میں' نیز ماسکو میں جا پہنچے گی۔ (صحیح الفاظ یاد نہیں آ رہے۔ غالباً بات اس سے کچھ زیادہ سخت تھی۔)

یہ ظاہری احوال ہیں' میری آرزو صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمالیں' اور اسے اگر نبی اکرمؐ

کے حضور میں پیش کیا جائے تو ان کی خوشنودی شفاعت میں ڈھل جائے۔

محسن انسانیتؐ چونکہ ایوبی مارشل لاء کی غیر اخلاقی جبریت کی فضا میں لکھی گئی جس کی وجہ سے بر سر عام تازیانہ بازی اور کان پکڑوائی' ضبطیوں اور جرمانوں' نظر بندیوں اور پابندیوں کے تجربوں اور مظاہروں کے احترام میں تہذیب و شائستگی کے تھوڑے بہت آثار بھی فوجی سیاست کے راستے سے دور ہٹ گئے۔ بس "لفٹ' رائٹ' لفٹ" کا جلالی ترانہ شہروں سے دیہات تک ہر جگہ گونج اٹھا۔

جور و استبداد تعمیر انسانیت اور اصلاح معاشرہ کبھی نہیں کر سکے۔ اس صورت حالات میں جب میں نے ڈوب کر سیرت جناب خاتم النبیین ﷺ کو پڑھا تو مجھ پر یہ حقیقت طلوع صبح کی طرح منکشف ہو گئی کہ حضورؐ نے افراد کو پکارنے' تنظیم کو مضبوط بنانے' اخلاقی قدروں کو روشن کرنے' انتہائی بگڑے ہوئے جاہلی معاشرے میں اصلاح کا راستہ نکالنے کے لیے' معلمانہ طریق دعوت اور معیار کمال تک پہنچنے کے لیے محبت و خیر خواہی کی روح کے ساتھ معلمانہ طریق انقلاب کا راستہ نکالا۔ جس کی نظر آج کے نام نہاد مہذب سائنسی دور کی دو چار صدیوں میں موجود نہیں ہے۔ ہر کام جبر سے' دباؤ سے' سازش سے اور منافقت سے کیا جاتا ہے۔ خواہ ملکی ہو' خواہ غیر ملکی۔ تاریخ گواہی دے گی کہ امریکہ' برطانیہ' فرانس' جرمنی' اٹلی اور روس میں جو بڑے بڑے انقلاب ہوئے وہ سب جباری و مکاری پر مبنی تھے۔ اسی طرح غالب اقوام نے کمزور قوموں کے شکار' نو آبادیات سازی اور اقتصادی غلبے کے لیے جتنا کام کیا' جنگ و جدل سے کیا یا قوموں کو قوموں سے لڑا کر یا اندر سے پھاڑ کر کیا۔ اسی کا نتیجہ کہ آج دنیا تشدد' دہشت گردی' زر پرستی' فحاشی' منافقت' بے اعتمادی اور خوف زدگی کی کتنی ہی بلاؤں کے درمیان گھری ہوئی ہے۔

اسی شعور سے میں نے کتاب کا نام بمعروف انداز سے ہٹ کر محسن انسانیتؐ تجویز کیا' اور معلمانہ انقلاب اور نظام فلاح انسانیت وغیرہ کی اصطلاحیں ایجاد کیں۔ بلکہ میں نے اس کارنامہ' نبوتؐ کو ہمیشہ کے لیے مستبدانہ انقلاب کے واحد مروجہ نسخے کے خلاف ایک بین تردید بنا دیا ہے اور ساتھ ہی یہ چیلنج کہ انسان کو ظاہر و باطن سے پوری طرح بدل کر ایک نیا نظام معاشرہ امن و انصاف کی بنیادوں پر' نبی اکرمؐ کے طریق دعوت و انقلاب کے بغیر قائم ہی نہیں ہو سکتا۔

خدا کا مجھ پر خاص کرم ہے کہ میں نے کبھی معاش اور روپے کو مقصد بنا کر کوئی کتاب نہیں لکھی بلکہ ہمیشہ فرض یا خدمت سمجھ کر قلم ہاتھ میں لیا ہے۔ محسن انسانیتؐ کا جب میں نے منصوبہ بنایا تو میرے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ میں اپنے قارئین' خصوصاً نوجوانوں کو مطالعہ' سیرت کی ایسی راہ پر ڈالوں کہ وہ کتاب کو پڑھتے پڑھتے نبی اکریم ﷺ تک جا پہنچیں اور کاروان دعوت اسلامی یا انقلاب اسلامی میں شامل ہو کر خیال ہی خیال میں ان سارے مقامات تک جا پہنچیں' ان ہستیوں کے کرداروں کو قریب سے دیکھیں' ان مصائب

کو جائیں جو مکہ میں مسلمانوں نے بھگتے اور پھر جو مدینہ میں یہودیوں اور متعصب جنگ باز معاندین قریش کے ہاتھوں برداشت کئے۔ محسن انسانیتؐ کے پڑھنے والے محض حصول معلومات کی لذت اور محمدؐ اور جماعت محمدؐ سے تسکین عقیدت ہی پا کر مطمئن نہ ہو جائیں --- بلکہ غار حرا' شعب ابی طالب' اور طائف' غار ثور' اور قبا کی مسجد میں نماز جمعہ' پھر میدان بدر و احد' جنگ احزاب اور فتح مکہ کے سارے مواقع پر وہ یوں محسوس کریں کہ حالات کی رو میں وہ خود شامل ہیں۔ وہ محض نبی ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کے دریا کی جولانیوں کا تماشا ساحل پر بیٹھ کر ہی نہ کریں' بلکہ دریا میں کود کر اس کی موجوں میں سے ایک موج بن جائیں۔

اس غرض کے لیے ایک تو میں نے اس زمانے کے مسائل و احوال' طریقہ ہائے اظہار اور اصول فہم کو میں نے سامنے رکھا' دوسری طرف مروجہ مقبول انداز کلام کو' پھر اپنے مقصد کے لیے ایک دلکش زبان ایجاد کی جس کے ساتھ طرز بیان میں سوز و ساز کا رنگ بھرا' نئی اصطلاحات ایجاد کیں جو اس کتاب سے پہلے کہیں نہ ملیں گی۔ خاص طرز کے عنوانات تجویز کئے جو پہلے وجود نہ رکھتے تھے' بلکہ اب ان کا انداز یا عکس کہیں کہیں دیکھا جاسکتا ہے۔

محسن انسانیتؐ میں میں نے چند اہم نکات چھیڑے ہیں۔

(۱) یہ کہ اسلامی ریاست مدینہ سے مشرکین مکہ یا دیگر قبائل کے حملے مجموعی طور پر سول وار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق اصطلاحاً جارحانہ یا مدافعانہ جنگوں کی بحث ہی پیدا نہیں ہوتی۔

(۲) سرایا اور غزوات کے کثیر تعداد کو اسلامی معرکہ آرائیاں شمار کرنے کے غلط اثرات پڑے ہیں۔ متفرق جھڑپوں اور سرحدی تصادموں وغیرہ کو الگ کر دیا جائے تو باقاعدہ حقیقی جنگیں صرف ۵ لڑی گئی ہیں۔ (۱) بدر (۲) احد (۳) احزاب (۴) خیبر (۵) فتح مکہ و حنین و اوطاس۔

(۳) دشمن کی صرف ۷۵۹ جانیں لینے پر اسلامی ریاست نے دس لاکھ مربع میل علاقے پر اسلامی انقلاب کا پرچم لہرا دیا۔ فی مربع میل کیا اوسط پڑا۔ اتنی قلیل خون ریزی کا اتنا بڑا نتیجہ مورخین' انقلابی سیاست کاروں اور اصلاح معاشرہ کے علمبرداروں کے لیے انتہائی قابل غور ہے۔

(۴) میں نے مستشرقین کے اس حملے کا جواب دینے کہ یہ انداز خاص کوشش کی ہے کہ حضورؐ کی کثیر الازدواجی شہوانی نفسیات کا نتیجہ تھی۔ اس کے لیے میں نے جملہ نکاحوں کا تجزیہ حضورؐ کی عمر کے مراحل کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔ حضورؐ کی شخصیت کی ساخت کا جائزہ لیا ہے۔ معترضین کے سامنے پہلا سوال تو میں نے یہی سامنے رکھا ہے کہ شراب اور زنا کے کلچرل ماحول میں ایک نوجوان عمر کے بہترین طوفانی حصے' یعنی عنفوان شباب سے ۲۵ سال تک ایسی پاکبازانہ زندگی بسر کرتا ہے کہ کسی دشمن نے بھی یہ الزام نہیں لگایا کہ نبی مقرر ہونے والے اس پیارے آدمی کی کبھی آنکھ میلی دیکھی گئی ہو۔ اور پھر وہ شادی کرتا ہے تو کسی کمسن مہوش کے ساتھ نہیں' بلکہ ۴۰ سال عمر کی ایک بیوہ شریف خاتون کے ساتھ' اور زندگی کے مزید ۲۵

سال وہ اس کے ساتھ گزار دیتا ہے۔ اب تم ہو کہ ۵۵ سے ۵۹ سال کے مرحلے پر گھٹیا اور گندا الزام لگاتے ہو کیونکہ کثیرالازدواجی کا دور یہی ہے۔

ایک شخص کا دعوتی و انقلابی سرگرمیوں میں انہماک دیکھو' اس کی ہر ماہ روزہ داری کو دیکھو' گھر میں کبھی نان جویں اور کبھی کھجوروں پر' کبھی سوکھی روٹی اور روغن زیتون پر گذر بسر کرتے دیکھتے ہو۔ مخالفتوں اور سازشوں کا مقابلہ کرتے دیکھتے ہو' آئے دن جنگی اور دفاعی طوفان مصروفیت میں دیکھتے' صحابہ کی تنظیم میں معلم و مزکی کے بھاری ادائے فرض کو دیکھتے ہو۔ راتوں کو وہی شخصیت نفل نمازوں کے طویل قیام میں کھڑی ہوتی ہے تو روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ جاتی ہیں اور پاؤں پر ورم آ جاتا ہے۔ تمہارے خیال میں کیا یہ حالات خواہشات بدنی کی "سنہری راتیں" گذارنے کے ہیں۔ افسوس کہ تم لوگ جو داشتائیں رکھتے' کاک ٹیل پارٹیاں منعقد کرتے اور نائٹ کلبوں میں جنسی گندگی کے طوفان اٹھاتے ہو' تم کیا جانو کہ طہارت نفس اور ضبط خواہشات کیا چیز ہوتی ہے۔

پھر میں نے زائد شادیوں کی مصلحتیں بیان کیں' جن کا منتہا یہ مقصد تھا کہ عرب کے متعصب قبائل کے معاشرے میں صرف ایسے شخص کی قیادت چل سکتی تھی جو بین القبائلی حیثیت رکھتا ہو۔ اس حیثیت کو ازدواجی رابطوں سے حاصل کر لینے کی وجہ سے سرکش قبائل نے ڈگیں ڈال دیں۔ اس معاملے میں حضورؐ کے دوسری قسم کی قبائلی تعلقات بھی معاون ہوتے۔

"بین القبائلی قیادت" کی اصطلاح اور اس کا تصور بھی محسن انسانیتؐ نے دیا۔

یہ بھی وضاحت میں نے کر دی کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے مذہبی نوشتوں میں کثیرالازدواجی کی اجازت چلی آ رہی تھی اور دونوں طرف کے انبیاء نے عملاً اس اجازت سے استفادہ کیا۔ ہاں یہ تو اسلام تھا جس نے اس عملی رخصت کی تحدید کر دی۔

(۵) آخری خصوصیت جو اس کام میں ملحوظ رکھی گئی' وہ یہ تھی کہ آیات الٰہی اور معجزات کے باوجود دعوت و انقلاب کا کام زمین پر چلتے پھرتے انسانوں نے کیا۔ اسی حقیقت کے مطابق حضورؐ کا گھرانا ایک انسانی گھرانا تھا۔ خانہ داری کے سارے کام' باہمی گفتگوئیں' اختلافات' معاشی دقتیں اسی طرح پیش آئیں جیسی انسانوں کے درمیان پیش آتی ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ ساری فضا پر کتاب و سنت کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور تمام معاملات میں اسلامی اصول اخلاق کارفرما رہے۔ غلطیاں بھی ہو جاتیں' ان کی اصلاح بھی ہوتی' تبسم بھی چمک دکھاتے اور آنسوؤں کے موتی بھی اچھلتے' حتیٰ کہ سوکناپے کے داعیات بھی کبھی کبھار تھوڑا بہت اثر دکھاتے۔ منافقوں کی عورتیں اور غیر اصلاح یافتہ خواتین فتنہ انگیزی بھی کرتیں' مگر ان چیزوں کا توڑ بھی ہو جاتا' کیونکہ قوامیت دائمی فلاح و سعادت کو حاصل تھی۔ نبی پاک کی نہایت عزیز اہلیہ کے خلاف منافقین نے افک و بہتان کا طوفان اٹھایا جو دیر تک مدینہ کی گلیوں اور گھروں میں تموج دکھاتا رہا۔ آخر وحی الٰہی نے فضا صاف کر دی۔

کہنے کا مطلب یہ کہ یہ تمام مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھرانا تھا' جسے ایک فوق الانسانی تصور دے کر بعض اصحاب نے ایک طرح سے ناقابل تقلید قرار دے لیا۔ میرا مقصد اس مضر تصور کو ختم کرنا تھا۔ ہمارے لیے کسی بھی دور میں اصولی حقیقتوں کے لحاظ سے نمونے کا گھر وہی ہے' اور کسی دوسرے کلچر کی لادینی' مشرکانہ' جاہل یا مخالف اسلام رسوم کو اپنے گھروں اور افراد خانہ پر مسلط کرنا تباہی کا سامان ہے۔ اور آج ہم ملحدانہ کلچر اور ناجائز رسوم کی یلغار کے آگے ہتھیار ڈال کر اور دل اور دماغ دوسروں کی نذر کر چکے ہیں۔

(۶) میں نے اپنے بیان کردہ مقصد کے تحت واقعات کے تفصیلی تجزیوں' مقامات اور اشخاص اور تاریخوں کے متعلق سلف سے اب تک جاری رہنے والے اختلافات پر تحقیقی بحثیں کرنے اور ان کے متعلق حوالے جمع کرنے سے اس لیے اجتناب کیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ میرا قاری جو حضورؐ پاک کی شخصیت کے قریب جا پہنچا ہے اور ان کے کاروان انقلاب کے قدم بقدم سیرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا سفر طے کر رہا ہے اس پاکیزہ کارواں سے بچھڑ کر اختلافی بحثوں کی پگڈنڈیوں پر گامزن ہو جائے' اور "محمل نہاں شد از نظر" اور "صد سالہ راہم دور شد" والا حادثہ نمودار ہو جائے۔ اس بارے میں میں نے بہ تقاضائے احتیاط کسی بھی معاملے میں ایک ترجیحی رائے کو اختیار کر لیا' اور تحقیقی بحثوں کا کام اگلی جلد کے لیے چھوڑ دیا جس کا لکھنا میرے مقدر میں نہ تھا۔

آخر میں دعا ہے کہ اس ایڈیشن کی طباعت و اشاعت کا کام خیر و خوبی سے ہو۔ خداوند کریم محمد فیصل صاحب کو بہترین کارکردگی سے نوازے اور ان کے ہاتھوں اس کتاب کی اشاعت کا پیمانہ اور دائرہ خوب خوب بڑھے۔

دعا ہے کہ کمپیوٹر ورک' ٹائپ شدہ مسودات کی تصحیح' طباعت' جلد بندی اور آرٹ ورک کی مختلف ذمہ داریاں انجام دینے والوں اور ان کے معاونوں' سب کو درجہ بہ درجہ جزا ملے' اور سیرت جناب محمد ﷺ کے مبارک کام پر شفاعت محمدؐ کا اعزاز ملے۔ ان کے ساتھ ساتھ کتاب کے قارئین اور ان تک کتاب پہنچانے والے کتب فروش یا ایجنٹ بھی یہ فیضان پائیں۔

امید کرتا ہوں کہ یہ سب حضرات میرے حق میں بھی ایسی ہی دعائیں کریں گے۔

مولف ناچیز

نعیم صدیقی۔ ۲۸ نومبر ۱۹۹۸ء



حسن تحسین

میرے پیش نظر صرف یہ ہے کہ نعیم صاحب نے ایک طویل مدت اور محنت شاقہ برداشت کر کے سیرت پاک کے چشمہ صافی سے خلق خدا کو سیراب کرنے کی جو کوشش کی ہے اس میں کچھ تھوڑا سا حصہ لے کر میں بھی کسی حد تک سعادت کا مستحق بن سکوں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

(اقتباس از دیباچہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے قلم حق رقم سے)

اسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دو ہی ذرائع سے پہنچی ہے۔ ایک اللہ کا کلام، دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں جن کو اللہ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ و تعلیم اور تفہیم کا واسطہ بنایا' بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت و رہنمائی کے منصب پر بھی مامور کیا تاکہ وہ کلام اللہ کا ٹھیک ٹھیک منشاء پورا کرنے کے لیے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیر صالح کر دکھائیں۔

یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے ایسی لازم و ملزوم رہی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کسی سے الگ کر کے نہ انسان کو کبھی دین کا صحیح فہم نصیب ہو سکا' اور نہ وہ ہدایت سے بہرہ یاب ہو سکا۔ کتاب کو نبی سے الگ کر دیجیے تو وہ ایک کشتی ہے ناخدا کے بغیر جسے لیکر اناڑی مسافر زندگی کے سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں۔ منزل مقصود پر کبھی نہیں پہنچ سکتے' اور نبی کو کتاب سے الگ کر دیجیے تو خدا کا راستہ پانے کی بجائے آدمی ناخدا ہی کو خدا بنا بیٹھنے سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ یہ دونوں ہی نتیجے پچھلی قومیں دیکھ چکی ہیں۔ یہودیوں نے اپنے انبیاء کی سیرتوں کو گم کیا۔ اور صرف کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ انجام یہ ہوا کہ کتابیں ان کے لیے لفظی گورکھ دھندوں سے بڑھ کر کچھ نہ رہیں۔ حتیٰ کہ آخرکار خود انہیں بھی وہ گم کر بیٹھے۔ عیسائیوں نے کتاب کو نظرانداز کر کے نبی کا دامن پکڑا' اور اس کی شخصیت کے گرد گھومنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی چیز انہیں نبی اللہ کو ابن اللہ بلکہ عین اللہ بنانے سے باز نہ رکھ سکی۔

پرانے ادوار کی طرح اب اس نئے دور میں بھی انسان کو نعمت اسلام میسر آنے کے وہی دو ذرائع ہیں جو ازل سے چلے آرہے ہیں۔ ایک خدا کا کلام جو اب صرف قرآن پاک کی صورت ہی میں مل سکتا ہے' دوسرے اسوہ نبوت جو اب صرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہی میں محفوظ ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہو سکتا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے سمجھے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی

مدد سے جس نے سمجھ لیا۔ اس نے اسلام کو سمجھا۔ ورنہ فہم دین سے بھی محروم رہا اور نتیجتاً ہدایت سے بھی۔

پھر' قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں چونکہ ایک مشن رکھتے ہیں' ایک مقصد و مدعا کو لیے ہوئے آئے ہیں' اس لیے ان کو سمجھنے کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ان کے مشن اور مقصد و مدعا کو کس حد تک سمجھتے ہیں اس چیز کو نظر انداز کر کے دیکھیے تو قرآن عبارتوں کا ایک ذخیرہ اور سیرت پاک واقعات و حوادث کا ایک مجموعہ ہے' آپ لغت اور روایات اور علمی تحقیق و کاوش کی مدد سے تفسیروں کے انبار لگا سکتے ہیں اور تاریخی تحقیق کا کمال دکھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپؐ کے عہد کے متعلق صحیح ترین اور وسیع ترین معلومات کے ڈھیر لگا سکتے ہیں' مگر روح دین تک نہیں پہنچ سکتے' کیونکہ وہ عبارات اور واقعات سے نہیں بلکہ اس مقصد سے وابستہ ہے جس کے لیے قرآن اتارا گیا اور محمد عربی صلی اللہ علیہ و سلم کو اس کی علمبرداری کے لیے کھڑا کیا گیا۔ اصل مقصد کا تصور جتنا صحیح ہو گا' اتنا ہی قرآن اور سیرت کا فہم صحیح' اور جتنا وہ ناقص ہو گا' اتنا ہی ان دونوں کا فہم ناقص رہے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دونوں ہی بحرِ ناپیدا کنار ہیں۔ کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی اور فوائد و برکات کا احاطہ کرے تو اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ جس چیز کی کوشش کی جا سکتی ہے وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی ان کا زیادہ سے زیادہ صحیح فہم حاصل کرے اور ان کی مدد سے روح دین تک رسائی پائے۔

ان سطور سے میرا مقصد نعیم صدیقی صاحب کی کتاب پر کوئی تقریظ یا تنقید لکھنا نہیں ہے۔ وہ جتنی اور جیسی داد کی مستحق ہے' انشاء اللہ ناظرین خود دیں گے اور اس کے عیب و صواب سے بھی علم و بصیرت والے ناواقف نہ رہیں گے۔ میرے پیش نظر صرف یہ ہے کہ نعیم صاحب نے ایک طویل مدت اور محنت شاقہ برداشت کر کے سیرت پاک کے چشمہ صافی سے خلق خدا کو سیراب کرنے کی جو کوشش کی ہے اس میں کچھ تھوڑا سا حصہ لے کر میں بھی کسی حد تک سعادت کا مستحق بن سکوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی کتاب پڑھنے سے پہلے ہر ناظر اچھی طرح سمجھ لے کہ سیرت پاک کا مطالعہ اس کو کس مقصد کے لیے اور کس نقطہ نظر سے کرنا چاہیے۔ اس کے بعد مجھے امید ہے کہ نعیم صاحب کی محنت سے لوگ زیادہ بہتر طریقہ سے مستفید ہو سکیں گے۔

لاہور

۱۸ مئی ۱۹۶۰ء

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تقریظ

جناب ماہر القادری، مرحوم و مغفور

مدحت رسولؐ میں فارسی شاعری کا یہ مصرعہ:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ضرب المثل بن چکا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نعت و منقبت کا عنوان اور مدحت رسولؐ کا موضوع اختصار و اجمال کا نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ شرح و اطناب کا تقاضا کرتا ہے۔ اس مبارک ذکر کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کے بعد بھی دل کی سیری نہیں ہوتی' اور جی یہی چاہتا ہے کہ یہ مقدس داستان دراز تر ہوتی چلی جائے۔

زبان و قلم کی سب سے بڑی سعادت یہی ہے کہ یہ سیرت نبیؐ کے اعلان و اظہار کا ذریعہ قرار پائیں اور سالہا سال کی زمزمہ خوانی اور ہزاروں صفحوں کی کتابت و املاء کے بعد بھی وجدان و ضمیر اس عجز و واماندگی کا اعتراف کریں کہ:

ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

غالب نے روح القدس کی تائید کے بعد ہی اتنا سچا شعر کہا ہے:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم — کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

کس کی مجال ہے جو خلاصہ کائنات' فخر موجودات علیہ الصلوٰۃ و التحیات کی مدحت سرائی اور سیرت نگاری کا حق ادا کر سکے' یہ غلط دعویٰ نہ کسی زبان سے نکل کر فضا میں پھیلا اور نہ کسی قلم نے اسے صفحہ قرطاس پر ثبت کیا۔ اس بارگاہ قدس میں جس نے بھی لب کشائی کی تو اس کا مقصود حصول سعادت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

سیرت ابن اسحاق کے شارح عبدالرحمٰن سہیلی (وفات ۵۸۱ ھ) کی "روض الانف" ہو یا حافظ عبدالمومن دمیاطی (۷۰۵ھ) کی "سیرت دمیاطی" کازرونی (۶۹۴ ھ) اور مغلطائی کی سیرت پر کتابیں ہوں یا حافظ ابن الجوزی کی "شرف المصطفیٰ" "سیرت ابن البر" ہو یا ابن سید الناس کی "عیون الاثر" قسطلانی کی "المواہب اللدنیہ" اور اس کی شرح "زرقانی علی المواہب" ہو یا "سیرت حلبی"! شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت پر تالیفات ہوں یا قاضی سلیمان منصور پوری کی "رحمۃ للعالمینؐ" ان تمام سیرت نگاروں کی کوششیں مستحق تبریک اور لائق تحسین ہیں۔ ان بزرگوں نے تاریخ و سیرت کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ مگر یہ کسی نے نہیں کہا کہ سیرت نگاری کا ہم نے حق ادا کر دیا۔ یا ہماری کتاب سیرت کے موضوع پر "حرف آخر" کی حیثیت رکھتی ہے۔

سیرت کی تمام کتابیں ثقاہت و صحت کے اعتبار سے ایک جیسی نہیں ہیں' کسی سیرت نگار نے تو چھان پھٹک کے بغیر ہی رطب و یابس کو اکٹھا کر دیا ہے' یہاں تک کہ موضوع روایتوں کو نقل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا' اسی قسم کی غلط روایتوں کو عوام مسلمانوں میں قبول حاصل ہوا اور میلاد کی محفلوں میں عام طور پر مسلمان انہی "موضوعات" کو سن سن کر جھومتے ہیں۔

اردو زبان و ادب کے مشہور اہل قلم جناب نعیم صدیقی نے بھی سیرت کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بارگاہ رسالت میں اپنی بساط کے مطابق نذر عقیدت پیش کر کے دین و دنیا کی سعادت حاصل کی ہے! یہ بہت بڑا شرف ہے جس کی توفیق اللہ تعالیٰ کے فضل سے انہیں نصیب ہوئی ہے۔ ایک ایسا "شرف" جس پر رشک کیا جا سکتا ہے! اس شرف میں زور بازو سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و عطا کا ہاتھ ہے!

اس دنیا میں مسلمان ادیبوں اور شاعروں کی کمی نہیں ہے مگر ان میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن کے زبان و قلم اسلام کی ترجمانی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔ نعیم صدیقی چاہتے تو اپنے قلم سے فلمی کہانیاں اور رومانی افسانے لکھ کر' بہت کچھ شہرت اور دولت حاصل کر سکتے تھے' مگر ان کے قلم کو بدو شعور اور آغاز تصنیف و تالیف ہی سے طہارت میسر آئی ہے اور وہ ان آلودگیوں سے دور رہے ہیں' جن پر بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی شہرت کے محل قائم ہیں! نعیم صدیقی نے سستی شہرت اور ناجائز و مشتبہ دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا! انہوں نے حق کی خاطر قید و بند کی سختیاں بھی اٹھائی ہیں اور معاش کی تنگی سے بھی ان کا سابقہ پڑا ہے' ان کڑی آزمائشوں نے ان کی زندگی میں نکھار' ان کی زبان میں تاثیر اور ان کی تحریر میں سوز پیدا کر دیا ہے۔

"محسن انسانیت" میں نعیم صدیقی کے قلم کی طہارت' فکر کی پاکیزگی' دل کا سوز اور دینی شغف پوری طاقت کے ساتھ ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے' ایک ایک سطر محبت رسولؐ کی خوشبو میں بسی ہوئی اور ایک ایک ورق پر عقیدت کے لعل و گہر جگمگ کرتے ہوئے! ظاہر ہے کہ کوئی سیرت نگار واقعات میں تو اپنی طرف سے اضافہ کر نہیں سکتا' جہاں تک واقعات کے قلم بند کرنے کا تعلق ہے ہر سیرت نگار کی حیثیت مصنف (Author) کی نہیں۔ مؤلف (Compiler) کی ہوتی ہے! سیرت نگار کی شخصیت کے جواہر واقعات کے انتخاب و ترتیب اور ان کو خاص اسلوب کے ساتھ پیش کرنے میں کھلتے ہیں! اس اعتبار سے یہ کتاب نعیم صدیقی کے ادب و انشاء' اسلوب نگارش' انداز فکر' دینی رجحان' مورخانہ بصیرت اور ذوق انتخاب کا نہایت حسین تعارف ہے!

سیرت نگاری کا ایک وہ ذوق اور عقیدت کا وہ جوش کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "مافوق الانسان" کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ جہاں سارا کام خرق عادت اور معجزوں کے زور سے چلتا ہو' اور زندگی کا یہ رنگ دیکھ کر آدمی اطاعت کی ہمت نہ کر سکے۔

نعیم صدیقی عقیدت کے اس غلو کی خرابیوں پر نگاہ رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے سیرت مقدسہ کے واقعات کے انتخاب میں بڑی دیدہ ریزی اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنے امکان بھر پوری کوشش کی ہے کہ سچے موتیوں کے ساتھ خزف ریزے نہ آنے پائیں۔ جو واقعہ بھی ان کی کتاب میں درج ہو وہ درایت و روایت کی کسوٹی پر پورا پورا اترتا ہو ---- اور اس "انسان کامل" کی پاک سیرت کے خط و خال پڑھنے والوں کے سامنے آئیں۔ جس کی اتباع و اطاعت "کشف و کرامت" کے بغیر کی جا سکتی ہے۔ اور جس کی مقدس زندگی وحشت ناک نہیں بلکہ دلکش و محبوب ہے!

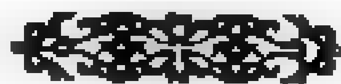
نعیم صدیقی ❶ معجزات کے خدانخواستہ منکر نہیں ہیں مگر وہ اس حقیقت کو پا گئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "خرق عادات" کے لیے نہیں' بلکہ انسانی عادات کو مربوط اور متوازن بنانے کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے' جس کا بہترین اور کامل ترین نمونہ خود حضورؐ کی زندگی تھی!

"محسن انسانیت" لالہ و گل کی طرح رنگین' آبشاروں کی مانند مترنم اور کہکشاں کی طرح روشن اور تابناک ہے۔ اس کی زبان میں بڑی سلاست و روانی پائی جاتی ہے اور اسلوب نگارش بہت دلکش اور بعض مقامات پر تو وجد آفریں ہے!

اردو زبان ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی جن اہل نظر اور ارباب علم کی نگاہ سے سیرت پر کتابیں گزری ہیں۔ وہ "محسن انسانیت" کو پڑھ کر اس کی انفرادیت کو ضرور محسوس کریں گے۔ غیب کا حال تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا' مگر میرا وجدان پیش گوئی کر رہا ہے کہ اس کتاب کو انشاء اللہ قبول عام حاصل ہو گا۔

جناب نعیم صدیقی نے کاغذ پر جو نقوش بنائے ہیں' وہ انشاء اللہ دلوں پر منتقل ہوتے رہیں گے اور اس طرح ان کا نام اور کام باقی رہے گا!

کراچی　　　۱۵ اکتوبر ۱۹۵۹ء　　　ماہر القادریؒ



---

❶ ماہر صاحب نے معجزات کے متعلق میرے یقین کا صحیح اندازہ کیا۔ اس کتاب میں بھی میں نے واقعہ معراج کے معجزاتی پہلو کو نمایاں کیا۔ ہجرت کی شب کفار کے نرغے سے نکلنے' غار ثور میں حضورؐ کے لیے خدائی حفاظت کے انتظام کا بیان کیا ہے۔ ام معبد کے گھر' مریل سی بکری کے تھنوں سے بہت دودھ نکلا۔ سورہ روم کی پیشین گوئی پر بھی بات کی گئی ہے۔ بعض اشخاص کے بارے میں حضورؐ کی دی ہوئی پیشگی اطلاعات کے سچا ثابت ہونے کا ذکر ہے۔ اور بہت سی باتیں ہیں۔ مگر میرا اصل زور حضورؐ کی سچی دعوت اور پاکیزہ کردار اور اسلامی تنظیم کے قیام اور جہاد وغیرہ پر رہا ہے۔ (مؤلف)

باب: ۱

محسنِ انسانیت ﷺ

مقدمہ

پیغامِ نصب العین اور تاریخی مقام

مقدّمہ
پیغام۔ نصب العین اور تاریخی مقام

پیشتر اس کے کہ ہم حضورؐ کی سیرت کا مطالعہ کرنے چلیں' ہمارے سامنے اس کام کا کوئی واضح تصور ہونا چاہیے جسے سرانجام دینے کے لیے (محسن انسانیتؐ) دنیائے انسانیت کی عظیم ترین شخصیت تاریخ کی جنگاہ میں نمودار ہوتے ہیں۔ پوری عمر ایک فیصلہ کن معرکہ سر کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ حضورؐ کی زندگی ایک بین الانسانی مشن کی داستان ہے۔ وہ قرآن کے ابدی اصولوں کی تفسیر ہے جسے عمل کی زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔ وہ اس مقدس پیغام کی تکمیل ہے جس کی مشعل آدم' ابراہیم' موسیٰ' عیسیٰ اور جملہ انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے دور میں روشن کرتے رہے ہیں۔

ہم سیرت پاک کو مربوط نہیں کر سکتے' واقعات کی توجیہہ نہیں کر سکتے' مطالعہ سیرت کا مقصد متعین نہیں کر سکتے اور اس سے جو کچھ ہمیں اخذ کرنا ہے وہ کچھ اخذ نہیں کر سکتے' تاوقتیکہ ہم حضورؐ کے کام کی نوعیت' اس کے امتیازی پہلوؤں اور اس کے دائرے کی وسعتوں کو پیش نظر نہ رکھ لیں۔

بنی نوع انسان کا نجات دہندہ:

تاریخ کے وسیع دائروں پر نظر ڈالیں' تو اس میں ہمیں طرح طرح کے مصلحین دکھائی دیتے ہیں۔ شیریں مقال واعظ اور آتش بیان خطیب سامنے آتے ہیں' بہت سے فلسفہ طراز ہر دور میں ملتے ہیں' بادشاہوں اور حکمرانوں کے انبوہ ہمیشہ موجود رہے ہیں جنہوں نے عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں' جنگجو فاتحین کی داستانیں ہم پڑھتے ہیں' جماعتیں بنانے اور تمدن میں مدو جزر پیدا کرنے والوں سے ہم تعارف حاصل کرتے ہیں۔ انقلابی طاقتیں نگاہوں میں آتی ہیں جنہوں نے نقشۂ حیات کو بار بار زیر و زبر کیا ہے۔ رنگا رنگ مذاہب کی نیو ڈالنے والے بکثرت سامنے آتے ہیں۔ اخلاقی خوبیوں کے داعی بھی اسٹیج پر جلوہ گر ہوتے رہے ہیں۔ کتنے ہی مقنن ایوان تہذیب میں کارنامے دکھا چکے ہیں۔ لیکن جب ہم ان کی تعلیمات' ان کے کارناموں اور ان کے پیدا کردہ مجموعی نتائج کو دیکھتے ہیں تو اگر کہیں خیر و فلاح دکھائی دیتی ہے تو وہ جزئی قسم کی ہے۔ اس کے اثرات زندگی کے کسی ایک گوشے پر ابھرتے ہیں۔ پھر خیر و فلاح کے ساتھ طرح طرح کے مفاسد ترکیب پائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انبیاءؑ کے ماسوا کوئی عنصر تاریخ میں ایسا نہیں دکھائی دیتا جو

انسان کو ---- پورے کے پورے انسان کو ---- اجتماعی انسان کو ---- اندر سے بدل سکا ہو۔ حضورؐ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ کی دعوت نے پورے کے پورے اجتماعی انسان کو اندر سے بدل دیا اور صبغۃ اللہ کا ایک ہی رنگ مسجد سے لے کر بازار تک' مدرسہ سے عدالت تک اور گھروں سے لے کر میدان جنگ تک چھا گیا۔ ذہن بدل گئے۔ خیالات کی رو بدل گئی۔ نگاہ کا زاویہ بدل گیا' عادات و اطوار بدل گئے' رسوم و رواج بدل گئے۔ حقوق و فرائض کی تقسیمیں بدل گئیں' خیر و شر کے معیارات اور حلال و حرام کے پیمانے بدل گئے۔ اخلاقی قدریں بدل گئیں' دستور اور قانون بدل گیا' جنگ و صلح کے اسالیب بدل گئے' معیشت اور ازدواج کے اطوار بدل گئے' اور تمدن کے ایک ایک ادارے اور ایک ایک شعبے کی کایا پلٹ گئی' اس پوری کی پوری تبدیلی میں جس کا دائرہ ہمہ گیر تھا' ایک سرے سے دوسرے سرے تک خیر و فلاح کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ کسی گوشے میں شر نہیں' کسی کونے میں فساد نہیں' کسی جانب بگاڑ نہیں۔ ہر طرف بناؤ ہی بناؤ' تعمیر ہی تعمیر اور ارتقا ہی ارتقا ہے۔ درحقیقت حضورؐ محسن انسانیت کے ہاتھوں انسانی زندگی کو نشاۃ ثانیہ حاصل ہوئی اور حضورؐ نے ایک نظام حق کی صبح درخشاں سے مطلع تہذیب کو روشن کر کے بین الاقوامی دور تاریخ کا افتتاح فرمایا۔ یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی!

خدا کے آخری رسولؐ ہدایت کا ظہور ایسے حالات میں ہوا جب کہ پوری انسانیت تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی ---- کہیں دور وحشت چل رہا تھا۔ اور کہیں شرک اور بت پرستی کی لعنتوں نے مدنیت کا ستیاناس کر رکھا تھا۔ مصر اور ہندوستان' بابل اور نینوا' یونان اور چین میں تہذیب اپنی شمعیں گل کر چکی تھی۔ لے دے کے فارس اور روم تمدنی عظمت کے پھریرے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ رومی اور ایرانی تمدنوں کی ظاہری چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تھی۔ مگر ان شیش محلوں کے اندر بدترین مظالم کا دور دورہ تھا اور زندگی کے زخموں سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ بادشاہ خدا کے اوتار ہی نہیں' خدا بنے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جاگیردار طبقوں اور مذہبی عناصر کی ملی بھگت قائم تھی۔ روم اور ایران کے دونوں خطوں میں اس تکڑم نے عام انسان کا گلا اچھی طرح دبوچ رکھا تھا۔ یہ لوگ ان سے بھاری ٹیکس' رشوتیں' خراج اور نذرانے وصول کرتے تھے اور ان سے جانوروں کی طرح بیگاریں لیتے تھے۔ لیکن ان کے مسائل سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی' ان کی مصیبتوں میں ان سے کوئی ہمدردی نہ تھی اور ان کی گتھیوں کا کوئی حل ان کے پاس نہ تھا۔ ان بالادست طبقوں کی عیاشیوں اور نفس پرستیوں نے اخلاقی روح کو ہلاک کر دیا تھا۔ بادشاہوں کے ادل بدل' نت نئے فاتحین کے ظہور اور خون ریز جنگوں کی وجہ سے حالات میں جو تموج پیدا ہوتا تھا۔ اس میں بھی کوئی راہ نجات عام آدمی کے لیے نہ نکلتی تھی۔ عام آدمی کو ہر تبدیلی کی چکی اور زیادہ تیزی سے پیستی تھی۔ ہر قوت اسی کو آلۂ کار بنا کر اور اسی کا خون صرف کر کے اور اسی کی محنتوں سے استفادہ کر کے اپنا جھنڈا بلند کرتی تھی اور پھر غلبہ و اقتدار پانے کے بعد وہ پہلوں سے بھی بڑھ چڑھ کر ظالم ثابت ہوتی تھی۔ خود روم و ایران کی سلطنتوں کے درمیان مسلسل آویزش کا چکر چلتا رہتا تھا اور مختلف علاقے کبھی

ایک حکومت کے قبضے میں جاتے اور کبھی دوسری سلطنت ان کو نگل لیتی۔ لیکن ہر بار فاتح قوت عوام کے کسی نہ کسی طبقے کو خوب اچھی طرح پامال کرتی۔ مثلاً رومی حکومت آتی تو آتش کدے کلیساؤں میں بدل جاتے اور ایرانی راج چھا جاتا تو پھر کلیسا آتش کدے بن جاتے۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مفتوحین کو جبری تبدیلیٔ مذہب سے گزرنا پڑتا یا وہ منافقت اختیار کرتے' ورنہ موت یا ایذا رسانی سے دوچار ہوتے۔ ایسے لوگوں میں جوہر ایمان و اخلاق کیسے زندہ رہ سکتا۔

دنیا کے اکثر حصوں میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ نت نئے ٹکراؤ ہوتے۔ بار بار کشت و خون ہوتے بغاوتیں اٹھتیں۔ مذہبی فرقے خون ریزیاں کرتے اور ان ہنگاموں کے درمیان انسان بہ حیثیت انسان بری طرح پامال ہو رہا تھا۔ وہ انتہائی مشقتیں کر کے بھی زندگی کی ادنیٰ ضرورتیں پوری کرنے پر قادر نہ تھا۔ اسے مظالم کے کولہو میں پیلا جاتا تھا۔ مگر تشدد کی خوف ناک فضا میں وہ صدائے احتجاج بلند نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تلخ احساسات رکھتا ہو گا مگر اسے ضمیر کی آزادی کسی ادنیٰ درجے میں حاصل نہ تھی۔ اس کی مایوسیوں اور نامرادیوں کا آج ہم مشکل ہی سے تصور کر سکتے ہیں کہ وہ ماحول کے ایک ایسے آہنی قفس میں بند تھا۔ جس میں کوئی روزن کسی طرف نہیں کھلتا تھا۔ اس کے سامنے کسی امید افزا اعتقاد اور کسی فلسفے یا نظریے کا جگنو تک نہیں چمکتا تھا' اس کی روح چیختی تھی' مگر پکار کا کوئی جواب کسی طرف سے نہ ملتا تھا۔ کوئی مذہب اس کی دستگیری کے لیے موجود نہ تھا۔ کیونکہ انبیاء کی تعلیمات تحریف و تاویل کے غبار میں گم کی جا چکی تھیں اور باقی جو شے مذہب کے عنوان سے پائی جاتی تھی اسے مذہبی طبقوں نے متاع کاروبار بنا لیا تھا۔ اور انہوں نے وقت کی ظالم طاقتوں کے ساتھ سودے گانٹھ لیے تھے۔

یونان کا فلسفہ سکتے میں تھا۔ کنفیوشس اور مانی کی تعلیم دم بخود تھی' ویدانت اور بدھ مت کے تصورات اور منوشاستر کے نکات سر بگریباں تھے۔ جسٹینین کا ضابطہ اور سولن کا قانون بے بس تھا۔ کسی طرف کوئی روشنی نہ تھی: جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان حالات کے ایک آہنی قفس میں بند ہو جاتا ہے اور اسے کسی طرف سے نجات کا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ تو تمدنی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔[1] یہ وہ خوف ناک ترین بحران کا ایک عالم گیر دور تھا[2] جس کی اندھیاریوں میں محسنِ انسانیت کی مشعل یکایک آ ابھرتی ہے۔ اور

---

[1] عالم انسانی کے اس تاریخی دور پر قرآن نے چند الفاظ میں ایسا مکمل تبصرہ کیا ہے کہ بڑی سے بڑی عبارت آرائی اس کے سامنے سرنگوں ہے فرمایا: ظهر الفساد في البر والبحر بما كسبت ايدي الناس ليذيقهم بعض الذي عملوا لعلهم يرجعون (الروم - ۴۱)

[2] اس دور کا بہترین مختصر جائزہ لینے کے لیے ملاحظہ ہو: "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ باب اول۔ نیز ملاحظہ ہو: "رسولؐ اکرم کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ باب: بعثت نبویؐ کے وقت دنیا کی حالت۔ مزید ملاحظہ ہو۔ سیرت النبیؐ از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (ج ۳)

وقت کے تمدنی بحران کی تاریکیوں کا سینہ چیر کر ہر طرف اجالا پھیلا دیتی ہے۔

خود عرب کا قریب ترین ماحول جو حضورؐ کا اولین میدان کار بنا' اس کا تصور کیجئے تو دل دہل جاتا ہے۔ وہاں عاد و ثمود کے ادوار میں سبا اور عدنا اور یمن کی سلطنتوں کے سائے میں کبھی تہذیب کی روشنی نمودار بھی ہوئی تھی تو اب اسے گل ہوئے مدتیں گزر چکی تھیں۔ ❶ بقیہ عرب پر دور وحشت کی رات چھائی ہوئی تھی۔ ❷ تمدن کی صبح ابھی تک جلوہ گر نہیں ہوئی تھی اور انسانیت نیند سے بیدار نہ ہو پائی تھی۔ ہر طرف ایک انتشار تھا' انسان اور انسان کے درمیان تصادم تھا' جنگ و جدل اور لوٹ مار کا دور دورہ تھا' شراب اور زنا اور جوئے سے ترکیب پانے والی جاہلی ثقافت زوروں پر تھی۔ قریش نے مشرکانہ اور بت پرستانہ مذہبیت کے ساتھ کعبہ کی مجاوری کا کاروبار چلا رکھا تھا۔ یہود نے کلامی اور فقہی موشگافیوں کی دکانیں کھول رکھی تھیں۔ باقی عرب فکر کے لحاظ سے ذہنی پریشانی میں مبتلا تھا۔ مکہ اور طائف کے مہاجنوں نے سود کے جال پھیلا رکھے تھے۔ غلام سازی کا منحوس ادارہ دھوم دھڑلے سے چل رہا تھا۔ حاصل مدعا یہ کہ انسان خواہش پرستی کی ادنیٰ سطح پر گر کر درندوں اور چوپایوں کی شان سے جی رہا تھا۔ ❸ جو زور والا تھا اس نے کمزوروں کو بھیڑ بکریوں کے گلوں کی طرح قابو میں کر رکھا تھا۔ اور کمزور لوگ قوت والوں کے قدموں میں سجدہ پاش تھے۔

یہ تھے وہ حالات جن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم عظیم ترین تبدیلی کا پیغام لے کر یکہ و تنہا اٹھتے ہیں' ایسے مایوس کن حالات میں کوئی دوسرا ہوتا' تو شاید زندگی سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ دنیا میں ایسے نیک اور حساس لوگ بکثرت پائے گئے ہیں جنہوں نے بدی سے نفرت کی' مگر وہ بدی کا مقابلہ کرنے پر تیار نہ ہو سکے۔ اور اپنی جان کی سلامتی کے لیے تمدن سے کنارہ کش ہو کر غاروں اور کھوہوں میں پناہ گزین ہوئے اور جوگی اور راہب بن گئے۔ مگر حضورؐ نے انسانیت کی نیا کو طوفانی موجوں میں ہچکولے کھاتے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی فکر نہیں کی' بلکہ بدی کے ہلاکت انگیز گردابوں سے لڑ کر ساری اولاد آدمؑ کے لیے نجات کا راستہ کھولا۔ تمدن کی کشتی کی پتوار سنبھال اور پھر اسے ساحل مراد کی طرف رواں کر دیا۔

روم اور ایران کی دو بڑی ٹکراتی ہوئی تمدنی طاقتوں نے جو بحران پیدا کر دیا تھا' اسے توڑنے کے لیے آپؐ ایک تیسری طاقت بن کے اٹھے اور آہستہ آہستہ یہ تیسری طاقت جب اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی۔ تو اس نے روم و ایران دونوں کو چیلنج کیا' دونوں کی مرعوب کن قیادتوں کے تخت الٹ دیئے اور عوام الناس

---

❶ ملاحظہ ہو: ارض القرآن۔ از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم۔ ابواب متعلقہ۔

❷ ملاحظہ ہو: سیرت النبیؐ۔ از علامہ سید سلیمان ندوی۔ ج ۴۔ باب ظہور اسلام کے وقت عربوں کی مذہبی و اخلاقی حالت۔

❸ القرآن: ان هم الا كالانعام بل هم اضل سبيلا ○ (الفرقان۔ ۴۴) ترجمہ: یہ لوگ تو بس مویشیوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بد راہ۔

کو خوفناک تمدنی قفس سے نکال کر آزاد فضاؤں میں اڑان کا موقع دیا! اولاد آدم کے سامنے معاً" ایک راہ نجات کھل گئی' کاروان زندگی جو رہزنوں کے درمیان گھرا کھڑا تھا۔ وہ پھر فلاح و ارتقا کی راہوں پر گامزن ہو گیا!

یوں رسولؐ پاک خلق خدا کے لیے نجات دہندہ بن کر تشریف لائے۔

وقت' مقام اور انسانی مواد:

مشیت الٰہی نے جہاں انسانیت کو صراط مستقیم پر لانے کے لیے حضورؐ کی بہترین ہستی کا اصطفیٰ کیا' وہاں وقت کے بدترین حالات کے باوجود حضورؐ کے لیے بہترین زمانہ' مقام دعوت اور بہ حیثیت اولین مخاطب بہترین قوم' بہترین خاندان اور اس کی بہترین شاخ کا انتخاب بھی کیا۔ [1]

مجموعی لحاظ سے زمانہ یوں موزوں ترین تھا کہ قبائلی دور ختم ہو کر جلد ہی بین الاقوامی دور شروع ہونے والا تھا' اور تاریخ کچھ ہی گردشوں کے بعد سائنس کے عہد میں داخل ہونے والی تھی۔ حضورؐ کا زمانۂ بعثت گویا دو دوروں کے درمیان خط فاصل تھا۔ آنے والے وسیع تر اور روشن دور کا افتتاح کرنے کے لیے ضروری ہوا کہ انبیاءؑ کی دعوت حق کو ایک بار پوری طرح اجاگر کر دیا جائے۔ دین کی روح کو ابھار دیا جائے۔ خدا پرستانہ تہذیب کی بنیادیں مضبوطی سے جما دی جائیں اور عدل و مساوات کا نظام رحمت کامل شکل میں پیش کر دیا جائے تاکہ حضورؐ کے اس کارنامے کی روشنی سے بعد کے ادوار منور کیے جا سکیں اور پھر یہ زمانہ اس لحاظ سے بھی موزوں ترین تھا کہ عام لوگوں کے سامنے کوئی دوسری امید گاہ باقی نہ تھی' اور ان کے دل میں قبول اسلام کے دروازے آسانی سے کھل سکتے تھے۔

مقام دعوت کے لحاظ سے دیکھیں تو عرب باوجود بے آب و گیاہ خطہ ہونے کے اس وقت کی متمدن دنیا میں وسطی [2] حیثیت رکھتا تھا' مشرق و مغرب اور شمال سے آنے والے تمام کاروانی راستے عرب کی سر زمین میں آ کے ملتے تھے۔ اور مختلف ممالک کے درمیان جتنی تجارت خارجہ ہوتی تھی اس کا واسطہ عرب

---

[1] اس سلسلے میں ملاحظہ ہو: زاد المعاد از علامہ ابن القیم ج ۱ تفسیر آیہ و ربک یخلق ما یشاء و یختار ص ۵ تا ۱۵۔ نیز ملاحظہ ہو۔ حجتہ البالغہ۔ شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ ج ۱ بحث ۶ باب ۵۳' ۵۴ ج ۲ باب سیرۃ النبی ﷺ۔ فصل: حضورؐ کی عادات و خصائل کے بیان میں۔

نیز ملاحظہ ہو: سیرت النبیؐ از سید سلیمان ندوی مرحوم۔ ج ۳ باب: عربوں کی خصوصیات۔ علاوہ ازیں ملاحظہ ہوں احادیث تخیر و اصطفیٰ' مندرجہ جامع ترمذی۔ باب المناقب۔

[2] عرب کی مرکزی حیثیت پر ملاحظہ ہو: ڈاکٹر حمید اللہ کا نوٹ مندرجہ "رسولؐ اکرم کی سیاسی زندگی" باب: "عرب اور مکہ معظمہ کا انتخاب دعوت اسلام کے مرکز کے طور پر"

ہی کے تجار تھے۔ عمان اور یمن، صنعا اور مکہ، جدہ اور ینبوع، مدینہ اور دومتہ الجندل کے درمیان کاروانوں کی آمد و رفت رہتی، جو عربی راستہ دکھانے والوں، قریش کے پروانہ ہائے راہداری اور اہم قبائل کے بدرقوں کے بغیر سلامتی سے گزر نہ سکتے تھے۔ اس طرح عرب کی سرزمین خصوصاً مکہ، طائف، مدینہ، ینبوع اور دومتہ الجندل ---- کا رابطہ ہند، چین، ایران، عراق، مصر، روم اور حبش کے تمام علاقوں سے تھا۔ یہاں کسی بین الانسانی دعوت کا مرکز دوسرے ہر علاقے سے زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ پھر سرزمین عرب میں مکہ اور مدینہ کے مقامات یہ اہمیت رکھتے تھے کہ مذہبی اور تجارتی اور تمدنی حیثیت سے ان کی قیادت کا سکہ چلتا تھا۔

عرب کا غیر متمدن اور جاہلانہ انتشار ہونا اور اقتصادی حیثیت سے کمزور ہونا اگرچہ کئی مشکلات کا باعث تھا مگر اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ علاقہ بیرونی تسلط سے بھی بڑی حد تک آزاد تھا۔ اور داخلی طور پر بھی کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو باقاعدہ سیاسی اقتدار پورے ملک پر جما چکی ہوتی اور پھر اقتدار، قانون اور تعلیم سے کام لے کر انسانوں کو ایک خاص نقشے پر ڈھال چکی ہوتی۔ ایسی طاقت اگر کوئی موجود ہوتی تو وہ اسی طرح دعوت حق کو کچل سکتی تھی جیسے پہلے بعض ظالم بادشاہوں نے انبیاء کی دعوتوں کو تکمیل تک پہنچنے سے قبل روک دیا۔ بلاشبہ قریش کا بڑا گہرا اثر موجود تھا۔ اور یہ پورے زور سے رکاوٹ بنا۔ لیکن قریش کو پورے عرب پر باقاعدہ سیاسی تسلط حاصل نہ تھا۔ ان کا مذہبی و تجارتی اثر کتنا بھی گہرا رہا ہو۔ منظم حکومت کا بدل نہیں ہو سکتا۔

دینی لحاظ سے دیکھیں تو اس سرزمین کے چاروں طرف انبیاء ماسبق کی دعوتوں کے چراغ روشن رہ چکے تھے اور ان کی اقوام کے آثار آنکھوں کے سامنے موجود تھے[1] شمال میں ظہور ابراہیمؑ کا مقام ار تھا۔ اسی کے قریب کچھ اور اوپر نوح علیہ السلام کا علاقہ تھا، پھر لوط علیہ السلام کا مقام دعوت تھا، پھر مدائن صالح تھا، پھر فلسطین و یروشلم کا علاقہ تھا جہاں بنی اسرائیل نے عروج و زوال کے دور گزارے اور جہاں عیسیٰ علیہ السلام نے سچائی اور نیکی کا پیغام سنایا۔ جنوب میں عاد و ثمود کی بستیاں تھیں، سبا کی سلطنت تھی، سد مآرب تھا جس کے ٹوٹنے سے سیل عرم کا عذاب اٹھا، سمندر پار مصر کی سرزمین تھی جہاں کنعان میں حضرت یعقوبؑ نقیب حق تھے، وہاں سے ان کے فرزند حضرت یوسفؑ اٹھے، اندھے کنویں میں ڈالے گئے، وہاں سے مصر پہنچے، بازار میں غلام بن کر بکے، عزیز مصر کے محل میں پہنچے، محل سے قید خانے میں ڈالے گئے، قید خانے سے نکلے تو مصری خزائن ارض کے مختار بن کر تخت پر جا بیٹھے، اسلامی نظام عدل و رحمت کا سکہ چلایا۔

---

[1] القرآن۔ آیت: افلم یھدلھم کم اھلکنا قبلھم من القرون یمشون فی مساکنھم ٥
ترجمہ: پھر کیا انھیں اس سے بھی ہوش نہیں آئی کہ کتنے ہی گروہوں کو ہم نے (ان کے اعمال بد کی وجہ سے) ملیامیٹ کر دیا، جن کے (اجڑے ہوئے) ٹھکانوں میں سے ان کا گزر ہوتا ہے۔ (طٰہٰ ۱۲۷، السجدہ ۲۶)

حضرت یوسف علیہ السلام کے کیے ہوئے کارِ دین کا احیا موسیٰ علیہ السلام نے کیا اور فرعون' قارون اور ہامان کے گٹھ جوڑ سے چلنے والے نظامِ ظلم کے لیے چیلنج بن گئے۔

ان علاقوں کے درمیان سرزمین حجاز واقع تھی جس کی وادیٔ غیر ذی زرع [1] میں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے مرکز توحید کو مستحکم کیا [2] اور عبودیت و طاعت کی روشن یادگاریں چھوڑیں' خدا پرستی اور توحید اور اصلاح انسانیت کے فروغ کے لیے آخر اس سے بہتر علاقہ اور کون سا ہو سکتا تھا۔ یہاں دعوت حق کی آواز اٹھانے سے انسانی ذہن میں سابق انبیاء کے چھوڑے ہوئے دھندلے نقوش بآسانی تازہ ہو سکتے تھے۔

انسانی مواد (Human Material) بھی بہترین وہ تھا جو عرب کی سرزمین میں موجود تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے خزانے ابھی تک غیر استعمال شدہ اور محفوظ پڑے تھے۔ یہ لوگ ابھی ان مہلک روگوں سے محفوظ تھے جو روم و ایران کے بیمانہ تمدنوں نے پیدا کر دیئے تھے۔ ان میں وحشیانہ طرز زندگی کی خرابیاں موجود تھیں مگر دوسری طرف خوبیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ یہ لوگ بدویت کی وجہ سے مزاج میں فطری سادگی رکھتے تھے اور تکلفات اور تصنعات سے پاک تھے۔ آثار فطرت کا قریبی مشاہدہ رکھنے کی وجہ سے کائنات میں آیات حقیقت کو پڑھ سکتے تھے۔ گرم آب و ہوا' لو کے تھپیڑوں' دن رات کے سفروں' بھوک اور پیاس کے تجربوں اور آئے دن کے قتل و غارت کی وجہ سے ان میں سخت جانی موجود تھی اور وہ جذبہ شجاعت کو پروان چڑھانے میں مدد بنی۔ ایک عالمی تحریک کو لے کر اٹھنے کے لیے شجاعت مند عنصر ہی مفید ہو سکتا تھا۔ ان میں فیاضی موجود تھی اور ایک بڑا کام کرنے کے لیے کوئی بخیل قوم موزوں نہ ہوتی۔ اس قوم کا حافظہ بلا کا تھا اور یہ اپنے انساب کے علاوہ اپنے گھوڑوں تک کے سلسلہ ہائے نسب محفوظ رکھتے تھے۔ ایسے لوگ ایک نظام زندگی کی تعلیم کو اخذ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے لیے بہترین کارکن بن سکتے تھے۔ ان میں غیرت و حمیت کا جذبہ بھی پوری طرح برسرِ کار تھا اس لیے یہ جوہرِ خودی کا تحفظ کر سکتے تھے۔ ان کی زبان ایک اعلیٰ اور وسیع اور ترقی پذیر زبان تھی۔ جس میں فصاحت و بلاغت کا جوہر خوب نکھر چکا تھا۔ لہٰذا علمی حیثیت سے وہ بآسانی آگے بڑھ سکتے تھے۔ نیز دوسروں کو کسی انقلابی پیغام سے متاثر کرنے میں زیادہ اچھی طرح کامیاب ہو سکتے تھے۔

عرب عزم اور دھن کے پکے تھے۔ وہ اگر غلط روش پر چلتے تو پورے شرح صدر سے چلتے اور مزاحمتوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرتے لیکن ان میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ اگر انہیں راہ راست پر ڈال دیا جائے۔ تو

---

[1] روئیدگی سے خالی وادی کہنے سے زور اس پر دینا مطلوب ہوا کہ دنیوی لحاظ سے اس بے آب و گیاہ سرزمین نے' انسانوں کی ایسی فصل اگائی کہ لاکھوں فاقہ کشان روحانیت نے اس سے صحت و توانائی حاصل کی۔ (مرتب)

[2] ملاحظہ ہو: ارض القرآن از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم۔

پھر ان کے قدم کبھی نہ ڈگمگائیں۔ ایسے مختلف وجوہ ہیں' جو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ حضورؐ جہاں اپنی ذات میں اپنے مشن کیلئے بہترین داعی و قائد تھے۔ وہاں آپؐ کو بہترین انسانی مواد بھی فراہم کیا گیا۔ [1]

پھر یہ انسانی مواد ہر لحاظ سے ارتقاء کا قدم آگے بڑھانے کے لیے بے چین تھا۔ مذہبی لحاظ سے ذہین عناصر میں سخت اضطراب پیدا ہو چکا تھا۔ اور خاص لوگ حقیقت کی روشنی اور الہامی رہنمائی کے پیاسے تھے۔ سیاسی لحاظ سے مکہ اور مدینہ جیسے شہروں میں سیاسی ہیئت کی تشکیل کا آغاز ہو رہا تھا۔ اور کسی قدر جمہوری رنگ کے ساتھ ایک شہری ریاست کا بے ترتیب ساڈھانچہ بن رہا تھا۔ پھر عرب کے معاشی ذرائع کی محدودیت زور کر رہی تھی کہ آبادی اپنے ریگ زار سے باہر پھیلاؤ اختیار کرے۔ یوں بھی مشیت کا ایک تاریخی کلیہ یہ ہے کہ جب رائج الوقت تمدنوں میں بحران آجاتا ہے اور ان کی قیادتیں فاسد ہو جاتی ہیں۔ تو کسی نئی قوت کو بدویت کے گہوارے سے اٹھا کر میدان میں لایا جاتا ہے۔ جیسے کہ خدا کی مشیت نے فرعونی اقتدار کے مقابل میں بنی اسرائیل کو اٹھا کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا [2] ان سارے پہلوؤں سے اہل عرب کرہ ارضی کا وہ بہترین مواد تھے جس کے ذریعے زندگی کا اساسی اور ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جا سکتا تھا۔

انقلابی کلمہ حق:

پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اعتقاد' کسی نظریہ اور کسی نقشہ فکر کے بغیر اصلاح و تعمیر کا کام یونہی شروع نہیں کر دیا۔ محض ایک مبہم جذبہ نہ تھا' کوئی جنون خام نہ تھا' بلکہ حضورؐ کون و مکان کی عظیم ترین سچائی کی مشعل لے کے اٹھے۔ انتہائی حساس قلب کے ساتھ برسوں حضورؐ نے زندگی کے معمے پر کاوشیں کی تھیں' غار حرا کی خلوتوں میں مدتوں اپنے اندرون کا بھی مطالعہ کیا اور بیرونی عالم پر بھی غور کیا۔ تمدن کے صلاح و فساد کے اصولوں کو سمجھنے میں بھی دماغ کھپایا [3] لیکن عملی اقدام اس وقت تک نہیں کیا جب تک کہ علم الٰہی نے آپؐ کے قلب کو حقیقت سے منور نہیں کر دیا [4] اور سب سے بڑی سچائی پوری طرح آپؐ کے سامنے بے نقاب نہیں ہو گئی۔ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ کائنات کا ایک خدا ہے اور

---

1. ملاحظہ ہو: رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی' از ڈاکٹر حمید اللہ۔ باب: عرب اور مکے کا انتخاب۔ فصل عمرانی وجہ۔ نیز ملاحظہ ہو: سیرت النبیؐ ج ۴ باب: عربوں کے خصوصیات۔

2. القرآن: "اور ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو ملک میں بے زور ہیں اور انہیں سردار بنائیں اور انہیں اقتدار کا وارث ٹھہرائیں۔ اور ان کے قدم ملک میں اچھی طرح جما دیں' اور ان کے ذریعے فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو (وہ چیز) دکھا دیں' جس کا وہ خطرہ محسوس کرتے ہیں"۔ (القصص ۵' ۶)

3. عینی شرح بخاری میں ہے کہ حراء کی خلوتوں میں آپ کا مشغلہ غور و فکر اور عبرت اندوزی تھا۔

4. القرآن آیت "ووجدک ضالا فهدی" اور تمہیں راہ حق کے لیے سرگردان پا کر ہدایت کی راہ دکھائی۔ (الضحیٰ)

انسان اس کا بندہ ہے! یہی کلمۂ حق حضورؐ کے انقلاب کا بیج تھا۔ اس بیج سے صالح زندگی اور صحت مند تمدن کا وہ شجرۂ طیبہ نمودار ہو سکتا تھا۔ جس کی شان یہ ہے کہ اس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی ہیں۔ اور اس کی شاخیں فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ❶

حضورؐ کا کلمہ حد درجہ کا انقلابی کلمہ تھا۔ "لا الہ الا اللہ!" لفظی پہلو سے انتہائی مختصر' معنوی لحاظ سے بے حد عمیق۔ "ایک اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں۔ صرف وہی ایک الٰہ ہے"۔ الٰہ اس طاقت یا ہستی کو کہتے ہیں جس کی غلامی کی جائے' جس پر آدمی والہانہ طور پر فدا ہو۔ جس کی عظمت مان کر پرستش کرے۔ جس کی تحمید و تقدیس کرے۔ جس کے گن گائے۔ جس کی تسبیح کرے۔ جس کو نذر پیش کرے' جس سے بھلائی کی امیدیں لگائے اور جس کی گرفت سے ڈرے۔ جس سے نیکی کی جزا کا امیدوار ہو اور جس سے برائی کی سزا کا اندیشہ رکھے۔ جس کو اپنا مالک و مختار سمجھے' جس کو فرمانروا اور قانون ساز مانے' جس کے مطالبوں کو پورا کرے۔ اور جس کے منع کردہ امور سے باز رہے۔ جس کے دیئے ہوئے اصولوں کو بناء زندگی بنائے۔ جس کی مقررہ حدوں کی پابندی کرے۔ جس کے ضابطۂ حلال و حرام کو بے چون و چرا مانے' جس کو اپنے لیے سر چشمہ ہدایت تسلیم کرے' جس کی مرضی کے مطابق نظام حیات کی تشکیل کرے۔ جس کے پسندیدہ لوگوں کا احترام کرے اور جس کے مخالفوں کی مخالفت کرے۔ جس کے اشاروں پر تن من دھن کی بازی لگا دے اور جس کی رضا کو زندگی کا نصب العین قرار دے۔ الوہیت کا یہ وہ وسیع مفہوم تھا جو ایک لفظ میں پنہاں تھا ❷

الوہیت کے یہ حقوق خدائے واحد سے الگ کر کے بہت سی انسانی طاقتوں نے پارہ پارہ کر کے بانٹ رکھے تھے ❸ اور بے شمار آلہہ تمدن پر سوار تھے۔ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشیں' خاندان اور برادری کی رسمیں' نسلی' قومی اور قبیلوی وحدتوں کی روایات' جاگیردار اور پجاری طبقوں کی بالادستی' شاہی خاندانوں اور درباری اشراف کی کبر پسندی' یہ مختلف طبق بر طبق الوہیتیں تھیں۔ جن کے نیچے عام آدمی پس رہا تھا۔ "لا الہ الا اللہ" کی شاہ ضرب ان سب پر یک دم پڑتی تھی۔ اس کلمہ کا کہنے والا گویا یہ اعلان کرتا تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عظمت مجھے تسلیم نہیں' کسی کی بالادستی قبول نہیں' کسی کا بنایا ہوا ضابطہ و قانون منظور نہیں' کسی کے حاصل کردہ فوق الانسانی حقوق جائز نہیں' کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا جائے گا۔ کسی کی رضا جوئی اب نہ کی جائے گی اور کسی کے اشارہ ابرو پر اب زندگی کا نظام نہیں چلے گا' خدا کے سوا ہر دوسری خدائی توڑ دی جائے گی۔ یہ کلمہ گویا انسان کی سچی آزادی کا اعلان تھا"

لا الہ ضرب است و ضرب کاری است

---

❶ القرآن۔ ابراہیم ۲۴۔۲۵۔

❷ ملاحظہ ہو: قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں از مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ بحث الہ۔

❸ القرآن۔ آیت: وتقطعوا امرهم بينهم (الانبیاء۔ ۹۳) نیز آیت فتقطعوا امرهم بينهم زبرا (المومنون۔ ۵۳)

اس کلمہ کے دوسرے جز میں یہ اقرار شامل تھا کہ انسانی ہدایت اور تمدن کی اصلاح کے لیے واحد ذریعہ وہ سلسلۂ نبوت و رسالت ہے جو اللہ نے قائم کیا ہے' زندگی کا اصل علم وہ ہے جو وحی کے ذریعے آیا ہے اور اسی سے عقل انسانی کو سوچنے کے لیے رہنما اصول ملتے ہیں۔ پھر یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ و سلم اس سلسلۂ رسالت کی تکمیل فرمانے والے ہیں [1] اور اب زندگی کی رہنمائی اسی ہستی کے واسطے سے حاصل ہو سکتی ہے اور اسی ہستی کی قیادت میں قافلۂ انسانیت فلاح و ارتقاء کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

اس کلمے کی یہی اہمیت تھی کہ جس کی وجہ سے اس کا اقرار اسلام میں داخلہ کی شرط اول ٹھہرا [2] اس کلمے کو موذنوں نے بلند آواز سے پکارا' اس کلمے کو نماز میں شامل کیا گیا اسے افضل الذکر قرار دیا گیا [3] اور ہر لحاظ سے یہ کلمہ تحریک اسلامی کا طغریٰ یا سلوگن بن گیا۔

حضورؐ کا انقلابی کلمۂ حق جس دل میں اترا اس کی کایا پلٹ دی' جس زندگی میں داخل ہوا اس کا نقشہ بدل دیا اور اس بیج سے نئی انسانیت پیدا ہوئی اور نشوونما پانے لگی۔

اصلاح تمدن کے لیے حضورؐ کا نصب العین:

سیرت پاکؐ سے صحیح استفادہ کرنے کے لیے اس اہم سوال کا جواب ضرور سامنے ہونا چاہیے کہ حضورؐ کے پیش نظر تبدیلی کا دائرہ اور کام کا پیمانہ کیا تھا؟ تمدنی نظام میں حضورؐ کوئی جزوی اصلاح چاہتے تھے یا ہمہ گیر؟ دعوت مذہبی و اخلاقی تھی یا وہ سیاسی اہمیت بھی رکھتی تھی؟ بالفاظ دیگر تمدنی دائرہ میں نصب العین کیا تھا؟

اس سوال کا جواب خود قرآن کریم میں بڑی وضاحت سے موجود ہے اور مختلف پیرایوں میں تکرار سے اسلامی دعوت کا مدعا واضح کیا گیا ہے۔ یہاں ہم صرف دو آیات کو لیتے ہیں۔ ایک مقام پر جملہ انبیاء و رسل کی بعثت کا مقصود یوں بیان کیا ہے:۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات و انزلنا معھم الکتب والمیزان لیقوم الناس بالقسط و انزلـ

---

[1] القرآن۔ محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں' ہاں مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور پیغمبروں کے خاتمے کی مہر۔ ترجمہ (الاحزاب۔ ۴۰)

[2] حدیث "جس کسی نے گواہی دی کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور یہ کہ محمدؐ اس کے فرستادہ ہیں تو اللہ نے اس پر (دوزخ کی) آگ حرام کر دی"۔ ترجمہ۔ روایت عبادہ بن صامت مندرجہ صحیح مسلم۔ ملاحظہ ہو مشکوٰۃ جلد ۱' کتاب الایمان' نیز روایت ابن عمرؓ متفق علیہ۔ ملاحظہ ہو: مشکوٰۃ ج ۱ کتاب الایمان۔ "مجھے اس وقت تک لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ یہ گواہی نہ دیں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے' اور محمدؐ اللہ کے فرستادہ ہیں"۔

[3] وہ مختصر بیان جس سے کسی دین یا تحریک کے بنیادی پیغام کا تصور مل جائے۔ (مولف)

الحدید فیه باس شدید و منافع للناس

ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل دے کر جس مقصد کے لیے بھیجا ہے اور جس غرض کے لیے بھیجا ہے اور جس غرض کے لیے ان پر کتابیں نازل کی ہیں اور ان کو ضابطہ حق کی میزان عطا کی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں۔ اور لوہا اتارا جس سے ہتھیار بنتے ہیں اور اس میں لوگوں کے لیے اور بھی فوائد ہیں۔ (الحدید۔ ۲۵)

بات نہایت ہی صاف ہے کہ دعوت حق کا منشا انسانی زندگی کو نظام قسط کے سانچے میں ڈھالنا اور تمدن میں عملاً عدل و توازن پیدا کرنا ہے۔ اس آیت میں متصلاً آہنی اسلحہ کو بھی اسی مقصد کے لیے استعمال کرنے کا اشارہ موجود ہے۔ یعنی نظام حق کی اقامت، اس کے تحفظ اور اس کے فروغ کے لیے سیاسی اور فوجی قوت بھی ناگزیر ہے۔ ❶

خود محمد صلی اللہ علیہ و سلم کی بعثت کی غایت اور زیادہ صراحت سے بیان کی گئی اور وہ بھی ایک سے زیادہ بار بیان کی گئی۔ ملاحظہ ہو:

هوالذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله! .... ولو کره المشرکون ○ (الصف۔۹)

---

❶ آیت محولہ پر اسماعیل ابن کثیر دمشقی نے الحدید کے متعلق جو نوٹ لکھا ہے بڑا اہم ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۵۵۶۔ اس سلسلے میں وضاحت "غرض ہے کہ دلیل کے لحاظ سے دین کی حجت پوری ہو جانے کے بعد جو لوگ محض ہٹ دھرمی یا نسلی و قومی یا اندھے مذہبی تعصب کے تحت دین حق سے انکار اور عناد کا رویہ رکھتے ہیں اور عقیدہ و مذہب کے حق آزادی کو ماننے کے بجائے ظلم اور جنگ و جدل یا قتل مقاتلے پر اتر آتے ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے حدید یا اسلحہ کی قوت استعمال کرنے کا اذن حق تعالی نے دیا ہے۔ چنانچہ حضورؐ نبی مقدس ﷺ نے برسوں بینات اور استدلالات کو پیش کیا۔ پہلے تمسخر، ایذا رسانی اور ظلم و تشدد کی حد تک مخاطب گروہ کی طرف سے جواب ملا، پھر گھروں سے نکالنے، محصور رکھنے اور بالآخر قتل کرنے کے منصوبے بننے لگے تو ایسے ظلم و پیکار کے ماحول میں تلوار کو حرکت میں لانے اور گردنیں کاٹنے کا اذن ہوا۔

لفظ حدید عربی شعر و ادب میں بھی اسلحہ کے لیے استعمال ہوتا تھا، جیسے کہ جناب ابو طالب نے قصیدہ لامیہ میں فرمایا کہ بنهض قوم بالحدید الیکم۔ یعنی اے دشمنان محمدؐ! ایک گروہ تلواریں لے کر حضرت محمدؐ کی حمایت میں تمہارے خلاف اٹھ کھڑا ہو گا۔

اس سلسلے میں حضور پاکؐ کی احادیث پر بھی نگاہ رہنے۔ فرمایا: بعثت بالسیف۔ الخ (روایت ابن عمرؓ مسند احمد، ابو داؤد) مزید فرمایا۔ لقد جئتکم بالذبح۔ الخ ترجمہ: میں تم کو ہلاک کرنے آیا ہوں، یعنی میری بعثت تمہارے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ یہ باتیں شدید ترین مخالفین کو رو در رو کہیں۔ (سیرت ابن ہشام ج ا۔ ص ۲۱۰)

وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ضابطۂ ہدایت اور دین حق دے کر اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ ہر دین کے مقابلے میں اسے (پوری انسانی زندگی پر) غالب کردے!۔ اگرچہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو!

مدعا یہ کہ قریش اور عرب کے دوسرے مشرکین تو اپنے جاہلی نظام حیات کو برقرار رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔ اور جاہلیت کے خلاف جو آواز اٹھے گی وہ انہیں سخت ناگوار ہوگی۔ مگر ان کی ناگواریوں کی پروا کیے بغیر ان کے محاذِ مخالفت کو توڑ کر حضورؐ کو اقامت دین کرنا ہے۔ اور خدا کے ضابطۂ ہدایت کو عملاً جاری کرنا ہے۔ یہ مدعا اگر دعوت حق میں مضمر نہ ہوتا تو کشمکش اور جہاد اور ہجرت کے ابواب کہاں سے آتے؟ جان و مال کی قربانیاں کاہے کے لیے مانگی جاتیں؟ [1] کس مقصد کے لیے "کونوا انصار اللہ" کی [2] صلائے عام دی جاتی؟ کس غایت کے لیے "حزب اللہ" یا اللہ کی پارٹی تشکیل پاتی [3] کس نصب العین کے لیے شہداء [4] چنے جاتے؟ قرآن اور سیرت دونوں کا فہم دعوت حق کے منتہا کو ذہن نشین کیے بغیر ممکن نہیں رہتا۔

آیئے اب ہم خود حضورؐ کے ابواب سیرت کا مطالعہ کر کے اس نصب العین کا سراغ لگائیں' جو پیش نظر تھا!

حضورؐ نے بالکل ابتدائی مرحلے میں خاندان بنی ہاشم کی ایک ضیافت اپنا پیغام سنانے کے لیے منعقد کی تھی۔ اس میں اجمالاً بیان فرمایا تھا کہ یہ دعوت دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی ضامن ہوگی۔ بہت عرصہ بعد قریش کے ایک وفد سے گفتگو کرتے ہوئے اسی بات کو دوہرایا اور فرمایا:

فان تقبلوا منی ما جئتکم به فهو حظکم فی الدنیا و فی الاخرہ [5]

تم اگر میری وہ دعوت قبول کرلو' جسے میں پیش کر رہا ہوں تو اس میں تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری ہے۔

دنیا کی بہتری اور بھلائی کے سادہ الفاظ سے کسی جزوی بھلائی کو مراد لینا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ جزوی

---

[1] من جملہ آیات کثیرہ کے' ملاحظہ ہو آیت: وتجاهدون فی سبیل اللہ باموالکم و انفسکم (الصف۔ ۱۱)

[2] القرآن: اللہ کے مددگار بنو۔ (الصف۔ ۱۴)

[3] جان لو کہ خدا کا لشکر ہی فلاح پانے والا ہے۔ (المجادلہ۔ ۲۲)

پھر یقیناً اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔ (المائدہ۔ ۵۶)

[4] تم پر یہ (امتحان جنگ) وقت اس لیے لایا گیا ہے کہ اللہ (عملی اور واقعی صورت میں) دیکھنا چاہتا ہے کہ تم میں سچے مومن کون ہیں۔ (آل عمران۔ ۱۴۰)

[5] سیرت ابن ہشام ج ا۔ ص ۳۱۶۔

بھلائی تو ہر دعوت میں موجود ہوتی ہے۔ اور ہر نظام شر میں بھی کچھ اچھے پہلو ہوتے ہیں۔ مطلب زندگی کا سنور جانا اور تمدن کا درست ہو جانا' نظام قسط کا قائم ہو جانا ❶ اور حیات طیبہ ❷ کا حاصل ہو جانا ہے۔

پھر ابتدائی دور کشمکش میں ایک اور موقع پر حضورؐ سے گفت و شنید ہوتی ہے تو اس کے دوران میں آپؐ فرماتے ہیں۔

کلمة واحدة تعطونیھا تملکون بھا العرب و تدین لکم بھا العجم ❸

بس وہ ایک کلمہ ہے' اسے اگر مجھ سے قبول کر لو۔ تو اس کے ذریعے تم سارے عرب کو زیر نگین کر لوگے اور سارا عجم تمہارے پیچھے چلے گا۔

میلوں اور حج کے موقعوں پر قبائل کے کیمپوں میں جا جا کر حضورؐ نے یہی بات ہر سردار قبیلہ سے کہی۔ فرماتے مجھے ساتھ لے چلو' مجھے کام کرنے کا موقع دو' اور مجھ سے تعاون ❹ کرو یہاں تک کہ خدا کی طرف سے اس پیغام کو میں واضح کر دوں جس کے لیے مجھے مبعوث کیا گیا ہے ❺ چنانچہ بنو عامر کا سردار بحیرہ بن فراس حضورؐ کے پیغام' حضورؐ کی شخصیت اور حضورؐ کی والہانہ سرگرمی کار سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے کہا کہ اگر یہ نوجوان میرے ہاتھ آ جائے تو میں سارے عرب کو نگل جاؤں۔ اس کی نگاہیں حضورؐ کی دعوت کے منتہا اور کام کے نتائج تک پہنچ گئیں۔ اور اسی لیے اس نے ایک سودا گانٹھنا چاہا۔ حضورؐ کو وہ اپنا تعاون اس قیمت پر پیش کرتا ہے کہ جب آپؐ کو مخالفین پر غلبہ حاصل ہو جائے' تو آپؐ کے بعد اقتدار ہمیں حاصل ہو' ماننا پڑتا ہے کہ بحیرہ کی نگاہ بڑی دور رس تھی۔ اب اگر حضورؐ محدود مذہبی تصور کے محض واعظ اور مبلغ ہوتے اور کوئی سیاسی منتہا آپؐ کے سامنے سرے سے نہ ہوتا تو صاف صاف کہہ دیتے کہ بھائی میں تو ایک اللہ والا ہوں' مجھے اقتدار کے بکھیڑے سے کیا مطلب اور میرے کام میں حکومت اور قیادت کا کیا سوال! --- مگر حضورؐ کا جواب یہ نہ تھا' حضور نے یہ فرمایا "الامر الی اللہ' یضعہ حیث یشاء" اقتدار کا معاملہ خدا کے اختیار میں ہے۔ اور وہ جس کے قبضے میں چاہے گا رکھے گا اور سودا چکانے سے انکار کر دیا۔ ❻

---

❶ القرآن۔ الحدید ۲۵۔

❷ القرآن: من عمل صالحا من ذکر او انثی و ھو مومن فلنحیینه حیوة طیبة۔ (النحل۔ ۹۷)

❸ سیرت ابن ہشام ج ۳۔ ص ۲۷۔

❹ بنو عامر بن صعصعہ نے حج سے واپسی کے بعد حضورؐ کے منشاء کو یوں بیان کیا کہ وہ اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ ہم ان کا تحفظ کریں' ان کو استوار رکھیں اور انھیں اپنے ساتھ علاقے میں لے جائیں۔ ابن ہشام۔ ج ۲۔ ص ۳۴۔

❺ ترجمہ اصل الفاظ: تم میرے ساتھ ایمان لاؤ' میری تصدیق کرو' اور میری حفاظت کرو' یہاں تک کہ میں وہ سب کچھ واضح کر سکوں جس کے لیے اللہ نے مجھے مبعوث کیا ہے۔ (سیرت ابن ہشام۔ ج ۲' ص ۳۲)

❻ ملاحظہ ہو: سیرت ابن ہشام۔ ج ۲۔ ص ۳۴)

حضور کی دعوت کے سلسلے میں "عرب و عجم کے اقتدار" کا چرچا اتنا عام ہو گیا تھا، جیسے تحریک اسلامی کا طغریٰ (سلوگن) ہو۔ بچے بچے کی زبان پر یہ بات رہتی تھی، حتیٰ کہ مخالفین نے اسی کو بناء طنز بنا لیا تھا، اسلام کے سائے میں جو غلام اور غریب طبقوں کے نوجوان آ آ کے جمع ہو رہے تھے اور جن کو قریش تشدد کے کولہو میں پیل رہے تھے ان کو دیکھتے تو اشارے کر کر کے طنزاً کہتے کہ واہ کیا کہنے ہیں ان ہستیوں کے، یہ ہیں جو عرب و عجم کے حکمران اور سردار بننے والے ہیں۔

طنز و تمسخر اور مخالفت و مزاحمت کے سارے طوفان اٹھانے کے باوجود قریش کے سمجھ دار لوگ دلوں کی گہرائیوں میں یہ ضرور محسوس کرتے تھے کہ یہ دعوت کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ اس سے بڑے بھاری نتائج پیدا ہونے والے ہیں۔ ایک مرتبہ عتبہ کو سرداران مکہ نے حضورؐ سے گفت و شنید کے لیے بھیجا، عتبہ نے حکومت، مال و دولت اور دنیوی مفاد کی ہر ممکن پیش کش حضورؐ کے سامنے بیان کی کہ کسی طرح آپؐ اس انقلابی مہم سے باز آجائیں۔ حضورؐ نے جواب میں سورۃ حٰم السجدہ کی آیات سنائیں۔ عتبہ جو تاثر اس مجلس سے لے کر گیا۔ اس نے اس کے چہرے کا رنگ بدل دیا تھا۔ اس نے جا کر کہا، کہ اس دعوت میں تو ایک "نباء عظیم" مضمر ہے۔ یعنی ایک بہت بڑی تبدیلی کی حامل ہے کوئی انقلاب آنے والا ہے اور زندگی کا نقشہ زیر و زبر ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے مشورہ دیا کہ محمدؐ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ تم درمیان میں حائل نہ ہو، اگر اہل عرب نے اس شخص کا خاتمہ کر دیا۔ تو تم سستے چھوٹے اور اگر اسے غلبہ حاصل ہو گیا، تو "ملکہ ملککم و عزہ عزکم و کنتم اسعد الناس"۔ اس کی سلطنت تمہاری سلطنت ہو گی، اس کا اقتدار تمہارا اقتدار ہو گا اور تم لوگوں میں سب سے بڑھ کر معزز ہو جاؤ گے۔ یعنی عتبہ تک یہ حقیقت پا گیا کہ اس دعوت کے پردے میں ایک سلطنت چھپی ہوئی ہے۔ اور یہ اقتدار پر منتج ہو گی۔ تو آخر خود حضورؐ اور حضورؐ کے رفقاء اس منتہا سے کیسے غافل ہو سکتے ہیں۔ [1]

ایک موقع پر جب تشدد کی بھٹی خوب گرم تھی۔ حضورؐ کے رفقاء نے اپنا دکھڑا بیان کیا اور دعا کی درخواست کی۔ حضورؐ نے پہلے تو ان کو بتایا کہ اقامت دین کی جد و جہد کی گھاٹیاں کتنی کٹھن ہوتی ہیں۔ اور ماضی میں جن جوانوں نے یہ فرض ادا کیا ہے انہیں کیا کچھ پیش آیا۔ اور پھر پورے وثوق سے مژدہ سنایا، کہ "خدا کی قسم! اس مہم کو اللہ تعالیٰ ضرور اس کے مرحلہ تکمیل تک پہنچائے گا"۔ پھر اس مرحلہ تکمیل کی کیفیت بیان کی کہ:

"ایک سوار صنعا سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ ہو گا۔ [2]

یعنی ایک ایسا نظام عدل اور دور رحمت چھا جانے والا ہے اور ایسا پر امن ماحول قائم ہونے والا ہے کہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ا۔ ص ۳۱۳

[2] روایت ابی عبداللہ خباب بن الارت۔ مندرجہ بخاری۔ ملاحظہ ہو: ریاض الصالحین۔ باب الصبر۔

آج جہاں ڈاکے پڑ رہے ہیں اور قتل ہو رہے ہیں' جہاں آدم زاد دن دہاڑے زمین سے اچک لیے جاتے ہیں' ❶ اور جہاں کھلم کھلا عصمتیں لٹ رہی ہیں' وہاں مسافر کل تن تنہا اس سرزمین میں بے کھٹکے سفر کرے گا۔ کسی کو اس کی جان اس کے مال اور اس کی عزت سے تعرض کرنے کی جرات نہ ہو گی۔ ایک بار حضورؐ نے یوں بھی فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا کہ مکہ کو بے نگہبان کے قافلہ جایا کرے گا۔ ❷

نصب العین کا کتنا واضح اور اجلا تصور ہے!

ایک مرتبہ عثمان بن طلحہ کلید بردار کعبہ سے حضورؐ نے کعبہ کا دروازہ کھلوانے کیلئے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ بظاہر سخت ناساز گار مایوس کن حالات کے درمیان کھڑے ہو کر اس وقت حضورؐ نے فرمایا۔ کہ ایک دن آنے والا ہے جب کہ یہ کنجی خود ہمارے ہاتھ میں ہو گی اور ہم جسے چاہیں گے تفویض کریں گے۔ ❸

عقبہ کے مقام پر انصار مدینہ سے جو تاریخی بیعتیں واقع ہوئیں ان کا مطالعہ کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انصار تک نے اس سیاسی کشمکش کی وسعتوں کو سمجھ لیا تھا جو دعوت حق کے نتیجے میں نمودار ہونے والی تھی۔ اور جس کا فیصلہ آگے چل کر میدان جنگ میں ہونے والا تھا' ایک طرف انصار حضورؐ کی حمایت میں سرخ و سیاہ سے معرکہ آرا ہونے کا پیمان باندھ رہے ہیں اور اپنے اشراف کی ہلاکت اور مالوں کی تباہی کو لبیک کہتے ہیں۔ دوسری طرف حضورؐ سے عہد لیتے ہیں' کہ جب خدا آپؐ کو غلبہ عطا کر دے تو آپؐ ہمیں چھوڑ کر واپس نہ چلے آئیں گے۔ جنگ' قربانیاں' اور غلبہ ---- کیا ان تصورات میں وہ نصب العین نمایاں اور واضح نہیں ہے جو حضورؐ کے سامنے تھا۔ ❹

ہجرت کی راہ میں قدم رکھنے سے پہلے جو دعا آپؐ کو سکھائی جاتی ہے اس دعا کا تکمیلی جزء یہ ہے کہ واجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا ❺ حضورؐ کو خدا سے سلطان نصیر کی طلب سکھائی گئی ہے۔ یعنی مقدس مشن کی پشت پناہی کرنے کے لیے اقتدار اور فرمانروائی درکار تھی۔

جناب ابو طالب پر جب حضورؐ کی حمایت ترک کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا تو انہوں نے حضورؐ سے گفتگو

---

❶ القرآن۔ آیت : تخافون ان یتخطفکم الناس۔ ترجمہ: یعنی تم اس سے ڈرتے تھے کہ تم کو کوئی اچک نہ لے جائے۔ (الانفال ۲۶) و آیت و یتخطف الناس من حولھم۔ ترجمہ: ان کے گرد و پیش لوگ اچک لئے جاتے تھے۔ العنکبوت۔ ۶۷)

❷ سیرت النبیؐ شبلی نعمانی ج ۲۔ ص ۳۔

❸ المواہب اللدنیہ۔ قسطلانی۔ ج ۱۔ ص ۱۵۸۔

❹ ملاحظہ ہو: سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۰' ۵۱۔ یہ بات ابوالہیثم بن التیہان نے یوں کہی تھی کہ اے خدا کے رسولؐ یہود کے ساتھ ہمارے تعلقات ہیں' وہ ہمیں توڑنے پڑیں گے۔ پھر اگر ہم یہ کر چکیں اور خدا آپؐ کو غلبہ دے تو ایسا تو نہ ہو گا کہ آپؐ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم (اہل مکہ) کی طرف لوٹ جائیں۔ مزید ملاحظہ ہو: زاد المعاد۔ ج ۱' ص ۵۰' ۵۱

❺ القرآن۔ ترجمہ: اور اپنی طرف سے (عطا کردہ) اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔ (بنی اسرائیل۔ ۸۰)

کی کہ میرے لیے مشکلات نہ پیدا کرو۔ اس پر حضورؐ نے وہ مشہور جواب دیا تھا کہ خواہ یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب کیوں نہ لا کر رکھ دیں۔ میں اپنے مشن سے باز نہیں رہ سکتا۔ حضورؐ نے اپنی بات ان الفاظ سے مکمل کی تھی کہ:

.... یہاں تک کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس مشن کو غالب کر دے گا' یا اس میں اپنی جان کھپا دوں گا۔ [1]

یہاں لفظ لیتمہ' نہیں لیظھرہ استعمال فرمایا۔ جس میں کشمکش اور غلبے کا تصور شامل ہے۔ اور آگے کا جملہ بتاتا ہے کہ کشمکش بھی ایسی ہے جس میں جان جوکھوں میں ڈالنے کا معاملہ ہے۔

مدنی دور میں عدی بن حاتم حاضر ہو کر حضورؐ کی شخصیت کا جائزہ لیتا ہے۔ دعوت کی نوعیت سمجھنا چاہتا ہے۔ ناقدانہ نگاہ سے حضورؐ کے اطوار کی جانچ کرتا ہے اور دل میں متاثر ہوتا ہے۔ اس کے طرز فکر کا لحاظ کرتے ہوئے حضورؐ اس سے گفتگو کرتے ہوئے جہاں یہ بتاتے ہیں کہ عنقریب بابل کے سفید محلات اسلام کے تسلط میں ہوں گے' عنقریب یہاں دولت کی ریل پیل ہو گی اور عن قریب مسلمانوں کی عددی قوت بہت ہی بڑی ہو گی' وہاں اسے اسلامی نظام عدل کی اس شان سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ عنقریب تم دیکھو گے کہ ایک عورت قادسیہ سے اونٹ پر تن تنہا اس مسجد تک آنے کے لیے نکلی اور خیرو عافیت سے پہنچی۔

بظاہر بے سرو سامانی کے عالم میں سفر ہجرت کرتے ہوئے جو نگاہ سراقہ کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھ لیتی ہے' کیسے یہ کہتے ہو کہ اسے اپنی دعوت کے منتہا اور اپنے تمدنی نصب العین کا پتہ نہ تھا! کیسے یہ سوچتے ہو کہ اسلامی ریاست بطور مقصد کے پیش نظر نہ تھی۔ اس کے لیے تیاریاں نہیں کی گئیں' اس کے لیے جدو جہد عمل میں نہیں آئی اور وہ اچانک بطور انعام حضورؐ کی جماعت کو تفویض کر دی گئی۔ کہہ سکتے ہو تو یہ کہہ سکتے ہو کہ حکومت محض برائے حکومت مطلوب نہ تھی۔ کہہ سکتے ہو کہ حکومت ذاتی اقتدار اور دنیوی فوائد کے حصول کے لیے مطلوب نہ تھی۔ مگر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اقامت دین کے لیے' عدل کے قیام کے لیے' انسانیت کی نجات کے لیے' معاشرہ کی تعمیر کے لیے بھی حکومت مطلوب نہ تھی!

درحقیقت حضورؐ کے پیش نظر جہاں اعتقادی اور اخلاقی انقلاب تھا' وہاں پوری اہمیت کے ساتھ سیاسی انقلاب بھی تھا۔ جہاں فرد کی اصلاح مطلوب تھی' وہاں تمدن کی درستی بھی مقصود تھی۔ دوسرے لفظوں میں حضورؐ نے انسان کو ایک اجتماعی وجود کی حیثیت سے سامنے رکھا۔ اور اس کی اصلاح اس کے جملہ تمدنی رابطوں سمیت کرنا چاہی۔ حضورؐ نے انسان کو تمدن سے منقطع فرد کی حیثیت سے نہیں لیا اور اپنی دعوت اس کی نجی زندگی تک محدود نہیں رکھی۔ یہ حقیقت سامنے رکھیے اور حضورؐ کے نصب العین کی پوری وسعت کو ذہن نشین کر لیجیے تو پھر واقعات سیرت میں پورا تسلسل دکھائی دے گا اور ہر واقعہ اور اقدام اور

---

[1] سیرت ابن ہشام۔ ج ۱۔ ص ۲۷۸۔

تدبیر کی توجیہہ ہوتی جائے گی۔ بصورت دیگر نہ سیرت پاک کے اسرار کھلتے ہیں اور نہ قرآن مقدس کے نکات واضح ہوتے ہیں۔

ایک دین ----ایک تحریک !!

فلسفہ کا دائرہ ہمیشہ فکر کا دائرہ ہے۔ فلسفی کو عملی زندگی اور تاریخ کے مدو جزر سے براہ راست واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ واقعات و احوال سے نتائج تو نکالتا ہے۔ لیکن واقعات و احوال کا رخ بدلنے کے لیے کسی عملی جدو جہد میں حصہ نہیں لیتا۔ مذہب (مروجہ محدود معنوں میں) ذرا سا آگے بڑھتا ہے' وہ کچھ اعتقادات دینے کے ساتھ ساتھ فرد کو تمدن سے الگ کر کے اسے ایک اخلاقی تعلیم بھی دیتا ہے۔ لیکن مذہب کا راستہ نظام اجتماعی سے باہر باہر ہو کے گزرتا ہے اور وہ نہ سیاسی ہیئت سے کوئی تعرض کرتا ہے' نہ معاشرے کے ادارات میں کوئی جامع تبدیلی چاہتا ہے' اور نہ وقت کی قیادت کو چیلنج کرتا ہے۔ مذہب کی دعوت ہمیشہ وعظ کے اسلوب پر ہوتی ہے واعظ نے نرم و شیریں انداز سے کچھ نصیحتیں کیں اور اپنا رستہ لیا۔ اسے نہ اس کی فکر کہ اس کے مخاطب حالات کے کس قفس میں گرفتار ہیں۔ نہ اس کی پروا کہ کون سے طبقے اور عناصر کن اقدامات اور سرگرمیوں سے لوگوں کے ذہن و کردار کو کس رخ پر لے جا رہے ہیں' نہ اس طرف توجہ کہ روز مرہ حالات و واقعات کی رَو کیا اثرات چھوڑ رہی ہے نہ یہی کاوش کہ میرے وعظ کے حق میں اور اس کے خلاف کیا کیا افکار و نظریات کس کس جانب سے کتنا اثر ڈال رہے ہیں' نہ یہ پیش نظر کہ میرے مذہبی سانچے میں ڈھلنے والے متقی ترین افراد کیسے نظام تمدن کے پرزے بنے ہوئے ہیں۔ کوئی اجتماعی نصب العین نہیں ہوتا۔ تبدیلی کا کوئی منصوبہ نہیں ہوتا۔ کسی سیاسی اور قائدانہ بصیرت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ زندگی کے ایک چھوٹے سے خانے میں جزوی نیکی پیدا کرنے کے لیے جو کچھ بن آیا کر دیا اور بقیہ وسیع دائرہ میں بدی اپنا جھنڈا اطمینان سے لہراتی رہے۔ کسی اللہ والے کو اس سے کیا مطلب!

حضورؐ نہ تو ایک فلسفی تھے کہ محض چند اونچے اور گہرے خیالات دے دیتے' اور واقعاتی احوال سے تعرض نہ کرتے' اور نہ ایک واعظ تھے۔ جو اجتماعی فساد سے آنکھیں بند کر کے محض فرد کو مخاطب بناتے اور ٹھنڈے اور میٹھے وعظ سنایا کرتے اور نتائج پر سرے سے سوچا ہی نہ کرتے۔ انسانیت کے اس محسن نے پورے تمدنی شعور کے ساتھ حیات انسانی کی کامل تبدیلی پیش نظر رکھی۔ ان قوتوں اور عناصر کو پہچانا جو نظام حیات پر حاوی تھیں۔ اس قیادت کو زیر نظر رکھا جو جاہلی تمدن کی گاڑی چلا رہی تھی۔ اسے دلائل کے ساتھ دعوت بھی دی۔ اس پر تنقید بھی کی اور اسے چیلنج بھی کیا۔ تاریخ کے دھارے پر نگاہ رکھی۔ حالات و واقعات کی ایک ایک لہر پر توجہ دی۔ ہر واقعے کو قائدانہ بصیرت اور سیاسی شعور کے ساتھ دیکھا کہ وہ کس پہلو سے اصلاح کی مہم کے لیے مفید پڑتا ہے۔ اور کس پہلو سے خلاف جاتا ہے۔ معاشرے کے جملہ عناصر پر توجہ رکھی کہ دعوت کے لیے کس موقع پر کس سے کیا امیدیں کی جا سکتی ہیں۔ اپنی قوت اور رفتار کو

حریفوں کی قوت و رفتار کے مقابل میں ملحوظ رکھا۔ ہر اقدام کے لیے صحیح ترین وقت کا انتظار صبر سے کیا اور جب موزوں گھڑی آگئی تو جرأت سے قدم اٹھا دیا۔ رائے عام کے ہر مدو جزر کا کامل فہم حاصل کیا اور مخالفین کے ہر پروپیگنڈے کا مقابلہ کر کے ان کے اثرات کو توڑا۔ شعر اور خطابت کے مخالفانہ محاذ قائم ہوئے تو ان کے جواب میں اپنے شعراء' اور خطیبوں کو کھڑا کیا۔ اپنے اصولوں کی کڑی پابندی کی مگر آنکھیں بند کر کے نہیں' بلکہ احوال و ظروف کو دیکھا' وقت کی مصلحتوں کو سمجھا اور حکیمانہ نقطہ نگاہ اختیار کیا۔ جہاں قدم آگے بڑھانے کا موقع ملا۔ آگے بڑھایا۔ آگے بڑھنا جب موزوں نہ دیکھا تو قدم روک لیا۔ دو بلائیں سامنے آگئیں تو ایک سے بچ کر دوسری کا مقابلہ کیا۔ جنگی کارروائی کی ضرورت پڑی تو دریغ نہیں کی۔ مصالحت کی راہ ملی تو دست صلح بڑھا دیا۔ اور پھر کمال یہ کہ اس ساری جد و جہد میں خدا پرستی کی روح اور اخلاقی اقدار کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ ان کو مسلسل نشوونما دی۔ اس پورے نقشہ کار اور اس پورے طریق کار کو اگر قرآن اور سیرت پاک کے اوراق سے اخذ کر کے سامنے رکھیے تو وہ فرق بین طور پر معلوم ہو جائے گا۔ جو مذہب اور دین میں' وعظ اور انقلابی دعوت میں' انفرادی تزکیہ اور تمدنی تحریک میں ہوتا ہے۔

حضورؐ نے چونکہ ایک مکمل دین کو برپا کرنے کے لیے تحریک برپا کی تھی' اس لیے آپؐ نے ایک ایک کر کے سلیم الفطرت افراد کو تلاش کیا۔ پھر جس کے سینے میں بھی کلمۂ حق کی شمع روشن ہو گئی اسے ایک تنظیم میں پرو دیا۔ اس کی تربیت کی۔ اسے اپنے ساتھ کشمکش کی بھٹی میں ڈالا۔ اور پھر جس مرحلے میں جتنی منظم قوت حاصل تھی' اسے اپنی قیادت کے تحت جاہلی نظام کے خلاف معرکہ آراء کیا۔ فکری میدان میں بھی۔ سیاسی میدان میں بھی ---- اور بالآخر جنگ کے میدان میں بھی!

جو لوگ حضورؐ کے گرد جمع ہوئے ان کو آپؐ نے صوفی اور درویش نہیں بنا دیا' راہبوں اور جوگیوں کے نقشے پر نہیں ڈھالا' بدی سے بھاگنے اور غالب قوتوں سے خوف کھانے اور دولت و اقتدار سے مرعوب ہونے والی ذہنیت انہیں نہیں دی۔ وہ لوگ بھولے بھالے اور معذورانہ شان کے زہاد نہیں تھے۔ وہ جری اور بے باک' باشعور اور بصیرت مند' خود دار اور غیور' ذہین اور زیرک' فعال اور متحرک' پیش رو اور تیز گام تھے۔ وہ پادریوں اور سادھوؤں کے سے انداز نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ کار فرما بننے کی صلاحیتوں سے آراستہ تھے۔

بہترین فطرت کے لوگ بہترین تربیت پا کر' بہترین تنظیمی رشتے سے بندھ کر اور بہترین قیادت کے ہاتھوں میں جا کر ایک ناقابل شکست قوت بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے ایک چھوٹی سی اقلیت میں ہونے کے باوجود سارے عرب کی عظیم ترین اکثریت کو اپنے سائے میں لے لیا۔ جب مکہ میں جماعت اسلامی کی تعداد چالیس تھی تو مکہ اور ارد گرد کی آبادیوں میں اس تعداد نے ایک ہمہ وقتی مدو جزر پیدا کر دیا۔ اور پھر برسوں تک گھر گھر اور کوچہ کوچہ اگر کوئی موضوع گفتگو تھا تو وہ حضورؐ کی دعوت اسلامی تھی۔ مدینہ میں جا کر ابھی تحریک اسلامی کے علم برداروں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی کہ غیر مسلم اکثریت

کے علی الرغم اسلامی ریاست کی نیو ڈال دی گئی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کی جماعت کا طرز یہ نہیں تھا کہ پہلے سارا عربی معاشرہ اسلام قبول کر لے یا اس کی اکثریت کی اصلاح ہو جائے تو پھر جا کر نظام اجتماعی کی تاسیس کی جائے نہ نقطہ نظر یہ تھا کہ بس دعوت دیتے رہو' خیالات و اعتقادات کی اصلاح کرتے رہو' بالآخر ایک صالح نظام خود بخود برپا ہو جائے گا۔ یا بطور انعام اللہ تعالیٰ حق کو غلبہ دے دیں گے۔ وہاں تاریخ کی یہ حقیقت سامنے تھی' کہ عوام کی بھاری اکثریت حالت جمود میں پڑی رہتی ہے' اور معاشرے کا ایک قلیل عنصر فعال ہوتا ہے۔ جس میں سے ایک حصہ اصلاح یا انقلاب کی دعوت کا علمبردار بنتا ہے اور ایک حصہ مزاحمت کرتا ہے۔ اصل بازی اسی فعال عنصر کی دونوں صفوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اور اس کا جب فیصلہ ہو جاتا ہے تو پھر عوام خود بخود حرکت میں آتے ہیں۔ یہاں یہ شعور پوری طرح کار فرما تھا کہ عوام کے راستے میں جب تک ایک فاسد قیادت حائل رہتی ہے' وہ نہ کسی دعوت کو بڑے پیمانے پر قبول کر سکتے ہیں نہ اپنی عملی زندگیوں میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔ خود دعوت پر لبیک کہنے والوں کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ فاسد قیادت کے بنائے ہوئے گندے ماحول میں اپنی زندگی کو حد کمال تک سنوار سکیں۔ بلکہ الٹا اگر تبدیلی برپا ہونے میں بہت زیادہ تاخیر ہو تو بسا اوقات اس مقام کو برقرار رکھنا بھی کٹھن ہو جاتا ہے جس پر داعیان حق لمبی محنت سے پہنچتے ہیں۔ کیونکہ مخالف حالات پیچھے دھکیلنے کے لیے پورا زور صرف کر رہے ہوتے ہیں۔ پس کسی اجتماعی تحریک کے لیے راہ عمل یہی ہوتی ہے کہ وہ معاشرے کے فعال عنصر میں سے سلیم الفطرت افراد کو چھانٹ کر جتنی زیادہ سے زیادہ قوت جمع کر سکتی ہو اسے کشمکش میں ڈال کر مقابل کی قیادت کا محاذ توڑ دے۔ تاریخ گواہ ہے کہ تمام انقلابات فعال اقلیتوں کے ہاتھوں واقع ہوئے ہیں۔ معاشرے کے فعال عنصر میں سے تعمیر و اصلاح کی دعوت چونکہ نسبتاً زیادہ سلیم الفطرت افراد کو کھینچتی ہے' ان میں ایک مثبت جذبہ بیدار کرتی ہے' اور ان کی تربیت کر کے ان کی اخلاقی قوت کو بڑھا دیتی ہے' اس لیے مقابل میں رہ جانے والا طبقہ اثر و اقتدار' مال و جاہ اور کسی قدر عددی کثرت رکھنے کے باوجود مقابلہ میں زک اٹھاتا ہے۔ معرکہ' بدر اس کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔ پس جب حضورؐ کے گرد عربی معاشرہ کے فعال عنصر میں سے سلیم الفطرت افراد کی اتنی تعداد جمع ہو گئی کہ وہ اخلاقی قوت سے سرشار ہو کر جاہلی قیادت اور اس کے حامیوں کا مقابلہ کر سکے تو حضورؐ نے اپنے سیاسی نصب العین کی طرف کوئی ضروری قدم اٹھانے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔

فتح مکہ کا اصل مفہوم یہی ہے کہ اس موقع پر جاہلی قیادت کا پوری طرح خاتمہ ہو گیا اور اس رکاوٹ کے ہٹتے ہی عوام صدیوں پرانے جوئے سے آزاد ہو کر دعوت حق کو لبیک کہنے کے لیے از خود آگے بڑھنے لگے۔

تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں ہے کہ فاسد قیادت کے زیر سایہ کوئی نظام فلاح پنپ سکا ہو اور بغیر سیاسی کشمکش کے، محض وعظ و تبلیغ اور انفرادی اصلاح کے کام سے اجتماعی انقلاب نمودار ہو گیا

ہو۔ ورنہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں خلافت راشدہ کے بعد وعظ و ارشاد' تبلیغ و تذکیر' تعلیم و تزکیہ کے عنوان سے عظیم الشان مساعی' مساجد' مدارس اور خانقاہوں کے ادارات کے تحت عمل میں آتی رہی ہیں اور آج بھی علماء و صوفیا' اصحاب درس اور ارباب تصانیف زبان و قلم سے جتنا کام کر رہے ہیں اس کی وسعت حیران کن ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ اس حدِ مطلوب تک افراد کا تزکیہ ہو سکا ہے اور نہ کبھی معاشرہ کی اتنی اصلاح ہو سکی ہے جس کے نتیجے میں اجتماعی نظام بدل جائے۔ اور محمدؐ رسول اللہ کا انقلاب دوبارہ رونما ہو سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ طرز فکر اور نقشہ کار اور نظریہ انقلاب میں کوئی بڑا جھول ہے' وہ جھول یہی ہے کہ قیادت کی تبدیلی کے لیے سیاسی کشمکش کیے بغیر افراد کو نظام تمدن سے منقطع کر کے دعوت کا مخاطب بنایا جاتا رہا ہے۔

لوگ جب یہ کہتے ہیں کہ دین کی اقامت اور اسلامی نظام کا برپا ہو جانا تو اصل مطلوب نہ تھا۔ اور یہ محض انعام خداوندی کے طور پر یکایک بیچ میں آنمودار ہوا تو وہ حضورؐ کے کارنامے اور آپؐ کی جدوجہد کی سخت ناقدری کرتے ہیں اور حضورؐ کی قائدانہ بصیرت اور سیاسی عظمت پر غبار ڈال دیتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ اس ہستی نے کتنی تگ و دو کر کے مدینہ کے مختلف عناصر کو چند ماہ کے اندر اندر دستوری معاہدہ کے تحت جمع کیا۔ کس عرق ریزی سے اردگرد کے قبائل سے حلیفانہ تعلقات قائم کیے۔ کس مہارت سے مٹھی بھر مسلمانوں کے بل پر ایک مضبوط فوجی نظام اور طلایہ گردی کا سلسلہ قائم کیا۔ کس کاوش سے قریش کی تجارتی شاہراہ کی ناکہ بندی کر لی۔ کس عزیمت کے ساتھ قریش کے خنجر براں کا مقابلہ کیا۔ کس زیرکی سے یہود اور منافقین کی سازشوں کی کاٹ کی۔ کس مہارت سے حدیبیہ کا معاہدہ باندھا۔ کس ہمت سے یہود کے مراکز فتنہ کی بیخ کنی کی۔ کس بیدار مغزی کے ساتھ بے شمار شرپسند قبائل کی علاقائی شورشوں کی سرکوبی کی۔ اس سارے کام میں قائدانہ بصیرت' سیاسی مہارت اور مضبوط حکمت عملی کے جو حیرت ناک شواہد پھیلے ہوئے ہیں ان سے یہ لوگ کس طرح صرف نظر کر لیتے ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ سب کچھ خدا کا انعام تھا بالکل ٹھیک ہے لیکن اس معنی میں کہ ہر بھلائی خدا کا عطیہ و انعام ہوتی ہے تاہم انسانوں کو کوئی انعام ملتا جبھی ہے کہ وہ اس کے لیے ضروری محنت' عقل و بصیرت کے ساتھ کر دکھائیں۔ اقامت دین کو خدا کا انعام کہہ کر اگر کوئی شخص رسولؐ خدا کی جدوجہد' جانفشانی' حکمت و بصیرت اور سیاسی شعور کی نفی کرنا چاہتا ہے تو وہ بڑا ظلم کرتا ہے۔

بدقسمتی سے حضورؐ کے کارنامے کا سیاسی پہلو اتنا اوجھل رہ گیا ہے کہ آج حضورؐ کی دعوت اور نصب العین کا صحیح تصور باندھنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس پہلو کو جب تک پوری سیرت میں سامنے نہ رکھا جائے وہ فرق سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا' جو محدود مذہبیت اور دین کے وسیع تصور میں ہے۔ حضورؐ پورا دین لائے تھے۔ حق کی بنیادوں پر ساری زندگی کا نظام قائم کرنے آئے تھے۔ خدا کے قوانین کو عملاً جاری کرنے آئے تھے۔ اس لیے ہمیں یہ شعور ہونا چاہیے کہ حضورؐ جامع اور وسیع معنوں میں تمدنی اصلاح اور انسانیت کی تعمیر نو

کی تحریک چلانے آئے تھے۔ اور اس تحریک کو چلانے کے لیے بہترین قائدانہ بصیرت اور اعلیٰ درجہ کے سیاسی شعور سے آپؐ کی ہستی مالا مال تھی۔ جس طرح کسی اور پہلو میں حضورؐ کا کوئی ہمسر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح سیاسی قیادت کی شان میں بھی آپؐ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ جس طرح آپؐ زندگی کے ہر معاملہ میں اسوہ و نمونہ ہیں۔ اسی طرح سیاسی جد و جہد کے لیے بھی آپؐ ہی کی ذات ہمیشہ کے لیے اسوہ و نمونہ ہے۔

حضورؐ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے نیکی کی دعوت دی۔ نیکی کے غلبہ کے لیے جد و جہد کی۔ اور ایک مکمل نظام قائم کر دیا۔ یہ کام مذہب کے محدود تصور کے دائرے میں سما نہیں سکتا۔ یہ دین تھا' یہ تحریک تھی!!

زندگی کی ہم آہنگی:

محسن انسانیتؐ کی مقدس تحریک نے انقلاب لا کر جو نظام زندگی قائم کیا اس کی امتیازی شان یہ تھی کہ اساسی کلمہ کی روح زندگی کے تمام شعبوں میں یکساں سرایت کیے ہوئے تھی۔ پورے تمدن میں ہم آہنگی تھی۔ سارے ادارے یک رنگ تھے۔ جس خدا کی عبادت مسجد کی چار دیواری میں ہوتی اسی کی اطاعت کھیت اور بازار میں بھی ہوتی تھی۔ جو قرآن نماز میں پڑھا جاتا تھا اسی قرآن کے قانون کے ذریعے عدالت میں معاملات کے فیصلے ہوتے تھے۔ جو اخلاقی اصول گھروں کی محدود فضاؤں میں کار فرما تھے وہی بین الاقوامی دائرۂ ربط میں بھی چھائے ہوئے تھے۔ جن صداقتوں کی تعلیم منبر سے دی جاتی تھی انہی صداقتوں پر حکومت کا نظم و نسق چلتا تھا۔ جو اعتقادات افراد کے ذہن نشین کرائے جاتے تھے وہی اعتقادات اجتماعی ہیئتوں پر بھی غالب تھے۔ جو طرز فکر نظام تعلیم میں کام کرتا تھا اسی کے مطابق پوری ثقافت تشکیل پا رہی تھی۔ جو رضائے الٰہی نماز روزہ میں مطلوب تھی' وہی میدان جنگ میں تیر کھاتے اور تلوار چلاتے ہوئے بھی مطلوب تھی۔

یہ ایک ایسا نظام تھا جس میں پوری انسانی زندگی ایک ہی خدائی ضابطہ ہدایت کے تحت تھی۔ مختلف دائروں میں مختلف اقتدار اور ضابطے نہیں چلتے تھے۔ اس نظام میں تضاد نہ تھے۔ اس کے اجزاء آپس میں ٹکرانے والے نہ تھے۔ اس کے مختلف عناصر میں الجھاؤ نہ تھا۔ اس میں کوئی پیوند کاری نہیں کی گئی تھی اور اسے معجون مرکب نہیں بنایا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تحت انسان نے جس رفتار سے ترقی کی اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

انقلاب کی روح:

انسانیت کی شاید سب سے بڑی بد نصیبی یہ رہی ہے کہ جس کسی کو بھی برسر قوت آنے کا موقع تاریخ میں ملا ہے۔ تلوار کے زور سے' سازش کے بل پر' جمہوری انتخاب کے راستے سے یا کسی اتفاقی حادثے کے تحت ---- اسی کو اپنے متعلق یہ زعم ہو گیا ہے کہ وہ نوع انسانی کا معلم اور زندگی کا مصلح بھی ہے۔ ایسے

مصلحین و معلمین کے ہاتھوں میں جب اقتدار کا لٹھ آجاتا ہے تو وہ عقل کل بن بیٹھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بہترین مفکر سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ ہر سرچشمہ علم سے بے نیاز ہو کر اور معاشرہ کے بہترین زیرک اور حساس عناصر کو برطرف رکھ کر اندھا دھند محیر العقول اقدامات کرنے لگتے ہیں جن میں سے ہر اقدام ایک خوف ناک حادثہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ تشدد کے ہتھیاروں سے انسان کو انسان بنانا چاہتے ہیں اور زندگی کی پیٹھ پر کوڑے برسا برسا کر اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ بسا اوقات اصلاح و انقلاب کے ایسے مدعیوں کو سرے سے انسان کی فطرت کا پتہ نہیں ہوتا۔ انھیں زندگی کے بناؤ اور بگاڑ کے موجبات کا مبتدیانہ علم بھی نہیں ہوتا۔ انہوں نے کبھی یہ کاوش ہی نہیں کی ہوتی کہ انسان کو انسانیت سکھانے کے صحیح طریقے کیا ہیں اور بگاڑ کا سرچشمہ کہاں واقع ہے اور اس کی اصلاح کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے۔ اور اس کی تکمیل کہاں جا کے ہوتی ہے۔ وہ سابق تجربات سے فائدہ اٹھائے بغیر اپنا تجربہ الف با سے شروع کرتے ہیں۔ وہ مشورہ و تنقید کے دروازے بند کر دیتے ہیں تاکہ ان کا کوئی خیر خواہ اور انسانیت کا کوئی محب ان کے مہلک تجربہ کی تکمیل میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ ان کے پاس ہر درد کی ایک ہی دوا ہوتی ہے۔ جبر و تشدد! سخت ترین قوانین بنانا' نت نئے کڑے احکام جاری کرنا' عوام الناس کے چاروں طرف قدغنیں کھڑی کر دینا اور پھر ان کی تواضع بار بار اپنے غیظ و غضب کے تازیانے سے کرتے رہنا۔

محسنؐ انسانیت نے جو انقلاب برپا کیا اس کی روح تشدد کی روح نہ تھی' محبت و خیر خواہی کی روح تھی۔ حضورؐ انسانیت کے لیے حد درجہ رحم دل تھے اور ابنائے آدم کے ساتھ آپؐ کو سچا پیار تھا۔ اپنی دعوت کی نوعیت کو آپؐ نے مثال دے کر سمجھایا۔ کہ تم لوگ پروانوں کی طرح آگ کے گڑھے کی طرف لپکتے ہو اور میں تم کو کمر سے پکڑ پکڑ کر بچانے کی کوشش کر رہا ہوں[1] قرآن نے اسی لیے آپؐ کو پیغامبر رحمت قرار دیا۔ ذرا اس حقیقت پر غور کیجیے کہ وہ ہستی اتنا عظیم انقلاب لاتی ہے مگر تشدد سے کام لینے کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی' مدینہ حضورؐ کی دس سالہ زندگی میں سنگین درجے کی ایمرجنسی کے زیر سایہ رہا ہے۔ ہر آن حملے کا خطرہ رہتا۔ قریش نے تین بار بڑے بڑے حملے کیے' چھوٹی چھوٹی جھڑپوں اور سرحدی آویزشوں کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ متفرق قبائل مدینہ پر دھاوا بولنے کے لیے کبھی ادھر سے سر اٹھاتے کبھی ادھر سے' بار بار طلایہ گردی کرنے اور فتنوں کی سرکوبی کے لیے مدینہ سے فوجی دستوں کی ترسیل ہوتی۔ راتوں کو فوجی پہرہ لگایا جاتا۔ غرضیکہ ایک جنگی کیمپ کی سی زندگی تھی۔ اس پر مستزاد یہود اور منافقین کی سازشیں تھیں ـــــ جنگ کی سازشیں اسلامی معاشرہ کو پھاڑ دینے اور مختلف عناصر کو ٹکرا دینے کی سازشیں' حضورؐ کی قیادت کو ناکام کرنے کی سازشیں' اور پھر اس زندگی بخش ہستی کو قتل کر دینے کی سازشیں' ایمرجنسی کا اس سے بڑھ کر اور کیا عالم ہو سکتا ہے۔ مگر حضورؐ نے نہ کبھی اپنے لیے کوئی

---

[1] ریاض الصالحین' باب السادس عشر۔ روایت حضرت جابرؓ۔

مستبدانہ اختیار حاصل کیا' نہ کوئی ہنگامی آرڈی نینس جاری کیا۔ نہ کوئی جابرانہ ایکٹ نافذ کیا' نہ کسی ایک فرد کو نظر بندی میں ڈالا۔ نہ کوئی ہنگامی عدالتیں بٹھائیں' نہ تازیانے برسا کر لوگوں کی کھال ادھیڑی۔ نہ جرمانے اور تاوان ڈالے' نہ کسی شہری پر کوئی بار خدائی قانون سے تجاوز کر کے ڈالا' نہ اختلاف اور تنقید کا حق سلب کیا۔ نہ کسی کی زبان بندی کی اور نہ کسی پر پابندی عائد کی۔ حتیٰ کہ عبداللہ بن ابی جیسے فتنہ پرداز تک سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ سارا دار و مدار اپنی دعوت کی صداقت اور اپنے کردار کی پاکیزگی پر رکھا۔ کبھی کسی پر دھونس نہیں جمائی' کبھی رعونت نہیں دکھائی۔ کبھی کسی کی انسانیت کی تحقیر نہیں کی۔ کبھی اکڑ فوں سے کام نہیں لیا بلکہ دوسروں کی ---- جو درحقیقت کمزور اور بے بس تھے ---- رعونتوں کو صبر سے برداشت کیا۔ یہی وجہ تھی کہ دشمنوں کے دل مسخر ہو جاتے تھے۔ ساتھ آنے والے دیدہ و دل فرش راہ کرتے تھے۔ مخالفت کرنے والے اپنے آپ کو پست اور ذلیل محسوس کرتے تھے۔ اور پھر جب حضورؐ کی صداقت و شرافت کے آگے سر جھکا دیتے تھے تو ان میں ایسی تبدیلی آتی تھی کہ گویا کایا کلپ ہو گئی۔

حضورؐ کے سینے میں خدا کی جو محبت کار فرما تھی اسی کا دوسرا روپ یہ تھا کہ حضورؐ انسانیت سے گہری محبت رکھتے تھے۔ اس محبت انسانی کا اگر ہم اندازہ کرنا چاہیں جو محسن انسانیتؐ کے سینے میں کار فرما تھی۔ تو ہم اس واقعہ سے کر سکتے ہیں کہ وہی مکہ جس کے باسی جنگ کی تلوار لیے آپؐ کے مقابلے میں کھڑے تھے۔ اس پر قحط کا زمانہ آتا ہے تو آپؐ غلہ کی رسد جاری کراتے ہیں۔ اور اسی شہر کے غرباء کے لیے پانچ سو اشرفی نقد بھجواتے ہیں۔ آپؐ کی محبت انسانی کا اندازہ ہم اس واقعہ سے بھی کر سکتے ہیں کہ بدر کے قیدیوں کی کراہیں گوش مبارک تک پہنچیں تو حضورؐ کی نیند اڑ گئی۔ اور آپؐ اس وقت تک آرام سے سو نہ سکے۔ جب تک کہ ان کے بندھن ڈھیلے کر کے انہیں آرام نہ پہنچا دیا گیا۔ آپؐ کی محبت انسانی کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ بنو ہوازن کے چھ ہزار قیدی ایک اپیل پر حضورؐ کے اشارے سے رہا کر دیے جاتے ہیں۔ اور پھر آپؐ کی محبت انسانی کا اندازہ کرنا ہو تو فتح مکہ کے موقع پر اس کا عظیم الشان مظاہرہ دیکھیے۔ انسانیت کا محسنؐ مکہ میں کامل فاتحانہ شان سے داخل ہوتا ہے۔ اور اس کے خلاف بیس برس تک لڑنے والے دشمن اس کے سامنے بے بس ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ایک ایک واقعہ کا انتقام لیتا۔ قتل عام کا حکم جاری کرتا۔ اور خون کی ندیاں بہا دیتا۔ کشتوں کے پشتے لگائے بغیر نہ ٹلتا۔ وہ لوگ عرفاً' قانوناً اخلاقاً ہر لحاظ سے مجرم تھے اور دین و سیاست، دونوں پہلوؤں سے گردن زدنی۔ مگر اس لمحے حضورؐ کی محبت انسانی ابھرتی ہے اور قریش کے مظالم کی ساری تاریخ پر خط عفو پھیر کر کہتی ہے کہ "لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء" !! [1] الٹا ان کی تالیف قلب کے لیے حضورؐ ان کو مال و دولت عطا کرتے ہیں اور ان کو ذلیل اور مسترد کرنے کے بجائے ان کو ذمہ داریاں سونپتے ہیں اور گلے لگا لیتے ہیں۔ حضورؐ پر یہ

---

[1] ترجمہ: آج تم پر کوئی گرفت نہیں' جاؤ تم آزاد ہو۔

حقیقت روشن تھی کہ جو انقلاب انتقام پر اتر آتا ہے۔ وہ اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ اور جو انقلاب عفو اور دلبری سے کام لیتا ہے وہ دشمنوں کو رام کرتا ہے اور مزاحمت کرنے والوں کو خادم بنا لیتا ہے۔

یہ قریش کا ذوق تشدد تھا جس کے تحت انہوں نے نبی رحمتؐ کو مجبور کر دیا کہ ان کی تیغ خون آشام کی دھار توڑ دی جائے اور جنگ کے سر آپڑنے پر حضورؐ نے نظام حق کے بچاؤ میں پوری طرح بازی لگا دی۔ مگر حضورؐ کی محبت انسانی نے جنگی پالیسی اور دفاعی تدابیر ایسی نکالیں کہ کم سے کم جانی نقصان ہو اور کم سے کم خون بہے' نیز حضورؐ نے کڑا اہتمام کیا کہ میدان جنگ میں بھی انسانیت کا احترام برقرار رہے۔

محبت انسانی کی ایسی روشن اور وسیع مثال کسی دوسرے انقلاب میں نہیں ملتی۔ حضورؐ کا انقلاب خالص تعلیمی انقلاب تھا۔ اور اس کی اساس بنی آدم کی خیر خواہی پر تھی۔

نیا انسان:

بے شمار اصلاحی اور تعمیری اور انقلابی تحریکیں ہمارے سامنے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک نے انسان کو جوں کا توں رکھ کر خارجی نظام کو بدلنے کی تدبیریں کی ہیں۔ لیکن ہر وہ تبدیلی حقیقی مسائل حیات کو حل کرنے کے لحاظ سے بالکل رائیگاں رہی جو انسان کو اندر سے نہیں بدل سکی۔ حضور اکرمؐ کے کارنامہ کا مبہوت کر دینے والا یہ پہلو بڑا ہی اہم ہے کہ انسان اندرون سے بدل گیا اور یکسر بدل گیا۔ انسانی روپ میں جو خواہش پرست حیوان پایا جاتا تھا کلمہ حق کے اثر سے وہ بالکل مٹ گیا اور معاً اس کی راکھ سے خدا پرست اور بااصول انسان ابھر آیا۔ اس نئے انسان کے کردار کی درخشانی دیکھئے تو آنکھوں میں چکا چوند آجاتی ہے۔ حضرت عمرؓ جیسا مکہ کا ایک تند خو' لاابالی نوجوان بدلا تو کہاں پہنچا! فضالہ میں تبدیلی آئی تو کس شان سے آئی! ذوالبجادین کو دیکھئے کہ کس طرح دولت و آسائش کو لات مار کے درویشانہ زندگی اختیار کرتا ہے! حضرت ابوذرؓ کو لیجئے کہ انقلابی جذبہ ہے کہ کعبہ میں کھڑے ہو کر جاہلیت کو چیلنج کیا۔ اور خوب مار کھائی۔ کعبؓ بن مالک کا کردار دیکھئے' ابو خیثمہؓ کا رنگ ملاحظہ فرمایئے۔ لبینہؓ اور سمیہؓ جیسی کنیزوں کی انقلابی شجاعت و عزیمت پر نگاہ ڈالیے' ماعز بن مالک اسلمی اور غامدیہ پر توجہ کیجئے۔ نجاشی کے دربار میں جعفرؓ طیار کی جرأت سے سبق لیجئے۔ ایرانی سپہ سالار کے دربار میں ربعیؓ بن عامر کی شان استغنا سے روح اخذ کیجئے ----- اور تاروں کے اس جھرمٹ میں سے کون ہے۔ جس کا ایمان لمعہ افگن نہیں ہے۔

ان ہستیوں سے وہ معاشرہ بنا اور ایسے قائدین اور کارکنوں کے ہاتھوں وہ نظام حق چلا جس نے اگر بندش شراب کی منادی کی تو ہونٹوں سے لگے ہوئے پیالے فوراً الگ ہو گئے اور بہترین شرابوں کے مٹکے گلیوں میں لنڈھا دیئے گئے۔ جس نے اگر عورتوں کو سر و سینہ ڈھانپنے کا حکم دیا تو حکم ملتے ہی کسی تاخیر کے بغیر دوپٹے اور اوڑھنیاں بنالی گئیں؛ جس نے اگر جہاد کے لیے پکارا تو نو عمر لڑکے تک ایڑیوں پر کھڑے ہو ہو کر یہ کوشش کرتے دکھائی دیئے کہ وہ لوٹائے جانے سے بچ جائیں۔ جس نے اگر چندہ طلب کیا تو جہاں

حضرت عثمانؓ جیسے دولت مند تاجروں نے سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطاریں لا کر کھڑی کر دیں اور حضرت ابو بکرؓ جیسے فدائین نے گھر کی ساری متاع تحریک کے قدموں میں ڈال دی۔ وہاں ایسے مزدور بھی تھے جنہوں نے دن بھر کی مزدوری سے حاصل شدہ کھجوریں جنگی فنڈ میں دے کر دامن جھاڑ دیا۔ جس نے اگر مہاجرین کی بحالی کے لیے انصار کو پکارا تو انھوں نے اپنے مکان اور کھیت اور باغ آدھوں آدھ بانٹ دیئے اور اخوت کا ایک بے مثل سماں پیدا کر دیا۔ جس نے اگر عہدوں کو خدمت کی روح سے بالاتر کر کے سول سروس کے لیے کارکن طلب کیے تو ایک درہم روز کے قلیل معاوضے پر گورنری کے فرائض انجام دینے والے حکام دنیا کے سامنے نمودار ہوئے۔ جس نے اگر مال غنیمت کو سپہ سالار کے پاس جمع کرانے کا حکم دیا' تو اس شان سے تعمیل کی گئی کہ فوج ایک ایک سوئی اپنے افسر کو پیش کر دیتی تھی۔ اور یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں درخشاں رہے گا۔ کہ مدائن کے اموال کا ایک قیمتی حصہ عامر نامی سپاہی کے ہاتھ آتا ہے۔ اور بغیر اس کے کہ کسی کو بھی اس خزانہ زر و جواہر کا علم ہو' وہ رات کی تاریکی میں چپکے سے اپنے سردار تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ ہستیاں تھیں جنہوں نے نیکی کا ایسا ماحول تیار کیا کہ جس میں شاذ و نادر ہی جرائم ہوتے تھے اور حضورؐ کے پورے دہ سالہ دور میں گنتی کے مقدمات عدالتوں میں آئے۔ یہ نیکی کا ایسا ماحول تھا جس میں کوئی سی آئی ڈی نہیں رکھی گئی۔ بلکہ لوگوں کے ضمیر ہی ان کے پاسبان اور نگران بن گئے۔

یہ تھا وہ انقلاب جس نے باہر کے نظام کے ساتھ ساتھ اندر سے انسانی قلب و ذہن کو بدلا اور نیا کردار پیدا کر دیا۔ اسی لیے وہ حقیقی اور بنیادی مسائل حیات کو حل کرنے میں کامیاب ہوا اور اس کے ذریعے وقت کے تمدنی بحران میں راہ نجات پیدا ہوئی۔

محسن انسانیتؐ کا عظیم ایثار:

یہ انقلاب اس لحاظ سے بھی لاجواب ہے کہ اسے برپا کرنے والے نے اگرچہ بے انتہا قربانیوں سے اس کی تکمیل کی' لیکن اس نے کوئی صلہ اور عوضانہ نہیں لیا۔ اپنا سب کچھ انسانیت کی بھلائی کے لیے دے دیا۔ اس نے اتنا کچھ بھی نہیں لیا جتنا اگر لیا جاتا تو "عقلاً" "شرعاً" "عرفاً" ہر طرح جائز اور روا ہوتا۔ اتنے بڑے کارنامے پر ذاتی غرض و لوث کا خفیف سا دھبہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ہے کوئی اس کی مثال؟

معاشی لحاظ سے دیکھیے کہ حضورؐ نے اپنی کامیاب تجارت قربان کی' اس سے حاصل شدہ سرمایہ اپنے مشن پر نچھاور کیا اور جب کامیابی کا دور آیا تو دولت کے ڈھیر اپنے ہاتھوں سے صرف اور تقسیم کیے مگر اپنے گھر کے لیے فقر و فاقہ اور سادہ سی گزران کا عالم پسند کیا۔ اپنے گھر والوں کے لیے کوئی اندوختہ نہیں چھوڑا' کوئی جائداد نہیں بنائی اور ان کے کوئی بالاتر ملی حقوق قائم نہیں کیے۔ اور ان کے لیے کسی عہدے کی مستقل موروثی گدی نہیں چھوڑی۔ دربان اور خادم بھرتی نہیں کیے' سواریاں جمع نہیں کیں۔ کوئی سامان آرائش گھر میں پسند نہیں کیا۔

سیاسی لحاظ سے دیکھیں تو اپنے لیے کوئی ترجیحی حقوق حاصل نہیں کیے۔ کسی کے خلاف خدا کے احکام و حدود سے تجاوز کر کے کوئی اختیار استعمال نہیں کیا۔ اپنا سیاسی مقام اونچا کرنے کے لیے کوئی من مانا قانون جاری نہیں کیا۔ مدینہ میں شدید ایمرجنسی موجود رہی اور یہود و منافقین کی نت نئی شرارتوں سے سابقہ رہا۔ مگر کسی کو نظربند نہیں کیا۔ کسی پر پابندیاں نہیں لگائیں۔ کوئی ضمیر کش احکام نافذ نہیں کیے۔ ہنگامی عدالتیں نہیں بٹھائیں اور لوگوں کی چمڑی تازیانوں سے نہیں ادھیڑی۔ بخلاف اس کے لوگوں کو تنقید اور رائے زنی کا حق دیا۔ اختلاف کرنے کی آزادی دی' اپنے اعلیٰ مشوروں کو قبول نہ کرنے کا حق بھی دیا۔ یہ حقوق محض کاغذ پر لکھے ہوئے نظری حقوق نہ تھے۔ بلکہ لوگوں نے ان حقوق کو عملاً استعمال کیا۔ بسا اوقات حضورؐ نے اپنی قیمتی رائے ترک کر کے اختلافی رائے قبول فرمائی۔ اگر کسی کو کوئی رعایت دینا چاہی تو جماعت سے اجازت طلب کی۔ مثلاً اپنے داماد جناب ابوالعاص قیدی بن کر آئے تو ان کے فدیہ میں حضرت زینبؓ نے وہ ہار بھیجا جو حضرت خدیجہؓ کی یادگار تھا اس ہار کی واپسی کے لیے حضورؐ نے مجلس عام میں اپیل کی۔ اسی طرح ان کا مال بطور غنیمت لایا گیا تو وہ جماعت کی اجازت سے واپس کیا۔ جعرانہ کے مقام پر معرکہ حنین کے قیدیوں کو چھوڑانے کے لیے ایک وفد آیا۔ جس نے حضورؐ کی رضاعی قرابت کا واسطہ دلا کر اپنی درخواست پیش کی۔ قیدی تقسیم ہو چکے تھے۔ حضورؐ نے بنو ہاشم کے حصے کے قیدی چھوڑنا تو بطور خود منظور کیا لیکن بقیہ کے لیے فرمایا کہ مجمع عام میں مسلمانوں سے درخواست کرو' لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ حضورؐ نے اپنے خاندان کے حصے کے قیدی چھوڑ دیے ہیں تو سب نے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ ایسے معاملات میں حضورؐ نے کبھی بھی دباؤ اور جبر سے کام نہیں لیا۔

سماجی اور مجلسی لحاظ سے دیکھیے تو اپنے لیے مساوات پسند کی۔ امتیاز پسند نہیں کیا۔ نہ کھانے پینے' رہن سہن' لباس اور وضع قطع میں کوئی غیر معمولی پن رکھا' نہ مجالس میں نمایاں مقام پر نشست پسند کی۔ نہ یہ مرغوب تھا کہ لوگ تعظیم کے لیے کھڑے ہوں اور نہ آقا اور سرواز اور اسی طرح کے القاب احترام استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ جنگ اور سفر میں بھی' خندق کی کھدائی میں بھی اور مساجد کی تعمیر میں بھی اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر مٹی ڈھونے' گارا اٹھانے' پتھر توڑنے اور لکڑیاں چننے کے کام اپنے دست مبارک سے سرانجام دیے۔ قرض خواہوں کو عالم واقعہ میں اپنے خلاف درشتی سے تقاضا کرنے کا اذن دیا۔ اپنے آپ کو مجلس عام میں انتقام کے لیے پیش کیا کہ جس کسی کے خلاف مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو وہ مجھ سے اپنا بدلہ لے لے۔

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

محسن انسانیتؐ کا یہ مقدس انقلاب تھا جس کے ہم پاسبان بنائے گئے تھے۔ یہ پیغام تھا جس کے لیے ہمیں شہداء علی الناس اور امت وسط ہونے کے بلند ترین منصب پر فائز کیا گیا تھا' یہ تھا کلمہ حق جس کی امانت

ہمیں اس لیے تفویض کی گئی تھی کہ حضورؐ کی نیابت میں ہم قیامت تک انسانیت کے نجات دہندہ بنیں اور جب بھی زندگی اپنے مسائل میں الجھ جائے اور تمدن بحران میں گھر جائے تو ہم اس کے لیے سہارا بنیں' لیکن ہم نے اس کلمہ حق کی مشعل کو بلند رکھنے میں کوتاہی کی اور اس نظام حق کا اپنے ہاتھوں ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ دور حاضر کا قافلہ' فکر بھٹک کر غلط موڑ مڑا' تو ہم اپنا فرض ادا کرنے کے اہل نہ تھے۔ اور ہماری ہی کوتاہیوں کا کرشمہ ہے کہ آج پوری حیات انسانی بحران کا شکار ہے۔ متضاد مادہ پرستانہ نظریات کی آویزش ذہنی سکون کو برباد کر رہی ہے۔ عالمی قیادت خدا ناشناس طاقتوں کے ہاتھ میں ہے اور ہم خود انھی طاقتوں کے دریوزہ گر بن کے رہ گئے ہیں۔ حالات کی ٹھوکریں ہمیں بیدار نہیں کر سکیں۔ ذلتیں اور نامرادیاں ہمارے اندر احساسِ ندامت ابھار نہیں سکیں۔ عالم اسلام کا انتشار اور انسانیت کا بحران۔ اسی کرنے کے اصل کام پر توجہ نہیں دلا سکا۔

آؤ سوچیں اور جائزہ لیں کہ انسانیت تاریخ کے کس مرحلے سے گزر رہی ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں؟

اس کتاب کے مؤلف نے اپنے مختصر سے دور عمر میں اپنے آپ کو بھی' اپنے قریبی ماحول کے ابنائے نوع کو بھی' اور اس سے آگے گزر کر دنیا بھر کے انسانوں کو بھی مسلسل ایک پریشانی' ایک اضطراب' ایک تنگی' ایک تشویش اور ایک خوف کی حالت میں گرفتار دیکھا ہے۔ گھروں سے لے کر بین الاقوامی تنظیموں تک ہر جگہ بدگمانی' بگاڑ' کشمکش اور تصادم کا سماں سامنے آتا ہے۔ اس پورے دور میں تاریخ ایک ہنڈیا کی طرح ابال کھاتی رہی ہے اور اس ہنڈیا کے کھولتے ہوئے پانی میں اپنے جیسے کروڑوں انسانوں کے انبوہ کے ساتھ خود کو بھی مٹر یا چاول کے ایک دانے کی مانند زیر و زبر ہوتے پایا ہے۔ جس انسانی دنیا سے اب تک سابقہ رہا ہے وہ دو عالمی جنگوں کے درمیان پس کر اور بے شمار علاقائی جنگوں کے چرکے کھا کھا کر ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائی کہ ایک اور قیامت خیز جنگ کی تلوار اس کے سر پر لہراتی دکھائی دے رہی ہے۔ اس مختصر سے دور میں توڑ پھوڑ کے بے شمار ہنگامے نظر سے گزرے' بار بار انقلابوں کے بھونچال آتے رہے' سلطنتوں کو ابھرتے اور مٹتے دیکھا۔ نظریات کی لہروں کی آویزش دیکھی۔ سازشوں کی سرنگیں بچھتی اور پھٹتی دیکھیں۔ علاقوں کے ٹکڑے ہوتے دیکھے۔ انسانی گلوں کو اجڑ پجڑ کر نقل مکانی کرتے دیکھا۔ خود برصغیر ہندو پاک میں عین صبح آزادی کے ظہور کے ساتھ بالکل اپنے سر سے موج خون گزرتی دیکھی۔ اور اس موج خون میں انسانی جانوں' عصمتوں اور آبروؤں اور قیمتی روایات و اقدار کو غرق ہوتے دیکھا۔

موجودہ عالمگیر مادہ پرستانہ تہذیب کے ظاہر فریب پردوں کے پیچھے جھانک کر انسانیت کا جائزہ لیجیے' تو وہ حال زار سامنے آتا ہے کہ روح کانپ جاتی ہے۔ پوری اولاد آدم کو چند خواہشات نے اپنے شکنجے میں کس لیا ہے اور ہر طرف دولت و اقتدار کے لیے ہاتھاپائی ہو رہی ہے۔ آدمیت کے اخلاقی شعور کی مشعل گل ہے۔ جرائم تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ نفسیاتی الجھنوں کا زور ہے اور ذہنی سکون یکسر غائب ہو چکا ہے۔ انسانی ذہن و کردار میں ایسا بنیادی فساد آگیا ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس کی منحوس

پرچھائیں سے محفوظ نہیں رہا۔ فلسفہ و حکمت سے سچائی کی روح کھو گئی ہے۔ اعتقادات و نظریات میں توازن نہیں رہا۔ روحانی قدریں چوپٹ ہو چکی ہیں۔ قانون روحِ عدل سے خالی ہو رہا ہے۔ سیاست میں جذبۂ خدمت کی جگہ اغراض پرستی گھس گئی ہے۔ معیشت کے میدان میں ظالم اور مظلوم طبقے پیدا ہو گئے ہیں' فنون لطیفہ میں جمال کی ساری رنگ آمیزیاں جنسی جذبوں اور سفلی خواہشوں سے کی جانے لگی ہیں۔ تمدن کے سارے عوامل میں چپہ چپہ پر تضادات ابھر آئے ہیں جن کے درمیان تصادم برپا ہے۔ اور پوری تاریخ ایک خوفناک ڈرامے میں بدل گئی ہے۔ عقل ترقی کر گئی ہے مگر اس کی حماقتیں ہمارے درپئے آزار ہیں۔ علم کے سوتے ابل رہے ہیں۔ مگر اسی کی پروردہ جہالتوں کے ہاتھوں آدم زاد کا ناک میں دم ہے۔ دولت کے خزانے ہر چہار طرف بکھرے پڑے ہیں۔ مگر خاکی مخلوق بھوک' ننگ اور محرومی کے عذاب میں گھری ہے۔ ہزار گونہ تنظیمیں اور سیاسی ہیئتیں' نظریاتی وحدتیں اور معاہداتی رابطے نمودار ہیں۔ مگر انسان اور انسان کے درمیان بھائی بھائی کا سا تعلق نہیں۔ چیتے اور بھیڑیے کا سا معاملہ ہے۔ عقلی' سیاسی' اخلاقی اور تہذیبی شعور کی ترقی کے چرچے ہیں' مگر ظلم اور تشدد کے انتہائی ناپاک حربے آج بھی انسانیت کے خلاف کام میں لائے جا رہے ہیں۔ تاریخ ایک وسیع اکھاڑا ہے جس میں کہیں امپیریلزم اور حریت پسندی کے درمیان' کہیں کمیونزم اور سرمایہ داری کے درمیان' کہیں جمہوریت اور آمریت کے درمیان کہیں فرد اور اجتماعیت کے درمیان اور کہیں مغربیت اور ایشیائیت کے درمیان ایک خونخوار آویزش ہو رہی ہے۔

ایسی ہے یہ دنیا جس میں ہم اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں!

مصنوعی سیاروں اور میزائیلوں کے اس دور میں سائنس الہ دین والے روایتی چراغ کے جن کی طرح مادی قوتوں کے نئے نئے خزانے انسان کے ایک ایک اشارے پر بہم پہنچا رہی ہے۔ قدرت کے سربستہ رازوں کے ازلی قفل حکمت کی کنجی سے کھل رہے ہیں! ہیبت ناک رفتاریں انسان کو زمان و مکان پر وسیع تصرف دلا رہی ہیں' جوہری توانائی نے تباہ کار دیوؤں کے لشکر انسان کے سامنے مسخر کر کے کھڑے کر دیئے ہیں' جو بس ایک اشارہ ابرو کے منتظر ہیں۔ دوسری طرف خود اس انسان کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ شیطانی اور تخریبی قوتوں کے پنجے میں پہلے سے زیادہ بے بس دکھائی دیتا ہے جو بار بار اسے اپنے ہی خلاف محشر آرا کرتی رہی ہیں۔ اور جنہوں نے ہر دور تاریخ میں اس کے عظیم تعمیری کارناموں اور اس کے شاندار تمدنوں کو خود اسی کے ہاتھوں ملیا میٹ کرایا ہے۔

ذرا کسی ایسے کارواں کا تصور کیجیے جو کسی پہاڑ کی چوٹی پر ڈیرہ ڈالے اور زربفت کے خیمے نصب کر کے کھانے پینے' رقص و موسیقی اور شعر و شراب میں مگن ہو' اس کے پاس کاروباری اموال کے انبار ہوں' اس کے ساتھ روپے سے بھری ہوئی تھیلیاں ہوں' جانوروں اور سواریوں کی کثرت ہو' اس کے اسلحہ چمکدار اور اس کا پہرہ مضبوط ہو ـــــ لیکن عین اس کے قالینوں اور بستروں اور مسندوں کے نیچے کی زمین میں چند فٹ کی گہرائی پر خوف ناک لاوا کھول رہا ہو۔ اور تھوڑا ہی وقفہ اس میں باقی ہو کہ پہاڑ پھٹ پڑے۔

اور آگ کا طوفان اٹھنے لگے۔ کچھ ایسا ہی حال ہمارے قافلہ تمدن کا ہے جو موجودہ لمحہ تاریخ کی پہاڑی پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ اس پہاڑی کے سینے میں ہولناک ترین بحران کا لاوا کھول رہا ہے۔

ہمارے سامنے مشیت عالمی بحران کا چیلنج لیے کھڑی ہے' وقت کے راستہ پر پیچھے بھاگنے کا امکان نہیں۔ چیلنج کا جواب دینے کی صلاحیت موجودہ مادی تہذیب اور اس کے بنائے ہوئے انسان میں نہیں ہے۔ کوئی نیا فلسفہ نہیں ابھر رہا ہے جو کم سے کم ایک چھلاوے کی طرح وقتی طور پر ہی سرمایۂ اطمینان بن سکے ----- کسی طرف کوئی راہ نجات کھلتی نظر نہیں آتی۔

اضطراب کے اس لمحے میں جب میں چاروں طرف نگاہیں گھماتا ہوں تو تاریکی کا ایک سمندر شش جہت سے محاصرہ کیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اس سمندر میں دور ---- چودہ صدی کی دوری پر ---- ایک نقطہ نور دکھائی دیتا ہے۔

یہ انسانیت کے سب سے بڑے محسن محمد ﷺ کے پیغام کی مشعل ہے! وہی مشعل جس کی روشنی کو خود ہم نے ---- محمد ﷺ کے نام لیواؤں نے ---- اپنے افکار پریشان اور اپنے اعمال پراگندہ کے غبار میں گم کر رکھا ہے!!

مطالعہ سیرت کا نقطہ نظر:

میرے نزدیک سیرت پاک کے مطالعہ کا ایک ہی مقصود ہے ----- حضورؐ کے پیغام کی مشعل ہمارے سامنے اور پوری انسانیت کے سامنے ایک بار پھر نور پاش ہو اور قافلہ زندگی دور حاضر کی تاریکیوں میں اسی طرح جادہ فلاح کا سراغ پالے جس طرح اسے ساتویں صدی عیسوی میں بحران سے نجات پانے کا راستہ ملا تھا!

بدقسمتی سے سیرت نبویؐ کا مطالعہ ہمارے ہاں اس اسپرٹ اور اس نقطہ نظر سے کم ہو رہا ہے جس سے ہونا چاہیے۔ ہماری دلچسپی اس میدان میں پوری طرح یہ نہیں رہی کہ ہمیں وہاں سے ایک نقشۂ زندگی حاصل کر کے اپنے آپ کو اس کے سانچے میں ڈھالنا ہے بلکہ بعض دوسری دلچسپیاں بیچ میں آگئی ہیں اور روز بروز بڑھ رہی ہیں۔

بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے ساری دلچسپی مجرد حصول ثواب کے لیے رکھتے ہیں (اس سے انکار نہیں کہ حضورؐ سے قرب کی ہر کوشش خدا کی بارگاہ میں پسندیدہ ہے اور اس پر اجر کی توقع رکھنی چاہیے' لیکن ایسی کوشش کا اولین مدعا زندگی کو سنوارنا بھی تو ہو!) دھوم دھام سے میلاد کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں اور اس اعتقاد سے کی جاتی ہیں کہ ان مجالس میں حضورؐ کی روح پُرنور جلوہ گر ہوتی ہے اور اپنے پیروؤں کی محبت کے مظاہروں کو دیکھ دیکھ کر خوشنود ہوتی ہے۔ شیرینی کے طشت' پھولوں کے گجرے اور ہار' قوالی اور نعت خوانی کے اہتمام' اگربتیوں اور لوبان کی خوشبوؤں کے مرغولے'

قمقموں اور فانوسوں کی لمعہ پاشیاں' یہ سب کچھ اسی اعتقاد کے ترجمان ہیں۔ سیرت نبویؐ سے اس انداز کی عقیدت جو نقشہ سامنے لاتی ہے۔ وہ کسی انسان کا نقشہ نہیں۔ گوشت پوست سے بنے ہوئے کسی آدم زاد کی شخصیت نہیں بلکہ ہم ایک فوق الانسان ہستی سے متعارف ہوتے ہیں جس کا پیکر نور سے ڈھلا ہے' جس کے جسم کا سایہ نہیں' جس کے کارنامے میں سارا پارٹ معجزوں کا ہے' جو عالم اسباب کے قوانین سے بالاتر ہے جس کے سارے کام فرشتے سرانجام دیتے ہیں اور جس کی ہربات اور ہرچیز پر اسرار ہے۔ انکار نہیں کہ ابنائے نوع کے مقابلہ میں حضورؐ کا روحانی و اخلاقی پایہ بدرجہا بلند ہے۔ وہاں بہت سی فوق العادت چیزیں بھی ملتی ہیں' وہاں معجزے بھی ہیں اور وہاں فرشتے بھی حرکت کرتے نظر آتے ہیں ---- مگر بہرحال وہ پاک زندگی ایک انسان کی زندگی ہے اور اس کی عظمت کی اساس ہی یہ ہے کہ ایسی لامثال زندگی ایک انسان نے پیش کی۔ وہاں قوانین فطرت اور نوامیس تاریخ و مدنیت ہی کے دائرے میں سارا کام ہوتا ہے اور کامیابی کی راہ کے ایک ایک چپے پر قربانیاں پیش کی جاتی ہیں۔ وہ ایک انسان کی زندگی ہو کر ہی ہمارے لیے اسوہ بنتی ہے اور اسی کے تصور کے ساتھ ہم اس سے اکتساب کر سکتے ہیں۔ اس سے عزم و ہمت کا درس لے سکتے ہیں۔ اس سے اصول کی پابندی اور فرض شناسی کا سبق سیکھ سکتے ہیں' اس سے انسانیت کی خدمت کا جذبہ اخذ کر سکتے ہیں۔ اور اس سے بدی کی طاقتوں کے خلاف معرکہ آرا ہونے کے لیے ایک تڑپ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔ سیرت نبویؐ کو اگر تم معجزہ بنا دو گے اور اگر اسے فوق الانسانی کارنامے کا رنگ دے دو گے تو پھر مٹی کے بنے ہوئے انسانوں کے لیے اس میں نمونہ کیا رہے گا۔ ایسی ہستی کے سامنے ہم مرعوب اور حیرت زدہ تو ہو سکتے ہیں' اس کا کوئی ایک لفظ اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے۔ اس سے ہم عقیدت تو رکھ سکتے ہیں' اس کا اتباع نہیں کر سکتے چنانچہ جہاں جہاں عقیدت مندی کا یہ خاص رنگ پہنچا ہے وہاں جتنا جتنا یہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ عملی زندگیاں اتباع نبوت سے اتنی ہی آزاد ہوتی جاتی ہیں۔ بلکہ الٹا' حالت یہ ہے کہ گھناؤنے معاشی اور معاشرتی جرائم کے میکدے میں جو لوگ خم کے خم لنڈھاتے ہیں۔ وہ اس سستے طرز سے مظاہرہ عقیدت کر کے اپنے مضطرب ضمیر کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ؎

"کچھ بھی ہیں' لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں"

دوسری طرف مغرب سے ایک دوسرا رجحان آٹھا ہے جسے اعاظم پرستی کہا جاتا ہے۔ یہ رجحان اپنی اصل روح کے اعتبار سے قوم پرستانہ جذبات کا ترجمان ہے۔ ایک طرح کا قومی تفاخر ہے جو دوسروں کے سامنے ماضی کی نمایاں شخصیتوں کا مظاہرہ کراتا ہے۔ یہ رجحان گویا یہ کہتا ہے کہ دیکھو ہمارے پاس ایسی اور ایسی ہستیاں ہیں' ہماری تاریخ میں اتنے اتنے بڑے پائے کے بزرگ ہو گزرے ہیں اور ان کے یہ یہ یادگار کارنامے ہیں جن کے ہم وارث ٹھہرے ہیں اور جو ہمارے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ اس رجحان کی علامت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ کھوکھلا ہوتا ہے۔ اس کے تحت ہر قوم متعدد شخصیتوں کے ایام وفات' ایام پیدائش اور دوسرے یادگاری دن بڑے ٹھاٹھ سے مناتی ہے مگر یہ ایام کہیں بھی ان شخصیتوں سے استفادہ کا ذریعہ

نہیں بنتے۔ انسانیت کے جن نمونوں کو بہ صد تفاخر دوسروں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا کوئی پرتو پیش کرنے والوں کی اپنی زندگیوں میں دکھائی نہیں دیتا اور نہ کبھی اس پرتو کو اخذ کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔ اس رجحان کے تحت حضورؐ کی یاد تازہ کرنے کے لیے جو تقاریب منعقد ہوتی ہیں ان میں کہنے کو تو ایک خاص طرح کی باتیں ہمیشہ کہی جاتی ہیں مگر زندگی پر ان کا کوئی اثر نمودار نہیں ہوتا۔

تیسرا غلط نقطۂ نظر وہ ہے جو حضورؐ کے پیغام کو ایک نظامِ حیات کا پیغام نہیں سمجھتا بلکہ ایک مذہب کا پیغام قرار دیتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے جو لوگ متاثر ہیں ان کا تصور یہ ہے کہ حضورؐ بس چند اعتقادات' چند رسوم و عبادات' چند اوراد و وظائف' چند اخلاقی سفارشیں اور چند فقہی احکام پہنچانے آئے تھے اور آپؐ کا منشا ایسے افراد پیدا کرنا تھا جو شخصی طور پر مسلمانی کی شان پیدا کر کے ہر گندے سے گندے نظام کے لیے بہترین کارکن ثابت ہوں۔ ایسا عنصر حضورؐ سے بس طہارت' نماز روزے' نوافل و اذکار اور انفرادی اخلاق کی حد تک اکتسابِ فیض کرتا ہے۔ لیکن تمدنی زندگی کے وسیع تر معاملات میں وہ پوری شان بے حسی کے ساتھ ہر باطل کے کام آتا ہے اور ہر فساد کے ساتھ سازگاری کر لیتا ہے۔ اس عنصر نے گویا سیرت نبویؐ کی مقدس کتاب کے بے شمار زریں ابواب کو فراموشی کی سرزمین میں دفن کر دیا ہے اور بس ایک مقدمہ کی فصل کو لے کر اسی میں کھو گئے ہیں۔ اس عنصر نے اب تک حضورؐ کی جو ترجمانی کی ہے اس سے متاثر ہو کر دورِ حاضر کی کوئی غیر قوم تو کجا' خود تعلیم یافتہ مسلم نوجوان تک یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حضورؐ ان کے لیے قافلہ سالارِ تمدن بھی ہو سکتے ہیں اور ان کی بارگاہ سے تازہ ترین کٹھن مسائل کا کوئی اطمینان بخش حل بھی مل سکتا ہے۔ یہ نقطہ نظر بھی حضورؐ کی ہستی کے لیے ایک مقدس حجاب بن گیا ہے۔

یہ غلط نقطہ ہائے نظر پنپ اس لیے رہے ہیں کہ فضا ان کے لیے سازگار ہے۔ فضا یوں سازگار ہے کہ جس نظامِ سیاست و تمدن اور جس ہیئتِ معیشت و معاشرت سے ہم دوچار ہیں اسے ایک خاص نقشے کا انسان درکار ہے' اس مشین کو خاص ڈھنگ کے پرزوں کی ضرورت ہے۔ وہ بالکل دوسری ہی سیرت افراد میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کا کام ایک اور ہی طرز کے ذہن و کردار سے چلتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں عملی زندگی کو سرے سے اس نمونۂ انسانیت کی ضرورت ہی نہیں ہے جسے محمد ﷺ کی سیرت پیش کرتی ہے اور اس منڈی میں اس متاعِ فکر و عمل کی مانگ ہی نہیں ہے جو آنحضورؐ کی زندگی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ دنیا کا اجتماعی نظام جس طرز کے وزیر' حکام' جج' وکیل' لیڈر' صحافی' سپہ سالار' سپاہی' کوتوال' پیادے' تحصیل دار' پٹواری' ڈپٹی کمشنر' نمبردار' زمیندار' مزارع' مصنف' ادیب' عام قلی اور مزدور مانگتا ہے ان کا نقشۂ انسانیت اس سے بالکل متضاد قسم کا ہے جس کا مظاہرہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ کے اسٹیج پر فرمایا۔ چھائے ہوئے نظام کی مانگ کے مطابق گھر گھر میں ماؤں کی محبت کی گودیں اور باپوں کی شفقت کی نگاہیں اولادوں کو پال رہی ہیں۔ ان کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر ادارہ ہائے تعلیم و تربیت بیس بیس' پچیس پچیس سال تک ایک ایک فرد پر صرف کر کے کام کے پرزے بنا رہے ہیں' اور اسی کے تقاضوں کے

تحت ہر صاحب شعور خود اپنے ذہن و کردار کو ایک خاص شکل دینے میں ساری عمر مصروف رہتا ہے۔ یہ نظام جن جن چیزوں کو پسند کرتا ہے انہی کو معاشرہ اپنے افراد میں از خود پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور یہ جن جن چیزوں کو حقارت و کراہت سے دیکھتا ہے ماحول کی پوری طاقت ان کو مٹانے کے در پے رہتی ہے۔ یہ نظام جس بولی کو پسند کرتا ہے' زبانیں آپ سے آپ اسی بولی کو بولنے لگتی ہیں۔ یہ جس لباس کو پسند کرتا ہے وہ لباس از خود زیب بدن ہونے لگتے ہیں۔ یہ ایک اشارہ کرتا ہے تو قدیم حیادار گھرانوں کی بہو بیٹیوں کے چہروں سے نقابیں الٹ جاتی ہیں۔ عزت کی روش وہ ٹھہرتی ہے جسے مروجہ نظام رائج کرنا چاہے۔ اور ذلت کا طرز وہ قرار پاتا ہے جسے چلتا ہوا تمدن ناپسند کرے۔ جن فنون کو یہ پسند کرتا ہے وہ ذریعہ مقبولیت بنتے ہیں اور جن مشاغل کو یہ مسترد کرتا ہے وہ نذر تغافل ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنی اقدار خود بناتا اور تمام افراد سے انہیں منواتا ہے۔ اور دوسری تمام روایات' اقدار اور شعائر کو مرجھا جانا پڑتا ہے۔ کچھ حمیت دار افراد اور خاندان' ماحول کے جبری دھارے کے خلاف زور کرتے ہیں مگر معاشی محرومی' ثقافتی پس ماندگی اور احساس کہتری کا دباؤ اتنا سخت ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہیراک مضمحل ہو کر اپنے آپ کو ماحول کے حوالے کرتے جاتے ہیں۔ ورنہ ان کی اگلی نسل ہمت چھوڑ بیٹھتی ہے۔ اب ایک دنیا کی دنیا جو اپنی سیرت کی تشکیل شعوری طور پر بھی اور غیر شعوری طور پر بھی ماحول کے منشا کے مطابق کرنے میں مگن ہے۔ وہ سرور عالمؐ کی سیرت پر کتابیں اگر لکھے اور پڑھے گی اور وعظ سنائے اور سنے گی تو اسوہ حسنہ کا ذوق لوگوں کے اندر آئے گا کہاں سے؟

سچی بات یہ ہے کہ سیرت نبوی میں ان لوگوں کے لیے کوئی پیغام ہے ہی نہیں جو کسی غیر اسلامی نظام سے بات بنا رکھنا چاہتے ہوں اور جن کے مفاد کے سودے کسی باطل سے چک گئے ہوں۔ ایسے لوگ سیرت پڑھ کر سر دھنتے ہوں گے۔ ان کو ذہنی حظ ملتا ہو گا' ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہو گا۔ لیکن ان میں یہ تحریک کہاں سے آئے گی کہ وہ اس سیرت کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالیں۔ ان کا جمود کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کی داستان حیات رستم و سہراب کا قصہ نہیں' الف لیلہ کی کہانی نہیں اور کسی خیالی کردار کا افسانہ نہیں' اس کا مقام یہ ہرگز نہیں کہ اسے ہم علم و ادب کی تفریحی چوپال کا محض ایک سرمایۂ رونق بنائیں' اس کی قدر و قیمت اجازت نہیں دیتی کہ ہم اسے محض ذہنی لذت حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں۔ اس کا احترام روکتا ہے کہ ہم اسے مجرد قومی تفاخر کے جذبہ کی تسکین کا ذریعہ بنائیں۔

یہ مختلف غلط نقطہ ہائے نظر ہمارے یہاں مل جل کر کام کر رہے ہیں اور یہی اصل مقصد میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ کون شمار کر سکتا ہے کہ ہر سال کتنی مجالس میلاد اور جلسہ ہائے سیرت ہمارے ملک میں منعقد ہوتے ہوں گے؟ ایک ربیع الاول ہی کے مہینے میں کتنے وعظ اور کتنی تقریریں ہوا میں لہریں اٹھا دیتی ہوں

گی؟ کتنے مقالے اور کتابیں لکھی جاتی ہوں گی؟ کتنے جرائد کے خاص نمبر اس موضوع پر شائع ہوتے ہوں گے۔ شعراء کتنی نعتیں لکھتے ہوں گے اور قوال ان کو کہاں کہاں گاتے پھرتے ہوں گے؟ اکابر کی طرف سے کتنے ہی پیغامات اور بیانات نشر ہو جاتے ہوں گے؟ دعوتوں اور ضیافتوں کی کیسی کچھ بہاریں دسترخوانوں پر آتی ہوں گی؟ بازاروں کو سجانے اور دروازے اور محرابیں بنانے اور دوسری رونق افزائیوں میں کتنا روپیہ کھپا دیا جاتا ہو گا؟ [1]

لیکن دوسری طرف یہ بھی ذرا سوچیے کہ ایک اچھے مقصد پر قوتوں اور روپے کے اس صرف کا واقعی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ جائزہ کی ترازو کے ایک پلڑے میں اپنی ایک سال کی ان سرگرمیوں کو رکھیے اور دوسرے پلڑے میں حاصل شدہ نتائج کو رکھ کر جانچیے کہ کیا وزن ٹھیک نکلتا ہے؟ کتنے افراد ہوں گے جو ان نیک مساعی کی بدولت سیرت نبوی کے سانچے میں اپنی زندگیاں ڈھالنے کی مہم میں ہر سال لگ جاتے ہوں گے؟ اگر ایک جلسے' ایک مقالے اور ایک نعت کے ذریعے صرف ایک ہی آدمی بدلا ہوتا تو اندازہ کیجیے کہ گزشتہ دو سو سال کا کیا حاصل ہونا چاہیے تھا۔ اور اگر عملاً حاصل وہ نہیں ہے تو کہیں نہ کہیں ہماری مساعی میں کوئی کوتاہی موجود ہے اور وہ کوتاہی بڑی بنیادی قسم کی ہے۔ رونا اسی کا نہیں کہ وہ کچھ حاصل نہیں ہو رہا جو مطلوب ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ماتم اس کا ہے کہ ہمارے پلے وہ کچھ پڑ رہا ہے جو محسنؐ انسانیت کے پیغام اور کارنامے سے کھلم کھلا ٹکراتا ہے۔ ہمارے اندر آج ایسے عناصر پروان چڑھ رہے ہیں جو حضورؐ کے مشن کو زمانہ حال کے لیے ناکارہ اور حضورؐ کے عطا کردہ نظام زندگی کو ناقابل عمل قرار دیتے ہیں----- ایسے عناصر جو حضورؐ کی تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہیں' ایسے عناصر جو سیرت' سنت اور حدیث کا سارا ریکارڈ دریا برد کر دینا چاہتے ہیں' ایسے عناصر جو قرآن کو پیش کرنے والی ہستی کی ۲۳ سالہ جدوجہد اور لازوال تحریکی کارنامے سے بے تعلق کر دینا چاہتے ہیں۔ اور حضورؐ کی ہستی کو بطور عملی نمونۂ انسانیت کے' ہماری نگاہوں سے گم کر دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ تعبیر و تاویل کے نام پر ہمارے ہاں یہ کوشش ہو رہی ہے کہ حضورؐ کی شخصیت' پیغام اور کارنامے کو موجودہ فاسد تہذیب کے فکری سانچے میں ڈھال دیا جائے اور محسنؐ انسانیت کی بالکل نئی تصویر عالمی طاقتوں کے ذوق کے مطابق تیار کر دی جائے۔

میرا حاصل مطالعہ و تحقیق یہ ہے کہ ہم نے مطالعہ سیرت کا صحیح بنیادی نقطہ نظر گم کر دیا ہے اور اوپر کے غلط نقطہ ہائے نظر کار فرما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرورِ عالم کی محبت و عقیدت کے بے شمار مظاہر موجود ہونے کے باوجود اور سیرت پر دماغی کاوشیں صرف ہونے کے باوجود ہماری تاریخ کے افق سے وہ نیا انسان طلوع نہیں ہو رہا جس کا نمونۂ کامل حضورؐ نے پیش فرمایا تھا۔

---

[1] آہستہ آہستہ نبی اکرمؐ کی یادگار تقریبوں میں مسرت و تفریح اور کھیل تماشوں کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے بلکہ کھلے کھلے ہنگامہ ہائے فسق و فجور بھی عمل میں آنے لگے ہیں یعنی معاشرہ ٹھیک اُس پیغام کے الٹی سمت چل پڑا ہے جو سیرت میں مضمر ہے۔

حضورؐ کی سیرت ہمارے اندر بجز اس کے کسی طرح جلوہ گر نہیں ہو سکتی کہ ہم اُسی نصب العین کے لیے ویسی ہی جدوجہد کرنے اٹھیں جس کے لیے حضورؐ کی پوری زندگی کو ہم وقف پاتے ہیں۔ وہی جدوجہد اپنے ڈھب کی سیرت پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے اور مصرف بھی!

محمد ﷺ کی سیرت ایک فرد کی سیرت نہیں ہے بلکہ وہ ایک تاریخی طاقت کی داستان ہے جو ایک انسانی پیکر میں جلوہ گر ہوئی۔ وہ زندگی سے کٹے ہوئے ایک درویش کی سرگزشت نہیں ہے جو کنارے بیٹھ کر محض اپنی انفرادی تعمیر میں مصروف رہا ہو۔ بلکہ وہ ایک ایسی ہستی کی آپ بیتی ہے جو ایک اجتماعی تحریک کی روح رواں تھی۔ وہ محض ایک انسان کی نہیں بلکہ ایک انسان ساز کی روداد ہے۔ وہ عالم نو کے معمار کے کارنامے کی تفصیل اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ سرور عالم کی سیرت غار حرا سے لے کر غار ثور تک' حرم کعبہ سے لے کر طائف کے بازار تک' امہات المومنین کے حجروں سے لے کر میدان ہائے جنگ تک چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے نقوش بے شمار افراد کی کتاب حیات کے اوراق کی زینت ہیں۔ ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و علیؓ' عمار و یاسرؓ خالد و خویلد اور بلال و صہیب (رضوان اللہ علیہم اجمعین) سب کے سب ایک ہی کتاب سیرت کے اوراق ہیں۔ ایک چمن کا چمن ہے کہ جس کے لالہ و گل اور نرگس و نسترن کی ایک ایک پتی پر اس چمن کے مالی کی زندگی مرقوم ہے۔ وہ قافلہ بہار وقت کی جس سرزمین سے گزرا ہے اس کے ذرے ذرے پر نکہت کی مہریں ثبت کر گیا ہے۔

دنیا کی اس بلند ترین شخصیت کو اگر سیرت نگاری میں مجرد ایک فرد بنا کے پیش کیا جائے اور سوانح نگاری کے مروجہ طرز پر اس کی زندگی کے بڑے بڑے کاموں' اس کی نمایاں مہمات اور اس کے اخلاق و عادات کو بیان کر دیا جائے' کچھ تاریخوں کی چھان بین اور کچھ واقعات کی کھوج کرید کر دی جائے تو ایسی سیرت نگاری سے صحیح منشا ہرگز پورا نہ ہو گا۔

پھر سرور عالم کی زندگی کی مثال ایک جوہڑ کے کھڑے پانی کی نہیں ہے کہ جس کے ایک کنارے کھڑے ہو کر ہم بیک نظر اس کا جائزہ لے ڈالیں۔ وہ ایک بہتا ہوا دریا ہے جس میں حرکت ہے' روانی ہے' کشمکش ہے' موج و حباب ہیں' سیپیاں اور موتی ہیں۔ اور جس کے پانی سے مردہ کھیتوں کو مسلسل زندگی مل رہی ہے' اس دریا کا رمز آشنا ہونے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ رواں رہنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کی بہت سی کتابیں پڑھ کر نادر معلومات ملتی ہیں لیکن ہمارے اندر تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ جذبے انگڑائی نہیں لیتے' عزم و ہمت کی رگوں میں نیا خون نہیں دوڑتا' ذوق عمل میں نئی حرارت نہیں آتی' ہماری زندگیوں کا جمود نہیں ٹوٹتا۔ وہ شرار آرزو ہم اخذ نہیں کر پاتے جس کی گرمی نے ایک یکہ و تنہا اور بے سرو سامان فرد کو قرنوں کے جمے ہوئے فاسد نظام کے خلاف معرکہ آرا کر دیا۔ وہ سوز و ساز ایمان ہمیں نہیں ملتا جس نے ایک یتیم بے نوا کو عرب و عجم کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والا بنا دیا۔

اصل میں حضور ﷺ معروف اصلاح کے محدود تصور کے مطابق فقط ایک "بڑے آدمی" نہ تھے۔ آپؐ

کی سیرت ایک ایسے "بڑے" یا "مشہور" آدمی کی داستان نہیں ہے۔ جیسے لوگوں کو مشاہیر کے سوانحی سلسلوں میں گنوایا جاتا ہے۔ یہ ہستی "بڑے" اور "مشہور" آدمیوں سے بہت اوپر کی ہے۔

دنیا میں بڑے آدمی بہت پیدا ہوئے اور ہوتے ہیں۔ بڑے لوگ وہ بھی ہیں جنھوں نے کوئی اچھی تعلیم اور کوئی تعمیری فکر پیش کر دی۔ وہ بھی ہیں جنھوں نے اخلاق و قانون کے نظام سوچے' وہ بھی ہیں جنھوں نے اصلاح معاشرہ کے کام کیے۔ وہ بھی ہیں جنھوں نے ملک فتح کیے اور بہادرانہ کارناموں کی میراث چھوڑی۔ وہ بھی ہیں جنھوں نے سلطنتیں چلائیں۔ وہ بھی ہیں جنھوں نے فقر و درویشی کے عجیب عجیب نمونے ہمارے سامنے پیش کیے۔ وہ بھی ہیں جنھوں نے دنیا کے سامنے انفرادی اخلاق کا اونچے سے اونچا معیار قائم کر دکھایا ...... مگر ایسے بڑے آدمیوں کی زندگیوں کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو بالعموم یہی دیکھتے ہیں کہ ان کی قوتوں کا سارا رس زندگی کی کسی ایک شاخ نے چوس لیا اور باقی ساری ٹہنیاں سوکھی رہ گئیں۔ ایک پہلو اگر بہت زیادہ روشن ملتا ہے تو کوئی دوسرا پہلو تاریک دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف افراط ہے تو دوسری طرف تفریط! لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر گوشہ دوسرے گوشوں کے ساتھ پوری طرح متوازن بھی ہے۔ اور پھر ہر گوشہ ایک ہی طرح کے کمال کا نمونہ بھی ہے۔ جلال ہے تو جمال بھی ہے۔ روحانیت ہے تو مادیت بھی ہے' معاد ہے تو معاش بھی ہے' دین ہے تو دنیا بھی ہے' اک گونہ بے خودی بھی ہے مگر اس کے اندر خودی بھی کار فرما ہے۔ خدا کی عبادت ہے تو اس کے ساتھ بندوں کے لیے محبت و شفقت بھی ہے۔ کڑا اجتماعی نظم ہے تو فرد کے حقوق کا احترام بھی ہے۔ گہری مذہبیت ہے تو دوسری طرف ہمہ گیر سیاست بھی ہے۔ قوم کی قیادت میں انہماک ہے مگر ساتھ کے ساتھ ازدواجی زندگی کا بکھیڑا بھی نہایت خوبصورتی سے چل رہا ہے۔ مظلوموں کی داد رسی ہے تو ظالموں کا ہاتھ پکڑنے کا اہتمام بھی ہے۔

آپ کی سیرت کے مدرسے سے ایک حاکم' ایک امیر' ایک وزیر' ایک افسر' ایک ملازم' ایک آقا' ایک سپاہی' ایک تاجر' ایک مزدور' ایک جج' ایک معلم' ایک واعظ' ایک لیڈر' ایک ریفارمر' ایک فلسفی' ایک ادیب ہر کوئی یکساں درس حکمت و عمل لے سکتا ہے' وہاں ایک باپ کے لیے' ایک شوہر کے لیے' ایک پڑوسی کے لیے' یکساں مثالی نمونہ موجود ہے۔ ایک بار جو کوئی اس درسگاہ تک آ پہنچتا ہے پھر اسے کسی دوسرے دروازے کو کھٹکھٹانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انسانیت جس آخری کمال تک پہنچ سکتی تھی وہ اس ایک ہستی میں جلوہ گر ہے' اسی لیے میں اس ہستی کو "انسان اعظم" کے لقب سے پکارنے پر مجبور ہوا۔ تاریخ کے پاس انسان اعظم صرف یہی ایک ہے جس کو چراغ بنا کر ہر دور میں ہم ایوان حیات کو روشن کر سکتے ہیں۔ کروڑوں افراد انسانی نے اس سے روشنی لی' لاکھوں بزرگوں نے اپنے علم و فضل کے دیے اسی کی لو سے جلائے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں اس کا پیغام گونج رہا ہے اور دیس دیس کے تمدن پر گہرے اثرات اس کی دی ہوئی تعلیم کے پڑے ہیں۔ کوئی انسان نہیں جو اس "انسانِ اعظم" کا کسی نہ کسی پہلو سے زیر بار احسان نہ ہو۔ لیکن اس کے احسان مند اس کو جانتے نہیں۔ اس سے تعارف نہیں رکھتے۔

اس کی ہستی کے تعارف اور اس کے پیغام کے فروغ کی ذمہ داری اس کی قائم کردہ جماعت پر تھی' لیکن وہ جماعت خود ہی اس سے اور اس کے پیغام سے دور جا پڑی ہے۔ اس کے پاس کتابوں کے اوراق میں کیا کیا کچھ موجود نہیں' لیکن اس کی کھلی ہوئی کتاب عمل کے اوراق پر انسان اعظم کی سیرت کی کوئی تصویر دکھائی نہیں دیتی۔ اس جماعت اور قوم کی مذہبیت' اس کی سیاست' اس کی معاشرت' اس کے اخلاق' اس کے قانونی نظام اور اس کے کلچر پر اس سیرت کے بہت ہی دھندلے نشانات باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی بے شمار نئے نئے نقوش میں خلط ملط ہو کر مسخ ہو رہے ہیں۔ اس جماعت یا قوم کا اجتماعی ماحول زمین کے کسی ایک چپے پر بھی یہ گواہی نہیں دیتا کہ میں محمدؐ کے دیئے ہوئے اصولوں اور اس کی قائم کردہ روایات و اقدار کا آئینہ دار ہوں' بلکہ الٹا یہ جماعت اور یہ قوم دنیا کے مختلف فاسد نظاموں کے دروازوں پر بھیک مانگتی پھرتی ہے اور ہر قائم شدہ طاقت سے مرعوب ہو ہو کر اپنے سرمایۂ افتخار پر شرمسار ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے قرآن کو غلافوں میں لپیٹ دیا اور انسان اعظم کی سیرت کا گلدستہ بنا کر طاق نسیان پر رکھ دیا۔

دوسرا غضب یہ ڈھایا کہ اپنے آپ کو ایک مذہبی و قومی جتھے میں بدل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو محض اپنے قومی و مذہبی رہنما کی حیثیت دے دی اور اس بین الاقوامی ہستی کے پیغام اور نمونۂ حیات کو گروہی اجارہ بنا لیا۔ حالانکہ آپؐ ساری انسانیت کے رہنما بن کر آئے تھے اور ساری انسانیت کے لیے پیغام اور نمونہ لائے تھے۔ ضرورت سیرت کو اس انداز سے پیش کرنے کی تھی کہ انسانیت کا یہ ایک نمونہ ہے کہ جس کے سانچے میں ڈھل کر انسان اپنے اور اپنے ابنائے نوع کی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے اور مسائل کے گوناگوں خارزاروں سے نجات پا کر ایک پاکیزہ نظام زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ حضورؐ کا پیغام اور اسوہ درحقیقت سورج کی روشنی اور بارش کے پانی اور ہوا کے جھونکوں کی طرح کا فیضان عام تھا لیکن اسے ہم نے اپنی نااہلی سے گروہی خول میں بند کر دیا۔ آج افلاطون و سقراط' ڈارون' میکیاویلی' مارکس' فرائڈ اور آئن سٹائن سے تو ہر ملک و مذہب کے لوگ تھوڑا یا بہت استفادہ کرتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے کسی کے خلاف کسی گروہ میں اندھا تعصب کار فرما نہیں ہے لیکن محمد ﷺ کے نور علم اور رہنمائی سے استفادہ کرنے میں بے شمار تعصبات حائل ہیں۔ لوگ یوں سوچتے ہیں کہ محمدؐ تو مسلمانوں کے ہیں اور مسلمان ہم سے الگ اور ہم مسلمانوں سے الگ ہیں لہٰذا مسلمانوں کے ہادی اور رہبر سے ہمارا کیا واسطہ! افسوس ہے کہ اس تاثر کے پیدا ہونے اور غیر معمولی حد تک جا پہنچنے میں ہمارے اپنے طرز عمل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ خود ہم ہیں کہ جنہوں نے محسن انسانیتؐ کی نہایت غلط نمائندگی کی ہے۔

بنام مغرب:

سرور عالمؐ کی ہستی تاریخ انسانی کے دو بڑے ادوار کے درمیان واقع ہے۔ بعثت محمدیؐ کے مقام سے کھڑے ہو کر دیکھیں تو ہمارے پیچھے قبائلی' جاگیردارانہ' بادشاہتی اور روایتی و اوہامی دور تمدن پھیلا دکھائی

دیتا ہے‘ سامنے دیکھیں تو آفاقی و بین الاقوامی‘ عوامی و جمہوری‘ عقلی و استدلالی ترقیاتی و ایجادی دور تمدن کی پہلی شعاعوں کا قافلہ دُور کے افق سے اُمڈتا دکھائی دیتا ہے اور اس دور عقل و ترقی کا افتتاح خود سرتاج انسانیت ہی کے ہاتھوں کرایا گیا اور آنے والے دور کے لیے ایسے اصول دنیا کو فراہم کردیے گئے جو قیامت تک کارگر ہو سکیں اور ان اصولوں کے ساتھ ایک ایسا انسان تیار کر کے دکھا دیا گیا‘ جو آنے والی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ حضورؐ کے ذریعے اسی آنے والے دور کی ضروریات کے لحاظ سے روح اور بدن‘ اخلاق اور مادیت‘ عقلیت اور جذبات‘ اعتقاد اور عمل‘ خواہش اور فرد اور جماعت کے احوال اور تقاضوں کے درمیان معجزانہ نوعیت کا توازن قائم کردیا گیا۔ آپؐ کے ہاتھوں ایک ایسی جماعت کی تاسیس کرائی گئی جو ایک طرف دنیا سے بے نیاز تھی اور دوسری طرف دنیا پر حکمرانی کرتی تھی۔ ایک طرف خدا پرستی میں بے مثال تھی اور دوسری طرف مادہ پر کارفرمائی کرنے کے لحاظ سے پیش پیش تھی۔ ایک طرف حق کے مقابلے میں انتہائی عاجزی سے سر جھکا دینے والی تھی اور دوسری طرف باطل کا زور توڑنے کے لیے جان مال کی بازی لگا دینے والی تھی۔ ایک طرف اپنے آپ کو رضائے الٰہی کی تحویل میں دیئے ہوئے تھی اور دوسری طرف فطرت کی قوتوں کو رام کر کے ان سے کام لینے میں چاق و چوبند تھی۔ یہ طاقت جونہی تاریخ کے ایوان میں داخل ہوئی اس نے علم و حکمت کے فانوس روشن کر دیئے۔ اس نے ایجادات کے دروازے کھول دیے اور اس نے ادارات کی تنظیم کے لیے نئے نئے تجربات نہایت تیزی سے کرڈالے اور اس کی ساری حرکت‘ اس کی ساری ترقیات اس کے علوم اور ایجادات‘ اس کے تمدنی و تہذیبی کارناموں کا اصل کریڈٹ محمد ﷺ کے حصے میں جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ مغربی قومیں جن کے قبضے میں آگے چل کر اس عقلی و جمہوری دور کی باگ ڈور آئی‘ محمدؐ اور اس کے پیغام اور اس کے پیش کردہ نظام کو نہ سمجھ سکیں۔ وہ ہستی جس کا کارنامہ مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے پس منظر میں جگمگا رہا ہے اور وہ ہستی جو جمہوریت اور بین الاقوامیت کے پردوں کے پیچھے مسکرا رہی ہے اور وہ ہستی کہ جس کا ہاتھ مذہبی اصلاح (Reformation) کی تحریک کی ڈور ہلانے والا تھا اس کو یورپ کا روشن دماغ انسان نہ دیکھ سکا اور نہ سمجھ سکا۔ اس کے کئی اسباب ہیں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں اجمالاً ان اسباب کا ذکر کریں۔

(۱) محمد ﷺ جب اپنا پیغام لے کر اٹھے تو آپؐ کو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں سے سابقہ پیش آیا۔ دونوں مذہب اس وقت فساد اور انحطاط کے افسوس ناک دور سے گزر رہے تھے۔ ایمانی و اخلاقی روح سے خالی ایک رسمیاتی ڈھانچہ شان تقدس کے ساتھ دونوں کے ہاں کھڑا تھا۔ دونوں گروہوں میں مذہبی طبقات پیدا ہو چکے تھے اور انہوں نے کاروباری ذہن کے ساتھ اپنے مفاد کی دکانیں کھول لی تھیں۔ فکر و عمل کی حقیقی متاع لٹ چکی تھی صرف باہر چمک دار سائن بورڈ آویزاں تھے۔ سارا زور اپنی اپنی گروہ بندی کو قائم رکھنے اور اپنے اپنے آدمیوں کو اس کے دائرے میں روک رکھنے پر تھا۔ تہذیب کی اصلاح اور آدمیت کا

بھلا کسی کے سامنے نہ رہا تھا۔ ان حالات میں بہ حیثیت مجموعی یہودیوں اور عیسائیوں کی ذہنیت اتنی بگڑ چکی تھی کہ انہوں نے محمدؐ کی قیمتی شخصیت کو جانچنے اور اس کے پیغام کو پرکھنے اور اس کے پیش کردہ نظام کا جائزہ لینے کے بجائے اس کے خلاف ضد اور تعصب اور حسد اور کینہ کے محاذ قائم کر لیے۔ اس کی دعوت کا مقابلہ کیا۔ اس کی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکائے۔ اس کے ساتھ عہد شکنیاں اور غداریاں کیں۔ اس کی تعمیر کو ڈھا دینا چاہا۔ اور اس کے قتل کی تدبیریں کیں۔ پھر اپنے ان کرتوتوں کے فطری نتائج سے جھولیاں بھریں۔ اس طرح تاریخ کے بہتے پانی کو گندے جذبات اور گھٹیا خیالات سے گدلا کیا اور یہی گدلا پانی بہ بہ کر بعد کی نسلوں تک پہنچا۔ انہوں نے کینے اور تعصب کی ایک میراث پیدا کی اور وہ میراث بعد کے یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے محفوظ چھوڑ گئے۔ محمد ﷺ کے ہم عصر یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی فاسد جذباتی رد عمل آج تک ان کے اخلاف کے ذہنوں میں منعکس ہو رہا ہے۔

(۲) اسلام سے قبل کی انسانی دنیا کے اندر مذہبی دائرے میں بھی اور سیاسی میدان میں بھی عیسائیوں کو نمایاں غلبہ حاصل تھا اور پھیلاؤ کی امنگیں کام کرنے کے لیے بڑی وسیع جولانگاہ سامنے رکھتی تھیں لیکن اسلام کے ابھرنے سے گویا ان کی نگاہ میں ایک حریف طاقت آ ابھری اور آہستہ آہستہ نشوونما پا کر دنیا بھر میں ایک فیصلہ کن طاقت بن گئی۔ اس وجہ سے عیسائیت کے سینے میں رقیبانہ جذبات پیدا ہو کر بڑھتے ہی چلے گئے۔ پھر عملاً اسلام کی طاقت نے عیسائیت کے ہاتھوں سے تسلط و اقتدار کی باگیں کرۂ ارضی کے مختلف حصوں میں چھین کر اس کے رد عمل کو اور زیادہ شدید بنا دیا۔ تاریخ کے میدان میں کھلے اور برابر سرابر کے مقابلے میں عیسائیوں نے اسپورٹس مین سپرٹ دکھانے کے بجائے اپنے اندر ایک کد اور ایک چڑ پیدا کر لی۔ یہ کد اور چڑ بنیادی طور پر مسلمانوں کے خلاف تھی اور بالواسطہ طور پر اسلام اور محمد ﷺ سے بھی کھچاؤ بڑھتا گیا۔ یہ کھچاؤ صلیبی جنگوں کے دور میں اپنی آخری انتہا تک جا پہنچا۔ اس دور تک آتے آتے چونکہ خود مسلمانوں میں انحطاط اپنا عمل کر چکا تھا اس لیے ان کی خاص خاص کمزوریاں اور بے راہ رویاں اسلام اور سرور عالم کے ساتھ منسوب کی جانے لگیں اور مسلمانوں کے عمل و کردار کے رنگوں سے سیرت محمدؐ کی ایک غلط تصویر تیار کی جانے لگی۔

(۳) ۔ اسلام اور عیسائیت کے اس لمبے دور کشمکش کے ابتدائی حصے میں پادری گروہ چونکہ اپنے عیسائی عوام کو ذہنی لحاظ سے کامل طور پر اپنے تصرف میں لیے ہوئے تھا اور اسلام اسی گروہ کے طبقاتی مفاد پر ضرب لگانے کا موجب بنا تھا' اس لیے اس گروہ نے محسن انسانیتؐ اور ان کے پیغام کا ایک جھوٹا تصور گھڑا اور گھڑ گھڑ کر اسے گلی گلی پھیلایا۔ قرنوں کے اس پروپیگنڈے نے مغرب کے ذہن کو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا چنانچہ آج بھی سرے سے مذہب کا انکار کرنے والے اور عیسائیت سے آزاد ہو کر سوچنے والے ارباب عقل تک جب اسلام اور محمد ﷺ کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہیں تو وہ آج سے چھ صدی قبل کے تنگ دل اور تاریک خیال پادریوں سے ذہنی سطح میں کچھ بھی بلند نہیں ہوتے۔ چنانچہ اٹھا کے دیکھ لیجیے

مستشرقین کی کتابوں کو کہ کتنی غلط اور ناقص معلومات کس مفسدانہ طریق سے مرتب کر کے لائی گئی ہیں اور دنیا کے سب سے بڑے انسان کی تصویر کس نامعقولیت سے کھینچی گئی ہے۔ کوئی ایک آدھ استثنائی مثال مل جانا اور چیز ہے۔ یہاں تو اُس عمومی انداز کا ذکر ہے جو اہل مغرب کے ہاں پایا جاتا ہے۔

(۴) گذشتہ دو صدی کا عہد مغربی امپریلزم کا شیطانی عہد ہے۔ اس عہد میں مسلمان قومیں اسلام سے انحراف' خدا سے بغاوت اور محمد ﷺ کے اصولوں سے گریز کی سزا پانے کے لیے ایک ایک کر کے مادہ پرست مغرب کے شہنشاہی عزائم کی شکار ہونے لگیں۔ مغرب کے شہنشاہی عزائم کو مسلمانوں کے اندر ہر جگہ ایک سخت درجہ کی مزاحم روح کار فرما ملی اور یہ روح ہر جگہ دینی و مذہبی روح تھی۔ اسلام نے توحید کا جو تصور دیا ہے وہ حریت و آزادی اور مساوات کے ایسے تصورات ابھارتا ہے کہ جو اسلام کے ماننے والوں کو غلامی پر رضامند نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ مسلمانوں کے اندر مغربی امپریلزم کے خلاف جتنی بھی تحریکیں برپا ہوئی ہیں ان کے اندر اسلام کی حرارت کام کر رہی تھی۔ ہر جگہ دینی شخصیتیں رہنمائی کرتی نظر آتی ہیں اور ہر جگہ نظام اسلامی کے احیاء کے ولولے کار فرما رہے ہیں۔ اسی طرح مسلمان ممالک کی تمام تحریکات آزادی میں دینی داعیہ پورے زور سے بر سر عمل ملتا ہے۔ چنانچہ مغرب کے شہنشاہی صیادوں میں اس قوت کے خلاف از سر نو ایک چڑ پیدا ہوئی جو قدم قدم پر ان کا راستہ روکتی تھی اور بار بار ناقابل تسخیر ولولے ابھارتی تھی۔ چنانچہ اس چڑ کی وجہ سے مسلمانوں کی مذہبیت کو جنونی پن سے تعبیر کیا گیا' اور "ملّا ازم" کو ایک خوفناک ہوّا بنا کر پیش کیا گیا۔ اور اب "فنڈا مشلسٹ" کی جدید اصطلاح دریافت ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی روح دینی کچھ ایسی سخت جان پائی گئی کہ جو آسانی سے مغربی فکر اور کلچر کے سامنے شکست کھانے والی نہیں تھی بلکہ جس نے ہر ہر دیس میں اس کا مقابلہ کیا ہے۔ تعلیم' لٹریچر اور اثر اندازی کی پوری قوتیں صرف کر کے مغربی امپریلزم نے برسوں میں جا کر مسلمان قوموں کے اندر سے اپنے حق میں ایک معمولی سی اقلیت حاصل کی۔ اور اسے سہارا دے کر اقتدار تک پہنچایا اور پھر اسے مسلمانوں کے اسلامی رجحانات کے خلاف فکری' سیاسی اور تہذیبی معرکے میں خوب خوب استعمال کیا۔ ان حالات میں اسلام اور اسے پیش کرنے والی ہستی سے مغرب کا کھچاؤ بڑھتا ہی گیا۔

(۵) مغربی قومیں جب مسلمانوں کو غلام بنانے میں کامیاب ہو گئیں تو ان کے لیے یہ مشکل ہو گیا کہ جو طاقت سیاسی و مادی اور تنظیمی و تہذیبی لحاظ سے ان سے پست ہے وہ اس سے نظریہ زندگی اور نظام حیات کا درس لے سکیں۔ اور اسے برپا کرنے والی ہستی کا احترام کر سکیں۔ پھر جب مسلمانوں کو انہوں نے اپنی ذہنی تقلید میں مبتلا دیکھا اور ان پر مرعوبیت کی کیفیت کی پرچھائیں پڑی دیکھی تو اس چیز نے اور بڑی رکاوٹ پیدا کر دی۔ انہوں نے جب اپنے تیار کردہ روشن خیال مسلمانوں کے ہاتھوں اسلام کو مغربی نقطہ نگاہ کے مطابق ڈھلتے دیکھا تو اسلام اور اس کے داعی کی وقعت ان کی نگاہوں میں اور کم ہو گئی۔ مسلمانوں کے معذرت خواہانہ نقطہ نظر نے اسلام کے وقار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو بڑا نقصان پہنچایا۔

ان سارے وجوہ و اسباب کے تحت محمد ﷺ اور مغرب کے انسان کے درمیان آہنی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔

آج مغرب محسنؐ انسانیت کو محض مسلمانوں کے گروہی رہنما کی حیثیت سے لیتا ہے اور سمجھنے سمجھانے کے نقطۂ نگاہ کے بجائے معترضانہ اور مناظرانہ ذہن کے ساتھ سیرت کا مطالعہ کرتا ہے۔ چنانچہ مغرب نے اس بلند مرتبہ ہستی کی جو تصویر اپنے لٹریچر میں تیار کی ہے۔ وہ ایک ایسے آدمی کا نقشہ سامنے لاتی ہے جو نفسیاتی صحت و توازن سے محروم ہے' جس کی ساری تگ و دو لاشعوری محرکات کے رد عمل سے پیدا شدہ خبط کا نتیجہ ہے۔ وہ تیغ خونخوار ہاتھ میں لیے جدھر بڑھتا ہے قتل عام کرتا چلا جاتا ہے۔ اس پیکر رحمت کو ایک دنیا طلب اور جاہ پسند جنگجو کا مرتبہ دے دیا گیا ہے۔ اور اس کے مخلصانہ کام کو ایک فراڈ بنا دیا گیا ہے۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ تحریک اسلامی میں جو جو کچھ اچھے پہلو تھے وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے مستعار لیے گئے تھے۔ ورنہ محمد ﷺ کے اندر اپنا کوئی جوہر قابل نہ تھا۔ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ روحانیت و مذہبیت کا سارا رنگ تو محض نمائشی تھا' در حقیقت ڈرامائی تدابیر سے تسخیر عوام کر کے اپنی مطلب براری کی گئی تھی۔ آپ جسے بھی چاہیں دنیا پرست اور حیلہ ساز آدمی کہہ سکتے ہیں' مگر سوال یہ ہو گا کہ ایسی شخصیت کے اندر اس طرح کا اعلیٰ اور بے داغ کردار کس طرح کھپایا جا سکتا ہے' جس کا تجربہ ہمیں سرور عالم کی پوری زندگی میں ہوتا ہے۔

پھر ظلم یہ ڈھایا جاتا ہے کہ اس صاحب دعوت ہستی کے پیش کردہ پیغام کا مطالعہ جڑ سے شروع کر کے ٹہنیوں اور برگ و بار تک نہیں پہنچایا جاتا بلکہ اساسی نظریہ کو سمجھے بغیر اور فکر کی جڑ کی ماہیت متعین کیے بغیر' مناظرہ باز پادریوں کے نہج پر پڑ کر جزئیاتی مسائل کی چند کونپلوں کو لے لیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ داعی اسلام نے تعدد ازدواج کو جائز رکھا' مذہب کے لیے تلوار اٹھائی' جنگی قیدیوں کو غلام بنانا جائز قرار دیا اور فلاں موقع پر یوں کیا اور فلاں معاملے میں یوں کیا۔ یہ طریق مطالعہ ہمیشہ متعصب اور مخالفانہ ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور اس کے ذریعے کسی نظام زندگی کو اور کسی دین کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس کے ذریعے تو بات کو سمجھنے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ دیکھنے' جاننے اور سمجھنے کی اصل چیز نظریہ' اساسی ہے کہ وہ کہاں تک برحق ہے اور اس سے زندگی کی بگڑی کہاں تک بنتی ہے۔ پھر اس نظریہ سے ماخوذ ہونے والے اصول دیکھے جاتے ہیں کہ جن پر زندگی کے مختلف شعبے استوار ہوتے ہیں۔ پھر ان اصولوں کے فریم میں جزئیات کی ترتیب دیکھی جاتی ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک قائم ہوتی ہے کہ نہیں۔ ایک شخص آپ کے سامنے زندگی کا ایک فلسفہ لے کے آتا ہے۔ آپ اس فلسفہ پر غور کرنے کے بجائے چند ایسے جزئی مسائل چھیڑ دیتے ہیں جن کے بارے میں آپ کے معاشرہ کا ایک خاص ذہن بنا بنایا چلا آتا ہے اور اس ذہن سے باہر نکل کر آپ سوچ نہیں سکتے' نتیجہ یہ کہ خود مغالطوں میں پڑتے ہیں اور ہزارہا لوگوں کو تعصب میں مبتلا کرتے ہیں۔ ایک شخص انسانیت کا ایک مکمل نیا نقشہ اپنی ذات میں بنا کر سامنے لاتا ہے۔ آپ اس نقشے کو

مجموعی طور پر سمجھنے سے قبل اس کی دو ایک لکیروں اور نشانوں کو پکڑ کر بحث شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لکیریں اور یہ نشان یوں کیوں لگائے گئے ہیں۔ حالانکہ اگر نقشے کی مجموعی ترتیب کو ڈھنگ سے سمجھا گیا ہوتا تو ان لکیروں اور نشانوں کی ماہیت بھی از خود سمجھ میں آجاتی۔ مغرب نظریات اور نظاموں کو سمجھنے کے لیے اور تاریخی شخصیتوں کا جائزہ لینے کے لیے جو انتہائی سائنٹفک انداز بالعموم استعمال میں لاتا ہے' وہی اسلام اور محمد ﷺ کا مطالعہ کرتے وقت بالکل بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک باغ پر رائے قائم کرنے کے لیے اس کو مجموعی حیثیت سے سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ نہ کہ اس کے اندر کی گھاس کی دو ایک پتیوں اور کسی پودے کی کونپلوں کو سارے باغ سے الگ کر کے زیر مطالعہ لایا جاتا ہو۔ آپ سیرت محمدیؐ اور پیغام محمدیؐ کے پورے چمن کو دیکھیں' اور اس کی مجموعی ترتیب کو سمجھیں' پھر آپ کو اس کے اندر ایک ایک شاخ اور ایک ایک پتی کا مقام خود ہی سمجھ آجائے گا۔ اگر کسی نظام یا نظریے یا تحریک' یا قائدانہ شخصیت میں چند چیزیں آپ کے ذوق اور آپ کی پسندیدہ روایات اور عادات کے خلاف ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ بس وہاں کوئی قابل قدر چیز ہے ہی نہیں۔ اور وہ پورا مجموعہ مسترد کر دینے کے قابل ہے۔ آپ کا ذوق اور آپ کی پسند کوئی عالمی و تاریخی معیار نہیں ہے۔ ممکن ہے بلکہ لازم ہے کہ ایک نظریہ' نظام تحریک اور قائدانہ شخصیت اپنا معیار خیر و شر اپنے ساتھ لائے اور سرے سے اس کے بھلے برے کے پیمانے ہی آپ سے الگ ہوں' لہٰذا سب سے پہلے تو معیار اور پیمانوں کو بالمقابل رکھ کر جانچنا چاہیے' اور معیار اور پیمانوں کو جانچنے سے قبل اساسی نظریہ کی قدر و قیمت متعین ہونی چاہیے۔

قرآن' اسلام اور محمد ﷺ کے بارے میں جو لٹریچر ارباب کلیسا اور مستشرق مؤرخین نے اب تک پیدا کیا ہے وہ ایک طرف غلط فہمیوں اور جہالتوں سے بھرا پڑا ہے۔ اور دوسری طرف معاندانہ تعصب کا زہر اس کی رگ رگ میں پھیلا ہوا ہے بلکہ حد یہ ہے کہ جن لوگوں نے وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعتراف حقیقت کیا بھی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر تعریفی انداز تک اختیار کیا ہے انہوں نے بھی ایسے ایسے میٹھے ڈنک سحر آگیں الفاظ کے پردوں میں رکھ دیئے ہیں کہ آدمی فریب نگارش کے اس انداز کی داد دیتا رہ جاتا ہے۔ دو چار درخشاں مثالیں ایسی ضرور ملتی ہیں کہ جنھوں نے حضورؐ کے پیغام اور کارنامے کو کسی قدر بہتر انداز میں بیان کیا ہے مگر خود انہیں مغرب کے دل و دماغ نے کچھ زیادہ قدر و قیمت نہیں دی۔ مثلاً حال ہی میں ایک کتاب ذرا بہتر انداز کے ساتھ آئی ہے تو اسے "در مدح مسلمین" (Pro - Mohammaden) قرار دے کر اس کی وقعت گھٹائی جا رہی ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ مسلمان مملکتوں سے آج مغرب کی ڈپلومیٹک اغراض وابستہ ہو رہی ہیں' ان کے تحت ان اقوام کی تالیف قلب کے لیے جانے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ لیکن کہیں بھی اس ظلم کی تلافی کی فکر نہیں کی گئی جو سرور عالم کے ساتھ اب تک روا رکھا گیا ہے۔

تقاضا یہ نہیں کہ آپ ضمیر کی آواز کے خلاف محمد ﷺ کے نظریہ و نظام کی صداقت کی گواہی دیں'

نہیں آپ اختلاف کریں اور پورے زور سے کریں۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے اپنے ہی بنائے ہوئے' اپنے ہی تسلیم کردہ اصولوں اور معیارات کو توڑ موڑ کر حقائق کو مسخ نہ کریں۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ ایسے مآخذ سے روایات نہ لیں جو مسلمانوں کی نگاہ میں بالاتفاق ناقابل استناد ہیں اور جنہیں تاریخی تحقیق کے مسلمہ معیارات قبول نہیں کر سکتے۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ ایک واقعہ کے اچھے محرکات کو ہٹا کر ان کی جگہ دانستہ مکروہ محرکات لا لا کر نہ رکھیں' تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ دلائل سے بات کہیں' طنز و تعریض اور توہین و تذلیل کا غیر شریفانہ ڈھب اختیار نہ کریں۔

اس گفتگو سے ہمارا مدعا ایک ناخوشگوار جذباتی فضا پیدا کرنا نہیں بلکہ اب تک جو فضا موجود رہی ہے' ہم چاہتے ہیں کہ اسے ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے شرط اول یہ ہے کہ مغرب' اسلام' قرآن اور محمد ﷺ کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو صاف کر لے۔ ایک نئے ذہن کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے اور وہ نیا ذہن اس کلمۂ سواء یا نقطۂ اشتراک کو سمجھنے سے پیدا ہو سکتا ہے جو اہل مغرب اور مسلمانوں کے درمیان واقع ہے۔ ہمارا کلمہ سواء ذیل کے مشترک نکات سے بنتا ہے۔

○ عیسائی' یہودی اور مسلمان تینوں خدا پرست گروہ ہیں' تینوں کے ہاں آخرت کا تصور موجود ہے' تینوں کی عبادات کا طرز ملتا ہے' تینوں کے نزدیک بنیادی اخلاقی اقدار یکساں ہیں۔

○ تینوں کی مذہبی تعلیمات ایک ہی الہامی سرچشمہ سے ماخوذ ہیں اور مسلمان جملہ انبیاء کو ایک ہی عظیم صداقت اور ایک ہی دین کے علمبردار مانتے ہیں۔

○ تمدنی حیثیت سے دیکھیں تو اہل مغرب اور مسلمانوں کے درمیان ذیل کے نقطہ ہائے اتحاد موجود ہیں:۔

○ مغربی تمدن نے علم اور سائنس کی ترقی کی جو راہیں کھولی ہیں۔ مسلمانوں کا خالص دینی نقطۂ نظر ان ترقیوں کا قدر شناس ہے اور اسلامی نظریات روحانیت کے ساتھ ساتھ اپنے تمدن میں اس مادیت کو جگہ (تھوڑی سی حدود کے ساتھ) دے سکتا ہے جس میں مغرب نے عروج حاصل کیا ہے۔ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام دین اور نظام ہونے کی وجہ سے زیادہ وسعت ظرف رکھتا ہے۔

○ جمہوریت کے جن اصولوں کے ساتھ مغربی تمدن نے سیاسی ہیئتیں استوار کی ہیں' پیروان اسلام کی فکر میں وہ پہلے سے شامل ہیں' بلکہ ان کا مکمل ترین مظاہرہ کرنے میں اسلامی تمدن ہی نے سبقت کی ہے۔ [1] نمائندگی و انتخاب' شورائیت' قانون کی عمل داری' شہری حقوق اور ان

---

[1] بریفالٹ اور لیبان اور بعض دوسرے مصنفین کی شہادتیں موجود ہیں کہ جمہوریت کی روح مسلمانوں ہی سے منتقل ہو کر مغرب تک پہنچی۔

میں مساوات کے سارے تصورات کو مسلمانوں نے مغرب سے پہلے جامۂ عمل پہنایا ہے اگرچہ وقت کے تمدنی و معاشرتی ماحول کی مطابقت میں!

○ عالمی کھچاؤ اور بحران کو پیش نظر رکھیے تو اس کا حل تلاش کرنے میں بھی دو وجوہ سے مسلمانوں ہی کا تعاون مغرب کے اصلاح پسندوں کے لیے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے۔

○ اگر مغرب سنجیدگی و اخلاص سے سوچے تو امن عالم کے مسئلے میں جتنا تعاون مسلمان بہم پہنچا سکتے ہیں اتنا اور کسی عنصر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی گروہ اعتقاداً اتنی محبت انسانیت رکھتا ہے اور جہانی وحدت کے لیے ایسی اصولی بنیادیں رکھتا ہے کہ اگر اسے پوری طرح کام کرنے کا موقع ملے تو بین الانسانی تصادموں کا انسداد ہو سکتا ہے۔ مستقبل کے عالمی نظام کی تعمیر کے لیے اصول و اقدار کا مسالہ اسلام سے وافر حد تک مل سکتا ہے۔

○ مادیت کی دو انتہا پسندانہ اشکال۔ یعنی سرمایہ پرستی اور کیمونزم ---- دونوں کا مقابلہ کرنے اور ایک درمیانی راہ عدل پر انسانیت کو لانے کے کام میں اسلام اور اس کے پیرووں ہی سے کچھ زیادہ امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

غور و فکر کے لیے یہ مشترک نکات سامنے رکھ کر ہم کہتے ہیں کہ کیوں نہ اہل مغرب اب محمد ﷺ کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بدلیں؟ کیوں نہ وہ پادریوں اور مستشرقین کے حائل کردہ پردہ ہائے تعصبات کو پارہ پارہ کر دیں؟ آج جب کہ مادی نظریہ کا تجربہ دل کھول کر کیا جا چکا ہے اور اب اس تجربہ کو اسی ڈھب سے آگے جاری نہیں رکھا جا سکتا' پھر یہ شاخسار حکمت اب نئی کونپلیں بھی نہیں چھوڑ رہا ہے جن کو مرکز امید بنا کر کچھ اور وقت گزارا جا سکے۔ دوسری طرف جو مذاہب موجود ہیں ان میں سے ہر ایک فرد کی زندگی کے ایک گوشے میں سکڑ کر رہنا پسند کرتا ہے۔ مگر آگے بڑھ کر زمام تمدن ہاتھ میں لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ گویا ہم نظریاتی لحاظ سے ساری پونجی ختم کر کے بالکل دیوالیہ ہوئے کھڑے ہیں۔ لے دے کے ایک مرکز توجہ باقی ہے جہاں سے شعاع امید پھوٹتی ہے۔ اس کے لیے بھی اگر دلوں کے دروازے بند کر لیے جائیں تو آخر مریخ سے تو کوئی رہنمائی درآمد نہیں کی جا سکتی۔

وقت ہے کہ آپ لوگ محمد ﷺ کو ایک تاریخ ساز' ایک محسن انسانیت' ایک قائد تمدن' اور ایک انسان اعظم کی حیثیت سے جانیں۔ جو روشنی وہاں سے ملتی ہے اس کے لیے دل و دماغ کے دریچے کھول دیں۔ یہ ہستی مستحق ہے کہ اسے آپ سائنٹیفک طریق سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ چاہیے یہ کہ آپ اسلام کو عیسائیت کے ایک حریف مذہب کی حیثیت سے نہ لیں' بلکہ جمہوریت' اشتراکیت اور دوسری اصولی تحریکوں کی طرح کی ایک تحریک اور زندگی کے ایک تہذیبی نظام کی حیثیت سے لیں' اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تحریک کے قائد اور خدائی ہدایت کے تحت ۔ اس نظام کے موسس کی حیثیت سے دیکھیں جنہوں نے ایک عظیم اور روشن دور تاریخ کا افتتاح کیا۔ اس ہستی کے پیش کردہ اصولوں کو آپ اس لحاظ سے

جانچیں کہ وہ ایک جہانی ریاست چلانے کے لیے آج کہاں تک مفید اور ناگزیر ہیں۔ اس کے تیار کردہ نمونہ انسانیت کا مطالعہ اس مقصد سے کریں کہ یہ نمونہ جوہری تہذیب کا کل پرزہ بننے کے لیے کس حد تک موزوں ہے۔

آج جب کہ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہمارے سامنے ہے اور دور دور تک کوئی شرر بھی چمکتا دکھائی نہیں دیتا' پیچھے پلٹ کر نظر ڈالتے ہیں تو محسن انسانیت ﷺ کے ہاتھوں میں ایک مشعل جھلملاتی دکھائی دیتی ہے جو گزشتہ چودہ صدیوں سے آندھیوں اور طوفانوں کے درمیان ایک ہی شان سے جل رہی ہے۔ کیا محض خود پیدا کردہ تعصبات اور غلط فہمیوں کی بنا پر اس مشعل کی روشنی کو قبول کرنے سے انکار کر دینا اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لینا کوئی اچھا نتیجہ دے سکے گا؟ کیا انسانیت و تہذیب کو اس اندھیرے میں تباہ و برباد ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائے؟ حالات آپ کے سامنے کتنا خوف ناک چیلنج لیے کھڑے ہیں' آیا آپ میں اس کا جواب دینے کی سکت موجود ہے؟

لیکن حق یہ ہے کہ اصل مجرم ہم خود ہیں۔ اور ہم ہی محسن انسانیتؐ کی شخصیت' پیغام اور کارنامے کو دنیا سے بھی اوجھل رکھنے والے ہیں اور اپنی نگاہوں سے بھی چھپانے والے۔ آج محسن انسانیتؐ کی ہستی کا از سر نو تعارف کرانے کی ضرورت ہے اور یہ خدمت شاید جوہری توانائی کے انکشاف سے زیادہ بڑی خدمت ہو گی!

یہ کتاب:

سیرت پاک پر اعلیٰ درجہ کی علمی و تحقیقی کتابوں کے موجود ہوتے ہوئے میں نے اس کٹھن وادی میں اپنی بے بضاعتی کے باوجود اس جذبے سے قدم رکھنے کی جسارت کی ہے کہ محسن انسانیت کی ہستی اس حیثیت سے ایک بار پھر بے نقاب ہو جائے کہ وہی زندگی کے شعور کا واحد سرچشمہ ہے۔ سیرت نگاری کے نہایت ہی قابل احترام شاہکار جو ہمارے سامنے موجود ہیں' ان میں پورا واقعاتی مواد ضرور موجود ہے لیکن قاری کہیں تو روایات کے اختلاف اور تحقیقی بحثوں میں کھو جاتا ہے' کہیں واقعات کے ربط و تسلسل کا سر رشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے' کہیں اس کے سامنے جزئیات آتے ہیں کہ جن کی واضح معنویت اور قابل اطمینان توجیہہ اس کے ہاتھ نہیں آتی' کہیں علمی نکات اور تحقیقی مواد اور حوالوں کی کثرت اسے مرعوب کر دیتی ہے' لیکن دفتروں کے دفتر بھی وہ اگر پڑھ جاتا ہے تو اس کے باوجود وہ ایک تحریک کو اپنے سامنے موجزن نہیں دیکھتا۔ وہ کشمکش کے اس منظر کو دیکھ نہیں پاتا جو حضورؐ کی دعوت سے برپا ہوئی۔ وہ اپنے آپ کو اس دور میں نہیں پاتا جس کی روح رواں نبی اکرمؐ کی ہستی تھی۔ وہ مطالعہ کی وادیوں سے یہ احساس لے کے نہیں پلٹتا کہ میں بھی حضورؐ کی تحریک کا ایک موجۂ بیتاب ہوں اور اپنے ماحول کی تیرگیوں کے خلاف جدوجہد کرنے کا فرض مجھ پر بھی عائد ہوتا ہے۔ مجھے بھی حضورؐ کے کلمۂ حق کی مشعل کو فضاؤں میں

بلند رکھتا ہے' اور اس کی روشنی کو اتنا فروغ دیتا ہے کہ تمدن کی دنیاؤں میں ایک صبح عالم تاب جلوہ فرما ہو جائے۔

یہی ایک پہلو ایسا ہے جس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ ناچیز سی تصنیفی کوشش کی گئی ہے۔ مطالعہ تاریخ کے لیے میں نے قرآنی زاویہ نگاہ اختیار کیا ہے۔ میرے نزدیک ہر چہار جانب پھیلی ہوئی دنیا حرکت اور گردش کی دنیا ہے۔ تغیر اور تنوع کی دنیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسابقت اور کشمکش اور جہاد اور معرکے کی دنیا ہے۔ اس میں کشش بھی کام کرتی ہے' مزاحمت بھی! اس میں عمل بھی پایا جاتا ہے رد عمل بھی! اس میں تخریب بھی ہے' تعمیر بھی! اس میں روشنی اور ظلمت ایک دوسرے کے درپے ہیں! اس میں رات اور دن ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں! اس میں موت اور زندگی دست بہ گریباں ہیں! اس میں آگ اور پانی باہم دگر آویزاں ہیں! اس میں خزاں اور بہار ایک دوسرے کی گھات میں بیٹھے ہیں! غرضیکہ اس دنیا کے کسی بھی عالم اور کسی بھی گوشے پر نظر ڈالیے' اضداد کے جوڑے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ کر مصروف جہاد دکھائی دیتے ہیں۔ اس کائنات کے ایک حقیر سے مکانی گوشے میں انسانی زندگی کی سب سے زیادہ پر ہنگامہ رزم گاہ واقع ہے۔ ہمارا نظام تمدن و معاشرت ایک طوفانی سمندر ہے جس میں موجوں سے موجیں' حبابوں سے حباب اور قطروں سے قطرے ہر ہر آن ٹکرا رہے ہیں۔ یہاں حق اور باطل' خیر اور شر' سچ اور جھوٹ' انصاف اور ظلم اور نیکی اور گناہ کے درمیان از آدمؑ تا ایں دم ایک لمبا معرکہ لڑا جا رہا ہے۔ اس معرکہ کی باگ ڈور انسانی روح و نفس کے ہاتھ میں ہے جس کے سرچشموں سے گوناں گوں خیال اور عقیدے اور نظریے پے بہ پے امڈ رہے ہیں۔ متنوع کردار نمودار ہو رہے ہیں اور متضاد فطرت کے اجتماعی نظام ظہور کر رہے ہیں۔ ہر خیال' عقیدہ' نظریہ' کردار اور نظام اپنی ضد ایک ہمزاد کی طرح ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے' اور ہر طاقت جو ابھرتی ہے اپنی حزب اختلاف کو جلو میں لے کے آتی ہے۔ اس اختلاف و تضاد سے وہ ہرجتی اور ہمہ گیر تصادم پیدا ہوتے ہیں جنھوں نے ہماری ساری تاریخ کو ایک داستان جہاد بنایا ہے اور آج یہ داستان جہاد ہمارے اپنے ہی خون کی روشنائی سے باب در باب اور فصل در فصل لکھی ہوئی ہمارے سامنے موجود ہے۔

تمدن انسانی کی باہم ترکیب یافتہ دنیاؤں میں جو ہر آنی اور ہرجتی جہاد کہیں دلائل اور کہیں تلواروں سے لڑا جا رہا ہے۔ اس میں انسان کے دو ہی پارٹ رہے ہیں۔ ایک طرف سے وہ شر و فساد کا علمبردار بن کے اٹھتا ہے۔ دوسری طرف سے وہ خیر و فلاح کا داعی بن کر میدان میں اترتا ہے۔ کبھی وہ تخریب اور بگاڑ کی قوتوں کا سرگرم آلہ کار بنتا ہے' کبھی تعمیر اور بناؤ کے داعیات پر لبیک کہتا ہوا سامنے آتا ہے۔ انسانیت کے کچھ شیطانی پیکر وہ ہیں جو زندگی کو دکھوں اور مصیبتوں سے بھر دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیتے ہیں' دوسری طرف کچھ پیکر وہ بھی ہوتے ہیں جو امن و مسرت کی ایک ارضی جنت تعمیر کر دینے کے لیے اپنا سارا سرمایہ حیات کھپا دیتے ہیں۔ معرکہ حیات کے کچھ جانباز وہ ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں بدی'

جھوٹ اور ظلم کا ہر طرف دور دورہ ہو جاتا ہے اور جہاد ہستی کے کچھ وہ سپاہی ہوتے ہیں جو نیکی اور سچائی اور انصاف کا سکہ چلا کے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

یہی نیکی اور سچائی اور انصاف کے سپاہی ہیں کہ جنھوں نے زندگی کو وہ کچھ دیا ہے جس کے ہوتے ہوئے یہ بسر کیے جانے کے کچھ قابل ہوئی ہے۔ تمدن میں آج جو جو پہلو بھی کسی قدر و قیمت سے مالا مال دکھائی دیتے ہیں وہ انھی مایہ ناز ہستیوں کا فیضان ہے۔ انھوں نے انسان کے سامنے نمونہ کی زندگی پیش کی ہے' انھوں نے تمدن و معاشرت کا ایک معیار اور آئیڈیل ہمارے سامنے رکھا ہے' انھوں نے ہمیں زریں اصول اور مقاصد دیئے ہیں' انھوں نے تاریخ کی رگوں میں زندہ و پائیدار روایات کا خون دوڑا دیا ہے' انھوں نے اخلاقی اقدار کے تارے آسمان تہذیب پر جگمگا دیئے ہیں' انھوں نے آدمی کو حوصلے اور ارمان اور امیدیں اور ولولے دیئے ہیں' انھوں نے اصول و مقاصد کے لیے قربانی اور جد و جہد کا درس دیا ہے۔ یہی ہستیاں ہیں کہ جن کے روشن کارناموں کے طفیل تاریخ اس قابل ہوئی کہ اس کا ریکارڈ محفوظ رکھا جائے اور اس سے قیامت تک نوع انسانی نت نئی روح عمل اخذ کرتی رہے۔

پھر جب کبھی بدی اور جھوٹ اور ظلم کی طاقتوں نے ایک سنگین نظام اور ایک آہنی ماحول بن کر زندگی کو خوب اچھی طرح گھیر اور بھینچ لیا ہے اور آدمی ہمت ہار کر مایوسی کے گڑھوں میں جا گرا ہے تو ایسے موقعوں پر تاریخ کے یہی ہیرو نوع انسانی کے کام آئے ہیں اور انھوں نے سوتوں کو جگایا' گرتوں کو اٹھایا' بزدلوں کو شجاعت کا آب حیات پلایا اور ہتھیار ڈال دینے والوں کو از سر نو میدان کارزار کی اگلی صفوں میں کھڑا کر کے شر و فساد کی قوتوں سے لڑایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان مایہ ناز ہستیوں نے تاریخ کے جمود کو توڑا ہے۔ تمدن کے یخ بستہ سمندر میں پھر حرکت پیدا کی ہے' فکر و عمل کی رکی ہوئی ندیوں کو نئے سرے سے بہاؤ دیا ہے۔ اور تغیر کی رو اٹھا کر سنگین نظام اور آہنی ماحول کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ کاروان انسانیت اپنے ارتقا کے صراط مستقیم پر بے روک ٹوک رواں دواں ہو گیا!

خیر و فلاح' تعمیر اور بناؤ کی مہم میں حصہ لینے والوں کی صفوں کا جب بھی جائزہ لیا جائے۔ ان میں خدا کے انبیاؑ و رسلؑ کی صف اول ہی اپنی امتیازی شان کی وجہ سے ہم سے بیش از بیش خراج عقیدت حاصل کرتی ہے۔ باقی جتنی بھی صفیں صدیقین' شہداء اور صالحین کی آراستہ نظر آتی ہیں وہ سب کے سب اسی صف اول کے کارناموں کی خوشہ چین اور اسی کی کمانڈ میں کام کرنے والی ہیں اور انبیاءؑ و رسلؑ کی صف مقدس میں نگاہ بے اختیار جس ہستی پر سب سے پہلے جا کر ٹکتی ہے وہ سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و سلم کی ذات مبارک ہے! یہ ہے تاریخ کا سب سے بڑا محسن انسانیت! اس ہستی کو جس پہلو سے دیکھیے اس کی گوناگوں عظمتیں درخشاں نظر آتی ہیں اور ان عظمتوں کی قصیدہ خوانی کرتے کرتے گزشتہ چودہ صدیوں میں نہ جانے نسلاً بعد نسل کتنے عقیدت مندان رسالت دنیا سے رخصت ہو گئے' مگر حق یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو سکا! اور آئندہ بھی یہ حق کس سے ادا ہو گا؟ محض ایک جذبہ شوق کا تقاضا ہے کہ جس سے پہلے بھی سرشار

رہے اور پچھلے بھی سرشار رہیں گے۔ جناب ماہر کی اکساہٹ سے ہی اسی جذبہ شوق کے تحت راقم الحروف کے جی میں آئی کہ آنحضورؐ کی سیرت کے اس عظیم پہلو کو اجمالاً نمایاں کیا جائے کہ آپؐ نے اپنی قوم اور انسانیت کی تعمیر و فلاح کے لیے جب میدانِ میں قدم رکھا تو کس ظلم و تشدد سے آپؐ کا خیر مقدم کیا گیا اور کس طرح ساری عمر ایک بے مثال محسن کے احسان کا جواب اندھی مخالفتوں اور ذلیل قسم کی شرارتوں سے دیا جاتا رہا' اور دوسری طرف اس ظلم و تشدد اور ان مخالفتوں اور شرارتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے رسول پاکؐ نے کس سیرت و کردار کا مظاہرہ کیا! ـــــ حدیث دلبر کے اس درد بھرے پہلو میں ان کے لیے بھی ایک سبق ہے جو نیکی کا راج قائم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیں اور ان کے لیے بھی ایک سبق ہے جو ایسی کسی جدوجہد کی مزاحمت کرنے کے لیے اٹھیں۔

یہ ہے تاریخ انسانیت میں محمد ﷺ کا مقام! ــــ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ وہ سب سے بڑا تاریخ ساز تھا۔

انسانی فلاح و بہبود کے سب سے بڑے اس کام کو کرنے کے لیے جب حضرت خاتم النبیینؐ تشریف فرما ہوئے تو وہ ساری عقوبتیں اور ایذائیں جو جملہ انبیاءؑ و رسلؑ پر مختلف زمانوں میں آزمائی گئی تھیں' شیطان یک دم ان سب کو جمع کر کے لایا اور ایک یکہ و تنہا یتیم نوجوان کو چومکھی لڑتے رہنے پر مجبور کر دیا! سیرت نبویؐ کا منظر کچھ ایسا ہے جیسے تاریخ کے طوفانی سمندر میں بغیر کشتی اور چپو ار کے کوئی پیراک موجوں گردابوں اور نہنگوں سے لڑ رہا ہو۔ زفیریں بجاتی ہوئی تیز و تند ہوائیں چل رہی ہوں' کالی گھٹاؤں کا غیظ و غضب برق و رعد کی چمک اور کڑک بن کر امڈا پڑتا ہو' اولوں کی بوچھاڑیں پڑ رہی ہوں ــــ لیکن شناور پھر بھی اپنا راستہ نکالتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہو! کیا تاریخ کے پاس رقت انگیز مظلومیت اور ایسے عزم آموز استقلال کی کوئی مساویانہ مثال ہے؟

معرکہ خیر و شر کا ڈرامہ جب بھی اسٹیج ہوتا ہے۔ اس کے بنیادی کردار ہمیشہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ زمانہ بدل جاتا ہے' جغرافیائی ماحول نیا پیدا ہو جاتا ہے' اشخاص کے نام بدل جاتے ہیں' لیکن ان کا مقررہ پارٹ نہیں بدلتا' ایک کردار صاحب دعوت کا کردار ہوتا ہے۔ دوسرا کردار سوسائٹی کے اس جوہر خالص کا ہوتا ہے جو سچائی اور نیکی کی پکار سنتے ہی آواز کو اپنے فطری ذوق سے پہچانتا اور اس پر بے دھڑک لبیک کہتا ہے اور سابقون اولون کا موقف سنبھالتا ہے۔ تیسرا کردار اخلاص کے ساتھ اختلاف کرنے والوں کا ہوتا ہے جو بات کو سنتے ہیں' سوچتے ہیں مگر علم و شعور کی کوتاہی اور بعض ذہنی نفسیاتی رکاوٹوں کی وجہ سے حقیقت کو پوری طرح سمجھنے میں دیر لگاتے ہیں۔ چوتھا نہایت ہی سرگرم اور ہنگامہ آرا کردار دشمنان حق کا ہوتا ہے جو اپنے مفاد اور اپنے مناصب اور اپنے مرتبے اور اپنی بگڑی ہوئی عادات کی وجہ سے اول روز سے جانتے بوجھتے ضدم ضدا کے اسلوب پر مخالفت کی مہم چلاتے ہیں اور روز بروز اس کی رو میں بہتے ہی چلے جاتے ہیں' پانچواں کردار کمزور عوام کا ہوتا ہے جو معاشرہ کے اونچے طبقوں کے زیردست ہونے کی وجہ سے کوئی جرأت مندانہ اور فعالانہ اقدام نہیں کر سکتے اور نہ ذہنی طور پر آسانی سے کسی دعوت کی تہ تک پہنچنے کی

صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ بالعموم داعی حق اور دشمنان حق کی کشمکش کو سالہا سال تک تربص کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں اور جب آخر کار پانسہ کسی طرف پلٹ جاتا ہے تو پھر یہ سیلاب قوت بھی حرکت میں آتا ہے اور اسی رخ بہہ نکلتا ہے۔ پس معرکہ خیر و شر کے ڈرامے کی گرما گرمی دو ہی کرداروں کی مرہون منت ہوتی ہے! یعنی داعی حق اور اس کے رفقاء کا کردار' اور جوابی اور حتی طوفان اٹھانے والے فعال مخالفین کا کردار! ناممکن ہے کہ دعوت حق کا کھیل کھیلا جائے اور یہ دونوں کردار آمنے سامنے نہ آجائیں! ناممکن ہے کہ سچائی اور نیکی کی آواز اٹھایئے تو اس کے جواب میں جھوٹ اور برائی کی ساری طاقتیں امڈ کر نہ آجائیں! ناممکن ہے کہ انسانیت کی بھلائی اور خدمت کے لیے کام شروع کیجیے۔ تو دنیا گالیوں اور الزامات اور پروپیگنڈوں اور سازشوں اور تشدد کے مختلف ہتھیاروں کے ساتھ ہجوم کر کے نہ آجائے۔

نبی اکرم ﷺ بھی اگر محض کچھ اچھی باتیں سوچتے اور کہتے رہتے' اپنے پسندیدہ طریقے پر خدا کے سامنے رکوع و سجود کرتے رہتے' کسی خلوت میں بیٹھے ذکر و اذکار فرماتے رہتے' بلکہ اچھے اچھے وعظ بھی فرماتے رہتے اور "مریدوں" کا ایک حلقہ یا اپنے متبعین کی ایک بے ضرر سی انجمن بھی بنا ڈالتے تو زمانہ یہ سب کچھ برداشت کر لیتا' لیکن آپؐ ساری زندگی کو بدلنے چلے تھے' آپؐ تمدن کی ساری عمارت کی تعمیر نو چاہتے تھے۔ آپؐ نظام اجتماعی کو ادھیڑ کر بہترین نقشے پر از سر نو بنانے پر مامور تھے' آپؐ مفاد اور حقوق کے اس سارے توازن کو درہم برہم کر دینے کے درپے تھے جو آہنی مضبوطی کے ساتھ قائم تھا' آپؐ انسان کو ایک نئے اعتقادی و اخلاقی سانچے میں ڈھالنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے' پہلے دن سے آپؐ نے اسی چیز کی دعوت دی اور پہلے دن سے قوم نے آپؐ کی دعوت کا یہی مفہوم سمجھا۔ چنانچہ سارے کا سارا جوابی رویہ اسی مفہوم کے فطری رد عمل سے پیدا ہوا۔

نیکی اور سچائی کی ہمہ گیر تحریک کے مخالفین کا کسی بھی دور میں جائزہ لیجیے۔ تو دیکھیے گا کہ ان کے منفی ہنگاموں کی تدریج اور تکنیک ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ سب سے پہلے ہمیشہ معمولی سی استہزاء و تضحیک سے کام لیا گیا' پھر اگلے مرحلے میں گالیوں اور طعنوں' جھوٹ' افترا اور نکتہ آفرینیوں اور بدنام کن القابات کا طوفان اٹھایا گیا' پھر عوام میں غلط فہمیاں پھیلانے کے لیے جھوٹے پروپیگنڈے کا زور باندھا گیا' معاملہ اور آگے بڑھا تو ایک طرف قومی مفاد اور اتحاد کے خطرے میں پڑنے کا واسطہ دلایا گیا۔ اور دوسری طرف مذہبی بنیادوں پر جاہل عامی طبقے میں اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ بیچ بیچ میں عقلی دلائل کے تیر تکے لڑائے جاتے رہے۔ اعتراضات اور سوالات کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ جب محسوس ہوا کہ ایک خطرناک دعوت زور پکڑ رہی ہے تو سودا بازی کی کوششیں کی گئیں۔ سارے حربے ناکام دیکھ کر تشدد کے نہایت ذلیل طریقے اختیار کیے گئے۔ اور معاشی اور سوشل بائیکاٹ کا دباؤ ڈالا گیا۔ قید و بند اور جلا وطنی کے منصوبے عمل میں لائے گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر داعی حق کے قتل کے ارادے کیے گئے۔ اگر معاملہ اس مرحلے سے بھی آگے نکل گیا تو معرکہ کارزار گرم کر کے دعوت مبارزت دی گئی۔ یہ سارے مراحل حضرت سیدنا خاتم المرسلین

ﷺ کو یکے بعد دیگرے پیش آئے' لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر مرحلے سے شاندار کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا اور وہ دن آیا کہ سارا عرب حضور ﷺ کے قدموں میں تھا۔

اس کتاب میں سیرت پاک کے مستند واقعاتی مواد کو پورے ربط و تسلسل کے ساتھ ایسے انداز سے لایا گیا ہے کہ اس عظیم معرکہ خیر و شر کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جسے تاریخ کا جمود توڑ کر حضور نے برپا کیا' اور پھر عمر کی ایک ایک گھڑی اس میں کھپا دی۔ مجھے امید ہے کہ قاری اس کا مطالعہ کرتے ہوئے چودہ صدیوں کا فاصلہ عبور کر کے اپنے آپ کو محسن انسانیتؐ کے قریب محسوس کرے گا۔ اسے واقعات کی رو اپنے سامنے چلتی معلوم ہو گی' وہ تحریک اسلامی کی لہروں کو اپنے عالم تصور میں امنڈتے دیکھے گا۔ وہ حق و باطل کی اس کشمکش کا غیر جانب دار تماشائی بن کے کنارے بیٹھا نہ رہ سکے گا' بلکہ اس کے اندر مثبت جذبے ابھریں گے۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ تاریخ انسانی میں میرا حصہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے!

مجھے امید ہے کہ اس کتاب سے عزیمت و استقلال کا درس حاصل کیا جا سکے گا۔ اور مشکل ترین حالات میں ادائے فرض کا حوصلہ پیدا ہو گا۔ اس کے مطالعہ سے اپنے سب سے بڑے محسن ﷺ کی صحیح قدر دلوں میں پیدا ہو گی۔ ایک گہرا جذبہ سپاس ابھرے گا۔ ایک وابستگی و عقیدت آپؐ کی ذات کے لیے پیدا ہو گی جو مطلوب دین ہے۔ یہ اندازہ کیا جا سکے گا کہ آج جس نور حق سے ہمارے سینے روشن ہیں اس کو لانے والا کیسی کیسی آزمائشوں سے گزر کر کیسی کیسی مخالفتوں کا مقابلہ کر کے' کیسے کیسے رہزنوں کے حملوں کی زد پر آکر اور خون اور آنسوؤں کے کیسے کیسے سمندروں کو پار کر کے اسے ہم تک پہنچا سکا ہے اس سے یہ شعور حاصل ہو گا کہ سچائی اور نیکی کے علمبرداروں کی راہ پر آشوب گھاٹیوں سے ہو کر نکلی ہے اور اس راہ کو جب محمد ﷺ جیسی مقبول بارگاہ اور یکتائے روزگار ہستی کے لیے کانٹوں سے صاف کر کے پھولوں کے فرش سے آراستہ نہیں کیا گیا تو اب اور کس کے لیے کوئی ایسا خفیہ شارٹ کٹ نکال دیا جائے گا کہ آدمی اپنے گوشہ عافیت سے اٹھے تو بغیر پاؤں پر گرد پڑے سیدھا جنت میں جا پہنچے۔ جناب رسالت مآبؐ کی دکھ بھری کہانی پڑھنے سے وہ سارے مغالطے اور من گھوتے کافور ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے آدمی عافیت اور خدا پرستی کو جمع کیے امن چین سے پڑا رہتا ہے۔ ہمیں سیرت نبویؐ کی روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ اگر وہ سنگ میل کہیں دکھائی نہیں دیتے' وہ نشانات راہ سامنے نہیں آتے' وہ موڑ اور نشیب و فراز پیش نہیں آتے۔ وہ کانٹے اور پتھر راستے میں نہیں پڑتے' وہ رہزن اور غول بیابانی حملہ آور نہیں ہوتے' وہ ٹھوکریں نہیں لگتیں۔ وہ چرکے نہیں آتے جن کے تذکرے سے قرآن کے صفحات اور سیرت کے ابواب بھرے پڑے ہیں تو ہمیں اپنی سمت سفر پر' اپنی منزل مقصود پر' اپنی اختیار کردہ راہ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ "کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است" اس کے مطالعہ سے ہر مسلمان پیشتر سے خبردار رہ سکتا ہے کہ اس امت میں جب کبھی بھی کوئی شخص یا گروہ دعوت نبیؐ اور تحریک نبویؐ کو لے کے اٹھے گا اور اسی طریقے پر کام کرنا چاہے گا۔ تو اس کے خلاف استہزاء و تحقیر' دشنام طرازی' الزام تراشی'

نکتہ آفرینی' اشتعال انگیزی' تکفیر و تفسیق' جھوٹے پروپیگنڈے' سازش اور شرارت' ظلم اور تشدد کے وہ سارے طوفان اٹھ کھڑے ہوں گے جو اس کام کے لیے مقدر ہیں۔ ان طوفانوں میں گھرے ہوئے کسی بھی دور میں اٹھنے والے داعی حق کو پہچاننا اور اس کی بات کو سمجھنا اور اس کی پکار پر لبیک کہنا صرف ایسے ہی لوگوں کے لیے آسان ہو سکتا ہے جو قرآن اور سیرت نبویؐ کے مطالعے سے معرکہ خیر و شر کے ڈرامے کے پیش آئندہ ہر ایکٹ اور منظر کا صحیح تصور پہلے سے رکھتے ہوں۔ ہر مسلمان کو یہ جاننا چاہیے کہ باطل کی وہ طاقتیں جنہوں نے نبی اکرمؐ جیسی بے داغ شخصیت کو نہ بخشا اور جنہوں نے بعد میں حضورؐ کی پیروکار ہستیوں ---- امام حسینؓ' امام مالکؒ' امام احمدؒ بن حنبل' امام ابو حنیفہؒ' حضرت مجدد الفؒ ثانی۔ شاہ ولی اللہؒ کو بچ کے نہ جانے دیا وہ کسی اور کو کہاں اپنی کرم فرمائیوں سے مستثنیٰ رکھنے پر تیار ہو سکتی ہے۔ سیرت نبوی ہمیں ہر دور میں داعیان حق اور دشمنان حق کے کردار میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔ میں نے ان سارے کرداروں کو اس کتاب میں نمایاں کر دینے کی کوشش کی ہے جو معرکہ خیر و شر میں کام کرتے ہیں!

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اس خوف ناک تضاد کا احساس دلائے گا جو ہمارے ایمان بالرسالت اور ہماری عملی زندگیوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ آج کوئی ایک سرزمین بھی ایسی نہیں ہے جہاں محسن انسانیتؐ کا نظام حیات برپا ہو کر کام کر رہا ہو۔ عالم اسلام بادشاہتوں اور آمریتوں کی جولانگا بنا ہوا ہے جن کے دم سے ایک طرف قدیم ظلمتیں ہمارے گرد محیط ہیں اور دوسری طرف جدید دور کی تاریکیاں ہم پر مسلط ہیں' ذہنی لحاظ سے ہم جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ معاشی لحاظ سے مفلوک حالی میں مبتلا ہیں۔ ثقافتی لحاظ سے دوسروں کے بھکاری ہیں اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم دونوں بلاکوں کے لیے سستا شکار ہیں۔ یہ ہے اس تضاد کی سزا جسے ہم بھگت رہے ہیں!

اس کتاب کا اصل پیغام یہ ہے کہ ہم محسن انسانیتؐ کی دعوت کا احیاء کریں' حضورؐ کے قائم کردہ خطوط پر تبدیلی احوال کے لیے جد و جہد کریں اور نظام عدل و رحمت کو ٹھیک اس عملی نقشہ پر استوار کریں جو قرآن کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اس قائد انسانیت نے وضع کیا تھا! وقت آگیا ہے کہ ہم اور ہمارے نوجوان تہذیب حاضر کی مرعوبیت کا بوجھ سر سے اتار پھینکیں اور اس مادہ پرستانہ دور کے خلاف فکری بغاوت کا علم اٹھائیں۔ محمد ﷺ کی سیرت کو کتابوں کے صفحات سے نکال کر نئے سرے سے عملی زندگی کے اوراق پر رقم کریں۔ اسے ایک اجتماعی نظام کی صورت میں مرتب کر دیں' اور راہ نجات کھولنے والی وہ تیسری طاقت بنیں جس کی جگہ تاریخ میں خالی پڑی ہے۔

خدائے رحیم اس ناچیز سعی کو قبول کرے اور اسے اپنے مقاصد میں کامیاب کرے!

نعیم صدیقی

یکم دسمبر ۱۹۵۹ء



محسنِ انسانیت ﷺ

مخالفتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے

تعارف

شخصیت ——— ایک نظر میں

وَاِذَا نَظَرْتَ اِلٰی اَسِرَّةِ وَجْهِهٖ
بَرَقَتْ كَبَرْقِ الْعَارِضِ الْمُتَهَلِّلِ

ابوکبیر ہذلی

جب میں نے اُس کے روئے تاباں پر نگاہ ڈالی تو اُس کی شانِ رخشندگی ایسی تھی جیسے کہ کسی لکۂ ابر میں بجلی کوند رہی ہو[ف]!!

ف: رنگِ تغزل سے مملو یہ شعر دورِ جاہلیت کے ایک مشہور شاعر ہذلی کا کہا ہوا ہے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ نے بے تکلفی کے ایک موقع پر بڑے لطیف انداز سے حضورؐ کو اس کا مصداق ٹھہرایا۔

ایک جھلک ❶ :

"یہ چہرہ ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔" (عبداللہ بن سلام)

دنیا میں عظیم کارنامے انجام دینے والی ہستیاں (خصوصاً انبیاء علیہم السلام) ہمیشہ غیر معمولی درجے کی شخصیتوں سے آراستہ ہوتی ہیں۔ اصلاح کے کام' تحریکوں کی رہنمائی' تہذیبوں کی تعمیر نو کرنے والوں کی اصل قوت ان کی شخصیت ہی ہوتی ہے جو خاص طرح کے افکار و کردار سے بنتی ہے۔ سیرت پاکؐ کے مطالعہ کی ایک غایت یہ بھی ہے کہ محسن انسانیتؐ کی شخصیت کو سمجھا جائے۔

کسی بھی شخصیت کو سمجھنے میں اس کی وجاہت بہت بڑی مدد دیتی ہے۔ آدمی کا سراپا' اس کے بدن کی ساخت' اس کے اعضاء کا تناسب خاص' اس کے ذہنی اور اخلاقی اور جذباتی مرتبے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ خصوصاً چہرہ ایک ایسا قرطاس ہوتا ہے جس پر انسانی کردار اور کارناموں کی ساری داستان لکھی ہوتی ہے اور اس پر ایک نظر ڈالتے ہی ہم کسی کے مقام کا تصور کر سکتے ہیں۔

ہم بعد کے لوگوں کی یہ کوتاہیٔ قسمت ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان کا روئے زیبا ہمارے سامنے نہیں ہے اور نہ ہم عالم واقعہ میں سر کی آنکھوں سے زیارت کا شرف حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم حضورؐ کے حسن و جمال کی جو کچھ بھی جھلک پا سکتے ہیں' وہ حضورؐ کے پیغام اور کارنامے کے آئینے ہی میں پا سکتے ہیں۔

حضورؐ کی کوئی حقیقی شبیہ یا تصویر موجود نہیں ہے۔ خود ہی حضورؐ نے امت کو ان سے باز رکھا۔ کیونکہ تصویر کا فتنہ شرک سے ورے ورے نہ رک سکتا۔ حضورؐ کی اگر کوئی تصویر موجود ہوتی تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا کیا کرامات اور اعجاز منسوب ہو جاتے۔ اور اس کے اعزاز کے لیے کیسی کیسی رسمیں اور تقریبیں نمودار ہو چکی ہوتیں بلکہ بعید نہ تھا کہ اس کی پرستش ہونے لگتی۔ یورپ میں حضورؐ کی فرضی تصاویر بنائی جاتی رہی ہیں لیکن کون سا آرٹسٹ ایسا ہے کہ جو حضورؐ کے عالم خیال اور کردار کا شوشہ بہ شوشہ کامل اور جامع تصور رکھتا ہو اور پھر اس تصور کو لکیروں اور رنگوں میں پوری طرح جلوہ گر کر سکے۔ فرضی تصویریں جو کچھ بھی بنتی ہیں وہ اس مخصوص پیکر کی نہیں ہوتیں جس کا اسم مبارک محمدؐ تھا بلکہ کسی موہوم وجود کا خاکہ گھڑ کر اس کو حضورؐ کا نام دے دیا جاتا ہے۔ معاملہ دیانت کے تابع بھی نہیں رہتا۔ بلکہ دانستہ ایسی تصویریں پیش کی جاتی ہیں جن سے ایک کمزور اور ناقص شخصیت کا تصور پیدا ہو۔ ان تصاویر کے لیے رنگ انہی متعصبانہ تصانیف اور تذکروں سے لیا جاتا ہے جو عناد' کج فہمی اور حقیقت ناشناسی کی مظہر ہیں۔ انبیاءؑ اور صلحاء کی فرضی تصاویر بنانے یا ان کے کردار ڈراموں میں لانے سے نقصان یہی ہے کہ ان کے اصل کردار ان پردوں کے پیچھے بالکل گم ہو کے نہ رہ جائیں اور دیکھنے والوں پر غلط اثر پڑے۔

لیکن حضورؐ کے صحابیوں نے کم سے کم پردۂ الفاظ میں حضورؐ کی شبیہ کو مرتب کر دیا ہے اور اسے محفوظ

---

❶ دوسری کتابیں بھی سامنے ہیں لیکن اس موضوع کے لیے مؤلف زیادہ تر شمائل ترمذی کا منت کش رہا۔

حالت میں اصحاب روایت نے ہم تک پہنچا دیا ہے۔ یہاں ہم اس لفظی شبیہ کو پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین حضورؐ کے کردار کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس عظیم انسان کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ یہ گویا ایک نوع کی ملاقات ہے --- ایک تعارف!

حضورؐ کے چہرہ اقدس' قد و قامت' خد و خال' چال ڈھال اور وجاہت کا جو عکس صدیوں کے پردوں سے چھن کر ہم تک پہنچتا ہے وہ بہرحال ایک ایسے انسان کا تصور دلاتا ہے جو ذہانت' شجاعت' صبر و استقامت' راستی و دیانت' عالی ظرفی' سخاوت' فرض شناسی' وقار و انکسار اور فصاحت و بلاغت جیسے اوصاف حمیدہ کا جامع تھا' بلکہ کہنا چاہیے کہ حضورؐ کے جسمانی نقشے میں روح نبوت کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے۔ اور آپؐ کی وجاہت خود آپؐ کے مقدس مرتبہ کی ایک دلیل تھی۔ اس موقع پر آپؐ کا ایک ارشاد یاد آیا۔ فرمایا۔ وان تقوی اللہ تبیض الوجوہ ۔ خدا کا تقویٰ ہی چہروں کو روشن کرتا ہے۔ نبوت تو ایمان و تقویٰ کی معراج ہے' نبی کا چہرہ تو نور افشاں ہونا ہی چاہیے۔

سو یہ ہے اس آفتاب حق کی ایک جھلک!

"وجاہت"

"میں نے جونہی حضورؐ کو دیکھا تو فوراً سمجھ لیا کہ آپؐ کا چہرہ ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔
(عبداللہ بن سلام) ❶

"میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر حاضر ہوا تو لوگوں نے دکھایا کہ یہ ہیں خدا کے رسولؐ! دیکھتے ہی میں نے کہا۔ واقعی یہ اللہ کے نبی ہیں"۔ (ابو رمثہ تیمی) ❷

"مطمئن رہو' میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا جو چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھا وہ کبھی تمہارے ساتھ بد معاملگی کرنے والا شخص نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا آدمی (اونٹ کی رقم) ادا نہ کرے تو میں اپنے پاس سے ادا کر دوں گی۔ (ایک معزز خاتون) ❸

---

❶ یہود کے ایک بڑے عالم تھے جن کا نام حصین تھا۔ سرور عالم کے مدینے آنے پر یہ دیکھنے کو گئے' دیکھتے ہی ان کو جو تاثر ہوا۔ بعد میں اسے انہوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایمان لائے اور عبداللہ نام تجویز ہوا۔

(سیرۃ المصطفیٰ) از مولانا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم (ج ا۔ ص ۳۴۹۔ ۳۵۰)

❷ شمائل ترمذی۔

❸ مدینہ میں ایک تجارتی قافلہ وارد ہوا۔ اور شہر سے باہر ٹھہرا۔ حضورؐ کا اتفاقاً اس طرف گزر ہوا۔ ایک اونٹ کا سودا کر لیا اور یہ کہہ کر اونٹ ساتھ لے آئے کہ قیمت بھجوائے دیتا ہوں' بعد میں قافلے والوں کو تشویش ہوئی کہ بغیر جان پہچان کے معاملہ کر لیا۔ اس پر سردار قافلہ کی خاتون نے مذکورہ فقرہ کہا۔ یہ واقعہ طارق بن عبداللہ نے بیان کیا جو خود =

"ہم نے ایسا خوب رو شخص اور نہیں دیکھا ❶ ...... ہم نے اس کے منہ سے روشنی سی نکلتی دیکھی ہے"۔ (ابو قرصافہ کی والدہ اور خالہ)۔

"حضورؐ سے زیادہ خوب رو کسی کو نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا' گویا آفتاب چمک رہا ہے"۔ (ابو ہریرہؓ)

"اگر تم حضورؐ کو دیکھتے تو سمجھتے کہ سورج طلوع ہو گیا ہے"۔ (ربیع بنت معوذ)

"دیکھنے والا پہلی نظر میں مرعوب ہو جاتا"۔ (حضرت علیؓ)

"میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضورؐ کو دیکھ رہا تھا' آپؐ اس وقت سرخ جوڑا زیب تن کئے ہوئے تھے۔ میں کبھی چاند کو دیکھتا تھا اور کبھی آپؐ کو' بالآخر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ حضورؐ اکرم چاند سے کہیں زیادہ حسین ہیں"۔ (حضرت جابر بن سمرہ)

"خوشی میں حضورؐ کا چہرہ ایسا چمکتا گویا چاند کا ٹکڑا ہے۔ اسی چمک کو دیکھ کر ہم آپؐ کی خوشی کو پہچان جاتے تھے"۔ (کعبؓ بن مالک)

"چہرے پر چاند کی سی چمک تھی"۔ (ہندؓ بن ابی ہالہ)

چہرہ --------

"بدر کی طرح گولائی لیے ہوئے"۔ (براء بن عازب)

"چہرہ بالکل گول نہیں تھا۔ ہلکی گولائی لئے ہوئے"۔ (حضرت علیؓ)

"پیشانی کشادہ۔ ابرو خمدار --- باریک اور گنجان -- (دونوں جدا جدا۔ دونوں کے درمیان میں ایک رگ کا ابھار جو غصہ آنے پر نمایاں ہو جاتا"۔ (ہندؓ بن ابی ہالہ)

"مسرت پیشانی سے جھلکتی تھی" (کعب بن مالک)

رنگت ------

"نہ چونے کی طرح سفیدی۔ نہ سانولا پن۔ گندم گوں جس میں سفیدی غالب تھی"۔ (حضرت انسؓ)

"سفید سرخی مائل"۔ (حضرت علیؓ)

"سفید مگر ملاحت دار"۔ (ابوالطفیل)

"سفید --- چمک دار"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

"گویا کہ چاندی سے بدن ڈھلا ہوا تھا"۔ (حضرت ابو ہریرہؓ)

= شریک قافلہ تھے بعد میں حضورؐ نے طے شدہ قیمت سے زیادہ مقدار میں کھجوریں بھجوا دیں۔ (سیرت النبیؐ مولانا شبلی مرحوم جلد دوم ص ۳۸۰ المواہب اللدنیہ جلد ۱ ص ۲۴۳)

❶ یہ خواتین حضورؐ کی خدمت میں ابو قرصافہ کے ساتھ بیعت اسلام کے لیے گئی تھیں اور لوٹتے ہوئے انہوں نے اپنے تاثرات بیان کئے۔

آنکھیں ------

"آنکھیں سیاہ --- پلکیں دراز"۔ (حضرت علیؓ)

"پتلیاں سیاہ --- نظریں نیچی --- گوشہ چشم سے دیکھنے کا حیادارانہ انداز" (ہند بن ابی ہالہ)

"سفید حصے میں سرخ ڈورے --- آنکھوں کا خانہ لمبا --- قدرتی سرگیں"۔ (جابر بن سمرہ)

ناک ------

"بلندی مائل --- اس پر نورانی چمک --- جس کی وجہ سے ابتدائی نظر میں بڑی معلوم ہوتی"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

رخسار ------

"ہموار اور ہلکے --- نیچے کو ذرا سا گوشت ڈھلکا ہوا"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

دہن ------

"فراخ ---!" (جابر بن سمرہ)

"بہ اعتدال فراخ" (ہند بن ابی ہالہ)

دندان مبارک ------

"باریک --- آبدار --- سامنے کے دانتوں میں خوش نما ریخیں"۔ (حضرت ابن عباسؓ)

"تکلم فرماتے تو دانتوں سے چمک سی نکلتی ہوتی"۔ (حضرت انسؓ)

ریش ------

"بھرپور اور گنجان بال"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

گردن ------

"پتلی لمبی --- جیسے مورتی کی طرح خوب صورتی سے تراشی گئی ہو ---"

"گردن کی رنگت چاندی جیسی اجلی اور خوشنما۔" (ہند بن ابی ہالہ)

سر ------

"بڑا --- مگر اعتدال اور مناسبت کے ساتھ"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

بال ------

"قدرے خم دار" (حضرت ابو ہریرہؓ)

"نہ بالکل سیدھے تنے ہوئے --- نہ زیادہ پیچ دار"۔ (قتادہؓ)

"ہلکا خم لیے ہوئے"۔ (حضرت انسؓ)

"گنجان --- کبھی کبھی کانوں کی لو تک لمبے' کبھی شانوں تک"۔ (براء بن عازبؓ)

"درمیان سے نکلی ہوئی مانگ"۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

"بدن پر بال زیادہ نہ تھے ــــ سینہ سے ناف تک بالوں کی باریک لکیر"۔
(حضرت علیؓ۔ ہند بن ابی ہالہؓ)

"کندھوں' بازوؤں اور سینہ کے بالائی حصہ پر تھوڑے سے بال تھے"۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

مجموعی ڈھانچہ ــــــــ

"بدن گٹھا ہوا ــــ اعضاء کے جوڑوں کی ہڈیاں بڑی اور مضبوط"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

"بدن موٹا نہیں تھا"۔ (حضرت علیؓ)

"قد ــ نہ زیادہ لمبا تھا' نہ پست! میانہ"۔ (حضرت انسؓ)

"قامت مائل بہ درازی! ــــ مجمع میں ہوں تو دوسروں سے قد نکلتا ہوا معلوم ہوتا"۔
(برا بن عازبؓ)

"پیٹ باہر کو نکلا ہوا نہ تھا"۔ (ام معبد)

دنیوی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے والوں سے حضورؐ کا جسم (باوجود فقر و فاقہ کے) زیادہ تر و تازہ اور توانا تھا۔"[1] (المواہب ج ۱ ص ۳۱۰)

"میں نے رسول اللہؐ سے بڑھ کر کوئی بہادر اور زور آور نہیں دیکھا۔"[2] (ابن عمرؓ)

کندھے اور سینہ ــــــــ

"سینہ چوڑا ــــ سینہ اور پیٹ ہموار"۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

"سینہ چوڑا"۔ (براء بن عازب)

"مونڈھوں کا درمیانی فاصلہ عام پیمانے سے زیادہ"۔ (ہند بنؓ ابی ہالہ۔ براء بن عازبؓ)

"کندھوں کا درمیانی حصہ پر گوشت"۔ (حضرت علیؓ)

---

[1] مشہور واقعہ ہے کہ حضورؐ نے عمرہ کیا تو سو اونٹ بہ نفس نفیس ہانکے اور ان میں سے ۶۳ کو بدست خود نحر کیا اور بقیہ کو حضرت علیؓ کے سپرد کیا۔

[2] مکہ میں رکانہ نامی ایک پہلوان تھا جو اکھاڑوں میں کشتیاں لڑتا۔ ایک دن حضورؐ کسی ملحقہ وادی میں اس سے ملے اور اپنی دعوت دی۔ اس نے دعوت کے لیے کوئی معیار صدق طلب کیا۔ اس کے ذوق کے پیش نظر حضورؐ نے کشتی کرنا پسند کر لیا۔ تین بار کشتی ہوئی اور تینوں بار آپؐ نے اسے پچھاڑ دیا۔ اسی رکانہ پہلوان کے بیٹے ابو جعفر محمد کی یہ روایت حاکم نے مستدرک میں لی ہے' اور ابوداؤد اور ترمذی نے اسے پیش کیا ہے اور بیہقی نے سعید بن جبیر کی دوسری روایت لی ہے جس میں آتا ہے کہ حضورؐ نے بعض دوسرے لوگوں کو بھی کشتی میں پچھاڑا ہے جن میں ایک ابوالاسود جمحی بھی ہے۔
(المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۳۔ ۳۰۲)

بازو اور ہاتھ ----------

"کلائیاں دراز --- ہتھیلیاں فراخ --- انگلیاں موزوں حد تک دراز"۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

"ریشم کا دبیز یا باریک کوئی کپڑا یا کوئی اور چیز ایسی نہیں جسے میں نے چھوا ہو اور وہ حضورؐ کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم و گداز ہو"۔ (حضرت انسؓ)

قدم ----------

"پنڈلیاں پُر گوشت نہ تھیں --- ہلکی ہلکی سُتی ہوئی"۔ (جابر بن سمرہؓ)

"ہتھیلیاں اور پاؤں پُر گوشت ------ تلوے قدرے گہرے ----- قدم چکنے کہ پانی نہ ٹھہرے"۔

(ہند بن ابی ہالہؓ)

"ایڑیوں پر گوشت بہت کم"۔ (جابر بن سمرہؓ)

ایک جامع لفظی تصویر:

یوں تو حضور کے متعدد رفقاء نے حضورؐ کی شخصیت کے مرقعے لفظوں میں پیش کیے ہیں لیکن ام معبدؓ نے جو تصویر مرتب کی ہے اس کا جواب نہیں' وادیٔ ہجرت کا سفر طے کرتے ہوئے مسافر حق جب اپنی منزل اول (غار ثور) سے چلا تو پہلے ہی روز قوم خزاعہ کی اس نیک نہاد بڑھیا کا خیمہ راہ میں پڑا۔ حضورؐ اور آپ کے ہمراہی پیاسے تھے۔ فیضان خاص تھا کہ مریل سی بھوکی بکری نے اس لمحہ وافر مقدار میں دودھ دیا۔ حضورؐ نے بھی پیا' ہمراہی نے بھی' اور کچھ بچ رہا ام معبدؓ کے شوہر نے گھر آکر دودھ دیکھا' تو اچنبھے سے پوچھا کہ یہ کہاں سے آیا۔ ام معبدؓ نے سارا حال بیان کیا۔ وہ پوچھنے لگا کہ اچھا اس قریشی نوجوان کا نقشہ تو بیان کرو۔ یہ وہی تو نہیں جس کی تمنا ہے۔ اس پر ام معبدؓ نے حسین ترین الفاظ میں تصویر کھینچی۔ ام معبدؓ کو نہ تو کوئی تعارف تھا۔ نہ کسی طرح کا تعصب' بلکہ جو کچھ دیکھا من و عن کہہ دیا۔ اصل عربی میں دیکھنے کی چیز ہے۔ [1] اس کا جو ترجمہ مولف "رحمتہ للعالمین" نے کیا ہے' اسی کو ہم یہاں لے رہے ہیں۔

> "پاکیزہ رو' کشادہ چہرہ' پسندیدہ خو' نہ پیٹ باہر نکلا ہوا' نہ سر کے بال گرے ہوئے' زیبا' صاحب جمال' آنکھیں سیاہ و فراخ' بال لمبے اور گھنے' آواز میں بھاری پن' بلند گردن' روشن مردمک' سرگیں چشم' باریک و پیوستہ ابرو' سیاہ گھنگھریالے بال' خاموش' وقار کے ساتھ گویا دلبستگی لیے ہوئے' دور سے دیکھنے میں زیبندہ و دلفریب' قریب سے نہایت شیریں و کمال حسین' شیریں کلام' واضح الفاظ' کلام کمی و بیشیٔ الفاظ سے معرا' تمام گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی' میانہ قد کہ کوتاہی نظر سے حقیر نظر نہیں آتے۔ نہ طویل کہ آنکھ اس سے نفرت

---

[1] ملاحظہ ہو: زاد المعاد جلد ا ص ۳۰۷

کرے۔ زیبندہ نہال کی تازہ شاخ' زیبندہ منظر والا قد' رفیق ایسے کہ ہر وقت اس کے گرد و پیش رہتے ہیں۔ جب وہ کچھ کہتا ہے تو چپ چاپ سنتے ہیں' جب حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لیے جھپٹتے ہیں' مخدوم' مطاع' نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو! [1]

لباس:

آدمی کی شخصیت کا واضح اظہار اس کے لباس سے بھی ہوتا ہے اس کی وضع قطع' قصر و طول' رنگ' معیار' صفائی اور ایسے ہی مختلف پہلو بتا دیتے ہیں کہ کسی لباس میں ملبوس شخصیت کس ذہن و کردار سے آراستہ ہے۔ نبی اکرمؐ کے لباس کے بارے میں حضورؐ کے رفقاء نے جو معلومات دی ہیں وہ بڑی حد تک حضورؐ کے ذوق کو نمایاں کر دیتی ہیں۔ حضورؐ نے لباس کے معاملہ میں درحقیقت اس آیت کی عملی شرح پیش فرمائی ہے:

یٰبنی ادم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سواتکم و ریشا و لباس التقوی ذالک خیر: اعراف۔ ۲۶)

اے اولاد آدم! ہم نے تمہارے ستر ڈھانکنے والا اور تمہیں زینت دینے والا لباس تمہارے لیے مقرر کیا ہے۔ اور لباس تقویٰ بہترین لباس ہے۔

دوسرا پہلو لباس کا "سرابیل تقیکم الحر و سرابیل تقیکم باسکم" (تمہیں گرمی سے بچانے اور جنگ میں محفوظ رکھنے کے لیے قمیصیں اور زرہیں فراہم کیں (النحل۔ ۸۱) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

سو حضورؐ کا لباس ساتر تھا' زینت بخش تھا اور بایں ہمہ لباس تقویٰ تھا۔ اس میں ضرورت کا بھی لحاظ تھا' وہ چند کپڑے اخلاقی اصولوں کی پابندی کا مظہر بھی تھا اور ذوق سلیم کا ترجمان بھی۔ حضورؐ کو کبر و ریا سے بعد تھا۔ اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہنا پسند نہ تھا۔ فرمایا: انما انا عبد البس کما یلبس العبد [2] میں تو بس خدا کا ایک بندہ ہوں اور بندوں کی طرح لباس پہنتا ہوں۔ ریشم' دیبا اور حریر کو مردوں کے لیے آپؐ نے حرام قرار دیا۔ ایک بار تحفہ میں آئی ہوئی ریشمی قبا پہنی اور پھر فوراً اضطراب کے ساتھ اتار پھینکی (مشکوٰۃ بند)' قمیص اور عمامہ کی لمبائی چونکہ علامت کبر تھی اور یہ طریق لباس متکبرین میں رائج تھا اس لیے اس سے سخت تنفر تھا۔ [3] دوسری قوموں خصوصاً مذہبی طبقوں کے مخصوص فیشنوں کی تقلید اور نقالی کو بھی حضورؐ نے ممنوع ٹھہرایا [4] تاکہ امت میں اپنی خودی اور عزت نفس برقرار رہے' نیز فیشن اور لباس کی تقلید نظریات و

---

[1] زاد المعاد جلد ۱ ص ۳۰۷ [2] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۳۲۸۔

[3] بہت سی روایات ہیں مثلاً سالم کی روایت اپنے والد سے' مندرجہ ابو داؤد' نسائی' ابن ماجہ' لباس شہرت پر وعید از ابن عمر۔ مندرجہ ترمذی۔ احمد۔ ابو داؤد۔ ابن ماجہ۔

[4] مثلاً روایت ابن عمر مندرجہ احمد و ابو داؤد۔

کردار کی تقلید پیدا کرنے کا سبب نہ بن سکے' چنانچہ حضورؐ نے اسلامی تمدن کے تحت فیشن' آداب اور ثقافت کا ایک نیا ذوق پیدا کر دیا۔ لباس میں موسمی تحفظ' ستر' سادگی' نظافت و نفاست اور وقار کا حضورؐ کو خاص لحاظ تھا۔ اگر ہم حضورؐ کے لباس کو وقت کے تمدنی دور' عرب کی موسمی اور جغرافیائی اور تمدنی ضروریات و مروجات کے نقشے میں رکھ کر دیکھیں تو وہ بڑے معیاری ذوق کا آئینہ دار ہے۔ آیئے حضورؐ کے لباس پر ایک نگاہ ڈالیں۔ ❶

کرتا (قمیص) بہت پسند تھا۔ کرتے کی آستین نہ تنگ رکھتے نہ زیادہ کھلی۔ درمیانی ساخت پسند تھی۔ آستین کلائی اور ہاتھ کے جوڑ تک پہنچتی۔ سفر (خصوصاً جہاد) کیلئے جو کرتا پہنتے اسکے دامن اور آستین کا طول ذرا کم ہوتا۔ قمیص کا گریبان سینہ پر ہوتا جسے کبھی کبھار (موسمی تقاضے سے) کھلا بھی رکھتے اور اسی حالت میں نماز پڑھتے' کرتا پہنتے ہوئے سیدھا ہاتھ ڈالتے' پھر الٹا۔ رفیقوں کو اسی کی تعلیم دیتے۔ داہنے ہاتھ کی فوقیت اور اچھے کاموں کیلئے داہنے ہاتھ کا استعمال حضورؐ کی سکھائی ہوئی اسلامی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے۔

عمر بھر تہ بند (لنگی) استعمال فرمایا جسے ناف سے ذرا نیچے باندھتے اور نصف ساق تک (ٹخنوں سے ذرا اونچا) سامنے کا حصہ قدرے زیادہ جھکا رہتا۔

پاجامہ (سراویل) دیکھا تو پسند کیا۔ آپؐ کے صحابی پہنتے تھے ایک بار خود خرید فرمایا (اختلاف ہے کہ پہنایا نہیں) اور وہ آپؐ کے ترکہ میں موجود تھا۔ اس کی خریداری کا قصہ دلچسپ ہے' حضرت ابو ہریرہؓ کو ساتھ لیے ہوئے حضورؐ بازار گئے اور بزازوں کے ہاں تشریف لے گئے۔ چار درہم پر پاجامہ خریدا۔ بازار میں اجناس کو تولنے کے لیے ایک خاص وزان مقرر تھا۔ وزن کرانے گئے اور اس سے کہا کہ اسے جھکتا ہوا تولو اتزن و ارجح' وزان کہنے لگا کہ یہ الفاظ میں نے کسی اور سے کبھی نہیں سنے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے توجہ دلائی۔ الا تعرف نبیک ؟ تم اپنے نبیؐ پاک کو پہچانتے نہیں۔ وہ ہاتھ چومنے کو بڑھا تو آپؐ نے روکا کہ یہ عجمیوں کا (یعنی غیر اسلامی) طریقہ ہے بہرحال وزن کرایا اور پاجامہ خرید کر لے چلے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ آپؐ اسے پہنیں گے؟ تعجب غالباً اس بنا پر ہوا ہو گا کہ ایک تو دیرینہ معمول میں ایسی نمایاں تبدیلی عجیب لگی۔ دوسرے پاجامہ اہل فارس کا پہناوا تھا۔ اور تشبہ سے حضورؐ کو اجتناب تھا (حالانکہ دوسرے تمدنوں کے اچھے اجزا کو حضورؐ قبول فرماتے تھے) آپؐ نے جواب دیا: "ہاں پہنوں گا۔ سفر میں بھی' حضر میں بھی' دن کو بھی' رات کو بھی۔ کیونکہ مجھے حفظ ستر کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے زیادہ ستر پوش لباس کوئی اور نہیں۔" ❷

---

❶ تفاصیل کے حوالے نہیں دیئے جا رہے۔ ماخذ کے طور پر زیادہ تر شمائل ترمذی' زاد المعاد اور المواہب اللدنیہ سامنے ہیں۔

❷ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۳۳۶ – ۳۳۶۔

سر پر عمامہ باندھنا پسند خاص تھا' نہ بہت بھاری ہوتا تھا۔ نہ چھوٹا۔ ایک روایت کے لحاظ سے' ۷ گز لمبائی ہوتی تھی۔ عمامہ کا شملہ بالشت بھر ضرور چھوڑتے جو پیچھے کی جانب دونوں شانوں کے درمیان اڑس لیتے۔ تمازت آفتاب سے بچنے کے لیے شملہ کو پھیلا کر سر پر ڈال لیتے۔ اسی طرح موسمی حالات تقاضا کرتے تو آخری بل تھوڑی کے نیچے سے لے کر گردن کے گرد لپیٹ بھی لیتے۔ کبھی عمامہ نہ ہوتا تو کپڑے کی ایک دھجی (رومال) پٹی کی طرح سر سے باندھ لیتے۔ [1] بربنائے نظافت عمامہ کو تیل کی چکنائی سے بچانے کے لیے ایک خاص کپڑا (عربی نام قناع) بالوں پر استعمال کرتے' جیسے کہ آج کل بھی بعض لوگ ٹوپیوں کے اندر کاغذ یا سلولائیڈ کا ٹکڑا رکھ لیتے ہیں۔ یہ دھجی چکنی تو ہو جاتی مگر نظافت کا حال یہ تھا کہ (روایات میں تصریح ہے) اسے کبھی میلا اور گندہ نہیں دیکھا گیا۔ سفید کے علاوہ زرد (غالباً مٹیالا' خاکستری مائل یا شتری) رنگ کا عمامہ بھی باندھا ہے۔ اور فتح مکہ کے موقع پر سیاہ بھی استعمال فرمایا۔ عمامہ کے نیچے کپڑے کی ٹوپی بھی استعمال میں رہتی۔ اور اسے پسند فرمایا۔ نیز روایات کے بہ موجب عمامہ کے ساتھ ٹوپی کا یہ استعمال گویا اسلامی ثقافت کا مخصوص طرز تھا اور اسے آپؐ نے مشرکین کے مقابلے پر امتیازی فیشن قرار دیا۔

عمامہ کے علاوہ کبھی خالی سفید ٹوپی بھی اوڑھتے۔ گھر میں اوڑھنے کی ٹوپی سر سے چپٹی ہوئی ہوتی۔ سفر پر نکلتے تو اٹھی ہوئی باڑ والی ٹوپی استعمال فرماتے۔ سوزنی نما سلے ہوئے کپڑے کی دبیز ٹوپی بھی پہنی ہے۔

اوڑھنے کی چادر ۴ گز لمبی سوا دو گز چوڑی ہوتی تھی۔ کبھی لپیٹ لیتے' کبھی ایک پلو سیدھے بغل سے نکال کر الٹے کندھے پر ڈال لیتے' یہی چادر کبھی کبھار بیٹھے ہوئے ٹانگوں کے گرد لپیٹ لیتے اور بعض مواقع پر اسے تہ کر کے تکیہ بھی بنا لیتے۔ معزز ملاقاتیوں کی تواضع کے لیے چادر اتار کر بچھا بھی دیتے۔ یمن کی چادر جسے حِبَرہ کہا جاتا تھا بہت پسند تھی' اس میں سرخ یا سبز دھاریاں ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ کے لیے سیاہ چادر (غالباً بالوں کی) بھی بنوائی گئی اسے اوڑھا تو پسینے کی وجہ سے بو دینے لگی۔ چنانچہ نظافت کی وجہ سے پھر اسے نہیں اوڑھا۔

نیا کپڑا خدا کی حمد اور شکر کے ساتھ بالعموم جمعہ کے روز پہنتے۔ فاضل جوڑے بنوا کر نہیں رکھتے تھے' کپڑوں میں پیوند لگاتے تھے۔ ان کی مرمت کرتے' احتیاطاً گھر میں دیکھ لیتے کہ مجمع میں بیٹھنے کی وجہ سے (مجالس اور نمازوں میں میلے کچیلے لوگ بھی آتے تھے اور صفائی کا عام معیار بھی آپؐ ہی نے مسلسل تربیت کر کر کے برسوں میں بلند کیا) کوئی جوں وغیرہ نہ آگھسی ہو۔

جہاں ایک طرف فقر و سادگی کی وہ شان تھی۔ وہاں دوسری طرف آپؐ کو رہبانیت کا سدباب بھی کرنا تھا اور اس اصول کا مظاہرہ بھی مطلوب تھا کہ "اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمت (رزق) کا اثر اس کے بندے سے عیاں ہو"۔ مختصر یہ کہ معمول عام سادگی..........

---

[1] ایک رائے یہ ہے کہ ایسا بیماری (خصوصاً درد سر) کی حالت میں ہوا۔

تھا۔ ❶ سو حضورؐ نے کبھی کبھار اچھا لباس بھی زیب بدن فرمایا۔ آپؐ کا مسلک اعتدال تھا اور انتہا پسندی سے امت کو بچانا مطلوب تھا۔

کپڑوں کے لیے سب سے بڑھ کر سفید رنگ مرغوب خاطر تھا۔ فرمایا "حق یہ ہے کہ تمہارے لیے مسجدوں میں بھی اللہ کے سامنے جانے کا بہترین لباس سفید لباس ہے۔" ❷ فرمایا۔ سفید کپڑے پہنا کرو اور سفید ہی کپڑے سے اپنے مردوں کو کفن دو' کیونکہ یہ زیادہ پاکیزہ اور پسندیدہ ہیں"۔ ❸

سفید کے بعد سبز رنگ بھی پسندیدہ تھا۔ لیکن بالعموم اس شکل میں کہ ہلکی سبز دھاریاں ہوں۔ اسی طرح خالص شوخ سرخ رنگ بہت ہی ناپسند تھا (لباس کے علاوہ بھی اس کے استعمال کو بعض صورتوں میں ممنوع فرمایا) لیکن ہلکے سرخ رنگ کی دھاریوں والے کپڑے آپؐ نے پہنے' ہلکا زرد (نیلا یا شتری) رنگ بھی لباس میں دیکھا گیا۔

حضورؐ کا جوتا مروجہ عربی تمدن کے مطابق چپل یا کھڑاؤں کی سی شکل کا تھا جس کے دو تسمے تھے۔ ایک انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے درمیان رہتا۔ دوسرا چھنگلیا اور اس کے ساتھ والی انگلی کے بیچ میں۔ جوتے پر بال نہ ہوتے تھے۔ جیسے کہ معمولی ذوق کے لوگوں کے جوتوں پر ہوتے۔ یہ ایک بالشت ۲ انگل لمبا تھا تلوے کے پاس سے سات انگل چوڑا اور دونوں تسموں کے درمیان پنجے پر سے دو انگل کا فاصلہ تھا۔ کبھی کھڑے ہو کر پہنتے' کبھی بیٹھ کر بھی' پہنتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں ڈالتے پھر بایاں اور اتارتے ہوئے پہلے بایاں پاؤں نکالتے پھر دایاں۔

جرابیں اور موزے بھی استعمال میں رہے۔ سادہ اور معمولی بھی اور اعلیٰ قسم کے بھی۔ شاہ نجاشی نے سیاہ رنگ کے سادہ موزے بطور تحفہ بھیجے تھے۔ انہیں پہنا اور ان پر مسح فرمایا۔ دحیہ کلبی نے بھی موزے تحفہ میں پیش کیے تھے ان کو آپؐ نے پھٹنے تک استعمال فرمایا۔

چاندی کی انگوٹھی بھی استعمال فرمائی جس میں کبھی چاندی کا نگینہ ہوتا تھا' کبھی حبشی پتھر کا' بعض روایات میں آتا ہے کہ لوہے کی انگوٹھی پر چاندی کا پتر یا پالش چڑھا ہوا تھا۔ دوسری طرف یہ واضح ہے کہ لوہے کی انگوٹھی (اور زیور) سے آپؐ نے کراہت فرمائی ہے۔ انگوٹھی بالعموم داہنے ہی ہاتھ میں پہنی۔ کبھی کبھار بائیں میں بھی۔ درمیانی اور شہادت کی انگلی میں نہ پہنتے۔ چھنگلیا میں پہننا پسند تھا۔ نگینہ اوپر کی طرف رکھنے کی بجائے ہتھیلی کی طرف رکھتے۔ انگوٹھی پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ ترتیب وار نیچے سے اوپر کو تین سطروں میں کندہ تھے۔ اس سے حضورؐ خطوط پر مہر لگاتے تھے۔ محققین کی یہ رائے قرین صحت ہے کہ انگوٹھی مہر کی

---

❶ عن عمر بن شعیب عن ابیہ (ترمذی) عن ابی الاحوص عن ابیہ (نسائی)

❷ ابوداؤد' ابن ماجہ

❸ عن سمرہ (احمد) ترمذی' نسائی' ابن ماجہ۔

ضرورت سے بنوائی تھی۔ اور سیاسی منصب کی وجہ سے اس کا استعمال ضروری تھا۔

وضع قطع اور آرائش:

حضورؐ اپنے بال بہت سلیقے سے رکھتے' ان میں کثرت سے تیل کا استعمال فرماتے' کنگھا کرتے' مانگ نکالتے' لبوں کے زائد بال تراشنے کا اہتمام تھا۔ اس معاملہ میں رفقاء کو تربیت دیتے۔ مثلاً ایک صحابی کو پراگندہ مو دیکھا تو گرفت فرمائی۔ ایک صحابی کی ڈاڑھی کے بے ڈھب بال دیکھ کر فرمایا کہ ان کو سنوار کر رکھو۔ فرمایا کہ جو شخص سر یا ڈاڑھی کے بال رکھتا ہو اسے چاہیے کہ ان کو سلیقے اور شائستگی سے رکھے۔ مثلاً ابو قتادہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "اکرمھا" (ان کو سنوار کے رکھو) [1] حضرت ابو ہریرہ اور عبداللہ بن عمر کے متعلق واضح آثار میں ہے کہ وہ حج کے موقع پر ہر سال داڑھی کے بال ہلکے کرایا کرتے تھے۔ [2]

---

[1] روایت ابو ہریرہ (ابو داؤد)

[2] ان دو صحابیوںؓ کا فعل جس پر خلفاء راشدین یا صحابہ کرامؓ کی سوسائٹی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور نہ اس سلسلے میں قرن اول اور دور خلافت راشدہ کی کوئی اخلاقی بحث یا روایت (یا اثر) ملتی ہے' یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کے فعل کو جائز سمجھا گیا اور کتاب و سنت سے متعارض قرار نہیں دیا گیا۔ خلفائے راشدین اور صحابہ کے اس اجماع سکوتی سے ہم ڈاڑھی سے متعلقہ احکام و احادیث کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد لے سکتے ہیں۔ یعنی روایات احادیث کا صحیح منشاء منطوق اور احکام کے حدود کی وسعتوں کے فہم میں جہاں دوسرے عقلی و نقلی قرائن و شواہد ممد ہوتے ہیں وہاں صحابہ کرامؓ جو قرآن کی آیات اور احادیث کی روایات کے پہلے گواہ' پہلے راوی اور پہلے مفسر اور پہلے پیروکار تھے ان کے ایسے اقوال و اعمال سے بھی مدد لی جا سکتی ہے جن پر حضورؐ' یا خلفاء راشدینؓ یا پوری جماعت صحابہؓ میں سے کسی نے نہ گرفت کی ہو' نہ اعتراض اٹھایا ہو اور نہ ان کو کتاب و سنت کی مخالفت قرار دیا ہو۔ اصل اہمیت اس بات کو ہے کہ آیا نفیاً بھی یہ حکم کہیں ہے کہ ڈاڑھی کے کسی بال سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ بال چاہے گچھے بن کے پھیل جائیں یا بعض بال بے تکے طور پر آنکھ کی طرف بڑھ جائیں تو ان کو درست کرنا گویا منافی دین و تقویٰ ہے۔ کب یہ حکم ہے کہ مونچھوں کو بلا نہایت گھٹایا جائے اور ڈاڑھی کو بلا نہایت بڑھایا جائے۔ سوال حدیث کی شرح و وضاحت یا درایت کا ہے۔ اس صورت میں تو تاریخی ترتیب واقعات کو' کسی راوی کی عمر کو' عربی کی کسی لغت اور عرب شعرا کی شاعری کو یا کسی جغرافی حقیقت (مقام) وغیرہ کو بھی حدیث کے بالمقابل لانے کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ اور خود حدیث کو قرآن کے بالمقابل لانے کا اور ایک آیت کو دوسری آیت سے ٹکرانے کا سوال بھی اٹھ سکتا ہے۔ خدا غلط الفکری سے بچائے اور اعمال بھی درست کرائے۔ ویسے مشہور روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کی ڈاڑھی کے بال یکمشت کے برابر چھوڑ کر بقیہ کٹوا دیئے اور آپؓ پر نہ اس وقت نہ بعد میں اس فعل پر عمومی گرفت ہوئی۔ دوسرے فقہاء نے بھی مختلف مسلک اختیار کئے ہیں' کیونکہ ان کے سامنے متذکرہ روایت تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی اور شبلی و مولانا آزاد تک بالوں کو سنبھال سنوار کے رکھتے تھے۔ =

یہ تاکیدیں حضورؐ نے اس لیے فرمائی تھیں کہ بسا اوقات مذہبی لوگ صفائی اور شائستگی کے تقاضوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً رنگ تصوف جب بڑھتا ہے اور رہبانیت ابھرتی ہے تو غلیظ اور غیر شائستہ رہنا علو مرتبت کی دلیل بن جاتا ہے۔ اس خطرے کا سد باب فرمایا۔

سفر و حضر میں سات چیزیں ہمیشہ ساتھ رہتیں اور بستر کے قریب (۱) تیل کی شیشی (۲) کنگھا (ہاتھی دانت کا بھی) (۳) سرمہ دانی (سیاہ رنگ کی) (۴) قینچی (۵) مسواک (۶) آئینہ (۷) لکڑی کی ایک پتلی کھپچی۔

سرمہ رات کو سوتے ہوئے (تا کہ زیادہ نمایاں نہ ہو) تین تین سلائی دونوں آنکھوں میں لگاتے۔ آخر شب میں حاجات سے فارغ ہو کر وضو کرتے' لباس طلب فرماتے' اور خوشبو لگاتے' ریحان کی خوشبو پسند تھی۔ مہندی کے پھول بھی بھینی خوشبو کی وجہ سے مرغوب تھے۔ مشک اور عود کی خوشبو سب سے بڑھ کر پسندیدہ رہی۔ گھر میں خوشبودار دھونی لیا کرتے' ایک عطردان تھا جس میں بہترین خوشبو موجود رہتی اور استعمال میں آتی (کبھی حضرت عائشہؓ اپنے دست مبارک سے خوشبو لگاتیں) مشہور بات ہے کہ آپؐ جس کوچے سے گزر جاتے تھے' دیر تک اس میں مہک رہتی تھی اور فضائیں بتاتی تھیں کہ "گزر گیا ہے ادھر سے وہ کاروان بہار"۔ خوشبو ہدیہ کی جاتی تو ضرور قبول فرماتے اور کوئی اگر خوشبو کا ہدیہ لینے میں تامل کرتا تو ناپسند فرماتے۔ اسلامی ثقافت کے مخصوص ذوق کے ماتحت آپؐ نے مردوں کے لیے ایسی خوشبو پسند فرمائی جس کا رنگ مخفی رہے اور مہک پھیلے اور عورتوں کے لیے وہ جس کا رنگ نمایاں ہو' مہک مخفی رہے۔

رفتار:

حضورؐ کی چال عظمت' وقار' شرافت اور احساس ذمہ داری کی ترجمان تھی۔ چلتے تو مضبوطی سے قدم جما کر چلتے۔ ڈھیلے ڈھالے طریق سے قدم گھسیٹ کر نہیں۔ بدن سمٹا ہوا رہتا۔ دائیں بائیں دیکھے بغیر چلتے۔ قوت سے آگے کو قدم اٹھاتے۔ قامت میں آگے کی طرف قدرے جھکاؤ ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اونچائی سے نیچے کو اتر رہے ہیں' ہند بن ابی ہالہ کے الفاظ میں "گویا زمین آپؐ کی رفتار کے ساتھ لپٹی جا رہی ہے"۔ رفتار تیز ہوتی' قدم کھلے کھلے رکھتے آپؐ معمولی رفتار سے چلتے مگر بقول حضرت ابو ہریرہؓ "ہم مشکل سے ساتھ دے پاتے"۔ حضورؐ کی رفتار یہ پیغام بھی دیتی جاتی تھی کہ زمین پر گھمنڈ کی چال نہ چلو۔ (سورہ لقمان) ❶

تکلم:

تکلم انسان کے ایمان' کردار اور مرتبے کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ موضوعات اور الفاظ کا

= اور سوائے ایک حلقے کے بقیہ تمام علماء خط بنواتے ہیں۔

❶ ولا تمش فی الارض مرحًا (لقمان ۱۸) اور نہ زمین میں اکڑ کر چل۔

انتخاب' فقروں کی ساخت' آواز کا اتار چڑھاؤ' لہجہ کا اسلوب اور بیان کا زور' یہ ساری چیزیں واضح کرتی ہیں کہ متکلم کس پائے کی شخصیت کا علمبردار ہے۔

حضورؐ کے منصب اور ذمہ داریوں کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کا بھاری بوجھ اگر کسی دوسری شخصیت پر ڈالا گیا ہوتا۔ تو وہ تفکرات میں ڈوب کر رہ جاتا اور اسے خلوت محبوب ہو جاتی۔ لیکن حضورؐ کے کمالات خاص میں یہ بات بھی شامل ہے' کہ ایک طرف آپؐ تفکرات اور مسائل مہمّہ کا پہاڑ اٹھائے ہوئے ہوتے اور طرح طرح کی پریشانیوں سے گزرتے' لیکن دوسری طرف لوگوں میں خوب گھلنا ملنا بھی رہتا اور دن رات گفتگوؤں کا دور چلتا۔ مزاج کی سنجیدگی اپنی جگہ تھی اور تبسم و مزاح اپنی جگہ۔ اضداد میں عجیب توازن تھا جس کی مظہر حضورؐ کی ذات تھی۔ ایک عالمی تحریک کی ذمہ داری' ایک سلطنت کے مسائل' ایک جماعت اور معاشرہ کے معاملات اور پھر اپنے خاصے بڑے کنبے کی ذمہ داریاں اچھا خاصا پہاڑ تھیں' جنہیں حضورؐ کے کندھے اٹھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ امام حسنؓ اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ کے حوالہ سے بتاتے ہیں کہ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم متواتر پریشانیوں میں رہتے۔ ہمیشہ مسائل پر غور کرتے' کبھی آپ کو بے فکری کا کوئی لمحہ نہ ملا۔ دیر دیر تک خاموش رہتے اور بلا ضرورت فضول بات چیت نہ کرتے۔" [1]

لیکن آپؐ ایک داعی تھے۔ اور ایک تحریک کے سربراہ' اس لیے تبلیغ و تعلیم اور تزکیہ اور سیاسی انتظام چلانے کے لیے لوگوں سے رابطہ ضروری تھا جس کے لیے سب سے اہم ذریعہ تکلم ہے۔ لہٰذا دوسری صورت حال حضرت زیدؓ بن ثابت کے الفاظ میں یوں رہتی کہ "جب ہم دنیوی معاملات کا ذکر کر رہے ہوتے تو حضورؐ بھی اس ذکر میں حصہ لیتے' جب ہم آخرت پر گفتگو کرتے تو حضورؐ بھی ہمارے ساتھ اسی موضوع پر تکلم فرماتے۔ اور جب ہم لوگ کھانے پینے کی کوئی بات چھیڑتے تو حضورؐ بھی اس میں شامل رہتے۔ [2] اس کے باوجود آپؐ نے خدا کی قسم کھا کر یہ اصولی حقیقت بیان فرمائی کہ میری زبان سے حق کے ماسوا کوئی بات ادا نہیں ہوتی قرآن نے بھی وما ینطق عن الھوی کی گواہی دی۔ یعنی آنحضورؐ اپنی خواہش نفس سے شرعی احکام نہیں دیتے تھے۔

گفتگو میں الفاظ اتنے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے کہ سننے والا آسانی سے یاد کر لیتا بلکہ الفاظ ساتھ ساتھ گنے جا سکتے تھے۔ ام معبد نے کیا خوب تعریف بیان کی کہ "گفتگو جیسے موتیوں کی لڑی پروئی ہوئی: الفاظ نہ ضرورت سے کم نہ زیادہ ---- نہ کوتاہ سخن' نہ طویل گو"۔ تاکید' تفہیم اور تسہیل حفظ کے لیے خاص الفاظ اور کلمات کو تین بار دہراتے تھے۔ بعض امور میں تصریح سے بات کرنا مناسب نہ سمجھتے تو کنایہ میں فرماتے' مکروہ اور فحش اور غیر حیادارانہ کلمات سے تنفر تھا۔ گفتگو میں بالعموم ایک مسکراہٹ شامل رہتی۔ عبداللہؓ

---

[1] شمائل ترمذی۔ باب کیف کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم۔

[2] شمائل ترمذی۔ باب ما جاء فی خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم

بن حارث کا بیان ہے کہ "میں نے حضورؐ سے زیادہ کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا"۔ یہ مسکراہٹ حضورؐ کی سنجیدگی کو خشونت بننے سے بچاتی تھی۔ اور رفقاء کے لیے وجہ جاذبیت ہوتی' بات کرتے ہوئے بار بار آسمان کی طرف دیکھتے۔ گفتگو کے دوران میں کسی بات پر زور دینے کے لیے ٹیک سے اٹھ کر سیدھے ہو بیٹھتے اور خاص جملوں کو بار بار دہراتے' حاضرین کو کسی بات سے ڈراتے تو تکلم کے ساتھ ساتھ زمین پر ہاتھ مارتے۔ بات کی وضاحت کے لیے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشارات (Gestures) سے بھی مدد لیتے۔ مثلاً دو چیزوں کا اکٹھا ہونا واضح کرنے کے لیے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دکھاتے۔ کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر آرپار کر کے مضبوطی یا جمعیت کا مفہوم نمایاں کرتے' کسی شے یا سمت میں اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ حرکت میں لاتے۔ کبھی ٹیک لگائے ہوئے اہم معاملات پر بات کرتے تو سیدھے ہاتھ کو الٹے ہاتھ کی پشت پر رکھ کر انگلیوں میں انگلیاں ڈال لیتے۔ تعجب کے موقعوں پر ہتھیلی کو الٹ دیتے' کبھی سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی الٹے ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصے پر مارتے' کبھی سر ہلاتے اور ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے۔ کبھی ہاتھ کو ران پر مارتے۔

--- قریش مکہ کے ایک مہذب خاندان کا یہ ممتاز فرد قبیلہ بنو سعد کی فضاؤں میں عرب کی فصیح ترین زبان سے آراستہ تو تھا ہی' وحی کی لسان مبین نے حسن گفتار کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ حق یہ ہے کہ حضورؐ افصح العرب تھے۔ حضورؐ کے کلام کا جہاں ادبی معیار بہت بلند تھا۔ وہاں اس میں عام فہم سادگی بھی تھی اور پھر کمال یہ کہ کبھی کوئی گھٹیا اور بازاری لفظ استعمال میں نہیں لیا اور نہ کبھی مصنوعی طرز کی زبان پسند فرمائی' کہنا چاہیے کہ حضورؐ نے اپنی دعوت اور اپنے مشن کی ضروریات سے خود اپنی ایک زبان پیدا فرمائی تھی' ایک اسلوب بیان تھا۔ چنانچہ حضورؐ کے ایک قول "الحرب خدعة" پر بحث کرتے ہوئے ثعلب کا کہنا تھا کہ "هی لغة النبی" یہ نبی اکرمؐ کی مخصوص زبان تھی' بے شمار اصطلاحات بنائیں' تراکیب پیدا کیں' تشبیہیں اور تمثیلیں وضع کیں' خطابت کا نیا انداز نکالا اور بہت سے مروج الفاظ و اسالیب کو متروک کیا۔ ایک مرتبہ بنو فہد کے لوگ آئے تو گفتگو ہوتی رہی۔ جس کے دوران میں آنے والوں نے تعجب سے کہا۔ "اے اللہ کے نبی ہم آپؐ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں' ایک ہی مقام میں پرورش پائی ہے' پھر یہ کیا بات ہے کہ آپؐ ایسی عربی میں بات کرتے ہیں کہ جس (کی لطافتوں) کو ہم میں سے اکثر نہیں سمجھ سکتے؟" فرمایا اور خوب فرمایا "ان الله عز و جل ادبنی فاحسن ادبی و نشات فی بنی سعد بن بکر" (میری لسانی تربیت خود اللہ عز و جل نے فرمائی ہے۔ اور میرے ذوق ادب کو خوشتر بنا دیا۔ نیز میں نے قبیلہ سعد کی فصاحت آموز فضا میں پرورش پائی ہے) ایک موقعے پر کسی ملاقاتی سے بات ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ تعجب سے سن رہے تھے۔ پوچھا اس شخص نے آپؐ سے کیا کہا اور آپؐ نے کیا فرمایا؟ حضورؐ نے وضاحت کی۔ اس پر جناب صدیق کہنے لگے۔ "میں عرب میں گھوما پھرا ہوں اور فصحاء عرب کا کلام سنا ہے۔ لیکن آپؐ سے بڑھ کر کلام فصیح کسی اور سے نہیں سنا' یہاں بھی وہی بات حضورؐ فرماتے ہیں۔ "ادبنی ربی و نشات فی بنی سعد"۔ اسی طرح حضرت

عمرؓ ایک بار کہنے لگے۔ "اے اللہ کے رسولؐ! کیا بات ہے کہ آپؐ فصاحت میں ہم سب سے بالا تر ہیں' حالانکہ آپؐ ہم سے کبھی الگ نہیں ہوئے"۔ فرمایا "کانت لغت اسماعیل' قد درست فجاء بی بھا جبریل ففطنیھا" (میری زبان اسمٰعیل علیہ السلام کی زبان ہے جسے میں نے خاص طور سے سیکھا ہے۔ اسے جبرئیل مجھ تک لائے اور میرے ذہن نشین کر دی) ❶ مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کی زبان معمولی عربی نہ تھی۔ بلکہ خاص پیغمبرانہ زبان تھی جس کا جوڑ اسماعیلی زبان سے ملتا تھا' اور جبرئیلؑ جس زبان میں قرآن لاتے تھے وہ بھی وہی پیغمبرانہ زبان تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر سامنے رہنا چاہیے کہ اکابر تاریخ خصوصاً انبیاء جو ایک مشن لے کر ماحول سے کشمکش کرتے ہیں اور ان میں ہر آن سچے جذبات کی موجیں اٹھتی ہیں وہ بات کرتے ہیں تو اس میں مقصد کی عظمت معنوی گہرائی پیدا کرتی ہے' مخلصانہ جذبے سے ادبی چاشنی دیتے ہیں اور کردار کی بلندی اسے پاکیزہ بناتی ہے۔

--- حضورؐ کی امتیازی شان یہ تھی کہ آپؐ کو "جوامع الکلم" عطا کیے گئے تھے۔ خود فرمایا کہ "اُعطیت بجوامع الکلم" ❷ جوامع الکلم حضورؐ کے وہ مختصر ترین کلمے ہیں جو معنوی لحاظ سے بڑی وسعت رکھتے ہیں۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیش کرنے میں سرورِ عالمؐ اپنی مثال آپ تھے۔ اور اسے خصوصی عطیات رب میں شمار کیا۔

یہاں ہم چند مثالیں بیان کریں گے۔

(۱) "المرء مع من احب"۔ آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہو گا جس سے وہ محبت رکھتا ہو۔

(۲) "اسلم تسلم" تم اسلام لاؤ تو سلامتی پاؤ گے"۔ ❸

(۳) "انما الاعمال بالنیات" اعمال نیتوں پر منحصر ہیں۔

(۴) "لیس للعامل من عملہ الا مانواہ"۔ کسی عمل کرنے والے کو اپنے عمل میں سے بجز اس کے کچھ نہیں ملتا ہے جو کچھ کہ اس نے نیت کی ہے۔

(۵) "الولد للفراش وللعاھر الحجر"۔ بیٹا اس کا جس کے بستر پر (گھر میں) ولادت پائے اور زانی کے لیے پتھر۔

(۶) "الحرب خدعہ" جنگ چالوں سے لڑی جاتی ہے۔

(۷) "لیس الخبر کالمعاینتہ" شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ خبر' مشاہدے جیسی نہیں ہوتی۔

(۸) "المجالس بالامانہ"۔ مجالس کے لیے امانت (راز داری) لازم ہے۔

---

❶ تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۵۶

❷ روایت ابو ہریرہ (مسلم)

❸ نامہ دعوت بنام ہرقل روم۔

(۹) "ترک الشر صدقۃ"۔ برائی سے باز آنا بھی صدقہ (نیکی) ہے۔

(۱۰) "سید القوم خادمھم"۔ قوم کا سردار وہ ہے جو اس کی خدمت کرے۔

(۱۱) "کل ذی نعمۃ محسود"۔ ہر نعمت پانے والے سے حسد کیا جاتا ہے۔

(۱۲) "الکلمۃ الطیبۃ صدقۃ"۔ حسن گفتار بھی ایک صدقہ (نیکی) ہے۔

(۱۳) "من لا یرحم' لا یُرحم"۔ جو (مخلوق پر' خصوصاً انسانوں پر) رحم نہیں کرتا اس پر (خدا کی بارگاہ سے) رحم نہ کیا جائے گا۔

ارشادات رسالت مآب بلحاظ الفاظ' بلحاظ اسلوب' بلحاظ روح بالعموم پہچانے جاتے ہیں۔ اور احادیث اور سیرت کے ریکارڈ میں حضورؐ کے جو اجزائے کلام ہیں' وہ موتیوں کی سی لمعانی رکھتے ہیں۔ تھوڑے الفاظ' ان کا خوش آہنگ گٹھاؤ' ان میں معنوی گہرائی' دل پر اثر کرنے والی روح اخلاص کلام نبویؐ کے امتیازات میں سے ہے۔ مناسب ہو گا کہ دو تین پارہ ہائے فصاحت یہاں درج کیے جائیں۔

"میں تم کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں' نظام اجتماعی کے لیے سمع و طاعت کی تاکید کرتا ہوں ــــ خواہ (اسے چلانے کے لیے) کوئی حبشی غلام ہی (بر سر قیادت) کیوں نہ ہو۔ کیونکہ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت سے اختلافات سے دو چار ہوں گے۔ پس (ایسے حالات میں) تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو اختیار کرو۔ اس کو مضبوطی سے تھامو' اسے ڈاڑھوں سے پکڑے رکھو۔ خبردار! دین میں نئے نئے شگوفے چھوڑنے سے پرہیز کرنا کیونکہ ہر نیا شگوفہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔" [1]

عمرو بن عبسہ نے حضورؐ سے کچھ باتیں کیں۔ جن کے بہت ہی مختصر مگر جامع جوابات حضورؐ نے دیئے۔ اس چھوٹے سے مکالمہ کو ملاحظہ کیجئے:

"اس (دعوت و تحریک کے) کام میں ابتداء" کون کون آپؐ کے ساتھ تھا؟"

"ایک مرد آزاد (مراد حضرت ابوبکرؓ) اور ایک غلام (مراد زیدؓ بن حارثہ)

"اسلام (کی اخلاقی حقیقت) کیا ہے؟"

"پاکیزہ گفتار اور (بھوکوں کو) کھانا کھلانا"۔

"ایمان (کا جوہر) کیا ہے؟"

"صبر اور سخاوت"۔

"کیسا اسلام افضل (معیاری) ہے؟"

"اس شخص کا جس کی زبان اور جس کے ہاتھ کی زیادتیوں سے مسلمان محفوظ رہیں"۔

---

[1] مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب و السنہ۔

"کیسا ایمان افضل (معیاری) ہے؟"
"جس کے ساتھ پسندیدہ اخلاق پایا جائے"۔
"کیسی نماز افضل (معیاری) ہے؟"
"جس میں دیر تک عاجزی سے قیام کیا جائے"۔
"کیسی ہجرت افضل (معیاری) ہے؟"
"ایسی کہ تم ان چیزوں سے کنارہ کش ہو جاؤ جو تمہارے پروردگار کو ناپسند ہیں"۔
"کیسا جہاد افضل (معیاری) ہے؟"
"اس شخص کا جس کا گھوڑا بھی میدان میں مارا جائے اور خود بھی شہادت پائے"۔
"کونسی گھڑی (عبادت کے لیے) سب سے بڑھ کر ہے؟"
"رات کا پچھلا پہر"۔ [1]

ایک بار دریافت کیا گیا کہ "انسانوں کو دوزخ تک پہنچانے کے موجبات زیادہ تر کیا ہیں؟" فرمایا: "الفم و الفرج" [2] یعنی دہن اور شرمگاہ۔ دہن سے اشارہ ہے کلام اور طعام دو چیزوں کی طرف۔ شرمگاہ سے اشارہ ہے جنسی داعیات کی طرف۔ یعنی کلام کا فاسد ہونا' روزی کا ناپاک ہونا اور جنسی جذبات کا بے راہ رو ہونا انسانوں کی عاقبت کو سب سے زیادہ برباد کرنے والا ہے۔ بیشتر جھگڑے اور تصادم اور زیادتیاں اور ظلم بھی انہی خرابیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے ایک بار سوال کیا کہ آپؐ اپنے مسلک کی وضاحت کریں۔ آپؐ نے مختصرا" جس فصیح انداز سے جواب دیا اور اس جواب میں اپنے طرز فکر' اپنے کردار اور اپنی روحانیت کی جامع تصویر کھینچ دی وہ بجائے خود انسانی کلام کی تاریخ میں ایک اعجاز ہے' ملاحظہ ہو:

> "المعرفة راس مالی' والعقل اصل دینی' والحب اساسی' والشوق مرکبی' و ذکر الله انیسی' والثقة کنزی' والحزن رفیقی' والعلم سلاحی' والصبر ردائی' والرضاء غنیمتی والعجز فخری' والزهد حرفتی' والیقین قوتی' والصدق شفیعی' والطاعة حسبی' والجهاد خلقی و قرة عینی فی الصلوة" [3]

ترجمہ: عرفان میرا سرمایہ ہے' عقل میرے دین کی اصل ہے' محبت میری بنیاد ہے' شوق میری سواری ہے' ذکر الٰہی میرا مونس ہے' اعتماد میرا خزانہ ہے' حزن میرا رفیق ہے' علم میرا

---

[1] مشکوٰۃ۔ کتاب الایمان۔

[2] روایت ابو ہریرۃؓ ترمذی۔

[3] ملاحظہ ہو: روایت حضرت علی مندرجہ "الشفاء" از قاضی عیاض۔

ہتھیار ہے' صبر میرا لباس ہے' خدا کی رضا میری غنیمت ہے' عاجزی میرے لیے وجہ اعزاز ہے' زہد میرا پیشہ ہے' یقین میری غذا ہے' صدق میرا سفارشی ہے' طاعت میرا اندوختہ ہے' جہاد میرا کردار ہے ---- اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"۔

حسن تمثیل کی بے شمار زریں مثالیں آپؐ کے کلام میں محفوظ ہیں' جن کی مدد سے بڑے بڑے حقائق آپؐ نے بدوؤں کے ذہن نشین کرا دیئے۔ ان میں یہاں ایک ہی کو لیجیے۔

"مجھے خدا نے ہدایت اور علم کا جو کچھ سرمایہ دے کر اٹھایا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ زمین پر موسلا دھار بارش ہو' پھر اس زمین کا جو ٹکڑا بہت ہی زرخیز ہے اس نے پانی کو پوری طرح جذب کیا اور مرجھایا ہوا سبزہ اس سے تروتازہ ہو گیا اور نئی بوٹیاں کثرت سے اگ آئیں۔ پھر زمین کا کچھ سخت حصہ ایسا بھی تھا جس نے پانی کو اندر جمع کر رکھا اور اللہ نے اسے لوگوں کے لیے مفید بنایا۔ انہوں نے اس کو پیا پلایا اور کھیتوں کو اس سے سیراب کیا۔ پھر یہ پانی ایک اور قطعہ پر برسا جو چٹیل میدان تھا اور نہ اس نے پانی جمع کر کے رکھا' نہ جذب کر کے روئیدگی دکھائی۔ پس اس میں ایک مثال تو ان لوگوں کی ہے جنہوں نے علم دین میں سوجھ بوجھ پیدا کی اور جو کچھ ہدایت مجھے دے کر اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے اس سے انہیں فائدہ پہنچا' انہوں نے خود علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا۔ دوسری مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اس دعوت کو سن کر سر نہیں اٹھایا اور نہ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کیا جو میرے ذریعے بھیجی گئی ہے"۔

---- آپؐ کے انداز گفتگو کا کوئی عنوان باندھا جا سکتا ہے تو قرآن کے اس جملے سے کہ "قولوا للناس حسنا" لوگوں کو حسن تکلم سے خطاب کرو۔ آپ کا حسن کلام سادگی کی شان لیے ہوئے تھا' بناوٹی کلام سے آپؐ کو بعد تھا۔ فرمایا:

ابعد کم منی یوم القیمة الثرثارون المتشدقون المتفیھقون۔

تم میں سے قیامت کے روز وہ لوگ مجھ سے انتہائی دوری پر ہوں گے جو بڑے بول بولنے والے' باتونی اور گھمنڈ جتانے والے ہیں۔

اسی طرح آپؐ کو سنجیدگی اور پاکیزگی کی حدود سے نکل کر فحش کے دائرے میں داخل ہونے والی گفتگو سخت ناپسند تھی ---- حضورؐ کے چمن زار تکلم میں ہمیشہ تبسم کی شبنم لمعانی دکھاتی تھی۔ سب سے بڑھ کر خندہ روئی سے آپؐ ہی کا چہرہ آراستہ رہتا تھا' باوجودیکہ ذمہ داریوں اور مشکلات و مصائب اور ہر آن کی پریشانیوں کے خار زار درپیش تھے۔

خطابت:

تکلم ہی کا ایک اہم جز خطابت ہے۔ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم پیغام کے حامل تھے۔ اور اس کے لیے خطابت ناگزیر ضرورت تھی۔ خطابت یوں بھی عربوں کی دولت تھی۔ پھر قریش تو اس صفت سے خاص طور پر مالا مال تھے۔ عرب اور قریش کے خطیبانہ ماحول سے حضورؐ بہت بلند رہے' فریضہ قیادت نے جب بھی تقاضا کیا آپؐ کی زبان کبھی نسیم سحر کی طرح' کبھی آب جو کی طرح اور کبھی تیغ برق دم کی طرح متحرک ہو جاتی۔

وعظ و تقریر کی کثرت سے آپؐ نے پرہیز کیا۔ اور معاشرہ کی ضروریات اور اس کے ظرف کو دیکھ کر اعتدال سے قوت خطابت کا استعمال کیا۔ مسجد میں خطابت فرماتے تو اپنے چھڑی پر سہارا لیتے اور میدان جنگ میں تقریر فرمانا ہوتی تو کمان پر ٹیک لگاتے۔ کبھی کبھار سواری پر سے خطاب کیا ہے۔ تقریر میں جسم دائیں بائیں جھوم جاتا۔ ہاتھوں کو حسب ضرورت حرکت دیتے' تقریر میں بعض مواقع پر والذی نفسی بیدہ یا والذی نفس محمد بیدہ (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یا محمدؐ کی جان ہے) کہہ کر قسم کھاتے' لہجے میں بھی اور چہرے پر بھی دل کے حقیقی جذبات جھلکتے اور سامعین پر اثر انداز ہوتے۔ اس انسان اعظم کے خطابات دلوں کو ہلا دیتے تھے۔ ہم یہاں صرف دو مثالیں دیں گے۔ حنین و طائف کے معرکہ کے بعد حضورؐ نے مال غنیمت تقسیم کیا۔ تو مؤلفۃ القلوب کی قرآنی مد کے تحت نو مسلم رؤسائے مکہ کو اس میں بہت سا حصہ دیا تا کہ ان کے دل مزید نرم ہوں اور وہ احسان کے رشتے سے اسلامی ریاست کے ساتھ مربوط تر ہو جائیں' انصار میں کچھ لوگوں نے عجیب سے احساسات کی رو دوڑا دی' کہا گیا کہ:

"رسولؐ اللہ نے قریش کو خوب انعامات دیئے اور ہمیں محروم رکھا' حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک خون کی بوندیں ٹپک رہی ہیں"۔

"مشکلات میں ہم یاد آتے ہیں اور حاصل غنیمت دوسرے لوگ لے جاتے ہیں"۔

یہ چرچے حضورؐ کے کانوں تک بھی پہنچے۔ ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا۔ اور اس میں انصار کا اجتماع بلایا گیا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں نے ایسی باتیں کہی ہیں؟ جواب ملا کہ "آپ نے جو سنا وہ صحیح ہے مگر یہ باتیں ہم میں سے ذمہ دار لوگوں نے نہیں کیں' کچھ نوجوانوں نے ایسے فقرے کہے ہیں"۔ واقعہ کی تحقیق کے بعد آپؐ نے یہ تقریر کی:

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم لوگ پہلے گمراہ تھے' خدا نے میرے ذریعے سے تم کو ہدایت دی؟ تم منتشر اور پراگندہ تھے' خدا نے میرے ذریعے سے تم کو متحد اور متفق کیا؟ تم مفلس تھے' خدا نے میرے ذریعے سے تم کو آسودہ حال کیا؟ (ہر سوال پر انصار کہتے جاتے تھے کہ بلاشبہ اللہ اور رسولؐ کا بہت بڑا احسان ہم پر ہے)۔

"---- نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمدؐ! تم کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تمہاری تصدیق کی' تم کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی۔ تم جب مفلس ہو کر آئے تھے تو ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔ تم جواب میں یہ کہتے جاؤ' اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ ہاں تم سچ کہتے ہو۔ لیکن اے گروہ انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں' کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھروں کو جاؤ"۔ ❶

کلام کا اتار چڑھاؤ دیکھئے' خنجر خطابت کی اس دھار کو دیکھئے جو نازک جذبات سے صیقل کی گئی تھی' پھر اس کی روانی دیکھئے' مطالب کے موڑ دیکھئے' پھر یہ غور کیجئے کہ کس طرح خطیبؐ نے بالآخر مطلوبہ کیفیت سامعین میں پوری طرح ابھار دی۔ انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ "ہم کو صرف محمدؐ درکار ہیں"۔

ابتدائی دور دعوت میں کوہ صفا کے خطبہ کے علاوہ متعدد بار آپؐ نے قریش کے سامنے تقاریر فرمائی ہیں۔ اس دور کے ایک خطبہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

ان الرائد لا یکذب اھلہ' واللہ لو کذبت الناس جمیعا ما کذبتکم' ولو غررت الناس جمیعا ما غررتکم۔ واللہ الذی لا الہ الا ھو انی لرسول اللہ الیکم خاصۃ والی الناس کافۃ۔ واللہ لتموتن کما تنامون ولتبعثن کما تستیقظون ولتحاسبن بما تعملون ولتجزون باحسان احسانا" و بالسوء سوء ا و انھا جنۃ ابدا اوالنار ابدا"۔ ❷

ترجمہ: قافلے کا دیدبان اپنے ساتھیوں کو کبھی غلط اطلاع نہیں دیا کرتا۔ خدا کی قسم اگر (بفرض محال) میں اور سب لوگوں سے جھوٹ کہنے پر تیار بھی ہو جاتا تب بھی تم سے غلط بات ہرگز نہ کہتا۔ اگر (بفرض محال) میں دوسرے تمام لوگوں کو ہلاکت و خطرہ سے دو چار کر دیتا تو بھی تم کو کبھی خطرہ میں مبتلا نہ کرتا۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں' میں تمہاری طرف خصوصیت سے اور تمام انسانوں کی طرف جامع طور سے خدا کا مقرر کردہ رسول ہوں۔ بخدا تم کو لازماً مرنا ہے جیسے کہ تم سو جاتے ہو اور پھر مرنے کے بعد تم کو جی اٹھنا ہے ---- جیسے کہ تم نیند سے بیدار ہو جاتے ہو' تم سے لازماً تمہارے کاموں کا حساب لیا جانا ہے اور تمہیں بھلے کا بدلہ بھلا اور برے کا بدلہ برا ضرور ملنا ہے پھر یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہو گی یا ہمیشہ کے لیے دوزخ"۔

کیا ہی سادہ انداز بیان ہے' کتنی عقلی اور جذباتی اپیل ہے۔ داعی کی خیر خواہی ایک ایک لفظ سے ٹپکی پڑتی ہے۔ پھر یقین کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ چھوٹے سے اس خطبے میں تمثیل سے بھی کام لیا گیا ہے' توحید' رسالت اور آخرت کی بنیادی دعوت پوری طرح سموئی ہوئی ہے۔

---

❶ بخاری جلد دوم ص ۶۲۰

❷ جمہرۃ الخطب ص ۵

حضورؐ کے معرکۃ الآرا خطبے دو اور ہیں جن میں سے ایک فتح مکہ کے موقع پر اور دوسرا حجتہ الوداع کے موقع پر دیا گیا' ان خطبوں کا مزاج انتہائی انقلابی ہے اور ان میں ایمان' اخلاق اور اقتدار تینوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ حجتہ الوداع کا خطبہ تو گویا ایک دورِ نو کے افتتاح کا اعلان ہے۔

عام سماجی رابطہ:

بڑے بڑے کام کرنے والے لوگ بالعموم رابطہء عام کے لیے وقت نہیں نکال سکتے اور نہ ہر طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ بعض بڑے لوگوں میں خلوت پسندی اور خشکیٔ مزاج پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ کبر کا شکار ہو کر اپنے لیے ایک عالم بالا بنا لیتے ہیں۔ مگر حضورؐ انتہائی عظمت کے مقام پر فائز ہو کر اور تاریخ کا رخ بدلنے والے کارنامے انجام دے کر عوامی حلقوں سے پوری طرح مربوط تھے۔ اور جماعت اور معاشرہ کے افراد سے شخصی اور نجی تعلق رکھتے تھے' علیحدگی پسندی یا کبر یا یبوست کا شائبہ تک نہ تھا' درحقیقت آپؐ نے جس نظام اخوت کی تاسیس فرمائی تھی' یہ اس کا اہم تقاضا تھا کہ لوگ باہم دگر مربوط رہیں۔ ایک دوسرے کے کام آئیں اور ایک دوسرے کے حقوق پہچانیں۔ بخلاف اس کے آج جو تمدن مغرب میں نشوونما پا گیا ہے اس میں "کسے را باکسے کارے نباشد" کی فضا بڑی انسانیت کش ہو گئی ہے۔ محمد ﷺ کی رہنمائی میں اس فضا کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ آیئے ہم حضورؐ کو عام سماجی رابطوں کے دائرے میں دیکھیں۔

آپؐ کا معمول تھا کہ راستہ میں ملنے والوں سے سلام کہتے اور سلام کہنے میں پہل کرتے۔ کسی کو پیغام بھجواتے تو ساتھ سلام ضرور کہلواتے۔ کسی کا سلام پہنچایا جاتا تو بھیجنے والے کو بھی اور لانے والے کو بھی جدا جدا سلام کہتے۔ ایک بار لڑکوں کی ٹولی کے پاس سے گزرے تو ان کو سلام کیا۔ عورتوں کی جماعت کے قریب سے ہو کر نکلے تو ان کو سلام کیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اور گھر سے نکلتے ہوئے گھر کے لوگوں کو بھی سلام کہتے۔ احباب سے معانقہ بھی فرماتے اور مصافحہ بھی۔ مصافحہ سے ہاتھ اس وقت تک نہ کھینچتے جب تک دوسرا خود ہی اپنا ہاتھ الگ نہ کرتا۔

مجلس میں جاتے تو اس امر کو ناپسند کرتے کہ صحابہ تعظیم کے لیے کھڑے ہوں۔ مجلس کے کنارے ہی بیٹھ جاتے۔ کندھوں پر سے پھاند کر بیچ میں گھسنے سے احتراز فرماتے۔ فرمایا۔ "اجلس کما یجلس العبد". (اسی طرح بیٹھتا ہوں' جس طرح خدا کا ایک بندہ بیٹھتا ہے ــــ [1] اپنے زانو ساتھیوں سے بڑھا کر نہ بیٹھتے' کوئی آتا تو اعزاز کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے۔ آنے والا جب تک خود نہ اٹھتا آپؐ مجلس سے الگ نہ ہوتے۔

اہل مجلس کی گفتگو میں غیر متعلق موضوع نہ چھیڑتے بلکہ جو سلسلہ کلام چل رہا ہوتا اسی میں شامل ہو جاتے۔ چنانچہ نماز صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں صحابہؓ سے خوب باتیں ہوتیں۔ جاہلیت کے قصے چھڑ

---

[1] روایت حضرت عائشہؓ

جاتے اور ان پر خوب ہنسی بھی ہوتی۔ ❶ صحابہ شعر بھی پڑھتے۔ جس موضوع سے اہل مجلس کے چہروں سے اکتانے کا اثر محسوس ہوتا اسے بدل دیتے۔ ایک ایک فردِ مجلس پر توجہ فرماتے تاکہ کوئی یہ نہ محسوس کرے کہ کسی کو اس پر آپؐ نے فوقیت دی ہے۔ دورانِ تکلم کوئی شخص غیر متعلق سوال چھیڑ دیتا تو اسے نظرانداز کر کے گفتگو جاری رکھتے اور سلسلہ پورا کر کے پھر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ خطاب کرنے والے کی جانب سے اس وقت تک رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ پھیرلیتا۔ کان میں کوئی سرگوشی کرتا تو جب تک وہ بات پوری کر کے منہ نہ ہٹالیتا آپؐ برابر اپنا سر اسی کی طرف جھکائے رکھتے۔ کسی کی بات کو کبھی نہ کاٹتے۔ الا یہ کہ حق کے خلاف ہو۔ اس صورت میں یا تو ٹوک دیتے یا چہرے پر ناگواری آجاتی یا اٹھ کر چلے جاتے۔ ناپسند تھا کہ کھڑے کھڑے کوئی اہم بحث چھیڑ دی جائے۔ ناپسندیدہ باتوں سے یا تو اعراض فرماتے ورنہ گرفت کرنے کا عام طریقہ یہ تھا' کہ براہِ راست نام لے کر ذکر نہ کرتے۔ بلکہ عمومی انداز میں اشارہ کرتے یا جامع طور پر نصیحت کر دیتے۔ انتہائی تکدر کی صورت میں جو فقط دینی امور میں ہوتا تھا احباب کو احساس دلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ طریق اظہار تھا کہ یا تو شخص متعلق کے آنے پر سلام قبول نہ کرتے یا عدم التفات دکھاتے۔ ناپسندیدہ آدمی کے آنے پر بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ چنانچہ ایک بار کوئی آیا جسے آپؐ بئس اخو العشیرۃ یا بئس ابن العشیرۃ (اپنے گروہ کا برا آدمی) سمجھتے تھے۔ مگر آپؐ نے بے تکلفی سے بات چیت کی۔ حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہوا تو آپؐ نے فرمایا۔ "قسم ہے کہ قیامت کے دن خدا کے حضور وہ شخص بدترین آدمی کا مقام پائے گا جس سے لوگ اس کی بدسلوکی کے ڈر سے ملنا جلنا چھوڑ دیں"۔ ❷

کسی کی ملاقات کو جاتے تو دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر اطلاع دینے اور اجازت لینے کے لیے تین مرتبہ سلام کرتے۔ جواب نہ ملتا تو بغیر کسی احساس تکدر کے واپس چلے آتے۔ رات کو کسی سے ملنے جاتے تو اتنی آواز میں سلام کہتے کہ اگر وہ جاگتا ہو تو سن لے اور سو رہا ہو تو نیند میں خلل نہ آئے۔

بدن یا لباس سے کوئی شخص تنکا یا مٹی وغیرہ ہٹاتا تو شکریہ ادا کرتے ہوئے فرماتے مسح اللہ عنک ماتکرہ (خدا تم سے ہر اس شے کو دور کرے جو تمہیں بری لگے) ہدیہ قبول کرتے اور جواباً ہدیہ دینے کا خیال رکھتے۔ کسی شخص کو اتفاقاً کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو اسے بدلہ لینے کا حق دیتے اور کبھی عوض میں کوئی ہدیہ دیتے۔ کوئی شخص نیا لباس پہن کر سامنے آتا تو فرماتے: حسنۃ حسنۃ ابل و اخلق (یعنی خوب سے خوب دیر تک پہنو' بوسیدہ کرو) بدسلوکی کا بدلہ برے سلوک سے نہ دیتے بلکہ عفو و درگزر سے کام لیتے۔ دوسرے کے قصور معاف کر دیتے تو اطلاع کے لیے اپنا عمامہ علامت کے طور پر بھیج دیتے' کوئی پکارتا تو خواہ وہ گھر کا

---

❶ روایت جابرؓ بن سمرہ (مسلم)

❷ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۱' بخاری

آدمی ہو یا رفقاء میں سے ہمیشہ "لبیک" (حاضر ہوں) کہتے۔

بیماروں کی عیادت کو اہتمام سے جاتے۔ سرہانے بیٹھ کر پوچھتے۔ "کیف تجدک"؟ (تمہاری طبیعت کیسی ہے؟) بیمار کی پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے۔ کبھی سینے اور پیٹ پر دست شفقت پھیرتے اور کبھی چہرے پر' کھانے کو پوچھتے۔ بیمار کسی چیز کی خواہش کرتا تو اگر مضرنہ ہوتی تو منگوا دیتے۔ تسلی دیتے اور فرماتے "لا باس! انشاء اللہ طھور" (فکر کی کوئی بات نہیں۔ خدا نے چاہا تو جلد صحت یاب ہو گے) شفا کے لیے دعا فرماتے۔ حضرت سعدؓ کے لیے تین بار دعا کی۔ مشرک چچاؤں کی بیمار پرسی بھی کی۔ ایک یہودی بچے کی عیادت بھی فرمائی (جو ایمان لے آیا) اس کام کے لیے کوئی دن اور وقت مقرر نہ تھا۔ جب بھی اطلاع ملتی اور وقت ملتا تشریف لے جاتے۔

ایک بار حضرت جابرؓ بیمار پڑے۔ رسول خدا ﷺ اپنے رفیق خاص حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لئے ہوئے پیدل خاصی دوری تک چل کر گئے (مدینہ کی آبادی پھیلی ہوئی تھی) حضرت جابر بے ہوش پڑے تھے۔ آپؐ نے دیکھا۔ پھر وضو کیا۔ پانی کے چھینٹے دیئے' دعا کی اور مریض کی حالت سنبھلنے لگی چنانچہ حضرت جابرؓ نے بات چیت کی اور اپنے ترکہ کے متعلق مسائل پوچھے۔

تواضع کی انتہا یہ تھی کہ منافقین کے لیڈر عبداللہ بن ابی تک کی عیادت فرمائی۔

جب کسی شخص کی وفات ہو جاتی تو تشریف لے جاتے' عالم نزع میں بلایا جاتا یا از خود اطلاع پا کر پہنچتے تو توحید اور توجہ الی اللہ کی تلقین کرتے۔ میت کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار فرماتے' صبر کی نصیحت کرتے اور چلانے اور بکا کرنے سے روکتے۔ سفید کپڑوں میں اچھا کفن دینے کی تاکید کرتے اور تجہیز و تکفین میں جلدی کراتے۔ جنازہ اٹھتا تو ساتھ ساتھ چلتے۔ مسلمانوں کے جنازے خود پڑھاتے اور مغفرت کے لیے دعا کرتے۔ کوئی جنازہ گزرتا ---- تو چاہے وہ غیر مسلم کا ہو۔ کھڑے ہو جاتے (بیٹھے رہنے کی روایت بھی ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ قیام کا طریقہ منسوخ ہو گیا تھا ---- ملاحظہ ہو زادالمعاد ج ا ص ۱۴۵) تلقین فرماتے کہ میت کے گھر والوں کے لیے لوگ کھانا پکوا کر بھجوائیں (کجا آج یہ الٹی رسمیت مسلط ہے کہ میت والے گھر میں دوسروں کی ضیافت ہوتی ہے) ناپسند تھا کہ باقاعدہ مجلس تعزیت کا سلسلہ ایک رسمی ضابطے کے طور پر کئی روز جاری رہے۔

کوئی مسافر سفر سے واپس آتا اور حاضری دیتا تو اس سے معانقہ کرتے' بعض اوقات پیشانی چوم لیتے کسی کو سفر کے لیے رخصت فرماتے تو کہتے کہ بھائی ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔

محبت آمیز بے تکلفی میں کبھی کبھی احباب کے ناموں کو مختصر کر کے بھی پکار لیتے' جیسے یا ابا ہریرہ کی بجائے "اباہر" حضرت عائشہؓ کو کبھی کبھار "عائش" کہہ کر پکارتے۔

بچوں سے بہت دلچسپی تھی۔ بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے پیار کرتے' دعا فرماتے' ننھے بچے لائے جاتے تو ان کو گود میں لے لیتے۔ ان کو بہلانے کے لیے عجیب سے کلمے فرماتے یعنی خرقۃ حرقۃ فی عین کل

بقہ۔ ❶ ایک معصوم بچے کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا "انهم لمن ريحان الله" (یہ بچے تو خدا کے باغ کے پھول ہیں) بچوں کے نام تجویز کرتے' بچوں کو قطار میں جمع کر کے انعامی دوڑ لگوا۔ تے کہ دیکھیں کون ہمیں پہلے چھو لیتا ہے' بچے دوڑتے ہوئے آتے تو کوئی سینہ پر گرتا' کوئی پیٹ پر۔ بچوں سے دل لگی بھی کرتے۔ مثلاً حضرت انسؓ کو کبھی کبھی پیار سے کہا "یاذاالاذنين" ! (او' دو کانوں والے) حضرت انسؓ کے بھائی ابو عمیر کا پالا ہوا ممولا مر گیا تو وہ اداس بیٹھا تھا۔ حضورؐ آئے تو پکار کر کہا "یا ابا عمیر! ما فعل النغیر" (ابو عمیر! تمہارے ممولے کو کیا ہوا) عبداللہ بن بشیر کے ہاتھ ان کی والدہ نے ہدیہ کے طور پر انگور حضورؐ کی خدمت میں بھیجے۔ صاحبزادے میاں راستے میں کھا گئے۔ بعد میں معاملہ کھلا تو آپؐ پیار سے عبداللہ کے کان پکڑ کر کہتے "یا غدر! یا غدر"! (او دھوکے باز' او دھوکے باز) سفر سے آرہے ہوتے تو جو بچہ راستے میں ملتا اسے سواری پر بٹھا لیتے' چھوٹا ہوتا تو آگے' بڑا ہوتا تو پیچھے' فصل کا میوہ پہلی بار آتا تو دعائے برکت مانگ کر کم عمر بچے کو دے دیتے' آپؐ کے پیش نظر تھا کہ یہی نئی پود آئندہ تحریک اسلامی کی علم بردار ہو گی۔

بوڑھوں کا احترام فرماتے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے ضعیف العمر والد کو (جو بینائی سے بھی محروم ہو چکے تھے) بیعت اسلام کے لیے آپؐ کی خدمت میں لائے۔ فرمایا۔ انہیں کیوں تکلیف دی۔ میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔

مروت کی انتہا یہ تھی کہ مدینہ کی ایک عورت جس کی عقل میں کچھ فتور تھا آتی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے کچھ کہنا ہے آپؐ اسے فرماتے ہیں کہ تم چلو' کسی کوچے میں انتظار کرو' میں ابھی آتا ہوں۔ چنانچہ اس کی بات جا کر سنی۔ اور اس کا کام کر کے دیا ❷ ایسا ہی ایک واقعہ عدی بن حاتم نے دیکھا تھا۔ اور حضورؐ کی مروت کو نبوت کی علامت کے طور پر لیا۔

میل جول کی زندگی میں آپؐ کے حسن کردار کی تصویر حضرت انسؓ نے خوب کھینچی ہے وہ فرماتے ہیں:

"میں دس برس تک حضورؐ کی خدمت میں رہا اور آپؐ نے مجھے کبھی اف تک نہ کہی۔ کوئی کام جیسا بھی کیا' نہیں کہا کہ یہ کیوں کیا۔ اور کوئی کام نہ کیا تو نہیں کہا کہ کیوں نہیں کیا۔ یہی معاملہ آپؐ کا خادموں اور کنیزوں کے ساتھ رہا۔ آپؐ نے ان میں سے کسی کو کبھی نہیں مارا"۔

اس کی تصدیق حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ازواج یا خادموں میں سے نہ کبھی کسی کو مارا' نہ کسی سے کوئی ذاتی انتقام لیا ــــ بجز اس کے کہ آپؐ خدا کے راستے میں جہاد کریں یا قانون الٰہی کے تحت اس کی

---

❶ بعض لوگوں نے معنی نکالنے کی کوشش کی ہے (ہر مچھر کی آنکھ میں ٹڈی کا جبڑہ ہے) مگر بظاہر یہ ویسے ہی کلمات ہیں جیسے ہر ملک میں بچوں کو بہلانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

❷ المواہب اللدنیہ ج ۱ص ۲۹۵

مقرر کردہ حرمتوں کے تحفظ کے لیے کارروائی کریں۔

خالص نجی زندگی:

اکثر بڑے لوگ وہ کہلاتے ہیں جو پبلک لائف کے لیے ایک مصنوعی کردار کا چغہ پہنے رکھتے ہیں جو نجی زندگی میں اتر جاتا ہے۔ باہر دیکھیے تو بڑی آن بان ہے' گھر پہنچے تو انتہائی پستی میں جا گرے۔ باہر سادگی اور تواضع دکھائی' گھر کو پلٹے تو عیش و تنعم میں ڈوب گئے۔ پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں کسی شخص کے ہاں جتنا زیادہ اختلاف اور فاصلہ ہوتا ہے' اتنا ہی اس کا مرتبہ اونی ہوتا ہے۔ حضورؐ کو دیکھیے تو ایک ہی رنگ گھر میں بھی ہے اور گھر سے باہر بھی۔

حضرت عائشہؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ رسولؐ خدا اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا۔ آپؐ آدمیوں میں سے ایک آدمی تھے۔ اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال خود ہی کر لیتے۔ (کہ ان میں کوئی جوں وغیرہ نہ چڑھ آئی ہو) بکری کا دودھ خود دوہتے اور اپنی ضرورتیں خود ہی پوری کر لیتے۔ [1] نیز اپنے کپڑوں کو خود ہی پیوند لگا لیتے۔ اپنے جوتے کی مرمت کر لیتے اور یہ کہ اپنے ڈول کو ٹانکے لگا لیتے' بوجھ اٹھاتے' جانوروں کو چارہ ڈالتے' کوئی خادم ہوتا تو اس کے ساتھ مل کر کام کرا دیتے (مثلاً) اسے آٹا پسوا دیتے۔ کبھی اکیلے ہی مشقت کر لیتے۔ [2] بازار جانے میں عار نہ تھی۔ خود ہی سودا سلف لاتے اور ضرورت کی چیزیں ایک کپڑے میں باندھ کر اٹھا لاتے۔

لوگوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ رسولؐ خدا جب گھر میں ہوتے تو کیا رنگ رہتا؟ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں: "الین الناس بساما ضاحکا"۔ (سب سے زیادہ نرم خو' متبسم' خندہ جبیں!) اور اس لینت کی شان یہ تھی کہ "کبھی کسی خادم کو جھڑکا نہیں"۔ [3] حق یہ ہے کہ "رسول خدا سے بڑھ کر کوئی بھی اپنے اہل و عیال کے لیے شفیق نہ تھا"۔ (مسلم)

ایک بار حضرت امام حسینؓ کے پوچھنے پر حضرت علیؓ نے بیان کیا کہ رسول خدا گھر میں آتے تو اپنا وقت تین طرح کی مصروفیتوں میں صرف کرتے۔ کچھ وقت خدا کی عبادت میں صرف ہوتا۔ کچھ وقت اہل و عیال کے لیے تھا اور کچھ وقت اپنے آرام کے لیے۔ پھر انہی اوقات میں سے ایک حصہ ملاقاتوں کے لیے نکالتے جن میں مسجد کی عام مجالس کے علاوہ خصوصی گفتگو کرنے والے احباب یا مہمان آ آ کر ملتے یا کچھ لوگ ضروریات و حاجات لے کر..............................

---

[1] ملاحظہ ہو: شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم

[2] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۳

[3] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۳

آتے۔ ❶ دیکھا جائے تو آرام کے لیے بہت ہی کم وقت رہ جاتا تھا۔

ازواج مطہرات کے نان و نفقہ اور مختلف ضروریات کا انتظام بھی آپؐ کو کرنا ہوتا پھر ان کی تعلیم و تربیت بھی آپؐ کے ذمہ تھی۔ پھر انہی کے ذریعے طبقہ خواتین کی اصلاح کا کام جاری رہتا۔ عورتیں اپنے مسائل لے کر آتیں اور ازواج مطہرات کی معرفت دریافت کرتیں۔ اس کے باوجود گھر کی فضا کو آپؐ نے کبھی خشک اور بوجھل نہ بننے دیا۔ اور نہ اس میں کوئی مصنوعی انداز پیدا ہونے دیا۔ گھر ایک انسانی گھر کی طرح تھا جس کی فضا میں فطری جذبات کا مدوجزر رہتا ---- اس میں آنسوؤں کی چمک بھی ہوتی اور تبسموں کی لمعانی بھی، محبتیں بھی کار فرما تھیں اور کبھی کبھار رشک کا کھچاؤ بھی پیدا ہوتا۔ پریشانیاں بھی رہتیں اور تفریح کے لمحات بھی آتے۔ حضورؐ اس باغ میں آتے تو نسیم کے جھونکے کی طرح آتے اور ایک عجیب شگفتگی پھیل جاتی۔ بات چیت ہوتی، کبھی کبھی قصہ گوئی بھی ہوتی، اور دلچسپ لطائف بھی وقوع میں آتے، مثلاً اپنا ایک واقعہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے خزیرہ (گوشت کا قیمہ کر کے پانی میں پکاتے اور پھر اس پر آٹا چھڑکتے جو ساتھ ہی پکتا) تیار کیا۔ حضرت سودہؓ بھی موجود تھیں اور رسول خدا دونوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ بے تکلفی کی فضا تھی۔ میں نے سودہؓ سے کہا کہ کھاؤ، انہوں نے انکار کیا پھر اصرار سے کہا کہ کھاؤ۔ انہوں نے انکار کیا۔ پھر اصرار سے کہا کہ تمہیں ضرور کھانا ہوگا۔ انہوں نے پھر انکار کیا۔ ادھر سے پھر کہا گیا کہ اس میں سے کھاؤ ورنہ اٹھا کر تمہارے منہ پر مل دوں گی۔ حضرت سودہؓ نے بھی ہٹ دکھائی۔ حضرت عائشہؓ نے خزیرہ میں ہاتھ ڈالا۔ اور واقعی حضرت سودہؓ کے چہرے پر لیپ دیا۔ اس بے تکلفی پر حضورؐ خوب ہنسے اور سودہؓ سے کہا کہ تم اس کے منہ پر ملو تاکہ حساب برابر ہو جائے چنانچہ سودہؓ نے ایسا ہی کیا۔ حضورؐ مکرر ہنسے۔ ❷

ایک موقع پر حضرت ابوبکرؓ آئے تو حضرت عائشہؓ کو حضورؐ کے ساتھ شوخی سے بات کرتے پایا۔ غضب ناک ہو کر مارنے کو چلے۔ حضورؐ نے ان کو ٹھنڈا کیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے اسی غصے میں جناب صدیق چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد آپؐ نے بڑے تیکھے انداز میں حضرت عائشہؓ سے کہا۔ دیکھا ہم نے تمہیں اس شخص سے بچا لیا۔

گھریلو زندگی کے اس فطری اتار چڑھاؤ کو بعض لوگ اسلامیت کے تصور سے فروتر پاتے ہیں اور خصوصاً نبی کریمؐ کے گھر کا نقشہ کچھ ایسا ذہن میں رکھتے ہیں کہ اس میں کوئی غیر انسانی پتلے رہتے تھے جن میں نہ کوئی جذبہ تھا، نہ خواہش ---- حالانکہ وہ گھر انسانوں کا گھر تھا۔ اور اس میں سارے انسانی جذبات کام کرتے تھے مگر اس گھر میں معصیت نہ تھی۔ اس لحاظ سے وہ نمونے کا گھر تھا۔ راتوں کو جب حضورؐ بستر پر ہوتے تو اہل

---

❶ شمائل ترمذی۔ باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم

❷ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۷-۲۹۶

وعیال سے عام باتیں ہوتیں۔ کبھی گھریلو امور پر، کبھی عام مسلمانوں کے مسائل پر۔ یہاں تک کہ کبھی قصہ کہانی بھی سناتے۔ ایک بار آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے ام زرع کی کہانی بیان کی۔ اس کہانی میں گیارہ عورتیں اپنے اپنے خاوندوں کا کردار آپس میں بیان کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک عورت ام زرع اپنے خاوند ابو زرع کا من موہنا کردار پیش کرتی ہے۔ یہ کہانی ادبی لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے۔ خاتمے پر حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں بھی تمہارے حق میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ ابو زرع ام زرع کے لیے تھا۔ اسی طرح کسی دوسرے موقع پر کوئی قصہ سنایا تو سننے والیوں میں سے ایک نے کہا کہ یہ تو خرافہ کے قصوں جیسا ہے (عرب میں خرافہ کی ایک روایتی شخصیت تھی جس سے بہت سے حیرت ناک قصے منسوب تھے) حضورؐ نے کہا کہ جانتی بھی ہو کہ خرافہ کی کیا حقیقت تھی۔ پھر آپؐ نے خرافہ کی روایتی شخصیت کا قصہ بھی بیان کیا کہ بنو عذرہ کے اس آدمی کو جن پکڑ کر لے گئے تھے اور کچھ عرصہ کے بعد واپس چھوڑ گئے۔ ❶

عمر بھر معمول رہا کہ رات کے دوسرے نصف حصے کے اوائل میں بیدار ہو کر مسواک اور وضو کے بعد تہجد ادا فرماتے۔ ❷ قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہوئے بعض اوقات اتنا لمبا قیام فرماتے کہ قدم مبارک متورم ہو جاتے۔ ❸ صحابہ نے اس مشقت پر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپؐ کو غفران خاص سے نوازا ہے۔ (قد غفرلک اللہ ما تقدم من ذنبک و ما تاخر) پھر اس قدر حضورؐ جان کیوں گھلاتے ہیں۔ فرمایا: "افلا اکون عبداً شکوراً"۔ کیا میں خدا کا احسان شناس اور شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ ❹

گھر اور اس کے ساز و سامان کے متعلق آپؐ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ زندگی اس طرح گزاری جائے۔ جیسے مسافر گزارتا ہے فرمایا کہ میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو تھوڑی دیر کے لیے سائے میں آرام کرے اور پھر اپنی راہ لے۔ مراد یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کو منتہا بنائیں اور دنیوی زندگی کو ادائے فرض یا امتحان کے طور پر گزاریں۔ اور جنہیں یہاں کسی بڑے نصب العین کے لیے جد و جہد کرنی ہو ان کے لیے کیا موقع ہے کہ اعلیٰ درجہ کے مسکن بنائیں اور ان کو ساز و سامان سے آراستہ کریں اور پھر ان میں مگن رہ کر لطف اٹھائیں۔ چنانچہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے نہ اعلیٰ درجہ کی عمارتیں بنائیں۔ اور نہ ان میں اسباب جمع کئے اور نہ ان کی زینت آرائش کی۔ ان کے گھر بس۔ "بہترین مسافرانہ قیام گاہیں تھیں"۔ ❺ ان میں گرمی سردی سے بچنے کا اہتمام تھا، جانوروں کی مداخلت سے بچاؤ کا انتظام تھا، پردہ داری (Privacy) کا

---

❶ شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی کلام رسول اللہ ﷺ فی السمر

❷ زاد المعاد۔

❸ شمائل ترمذی باب ماجاء فی عبادۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

❹ یہ اشارہ سورہ فتح کی آیت۔ تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی کوتاہی سے درگزر فرمائے۔ (الفتح۔ ۲)

❺ شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی عبادۃ رسول اللہ (ﷺ)۔

بندوبست تھا۔ اور حفظان صحت کے ضروری پہلو ملحوظ تھے۔ ❶ حضورؐ نے مسجد کے ساتھ ازواج کے لیے حجرات (چھوٹے چھوٹے کمرے) بنوا لیے تھے۔ بجز صفائی کے اور کسی طرح کی آرائش نہ تھی۔ صفائی میں ذوق نبوت یہاں تک تھا کہ صحابہ کو تاکید فرمائی۔ "گھروں کے آنگن صاف رکھو"۔ ❷

سازو سامان میں چند برتن نہایت سادہ قسم کے تھے۔ مثلاً ایک لکڑی کا پیالہ (بادیہ) تھا۔ جس پر لوہے کے پتر لگے تھے اور کھانے پینے میں اس کا بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ خوراک کا سامان جمع تو کیا ہوتا روز کا روز بھی کافی مقدار میں میسر نہ ہوا۔ بستر چمڑے کے گدے پر مشتمل تھا۔ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ بان کی بنی ہوئی چارپائی رکھتے۔ ٹاٹ کا بستر بھی استعمال میں رہا۔ جو دوہرا کر کے بچھایا جاتا۔ ایک بار چوہرا کر کے بچھایا گیا تو صبح دریافت فرمایا کہ آج کیا خصوصیت تھی کہ مجھے گہری نیند آئی اور تہجد چھوٹ گئی۔ معلوم ہونے پر حکم دیا کہ بستر کو پہلے ہی حال پر رہنے دیا جائے۔ زمین پر چٹائی بچھا کر بھی لیٹنے کا معمول تھا۔ بعض اوقات کھری چارپائی کے نشانات بدن پر دیکھ کر رفقائے خاص (مثلاً حضرت عمرؓ و عبداللہ بن مسعود) رو دیئے۔ ❸

ذرا حضرت عمرؓ کا چشم دید نقشہ سامنے لایئے۔ واقعہ ایلاء کے زمانے میں انہوں نے حضورؐ کو اس عالم میں دیکھا کہ: "آپؐ کھری چارپائی پر لیٹے ہیں اور جسم پر نشان پڑ گئے ہیں۔ ادھر ادھر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہیں۔ ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کیلی سے لٹک رہی ہے' یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے"۔ حضورؐ نے رونے کا سبب پوچھا تو عرض کی کہ "قیصرو کسریٰ تو عیش کریں اور آپؐ کا یہ حال رہے"۔ فرمایا "عمرؓ کیا تم اس پر خوش نہیں کہ وہ دنیا لے جائیں اور ہمیں آخرت ملے"۔ ❹

اکل و شرب:

کھانے پینے کا ذوق بہت نفیس تھا۔ گوشت سے خاص رغبت تھی' زیادہ ترجیح دست' گردن' اور پیٹھ کے گوشت کو دیتے' نیز پہلو کی ہڈی پسند تھی' ثرید (گوشت کے شوربے میں روٹی کے ٹکڑے بھگو کر یہ مخصوص عربی کھانا تیار کیا جاتا تھا) تناول فرمانا مرغوب تھا۔ پسندیدہ چیزوں میں شہد' سرکہ' خربوزہ' ککڑی' لوکی' کھچڑی' مکھن وغیرہ اشیاء شامل تھیں۔ دودھ کے ساتھ کھجور (بہترین مکمل غذا بنتی ہے) کا استعمال بھی اچھا لگتا اور مکھن لگا کے کھجور کھانا بھی ذوق میں شامل تھا۔ کھرچن (تہ دیگی) سے بھی انس تھا۔ ککڑی نمک لگا کر

---

❶ زاد المعاد۔

❷ روایت ابن المسیب۔ (ترمذی)

❸ ملاحظہ ہو: شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی فراش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

❹ المواہب اللدنیہ ج ا ص ۳۴۰ نیز صحیح مسلم باب فی الرجل یطلق امراتہ' روایت عبداللہؓ ابن عباسؓ۔

اور خربوزہ شکر لگا کر بھی کھاتے۔ مریضوں کی پرہیزی غذا کے طور پر حریرہ کو اچھا سمجھتے اور تجویز بھی فرماتے۔ میٹھا پکوان بھی مرغوب خاص تھا۔ اکثر جو کے ستو بھی استعمال فرماتے۔ ایک مرتبہ بادام کے ستو پیش کیے گئے تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ امراء کی غذا ہے۔ گھر میں شوربا پکتا تو کہتے کہ ہمسائے کے لیے ذرا زیادہ بنایا جائے۔

پینے کی چیزوں میں نمبر ایک پر میٹھا پانی تھا۔ اور بطور خاص دو روز کی مسافت سے منگوایا جاتا۔ دودھ' پانی ملا دودھ (جسے کچی لسی کہا جاتا ہے) اور شہد کا شربت بھی رغبت سے نوش فرماتے۔ غیر نشہ دار نبیذ بھی قرین ذوق تھی۔ مشکیزے یا پتھر کے برتن میں پانی ڈال کر کھجور بھگو دی جاتی اور اسے متواتر دن بھر استعمال کرتے لیکن وقت زیادہ ہونے پر چونکہ نشہ ہونے کا اندیشہ ہو جاتا لہٰذا پھنکوا دیتے۔ بہ روایت ابو مالک اشعریؓ یہ فرمایا بھی کہ میری امت میں سے بعض لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام بدل کر کچھ اور رکھ دیں گے (چنانچہ سلاطین مابعد نے نبیذ کے نام سے منشیات کا استعمال کیا)

افراد کا الگ الگ بیٹھ کر کھانا ناپسند تھا' اکٹھے ہو کر کھانے کی تلقین فرمائی' میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو اپنی شان فقر کے خلاف سمجھتے' اسی طرح دستر خوان پر چھوٹی چھوٹی پیالیوں اور طشتریوں میں کھانا رکھا جانا بھی خلاف مزاج تھا۔ سونے چاندی کے برتنوں کو بالکل حرام فرما دیا تھا۔ کانچ' مٹی' تانبے اور لکڑی کے برتنوں کو استعمال میں لاتے رہے۔ دستر خوان پر ہاتھ دھونے کے بعد جوتا اتار کر بیٹھتے۔ سیدھے ہاتھ سے کھانا لیتے اور اپنے سامنے کی طرف سے لیتے۔ برتن کے وسط میں ہاتھ نہ ڈالتے۔ ٹیک لگا کر کھانا پینا بھی خلاف معمول تھا دو زانو یا اکڑوں بیٹھتے۔ ہر لقمہ لینے پر بسم اللہ پڑھتے۔ ناپسندیدہ کھانا بغیر عیب نکالے خاموشی سے چھوڑ دیتے۔ زیادہ گرم کھانا نہ کھاتے' کبھی کبھار چھری سے پکا ہوا گوشت کاٹ کاٹ کر بھی کھایا ہے۔ مگر یہ پر تکلف طریقہ مرغوب نہ تھا۔ [1] کھانا ہمیشہ تین انگلیوں سے لیتے اور ان کو لتھڑنے نہ دیتے۔ کبھی کبھار میوہ یا پھل کھڑے ہو کر یا چلتے ہوئے بھی کھا لیا۔ دو پھل اکٹھے بھی کھائے۔ مثلاً ایک ہاتھ میں خربوزہ لیا اور دوسرے میں کھجور۔ کھجور کی گٹھلی الٹے ہاتھ سے پھینکتے۔ دعوت ضرور قبول فرماتے اور اگر اتفاقاً کوئی دوسرا آدمی (بات چیت کرتے ہوئے یا کسی اور سبب سے) ساتھ ہوتا تو اسے لے تو جاتے مگر صاحب خانہ سے اس کے لیے اجازت لیتے۔ مہمان کو کھانا کھلاتے تو بار بار اصرار سے کہتے کہ اچھی طرح بے تکلفی سے کھاؤ۔ کھانے کی مجلس سے بہ تقاضائے مروت سب سے آخر میں اٹھتے۔ دوسرے لوگ اگر پہلے فارغ ہو جاتے تو ان کے ساتھ ہی آپؐ بھی اٹھ جاتے۔ فارغ ہو کر ہاتھ ضرور دھوتے۔ دعا کرتے جس میں خدا کی نعمتوں کے لیے ادائے شکر کے کلمات ہوتے' نیز طلب رزق فرماتے اور صاحب خانہ کے لیے برکت چاہتے۔ کھانے کی کوئی چیز آتی تو حاضر دوستوں کو باصرار شریک کرتے اور غیر حاضر دوستوں کا حصہ

---

[1] روایت عمر بن امیہ (بخاری و مسلم) نیز روایت عائشہؓ (ابوداؤد و بیہقی)

رکھ دیتے۔ پھل وغیرہ کھانے کی مجلس میں ایک ایک دانہ لینے کی تربیت آپؐ نے دی۔ پانی غٹ غٹ کی آواز نکالے بغیر پیتے اور بالعموم تین بار پیالہ منہ سے الگ کر کے سانس لیتے اور ہر بار آغاز "بسم اللہ" سے اور اختتام "الحمدللہ و الشکرللہ" پر کرتے۔ عام طریقہ بیٹھ کر پانی پینے کا تھا۔ مگر کبھی کبھی کھڑے ہو کر بھی پیا ہے۔ پینے کی چیز مجلس میں آتی تو بالعموم داہنی جانب سے دور چلاتے اور جہاں ایک دور ختم ہوتا دوسرا وہیں سے شروع کرتے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو ترجیح دیتے‘ مگر داہنے ہاتھ والوں کے مقررہ استحقاق کی بنا پر ان سے اجازت لے کر ہی ترتیب توڑتے‘ احباب کو کوئی چیز پلاتے تو خود سب سے آخر میں پیتے اور فرماتے کہ "ساقی آخر میں پیا کرتا ہے"۔ کھانے پینے کی چیزوں میں پھونک مارنا یا ان کو سونگھنا ناپسند تھا۔ سانس میں بو کا ہونا چونکہ خلاف مزاج تھا اس لیے کچی پیاز اور لہسن کا استعمال ہمیشہ ناپسند رہا۔ کھانے پینے کی چیزوں کو ڈھانکنے کا حکم دیا ہے۔ کوئی نیا کھانا سامنے آتا تو کھانے سے پہلے اس کا نام معلوم فرماتے۔ زہر خورانی کے واقعہ کے بعد معمول ہو گیا تھا کہ اگر کوئی اجنبی شخص کھانا کھلاتا تو پہلے ایک آدھ لقمہ خود اسے کھلاتے۔ ❶

ذوق کی اس نفاست کے ساتھ دوسری طرف اکثر اوقات فقر و فاقہ کا عالم در پیش رہا۔ جس کی تفصیل ہم دوسری جگہ دیں گے۔ فرمایا اکل کما یا کل العبد میرا کھانا پینا ایسا ہے جیسے (خدا کے) کسی بندے کا ہونا چاہیے۔

نشست و برخاست:

کبھی اکڑوں بیٹھتے‘ کبھی دونوں ہاتھ زانوؤں کے گرد حلقہ زن کر لیتے‘ کبھی ہاتھوں کے بجائے کپڑا (چادر وغیرہ) لپیٹ لیتے۔ بیٹھے ہوئے ٹیک لگاتے تو بالعموم الٹے ہاتھ پر۔ فکر یا سوچ کے وقت بیٹھے ہوئے زمین کو لکڑی سے کریدتے۔ سونے کے لیے سیدھی کروٹ سوتے اور داہیں ہاتھ کی ہتھیلی پر داہنا رخسار رکھ لیتے۔ کبھی چت بھی لیٹتے اور پاؤں پر پاؤں بھی رکھ لیتے۔ مگر ستر کا اہتمام رکھتے۔ پیٹ کے بل اوندھا لیٹنا سخت ناپسند تھا اور اس سے منع فرماتے تھے۔ ایسے تاریک گھر میں سونا پسند نہ تھا جس میں چراغ نہ جلایا گیا ہو۔ کھلی چھت پر جس کی پردے کی دیوار نہ ہو سونا اچھا نہ سمجھتے‘ وضو کر کے سونے کی عادت تھی اور سوتے وقت مختلف دعائیں پڑھنے کے علاوہ آخری تین سورتیں (سورہ اخلاص اور معوذتین) پڑھ کر بدن پر دم کر لیتے۔ ❷ سوتے ہوئے ہلکی آواز سے خراٹے لیتے۔ رات میں قضائے حاجت کے لیے اٹھتے تو فارغ ہونے کے بعد ہاتھ منہ ضرور دھو لیتے۔ ❸ سونے کے لیے ایک تہ بند علیحدہ تھا۔ کرتا اتار کر لٹکا دیتے۔

---

❶ ملاحظہ ہو شمائل ترمذی (ابواب متعلقہ)

❷ مختلف اذکار وادعیہ کو ہم دوسرے موقعہ پر لائیں گے۔

❸ شمائل ترمذی۔

بشری حاجات:

ضرورت کے لیے چونکہ اس دور میں گھروں میں بیت الخلاء نہ تھے اس لیے حضورؐ جنگل جاتے۔ عموماً اتنی دور تک جاتے (۲،۳ میل تک) کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ ایسی نرم زمین تلاش کرتے کہ چھینٹے نہ اڑیں۔ موقع حاجت پر پہلے بایاں قدم رکھتے پھر دایاں۔ بیٹھتے ہوئے زمین کے بالکل قریب ہو کر مقام ستر سے کپڑا کھولتے۔ کسی ٹیلے وغیرہ کی آڑ ضرور لیتے۔ ضرورت کے لیے ہمیشہ جوتا پہن کر اور سر ڈھک کر نکلتے۔ قبلہ کی طرف منہ یا پشت کرنے سے اجتناب تھا۔ رفع حاجت کے وقت انگوٹھی الگ کر دیتے۔ (واضح رہے کہ اس پر خدا اور رسولؐ کے اسماء کندہ تھے) آب دست بالالتزام بائیں ہاتھ ہی سے کرتے۔ جائے ضرورت سے الگ ہوتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں اٹھاتے پھر بایاں۔

غسل کے لیے پردہ ضروری قرار دیا تھا۔ گھر میں نہاتے تو کپڑے کا پردہ تانا جاتا۔ کبھی بارش میں نہاتے تو تہ بند باندھ لیتے۔

چھینک پست آواز سے لیتے اور ہاتھ یا کپڑا منہ پر رکھ لیتے۔

سفر:

سفر کے لیے جمعرات کو روانگی زیادہ پسند تھی۔ سواری کو تیز چلاتے۔ پڑاؤ سے صبح کے وقت کوچ کرنا معمول رہا۔ سفر (Camp life) میں جو اجتماعی کام درپیش ہوتے ان میں ضرور حصہ لیتے۔ چنانچہ ایک بار کھانا تیار کرنے کی مہم تھی۔ سارے ساتھیوں نے کام تقسیم کیے۔ آپؐ نے بھی لکڑیاں چننا اپنے ذمہ لیا۔ کہا گیا کہ آپ تکلیف نہ کریں، ہم سب اس کام کے لیے کافی ہیں۔ فرمایا کہ مجھے امتیاز پسند نہیں [1] سفر میں اپنی سواری پر باری باری کسی نہ کسی پیادہ ساتھی کو شریک کرتے سفر سے رات میں واپس آنا پسند نہ تھا۔ آتے، تو سیدھے گھر جانے کے بجائے مسجد میں جا کر نفل ادا کرتے۔ گھر میں اطلاع ہو جانے کے بعد اطمینان سے جاتے۔

جذبات:

انسانیت کا کوئی تصور ہم جذبات کو الگ رکھ کر نہیں کر سکتے۔ حضورؐ میں بھی انسانی جذبات بہترین اسلوب پر کار فرما تھے۔ آپؐ بہت ہی صاحب احساس ہستی تھے اور خوشی میں خوشی اور غم میں غم سے متاثر ہوتے۔

حضورؐ ان نام نہاد بڑے لوگوں میں سے نہ تھے۔ جو دنیا جہان کے غم میں گھلے جاتے ہیں لیکن گھر کے لیے سنگ دل اور تغافل کیش ثابت ہوتے ہیں۔ باہر کی زندگی پُر ہنگامہ ہوتی ہے۔ گھر کی پھیکی اور بد مزہ۔

---

[1] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۳

آپؐ کو ازواج کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایک ہی پیالہ میں پانی پیتے اور جہاں وہ منہ لگاتیں' وہیں منہ لگاتے۔ انصار کی بچیوں کو بلواتے تاکہ وہ ان کے ساتھ کھیلیں۔ حبشیوں کے ورزشی کرتب اس انداز سے دکھائے کہ حضرت عائشہؓ کی ٹھوڑی آپؐ کے کندھے پر تھی۔ بار بار پوچھتے" کہ "کیا تم سیر ہو گئی ہو؟" وہ کہتیں "ابھی نہیں"! دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ❶ حضرت صفیہؓ کو اونٹ پر سوار کرانے کے لیے آپؐ اپنا گھٹنا بڑھا دیتے اور اس پر آنجناب اپنا پیر رکھ کر سوار ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ سفر میں ناقہ کا پاؤں پھسلا اور حضورؐ اور جناب صفیہؓ دونوں گر پڑے۔ ابو طلحہؓ ساتھ تھے۔ دوڑے ہوئے آپؐ کے پاس آئے۔ آپؐ نے فرمایا پہلے خاتون کی طرف توجہ کرو ایک بار ساربان نے اونٹوں کو تیز چلایا تو فرمانے لگے:- "دیکھو! آبگینے ہیں آبگینے! ذرا احتیاط سے" ❷ اسی محبت کی وجہ سے ایک بار شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی جس پر عتاب آیا کہ "حلال شے کو حرام نہ کرو"۔ ❸

اپنے بچوں کے لیے بھی حضورؐ کے جذبات بڑے گہرے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کو رضاعت کے لیے ایک لوہار کے گھر میں مدینہ کے بالائی حصے میں رکھا گیا تھا۔ ان کو دیکھنے کے لیے خاصہ فاصلہ چل کر تشریف لے جاتے۔ گھر میں دھوآں بھرا ہوتا مگر وہاں بیٹھتے اور بچے کو گود میں لے کر پیار کرتے۔ ❹

حضرت فاطمہؓ آتیں تو اٹھ کر استقبال کرتے۔ خود تشریف لے جاتے۔ اپنی کہتے' ان کی سنتے' ان کے صاحبزادوں امام حسنؓ و امام حسینؓ سے بہت ہی پیار تھا۔ ان کو گود میں لیتے' ان کو کندھوں پر سوار کرتے ان کے لیے گھوڑا بنتے۔ حالت نماز میں بھی ان کو کندھوں پر بیٹھنے دیتے ایک بار اقرع بن حابس نے آپؐ کو جناب حسنؓ کا بوسہ لیتے دیکھا تو تعجب سے کہا کہ میرے تو دس بیٹے ہیں' میں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا' مگر آپؐ بوسہ لیتے ہیں۔ فرمایا "جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا"۔

انہی ابراہیمؑ صاحبزادے کی وفات ہوئی تو صدمہ سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اسی طرح ایک صاحبزادی کی وفات آپؐ کی موجودگی میں ہوئی۔ ام ایمن (کنیز) چلا چلا کے رونے لگیں۔ حضورؐ نے منع فرمایا۔ تو وہ کہنے

---

❶ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۶

❷ مسلم و بخاری۔

❸ مغربی اہل قلم نے حضورؐ کی اس صاف ستھری ازدواجی زندگی کو مخالفت کا ہدف بنایا ہے' حالانکہ خود ان کے تمدن نے جو بلند ترین اور ذمہ دار ترین شخصیتیں پیدا کی ہیں وہ نہ صرف گھر کے دائرے میں رکاکت تک پہنچ جاتی ہیں بلکہ اس دائرے سے باہر بھی انہیں نفسانیت گھناؤنی پستیوں میں گراتی رہتی ہے۔ حضورؐ کا حال یہ تھا کہ ساری دلچسپیاں دائرہ ازدواج تک محدود تھیں اور ان میں بھی رنگ پاکیزگی نمایاں تھا' آپؐ نے فطرت کے تقاضوں کو شائستگی کی حدود میں رکھ کر باحسن طریق پورا کیا' اور ازدواجی محبت کا ایک مہذب اسلوب پیدا کیا۔

❹ بروایت انسؓ۔

لگیں کہ آپؐ خود بھی تو رو رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایسا رونا منع نہیں ہے۔ یہ رونا جس رقت کی وجہ سے ہے وہ اللہ کی ایک رحمت ہے۔ اپنی صاحبزادی ام کلثومؓ کی قبر پر کھڑے ہوئے تو اس وقت بھی آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ عثمانؓ بن مظعون کی میت کے سامنے بھی آپؐ کی آنکھیں اشکبار تھیں اور آپؐ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ❶ اپنے رونے کی کیفیت کو خود بیان فرمایا۔ ''آنکھیں اشک آلود ہیں' دل غم زدہ ہے' مگر ہم اپنی زبان سے اس کے ماسوا کچھ نہیں کہتے جو ہمارے رب کو پسند ہے''۔ غم کی حالت میں اکثر زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے حسبی اللہ نعم الوکیل۔ رونے میں اونچی آواز نہ نکلتی' بلکہ ٹھنڈا سانس لیتے۔ اور ہانڈی کے ابلنے جیسی آواز سینے سے نکلتی۔

یہ دل حساس جب اپنے خدا کے حضور میں عرض و نیاز کر رہا ہوتا یا قرآن وردِ زبان ہوتا تو ایسی حالت میں بھی بسا اوقات پلکوں پر موتی چمکنے لگتے۔ ایک بار عبداللہ ابن مسعودؓ سے فرمائش کر کے قرآن سنا۔ وہ جب سورہ نساء کی اس آیت پر پہنچے۔ "فکیف اذا جئنا ---" (النساء۔ ۴۱) (اس وقت کیا حال ہو گا جب کہ ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو اٹھا کر کھڑا کریں گے اور ان لوگوں پر تمہیں گواہ بنا کے لائیں گے) تو آنکھوں سے سیل اشک رواں ہو گیا۔ ❷

یہ رقت سرچشمہ ہے ان جذبات ہمدردی و شفقت کا جو حضورؐ کو ساری انسانیت سے تھی۔ اور خصوصاً اسلامی جماعت کے افراد سے! حیرت ہے کہ اس نزاکت احساس کے ساتھ ساتھ حضورؐ نے مشکلات و مصائب کے مقابلے میں کس درجہ کے صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔

ذوق مزاح:

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ رسول خدا خندہ روئی کی صفت سے متصف تھے' بلکہ فرمایا: و تبسمک فی وجہ اخیک صدقۃ" (تیرا اپنے بھائی کے سامنے مسکراتے ہوئے آنا بھی ایک کار خیر ہے) آپؐ کی یہ شان بھی بیان ہو چکی ہے۔ کہ کان بساما ضاحکا ۔ عظیم کارنامے انجام دینے۔ والی شخصیت کے لیے یہ ایک لازمی وصف ہے کہ وہ فرائض حیات کے بوجھ کو اپنے تبسم سے گوارا بنا دے اور ساتھیوں کے دلوں میں گھر کر لے۔ آپؐ کا حال یہ تھا کہ قد کان یباسط اصحابہ بما یولج حبہ فی القلوب" ❸ یعنی آپؐ اپنے بے تکلفانہ انداز مزاح سے پیش آتے تھے کہ رفقاء کے دلوں میں آپ کی محبت رچ بس گئی تھی۔ آپ ہنسی' دل لگی کی باتیں کرتے۔ اور مجلس میں شگفتگی کی فضا پیدا کر دیتے۔ مگر توازن و اعتدال ہمیشہ ملحوظ رہتا' مزاح

---

❶ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۷

❷ ایضاً۔

❸ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۷

کا رنگ آٹے میں نمک کی طرح ہلکا رہتا اور اس میں بھی نہ تو خلاف حق کبھی کوئی بات شامل ہوتی' نہ کسی کی دلآزاری کی جاتی اور نہ ٹھٹھے لگا کر ہنسنا معمول تھا۔ غنچوں کا سا تبسم ہوتا جس میں زیادہ سے زیادہ دانتوں کے کیلے دکھائی دیتے' حلق نظر نہ آتا۔

ایک بار تعجب سے حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا' کہ "آپؐ ہم سے مذاق بھی فرما لیتے ہیں"؟ ارشاد فرمایا۔ "ہاں! مگر میں خلاف حق کوئی بات نہیں کہتا"۔ [1]

یہاں ہم حضورؐ پاک کے مزاح کے چند نمونے درج کرتے ہیں جو سنت کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔

کسی سائل نے سواری کا اونٹ مانگا۔ فرمایا ہم تمہیں اونٹنی کا ایک بچہ دیں گے' سائل نے حیرت سے کہا کہ میں اسے لے کر کیا کروں گا۔ فرمایا: ہر ایک اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔

ایک بوڑھیا نے آ کر عرض کی کہ میرے لیے دعا کیجئے کہ خدا مجھے جنت عطا فرمائے' حضورؐ نے مزاحا کہا۔ "اے ام فلاں! جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہیں جا سکتی"۔ وہ روتی ہوئی اٹھ کر جانے لگی۔ حاضرین سے فرمایا۔ اسے کہو کہ خدا تعالیٰ اسے اس بڑھاپے کے ساتھ جنت میں نہیں لے جائے گا بلکہ اس کا ارشاد ہے کہ انا انشانا هن انشاء فجعلنهن ابکارا عربا اترابا [2] مراد یہ کہ جنت میں جانے والیوں کو اللہ تعالیٰ جوانی سے سرفراز فرمائے گا۔

زاہر (یا زہیر) نامی ایک بدوی تھے۔ ان سے بے تکلفی تھی۔ آپؐ اپنے اس بدوی دوست کو شہر سے متعلق کاموں میں امداد دیتے اور وہ دیہات سے متعلق حضورؐ کے کام کر لاتا۔ نیز مخلصانہ جذبے سے ہدیے دیتا (جن کی قیمت حضورؐ باصرار ادا فرماتے) چنانچہ فرماتے کہ زاہر دیہات میں ہمارا گماشتہ ہے اور ہم شہر میں اس کے گماشتہ ہیں۔ یہی زاہر ایک دن بازار میں اپنا کچھ سودا بیچ رہے تھے۔ حضورؐ نے پیچھے سے جا کر چپکے سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور پوچھا بتاؤ میں کون ہوں۔ وہ پہلے تو کچھ نہ سمجھے۔ پھر جب معلوم ہوا تو فرط اشتیاق میں حضورؐ کے سینے سے اپنے کندھے ملتے رہے۔ پھر حضورؐ نے مزاحا کہا کہ کون اس غلام کو خریدتا ہے۔ زاہر کہنے لگے' یا رسول اللہ! مجھ جیسے ناکارہ غلام کو جو خریدے گا۔ گھاٹے میں رہے گا۔ فرمایا تم خدا کی نگاہ میں ناکارہ نہیں ہو۔

ایک موقع پر مجلس میں کھجوریں کھائی گئیں۔ آپؐ مزاح کے طور پر گٹھلیاں نکال نکال کر حضرت علیؓ کے آگے ڈالتے رہے۔ آخر میں گٹھلیوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے ان سے کہا کہ تم نے تو بہت کھجوریں کھائیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے گٹھلیوں سمیت نہیں کھائیں۔

---

[1] بیشتر واقعات شمائل ترمذی سے لیے گئے ہیں باب ماجاء فی صفة مزاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم

[2] ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے' اپنے شوہروں کی عاشق اور عمر میں ہم سن (الواقعہ ۳۵ تا ۳۷)

غزوہ خندق کے موقع پر ایک واقعہ کی وجہ سے حضورؐ خوب ہنسے اور آپؐ کے دانت (نواجذ) تک دکھائی دیئے۔ ہوا یہ کہ عامرؓ کے والد سعدؓ تیر پھینک رہے تھے' ایک دشمن فرد زد پر تھا' وہ ڈھال بڑی پھرتی سے چہرے کے سامنے رکھ لیتا سعد کے تیر کاری نہیں بیٹھ رہے تھے۔ آخری بار سعدؓ نے تیر کمان چڑھایا اور تاک میں رہے کہ موقع ملے تو چھوڑیں۔ اس نے جونہی ڈھال سے سر نکالا۔ تیر سیدھا پیشانی میں پیوست ہو گیا۔ اس بری طرح چکرا کر گرا کہ ٹانگیں اوپر کو اٹھ گئیں۔

بعد کے لوگوں کو اس رنگ مزاح کا حال سن کر تعجب ہوتا تھا' کیونکہ ایک تو مذہب کے ساتھ تقشف کا تصور ہمیشہ موجود رہا ہے اور خدا پرستوں اور متقیوں کی ہمیشہ رونی صورتیں اور خشک طبیعتیں لوگوں کے سامنے رہی ہیں' دوسرے حضورؐ کی عبادت رب' حضورؐ کی خشیت' حضورؐ کی بھاری ذمہ داریوں اور حضورؐ کے تفکرات کا خیال کرتے ہوئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس نمونہ انسانیت نے ان مسکراہٹوں کے لیے زندگی کے نقشے میں کیسے جگہ پیدا کی۔ چنانچہ ابن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ "کیا رسول اللہ کے رفقاء بھی ہنسا کرتے تھے؟" انہوں نے فرمایا "ہاں ہنستے تھے اور ان کے دلوں میں پہاڑ سے زیادہ بڑا ایمان تھا۔ (یعنی ہنسی دل لگی ایمان و تقویٰ کی نقیض نہیں ہے) تیروں کا نشانہ (بطور مشق) کرتے ہوئے دوڑتے تھے اور باہم دگر ہنستے تھے"۔ (روایت قتادہؓ)

یہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ نماز صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں جاہلی دور کی باتیں بھی چھڑتیں اور صحابہؓ کے ساتھ رسول اکرم ﷺ بھی خوب ہنستے۔ بچوں سے آپ کی دل لگی کرنے کے واقعات بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں گھر میں ازواج کے ساتھ ہنسنے ہنسانے کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔

تفریحات:

متوازن زندگی کا ایک لازمی جزء تفریحات (جائز حدود میں) بھی ہیں۔ مزاح کی طرح یہ جزء ساقط ہو جائے تو زندگی بوجھ بن جاتی ہے اور جس نظام حیات میں تفریحات کی گنجائش نہ رکھی گئی ہو اسے کوئی معاشرہ دیر تک اٹھا نہیں سکتا۔ حضورؐ کو بھی بعض تفریحات پسند تھیں اور جائز حدوں میں ان کے لیے راستے نکالے۔

شخصی طور پر آپ کو باغوں کی سیر کا شوق تھا۔ کبھی تنہا اور کبھی رفقاء کے ساتھ باغوں میں چلے جاتے اور وہیں مجلس آرائی بھی ہو جاتی۔

تیرنے کا مشغلہ بھی تھا۔ اور احباب کے ساتھ کبھی کبھار تالاب میں تیرا کرتے دو دو ساتھیوں کے جوڑ بنائے جاتے اور پھر ہر جوڑ کے ساتھی دور سے تیر کر ایک دوسرے کی طرف آتے۔ ایک موقع پر اپنا ساتھی حضورؐ نے جناب ابوبکرؓ صدیق کو پسند کیا۔

وقفے کے بعد بارش پڑتی تو تہ بند باندھ کر پھوار میں نہایا کرتے۔ کبھی تفریحاً کسی کنوئیں میں پاؤں لٹکا کے

اس کے دہانے پر بیٹھتے۔ ❶

دوڑوں اور تیر اندازی کے مقابلے کراتے اور اکھاڑے میں خود پوری دلچسپی سے شریک رہتے ایسے موقعوں پر ہنسی بھی ہوتی۔

مسرت کے موقعوں پر پسند تھا کہ دف بجائی جائے یا بچیاں گیت گائیں۔ چنانچہ عید کی تقریب پر حضرت عائشہؓ کے پاس دو لڑکیاں گیت گا رہی تھیں۔ حضورؐ قریب ہی لیٹے تھے۔ ابوبکر صدیقؓ آئے تو غصے میں ڈانٹا کہ خدا کے رسولؐ کے گھر میں یہ کیا شیطانی ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں گانے دو۔ ❷

شادی بیاہ کے لیے بھی فرمایا کہ ایسے موقعوں پر دف بجائی جائے (روایت عائشہ و محمد بن حاطب الجمحیؒ) حضرت عائشہؓ ہی بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس ایک انصاری لڑکی رہتی تھی۔ میں نے اس کا نکاح کر دیا تو حضورؐ نے فرمایا۔ "عائشہ! تم گانے کا انتظام نہیں کراتیں حالانکہ قبیلہ انصار گانے کو پسند کرتا ہے ایک دوسری روایت میں (غالباً اسی موقعے سے متعلق) یہ آتا ہے۔ "کہ تم لوگ کسی گانے والے کو لڑکی کے ساتھ بھیجتے جو کہتی۔ "اتیناکم اتیناکم فحیانا و حیاکم" (ہم تمہارے پاس آئے، ہم تمہارے پاس آئے۔ پس تم بھی سلامت رہو، ہم بھی سلامت رہیں) ایسی ہی ایک بزم عروسی میں بچیاں گا رہی تھیں حضرت عامر بن سعدؓ نے بعض حاضرین سے بطور اعتراض کہا کہ "اے صحابیان رسولؐ! اے شرکائے بدر! تمہارے سامنے یہ کچھ ہو رہا ہے؟" جواب ملا۔ "جی چاہے تو بیٹھ کر سنو ورنہ چلے جاؤ۔ ہمیں رسول اللہؐ نے اس کی اجازت دی ہے" ❸

تفریحات میں ایک دروازہ گناہ اور تعیش کی طرف کھلتا ہے۔ اس کا حضورؐ نے سد باب کیا۔ یہاں گانے کا ذکر ہے۔ عرب میں رباب بکثرت رائج تھا مگر اس کا نام نہیں لیا، صرف دف کا نام لیا۔ گانے کا مضمون دیکھئے تو کوئی شوخی نہیں کوئی جنسیت نہیں، گناہ کی بات نہیں، صرف محبت کے سادہ کلمے ہیں۔ پھر یہ نہیں فرمایا کہ کسی قینہ (گانے والی لونڈی) یا گویے کو یا کوئی طائفہ بلا لیتے۔ نہیں صرف چھوٹی بچیوں میں سے کہا کہ کسی مناسب لڑکی کو بلوا لیتے۔ وہ لوگ زیادتی کرتے ہیں جو استثنیٰ کو پھیلا کر کلی اصول بنا لیتے ہیں اور انتہاپسندانہ باتیں کرتے ہیں۔ ایسے اجتہادات کی گنجائش حضورؐ نے نہیں چھوڑی۔

ازاں جملہ حضورؐ نے شعر سے بھی دلچسپی لی ہے۔ عرب میں جو شعر پرستی رائج تھی، اس سے تو آپؐ کو بُعد تھا۔ آپؐ کو نغمہ الہام کی جاذبیتیں اتنا موقع ہی نہ دیتی تھیں کہ شعر و سخن کی طرف زیادہ توجہ ہو۔ مگر دوسری طرف ذوق شعر سے قدرت نے محروم نہیں رکھا۔ اچھے شعر (بلحاظ مقصد) کی قدر فرماتے تھے بلکہ

---

❶ شمائل ترمذی۔ مختلف ابواب۔

❷ روایت عائشہ (مسلم۔ باب ما یقول الجواری فی العید)

❸ ملاحظہ ہو: مشکوٰۃ باب اعلان نکاح۔

کہنا چاہیے کہ حضورؐ نے ایک نیا ذوق معاشرے کو دیا۔ اور ایک نیا معیار نقد مقرر فرمایا۔ جابر بن سمرہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ کی خدمت میں ایک سو سے زیادہ مجالس میں شریک ہوا ہوں جن میں جاہلیت کے قصے بھی ہوتے تھے اور صحابہ شعر بھی سنایا کرتے' شاعران عرب کے کلام میں سے ایک بار لبید کا یہ مصرعہ پسندیدگی سے پڑھا ؂

الا کل شیئی ما خلا اللہ باطل"۔

(آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے سوا ہر چیز فانی ہے) دوسرا مصرعہ ہے:۔

و کل نعیم لا محالۃ زائل"۔

(دنیا کی ساری نعمتیں زائل ہو جانے والی ہیں)

حضرت شریدؓ سے ایک سفر میں یکے بعد دیگرے فرمائش کر کر کے امیہ ابن ابی صلت کے سو شعر سنے۔ آخر میں فرمایا کہ یہ شخص اسلام لانے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بعض اوقات خود بھی (خصوصاً میدان جنگ میں) بلا ارادہ شعر کے انداز پر کلمات فرمائے ہیں۔ حضرت حسانؓ اور کعب بن مالکؓ سے دشمنان اسلام کے ہجویہ اشعار کے جواب میں شعر کہلاتے اور کبھی کبھی حضرت حسانؓ کو اپنے منبر پر بٹھا کر ان سے پڑھواتے اور کہتے کہ "یہ اشعار دشمنوں کے حق میں تیر سے زیادہ سخت ہیں"۔ یہ بھی فرمایا کہ "مومن تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی"۔

چند متفرق ذوقیات:

آخر میں ہم بعض ایسے خاص ذوقیات و اطوار کا ذکر کرتے ہیں۔ جنہیں کسی دوسرے عنوان کے تحت نہیں لیا جا سکا۔

کسی سے چیز لیتے تو سیدھے ہاتھ سے لیتے اور کوئی چیز دیتے' تو سیدھے ہاتھ سے دیتے۔

--- خطوط لکھواتے تو سب سے پہلے بسم اللہ لکھواتے۔ پھر مرسل کا نام اور اس کے نیچے مرسل الیہ کا نام ہوتا۔ اس کے بعد اصل مضمون لکھا جاتا۔ خاتمے پر مہر لگواتے۔

--- حضورؐ اوہام پسندی سے پاک تھے اور شگون نہ لیتے تھے۔ البتہ اشخاص اور مقامات کے اچھے نام پسند آتے۔ برے نام پسند نہ کرتے۔ سفر میں اقامت کے لیے ایسا ہی مقام انتخاب کرتے جس کے نام میں خوشی یا برکت یا کامیابی کا مفہوم ہوتا۔ اسی طرح جس شخص کے نام میں لڑائی جھگڑے یا نقصان کا معنی شامل ہوتا اسے کام نہ سونپتے۔ ایسے آدمیوں کو نامزد کرتے جن کے ناموں میں خوشی یا کامیابی کا مفہوم پایا جائے۔ بہت سے ناموں کو تبدیل بھی فرمایا۔

---- سواریوں میں سے گھوڑا بہت پسند تھا۔ فرماتے گھوڑے کے ایال میں قیامت تک کے لیے خیر و برکت ہے۔ گھوڑے کی آنکھ' منہ' ناک کو اہتمام سے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے۔

---- شور ہنگامہ اور ہڑبونگ اچھی نہ لگتی۔ ہر کام میں سکون و وقار اور نظم و ترتیب چاہتے' نماز تک کے بارے میں کہا کہ بھاگم بھاگ نہ آؤ۔ "علیکم بالسکینۃ" (تمہارے لیے سکون و وقار لازم ہے) یوم عرفہ کو ہجوم تھا بڑا شور و ہنگامہ تھا۔ لوگوں کو اپنے تازیانہ سے اشارہ کرتے ہوئے نظم و سکون کا حکم دیا اور فرمایا۔ "فان البر لیس بالایضاع"۔ (جلدی مچانے کا نام نیکی نہیں ہے) [1]

اخلاق:

حضورؐ پاک کے اخلاق کا بیان یہاں کسی ضمنی عنوان کے تحت کیا نہیں جا سکتا۔ وہاں تو پوری زندگی حسن خلق ہی کی تفسیر ہے۔ جس کے متعلق حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا۔ "کان خلقہ القرآن" انس بن مالک کا یہ قول بہت ہی جامع ہے کہ "کان احسن الناس و کان اجود الناس و کان اشجع الناس." [2] احسن الناس ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ کسی کو عمر بھر تکلیف نہیں پہنچائی۔ (ماسوا ان باتوں کے جو حکم الٰہی کے تحت تھیں) اور دوسروں کی زیادتیوں پر کبھی انتقام نہیں لیا۔ ہر کسی سے عفو فرمایا۔ یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے بے دادگروں کو معاف کیا اور منافقین و اشرار سے درگزر کیا۔ اجود الناس ہونے کا عالم یہ تھا کہ جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ سے جو کچھ بھی کسی نے مانگا آپؐ نے کبھی نہ نہیں کی۔ [3] موجود ہوا تو دے دیا کبھی قرض لے کر دیا۔ نہیں موجود ہوا تو دوسرے وقت آنے کو کہا' یا سکوت اختیار کیا' اشجع الناس ہونے کے لیے فی الجملہ یہ امر کافی ہے کہ نظریہ حق کو لے کر تن تنہا اٹھے اور زمانے بھر کی مخالفتوں اور مظالم کے مقابلے میں جمے کھڑے رہے۔ کبھی کسی خطرناک ترین موقع پر بھی خوف یا کمزوری کا اظہار نہ کیا۔ غار ثور ہو یا احد و حنین کے معرکے ہر موقع پر یقین محکم کا مظاہرہ فرمایا۔

---

1. بخاری و مسلم
2. مسلم باب فی شمائل النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم
3. باب ماسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

باب: ۳

محسنِ انسانیت ﷺ

مخالفتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے

(ا)

مکی دور

مدّوجزر

بس وہ ایک کلمہ ہے اسے اگر قبول
کر کے میرے ساتھ آؤ تو تم اس کے
بل پر سارے عرب کو ہاتھ میں لو گے
اور اس کے اثر سے عجم تمہارے
زیرِ نگیں ہوگا۔ محسنِ انسانیتؐ

آئیے! ذرا صورتِ واقعہ پر غور کیجئے! ــــــ اُس شاخِ گل کی اٹھان دیکھیے جس کی تواضع کانٹوں سے کی گئی!

وہ نوجوان:

عرب کے ایک ممتاز، مہذب اور اعلیٰ روایات رکھنے والے خاندان میں، سلیم الفطرت والدین کے قران السعدین سے ایک انوکھا سا بچہ یتیمی کے سائے میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک غریب مگر شریف ذات کی دایہ کا دودھ پی کر دیہات کے صحت بخش ماحول کے اندر فطرت کی گود میں پلتا ہے۔ وہ خاص انتظام سے صحرا میں تگ و دو کرتے کرتے زندگی کی جولان گاہ میں مشقتوں کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کرتا ہے اور بکریاں چرا کر گلہ بانئ اقوام کی تربیت پاتا ہے۔ بچپن کی پوری مسافت طے کرنے سے پہلے یہ انوکھا بچہ ماں کے سایہ شفقت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ دادا کی ذات کسی حد تک والدین کے اس خلاء کو پُر کرنے والی تھی، لیکن یہ سہارا بھی چھین لیا جاتا ہے۔ بالآخر چچا کفیل بنتے ہیں۔ یہ گویا مادی سہاروں سے بے نیاز ہو کر ایک آقائے حقیقی کے سارے گراں بہا فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی تیاری کرائی جا رہی ہے۔

جوانی کے دائرے میں قدم رکھنے تک یہ انوکھا بچہ عام بچوں کی طرح کھلنڈرا اور شریر بن کر سامنے نہیں آتا، بلکہ بوڑھوں کی سی سنجیدگی سے آراستہ نظر آتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو انتہائی فاسد ماحول میں پلنے کے باوجود اپنی جوانی کو بے داغ رکھتا ہے۔ عشق اور نظربازی اور بدکاری جہاں نوجوانوں کے لیے سرمایہ افتخار بنے ہوئے ہوں، وہاں وہ اپنے دامانِ نظر تک کو ایک آن بھی میلا نہیں ہونے دیتا۔ جہاں گلی گلی شراب کشید کرنے کی بھٹیاں لگی ہوں، گھر گھر شراب خانے کھلے ہوں، جہاں مجلس مجلس دخترِ رز کے قدموں میں ایمان و اخلاق نچھاور کیے جاتے ہوں، اور پھر جہاں اپنی بلانوشیوں کے چرچے فخریہ قصیدوں اور شعروں میں کیے جاتے ہوں، وہاں یہ جداگانہ فطرت کا نوجوان کبھی قسم کھانے کو بھی شراب کا ایک قطرہ تک اپنی زبان پر نہیں رکھتا۔ جہاں قمار قومی مشغلہ بنا چلا آ رہا تھا وہاں یہ ایک مجسمۂ پاکیزگی تھا کہ جس نے کبھی مہروں کو ہاتھ سے نہ چھوا۔ جہاں داستان گوئی اور موسیقی کلچر کا لازمہ بنے ہوئے تھے وہاں کسی اور ہی عالم کا یہ نوجوان، لہو و لعب سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اور دو مرتبہ ایسے مواقع پیدا ہوئے بھی کہ یہ نوجوان ایسی مجالس تفریح میں جا پہنچا، لیکن جاتے ہی ایسی نیند طاری ہوئی کہ سمع و بصر کا دامن پاک رہا۔ جہاں بتوں کے سامنے سجدہ پاشی عین دین و مذہب قرار پا چکی تھی وہاں خانوادہ ابراہیمی کے اس پاکیزہ مزاج نوجوان نے نہ غیر اللہ کے سامنے کبھی اپنا سر جھکایا، نہ اعتقاداً کوئی مشرکانہ تصور اپنے اندر جذب کیا، بلکہ ایک مرتبہ بتوں کے چڑھاوے کا جانور پکا کر لایا گیا تو اس نے وہ کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ جہاں قریش نے

زمانہ حج میں اپنے آپ کو عرفات جانے سے مستثنیٰ کر لیا تھا وہاں اس ممتاز مرتبے کے قریشی نے کبھی اس من گھڑت استثنیٰ سے فائدہ نہ اٹھایا۔ جہاں اولاد ابراہیمؑ نے مسلک ابراہیمیؑ کو بگاڑ کر دوسری خرابیوں کے ساتھ کعبہ کا طواف حالت عریانی میں کرنے کی ایک گندی بدعت پیدا کر لی تھی' وہاں اس حیادار نوجوان نے کبھی اس بدعت کو اختیار نہ کیا۔ جہاں جنگ ایک کھیل تھی اور انسانی خون بہانا ایک تماشا تھا' وہاں احترام انسانیت کا علمبردار یہ نوجوان ایسا تھا کہ جس کے دامن پر خون کی ایک چھینٹ نہ پڑی تھی...... نو عمری میں اس نوجوان کو حرب فجار نامی جنگ عظیم میں شرکت کا موقع پیش آیا۔ اور اگرچہ اس نے قریش کے برسرِ حق ہونے کی بنا پر اس میں حصہ لیا' لیکن پھر بھی کسی انسانی جان پر خود ہاتھ نہیں اٹھایا۔

پھر اس پاکباز و عفیف نوجوان کی دلچسپیاں دیکھئے کہ عین بہک جانے والی عمر میں وہ اپنی خدمات اپنے ہم خیال نوجوانوں کی ایک اصلاح پسند انجمن کے حوالے کرتا ہے جو حلف الفضول کے نام سے غریبوں اور مظلوموں کی مدد اور ظالموں کی چیرہ دستیوں کے استیصال کے لیے قائم ہوئی تھی۔ اس کے شرکاء نے اس مقصد کے لیے حلفیہ عہد باندھا۔

"آپؐ دورِ نبوت میں اس کی یاد تازہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے کہ:

"اس معاہدہ کے مقابلے میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں اس سے نہ پھرتا۔ اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لیے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں"۔

پھر اس نوجوان کی صفات اور صلاحیتوں کا اندازہ اس سے کیجئے کہ تعمیر کعبہ کے موقع پر حجر اسود نصب کرنے کے معاملے میں قریش میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور تلواریں میانوں سے باہر نکل آتی ہیں' لیکن تقدیر کے اشارے سے اس قضیے کو چکانے کا شرف اسی نوجوان کے حصے میں آتا ہے۔ انتہائی جذباتی تناؤ کی اس فضا میں یہ جج اور صلح کا علمبردار ایک چادر بچھاتا ہے اور اس پر پتھر کو اٹھا کر رکھ دیتا ہے اور پھر دعوت دیتا ہے کہ تمام قبیلوں کے لوگ مل کر اس چادر کو اٹھاؤ۔ چادر پتھر سمیت متحرک ہو جاتی ہے اور جب موقع پر جا پہنچتی ہے تو وہ نوجوان اس پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیتا ہے۔ جھگڑے کا سارا غبار چھٹ جاتا ہے اور چہرے خوشی اور اطمینان سے چمک اٹھتے ہیں۔

یہ نوجوان میدان معاش میں قدم رکھتا ہے تو تجارت جیسا پاکیزہ اور معزز مشغلہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ کوئی بات تو اس نوجوان میں تھی کہ اچھے اچھے اہل سرمایہ نے یہ پسند کیا کہ یہ نوجوان ان کا سرمایہ اپنے ہاتھ میں لے اور کاروبار کرے۔ پھر سائب' قیس بن سائب مخزومی' حضرت خدیجہؓ اور جن دوسرے لوگوں کو اس نوجوان کے حسن معاملت کا عملی تجربہ ہوا۔ ان سب نے اسے "تاجر امین" کا لقب دیا۔ عبداللہ بن ابی الحمساء کی گواہی آج بھی محفوظ ہے کہ بعثت سے قبل خرید و فروخت کے معاملہ میں اس تاجر امین سے طے ہوا کہ آپ ٹھہریں میں ابھی پھر آؤں گا۔ لیکن بات آئی گئی ہو گئی۔ تیسرے روز اتفاقاً عبداللہ کا گزر اسی مقام سے ہوا تو دیکھا کہ وہ تاجر امین وعدہ کی ڈوری سے بندھا اسی جگہ کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ

"تم نے مجھے زحمت دی۔ میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں"۔ (ابو داؤد)

پھر دیکھیے کہ یہ نوجوان رفیقہ حیات کا جب انتخاب کرتا ہے تو مکہ کی نو عمر' شوخ و شنگ لڑکیوں کو ایک ذرا سا خراج نگاہ تک دیئے بغیر ایک ایسی خاتون سے رشتہ مناکحت استوار کرتا ہے جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خاندان اور ذاتی سیرت و کردار کے لحاظ سے نہایت اشرف خاتون ہے۔ اس کا یہ ذوق انتخاب اس کے ذہن' اس کی روح' اس کے مزاج اور اس کی سیرت کی گہرائیوں کو پوری طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ پیغام خود وہی خاتون حضرت خدیجہؓ بھیجتی ہیں۔ جو اس یکتائے روزگار نوجوان کے کردار سے متاثر ہوتی ہیں اور یہ نوجوان اس پیغام کو شرح صدر کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

پھر کسی شخص کے ذہن و سیرت کو اگر اس کے حلقہ احباب کا جائزہ لینے سے جانچا جا سکتا ہے تو آیئے دیکھیے کہ اس عربی نوجوان کے دوست کیسے لوگ تھے۔ غالباً سب سے گہری دوستی اور سب سے زیادہ بے تکلفانہ رابطہ حضرت ابوبکرؓ سے تھا۔ ایک ہم عمری اوپر سے ہم مذاقی! اس نوجوان کے دوستوں میں ایک شخصیت حکیم بن حزام کی تھی' جو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے اور حرم کے منصب رفادہ پر فائز تھے۔ (1) پھر حلقہ احباب کے ایک رکن ضماد بن ثعلبہ ازدی تھے جو طبابت و جراحی کا کام کرتے تھے۔ اس نوجوان کے حلقہ احباب میں کیا کوئی ایک بھی دون فطرت' پست ذوق' اور کمینہ مزاج آدمی دکھائی دیتا ہے؟ مکہ کے اشرار میں سے کسی کا نام اس فہرست میں ملتا ہے؟ ظالموں اور فاسقوں میں سے کوئی اس دائرے میں سامنے آتا ہے؟

پھر دیکھیے کہ یہ یکتائے زمانہ نوجوان گھر بار کی دیکھ بھال' تجارت اور دنیوی معاملات کی گوناگوں مصروفیات سے فارغ ہو کر جب کبھی کوئی فرصت کا وقت نکالتا ہے' تو اسے تفریحات و تعیشات میں صرف نہیں کرتا' اسے کوچہ گردی میں اور مجلس آرائیوں اور گپوں میں نہیں کھپاتا' اسے سو سو کر اور غفلت میں بے کار پڑے رہ رہ کر بھی نہیں گزارتا' بلکہ سارے ہنگاموں سے کنارہ کر کے اور سارے مشغلوں کو تج کر حرا کی خلوتوں میں خدائے واحد کی عبادت اور اس کا ذکر اپنی فطرت مطہرہ کی راہنمائی کے مطابق کرتا ہے۔ کائنات کی گہری حقیقتوں کو اخذ کرنے کے لیے اور انسانی زندگی کے غیبی رازوں کو پالینے کے لیے عالم انفس و آفاق میں غور و فکر کرتا ہے اور اپنی قوم اور اپنے ابناء نوع کو اخلاقی پستیوں سے نکال کر مرتبہ ملکوتی پر لانے کی تدبیریں سوچتا ہے۔ جس نوجوان کی جوانی کی فرصتیں اس تحنث میں صرف ہو رہی ہوں کیا اس کی فطرت کے بارے میں انسانی بصیرت کوئی رائے قائم نہیں کر سکتی۔

---

(1) ہجرت کی آٹھویں برس تک یہ ایمان نہیں لائے۔ لیکن پھر بھی آنحضرت ﷺ سے گہری محبت رکھتے تھے اور اسی محبت کے تحت ایک مرتبہ پچاس اشرفیوں کا ایک قیمتی حلہ خرید کر مدینہ میں آکر پیش کیا۔ مگر آنحضورؐ نے باصرار قیمت ادا کر دی۔

ہونے والا آخری نبیؐ اس نقشہ زندگی کے ساتھ قریش کی آنکھوں کے سامنے اور ان کے اپنے ہی ملکی معاشرے کی گود میں پلتا ہے' جوان ہوتا ہے اور پختگی کے مرتبے کو پہنچتا ہے۔ کیا یہ نقشہ زندگی بول بول کر نہیں بتا رہا تھا کہ یہ ایک نہایت ہی غیر معمولی عظمت رکھنے والا انسان ہے؟ کیا اس اٹھان سے اٹھنے والی شخصیت کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے کی کچھ بھی گنجائش کسی پہلو سے ملتی ہے کہ نعوذ باللہ یہ کسی جھوٹے اور فریبی آدمی کا نقشہ ہو گا؟ یہ کوئی مرد جاہ طلب ہو گا؟ یہ کوئی بندہ مفاد و اغراض ہو گا؟ یہ خدا کے نام کو متاع کاروبار بنا کر اپنی دکان چمکانے والا کوئی سوداگر ہو گا؟ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں! خود قریش نے اسے صادق و امین' دانا و حکیم اور پاک نفس و بلند کردار تسلیم کیا۔ اور بار بار تسلیم کیا' اس کے دشمنوں نے اس کی ذہنی و اخلاقی عظمت کی گواہی دی اور سخت ترین کشمکش کرتے ہوئے دی! داعیٔ برحق کے نقشہ زندگی کو خود قرآن نے دلیل بنا کے پیش کیا ولقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ ؕ افلا تعقلون ❶

لیکن اپنی قوم کا یہ چمکتا ہوا ہیرا جب نبوت کے منصب سے کلمہ حق پکارتا ہے تو زمانہ کی آنکھوں کا رنگ معاً بدل جاتا ہے اور اس کی صداقت و دیانت اور اس کی شرافت و نجابت کی قدر و قیمت بازار وقت میں یکایک گرا دی جاتی ہے۔ کل تک جو شخص قوم کا مایہ ناز فرزند تھا' آج وہ اس کا دشمن اور مخالف اور اس کے لیے باعث ننگ گردانا جاتا ہے۔ کل تک جس کا احترام بچہ بچہ کرتا تھا' آج وہ ایک ایک قدردان کی نگاہوں میں مبغوض ٹھہرتا ہے۔ وہ شخص جس نے چالیس سال تک اپنے آپ کو ساری کسوٹیوں پر کھرا ثابت کر کے دکھایا تھا' توحید نیکی اور سچائی کا پیغام سناتے ہی صیرفیان قریش کی نگاہوں میں کھوٹا سکہ بن جاتا ہے۔ کھوٹا وہ نہ تھا بلکہ صرافوں کی اپنی نگاہوں میں ٹیڑھ تھی اور ان کے اپنے معیار غلط تھے!

کیا قریش کی آنکھیں اتنی اندھی تھیں کہ وہ ماحول کی تاریکیوں میں جگمگاتے ہوئے ایک چاند کی شان نہیں دیکھ سکتی تھیں؟ کیا بالشتیوں کی محفل میں وہ اونچے اخلاقی قدو قامت رکھنے والے ایک زعیم کو نہیں پہچان سکتی تھیں؟ کیا کوڑے کے انبار میں پڑا ہوا موتیوں کا ایک ہار ان کو الگ محسوس نہیں ہوتا ہو گا؟ کیا خار و خس کے ہجوم میں ایک گلدستہ شرافت و عظمت ان سے اپنی قدر و قیمت نہیں منوا سکا ہو گا؟ نہیں نہیں قریش خوب پہچانتے تھے کہ محمدؐ کیا ہے؟ مگر انہوں نے جان بوجھ کر آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی! مفاد اور تعصبات نے ان کو مجبور کیا کہ وہ آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے بن جائیں۔ ولھم اعین لا یبصرون بھا ❷ اور جب کوئی آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا بن جاتا ہے تو اس سے بڑی بڑی مصیبتیں اور تباہیاں رونما ہوتی ہیں۔

---

❶ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں' کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ یونس۔ ۱۶

❷ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ (الاعراف: ۱۷۹)

قریش کے وجوہ مخالفت:

آج اگر کسی طرح ہم مشرکین مکہ سے بات کرسکتے تو ان سے پوچھتے کہ تمہارے خاندان کے اس چشم و چراغ نے جو دعوت دی تھی وہ فی نفسہ کیا برائی کی دعوت تھی؟ کیا اس نے تم کو چوری اور ڈاکے کے لیے بلایا تھا؟ کیا اس نے تمہیں ظلم اور قتل کے لیے پکارا تھا؟ کیا اس نے یتیموں اور بیواؤں اور کمزوروں پر جفائیں ڈھانے کی کوئی اسکیم پیش کی تھی؟ کیا اس نے تم کو باہم دگر لڑانے اور قبیلے قبیلے میں فساد ڈلوانے کی تحریک چلائی تھی؟ کیا اس نے مال سمیٹنے اور جائداد بنانے کے لیے ایک جماعت کھڑی کی تھی؟ آخر تم نے اس کے پیغام میں کیا کجی دیکھی؟ اس کے پروگرام میں کون سا فساد محسوس کیا؟ کیوں تم پرے باندھ کر اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے؟

قریش کو جس چیز نے جاہلیت کے فاسد نظام کے تحفظ اور تبدیلی کی رو کی مزاحمت پر اندھے جنون کے ساتھ اٹھا کھڑا کیا' وہ یہ ہرگز نہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فکر و کردار میں کوئی رخنہ تھا' یا آپؐ کی دعوت میں کوئی خطرناک مفسدہ تھا یا آپؐ کی تحریک جاہلی تمدن کو پستی کی طرف لے جانے کا موجب بنتی دکھائی دیتی تھی' بلکہ وہ چیز صرف مفاد پرستی تھی! قریش سالہا سال کے جمے ہوئے عربی معاشرے کے سانچے میں اپنے لئے ایک اونچا مقام قیادت حاصل کرچکے تھے' تمام سیاسی اور مذہبی مناصب ان کے ہاتھ میں تھے' اقتصادی اور کاروباری لحاظ سے ان کی سیادت کا سکہ رواں تھا۔ پوری قوم کی چودھراہٹ انہیں حاصل تھی- ان کی یہ چودھراہٹ اسی مذہبی و تمدنی و معاشرتی سانچے میں چل سکتی تھی جو جاہلی دور میں استوار تھا۔ اگر وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر مجبور تھے کہ اپنی چودھراہٹ کا تحفظ کریں تو پھر وہ اس پر بھی مجبور تھے کہ جاہلی نظام کو بھی ہر حملے اور ہر تنزل سے بچائیں۔

قریش جہاں سیاسی و معاشرتی لحاظ سے چودھری تھے وہاں وہ عرب کے مشرکانہ مذہب کے پروہت' مذہبی استھانوں کے مہنت اور مجاور اور تمام مذہبی امور کے ٹھیکہ دار بھی تھے۔ یہ مذہبی ٹھیکہ داری' سیاسی و معاشرتی چودھراہٹ کی بھی پشتیباں تھی اور بجائے خود ایک بڑا کاروبار بھی تھی۔ اس کے ذریعے سارے عرب سے نذریں اور نیازیں اور چڑھاوے کھنچے چلے آتے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کی دامن بوسیاں ہوتی تھیں۔ اس کی وجہ سے ان کے قدموں کو چھوا جاتا تھا۔ مذہب جب ایک طبقے کا کاروبار بن جاتا ہے تو اس کی اصل روح اور مقصدیت کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے اور گوناگوں رسمیات کا ایک نمائشی طلسم قائم ہو جاتا ہے۔ اصولی تقاضے فراموش ہو جاتے ہیں اور مذہبی کاروباریوں کی اپنی بنائی ہوئی ایک شریعت آہستہ آہستہ نشوونما پا جاتی ہے۔ معقولیت ختم ہو جاتی ہے اندھی عقیدتیں اور فضول اوہام ہر طرف چھا جاتے ہیں۔ استدلال غائب ہو جاتا ہے اور جذباتی ہیجانات عقل کا گلا گھونٹ لیتے ہیں۔ مذہب کا عوامی و جمہوری مزاج کافور ہو جاتا ہے اور ٹھیکہ دار طبقے کا تحکم معاشرہ کے سینہ پر سوار ہو جاتا ہے۔ حقیقی علم مٹ جاتا

ہے۔ ہوائی باتیں مقبول عام ہو جاتی ہیں۔ اعتقاد و احکام کی سادگی ہوا ہو جاتی ہے۔ بات بات میں بڑے اینچ پینچ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اختلاف رائے کا حق قطعی طور پر سلب کر لیا جاتا ہے اور ایک طبقے کی اتھارٹی بے روک ٹوک نافذ ہوتی ہے۔ حق' نیکی' شرافت اور تقویٰ کا نام و نشان مٹ جاتا ہے اور مذہبیت ایک فریب کارانہ بہروپ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جب کبھی مذاہب میں بگاڑ پیدا ہوا ہے تو ہمیشہ وہ اسی نہج پر ہوا ہے۔ جاہلی عرب میں یہ بگاڑ بالکل اپنی انتہائی شکل پر پہنچا ہوا تھا۔ اسی بگاڑ پر قریش کی مہنت گری اور مجاوری کی ساری گدیاں قائم تھیں۔ یہ زر خیز گدیاں اپنی بقا کے لیے اس بات کی محتاج تھیں کہ فاسد مذہبیت کے ڈھانچے کو جوں کا توں قائم رکھا جائے۔ اور اس کے خلاف نہ کوئی صدائے احتجاج و اختلاف اٹھنے دی جائے اور نہ کسی دعوت تغیر و اصلاح کو برپا ہونے دیا جائے۔ پس قریش اگر دعوت محمدیؐ جیسی خطرناک تحریک کے خلاف تلملا کر نہ اٹھ کھڑے ہوتے تو اور کیا کرتے!

اور پھر' حال یہ تھا کہ قریش کا کلچر نہایت فاسقانہ کلچر تھا۔ شراب اور بدکاری' جوا اور سود خواری' عورتوں کی تحقیر و تذلیل اور بیٹیوں کا زندہ دفن کرنا' آزادوں کو غلام بنانا اور کمزوروں پر ظلم ڈھانا' یہ سب اس کلچر کے لوازم تھے۔ یہ کلچر قرنوں کی راسخ شدہ عادات بد اور فخر آمیز قومی روایات بن جانے والی رسوم قبیحہ سے ترکیب پذیر ہوا تھا۔ قریش کے لیے آسان نہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے اس آہنی تہذیبی قفس کو توڑ کر ایک نئی فضا میں پرواز کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ انہیں فوراً محسوس ہو گیا کہ دعوت محمدؐ ان کی عادات ان کی خواہشات' ان کے فنون لطیفہ اور ان کے محبوب کلچر کی دشمن ہے چنانچہ وہ جذباتی ہیجان کے ساتھ اس کی دشمنی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

درحقیقت یہی وجوہ و اسباب ہمیشہ دعوت حق کے خلاف کسی بگڑے ہوئے سماج کے ارباب اقتدار اور مذہبی ٹھیکہ داروں اور خواہش پرستوں کو متحدہ محاذ بنا کر اٹھ کھڑے ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

تاریک ماحول میں چند شرارے:

بعثت نبویؐ سے قبل ذہین لوگوں میں اس مذہب' اس معاشرے اور اس ماحول کے بارے میں نوامیس الٰہی کے تحت اضطراب پیدا ہو چکا تھا اور فطرت انسانی اس کے خلاف جذبہ احتجاج کے ساتھ انگڑائی لے رہی تھی۔ ہم ابھی اوپر جن حساس افراد کا ذکر کر چکے ہیں ان کی روحوں کے ساز سے تبدیلی کا دھیما دھیما نغمہ بلند ہونے لگا تھا۔

قریش اپنے ایک بت کے گرد جمع ہو کر تقریب عید منا رہے تھے' اس خداوند سنگیں کی تعریف و تعظیم ہو رہی تھی' اس پر چڑھاوے چڑھائے جا رہے تھے' اس کا طواف ہو رہا تھا اور عین اس عالم میں چار آدمی' یعنی ورقہ بن نوفل' عبیداللہ بن جحش' عثمان بن الحویرث اور زید بن عمرو بن نفیل اس ہنگامہ لایعنی سے بیزار الگ تھلگ بیٹھے ایک خفیہ میٹنگ کر رہے تھے۔ باہم دگر راز داری کا پیمان باندھنے کے بعد گفتگو

ہوئی۔ ان لوگوں کے خیالات یہ تھے کہ "ہماری قوم ایک بے بنیاد مسلک پر چل رہی ہے' اپنے دادا ابراہیمؑ کے دین کو انہوں نے گنوا دیا ہے' یہ جس مجسمہ سنگین کا طواف کیا جا رہا ہے' یہ نہ دیکھتا ہے' نہ سنتا ہے' نہ نقصان پہنچا سکتا ہے' نہ نفع دے سکتا ہے۔ ساتھیو! اپنے دلوں کو ٹٹولو تو خدا کی قسم تم محسوس کرو گے کہ تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے' ملک ملک گھومو اور کھوج لگاؤ دین ابراہیمؑ کے سچے پیروؤں کا۔ [1] بعد میں ان میں سے ورقہ بن نوفل عیسائی ہو گیا۔ عبیداللہ بن جحش جیسا تھا ویسا ہی رہا مگر اس کے ذہن میں الجھن رہی۔ کچھ عرصے بعد اسلام لایا۔ پھر مہاجرین حبشہ کے ساتھ حبش میں ہجرت کی اور اس کے ساتھ اس کی اہلیہ ام حبیبہ (بنت ابو سفیان) بھی ہجرت میں گئیں۔ وہاں جانے کے بعد عبیداللہ دوبارہ نصرانی ہو گیا اور اسی حالت میں موت واقع ہوئی اور زید نے نہ یہودیت قبول کی نہ نصرانیت' لیکن اپنی قوم کا دین ترک کر دیا۔ بت پرستی چھوڑ دی' مردار اور خون اور استھانوں کے ذبیحوں سے پرہیز شروع کر دیا۔ بیٹیوں کے قتل سے لوگوں کو باز رہنے کی تلقین کرتا رہا اور کہا کرتا۔ "اعبد رب ابراہیم" کہ میں تو ابراہیمؑ کے رب کا پرستار ہوں۔ [2] اسماء بنت ابوبکر کا بیان ہے کہ میں نے بوڑھے سردار زید بن عمرو کو کعبے کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے دیکھا اور وہ کہہ رہا تھا۔ اے قریش کے لوگو! قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں زید بن عمرو کی جان ہے۔ میرے سوا تم میں سے کوئی بھی ابراہیمؑ کے دین پر قائم نہیں رہا۔ پھر کہنے لگا اے خدا! اگر میں جانتا کہ تجھے کون سے طریقے پسند ہیں تو میں انہی طریقوں سے تیری عبادت کرتا۔ لیکن میں نہیں جانتا۔ پھر ہتھیلیاں ٹیک کر سجدہ کرتا۔ [3] اپنے ملنے والوں کے سامنے وہ اکثر یہ اشعار الاپتا:

اربا واحدا ام الف رب　　　ادین اذا تقسمت الامور

رب ایک ہونا چاہیے' یا سینکڑوں رب بنا لیے جائیں؟ میں اس مذہب پر کیسے چلوں جب کہ مسائل حیات کئی معبودوں میں بانٹ دیئے گئے ہوں۔

عزلت اللات والعزی جمیعا　　　کذالک یفعل الجلد الصبور

میں نے لات و عزیٰ سب کو ترک کر دیا ہے اور مضبوط اور صبر کیش شخصیتیں ایسا ہی کرتی ہیں۔

ولکن اعبدالرحمن ربی　　　لیغفر ذنبی الرب الغفور

مگر ہاں' اب میں اپنے رب رحمٰن کا عبادت گزار ہوں تاکہ وہ بخشش فرمانے والا آقا میرے گناہوں کو معاف کر دے۔

فتقوی اللہ ربکم احفظوھا　　　متی ما تحفظوھا لا تبوروا

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۴۲

[2] " " " "

[3] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۴۳

سو تم اللہ ہی کے تقویٰ کی حفاظت کرو۔ جب تک اس صفت کو قائم رکھو گے، کبھی گھاٹے میں نہ پڑو گے۔

بچارے زید کی بیوی صفیہ بنت الحضرمی ہمیشہ اس کے پیچھے پڑی رہتی۔ بسا اوقات وہ خالص ابراہیمی دین کی جستجو کے لیے مکہ سے نکل کھڑے ہونے کا ارادہ کرتا' لیکن اس کی جورو خطاب بن نفیل کو آگاہ کر دیتی اور وہ اسے دین آبائی کے چھوڑنے پر سخت سست کہتا۔ زید کی والہیت کا عالم یہ تھا کہ سجدہ گاہ کعبہ میں داخل ہوتا تو پکار اٹھتا۔ "لبیک حقا حقا تعبدا ورقا"۔ یعنی اے خداوند برحق میں تیرے حضور اخلاص مندانہ' عبادت گزارنہ اور غلامانہ انداز سے حاضر ہوں۔ پھر کہتا۔ "میں کعبہ کی طرف منہ کرکے اسی ذات کی پناہ طلب کرتا ہوں جس کی پناہ ابراہیم علیہ السلام نے ڈھونڈی تھی"۔ [1]

خطاب بن نفیل' زید کے درپے آزار رہا۔ یہاں تک کہ مکہ کی بالائی جانب شہربدر کر دیا اور زید نے مکہ کے سامنے حرا کے پاس جاڈھونی رمائی۔ پھر خطاب نے قریش کے چند نوجوانوں اور کچھ کمینہ خصلت افراد کو اس کی نگرانی پر مامور کر دیا اور ان کو تاکید کی کہ خبردار اسے مکہ میں داخل نہ ہونے دو۔ چنانچہ زید اگر کبھی آیا تو چھپ چھپا کر' اور اس پر بھی اگر پتہ چل جاتا تو خطاب اور اس کے رضاکار اسے کھدیڑ دیتے اور اسے دین کو بگاڑ دینے کا مجرم جانتے ہوئے نہایت نفرت کے ساتھ دکھ دیتے۔ چنانچہ تنگ آکر اس نے وطن چھوڑا اور موصل' الجزیرہ اور شام وغیرہ میں بے آمیز ابراہیمی" دین کی جستجو میں مارا مارا پھرتا رہا۔ آخرکار وہ دمشق کے علاقہ بلقاء میں ایک صاحب علم راہب کے پاس پہنچا اور اس سے گم گشتہ مسلک ابراہیمی" کا سراغ پوچھا۔ راہب نے کہا کہ "آج تجھے اس مسلک پر چلنے والا کوئی ایک متنفس بھی نہ ملے گا۔ البتہ ایک نبی کے ظہور کا وقت آپہنچا ہے جو اسی جگہ سے اٹھے گا۔ جہاں سے نکل کر تو آیا ہے۔ وہ دین ابراہیمی کا علمبردار بن کے اٹھے گا جاکر اس سے مل۔ ان دنوں اس کی بعثت ہو چکی ہے"۔ زید نے یہودیت و نصرانیت کو خوب دیکھ بھال لیا اور ان کی کوئی چیز اس کے دل کو نہ لگی۔ وہ راہب کی ہدایت کے مطابق مکہ کی طرف لپکا۔ بلاد لخم میں لوگوں نے اس کو قتل کر دیا۔ [2] ورقہ بن نوفل نے بڑے دردناک اشعار الاپتے ہوئے اظہار درد کیا:۔

فاصبحت فی دار کریم مقامها تعلل فیها بالکوامه لاهیا

تلاقی خلیل الله فیها ولم تکن من الناس جبارا الی النار هاویا

وقد تدرک الانسان رحمة ربه ولو کان تحت الارض سبعین وادیا

(ابن ابی صلت)

---

[1] ایضاً ص ۲۲۸

[2] سیرت ابن ہشام ج ا ص ۵۰-۲۴۹

اس طرح کے حساس افراد کے ذہنی مد و جزر کو دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ماحول ایک زندگی بخش پیغام کے لیے مضطرب ہو رہا تھا۔ تاریخ جس انقلابی قوت کو مانگ رہی تھی وہ اپنے ٹھیک تمنائی موسم نمو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی صورت میں کونپل نکالتی ہے۔ آپؐ ایک منفی صدائے احتجاج بن کر اور اپنے انفرادی ذہن و کردار کی فکر لے کر نمودار نہیں ہوئے۔ بلکہ ایک جامع مثبت نظریہ و مسلک کے ساتھ ساری قوم اور سارے ماحول کی اجتماعی تبدیلی کے لیے میدان میں اترے۔ اس جرم کو بھلا کیسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا جا سکتا تھا۔

دعوت کا پہلا خفیہ دور:

مقدمۂ دور نبوت کے طور پر اپنے زمانہ تحنث میں آنحضورؐ رویائے صادقہ سے نوازے گئے۔ کبھی غیبی آوازیں سنائی دیتیں، کبھی فرشتہ دکھائی دیتا، یہاں تک کہ عرش الٰہی سے پہلا پیغام آ پہنچا۔ جبرائیلؑ آتے ہیں اور پکارتے ہیں کہ "اقرا باسم ربک الذی خلق" (الخ) [1] وحی الٰہی کے اولین تجربے میں ہیبت و جلال کا بہت سخت بوجھ آپؐ نے محسوس کیا۔ پھر حضرت جبرئیلؑ نے آنحضرتؐ کو سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر کہا پڑھ۔ غرض یہ کہ آخر کار آپؐ سہمے سہمے جبریلؑ کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو دوہراتے رہے۔ یہاں تک کہ پہلا کلام وحی یاد ہو گیا۔ گھر آ کر اپنی رفیقہ راز داں سے واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے تسلی دی کہ آپؐ کا خدا آپؐ کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔ ورقہ بن نوفل نے تصدیق کی کہ یہ تو وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اترا تھا۔ بلکہ مزید یہ کہا کہ یقیناً لوگ آپؐ کی تکذیب کریں گے، آپؐ کو تنگ کریں گے آپؐ کو وطن سے نکالیں گے اور آپؐ سے لڑیں گے۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو میں خدا کے کام میں آپؐ کی حمایت کروں گا"۔

اب گویا آپؐ خدا کی طرف سے دعوت حق پر باقاعدہ مامور ہو گئے۔ اور آپؐ پر ایک بھاری ذمہ داری ڈال دی گئی۔ یہ دعوت سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ ہی کے سامنے آئی اور وہی اس پر ایمان لانے والوں میں سے پہلی ہستی قرار پائیں۔ پھر یہ کام خفیہ طور پر دھیمی رفتار سے چلنے لگا۔ آپؐ کے بچپن کے ساتھی اور پوری طرح ہم مذاق و ہم مزاج حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ ان سب کے سامنے جب پیغام حق آیا تو انہوں نے کسی تامل و توقف کے بغیر اس طرح لبیک کہی جیسے پہلے سے روح اسی چیز کی پیاسی تھی۔ علاوہ بریں زیدؓ رفیق مسلک بنے جو آپؐ کے پروردہ غلام تھے اور آپؐ کی زندگی اور کردار سے متاثر تھے۔

آپؐ پر قریب ترین لوگوں کا ایمان لانا آپؐ کے اخلاص اور آپؐ کی صداقت کا بجائے خود ایک ثبوت

---

[1] پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔ (العلق ۱ تا ۵)

اس کے بیٹے سعید اور حضرت عمرؓ ابن الخطاب نے زمانہ اسلام میں آنحضورؐ سے دریافت کیا کہ کیا ہم زید کے لیے دعائے مغفرت کر سکتے ہیں؟ آنحضورؐ نے فرمایا۔ "ہاں! فانه یبعث امة وحده۔ (اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ایک مستقل جداگانہ امت کی حیثیت سے کھڑا کرے گا۔) مدعا یہ کہ ایک شخص کو جہاں تک اس کی فطرت سلیم سے رہنمائی مل سکتی تھی اس نے شرح صدر کے ساتھ اسے قبول کیا۔ اور پھر وہ ہدایت وحی کی طلب میں مارا مارا پھرا اور بالآخر وہ سرچشمہ رسالت کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا کہ اسی راہ جستجو میں شہید ہوا۔ [1]

اس طویل بیان سے یہ حقیقت سامنے لانا مقصود ہے کہ تاریخ ایک موڑ مڑنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی' روح معاشرہ ایک نئی کروٹ لینا چاہتی تھی۔ انسانی ضمیر ایک شدید اضطراب سے دو چار تھا۔ مگر فطرت کی دھندلی رہنمائی کے سوا کوئی روشنی موجود نہ تھی۔ اوپر سے فاسد مذہبیت اور اندھی رسمیت کا ماحول ایک آہنی خول کی طرح سے انسانی خودی کو بھینچے ہوئے تھا۔ جمود نے زندگی کے سمندر پر یخ کی ایک موٹی تہ مسلط کر دی تھی کہ جس کو توڑ کر کسی موج کے لیے اوپر آنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ حساس افراد یا تو مسلک نصرانیت کی منزل پر رک گئے جس کے لیے ماحول میں گنجائش تھی' یا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن اس کے خلاف جہاد کا آغاز کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ متذکرہ بالا چار افراد میں بغاوت کی ایک لہر اٹھی تھی' ان میں سے صرف ایک زید نے اتنا کس بل دکھایا کہ حرم میں بیٹھ کر خدائے واحد کو پکارا اور قریش کے سامنے بت پرستی سے برأت کی۔ لیکن زید بھی ایک اظہار اضطراب اور ایک اعلان احتجاج سے زیادہ کچھ نہ کر سکا۔ کیونکہ اس کے سامنے کوئی واضح اور مثبت اور مکمل نظریہ و مسلک نہ تھا جسے وہ بنائے دعوت و تحریک بنا سکتا۔ پھر بھی مکہ نے اس کے وجود کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔

شعراء کو جاہلی معاشرہ میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ اور یہ لوگ ذہنی قیادت کے منصب پر بھی فائز تھے اور ان کے فن پارے وقت کے اجتماعی ذہن اور فکری فضا کے آئینہ دار بھی تھے۔ سماج کے ضمیر کا اضطراب جو لہریں اٹھا رہا تھا وہ حضورؐ سے قبل کے متصل دور کی جاہلی شاعری میں نمایاں ہیں۔ ان لہروں میں انسانی فطرت بسا اوقات بنیادی صداقتوں کو پکار اٹھتی تھی۔

ان میں سے ایک نمایاں شخصیت امیہ ابن ابی الصلت کی تھی جو سرداران طائف میں سے تھا۔ اس شاعر نے توحید' حشر' جزا اور سزا کے بارے میں اچھے خیالات پیش کیے ہیں۔ نیز اخلاقی حکمت و نصیحت کی باتیں نظم کی ہیں۔ یہ شاعر بھی صنم پرستانہ جاہلی طرز فکر کا باغی تھا۔ مگر حضورؐ کی دعوت سے یہ حصہ نہ پا سکا۔ اس کے اشعار کو حضورؐ پسند کرتے تھے اور فرماتے کہ وہ اسلام لاتے لاتے رہ گیا۔

---

[1] قس بن ساعدہ کا قصہ بھی کتب تاریخ و ادب میں اسی طرح کا مندرج ہے لیکن جو اشعار اور خطبہ عکاظ اس کے نام سے منسوب ہے اسے علامہ شبلی موضوع قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو سیرۃ النبیؐ از شبلی نعمانی ج ۱ ص ۱۸۳۔۱۸۰۔

ہے۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جو کئی برس سے آپؐ کی پرائیویٹ اور پبلک لائف سے اور آپؐ کے ظاہر و باطن سے پوری طرح واقف تھیں۔ ان سے بڑھ کر آپؐ کی زندگی اور کردار اور آپؐ کے ذہن و فکر کو جاننے والا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ ان قریب ترین ہستیوں نے بالکل آغاز میں آپؐ کے بلاوے پر لبیک کہہ کر گویا ایک شہادت بہم پہنچادی، دعوت کی صداقت اور داعی کے اخلاص کی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تحریک محمدیؐ کا سپاہی بنتے ہی اپنے حلقہ اثر میں زور شور سے کام شروع کر دیا اور متعدد اہم شخصیتوں، مثلاً حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ، حضرت طلحہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس انقلابی حلقہ کا رکن بنا دیا۔ بڑی خاموشی، رازداری اور احتیاط سے اس حلقہ کے جواں ہمت کارکن اس کو توسیع دے رہے تھے۔ عمارؓ، خبابؓ، ارقمؓ، سعد بن زیدؓ (انہی زیدؓ بن عمرو کے بیٹے جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ یہ والد کی زندگی سے متاثر تھے)۔ عبداللہؓ بن مسعود، عثمانؓ بن مظعون، عبیدہؓ، صہیب رومی (رضوان اللہ علیہم اجمعین) بھی اسلامی تحریک کے ابتدائی خفیہ دور میں سابقین اولین کی صف میں آچکے تھے!

نماز کا وقت آتا تو آنحضورؐ کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور اپنے رفقاء کے ساتھ چھپ چھپا کر سجدہ عبودیت بجالاتے۔ صرف چاشت کی نماز حرم میں پڑھتے، کیونکہ یہ نماز خود قریش کے ہاں بھی مروج تھی۔ ایک مرتبہ آنحضورؐ حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز ادا فرما رہے تھے کہ آپؐ کے چچا ابو طالب نے دیکھ لیا۔ اس نئے انداز کی عبادت کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے اور بڑے غور سے دیکھتے رہے۔ نماز کے بعد آپؐ سے پوچھا کہ یہ کیا دین ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "ہمارے دادا ابراہیمؑ کا "یہی دین تھا"۔ یہ سن کر ابوطالب نے کہا کہ میں اسے اختیار تو نہیں کر سکتا لیکن تم کو اجازت ہے اور کوئی شخص تمہارا مزاحم نہ ہو سکے گا"۔ ❶

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تحریک اسلامی کے اسی خفیہ دور میں ایمان لائے اور آپ کا ترتیبی نمبر بہ تحقیق علامہ شبلی چھٹا یا ساتواں ہے۔ یہ بھی انہی مضطرب لوگوں میں سے تھے جو بت پرستی چھوڑ کر محض فطرت سلیم کی رہنمائی میں خدا کا ذکر کرتے اور اس کی عبادت بجالاتے۔ ان تک کسی ذریعے سے آنحضورؐ کی دعوت کا نور پہنچ گیا۔ انہوں نے اپنے بھائی کو بھیجا کہ جا کر صحیح معلومات لائیں۔ انہوں نے آنحضورؐ سے ملاقات کی، قرآن سنا اور بھائی کو بتایا کہ میں نے اس شخص کو دیکھا ہے۔ لوگ اسے مرتد کہتے ہیں، ❷ لیکن وہ مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور ایک عجیب کلام سناتا ہے جو شعر و شاعری سے بالکل

---

❶ سیرت النبیؐ علامہ شبلی ج ۱ ص ۱۹۲۔

❷ دیکھیے بگڑے ہوئے معاشرے کی شان کی جو شخص دنیا بھر کو ایمان سے مالا مال کرنے آیا تھا اس پر بے دینی کا ٹھپہ لگا دیا۔ ہر دور کے مذہبی ٹھیکہ داروں کا طرز عمل یہی ہوتا ہے۔

مختلف ہے۔ اس کا طریقہ تمہارے طریقے سے ملتا جلتا ہے' اس اطلاع پر خود آئے اور آپؐ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اخفاء کے مشکِ حق کی خوشبو کو ہوا کی لہریں لے اڑی تھیں اور خدا کے رسولؐ کے لیے بدنام کن القاب تجویز کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا لیکن پھر بھی ماحول ابھی پر سکون تھا ابھی وہ "خطرے" کا پورا پورا اندازہ نہیں کر پایا تھا۔

دیکھئے' ایک اور اہم تاریخی حقیقت' کہ تحریک کے ان اولین علمبرداروں میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو اعلیٰ درجے کے مذہبی و قومی مناصب پر مامور ہو۔ یہ حضرات اغراض کے بوجھ تلے دبے ہوئے اور مفاد کی ڈوریوں سے بندھے ہوئے نہ تھے۔ ہمیشہ ایسے ہی آزاد فطرت نوجوان تاریخ میں بڑی بڑی تبدیلیاں پیدا کرنے کے لیے اگلی صفوں میں آیا کرتے ہیں۔ لیڈروں اور عہدہ داروں میں سے کوئی بھی ادھر نہ آیا تھا۔

تحریک اپنے اس خفیہ دور میں قریش کی نگاہوں میں درخورِ اعتناء نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ چند نوجوانوں کا سرپھرا پن ہے' الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں' چار دن میں دماغوں سے یہ ہوا نکل جائے گی' ہمارے سامنے کوئی دم مار سکتا ہے؟ مگر برسرِ اقتدار طبقہ تختِ قیادت پر بیٹھا اپنے زعمِ قوت میں مگن رہا اور سچائی اور نیکی کی کونپل تخت کے سائے میں آہستہ آہستہ جڑیں چھوڑتی رہی اور نئی پتیاں نکالتی رہی' یہاں تک کہ تاریخ کی زمین میں اس نے اپنا ایک مقام بنا لیا۔ قریش کا اعتقاد یہ بھی تھا کہ لات منات اور عزیٰ جن کے آگے ہم پیشانیاں رگڑتے اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں اور جن کے ہم خدامِ بارگاہ ہیں اپنے احترام اور مذہبِ بت پرستی کی خود حفاظت کریں گے اور ان کی روحانی مار ہنگامہ کو ختم کر دے گی۔

دعوتِ عام:

تین برس اسی طرح گزر گئے۔ لیکن مشیتِ الٰہی حالات کے سمندر کو بھلا کب بستہ کہاں رہنے دیتی؟ اس کی سنت تو ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ وہ باطل کے خلاف حق کو اٹھا کھڑا کرتی ہے اور پھر ٹکراؤ پیدا کرتی ہے۔ (بل نقذف بالحق علی الباطل) [1] اس سنت کے تحت یکایک دوسرے دور کے افتتاح کے لیے حکم ہوتا ہے۔ "فاصدع بما تومر" [2] جو کچھ حکم دیا جا رہا ہے اسے واشگاف کہہ دیجئے!

آنحضورؐ اپنی ساری ہمت و عزیمت کو سمیٹ کر' نئے مرحلے کے متوقع حالات کے لیے اپنے آپ کو تیار کر کے کوہِ صفا پر آ کھڑے ہوتے ہیں' اور قریش کو عرب کے اس خاص اسلوب سے پکارتے ہیں جس سے

---

[1] مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں۔ (الانبیاء ۱۸)

[2] پس اے نبیؐ جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو (الحجر: ۹۴)

وہاں کسی خطرے کے نازک لمحے قوم کو بلایا جاتا تھا۔ لوگ دوڑ کر آتے ہیں' جمع ہو جاتے ہیں اور کان منتظر ہیں کہ کیا خبر سنائی جانے والی ہے۔

آپؐ نے باآواز بلند پوچھا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک حملہ آور فوج چلی آرہی ہے۔ تو کیا تم مجھ پر اعتماد کرو گے"؟

"ہاں' کیوں نہیں؟ ہم نے تم کو ہمیشہ سچ بولتے پایا ہے"۔ یہ جواب تھا جو بالاتفاق مجمع کی طرف سے دیا گیا۔

"تو پھر میں یہ کہتا ہوں کہ خدا پر ایمان لاؤ ـــــ اے بنو عبدالمطلب! اے بنو عبد مناف' اے بنو زہرا! اے بنو تیم! اے بنو مخزوم! اے بنو اسد! ـــــ ورنہ تم پر سخت عذاب نازل ہو گا"۔ ان مختصر الفاظ میں آپؐ نے اپنی دعوت بر سر عام پیش کر دی۔

آپؐ کے چچا ابولہب نے یہ سنا تو جل بھن کر کہا کہ "غارت ہو جاؤ تم آج ہی کے دن! ــــ کیا یہی بات تھی جس کے لیے تم نے ہم سب کو یہاں اکٹھا کیا تھا؟" ابو لہب اور دوسرے اکابر بہت برہم ہو کر چلے گئے۔

دیکھیے! ابولہب کے الفاظ میں دعوت نبویؐ کے صرف ناقابل اعتناء ہونے کا تاثر جھلک رہا ہے' ابھی کوئی دوسرا ردعمل پیدا نہیں ہوا۔ شکایت صرف یہ تھی کہ تم نے ہمیں بے جا تکلیف دی اور ہمارا وقت ضائع کیا!

دعوت عام کی مہم کا دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ آنحضورؐ نے تمام خاندان عبدالمطلب کو کھانے پر بلوایا۔ اس مجلس ضیافت میں حمزہؓ' ابو طالب اور عباسؓ جیسے اہم لوگ بھی شریک تھے۔ کھانے کے بعد آپؐ نے مختصر سی تقریر کی اور فرمایا کہ میں جس پیغام کو لے کر آیا ہوں یہ دین اور دنیا دونوں کا کفیل ہے[1] کون اس مہم میں میرا ساتھ دیتا ہے؟

اس پر سکوت چھا گیا۔ اس سکوت کے اندر تیرہ برس کا ایک لڑکا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ "اگرچہ میں آشوب چشم میں مبتلا ہوں' اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں' اگرچہ میں ایک بچہ ہوں' لیکن میں اس مہم میں آپؐ کا ساتھ دوں گا" ـــــ یہ حضرت علیؓ تھے جو آگے چل کر اساطین تحریک میں شمار ہوئے۔

یہ منظر دیکھ کر حاضرین میں خوب قہقہہ پڑا! ـــــ اس قہقہے کے ذریعے گویا خاندان عبدالمطلب یہ کہہ رہا تھا کہ یہ دعوت اور یہ لبیک کہنے والا کون سا کارنامہ انجام دے لیں گے۔ یہ سب کچھ ایک مذاق ہے' ایک جنون ہے' اور بس! اس کا جواب تو صرف ایک خندہ استہزاء سے دیا جا سکتا ہے۔

---

[1] بالکل ابتدائے دعوت میں آنحضورؐ اس حقیقت کا شعور رکھتے تھے کہ وہ دنیا سے کٹا ہوا مذہب لے کر نہیں آئے بلکہ دنیا کو سنوارنے والا دین لے کے آئے ہیں۔

اس دوسرے واقعہ پر ماحول کا سکون نہیں ٹوٹا' زندگی کے سمندر کے نہنگوں اور گھڑیالوں نے کوئی انگڑائی نہیں لی۔ لیکن اس کے بعد یہ تیسرا قدم اٹھا تو اس نے معاشرہ کو ہسٹریا کے اس دورے میں مبتلا کر دیا جو آہستہ آہستہ شروع ہو کر روز بروز تند و تیز ہوتا گیا!

اس تیسرے اقدام کے بارے میں گفتگو کرنے سے قبل ایک اور واقعہ کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مخالف ماحول کی خطرناک سنگینی کی وجہ سے نماز چوری چھپے پڑھی جاتی تھی۔ آنحضورؐ اور رفقائے تحریک شہر سے باہر وادیوں اور گھاٹیوں میں جا جا کر ادا کرتے۔ ایک دن ایک گھاٹی میں سعدؓ بن ابی وقاص دوسرے رفقائے نبویؐ کے ساتھ نماز میں تھے کہ مشرکین نے دیکھ لیا۔ عین حالت نماز میں ان مشرکین نے فقرے کسنے شروع کئے' برا بھلا کہا اور نماز کی ایک ایک حرکت پر پھبتیاں چست کرتے رہے' جب ان لایعنی باتوں کا کوئی جواب نہ ملا تو زچ ہو کر لڑنے پر اتر آئے۔ اس دنگے میں ایک مشرک کی تلوار نے سعدؓ بن ابی وقاص کو زخمی کر ڈالا۔ یہ تھی خون کی سب سے پہلی دھار جو مکہ کی خاک پر خدا کی راہ میں بہی! یہ جاہلی معاشرے کا سب سے پہلا جنوں آمیز خونین رد عمل تھا اور اس رد عمل کے تیور بتا رہے تھے کہ مخالفت اب تشدد کے مرحلے میں داخل ہونے والی ہے۔

انتشار انگیزی:

تحریک کی زیر سطح رَو نے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے چالیس موتی اکٹھے کر لیے تھے۔ اب گویا اسلامی جماعت ایک محسوس طاقت بن چکی تھی۔ کھلم کھلا کلمہ حق کو پکارنے کا حکم آ ہی چکا تھا۔ اس کی تعمیل میں آنحضورؐ نے ایک دن حرم کعبہ میں کھڑے ہو کر توحید کا اعلان کیا۔ لیکن مذہبیت جب بگڑتی ہے' تو اس کی اقدار اس طرح تہ و بالا ہو جاتی ہیں کہ وہ گھر جو پیغام توحید کے مرکزی حیثیت سے استوار کیا گیا تھا آج اسی کی چار دیواری کے اندر خدائے واحد کی وحدت کی پکار بلند کرنا اس مرکز توحید کی توہین کا موجب ہو چکا تھا۔ بتوں کے وجود سے کعبے کی توہین نہیں ہوتی تھی' بتوں کے آگے پیشانیاں رگڑنے سے بھی نہیں' ننگے ہو کر طواف کرنے' سیٹیاں اور تالیاں بجانے سے بھی نہیں' غیر اللہ کے نام پر ذبیحے پیش کرنے سے بھی نہیں' مجاوری کی فیس اور پروہتی کا ٹیکس وصول کرنے سے بھی نہیں ــــ لیکن اس گھر کے اصل مالک کا نام لیتے ہی اس کی توہین ہو گئی تھی![1]

''کعبہ کی توہین! حرم کی بے حرمتی! ــــ توبہ توبہ! کیسی خون کھولا دینے والی بات ہے' کیسی جذبات کو

---

[1] یہ تو خیر مشرکین تھے دور جاہلیت کے' آج ہمارے سامنے ایک مسلمان' اور ایک معمولی مسلمان نہیں ایک مذہبی شخصیت کعبہ کے نظام تولیت کی خرابیوں پر تنقید کرنے والے اپنے بھائی کو توہین کعبہ کا مجرم گردانتی ہے! فاعتبروا یا ولی الابصار۔

مشتعل کر دینے والی حرکت ہے! چنانچہ کھولتے ہوئے خون اور مشتعل جذبات کے ساتھ چاروں طرف سے کلمہ توحید کو سننے والے مشرکین و کفار اُمڈ آتے ہیں' ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ نبی ﷺ گھیرے میں آ جاتے ہیں' حارث بن ابی ام ہالہ کے گھر میں تھے' شور و شغب سن کر آنحضور کو بچانے کے لیے دوڑے لیکن ہر طرف سے تلواریں ان پر ٹوٹ پڑیں اور وہ شہید ہو گئے۔ عرب کے اندر اسلام اور جاہلیت کی کشمکش میں یہ پہلی جان تھی جو حمایت حق میں قربان ہوئی۔

دیکھا آپ نے! ایک دعوت جو معقول اور پر سکون انداز سے دی جا رہی تھی اس پر غور کر کے رائے قائم کرنے اور استدلال کا جواب دلائل سے دینے کے بجائے اندھے جذباتی اشتعال سے دیا جاتا ہے۔ سیدنا محمد ﷺ کلمہ حق آہنی تلوار سے منوانے نہیں اٹھے۔ لیکن مخالف طاقت معاً تلوار سونت کے آ جاتی ہے۔ یہی ایک فاسد نظام کے مفاد پرست مخالفین کی علامت ہے کہ معقولیت کے جواب میں اشتعال اور دلیل کے جواب میں تلوار لیے میدان میں اترتے ہیں۔ مخالفین میں اتنا ظرف نہیں تھا کہ وہ کم سے کم چند ہفتے چند دن' چند لمحے حرم سے اٹھنے والی صدا پر پر سکون طریقے سے غور و فکر کر سکتے۔ یہ تسلیم کرتے کہ محمدؐ کو بھی ان کی طرح کسی نظریے' فلسفے' عقیدے پر ایمان رکھنے' کسی مذہب پر چلنے اور ان کی قائم کردہ صورت مذہب سے اختلاف کرنے کا حق ہے' کم سے کم امکان کی حد تک یہ مانتے کہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اندر غلطی موجود ہو اور محمدؐ ہی کی دعوت سے حقیقت کا سراغ مل سکتا ہو۔ کسی نظام فاسد کے سربراہ کاروں میں اتنا ظرف باقی نہیں رہتا' ان میں اختلاف کے لیے قوت برداشت بالکل ختم ہو جاتی ہے' ان کی غور و فکر کی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔

ذرا اندازہ کیجئے کہ کیسی تھی وہ فضا جس میں ہم سب کی دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دینے والا داعی حق بے سرو سامانی کے عالم میں اپنا فرض ادا کر رہا تھا!

گندا پروپیگنڈا:

ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے پاکیزہ جذبات اور پاکیزہ حسرتوں اور تمناؤں کے مسالے سے بنے ہوئے حرم پاک کے اندر مکہ والوں کی اس حرکت کے وقوع نے آنے والے دور مستقبل کا ایک تصور تو ضرور دلا دیا اور ایک بے گناہ کے خون سے آئندہ ابواب تاریخ کی سرخی تو جما دی' لیکن یہ اصل دور تشدد کا افتتاح نہیں تھا۔

پہلا مرحلہ مخالفت ہمیشہ استہزاء' تضحیک اور کٹ حجتیوں کا ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ غنڈہ گردی کا رنگ اختیار کرتا جاتا ہے۔

نبی ﷺ کی دعوت کو پایہ اعتبار سے گرانے کے لیے گالی دینے کے کمینہ جذبہ کے ساتھ پروپیگنڈہ کے ماہر استادوں نے گوناں گوں القاب گھڑنے شروع کیے۔

مثلاً یہ کہا جانے لگا' کہ اس شخص کی بات کیوں سنتے ہو یہ تو (نعوذ باللہ) "مرتد" ہے' سکہ بند دین اسلاف کہ جس کے ہم اجارہ دار ہیں یہ اس کے دائرہ سے باہر نکل گیا ہے اور اب اپنے پاس سے ایک انوکھا دین گھڑ لایا ہے۔ کوئی استدلال نہیں ---- بس اپنی گدیوں پر بیٹھے بیٹھے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے' یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ تو "صابی" ہو گیا ہے' صابئیت چونکہ اس وقت کی مشرکانہ سوسائٹی میں ایک بدنام اور نا پسندیدہ مسلک تھا اس لیے کسی کا نام صابی دھر دینا ویسی ہی گالی تھا جیسے آج کسی مسلمان کو یہودی یا خارجی یا نیچری کہہ دیا جائے۔ حق کے خلاف دلائل کے لحاظ سے بودے لوگ جب حنقی ہنگامے اٹھاتے ہیں تو ان کی پروپیگنڈے کی مہم کا ایک ہتھیار ہمیشہ اس طرح کے بدنام کن القاب' ناموں اور اصطلاحوں کا چسپاں کرنا ہوتا ہے۔ گلی گلی' مجلس مجلس مکہ کے پروپیگنڈسٹ ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے تھے کہ دیکھو جی! یہ لوگ صابی ہو گئے ہیں' بے دین ہو گئے ہیں۔ باپ دادا کا دین دھرم انہوں نے چھوڑ دیا ہے' نئے نئے عقیدے اور نئے نئے ڈھنگ گھڑ کے لا رہے ہیں' دیکھو جی! ان ہونی باتیں ہو رہی ہیں! یہ آندھی جب اٹھ رہی ہو گی تو تصور کیجئے کہ اس میں راستہ دیکھنا اور سانس لینا عام لوگوں پر کتنا دو بھر ہو گیا ہو گا۔ اور داعیان حق کے مختصر سے قافلہ کو کس آفت کا سامنا ہو گا! مگر آندھیاں ارباب عزیمت کے راستے کبھی نہیں روک سکتیں! ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لھا۔ [1]

دلائل کے مقابلہ میں جب گالیاں لائی جا رہی ہوں تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ دلائل تو اپنی جگہ جمے رہتے ہیں لیکن جو گالی مقابلے پر لائی جاتی ہے وہ جذباتی حد تک دو چار دن کام دے کر بالکل بے اثر ہو جاتی ہے اور انسانی فطرت اس سے نفور ہونے لگتی ہے اس لیے استادان فن کا یہ کلیہ ہے کہ نت نئی گالیاں ایجاد کرتے چلے جاؤ۔ چنانچہ آنحضور ﷺ کے لیے ایک گالی اور وضع کی گئی۔ آپؐ کو "ابن ابی کبشہ" کہا جاتا تھا۔ ابی کبشہ ایک معروف مگر بدنام شخصیت تھی۔ یہ شخص تمام عرب کے دینی رجحانات کے خلاف "شعریٰ" نامی ستارے کی پرستش کرتا تھا۔ ابن ابی کبشہ کے معنی ہوئے "ابی کبشہ کا بیٹا" یا ابی کبشہ کا پیرو (نعوذ باللہ) دل کا بخار نکالنے کے لیے مکہ کے مریضان جذباتیت نے کیا کیا ایجادیں نہیں کیں!

کسی صاحب دعوت یا کسی نقیب تحریک کی ذات پر جب اس طرح کے وار کیے جاتے ہیں تو اصل مطلوب اس شخصیت کو کرب دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ در حقیقت گالی دی جاتی ہے' اس نظریہ و مسلک کو اور اس کام اور تنظیم کو جس کی روز افزوں یلغار سے سابقہ پڑا ہوتا ہے' مگر کیا ایک امڈتے ہوئے سیلاب کے آگے گوبر کے پشتے باندھ کر اس کو روکا جا سکتا ہے! مستہزئین مکہ دیکھ رہے تھے کہ وہ گندگی کے جو جو بند بھی باندھتے ہیں ان کو یہ دعوت بہائے لیے جا رہی ہے اور ہر صبح اور ہر شام کچھ نہ کچھ آگے ہی بڑھتی جاتی ہے تو انہوں نے پروپیگنڈے کے دوسرے پہلو اختیار کیے۔ ایک نیا لقب یہ تراشا کہ یہ شخص (نعوذ باللہ)

---

[1] اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لیے کھول دے اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ (فاطر: ۲)

درحقیقت پاگل ہو گیا ہے ـــــــ بتوں کی مار پڑنے سے اس کا سر پھر گیا ہے۔ یہ جو باتیں کرتا ہے وہ ہوش و حواس اور عقل و حکمت کی باتیں نہیں ہیں بلکہ یہ ایک مالیخولیا ہے کہ جس کے دورے پڑنے پر کبھی اسے فرشتے نظر آتے ہیں' کبھی جنت اور دوزخ کے خواب دکھائی دیتے ہیں کبھی وحی اترتی ہے اور کبھی کوئی انوکھی بات منکشف ہو جاتی ہے۔ یہ ایک سرپھرا آدمی ہے' اس لیے اس کی باتوں پر عام لوگوں کو دھیان نہیں دینا چاہیے اور اپنا دین ایمان بچانا چاہیے۔ ہمیشہ سے یہ ہوا کہ داعیان حق کا زور استدلال توڑنے کے لیے یا تو ان کو پاگل کہا گیا ہے یا سفیہ و احمق! ہوشمند تو بس وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی دنیا بنانے اور زمانے کی ہاں میں ہاں ملانے اور اپنی خواہشوں کا سامان تسکین بہم کرنے میں منہمک رہیں' باقی وہ لوگ جو تجدید و اصلاح کی مہم اٹھا کر جان جوکھوں میں ڈالیں' ان کو دنیا پرست اگر احمق اور پاگل نہ کہیں تو آخر ان کی ڈکشنری میں اور کون سا لفظ موزوں ہو سکتا ہے۔

پھر یہ بات پیٹھ پیچھے کہتے رہنے پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا بلکہ مُرو در رُو کہا جاتا تھا۔ یا یھا للذی نزل علیہ الذکر انک لمجنون ❶ گالی کا اصلی مزہ تو آتا ہی جب ہے کہ وہ رو در رو سنائی جائے!

لیکن کبھی پاگلوں کے گرد بھی دنیا کسی تحریک کو چلانے کے لیے منظم ہوئی ہے؟ کبھی احمقوں کا دامن بھی ہوشمند اور سلیم الفطرت نوجوانوں نے تھاما ہے؟ کبھی سرپھرے لوگوں کے بلاوے پر سمجھدار لوگوں نے بھی لبیک کہی ہے؟ ----- اس سوال کا جواب دینے کے لیے مشرکین مکہ ❷ نے ایک اور طنز گھڑی۔ کہنے لگے کہ یہ مدعی نبوت درحقیقت جادو کے فن میں بھی درک رکھتا ہے۔ یہ اس کا فنی کمال ہے کہ دو چار باتوں میں ہر ملنے والے پر ہپناٹزم کر دیتا ہے' نظربندی کی حالت میں مبتلا کر دیتا ہے اور ذرا کوئی اس کی باتوں میں آیا نہیں کہ جادو کے جال میں پھنسا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے بھلے سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ اس کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں!

ہاں مگر ایک سوال یہ بھی تو پیدا ہوتا تھا کہ کبھی جادوگروں نے بھی آج تک مذہبی و تمدنی تحریکیں چلائی ہیں اور کبھی کاہنوں نے خدا پرستی اور توحید اور مکارم اخلاق کا درس دینے کے لیے فن ساحری کو استعمال کیا ہے؟ کوئی مثال ایسی تاریخ میں ہے کہ جادوگروں کی سی ذہنی سطح رکھنے والے کسی فرد نے نظام وقت کو

---

❶ یہ لوگ کہتے ہیں' اے وہ شخص جس پر یہ ذکر نازل ہوا ہے' تو یقیناً دیوانہ ہے۔ (الحجر ۶)

❷ پختہ مذہبی رجحانات رکھنے والوں کے لیے اہل مغرب نے جنونی (FANATICS) کی خاص اصطلاح اسی معنی میں اختیار کر رکھی ہے کہ یہ عقلی توازن سے بے بہرہ جذباتی لوگ ہوتے ہیں آج کل نئی اصطلاح فنڈا مینٹلسٹ آگئی ہے۔ (مؤلف) خود ہمارے اپنے اندر کے بدمذہب عناصر داعیان حق کو جو ملا' کہتے ہیں تو اسی معنی میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ سوجھ بوجھ سے کورے' حالات زمانہ سے ناآشنا اور اپنے ماضی کے بوسیدہ خیالات کے اندھے عاشق ہوتے ہیں۔ اس سے نیچے اتر کر دینی لوگوں کو مخالف عناصر سیاست سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ بھی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہیں ہی احمق!

بدل ڈالنے کے لیے جادو کے زور سے ایک انقلابی گروہ اٹھا کھڑی کی ہو؟ کبھی جادو کے زور سے دلوں اور دماغوں' روحوں اور سیرتوں کو بھی بدلنے کی کوئی مثال سامنے آئی؟ ـــــ پھر یہ کیسا جادوگر تھا جو شعبدہ گری کر کے چار پیسے کماتے پھرنے کے بجائے ساری دنیا کا عذاب بھگتتا ہوا سوسائٹی کے بہترین صالح عنصر کو اپنے گرد ایک بڑی اجتماعی مہم کے لیے سمیٹ رہا تھا۔ کیا یہ کوئی نظر بندی کا ایک شعبدہ تھا جو تمہاری آنکھوں کے سامنے واقع ہو رہا تھا! لیکن یہ سکہ بند الزام ہے' ایسا کہ ہر دور میں ہر صاحب دعوت پر لگایا گیا ہے۔ یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خود دعوت میں صداقت نہیں کہ اس کی فطری کشش کام کرے۔ داعی کے استدلال میں کوئی وزن نہیں کہ جس سے قلوب مسخر ہو رہے ہوں بلکہ سارا کھیل کسی پر اسرار قسم کی فریب کاری اور ساحری پر مبنی ہے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ بھلے چنگے لوگ توازن کھو بیٹھتے ہیں۔

لوگ اکابر قریش کے سامنے آنحضرت ﷺ کی الہامی تقاریر اور آیات قرآنی خصوصاً پیش بھی تو کرتے ہوں گے کہ یہ اور یہ باتیں کہی گئی ہیں۔ کلام کے وہ جوہر شناس آخر یہ تو محسوس کر لیتے ہوں گے کہ خود یہ کلام موثر طاقت ہے۔ اس پر بحثیں ہوتی ہوں گی اور رائیں قائم ہوتی ہوں گی۔ اس کلام کے اعجاز کی توجیہہ کرنے کے لیے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ "اجی کیا ہے' بس شاعری ہے' الفاظ کا ایک آرٹ ہے اور بیانہ زور ہے۔ محمدؐ درجہ اول کے آرٹسٹ اور لسان خطیب ہیں' ان کی شاعری کی وجہ سے کچھ ذہن کے نوجوان بھک رہے ہیں"۔

اے قریش مکہ! شاعر تو دنیا میں ہمیشہ ہوتے رہے ہیں' کیا کوئی ایسا انوکھا شاعر کبھی پیدا ہوا جو اس بے داغ سیرت اور عظیم کردار کا حامل ہو جس کا مظاہرہ محمدؐ اور ان کے رفقاء کر رہے تھے۔ کیا شاعری کے طلسم باندھنے والوں نے کبھی ایسی دینی مہمات بھی برپا کی ہیں جیسی تمہارے سامنے ہو رہی تھی؟

قریش کے سامنے بھی یہ سوال تھا۔ اس کا جواب دینے کے لیے انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کہانت کا ایک اور الزام باندھا۔ کاہن لوگ کچھ مذہبی انداز و اطوار رکھتے تھے' ایک عجیب پراسرار سی فضا بناتے تھے۔ چلوں اور اعتکافوں اور وظیفوں اور منتروں میں ان کی زندگی گزرتی تھی۔ مراقبوں اور مکاشفوں اور فال گیریوں کے ذریعے ایک ٹیکنیکل زبان میں غیب کے اسرار لوگوں کو بتاتے تھے' عام لوگوں سے کچھ انوکھے سے انداز و اطوار رکھتے تھے۔ کچھ مجذوبانہ سی شان ہوتی تھی۔ کاہن کہنے سے قریش کا مدعا یہ تھا کہ آنحضورؐ نے بھی بس اسی طرح کا ایک ڈھکوسلہ بنا رکھا ہے۔ تاکہ لوگ آئیں' مرید بنیں' ان پر کہانت کا سکہ بھی چلے اور پیٹ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ (معاذ اللہ)

اور قرآن اس سارے پروپیگنڈے کی دھواں دھاریوں کو محیط ہو کر آسمانی بلندیوں سے پکار کر کہہ رہا تھا کہ:۔

وما ھو بقول شاعر ! ـــ قلیلا ما تومنون

وما بقول کاھن ؕ قلیلا ما تذکرون ❶

یہ شاعری نہیں ہے مگر افتاد تو یہ آپڑی کہ تم نے ایمان و یقین کے دروازے بند کر رکھے ہیں' یہ کہانت نہیں' مگر رکاوٹ یہ ہوئی کہ تم نے غور و فکر نہ کرنے اور کسی قسم کا سبق نہ لینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اس طوفان بدتمیزی پر قرآن نے چار لفظوں میں کیا ہی شاندار تبصرہ آنحضورؐ کو مخاطب کر کے کیا کہ "انظر ! کیف ضربوا لک الامثال" ❷ دیکھو یہ لوگ کیسے کیسے محاورے اور فقرے چست کرتے ہیں' کیسے کیسے نام دھرتے ہیں' کیا کیا تشبیہیں گھڑتے ہیں اور کہاں کہاں سے اصطلاحیں ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ کر کے پھر ایک کیسا پلٹا کھاتے ہیں؟ ------ "فضلّوا"۔ یعنی اپنے ہی آپ کو گمراہی میں ڈالتے ہیں۔

دیکھئے ! اب ایک اور شوشہ تراشا جاتا ہے۔ دین ابراہیمی کے نام لیوا فرماتے ہیں کہ یہ کوئی جنؔ ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر آتا ہے اور وہ آکر عجیب عجیب باتیں بتاتا ہے یا یہ کہ وہ سکھا پڑھا جاتا ہے۔ کبھی مکہ کے ایک رومی و نصرانی غلام (جابر یا جبرا یا جبر) کا نام لیا جاتا ہے (جو آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر دین کی باتیں سنتا) کہ یہ جاتا ہے اور تنہائی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ وعظ اور لیکچر نوٹ کراتا ہے۔ ایک موقع پر وفد اکابر قریش نے خود آنحضورؐ سے کہا کہ: ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یمامہ میں کوئی شخص "الرحمٰن" نامی ہے جو تمہیں یہ سب کچھ سکھاتا پڑھاتا ہے۔ خدا کی قسم ہم اس الرحمٰن پر ایمان نہیں لانے کے۔ ❸ ان ہوائی شوشوں سے یہ ظاہر کرنا مطلوب تھا کہ یہ کسی بیرونی طاقت اور کسی غیر شخص کی شرارت ہے جو ہمارے مذہب اور معاشرے کو تباہ کرنے کے درپے ہے اور محمد ابن عبداللہ تو محض آلہ کار ہے۔ یہ کسی طرح کی سازباز ہے۔ دوسری طرف اس میں یہ تاثر بھی شامل تھا کہ کلام کا یہ حسن و جمال نہ محمدؐ کا کمال ہے نہ خدا کی عطا و بخشش' یہ تو کوئی اور ہی طاقت گل کھلا رہی ہے۔ تیسری طرف اس کے ذریعے کذب اور افترا علی اللہ کا الزام بھی داعی حق پر چسپاں ہو رہا تھا۔ اس کے جواب میں قرآن نے تفصیلی استدلال کیا ہے مگر اس کا چیلنج قطعی طور پر مسکت ثابت ہوا کہ انسانوں اور جنوں کی مشترکہ مدد سے تم اس طرح کی کوئی سورۃ یا ایسی چند آیات ہی بنا کر لاؤ۔

ضمناً مزید ایک دعوی یہ بھی سامنے آیا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے' کوئی خاص کارنامہ نہیں ہے' اصل میں پرانے قصے کہانیاں ہیں جن کا مواد کہیں سے جمع کر کے زوردار زبان میں ڈھالا جا رہا ہے' یہ ایک طرح

---

❶ یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ (الحاقہ ۴۱۔ ۴۲)

❷ دیکھو کیسی کیسی حجتیں یہ لوگ تمہارے آگے پیش کر رہے ہیں۔ ایسے بہکے ہیں کہ کوئی ٹھکانے کی بات ان کو نہیں سوجھتی۔ (الفرقان۔ ۹)

❸ ابن ہشام ج ۱ص ۳۱۷

کی افسانہ طرازی ہے اور داستان گوئی ہے اور جس طرح داستان گو محفل پر چھا جاتا ہے اسی طرح محمدؐ چٹ پٹے انداز سے قصے سنا سنا کر داد لے رہا ہے۔ دعوت حق پر "اساطیر الاولین" کی پھبتی کسنے میں یہ طنز بھی شامل تھی کہ "اگلے وقتوں کی ان کہانیوں کے ذریعے آج کے مسائل کی عقدہ کشائی کہاں ہو سکتی ہے' زمانہ کہیں سے کہیں آ پہنچا"۔

کمال یہ ہے کہ ایک طرف یہ الزام دیا جا رہا تھا کہ اسلاف کے سکہ بند دین کے بالمقابل نئی باتیں گھڑی جا رہی ہیں' دوسری طرف بالکل متضاد قسم کا یہ طعنہ کہ گڑے مردے اکھیڑ کر لائے جا رہے ہیں! ہمیشہ غیر مخلص اشرار کا یہی حال رہا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے کبھی ایک پہلو سے آ کر نکتہ چھانٹتے ہیں اور کبھی دوسرے رخ سے یورش کر کے دوسرا برعکس قسم کا اعتراض لا پھینکتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ خود اپنی تردید آپ کر رہے ہیں۔

اسی سلسلے میں ایک محاذ شعراء کا قائم کیا گیا تھا۔ ابو سفیان بن حارث' عمرو بن عاص اور عبداللہ بن زبعریٰ اس مہم پر مامور کئے گئے کہ وہ آنحضورؐ کے خلاف گندی ہجویہ نظمیں کہیں اور ان کو نشر کریں۔ واضح رہے کہ شعراء کا بڑا اثر جاہلی سوسائٹی پر تھا۔ یہ لوگ گویا ذہنی رہنمائی اور تربیت کے منصب پر فائز تھے اور ان کے منہ کا ایک ایک بول دلوں میں گھر کرتا تھا اور اسے یاد کر کے پھیلایا جاتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ شعراء اس دور میں تقریباً آج کے صحافیوں کی پوزیشن میں تھے۔ جس طرح آج ایک ماہر فن صحافی اگر اپنے قلم اور اخبار کی طاقت کے بل پر کسی کے پیچھے پڑ جائے تو اپنے شذرات سے اور فکاہی ہجو نگاری سے اور مراسلات کے کالموں کے غیر شریفانہ استعمال سے' خبروں کا بلیک آؤٹ کرنے' بیانات کی کتربیونت کرنے' گمراہ کن سرخیاں جمانے سے وہ کسی دعوت' جماعت اور تحریک کے لیے بھاری مشکلات پیدا کر سکتا ہے' ٹھیک یہی مقام شعرائے عرب کا تھا' وہاں ایک سے زیادہ شعراء اس کام پر لگا دیئے گئے کہ محمد ﷺ اور آپ کی دعوت و تحریک کو گلی گلی بدنام کرتے پھریں اور مقفیٰ و مسجع گالیاں نشر کریں۔ بالکل یہ سماں تھا کہ جیسے ذہنی و فکری دنیا میں ایک شریف راہ گیر کے پیچھے کتے لگا دیئے گئے ہوں۔ لیکن محسن انسانیتؐ کا پیغام اور کردار بجائے خود شاعروں کے جادو کا کامیاب توڑ تھا۔

واضح رہے کہ یہ ساری مہم کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں بلکہ سوچی سمجھی ہوئی شرارت کے طور پر چلائی جا رہی تھی' انہوں نے مل کر یہ قرار داد طے کی تھی کہ لا تسمعوا لهذا القران و الغوافيه لعلكم تغلبون (حم السجدہ ۲۶) یعنی داعی کی بات سنو ہی نہیں' اس پر غور کرو ہی نہیں۔ کہیں خیالات میں تزلزل نہ آ جائے۔ کہیں ایمان خراب نہ ہو جائے۔ بس ہاؤ ہو کا خوب شور مچا کر اس میں رخنہ اندازی کرو اس میں گڑ بڑ ڈالو اور اسے مذاق پر دھر لو' اس طریقے سے قرآن کا زور ٹوٹ جائے گا۔ اور آخری فتح تمہاری ہو گی۔ اس آیت کے اندر مطالعہ کیجئے حق کی مخالفت کرنے والی طاقتوں کی نفسیات کا۔ وہ بات کو سننے اور سمجھنے سے بے نیاز ہو کر اور دوسروں کو بھی سننے سمجھنے سے روک کر ہنگامہ آرائی کرتی ہیں۔ ایسے ذہنوں سے ہمارے

محسن اور محبوب رہنما کا سابقہ پڑا تھا۔

عاص بن وائل السمی نے آنحضورؐ کی دعوت و تحریک کی تحقیر کرتے ہوئے یہ زہریلے کلمات کہے دعوہ فانما ھو رجل ابتر لا عقب لہ' لومات لا نقطع ذکرہ و استرحتم منہ"۔ یعنی یہ کیا ہے میاں چھوڑو اسے اس کے حال پر' وہ تو ایک لنڈ منڈ آدمی ہے' کوئی اس کے پیچھے رہنے والا نہیں۔ اس کے مرتے ہی اس کی یاد تک فراموش ہو جائے گی اور تم اس کے جھنجھٹ سے نجات پا کر امن چین سے رہنا۔ طعنہ دیا گیا تھا آنحضورؐ کی اولاد نرینہ نہ ہونے پر اور عرب میں فی الواقع یہ طعنہ کچھ معنی رکھتا تھا' مگر عاص جیسوں کی نگاہیں یہ نہیں سمجھ سکتیں کہ انبیاء جیسی تاریخ ساز ہستیوں کی اصل اولاد ان کے عظیم الشان کارنامے ہوتے ہیں' ان کے دماغوں سے نئے ادوار تہذیب جنم لیتے ہیں اور ان کی دعوت و تعلیم کی وراثت سنبھالنے اور ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان کے رفقاء اور پیروکار گروہ در گروہ موجود ہوتے ہیں وہ جس خیر کثیر کو لے کے آتے ہیں اس کی طاقت اور اس کی قدر و قیمت کسی کی نرینہ اولاد کے بڑے سے بڑے لشکر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس طعنہ کے جواب میں سورہ کوثر نازل ہوئی جس میں عاص اور اس کے ہم کیشوں کو بتایا گیا کہ ہم نے اپنے نبیؐ کو "کوثر" عطا کیا ہے' اسے خیر کثیر کا سرچشمہ بنایا ہے' اسے قرآن کی نعمت عظمیٰ دی ہے' اس پر ایمان لانے والوں اور اطاعت کرنے والوں' اس کے کام کو پھیلانے اور جاری رکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت ہے اور اس کے لیے عالم آخرت میں حوض کوثر کا تحفہ مخصوص کر رکھا ہے۔ جس سے ایک بار اگر کسی کو اذن نوش مل گیا تو وہ ابد تک پیاس نہ محسوس کرے گا۔ پھر فرمایا کہ اے نبیؐ ابتر تو ہیں تمہارے دشمن' کہ جن کا باعتبار حقیقت کوئی نام لیوا اور پانی دیوا نہیں ہے اور جن کے مرجانے کے بعد کوئی بھول کے یاد بھی نہ کرے گا کہ فلاں کون تھا اور جن کے لیے تاریخ انسانی کے ایوان میں کوئی جگہ نہیں۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سرگرم ترین' مستہزئین مکہ کی فہرست پیش کر دی جائے۔ بڑے بڑے شدید ترین مخالفین سرداران قریش۔ ابوجہل' ابولہب' اسود بن عبد یغوث (یہ بنی زہرہ میں سے' حضورؐ کا ماموں زاد بھائی تھا)۔ حارث بن قیس بن عدی (جو بنی سہم میں سے تھا اور ابن الغیطلہ کے نام سے مشہور تھا)' ولید بن مغیرہ (بنی مخزوم میں سے)' امیہ بن خلف اور ابی بن خلف (بنی جمح میں سے) ابو قیس بن فاکہ بن مغیرہ (بنی مخزوم میں سے)' عاص بن وائل سہمی (یہ عمرو بن العاص کا باپ تھا)' نضر بن الحارث (بنی عبدالدار میں سے)' منبہ بن الحجاج (بنی سہم میں سے)' زہیر بن ابی امیہ (بنی مخزوم میں سے' یہ ام سلمہؓ کا باپ شریک بھائی تھا)' سائب بن صیفی بن عابد (بنی مخزوم میں سے)' اسود بن عبدالاسد مخزومی' عاص بن سعید بن العاص (بنی امیہ میں سے) ابوالبختری عاص بن ہشام (بنی اسد میں سے)' عتبہ بن ابی معیط (بنی امیہ میں سے)' ابن الاصدی (یا الاصداء) الھذلی' حکم بن ابی العاص (بنی امیہ میں سے' یہ مروان کا باپ تھا)'

عدی بن حمراء الثقفی۔ ❶ یہ لوگ طعن و استہزاء اور دشنام طرازی کے محاذ کے سپہ سالار تھے۔ مخالفین کا دوسرا گروہ۔ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ان کی کارروائیاں اسلام کے خلاف تھیں مگر مقدم الذکر جیسی نہ تھیں۔ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ (بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے) اور ابو سفیان بن حرب (بنی امیہ میں سے) ❷

کٹ حجتیاں:

استہزاء اور تنابز بالالقاب کے ساتھ ساتھ کٹ حجتیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا' جو لوگ آنکھوں دیکھتے ایک امر حق کو نہیں ماننا چاہتے وہ اپنے اور داعی کے درمیان طرح طرح کے نکتے اور لطیفے اور باتوں میں سے باتیں نکال نکال کر ایک سنگین دیوار چنتے رہتے ہیں۔ اس بودی دیوار کا ہر ردہ رکھتے ہی گر جاتا ہے' معاندین کچھ اور اینٹ گارا لاتے ہیں' پھر ساری مزدوری برباد جاتی ہے' پھر وہ اور مسالہ استعمال کرتے ہیں' غرض ان کی ساری عمر اسی کھیل میں گزر جاتی ہے لیکن نہ وہ اپنا کچھ بنا سکتے ہیں نہ دوسروں کی کوئی تعمیری خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ وہ سوال اور اعتراض بالکل اور مزاج کا ہوتا ہے جو اخلاص کی اسپرٹ کے ساتھ ابھرتا ہے اور وہ سوال اور اعتراض بالکل دوسری ساخت رکھتا ہے جو شرارت سے داعی کا راستہ روکنے کے لیے گھڑا جاتا ہے۔ اس دوسری صورت کو کٹ حجتی کہتے ہیں اور کٹ حجتی ہمیشہ بے ایمانی' شرارت اور فتنہ پسندی کی گواہی دیتی ہے۔ کٹ حجتی کرنے والے ذہن کا انداز یہ ہوتا ہے کہ دعوت سے کوئی سبق اخذ نہیں کرنا ہے بلکہ کاوش کر کے کوئی نہ کوئی ٹیڑھ نکالتے رہنا ہے۔ یبغونھا عوجا (ہود۔ ۱۹ و دیگر مقامات) ❸

اسلاف کی سکہ بند مذہبیت کے یہ مخالفین کرام آنحضورؐ سے ایک تو بار بار یہ پوچھتے تھے کہ تم اگر نبی ہو تو آخر کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ تمہارے نبی ہونے کی کوئی واضح نشانی تمہارے ساتھ ہو' کوئی ایسا معجزہ ہو جسے دیکھنے والوں کے لیے نبوت ماننے بغیر چارہ ہی نہ رہے۔ ❹

پھر وہ مسمی صورتیں بنا کر کہتے کہ لو لا انزل علینا الملئکہ او نری ربنا ❺ یعنی لمبے بحث و استدلال کی

---

❶ طبقات ابن سعد بحوالہ سیرت سرور عالم از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۵۱۵ ج ۲

❷ طبقات ابن سعد بحوالہ سیرت سرور عالم از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۵۱۵ ج ۲

❸ ان ظالموں پر جو خدا کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں' اس کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں۔ ترجمہ (ہود ۱۹)

❹ لو لا انزل علیہ ایت من ربہ۔ ترجمہ: یہ لوگ کہتے ہیں کہ "کیوں نہ اتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں اس کے رب کی طرف سے" (العنکبوت ۵۰)

❺ کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے جائیں؟ یا پھر ہم اپنے رب کو دیکھیں۔ (الفرقان ۲۰)

کیا ضرورت' سیدھی طرح آسمان سے فرشتوں کے جھنڈ اتریں' ہمارے سامنے چلتے پھرتے دکھائی دیں' اور خدا تمہارے ذریعے پیغام بھیج کر اپنے آپ کو منوانے کے بجائے خود ہی کیوں نہ ہمارے سامنے آجائے اور ہم دیکھ لیں کہ یہ ہے ہمارا رب۔ جھگڑا ختم ہو جائے۔

پھر وہ یہ کہتے کہ جو کچھ تم پیش کر رہے ہو' یہ اگر واقعی خدا کی طرف سے ہوتا تو چاہیے یہ تھا کہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہمارے دیکھتے دیکھتے آسمان سے اترتی' بلکہ تم خود سیڑھی کے ذریعے کتاب لیے ہوئے اترتے اور ہم سر تسلیم خم کر دیتے کہ تم سچے نبی ہو۔ اسی سلسلے میں ایک سوال یہ بھی اٹھایا جاتا تھا کہ قرآن خطبہ بہ خطبہ اور قطعہ بہ قطعہ کیوں نازل ہوتا ہے۔ سیدھی طرح ایک ہی بار پوری کی پوری کتاب کیوں نہیں نازل ہو جاتی؟ دراصل انہیں یہ صورت بڑی کھلتی تھی کہ جتنے سوال وہ اٹھاتے تھے' جو جو شرارتیں کرتے تھے' جس جس پہلو سے مین میخ نکالتے تھے اس پر وحی کے ذریعے حسب موقع تبصرہ ہوتا' اس کا تجزیہ کیا جاتا' اور پورے زور استدلال سے ان کی مخالفانہ کاوشوں کی جڑیں کھود دی جاتیں۔

پھر وہ یہ کٹ حجتی کرتے کہ تم جو گوشت پوست کے بنے ہوئے ہماری طرح کے ایک آدمی ہو' تمہیں بھوک لگتی ہے' معاش کے در پے ہو' روٹی کھاتے ہو' گلیوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہو' پھٹے حالوں رہتے ہو' تمہارے اوپر طرح طرح کی زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ کیسے یہ بات عقل میں آئے کہ تم اللہ کے پیارے اور اس کے معتمد نمائندے اور دنیا کی اصلاح کے ذمہ دار بنا کر بھیجے گئے ہو۔ تم واقعی اگر ایسے چیدہ روزگار ہوتے تو فرشتے تمہارے آگے آگے ہٹو بچو کی صدا لگاتے' باڈی گارڈ بن کر ساتھ چلتے' جو کوئی گستاخی کرتا لٹھ سے اس کا سر پھوڑ دیتے۔ تمہاری یہ شان اور یہ ٹھاٹھ دیکھ کر ہر آدمی بے چون و چرا مان لیتا کہ اللہ کا پیارا ہے اور نبی ہے۔ اتنا ہی نہیں تمہارے لیے آسمان سے خزانہ اترتا اور اس خزانہ کے بل پر تم شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ عیش کی زندگی گزار رہے ہوتے۔ تمہارے بسنے کے لیے سونے کا ایک محل ہوتا' تمہارے لیے کوئی چشمہ جاری ہوتا' کوئی نہر بہائی جاتی' تمہارے پاس پھلوں کا کوئی اعلیٰ درجے کا باغ ہوتا' آرام سے بیٹھے اس کی کمائی کھاتے۔ اس نقشے کے ساتھ تم نبوت کا دعوی لے کے اٹھتے تو ہم سب بسرو چشم مانتے کہ واقعی یہ کوئی منتخب زمانہ اور مقبول ربانی ہستی ہے۔ برخلاف اس کے حال یہ ہے کہ ہم لوگ کیا مال کے لحاظ سے' کیا اولاد کے لحاظ سے تم سے منزلوں آگے ہیں' اور تمہارا حال جو کچھ ہے وہ سامنے ہے' ایک تم ہی نہیں' تمہارے ارد گرد جو ہستیاں جمع ہوئی ہیں وہ سب ایسے لوگ ہیں جو ہماری سوسائٹی کے سب سے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں' کوتاہ نظر اور کم علم ہیں۔ تم لوگوں کو ہمارے مقابلے میں کوئی بھی توجہ فضیلت حاصل نہیں۔ بتاؤ' اے محمدؐ! کہ ایسی صورت میں کوئی معقول آدمی کیسے تمہیں نبی مان لے!

چنانچہ حال یہ تھا کہ جدھر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوتا۔ پھبتیاں کسی جاتیں کہ اھذا الذی

بعث اللہ رسولا ❶ یعنی انگلیاں اٹھا اٹھا کر اور اشارے کر کر کے غنڈوں کا سا مذاق رکھنے والے اہالیان مکہ کہتے کہ ذرا دیکھنا ان صاحب کو' یہ ہیں جن کو اللہ نے رسول مقرر فرمایا ہے! خدا کو کسی آدم زاد سے رسالت کا کام لینا ہی تھا تو کیا لے دے کے یہی شخص رہ گیا تھا! کیا حسن انتخاب ہے۔ اسی طرح اسلامی تحریک کے علمبرداروں پر بہ حیثیت مجموعی یہ فقرہ چست کیا جاتا تھا کہ آھولاء من اللہ علیھم من بیننا؟ (الانعام۔ ۵۳) کیا یہی ہیں وہ ممتاز ہستیاں جنہیں اللہ نے مراتب خاص سے نوازنے کے لیے ہمارے اندر سے چھانٹ لیا ہے۔

پھر کہا جاتا کہ اے محمدؐ! وہ جس عذاب کی روز روز تم دھمکیاں دیتے ہو۔ اور جس کے ذریعے اپنا اثر جمانا چاہتے ہو' اسے لے کیوں نہیں آتے؟ "مایحبسہ" اسے آخر کس چیز نے روک رکھا ہے؟ چیلنج کر کر کے کہتے کہ فاسقط علینا کسفا من السماء ان کنت من الصدقین (الشعراء۔ ۱۸۷) کیوں نہیں تم آسمان کا کوئی ٹکڑا توڑ گراتے ہم جیسے نافرمان کافروں پر؟ اگر تم سچے ہو تو ہمارا خاتمہ کر ڈالو۔ بطور طنزیہ دعا کرتے کہ اللھم ان کان ھذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء او ائتنا بعذاب الیم ❷

پھر یہ دین اسلاف کے ٹھیکہ دار یہ نکتہ چھانٹتے کہ اے محمدؐ! جب تم بتاتے ہو کہ خدا قادر و صاحب اختیار اور قاہر و جبار ہے تو کیوں نہیں وہ ہم کو اپنی طاقت کے زور سے اس ہدایت کے راستے پر چلاتا کہ جس پر چلنے کے لیے تم ہمیں کہتے ہو۔ وہ ہمیں موحد اور نیک دیکھنا چاہتا ہے تو پھر ہمیں موحد بنا دے اور نیکی پر چلا دے' اس کو کس نے روک رکھا ہے۔ وہ ہمیں بتوں کو نہ پوجنے دے۔ وہ ہمیں بد عقیدہ نہ ہونے دے۔ جب وہ ایسا نہیں کرتا' بلکہ ہمیں محبوب رکھتا ہے اور ہماری موجودہ روش اسے گوارا ہے تو پھر بیچ میں تم کون ہوتے ہو دخل دینے والے۔ بڑی سست گواہ چست والی بات ہے۔

اسی طرح وہ قیامت کا مذاق اڑاتے ---- بڑے ڈرامائی انداز میں دریافت کرتے' کہ ذرا یہ تو فرمایئے کہ یہ حادثہ کب واقعہ ہونے والا ہے؟ متی ھذا الوعد؟" (الملک۔ ۲۵) کچھ اتا پتا دیجئے کہ اس اعلان کو کب پورا ہونا ہے؟ "ایان مرسھا"۔ قیامت کب تک آ پہنچنے والی ہے؟ کیا کوئی تاریخ اور کوئی گھڑی معین نہیں ہوئی؟

ان چند مثالوں سے جن کی تفصیل قرآن و حدیث اور سیرت و تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہے اندازہ کیجئے کہ دنیا کے سب سے بڑے محسن اور انسانیت کے عظیم ترین خیر خواہ کو کیسی فضا سے سابقہ آپڑا تھا۔ نہایت

---

❶ یہ لوگ جو تمہیں دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق بنا لیتے ہیں (کہتے ہیں) کیا یہ شخص ہے جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ (الفرقان ۴۱)

❷ خدایا اگر یہ واقعی حق ہے تیری طرف سے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لے آ۔ (الانفال ۳۲)

گھٹیا مذاق کے لوگ چاروں طرف سے طعنہ آمیز اسلوب کے ساتھ نکتے چھانٹ رہے ہیں۔ مناظرانہ انداز سے سوال گھڑ گھڑ کر ڈال رہے ہیں' اور آنحضورؐ ہیں کہ مین میخ نکالنے والوں کے ہجوم میں نہایت ہی شریفانہ اور مہذب اور ٹھنڈے اور سنجیدہ انداز سے اپنی دعوت پر استدلال کر رہے ہیں' جواباً کوئی مذاق نہیں کرتے' طعنے نہیں دیتے' مناظرانہ رنگ اختیار نہیں کرتے' برافروختہ نہیں ہوتے لیکن ایک لمحے کے لیے استدلال کا محاذ اور دعوت کا میدان چھوڑ کر پیچھے بھی نہیں ہٹتے۔

استہزاء اور نکتہ چینیوں کے اس طوفان سے گزرتے ہوئے آنحضورؐ پر نفسیاتی کرب کے جو لمحے گزرے ہیں اور جس طرح آپ کڑھے اور گھٹے ہیں' ان سارے احوال کا قرآن میں پورا پورا عکس ملتا ہے۔ عالم بالا کی طرف سے یقین دہانی کی جاتی ہے' اللہ تعالیٰ اپنے کلمات سے خود سامان تسکین فرماتا ہے اور ساتھ ساتھ اس مرحلے سے گزرنے کے لیے بار بار ہدایات دی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک جامع ہدایت یہ آئی کہ خذ العفو و امر بالعرف و اعرض عن الجھلین۔ [1] یعنی اعصاب کو جھنجھوڑ دینے والے اور دل و جگر کو چھید ڈالنے والے اس دور کے لیے آنحضورؐ کو تین تقاضوں کا پابند کر دیا گیا۔ ایک یہ کہ بد زبانیوں سے بے نیازی کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ حق بات کہنے کی ذمہ داری ہر حال میں پوری کی جائے گی۔ تیسرے یہ کہ کمینہ اور بد اخلاق اور جہالت زدہ اشخاص کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں!

اور قرآن اور تاریخ دونوں گواہ ہیں کہ آنحضورؐ نے ان ہدایات کی حدود سے بال برابر تجاوز کیے بغیر یہ پورا دور گزار دیا۔ اپنی جان گھلائی اور اپنے سینے میں گھٹن محسوس کی (فلعلک باخع نفسک) [2] لیکن نہ اپنی زبان میں کوئی بگاڑ آنے دیا' نہ اپنے داعیانہ کردار کی بلندی میں فرق آنے دیا' نہ استدلال کی سنجیدگی میں کمی گوارا کی! ---- خدا کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں آپؐ کی روح پر انوار اور آپؐ کے متبعین پر! یوں ان نکتہ چینیوں میں جہاں کہیں کوئی استدلال ----- خواہ وہ تیسرے درجے کا کیوں نہ ہو ---- پایا گیا۔ اس کا آپؐ کی زبان سے وحی الٰہی نے پورا پورا قلع قمع کر کے چھوڑا۔

دلائل:

استہزاء' دشنام طرازیوں اور نکتہ چینیوں کے حملوں کے دوران میں کبھی کبھی قریش کو سوچ بچار سے کوئی عقلی قسم کی دلیل بھی ہاتھ آجاتی تھی۔ مگر ایسے عقلی استدلال کا تناسب پورے ہنگامہ مخالفت میں آٹے میں نمک کا سا تناسب رکھتا تھا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک بات وہ یہ کہتے تھے کہ ہم کب بتوں کو خداوند تعالیٰ کے مقام پر رکھتے ہیں' ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ یہ جن بزرگوں کی ارواح کے مظہر ہیں وہ اللہ کے دربار میں ہمارے لیے سفارش کرنے والے ہیں اور

---

[1] اے نبیؐ' نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو' معروف کی تلقین کیے جاؤ' اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ (الاعراف ۱۹۹)

❷ سورہ ۱۲۔ الکہف ۲
ان بتوں کے آگے سجدہ و قربانی کر کے ہم صرف اللہ کے حضور تقرب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح ایک بات وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارے نزدیک زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ہے کوئی اور عالم پیش آنے والا نہیں ہے اور نہ ہمیں دوبارہ زندہ کیا جانے والا ہے' پھر آخر ہم ایک ایسے دین کو کیونکر تسلیم کریں جو کسی دوسری دنیا کا تصور دلا کر اس دنیا کے مفاد اور اس کی دلچسپیوں سے ہمیں محروم کرنا چاہتا ہے۔

اسی طرح ایک بات وہ یہ کہتے تھے کہ اگر ہم دعوت محمدؐ کو مان لیں اور موجودہ مذہبی و معاشرتی نظام کو ٹوٹ جانے دیں اور اپنے قائم شدہ تسلط کو اٹھالیں تو پھر تو ہم میں سے ایک ایک شخص کو دن دہاڑے چن چن کر اچک لیا جائے گا نتخطف من ارضنا۔ ❶

یہ دو تین مثالیں اس امر واقعہ کو عرض کرنے کے لیے مجملاً لے لی گئی ہیں' کہ شرارتوں اور خباثتوں کے بیچ بیچ میں وہ کچھ نہ کچھ دلیل بازی بھی کرتے جاتے تھے لیکن اس دلیل بازی کا تار تار قرآن الگ کر کے دکھا دیتا تھا اور اس کی ہر موقع پر دھجیاں اڑتی رہتی تھیں۔

غنڈہ گردی:

استہزاء' القاب طرازی اور گالم گلوچ کی یہ مہم قریش کے جنون' مخالفت کے تیز ہونے کے ساتھ ساتھ غنڈہ گردی کا رنگ اختیار کرتی چلی جا رہی تھی۔ منفی شرارت کے علمبردار جب تضحیک و دشنام کو ناکام ہوتے دیکھتے ہیں تو پھر ان کا اگلا قدم ہمیشہ غنڈہ گردی ہوتا ہے۔ مکہ والوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے وہ کمینہ حرکتیں کی ہیں کہ صاحب رسالتؐ کے علاوہ کوئی اور داعی ہوتا تو بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے باوجود اس کی ہمت ٹوٹ جاتی اور وہ قوم سے مایوس ہو کر بیٹھ جاتا۔ لیکن رسولؐ خدا کی شرافت اور سنجیدگی' غنڈہ گردی کے چڑھے ہوئے دریا میں سے بھی پاکئی دامن کو کنول کی طرح صحیح سلامت لیے آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ حرکات جو بالکل روز مرہ کا معمول بن گئیں' یہ تھیں کہ آپؐ کے محلہ دار پڑوسی جو بڑے بڑے سردار تھے بڑے اہتمام سے آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے۔ نماز پڑھتے وقت شور مچاتے اور ہنسی اڑاتے' عین حالت سجدہ میں اوجھڑیاں لا کے ڈالتے' چادر کو لپیٹ لپیٹ کر گلا گھونٹتے' محلے کے لونڈوں کو پیچھے لگا دیتے کہ تالیاں پیٹیں اور غوغا کریں۔ قرآن پڑھنے کی حالت میں آپؐ کو' قرآن کو اور خدا تعالیٰ کو گالیاں دیتے۔

---

❶ وہ کہتے ہیں اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے۔ (القصص ۵۷)

اس معاملے میں ابولہب کے ساتھ ساتھ ابولہب کی بیوی بہت پیش پیش تھی۔ وہ بلاناغہ کئی سال تک آپؐ کے راستے میں غلاظت اور کوڑا کرکٹ اور کانٹے جمع کر کر کے ڈالا کرتی تھی اور آنحضورؐ روزانہ بڑی محنت سے راستہ صاف کرتے۔ آپؐ کو اس کیفیت نے اس درجہ پریشان رکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی تسکین کے لیے یہ خوشخبری سنائی کہ مخالف محاذ کی اس لیڈرہ کے شوہر نامدار کے ایذا رساں ہاتھ ٹوٹ جانے والے ہیں اور خود یہ بیگم صاحبہ بھی دوزخ کے حوالے ہونے والی ہیں۔

ایک مرتبہ حرم میں خدا کا رسولؐ مصروف نماز تھا کہ عقبہ بن ابی معیط نے چادر آپؐ کے گلے میں ڈالی اور اسے خوب مروڑ کر گلا گھونٹا۔ یہاں تک کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے‘[1] اسی شخص نے ایک مرتبہ حالت نماز میں آپؐ پر اوجھ بھی ڈالی تھی۔

ایک مرتبہ آپؐ راستہ چلتے جا رہے تھے کہ کسی شقی نے سر پر مٹی ڈال دی‘ اسی حالت میں یہ مجسمہ صبر و استقامت چپ چاپ گھر پہنچا۔ معصوم بچی فاطمہؓ نے دیکھا تو آپؐ کا سر دھوتی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ مارے غم کے روتی جاتی تھیں۔ آپؐ نے اس ننھی سی جان کو تسلی دی کہ جان پدر! روؤ نہیں‘ خدا تیرے باپ کو بچائے گا"[2]

ایک اور مرتبہ آپؐ حرم میں مصروف نماز تھے کہ ابو جہل اور چند اور روسائے قریش کو توجہ ہوئی۔ ابوجہل کہنے لگا: "کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا‘ تاکہ جب محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) سجدہ میں جاتا تو اس کی گردن پر ڈال دیتا"۔ عقبہ نے کہا کہ یہ خدمت انجام دینے کے لیے بندہ حاضر ہے۔ اوجھ لائی گئی۔ ان بزرگوں کے ذوق خندہ گردی نے واقعی اسے آپؐ کے اوپر حالت سجدہ میں ڈال کر دم لیا۔ اب ٹھٹھے مار مار کر ہنسی اڑائی جا رہی تھی۔ حضرت فاطمہؓ کو اطلاع ہوئی تو آپ دوڑی آئیں اور پاکباز باپ کی معصوم بچی نے وہ سارا بار غلاظت آپؐ کے اوپر سے ہٹایا ساتھ ساتھ عقبہ کو بد دعائیں بھی دیتی جاتی تھیں۔[3]

یہ تھا جواب اس خیر خواہانہ نصیحت کا کہ ایک خدا کو مانو‘ راستی اور انصاف پر چلو‘ یتیموں اور مسافروں کی سرپرستی کرو!

کانٹے بچھا کر چاہا گیا کہ تحریک حق کا راستہ رک جائے!

گندگی پھینک کر کوشش کی گئی کہ توحید اور حسن اخلاق کے پیغام کی پاکیزگی کو ختم کر دیا جائے۔ آنحضورؐ کو بوجھ تلے دبا کر یہ توقع کی گئی کہ بس اب سچائی سر نہ اٹھا سکے گی۔ آپؐ کا گلا گھونٹ کر یہ خیال کیا گیا کہ

---

[1] سیرت النبیؐ علامہ شبلی جلد ۱ ص ۲۴۲

[2] ایضاً

[3] ایضاً صفحہ ۱۸۶

بس اب وحی الٰہی کی آواز بند ہو جائے گی۔ کانٹوں سے جس کی تواضع کی گئی وہ برابر پھول برساتا رہا! گندگی جس کے اوپر اچھالی گئی وہ معاشرے پر مسلسل مشک و عنبر چھڑکتا رہا! جس پر بوجھ ڈالے گئے وہ انسانیت کے کندھے سے باطل کے بوجھ متواتر اتارتا رہا۔ جس کی گردن گھونٹی گئی' وہ تہذیب کی گردن کو رسمیات کے پھندوں سے نجات دلانے میں مصروف رہا۔

غنڈہ گردی ایک ثانیہ کے لیے بھی ٹھوس شرافت کا راستہ نہ روک سکی! ...... اور شرافت اگر واقعہ میں ٹھوس اور عزیمت مند ہو تو تاریخ انسانی کے اٹل قوانین مقابلے میں آنے والی شدید سے شدید غنڈہ گردی کا سر نیہوڑا دیتے ہیں۔

حمایتیوں کو توڑنے کی کوششیں:

دعوت حق کے مخالفین جب پانی سر سے گزرتا دیکھتے ہیں تو ایک مہم یہ شروع کرتے ہیں کہ تحریک یا اس کے قائد اور علمبرداروں کو سوسائٹی میں ہر قسم کی موثر حمایت و ہمدردی سے محروم کرا دیا جائے۔ براہ راست اثر نہ ڈالا جا سکے تو بالواسطہ طریق سے دباؤ ڈال کر تبدیلی کے سپاہیوں کو بے بس کر دیا جائے۔

اہل مکہ آنحضورؐ پر ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے' لیکن ڈرتے اس بات سے تھے کہ قبائلی عصبیت کے تحت خونریزی کی ایسی آگ بھڑک اٹھے گی کہ کسی کے روکے نہ رک سکے گی اور ماضی قریب میں ایک ہمہ گیر جنگ ان کو ایسا جھنجوڑ چکی تھی کہ وہ ایسی ایک اور جنگ کے لیے تیار نہ تھے۔ بیچ میں ایک پیچ اور بھی آپڑا تھا۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان پرانی رقابت تھی۔ بنو امیہ کے سردار ہرگز اس کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ بنو ہاشم کے گھرانے کے ایک شخص کی نبوت چلے اور اس طرح ان کا سکہ رواں ہو جائے۔ چنانچہ بنو ہاشم نے ایک دوبار یہ ارادہ کیا بھی کہ محمدؐ ہمارے ہیں اور ان کی بڑائی اور ان کے دین کا فروغ ہمارے ہی لیے موجب خیر و برکت ہو گا۔ لہٰذا کیوں نہ ہم کھل کر ساتھ دیں مگر بنو امیہ کے لیڈروں نے ان کو اس ارادے سے ہمیشہ باز رکھنے پر زور صرف کیا۔ بنو ہاشم مثبت طور پر تو کچھ نہ کر سکے' لیکن ان کے ایک فرد پر ہاتھ اٹھانا بہرحال سہل نہ تھا' تاوقتیکہ وہ اس کو اپنے دائرہ سے نکال نہ دیں۔ ادھر داعی حق اپنے چچا ابوطالب کی سرپرستی میں تھا اور یہ سرپرستی جب تک قائم تھی گویا پورے ہاشمی قبیلہ کی عصبیت آنحضورؐ کے ساتھ تھی۔ مخالفین دعوت نے اب پورا زور اس بات پر صرف کر دیا کہ کسی طرح ابوطالب پر دباؤ ڈال کر آنحضورؐ کو اس کی سرپرستی سے محروم کر دیا جائے' دباؤ ڈالنے کا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ مگر مخالفین کو ہر بار ناکامی ہوئی۔ صرف ایک ابولہب ایسا سنگدل تھا کہ وہ بغض و عناد کی آگ بھڑکاتا رہا۔

ربیعہ کے دونوں بیٹے عتبہ اور شیبہ' ابوسفیان بن حرب' ابوالبختری' اسود بن عبدالمطلب' ابوجہل' ولید بن المغیرہ' حجاج بن عامر کے دونوں بیٹے نبیہ اور منبہ اور عاص بن وائل جیسے اکابرین کا ایک زوردار وفد آنحضورؐ کے چچا کے پاس پہنچتا ہے۔ یہ لوگ اپنا مدعا یوں بیان کرتے ....

ہیں:❶

"اے ابو طالب! تیرا بھتیجا ہمارے خداوندوں اور ٹھاکروں کو گالیاں دیتا ہے' ہمارے مذہب میں عیب چھانٹتا ہے' ہمارے بزرگوں کو احمق کہتا ہے اور ہمارے اسلاف کو گمراہ شمار کرتا ہے' اب یا تو تم اس کو ہمارے خلاف ایسی زیادتیاں کرنے سے روکو' یا ہمارے اور اس کے درمیان سے تم نکل جاؤ۔ کیونکہ تم بھی (عقیدہ و مسلک کے لحاظ سے) ہماری طرح اس کے خلاف ہو۔ اس کی جگہ ہم تمہارے لیے کافی ہوں گے"۔

ابو طالب نے ساری گفتگو ٹھنڈے دل سے سنی اور نرمی سے سمجھا بجھا کر معاملہ ٹال دیا اور وفد کو رخصت کر دیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ و سلم بدستور اپنے مشن کی خدمت میں لگے رہے اور قریش پیچ و تاب کھاتے رہے! اہل وفد کی اس تقریر کو غور سے پڑھیئے اس میں بڑی گہری جذباتیت پائی جاتی ہے۔ اس میں بڑی زور دار اپیل ہے اور خاص بات یہ کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ مخالفین حق نے عوامی ماحول میں اشتعال پیدا کرنے کا خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ ایسے نعرے اور الزامات بہم پہنچا لیے تھے کہ جنہیں سنتے ہی عام لوگ آپے سے باہر ہو جائیں اور رسولؐ اللہ کے خلاف ایک حالت اشتعال میں مبتلا ہو جائیں۔ تاریخ مذہبیات میں جب کبھی حق کے خلاف محاذ کھڑا کیا گیا ہے تو لوگوں میں اشتعال پیدا کرنے کے لیے چند مغالطہ آمیز تاثرات ان کو ضرور دیئے گئے ہیں۔

ایک یہ کہ تمہاری عقیدتوں کو مجروح کیا جا رہا ہے اور تمہارے محبوبوں کو گالیاں دی جا رہی ہیں۔

دوسرے یہ کہ قدیمی اور آبائی مذہبیت میں نقائص چھانٹے جا رہے ہیں۔

تیسرے یہ کہ بزرگوں اور اسلاف کی توہین کی جا رہی ہے۔

اشتعال پیدا کرنے کے یہ حربے تھے جن کو مکہ کے کفار و مشرکین میدان میں لا چکے تھے۔ آنحضورؐ کے الہامی پیغام میں اگرچہ کبھی معبودان قریش کو گالی نہیں دی گئی' لیکن ان کو معبود بنانے کے خلاف جو کچھ استدلال کیا گیا وہ پروپیگنڈے کے رنگ میں رنگ کر گالیوں کا عنوان قرار دیا گیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ و سلم نے قوم کے سامنے ان بزرگوں اور اسلاف کی توہین نہیں کی۔ صرف یہ کہا کہ کسی چیز کو محض اس بنا پر سینے سے لگائے رکھنا کہ وہ پہلے سے چلی آ رہی ہے کوئی معقول روش نہیں ہے' لیکن بدگمانی کے تیزاب میں غوطہ کھا کر یہ چیز توہین اسلاف کے نعرے میں ڈھل گئی۔ اسی طرح آنحضورؐ نے توحید کی صداقت اور شرک کے بطلان میں جو جو کچھ استدلال کیا۔ اور مخالفین ہی کی طرف سے سوالات و جوابات اٹھائے جانے پر مروجہ مذہبیت کے بارے میں جو جو تبصرہ کیا وہ قدیمی مذہبیت میں عیب چھانٹنے کے الزام کی بنیاد بنا۔

لیجئے' ایک اور وفد آتا ہے۔ پھر وہی رونا رویا جاتا ہے۔

---

❶ ابن ہشام' جلد ۱ ص ۲۴۷

"اے ابو طالب! تم ہمارے درمیان عمر' شرف اور قدر و قیمت کے لحاظ سے ایک بڑا درجہ رکھتے ہو۔ ہم نے مطالبہ کیا تھا کہ اپنے بھتیجے سے ہمیں بچاؤ لیکن تم نے یہ نہیں کیا۔ اور خدا کی قسم' جس طرح ہمارے باپ دادا کو گالیاں دی جا رہی ہیں' جس طرح ہمارے بزرگوں کو احمق قرار دیا جا رہا ہے اور جس طرح ہمارے معبودوں پر حرف گیری کی جا رہی ہے' اسے ہم برداشت نہیں کر سکتے ----- الا آنکہ تم اسے باز رکھو یا پھر ہم اس سے بھی اور تم سے بھی لڑیں گے۔ یہاں تک کہ ایک فریق کا خاتمہ ہو جائے۔" [1]

ابو طالب نے آنحضورؐ کو بلایا اور سارا ماجرا بیان کیا۔ پھر لجاجت سے کہا کہ بھتیجے! مجھ پر ایسا بوجھ نہ ڈالو جس کا اٹھانا میرے بس سے باہر ہو۔ اب ایسی صورت آگئی تھی' کہ پاؤں جمانے کیلئے سہارے کا جو ایک پتھر حاصل تھا وہ بھی متزلزل ہوا جاتا تھا۔ بظاہر تحریک کے لیے انتہائی خطرناک لمحہ آگیا تھا' لیکن دوسری طرف دیکھئے اس جذبہ صادقہ اور اس عزیمت مجاہدانہ کو کہ جس سے سرشار ہو کر آنحضورؐ یہ جواب دیتے ہیں:۔

"چچا جان! خدا کی قسم۔ یہ لوگ اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ کر چاہیں کہ اس مشن کو چھوڑ دوں' تو میں اس سے باز نہیں آ سکتا۔ یہاں تک کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس مشن کو غالب کر دے یا میں اسی جد و جہد میں ختم ہو جاؤں"۔ [2]

یہاں وہ اصلی طاقت بول رہی ہے جو تاریخ کو الٹ پلٹ کے رکھ دیتی ہے اور مزاحمتوں اور شرارتوں کو کچلتی ہوئی اپنے نصب العین تک جا پہنچتی ہے' افسوس کہ قریش اسی طاقت کا راز نہ پا سکے! ابو طالب اسی طاقت کی سحر آفرینی سے متاثر ہو کر کہتے ہیں کہ "بھتیجے! جاؤ جو کچھ تمہیں پسند ہے اس کی دعوت دو' میں کسی چیز کی وجہ سے تم کو نہیں چھوڑوں گا"۔

ایک اور وفد عمارہ بن ولید کو ساتھ لے کر پھر آتا ہے۔ اب کے یہ لوگ ایک اور ہی منصوبے کے ساتھ آتے ہیں۔ ابو طالب سے کہتے ہیں کہ دیکھئے یہ عمارہ بن ولید ہے جو قریش میں سے ایک مضبوط اور خوبصورت ترین جوان ہے' اسے لے لیجئے۔ اس کی عقل اور اس کی طاقت آپ کے کام آئے گی اسے اپنا بیٹا بنا لیجئے اور اس کے عوض میں محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دیجئے۔ جس نے کہ آپ کے اور آپ کے آباؤ اجداد کے دین کی مخالفت شروع کر رکھی ہے۔ اور آپ کی قوم کا شیرازہ درہم برہم کر دیا ہے۔ اور ان کے بزرگوں کو احمق ٹھہرایا ہے اسے ہم قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ سیدھا سیدھا ایک آدمی کے بدلے میں ہم ایک آدمی آپ کو دیتے ہیں۔ [3]

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۰۸

[2] ایضاً ص ۲۷۸

[3] ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۷۹

دیکھئے ذرا ان لوگوں کا طرز فکر! گویا محمدؐ جیسی عظیم ہستی کوئی مال تجارت بنا رکھی تھی' کوئی جنس تبادلہ تھی اور ابو طالب آپؐ کے چچا نہ تھے کوئی سوداگر تھے۔ وفد کی گفتگو سن کر یقیناً ابو طالب کے جذبات پر بڑی چوٹ لگی اور کہا کہ تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ تمہارے بیٹے کو تو میں لے کر پالوں پوسوں اور میرے بیٹے کو تم لے جا کر تلوار کے نیچے سے گزار دو۔ ابد تک ایسا نہیں ہو سکتا۔ معاملہ بڑھ گیا۔ کشمکش کی فضا گرم تر ہو گئی اور خود وفد کے اتفاق رائے کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

اب قریش نے آنحضور صلی اللہ علیہ و سلم کے رفقاء پر سختیاں کرنے کے لیے ان تمام قبائل کو اکسانا شروع کیا جن میں تحریک اسلامی کا کوئی فرد پایا جاتا تھا۔ ظلم ڈھائے جانے لگے' اسلام سے ہٹانے کے لیے استبداد سے کام لیا جانے لگا۔ لیکن اللہ نے اپنے رسولؐ کو ابو طالب کی آڑ کھڑی کر کے بچا رکھا تھا۔ ابو طالب نے قریش کے بگڑے تیور دیکھ کر بنو ہاشم اور بنو مطلب کے سامنے آنحضورؐ کی پشت پناہی کے لیے اپیل کی۔ لوگ جمع ہوئے اور حمایت محمدؐ کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر ابولہب نے سخت مخالفت کی اور بات طے نہ ہو سکی۔

آگے چل کے جب تحریک حق نے مخالفین کی صفوں میں سے حمزہؓ اور عمرؓ جیسی دو ہستیاں چن لیں تو پیچ و تاب کی نئی لہر اٹھی۔ محسوس کیا گیا کہ محمدؐ کی چلائی ہوئی ہوا تو اب گھر گھر میں شکست پاش ہو رہی ہے' کچھ کرنا چاہیے۔ ابو طالب کی بیماری کی حالت میں یہ لوگ پھر پہنچے۔ اب کی اسکیم یہ تھی کہ معاہدہ ہو جائے۔ وفد نے کہا کہ "جو کچھ صورت حالات ہے اسے آپ جانتے ہیں' اپنے بھتیجے کو بلوایئے' اس کے بارے میں ہم سے عہد لیجیے اور ہمارے بارے میں اس کا عہد دلوایئے۔ وہ ہم سے باز رہے ہم اس سے باز رہیں۔ وہ ہم سے اور ہمارے مذہب سے واسطہ نہ رکھے' ہم اس سے اور اس کے مذہب سے واسطہ نہیں رکھیں گے"۔ رسولؐ پاک بلوائے جاتے ہیں' بات ہوتی ہے اور آپؐ سارا مطالبہ سننے کے بعد جواب دیتے ہیں' "کلمتہ واحدہ تعطونیھا تملکون بھا العرب' و تدین لکم بھا العجم" [1] یعنی اے اشراف قریش میرے اس ایک کلمہ کو مان لو تو پھر عرب و عجم سب تمہارے زیر نگیں ہوں گے۔

ذرا تصور میں لایئے! جان لیوا ماحول کو' کلبلاتی ہوئی شرارتوں اور مخالفتوں سے بھری ہوی فضا کو' اور پھر سوچئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ و سلم کو اپنی دعوت کے زور اور اس کے ممکنات کا کتنا گہرا شعور و یقین تھا' گویا اندھیری رات میں کھڑے آپؐ قطعیت سے فرما رہے تھے کہ ابھی سورج نکلنے والا ہے۔ پھر یہ نوٹ کیجئے کہ اپنے کلمہ کا صرف مذہبی نہیں بلکہ سیاسی و اجتماعی پہلو بھی آپؐ کے سامنے تھے۔

ابو جہل نے تنک کر کہا۔ "ہاں! تیرے باپ کی قسم! ایک کیوں' دس کلمے چلیں گے"!

کوئی دوسرا بولا: یہ شخص تو خدا کی قسم تمہاری مرضی کی کوئی بات مان کر دینے کا نہیں............

---

[1] ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۷-۲۹

ہے۔ ❶

اس کے بعد یہ لوگ مایوس ہو کر چلے گئے۔ لیکن اس وفد کی گفتگو نے چند حقیقتوں کو نمایاں کر دیا۔ ایک یہ کہ اب تحریک اسلامی کو وہ ایک ایسی طاقت ماننے پر مجبور ہو گئے تھے جس کو اکھیڑنے کی سعی رائیگاں سے زیادہ بہتر سمجھوتہ کی کوئی راہ نکالنا تھا' دوسرے یہ کہ قریش ساری شرارتوں اور زیادتیوں کو آزمانے کے بعد اب اپنی بے بسی کو محسوس کر رہے تھے۔

یہ تو وہ معاملہ تھا جو داعی تحریک صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھا۔ آپؐ کے رفقاء میں سے بھی جو کوئی کسی کے سایہ حمایت میں تھا' اسے بھی اس حمایت سے محروم کرانے کی مساعی اسی طرح کی گئیں۔

مثلاً حضرت ابو سلمہ بھی ابو طالب کی امان میں تھے۔ بنو مخزوم کے لوگ آئے اور انہوں نے کہا۔ "اے ابو طالب! تم نے بھتیجے کو تو خیر ہمارے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اب تو معاملہ خود ہمارے اپنے آدمی کا ہے اس کو روکنے کا تمہیں کیا حق ہے؟ ابو طالب کہنے لگے کہ وہ میرا بھانجا ہے اور اس نے میری حمایت طلب کی ہے۔ تم اس پر زیادتی کرتے ہو اور ظلم ڈھانے سے کسی لمحے باز نہیں آتے' خدا کی قسم' یا تو تم لوگ اس سے باز رہو ورنہ جہاں یہ کھڑا ہو گا ہم اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اسی طرح ہجرت حبشہ کے بعد ایک بار حضرت ابو بکرؓ مکہ کی گھٹن سے تنگ آکر نکل کھڑے ہوئے' کچھ دور پہنچے تھے کہ ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی' پوچھنے پر اسے جب آپ کے ارادہ ہجرت کا حال معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ آپ جیسے آدمی کا یوں نکل جانا مجھے گوارا نہیں جو مصیبتوں میں قرابت داروں کے کام آتا ہے' بھوکوں کو کھانا اور ننگوں کو لباس بہم پہنچاتا ہے' نیک کام کرتا ہے اور دوسروں کو کما کر دیتا ہے' اپنی امان میں وہ حضرت صدیقؓ کو واپس لے آیا۔ اور قریش کے سامنے اعلان کر دیا' کہ ابو بکرؓ میری حفاظت میں ہیں۔ آپ کا معمول ہو گیا کہ اپنی مسجد میں جو گھر کے دروازے کے سامنے بنا رکھی تھی بڑی خوش الحانی سے قرآن پڑھا کرتے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے' اس سے ہر سننے والے پر اثر پڑتا تھا۔ قریش ابن الدغنہ کے پاس پہنچے اور فریاد کی کہ تم نے ابو بکرؓ کو پناہ کیا دی' ہماری تو شامت آگئی ہے' وہ خوش الحانی سے قرآن پڑھتے ہیں اور ہماری عورتیں اور بچے اور کمزور طبیعت کے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ تم پناہ اٹھا لو تو وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر جو چاہیں کریں۔ ابن الدغنہ نے اس دباؤ کے زیر اثر آپ سے آکر گلہ کیا کہ میں نے پناہ اس لیے تو نہیں دی تھی کہ آپ لوگوں کو ستائیں۔ آپ نے پناہ واپس کر دی۔ ❷

---

❶ حضورؐ کے اس ارشاد کو مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو سیرت سرور عالم از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ج ۲ ص ۵۲۵۔

❷ ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۹۶۔ ۳۹۵

منظم منفی محاذ:

انسان اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) اولاد آدم کی جس سب سے بڑی خدمت میں مصروف تھا' اس کو ناکام بنانے کے لیے مخالفین جن مختلف تدبیروں سے کام لے رہے تھے ان سب کے علی الرغم دعوت کا کام جاری تھا' اور کلمہ حق کونپلیں نکال رہا تھا۔ اندریں حالات مخالفانہ پروپیگنڈہ کی ایک متحرک مشینری پیدا کی گئی۔ مکہ کے بعض قائدین اعلیٰ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے لگے۔ بڑی پیچیدگی یہ تھی کہ مکہ مرکز عرب تھا اور ہر طرف سے قافلے آتے جاتے اور داعی حق کے لیے کام کا نت نیا میدان فراہم کرتے۔ سرداران مکہ کی جو دھونس خود باشندگان مکہ پر چلتی تھی وہ باہر سے آنے والوں پر نہیں چل سکتی تھی۔ نیز نو واردوں میں ایسے ذہین اور صاف فطرت لوگ بھی ہوتے تھے جو کسی دعوت کو محض اس کی استدلالی قدر و قیمت اور کسی داعی کو محض اس کے کرداری وزن کے لحاظ سے جانچ کر بغیر کسی تعصب اور بغیر کسی تاریخی عناد کی پرچھائیں قبول کیے آزادانہ رائے قائم کر سکتے تھے۔ تحریک محمدیؐ کے خلاف ان کے دلوں میں کوئی حاسدانہ چھالے موجود نہیں تھے۔ اندریں حالات مکہ کو بچالینا بالکل بے کار تھا۔ جب کہ باہر کا عربی ماحول دعوت حق سے متاثر ہوتا چلا جائے۔ وہی بات جسے قرآن نے خود ہی کہہ دیا کہ نحن ناتی الارض ننقصہا من اطرافھا[1] چنانچہ سب سے تشویش ناک موقع اس پہلو کے لحاظ سے حج کا تھا۔ قبائل عرب جوق در جوق مع اپنے سرداروں کے مکہ میں اکٹھے ہوتے اور نبی اکرمؐ اپنا پیغام پھیلانے کے لیے خیمہ بہ خیمہ گردش میں مصروف ہو جاتے۔ رد عملی منفی ہنگامہ کے سربراہ کار اس وقت بہت سٹپٹاتے۔ چنانچہ ایک سال موسم حج کی آمد آمد تھی کہ ولید بن مغیرہ کے ہاں قریشان کرام جمع ہوئے اور سر جوڑ کر سوچ بچار میں مصروف ہو گئے۔ ولید نے معاملہ کو یوں چھیڑا:

> "اے گروہ قریش! یہ موسم آپہنچا ہے' عرب کے وفود اس زمانے میں تمہارے ہاں آئیں گے' اور صورت حالات یہ ہے کہ وہ سب تمہارے اس آدمی (نبی اکرمؐ) کا قصہ سن چکے ہیں (اس لیے وہ ایک ذوق تجسس و تحقیق لے کر آئیں گے) سو اب تم اس معاملہ میں کوئی ایک بات طے کر لو' اور پھر باہم اختلاف نہ کرو کہ ایک دوسرے کو جھٹلاتا پھرے اور دوسرا پہلے کی بات کاٹتا رہے"۔[2]

حاضرین نے کہا:

"تم ہی کہو اے ابو عبد شمس! کہو اور ہمارے لیے کوئی رائے متعین کر دو۔ ہم اسی کے مطابق بات

---

[1] مگر کیا انہیں نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کو مختلف سمتوں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں۔ ترجمہ آیت (الانبیاء ۴۴)

[2] ابن ہشام جلد ا ص ۲۸۳

کریں گے"۔

مگر ولید بن مغیرہ نے اصرار کیا کہ آپ لوگ خود ہی بات کریں میں سنوں گا۔ سو سلسلہ گفتگو چل پڑا۔

حاضرین:۔ "ہم تو کہتے ہیں کہ وہ (محمد صلی اللہ علیہ و سلم) کاہن ہے"!

ولید:۔ "نہیں خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ سو اس کے ہاں نہ تو کاہنوں کا سا رمزیہ کلام ہے نہ قافیہ آرائی"۔

حاضرین:۔ "تو پھر ہم کہیں گے کہ وہ آسیب زدہ ہے"۔

ولید:۔ وہ آسیب زدہ بھی نہیں ہے' ہم آسیب کو جانتے پہچانتے ہیں مگر یہاں نہ تو اس طرح سے حلق کی گھٹن ہے' نہ اعضا میں رعشہ' نہ ویسی پریشان خیالی"!

حاضرین:۔ "اچھا تو پھر ہم یہ کہیں گے کہ وہ شاعر ہے"۔

ولید:۔ "وہ شاعر بھی تو نہیں ہے! ہم شعر کو اس کی ہر قسم کے لحاظ سے جانتے ہیں --- اس میں سے رجز کو' ہزج کو' قریض کو' مقبوض کو' مبسوط کو (بحروں کے لحاظ سے اقسام شعر) سو وہ (صلی اللہ علیہ و سلم) شاعر نہیں ہے"۔

حاضرین:۔ تو پھر ہم کہتے ہیں کہ وہ جادوگر ہے"۔

ولید:۔ "جی نہیں' وہ جادوگر بھی نہیں! ہم نے جادوگروں کو بھی اور ان کے جادو کو بھی دیکھ رکھا ہے۔ سو اس (صلی اللہ علیہ و سلم) کے ہاں نہ گنڈے ہیں نہ پھونکیں"!

حاضرین: "تو پھر' ابو عبد شمس! تمہی بتاؤ کہ ہم اس کے خلاف (پروپیگنڈہ کا طوفان اٹھانے کے لیے) کہیں کیا؟"

ولید:۔ "خدا کی قسم! اس کی بات میں بڑی مٹھاس ہے۔ اور اس بات کی جڑ بڑا پھیلاؤ رکھتی ہے اس کی شاخیں بار دار ہیں"۔ مستدرک کی روایت میں اتنا اور آتا ہے کہ "یہ پیغام غالب ہو گا۔ اسے مغلوب نہیں کیا جا سکے گا۔ اور یہ سب کو کچل ڈالے گا"۔ [1] اپنی کہی ہوئی باتوں میں سے تم جو بھی کہو گے لایعنی قرار دی جائے گی۔ بس اس کے بارے میں ان میں سے لگتی ہوئی بات ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ تم کہو کہ یہ ایک جادوگر ہے جس کا کلام جادو ہے اور اس سے بیٹے اور باپ میں' شوہر اور بیوی میں' بھائی اور بھائی میں' ایک شخص اور اس کے قبیلے میں جدائی ڈالی جا رہی ہے (اشارہ ہے دعوت حق کی طرف کہ اس کی وجہ سے ہر طرف پھوٹ پڑ گئی ہے۔ اور دو طاقتیں بر سر کشمکش ہیں' حالانکہ اس کشمکش کا اصل محرک خود مخالفین حق کی شرارت تھی) اور کہو کہ لوگ اسی بنا پر اس سے کٹ گئے ہیں۔ [2]

---

[1] سیرت المصطفیٰ از مولانا ادریس کاندھلوی جلد ۱ ص ۱۵۲

[2] سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۸۴ ۔ ۲۸۳

دیکھیے کہ کس طرح ایک شخص کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کے لیے سازش کی جاتی ہے۔ دل جس بات کو نہیں مانتے' اسی کو لے کر مخالفانہ ہنگامہ جاری رکھنے کی اسکیم بنتی ہے۔ چنانچہ اس مجلس میں طے ہو گیا کہ مختلف پارٹیاں مکہ کو آنے والے راستوں پر چوکیاں لگادیں۔ اور آنے والے ہر وفد کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپؐ کی دعوت کے بارے میں چوکنا کر دیں۔ چنانچہ اسی منصوبہ پر عمل کیا گیا' لیکن نتیجہ الٹا ہوا۔ آنحضورؐ کا چرچا عرب کے کونے کونے تک پھیل گیا اور جن کو کچھ نہیں معلوم تھا ان کو بھی معلوم ہو گیا کہ ایک نئی دعوت ایسی اٹھی ہے اور اس کی علمبردار شخصیت محمدؐ کی ہے۔

آیئے' ذرا تاریخ کے اسکرین پر داعی حق اور ردعملی تحریک کے لیڈروں کو میدان میں کام کرتے ہوئے دیکھیے!

ربیعہ بن عباد کا بیان ہے کہ "میں منیٰ میں اپنے باپ کے ساتھ موجود تھا جب کہ میں ایک نوخیز لڑکا تھا۔ اور دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی قبیلوں کی اقامت گاہوں میں جا جا کر رکتے اور فرماتے' "اے بنی فلاں! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ تم سے کہتا ہوں کہ اللہ کی عبادت کرو۔ اور اس کے ساتھ اور کسی کو شریک نہ گردانو' اور اس کے علاوہ ان بتوں میں سے جس جس کی بھی عبادت کر رہے ہو اس سے الگ ہو جاؤ اور مجھ پر ایمان لاؤ۔ میری تصدیق کرو' اور میری حمایت کرو' یہاں تک کہ میں اللہ کی طرف سے ساری بات کھول کر رکھ دوں جس کے ساتھ اس نے مجھے مامور کیا ہے"۔

واقعہ کا رپورٹر کہتا ہے کہ ایک شخص عدنی حلہ اوڑھے آنحضورؐ کے ساتھ ساتھ لگا تھا۔ جب رسول اللہ اپنی بات فرما چکتے تو یہ شخص اپنی ہانکنا شروع کر دیتا۔ کہ: اے بنی فلاں! یہ شخص تم کو لات و عزیٰ سے ہٹا کر بدعت و گمراہی کی طرف کھینچ لے جانا چاہتا ہے۔ پس نہ اس کی سنو' نہ اس کی بات مانو۔

وہ نوجوان یہ منظر دیکھ کر اپنے باپ سے پوچھتا ہے کہ یہ کون ہے جو آنحضورؐ کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اور آپؐ کی بات کی تردید کر رہا ہے۔ جواب ملتا ہے کہ یہ آپؐ کا اپنا ہی چچا ابولہب ہے۔

نبی اکرمؐ حج کی طرح میلوں کے اجتماعات میں بھی تشریف لے جاتے تھے' تاکہ انسانی اجتماع سے فائدہ اٹھائیں۔ ایک مرتبہ بازار ذوالمجاز میں پہنچے اور لوگوں کو حق کا پیغام سنا کر کلمہ طیبہ کی دعوت دی۔ ابوجہل ساتھ لگا تھا۔ کم بخت کو بغض و کینہ نے اتنا پست کر دیا تھا کہ مٹی اٹھا اٹھا کر آپؐ پر پھینکتا اور ساتھ ساتھ پکارتا کہ لوگو! اس کے فریب میں نہ آنا۔ یہ چاہتا ہے کہ لات و عزیٰ کی پرستش چھوڑ دو۔ [1]

مخالفانہ پروپیگنڈہ کی اس طوفانی مہم سے ابوطالب کو تشویش بھی لاحق ہوئی کہ کہیں عرب کے عوام اجتماعی مخالفت پر نہ اتر آئیں۔ انہوں نے ایک طویل قصیدہ لکھ کر کعبہ میں آویزاں کیا جس میں ایک طرف یہ صفائی دی کہ میں نے دعوت محمدؐ کو قبول نہیں کیا' لیکن دوسری طرف یہ اعلان بھی کیا کہ کسی قیمت پر محمدؐ

---

[1] سیرت النبی شبلی نعمانی جلد اول ص ۲۳۷

کو نہیں چھوڑ سکتا اور اس کے لیے اپنی جان تک دے دوں گا۔ اگرچہ ایسے اکثر قصائد کی تاریخی حیثیت کمزور ہے تاہم ان میں سے بہت سے اجزا درست بھی ہیں۔ ❶

الٹا اثر:

جب کبھی کوئی اہم شخصیت مکہ میں وارد ہوتی تو تحریک اسلامی کے مخالفین اس کو رسول اللہؐ کے اثر سے بچانے کے لیے پورا جتن کرتے' مگر بسا اوقات اثر الٹا پڑتا۔ اس قسم کے چند خاص واقعات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

طفیل بن عمرو دوسی ایک مرد شریف اور ایک شاعر لبیب تھا۔ ایک مرتبہ وہ آیا' بعض افراد قریش اس کے پاس پہنچے' کہنے لگے کہ طفیل! دیکھو تم ہمارے شہر میں آئے ہو اور یہاں محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کی سرگرمیاں ہمارے لیے ناقابل برداشت بنی ہوئی ہیں۔ اس شخص نے ہماری وحدت کا شیرازہ بکھیر دیا ہے اور ہمارے مفاد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ اس کی باتیں جادوگروں جیسی ہیں۔ اور یہ بیٹے اور باپ میں' بھائی اور بھائی میں' شوہر اور بیوی میں جدائی ڈلوا رہا ہے۔ ہمیں تمہارے اور تمہاری قوم کے بارے میں اندیشہ ہے کہ تم کہیں شکار نہ ہو جاؤ۔ پس بہتر یہ ہے کہ اس شخص سے نہ تو بات کرنا اور نہ اس کی کوئی بات سننا۔

طفیل کا اپنا بیان ہے کہ ان لوگوں نے اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ میں پوری طرح قائل نہ ہو گیا کہ نہ بات کروں گا' نہ سنوں گا' چنانچہ جب میں مسجد حرام کی طرف جاتا تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کعبہ کے پاس عبادت میں کھڑے تھے تو میں بھی قریب جا کر کھڑا ہوا۔ میں نے بہت ہی خوب کلام سنا۔ پھر دل میں میں نے کہا کہ میری ماں مجھے روئے' خدا کی قسم میں ایک صاحب عقل آدمی ہوں' شاعر ہوں' برے بھلے کی پہچان کر سکتا ہوں۔ پھر کیا چیز مجھے ان باتوں کے سننے سے روک سکتی ہے جنہیں یہ کہتا ہے۔ جو پیغام یہ لایا ہے وہ اگر بھلا ہو گا' تو میں قبول کر لوں گا' اگر برا ہو گا تو چھوڑ دوں گا۔

اسی سوچ بچار میں کچھ وقت گزر گیا۔ اب آنحضور صلی اللہ علیہ و سلم گھر کو چلے' طفیل ساتھ ہو لیا۔ راستے میں سارا قصہ سنایا کہ مجھے پروپیگنڈہ کے کس چکر میں ڈال رکھا گیا ہے۔ پھر مکان پر پہنچ کر درخواست کی کہ اپنا پیغام ارشاد فرمایئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے اسلام کی حقیقت بیان کی اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ طفیل کہتا ہے کہ "خدا کی قسم! نہ اس سے بڑھ کر اچھا کلام میں نے کبھی سنا نہ اس سے بڑھ کر سچا پیغام۔ اور پھر وہ بتاتا ہے کہ میں اسلام لے آیا اور حق کی گواہی دی۔ ❷ ان طفیل دوسی نے قبیلہ میں جا کر

---

❶ سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۸۶

❷ سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۴۰۷

پر جوش طریق سے دعوت کا کام کیا اور پورا قبیلہ متاثر ہوا۔

ان کے تبلیغی جوش کا یہ عالم تھا کہ گھر پہنچ کر جونہی ضعیف العمر والد سے ملاقات ہوئی' کہنے لگے کہ "نہ آپ میرے' نہ میں آپ کا"! انہوں نے پوچھا۔ "بیٹے یہ کیوں؟" جواب دیا' کہ اب میں نے محمد صلی اللہ علیہ و سلم کا دین قبول کر لیا ہے اور آپؐ کی پیروی کر لی ہے' والد نے کہا کہ بیٹے! جو تیرا دین ہے وہی میرا بھی ہو گا۔ فوراً نہا کر اسلام قبول کیا۔ طفیل نے اسی طرح اپنی بیوی کو دعوت دی۔ اور اس نے بھی لبیک کہی۔ پھر قبیلہ میں دعوت عام کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں آ کر حضورؐ کی خدمت میں روداد بیان کی۔ اور اپنے قبیلہ کی خرابیاں بیان کر کے دعائے عذاب کی درخواست کی۔ مگر حضورؐ نے ہدایت کی دعا کی۔ اللھم اھددوسا۔ طفیل کو تاکید کی کہ واپس جا کر اپنے لوگوں میں دعوت جاری رکھو اور خاص نصیحت کی کہ ان کے ساتھ نرمی برتو۔ (ان کا تشدد آمیز جوش تبلیغ اسلامی حکمت کے مطابق نہ تھا) [1]

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو۔ اعشیٰ بن قیس بھی ایک ممتاز شاعر تھا۔ اس نے رسولؐ اللہ کا چرچا سنا اور اس ارادے سے مکہ کا رخ کیا کہ جا کر اسلام قبول کرے۔ اس نے آنحضورؐ کی شان میں قصیدہ بھی کہا تھا۔ اب جونہی یہ مکہ کی حدود میں پہنچا ایک قریشی مشرک [2] نے آگھیرا اور اس کے مقصد کے بارے میں کھوج کرید کی۔ اس نے بتایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی خدمت میں جا کر اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر بات چل پڑی۔ مشرک حیلہ طراز نے اعشیٰ کی دکھتی رگوں کو ٹٹولنے کے لیے کہا کہ دیکھو محمدؐ تو زنا کو حرام ٹھہراتا ہے۔ یہ وار اوچھا پڑا تو پھر کہا کہ وہ تو شراب سے بھی روکتا ہے۔ یہاں تک کہ باتوں باتوں میں اعشیٰ کے ارادے کو کمزور کر دیا۔ چنانچہ اس نے یہ منوا لیا کہ اس مرتبہ تو تم واپس چلے جاؤ اور اگلے برس آ کر اسلام قبول کر لینا۔ اعشیٰ واپس چلا گیا اور قبل اسکے کہ وہ مکہ لوٹتا' بدنصیب کی موت واقع ہو گئی۔ [3]

سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ مرد اراشی کا ہے۔ یہ مکہ آیا' ساتھ اونٹ تھا جس کا سودا ابوجہل نے چکا لیا۔ مگر قیمت کی ادائی میں لیت و لعل کیا۔ اب یہ قریش کے مختلف لوگوں کے پاس گیا کہ کوئی اونٹ کی قیمت اسے دلوا دے۔ وہاں ایک مجلس آراستہ تھی۔ اراشی نے اہل مجلس سے اپیل کی کہ آپ میں سے کوئی میری رقم ابوجہل سے دلوا دے' میں ایک مسافر بے وطن ہوں اور میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اہل مجلس میں سے کسی کو جرأت نہ تھی کہ وہ ابوجہل سے جا کر ایک مسافر کا حق دلوائیں۔ اس لیے بات ٹالنے کے لیے اشارہ کر کے کہنے لگے کہ وہ دیکھتے ہو' ایک شخص (محمد صلی اللہ علیہ و سلم) بیٹھا ہے۔ اس کے پاس جاؤ وہ وصولی کرا دے گا۔ دراصل یہ ایک طرح کا استہزاء تھا۔ کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ سلم سے ابوجہل کو جو

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۰۷ تا ۴۰۹

[2] یہ ابوجہل ہی تھا۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۲۹

[3] ایضاً ص ۱۶۔ ۴۱۵

عداوت تھی وہ ظاہر تھی۔ اراشی آنحضورؐ کے پاس پہنچا اور اپنا ماجرا بیان کر کے مدد طلب کی۔ آنحضورؐ اٹھے اور فرمایا میرے ساتھ آؤ۔ وہ لوگ دیکھنے لگے کہ اب کیا ہوتا ہے۔ رسولؐ اللہ حرم سے نکل کر ابو جہل کے گھر پر آئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آئی۔ کون ہے؟ فرمایا: محمدؐ! باہر آؤ میرے پاس! ابو جہل نکلا۔ چہرے کا رنگ بالکل اڑا ہوا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ اس شخص کا حق اسے دے دو۔ چنانچہ بے چون و چرا ابو جہل نے ادائیگی کر دی۔ اراشی خوش خوش حرم کی اس مجلس کی طرف پلٹا اور واقعہ سنایا۔

یہ اثر تھا اس عظیم کیریکٹر کا جو محمد صلی اللہ علیہ و سلم کی ذات میں جلوہ گر تھا۔ اس کا اعتراف خود ابو جہل نے کیا۔ اور اہل مجلس سے آکر کہا۔ کہ اس (محمد ﷺ) نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا میں نے اس کی آواز سنی۔ اور یکایک ایک رعب مجھ پر طاری ہو گیا۔ [1] بعض روایات میں تو یہ بھی آیا ہے کہ ابو جہل نے ایک اونٹ کو سامنے دیکھا جو مونہہ پھاڑے اسے چبا جانے والا ہے۔ یہ معجزہ بھی ہو سکتا ہے اور ابو جہل کی نفسیاتی کیفیت بھی۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس واقعہ کا کتنا بڑا اثر مرد اراشی پر اور خود اہل مکہ پر پڑا ہو گا۔

مہاجرین حبش کے ذریعے اسلام کا پیغام ایک نئے علاقے میں جا پہنچا تو وہاں سے ۲۰ عیسائیوں کا ایک وفد مکہ آیا۔ یہ لوگ مسجد حرام میں آنحضورؐ کی خدمت میں آئے، بیٹھے، بات کی اور سوالات پوچھے۔ آنحضورؐ نے قرآن سنایا اور دعوت حق پیش کی۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اللہ کی پکار کو انہوں نے قبول کیا۔ ایمان لائے اور نبی اکرمؐ کی تصدیق کی۔ جب یہ اٹھ کر نکلے تو باہر قریشی مخالفین مسجد کے گرد منڈلا رہے تھے۔ ابو جہل نے اس گروہ کو نشانہ ملامت بنا لیا کہ تم بھی کیا احمق لوگ ہو جو اپنے دین کو خیرباد کہہ دیا۔ وفد والوں نے جواب دیا: "آپ لوگوں کو ہماری طرف سے سلام عرض ہے ہمیں آپ کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کرنا۔ ہمارا راستہ الگ، آپ کا راستہ الگ! ہم اپنے آپ کو ایک بھلائی سے محروم نہیں رکھنا چاہتے"۔

بیعت عقبہ ثانیہ کی ساری کارروائی رات کی تاریکی میں بڑے اہتمام اخفا کے ساتھ اسی وجہ سے عمل میں لائی گئی تھی کہ اشرار مکہ کی طرف سے سخت مزاحمت تھی۔ اہل وفد جب بیعت کی مجلس سے فارغ ہو کر قیام گاہوں میں پہنچے تو سرداران قریش نے ان کو وہاں جا لیا۔ ان کی مخبری کا نظام ایسا مضبوط تھا کہ انہوں نے بیعت کا قصہ بیان کر کے کہا کہ "تم ہمارے آدمی (محمد صلی اللہ علیہ و سلم) کو نکال لے جانا چاہتے ہو اور اس کے ہاتھ پر تم نے ہمارے خلاف جنگ کرنے کا پیمان باندھا ہے۔ خوب سمجھ لو کہ تم لوگ اگر ہمیں اور اہل عرب کو لڑا دو گے تو تم سے بڑھ کر قابل نفرت ہماری نگاہوں میں کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا"۔ انصار نے بات کو چھپانے کی کوشش کی، چنانچہ اس وقت تو بات ٹل گئی اور انصاری قافلہ روانہ ہو گیا۔ لیکن قریش

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ا ص ۱۷۔ ۳۱۹

بعد میں برابر تجسّس میں لگے رہے۔ اور پوری اطلاع پالی۔ انصاری قافلہ کا تعاقب کیا گیا اور سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرو ان کے ہاتھ آ گئے۔ یہ دونوں اپنے اپنے قبیلوں پر دوران بیعت نقیب مقرر ہوئے تھے۔ منذر تو تھے ہی کمزور آدمی سعد بن عبادہ کو قریش نے پکڑ لیا۔ اور ان کے ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ دیئے اور گرفتار کر کے مکہ لے گئے' مکہ پہنچ کر خوب مارا۔ ان کے بال پکڑ کر جھنجھوڑا۔

سعد بن عبادہ کا خود اپنا بیان ہے کہ اسی حالت میں قریش کا ایک آدمی آیا جس کا چہرہ روشن اور وجاہت دار تھا۔ لمبا اور خوب صورت! میں نے دل میں کہا کہ اگر اس قوم میں کوئی خیر باقی ہے تو اس کی توقع اسی شخص سے کی جاسکتی ہے۔ جب وہ قریب آیا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر زور سے مجھے تھپڑ لگایا۔ اب دل میں میں نے سمجھ لیا کہ اس گروہ میں بھلائی کی کوئی رمق باقی نہیں۔ آخر ایک شخص نے نرمی کے ساتھ پوچھا کہ کیا تمہارا کوئی آدمی قریش میں ایسا نہیں کہ جس سے تمہارا کوئی بھائی چارہ یا کوئی عہد و پیمان ہو؟ میں نے جبیر ابن مطعم اور حارث بن حرب کے نام لیے۔ اس نے کہا کہ پھر پکارو ان کے نام اور جو تعلق ان کے ساتھ ہے اسے بیان کرو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہی شخص انہیں ڈھونڈنے نکلا۔ وہ دونوں پاس ہی مل گئے اور انہوں نے آ کر مجھے چھڑایا۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دعوت حق کے خلاف رد عملی ہنگامہ کے علمبردار کس طرح میدان کشاکش میں سرگرم عمل تھے۔

فنون لطیفہ کا محاذ:

اسلام کی مخالفت کی مہم کا ایک سرخیل نضر بن حارث بھی تھا۔ یہ اپنی تجارت کے لیے اکثر فارس جاتا۔ وہاں سے شاہان عجم کے تاریخی قصص بھی جمع کر لاتا۔ اور ادبی انداز کی کہانیاں بھی۔ چنانچہ اس نے مکہ میں قرآن کے انقلابی ادب کے مقابلے پر عجم کے سفلی ادب کا اڈہ قائم کیا اور لوگوں کو دعوت دیتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عاد و ثمود کے پھیکے قصے کیا سنتے ہو' آؤ میں تم کو رستم و اسفندیار کی سرزمین کی چٹ پٹی کہانیاں سناؤں۔ نضر بن حارث کو ایک مستقل انسانی کردار بنا کر قرآن نے ہمارے سامنے یوں رکھا ہے کہ:۔

> و من الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم و یتخذھا ھزوا۔ (لقمان۔٦)
>
> "اور لوگوں میں ایک کردار ایسا بھی ہے جو دل بہلاوے کے افسانوں کا خریدار ہے تاکہ ان کے ذریعے (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے بغیر سمجھے بوجھے بھٹکائے اور اس کا مذاق اڑائے۔"

یہ نضر بن حارث وہ ہے جس نے ایک مجلس میں ابوجہل کے سامنے دعوت محمدیؐ کے موضوع پر یہ تقریر کی تھی:۔

اے گروہ قریش! تمہارے اوپر ایک ایسا معاملہ آپڑا ہے کہ آگے چل کر اس کے خلاف

تمہارا کوئی حیلہ کارگر نہ ہو گا۔ محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) تمہارے درمیان ایک من موہنا نوخیز لڑکا تھا' تم سب سے بڑھ کر راست گو' تم سب سے بڑھ کر امانت دار! یہاں تک کہ جب اس کی کنپٹیوں میں سفید بال آگئے اور اس نے تمہیں اپنا وہ پیغام دیا تو اب تم کہتے ہو کہ وہ جادوگر ہے ---- کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے ---- کہتے ہو کہ وہ شاعر ہے ---- اور کہتے ہو کہ وہ دیوانہ ہے! ---- (ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں ہے [1] ---- اے گروہ قریش! اپنے موقف پر غور کرو۔ کیونکہ بخدا تمہارے سامنے ایک امر عظیم آچکا ہے"۔ [2]

نضر بن حارث کی یہ تقریر بتاتی ہے کہ وہ دعوت محمدیؐ کی عظمت کو بھی سمجھتا تھا۔ اور محسن انسانیت کے کردار کی رفعت سے بھی آگاہ تھا۔ وہ اپنے ضمیر کو پامال کر کے حضورؐ کے پیغام کی مخالفت کے لیے شیطانی ترکیبیں نکالتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ایک بامقصد تحریک کے سنجیدہ پیغام کے مقابلے میں عام لوگوں کے لیے سفلی ادب میں زیادہ کشش ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس نے سفلی ادب کے ایک مکتب کی ابتداء کر دی۔ نضر بن حارث کہا کرتا تھا کہ "میں محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) سے زیادہ دلچسپ کہانیاں پیش کرتا ہوں۔ پھر جب وہ عجمی داستانیں بیان کرتا تو کہتا کہ آخر محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کی باتیں کس پہلو سے میری باتوں سے زیادہ خوش آئند ہیں"۔ دوسری طرف وہ حضورؐ کے کلام پر اساطیر الاولین کی پھبتی کستا۔

اتنا ہی نہیں اس نے گانے بجانے والی ایک فنکار لونڈی بھی خرید کی تھی۔ لوگوں کو جمع کر کے کھانے کھلاتا۔ پھر اس لونڈی سے گانے سنواتا۔ جس نوجوان کے متعلق معلوم ہو جاتا کہ وہ اسلام کی طرف راغب ہو رہا ہے تو اس کے ہاں اس فن کار لونڈی کو لے جاتا اور اسے ہدایت کرتا کہ ذرا اسے کھلا پلا اور موسیقی سے شاد کام کر۔ آرٹ اور کلچر کے ایسے مظاہرے کے بعد طنزاً کہتا کہ محمد (ﷺ) جس کام کی طرف بلاتے ہیں' وہ مزیدار ہے یا یہ؟ [3]

اصل میں دین حق کی روح خدا پرستی ہے اور پابندی اصول۔ نفسانیت اور شہوانیت کی فضا میں اس روح کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جس ماحول میں ساری توجہ کھانے' شہوت' گانے بجانے' تفریحات اور فنون لطیفہ کی طرف منعطف ہو جائے وہ دعوت حق کے لیے سازگار نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر نضر بن حارث نے ایک طرف سفلی افسانوں کا دور شروع کیا۔ دوسری طرف گانے بجانے اور نسائیت کی جلوہ آرائیوں سے مجالس گرم کیں۔

لیکن ایک تعمیری پیغام اور ایک بامقصد تحریک کے مقابلے میں سفلی ادب بھی کارگر نہ ہوا۔ اور فنون

---

[1] یہاں ہم نے کسی قدر تلخیص سے کام لیا ہے۔

[2] سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۱۹

[3] سیرت المصطفیٰ از مولانا ادریس کاندھلوی ج ۱ ص ۱۸۸

لطیفہ کے شعبدے بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئے۔ چار دن ہماہمی رہی اور پھر یہ سارے ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے۔

چنانچہ اپنے اس حربے میں ناکام ہو کر یہی نضر بن حارث سرداران قریش کے مشورے سے یہودیوں کے مولویوں کے پاس مدینہ پہنچا کہ تم علم رکھتے ہو تو ہم بے علموں کو بتاؤ کہ ہم تحریک اسلامی سے کیسے عہدہ برآ ہوں۔ اور کیسے داعی حق کو زچ کریں۔ علمائے یہود نے سکھایا کہ اس شخص سے اصحاب کہف اور ذوالقرنین کا قصہ دریافت کرو اور روح کی حقیقت پوچھو۔ چنانچہ فیصلہ کن انداز سے یہ سوالات رکھے گئے۔ وحی ربی نے اطمینان بخش جواب دے دیئے۔ لیکن کفر کی ہٹ کا کیا علاج! [1]

سودا بازی کی کوششیں:

ابتدائی خفیہ مرحلے سے نکلنے کے بعد اسلامی تحریک جب تیزی سے پھیلنے لگی۔ اور پھر آگے چل کر جب پروپیگنڈے اور تشدد کی مختلف تدبیریں ناکارہ ثابت ہوئیں۔ تو مخالفین دل ہی دل میں محسوس کرنے لگے کہ یہ ایک ناقابل تسخیر طاقت ہے اور کوئی بڑا نتیجہ پیدا کرنے والی ہے۔ چنانچہ پھر ایسی کوششیں ہونے لگیں۔ کہ کسی طرح سمجھوتہ (Compromise) کی راہ نکلے اور کچھ مان کر اور کچھ منوا کر قضیہ ختم کیا جاسکے۔ مگر اصولی تحریکوں میں اتنی لچک ہوتی ہی نہیں کہ لین دین کر کے کوئی درمیانی راہ پیدا کر لی جائے۔ تاہم سرداران قریش نے اس حربے کو بھی پوری طرح آزمایا کہ شاید کسی طرف سے انگلی دھنسائی جاسکتی ہو۔

مثلاً ان کی ایک شرط مصالحت یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اصنام و آلہہ کے خلاف زبان نہ کھولیں اور ان کے مذہب سے تعرض نہ کریں۔ اور اس کے علاوہ جو کچھ وعظ بھی کرنا چاہیں اور جیسی کچھ اخلاقی نصیحتیں فرمانا چاہیں، گوارا کر لی جائیں گی۔ یعنی آپؐ اپنے کلمہ دعوت میں سے نفی باطل کا جزء ساقط کر دیں۔ یا کہیے کہ "لا الہ" نہ کہیں محض اللہ کا نام لینے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جن باطل تصورات پر نظام تمدن کھڑا تھا، ان کو نہ چھیڑا جائے۔ اور معاشرہ کا جو فاسد ماحول جس شکل میں موجود تھا اسے برقرار رہنے دیا جائے۔ سچائی کو ایسی شکل میں لایا جائے کہ وہ تغیر کی نقیب نہ ہو اور اس سے انقلابیت کی روح کو خارج کر دیا جائے۔ دین حق کا سیاسی جز معطل ہو جائے اور اجتماعی نظام کو اس کی بنیادوں پر قائم رکھ کر اس کے سائے میں روحانی نوعیت کی اصلاح معاشرہ کی جاتی رہے۔ گویا قریش کا مطالبہ یہ تھا کہ ہماری طبقاتی سیادت برقرار، ہماری سیاسی و اقتصادی قیادت اور مذہبی پیشوائی سلامت، ہمارے عہدے قائم، ہمارے مفاد محفوظ ـــــ باقی جو کچھ تم کرنا چاہو کرو۔ لیکن تحریک اسلامی اگر یہ شرط پوری کرتی تو از خود ختم ہو جاتی۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۲۰۔

اسی طرح ان کی طرف سے خواہش کی گئی کہ:

ائت بقران غیر ھذا او بدلہ (یونس۔ ۱۵)

یعنی اس قرآن کو تو بالائے طاق رکھ دو اور کوئی دوسرا قرآن لاؤ۔ یا اس میں رد و بدل کر لو (تاکہ کچھ) ہمارے تقاضوں کے لیے بھی گنجائش نکلے)

اس کا جواب وحی الٰہی کے الفاظ میں حضورؐ کی زبان سے یہ دلوایا گیا کہ "میرا یہ اختیار نہیں۔ کہ اس (قرآن) کو بطور خود بدل لوں۔ جو کچھ مجھ پر وحی کیا جاتا ہے' اس کے ماسوا کسی اور چیز کی پیروی نہیں کر سکتا۔ میں اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں تو یوم عظیم (قیامت) کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو کوئی غلط بات (اپنی طرف سے گھڑ کر) اللہ تعالیٰ سے منسوب کر دے" (یونس ۱۵)۔

مصالحت کی راہ نکالنے کے لیے مخالفین تحریک نے حضورؐ کے سامنے ایک مطالبہ یہ بھی رکھا کہ اگر آپؐ اپنے حلقے سے ہمارے معاشرے کے گھٹیا لوگوں' ہمارے غلاموں اور کمیروں اور کل کے لونڈوں کو نکال دیں تو پھر ہم آپؐ کے پاس آ کے بیٹھیں اور آپؐ کی تعلیمات کو سنیں' آخر موجودہ حالت میں ہمارے مرتبے سے یہ بعید ہے کہ ہم کوئی استفادہ کر سکیں۔ پنچ لوگوں نے ہمارا راستہ روک رکھا ہے۔ یہاں ہم ان کو دیکھتے ہیں کہ وہ تحریک کے خواص بنے بیٹھے ہیں۔ اور ان کو بڑی قربت حاصل ہے۔ انہی لوگوں کے بارے میں وہ اکثر طنزاً کہا کرتے تھے کہ یہ ہیں وہ ہستیاں جو قیصر و کسریٰ کی جانشین بننے والی ہیں۔ واقعہ یہ نہ تھا کہ ان کے دل تحریک اسلامی کی خدمت کے لیے مضطرب تھے۔ بلکہ منشا یہ تھا کہ وہ نوجوان جو مجنونانہ وار سچائی کے پیغام کا علم اٹھا رہے تھے' جو اپنے مفادات قربان کر رہے تھے اور جو ہر قسم کی مصیبتوں کو سہار کر اپنا کردار بنا رہے تھے اور وہ کہ جن کی ایک ایک سانس اپنے مقدس مشن کی خدمت کے لیے وقف تھی ان کی حوصلہ شکنی کرائی جائے اور ان کی خدمات سے اس مشن کو محروم کرایا جائے۔ قبل اس کے کہ حضورؐ کے دل پر اس فریب کارانہ خواہش کا کوئی اثر ہو؟' قرآن نے آپ پر واضح کیا کہ یہ تو معاندین کی محض ایک چال ہے جیسی کہ وہ جملہ انبیاءؑ کے خلاف چلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ٹھیک ایسی ہی بات نوح علیہ السلام کے سامنے بھی رکھی گئی تھی (ہود۔ ۲۷) پس آپؐ ان ساتھیوں کو معاندین کی خوشنودی کے لیے اپنے قرب سے ہرگز محروم نہ کریں جو صبح و شام خدا کا نام پکارنے والے ہیں (الانعام۔ ۵۲) بلکہ ہدایت دی گئی کہ اخلاص کے یہ پیکر جو طرح طرح کی مصیبتیں اٹھا رہے ہیں' ان کو اپنے سایہ شفقت میں رکھو۔ واخفض جناحک لمن اتبعک من المومنین [1] بلکہ ایک موقع پر ایک ذی اثر مخالف سے گفتگو کرتے ہوئے حضورؐ نے ایک نابینا رفیق (ابن ام مکتوم) کی مداخلت کو ناپسند کیا تو اتنی سی بات پر تنبیہہ آ گئی۔ (سورہ عبس۔ ۱ تا ۱۰)

---

[1] اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں' ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔ (الشعراء ۲۱۵)

اسی سلسلے میں ایک بار معاندین قریش کی مجلس میں غور و فکر ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف رسول خدا حرم میں تنہا تشریف فرما تھے۔ عتبہ بن ربیعہ نے اہل مجلس سے کہا کہ اگر تم لوگ پسند کرو تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر بات کروں اور اس کے سامنے ایسی صورتیں پیش کروں جن میں سے ممکن ہے کہ کسی کو وہ چاہے تو قبول کر لے۔ اور پھر ہم اسے ایفا کر دیں۔ اور وہ ہمارے مقابلے سے باز آ جائے۔ یہ صریح طور پر سودا بازی کی ایک تجویز تھی۔ اور یہاں تک اگر قریش آ پہنچے تھے تو درحقیقت حضرت حمزہؓ کے ایمان لانے اور تحریک کے تیزی سے پھیلنے کی وجہ سے زچ ہو کر آ پہنچے تھے۔ مجلس کی رضامندی سے عتبہ نے حضورؐ سے جا کر یوں گفتگو کی:

"اے برادر زادے! تمہارا جو کچھ مرتبہ ہمارے درمیان ہے وہ تم خود جانتے ہو' خاندان بھر میں تمہارا مقام بلند ہے اور نسب کے لحاظ سے تم ایک شان رکھتے ہو"۔

اس خوشامد آمیز مگر مبنی بر حقیقت تمہید کے بعد عتبہ نے شکایت کی کہ تم نے قوم کو بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے' ان کے اکابر کو احمق قرار دیا ہے' ان کے معبودوں اور ان کے دین میں عیب لگایا ہے۔ ان کے گزرے ہوئے آباد اجداد کی تکفیر کر ڈالی ہے۔ اب میری بات سنو اور میں جو جو کچھ پیش کش کرتا ہوں' ان ساری صورتوں پر غور کرو۔ شاید کہ تم ان میں سے کوئی بات قبول کر لو۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "تم کہو اے ابوالولید! میں سنوں گا۔" عتبہ نے حسب ذیل صورتوں کی پیش کش کی:

اگر اس سارے ہنگامے سے تمہارا مقصود دولت ہو تو پھر ہم تمہارے لیے اتنا مال جمع کر دیں کہ تم ہم سب سے بڑھ کر مالدار ہو جاؤ۔

اگر تم اس کے ذریعے سرداری و قیادت چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنے اوپر سردار مقرر کیے لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ تمہارے بغیر ہم کسی بھی معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔

اگر تم بادشاہت چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کیے لیتے ہیں۔

اور اگر یہ اس وجہ سے ہے کہ تم پر کسی جن وغیرہ کا سایہ ہوتا ہے اور وہ تم پر مسلط ہو جاتا ہے تو پھر ہم کچھ چندہ وغیرہ کر کے تمہارے لیے علاج کا سامان کریں۔ پھر یا تو تمہیں اس سے نجات دلا دیں یا ناکامی ہو تو معذور سمجھیں۔

اس مصالحانہ پیش کش میں وہ مختلف تصورات جھلک رہے ہیں جو اسلامی تحریک کے مخالفین میں پائے جاتے تھے۔ ان تصورات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی نگاہ میں دو ہی امکان تھے: ایک یہ کہ حضورؐ جاہلی نظام کی طاقت سے اتنی بڑی ٹکر لینے کا اقدام ہوش و خرد کے عالم میں نہیں کر رہے تھے بلکہ کسی بھوت پریت کے سائے اور کسی طرح کے دورے میں ہونے کی وجہ سے کر رہے تھے: دوسرے یہ کہ اگر ہوش و خرد کے تحت یہ جد و جہد ہو رہی تھی تو پھر اس کا ہدف لازماً قیادت و بادشاہت کا مقام تھا۔ بہرحال پوری پیش کش کو سن کر حضورؐ نے فرمایا:۔ "ابوالولید! کیا تم اپنی بات کہہ چکے؟" اس نے کہا۔ "ہاں"۔ فرمایا "تو

اب میری سنو"۔ اس نے کہا۔ "کہو"! حضورؐ نے پوری پیش کش کو ایک طرف ڈال کر حٰمٓ کی آیات سنانی شروع کیں۔

یہ حٰمٓ ہے۔ یہ بڑی مہربان اور رحم والی ہستی کی طرف سے بھیجی گئی ہے۔ یہ ایک نوشتہ ہے جس کی ایک ایک آیت نکھری ہوئی ہے۔ یہ قرآن ہے عربی زبان میں --- سمجھ بوجھ سے کام لینے والوں کے لیے! (ایمان لانے والوں کو) بشارت سنانے والا اور (انکار کرنے والوں کو) تنبیہہ دلانے والا۔ پس ان (اہل مکہ) میں سے اکثریت نے اس سے روگردانی کی اور سن کر نہیں دیتے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل اس حقیقت کے مخالف ہیں جس کی طرف تم بلاتے ہو۔ اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان ایک روک حائل ہے۔ سو تم اپنی جگہ کام کرو ہم اپنی جگہ کام کرتے ہیں"۔

(حٰمٓ السجدہ ۱ تا ۵)

حضورؐ جب تک سناتے گئے، عتبہ دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر ان پر ٹیک لگائے ہوئے چپ چاپ توجہ سے سنتا رہا۔ حضورؐ نے سجدۂ تلاوت آنے پر قرأت روکی اور سجدہ کیا۔ پھر فرمایا۔ "ابوالولید! تم نے سن لیا جو کچھ سنا۔ اب تو جانے اور یہ"۔

عتبہ اٹھا اور اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ انہوں نے نظر پڑتے ہی کہا کہ عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ اب وہ رنگ نہیں جو جاتے وقت تھا۔ تشویش کے ساتھ انہوں نے ماجرا پوچھا۔ عتبہ نے کہا:

"ماجرا یہ ہے کہ میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ جیسا کبھی نہیں سنا۔ بخدا نہ وہ شعر ہے، نہ جادو ہے اور نہ کہانت ہے۔ اے گروہ قریش! میری بات مانو اور اس کی ذمہ داری مجھ پر رہنے دو۔ اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور اس کے پیچھے نہ پڑو۔ خدا کی قسم جو کلام میں نے اس سے سنا ہے اس سے یقیناً کوئی بڑا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ اگر اہل عرب نے اس سے نمٹ لیا تو دوسروں کے ذریعے تمہیں اس سے نجات ہو جائے گی اور اگر وہ عرب پر چھا گیا تو اس کی سلطنت تمہاری سلطنت ہوگی۔ اور اس کی طاقت تمہاری طاقت ہوگی۔ اور تم اس کے واسطے سے لوگوں میں سب سے بڑھ کر خوش نصیب ہو جاؤ گے"۔ [1]

عتبہ کے اس اظہار رائے سے کئی اہم حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ فصحائے عرب مجبور ہو کر قرآن کے کلام کی عظمت کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ جب تک مخالفین اصل دعوت کو براہ راست داعی کی زبان سے سننے سے بچے رہتے اور محض اپنے حلقے کے زہریلے پروپیگنڈے کے اثر میں رہتے تو ان کا زور مخالفت قائم رہتا۔ لیکن جب کسی نے بھی براہ راست اصل پیغام کا کوئی جز سنا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۱۳-۳۱۴

اس کا دل مفتوح ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تیسرے یہ کہ اس کلام کے بارے میں ان کے ہر ذہین آدمی کا تاثر یہی تھا کہ اس سے کوئی بڑا نتیجہ (نباء عظیم) پیدا ہونے والا ہے۔ بلکہ وہ اس کے پردوں کے پیچھے ایک کامل انقلاب کا منظر دیکھتے تھے اور اندازہ کر لیتے تھے کہ اس کلمہ کی بنیاد پر ایک سلطنت اور ایک نظام زندگی کا قیام ہونے والا ہے۔

مگر عتبہ کی بات سن کر مجلس میں یوں مذاق اڑایا گیا کہ "ابوالولید' اس کی زبان کا جادو تو تم پر بھی چل گیا"۔

عتبہ نے کہا کہ اس کے متعلق میری رائے تو یہی ہے جو میں نے کہہ دی۔ اب تم جو چاہو کرو۔

ایک کوشش اس سلسلے میں اور کی گئی۔ بڑے بڑے زعماء ---- عتبہ بن ربیعہ' شیبہ بن ربیعہ' ابوسفیان بن حرب' نضر بن حارث' کلدہ (جس کی برادر خواندگی بنو عبدالدار سے تھی) ابوالبختری بن ہشام' اسود بن مطلب' زمعہ بن اسود' ولید بن مغیرہ' ابوجہل بن ہشام' عبداللہ بن ابی امیہ' عاص بن وائل۔ نبیہ اور منبہ ابنائے حجاج (بنو سہم) امیہ بن خلف ---- غروب آفتاب کے بعد کعبہ کے پاس جمع ہوئے انہوں نے رسول خدا کو بلوا بھیجا۔ حضورؐ اچھی توقعات کے ساتھ جلد جلد آپہنچے۔ انہوں نے اپنی اسی پیش کش کو جو پہلے عتبہ کے ذریعے پہنچائی گئی تھی' ایک بار پھر دہرایا۔ اسے سن کر حضورؐ نے یہ جواب دیا:

> "تم لوگ جو کچھ کہہ رہے ہو' میرا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ میں جو دعوت تمہارے سامنے لے کے اٹھا ہوں۔ اسے اس لیے نہیں پیش کر رہا کہ اس کے ذریعے تم سے مال و دولت حاصل کروں' یا تمہارے اندر سرداری حاصل کروں یا تمہارے اوپر بادشاہت قائم کروں: مجھے تو خدا نے تمہارے سامنے اپنا پیغامبر بنا کر اٹھایا ہے۔ اس نے مجھ پر کتاب اتاری ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے لیے بشیر و نذیر بنوں سو میں نے خدا کی ہدایات تم تک پہنچا دی ہیں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کیا ہے۔ اب جو کچھ میں لایا ہوں اگر اسے تم قبول کر لو تو وہ تمہارے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی کا ذریعہ ہے اور اگر تم اسے میری طرف واپس پھینک دو تو میں اللہ کے حکم کے انتظار میں صبر دکھاؤں گا۔ یہاں تک کہ خدا میرے اور تم لوگوں کے درمیان اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔" ❶

یہ جواب سن کر جب انہوں نے دیکھا کہ آگے بڑھنے کا راستہ نہیں مل رہا۔ تو طرح طرح کی حجتیں نکالنا شروع کیں۔ مثلاً یہ کہا کہ تم جانتے ہو کہ ہماری یہ سرزمین بہت ہی تنگ ہے۔ اس میں پانی کی کمی ہے اور یہاں کی زندگی بہت کٹھن ہے۔ تم خدا سے کہو کہ وہ ان پہاڑوں کو ہٹا دے اور ہماری زمین کو کشادہ کر دے اور اس میں شام و عراق کی طرح دریا چلا دے۔ پھر یہ کہا کہ خدا ہمارے آباؤ اجداد کو اٹھا کھڑا کرے۔ اور

---

❶ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۱۴-۳۱۵

ان میں قصی بن کلاب ضرور شامل ہو کیونکہ وہ مرد بزرگ بڑا راست باز تھا۔ ہم اس سے تمہاری دعوت کے بارے میں دریافت کریں گے' کہ یہ حق ہے یا باطل! پھر ہمارے اسلاف کرام زندہ ہو کر اگر تمہاری تصدیق کر دیں اور تُو وہ باتیں کر دکھائے جن کا مطالبہ ہم نے کیا ہے تو ہم تمہاری تصدیق کریں گے اور خدا کے ہاں تمہارا یہ مرتبہ ہمیں تسلیم ہو گا کہ اس نے تمہیں واقعی رسولؐ بنا کے بھیجا ہے۔ پھر کہا یہ بھی نہیں کرتے تو ہم پر عذاب ہی وارد کرا دو۔ حضورؐ ان لایعنی مطالبات پر بار بار اپنی وہی بات دوہراتے چلے گئے اور کہتے گئے کہ:

ما بھذا بعثت. (ان کاموں کے لیے مجھے نہیں اٹھایا گیا)

آخر جب حضورؐ اٹھ کھڑے ہوئے تو آپؐ کے ساتھ ہی ساتھ عبداللہ بن ابی (جو حضورؐ کا پھوپھی زاد بھائی تھا) بھی اٹھ کھڑا ہوا' اور آپؐ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ تمہاری قوم نے تمہارے سامنے کچھ باتیں رکھیں۔ لیکن تم نے کوئی پیش کش بھی مان کر نہیں دی۔ اب تو خدا کی قسم میں تمہارے اوپر ایمان نہیں لانے کا خواہ تم آسمان پر سیڑھی لگا کر اس پر چڑھتے ہوئے دکھائی کیوں نہ دے جاؤ اور پھر آنکھوں کے سامنے اترو اور تمہارے ساتھ چار فرشتے بھی آکر تمہاری صداقت کی گواہی کیوں نہ دے دیں. خدا کی قسم اگر میں ایسا کروں بھی تو میرا قطعاً یہ خیال نہیں کہ میں حقیقتاً تمہاری تصدیق کروں گا۔ [1]

محسن انسانیتؐ بڑے دکھی دل کے ساتھ گھر واپس آئے۔

ایسے ہی واقعات میں سے ایک یہ ہے کہ سفر طائف کے بعد جب حضورؐ نے مکہ سے نکل کر آس پاس کے قبائل مثلاً بنو کندہ اور بنو حنیفہ وغیرہ میں پیغام پہنچانا شروع کیا تو ایک بار قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ کے ہاں بھی پہنچے اور سردار قبیلہ بحیرہ بن فراس سے ملاقات کی۔ اس نے حضورؐ کی دعوت سنی۔ پھر ساتھیوں سے کہنے لگا۔ "بخدا اگر قریش کا یہ نوجوان میرے ہاتھ آجائے تو میں اس کے ذریعے سارے عرب کو مٹھی میں لے لوں" [2] پھر آپؐ کو خطاب کر کے پوچھا' کہ اگر ہم لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں اور تم مخالفین پر غالب آجاؤ تو کیا یہ وعدہ کرتے ہو کہ تمہارے بعد یہ سارا سلسلہ میری تحویل میں آجائے گا؟

غور کیجیے کہ ابتدائی مجمل دعوت کو سن کر ہی اس شخص نے بھانپ لیا تھا کہ یہ دعوت ایک معرکہ پیدا کرنے والی دعوت ہے اور اس کے غالب آجانے کا امکان بھی ہے اور اس وقت یہ ذریعۂ حصول مفاد بھی ہو گی۔ انہیں تصورات نے بحیرہ کے اندر سوداگرانہ ذہنیت پیدا کر دی مگر حضورؐ تو داعی تھے' سیاسی کاروبار کرنے نہیں چلے تھے اس لیے آپؐ نے جواب یہ دیا کہ:

"یہ تو خدا کے اختیار میں ہے وہ جسے چاہے گا میرے بعد مقرر کرے گا"۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۱۶ تا ۳۱۸

[2] ایضاً ج ۲ ص ۳۳

بحیرہ نے اس پر یہ کہا کہ "کیا خوب! اس وقت تو عرب کے سامنے ہم سینہ سپر ہوں اور جب تمہارا کام بن جائے تو مفاد کوئی دوسرا حاصل کر لے جائے۔ جاؤ، ہم کو اس سلسلے سے کوئی مطلب نہیں"۔ [1]

حضورؐ اگر کوئی غیر سیاسی واعظ ہوتے یا صوفیانہ طرز پر معاشرہ کی اخلاقی اصلاح کرنے چلے ہوتے تو اس موقع پر ان کا جواب سیدھا سیدھا یہ ہوتا کہ میاں تم یہ کیسے خواب دیکھ رہے ہو، یہ تو اللہ والوں کا ایک اصلاحی کام ہے۔ اس میں مفاد کا کیا سوال اور اس میں کسی کی سرداری اور جانشینی کا کیا ذکر۔ حضورؐ بھی اپنی تحریک کی جامعیت اور اس کے سیاسی پہلو سے آگاہ تھے اور مخاطب نے بھی اس منتہا کا کچھ نہ کچھ تصور کر لیا جس کی طرف یہ دعوت جانے والی تھی۔

سودا بازی کی ان مختلف مساعی سے مخالف طاقت یہ فائدہ اٹھانا چاہتی تھی کہ اگر حضورؐ تحریک کے لیے نفوذ کی راہیں نکالنے یا استبداد کی بھٹی سے ساتھیوں کو بچانے کے لیے خم کھا جائیں تو بہ حیثیت اصولی تحریک کے ان کی دعوت کا زور ٹوٹ جائے اور اگر وہ بے لچک ہونے کا ثبوت دیں تو یہ پروپیگنڈا کیا جا سکے کہ دیکھو لوگو! ہم نے جھگڑا ختم کرنے کے لیے کتنی ہی چیزوں کی پیشکش کی اور کتنے ہی راستے نکالے مگر یہ شخص ایسی ضد میں پڑا ہے کہ کسی حل کو قبول ہی نہیں کرتا۔ پوزیشن واقعی بڑی نازک تھی، اسی لیے قرآن حضورؐ کو ان سودا بازیوں کے مقابلے پر مضبوط رکھنے کے لیے پے در پے انتباہ دیتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک بار تو بڑے شدید انداز میں مخالفین کی اس چال سے بچنے کی تلقین بھی کی۔ اور اس بارے میں حفاظت الٰہی کا یقین بھی دلایا۔ فرمایا:

"اور اگر ہم تم کو مضبوطی سے جمائے نہ رکھتے تو بعید نہ تھا کہ تم ان کی طرف کسی قدر جھکاؤ دکھا دیتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم تمہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی (اپنی گرفت کا) مزہ چکھا دیتے۔ پھر تم ہمارے مقابلے میں کسی کو مددگار نہ پاتے"۔ (بنی اسرائیل ۷۴-۷۵)

غرضیکہ بڑی حکمت اور بڑے صبر و تحمل سے حضورؐ نے تحریک کو سودا بازی کی ان کوششوں سے بچا کر نکالا۔

تشدد اپنے جوبن پر:

مخالفین حق نیتوں کے لحاظ سے کھوٹے اور دلیل کے لحاظ سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے اصل مسئلہ اپنے مفاد اور اپنے اقتدار کا ہوتا ہے وہ کسی دعوت کے اٹھنے پر قوت کے سارے ہتھیار سنبھال لیتے ہیں اور دلیل کا جواب تشدد سے دیتے ہیں۔ حق کی تحریک انسانی قوائے فکر کے بل پر کام کرتی ہے۔ مگر مخالفین جذبات غیظ و غضب کو جواب میں لاتے ہیں۔ تبدیلی کے لیے کوئی جنبش بھی اگر کسی طاقت نے

---

[1] رحمۃ للعالمین ج ۱ ص ۸۹

نظام وقت کے خلاف کی ہے تو اسے خدایان معاشرہ کے ہاتھوں مار کھانی پڑی ہے۔ لیکن حق کی دعوت جس ہمہ گیر تبدیلی کی اذان ہے اس کے رد عمل میں تو لازماً ایک شدید ہسٹریائی دورہ' نظام رائج کے پاسبانوں کو پڑتا ہے۔ یہی صورت مکہ میں درپیش تھی۔ یوں تو دعوت عام کی ابتدا کے ساتھ ہی تشدد کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ نظام جاہلی کا پارہ چڑھتا گیا اور ظلم کے دریا کی موجیں بھرتی چلی گئیں۔ پانچ چھ برس کے اندر اندر گویا مکہ سے نظام امن و رحمت کے علمبرداروں کے لیے ایک گرم بھٹی بن گیا۔ اور یہ بھٹی حضرت خدیجہؓ اور جناب ابو طالب کی وفات کے بعد اپنی آنچ کے لحاظ سے پورے جوبن پر آ گئی۔ کوئی نہ تھا جو اس بھٹی میں نہ تپایا گیا ہو۔ مگر خوب اچھی طرح جل جل کر' تپ تپ کر اور پگھل پگھل کر اسلامی جماعت کے افراد کھرا سونا ثابت ہوئے۔ اس بھٹی کی آنچ کا سب سے بڑا حصہ تو تحریک کے لیڈر ----- محمد صلی اللہ علیہ وسلم ----- کے حصے میں آیا' لیکن آپؐ کے رفقاء پر بھی جو کچھ بیتی ہے اسے تاریخ کے ذریعے ہم پوری طرح کہاں جان سکتے ہیں اور کیسے محسوس کر سکتے ہیں؟ تاہم تاریخ کے پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہم دشمنان حق کے محاذ تشدد کا بالکل ہی مجمل تذکرہ کرنے کی گنجائش رکھتے ہیں۔

براہ راست آنحضورؐ کے خلاف تو ہر گھڑی اور ہر ہر سانس گوناگوں زیادتیاں کی ہی جاتی رہیں۔ لیکن آپؐ کے رفقاء کو جو اذیتیں دی جاتی تھیں وہ بھی بالواسطہ آپؐ ہی کے حساس قلب کو چھلنی کرنے والی تھیں۔ اب دیکھیے کہ کس پر کیا گزری؟

خباب بن الارت تمیمی جاہلیت کے دور میں غلام بنا کر بیچ ڈالے گئے تھے۔ اور ام انمار نے ان کو خریدا تھا۔ یہ اس وقت ایمان لائے جب کہ خانہ ارقم تحریک اسلامی کا مرکز تھا۔ اور وہیں سے آنحضرتؐ سارا جماعتی نظام چلا رہے تھے۔ قریش نے جلتے انگارے بچھا کر ان کو اس بستر آتشیں پر لٹایا۔ اور چھاتی پر ایک شخص کھڑا ہو گیا تاکہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ انگارے پیٹھ کے نیچے ہی ٹھنڈے ہو گئے۔ بعد میں خباب نے حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ پیٹھ دکھائی تو برص کی طرح کے سفید داغ اس پر نمایاں تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے یہ لوہار تھے۔ اسلام لانے کے بعد جب انہوں نے لوگوں سے واجب الوصول اجرتوں کا تقاضا کیا تو جواب ملا کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہیں کرو گے' ایک کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ یہ گویا معاشی چوٹ لگائی جا رہی تھی۔ مگر حق کا یہ سپاہی کہتا کہ تم لوگ جب تک مر کر زندہ نہ ہو جاؤ ایسا نہیں ہو سکتا۔

حضرت بلالؓ بن رباح حبشی' امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب سورج ٹھیک نصف النہار پر آ جاتا تو عرب کی تپتی ریت پر ان کو لٹایا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا تاکہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ امیہ اس حالت میں ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آ جاؤ' ورنہ اسی طرح ختم ہو جاؤ گے۔ حضرت بلالؓ جواب میں صرف "احد! احد" پکارتے۔ امیہ کا غصہ اور بھڑک گیا۔ اس نے آپ کے گلے میں رسی ڈال کر شہر کے لونڈوں کو ساتھ لگا دیا۔ وہ آپ کو گلی گلی گھسیٹتے پھرتے لیکن یہ عاشق جانباز اسی طرح "احد! احد" پکارتا

پھرتا۔ کبھی آپ کو گائے کی کھال میں لپیٹا جاتا' کبھی آہنی زرہ پہنا کر تیز دھوپ میں بٹھایا جاتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے امیہ بن خلف سے ایک غلام کے عوض میں خرید کر آزاد کر دیا۔

عمار بن یاسر قحطانی الاصل تھے۔ ان کے والد یاسر یمن سے اپنے دو بھائیوں کے ہمراہ ایک گم شدہ بھائی کی تلاش میں آئے تھے۔ دو بھائی تو واپس چلے گئے اور یاسر ابو حذیفہ مخزومی سے حلیفانہ تعلقات قائم کر کے مکہ میں ہی رہ پڑے اور یہیں شادی کر لی۔ یاسر سمیت تقریباً سارا ہی گھرانا اسلام لے آیا۔ چونکہ عمار بن یاسر کا کوئی قبیلہ مکہ میں نہ تھا' اس لیے ان پر خوب ستم ڈھائے جاتے۔ انھیں قبول اسلام کے جرم کی سزائیں دی جاتی کہ ان کو بھی جلتی زمین پر لٹایا جاتا۔ اور قریش ان کو اتنا مارتے کہ بار بار بے ہوش ہو جاتے۔ ان کے والدین پر بھی اسی طرح طبع آزمائی کی جاتی۔ پانی میں ان کو غوطے بھی دیے جاتے۔ اور انگاروں پر بھی تڑپایا جاتا۔ حضورؐ ان کے سر پر دست شفقت پھیر کر خاص دعا کرتے اور بشارت دیتے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ فرماتے کہ عمار سر سے پیر تک ایمان سے بھرا ہوا ہے۔

سمیہؓ جو حضرت عمار کی والدہ تھیں ان کو اسلام لانے پر ابو جہل نے نہایت وحشیانہ طریق سے برچھی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہی اولین خاتون ہے جو راہ حق میں شہید ہوئی۔

یاسرؓ جو حضرت عمار کے والد تھے وہ بھی ظلم سہتے سہتے شہید ہو گئے۔

صہیبؓ بھی عمارؓ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ ان کو اس بے دردی سے مارا جاتا تھا کہ دماغی توازن بار بار درہم برہم ہو جاتا۔ دور ہجرت میں قریش نے ان کو اس شرط پر مدینہ جانے کی اجازت دی کہ اپنا سارا مال و اسباب دے جائیں۔ انہوں نے بخوشی منظور کیا اور خالی ہاتھ نکل گئے۔

ابو فکیہہ جہنی صفوان بن امیہ کے غلام تھے۔ اور اسلام لانے میں حضرت بلالؓ کے ہمعصر۔ امیہ کو اطلاع ہوئی تو پاؤں میں رسی ڈلوا کر لوگوں سے کہا کہ تپتی ریت پر لٹانے کے لیے گھسیٹ کر لے جاؤ۔ راستے میں ایک گبریلا دکھائی دیا۔ تو امیہ نے ان سے کہا کہ "یہی تو تیرا خدا نہیں"۔ انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ کہ میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس پر امیہ نے اس زور سے ان کا گلا گھونٹا کہ لوگ یہ سمجھے کہ دم نکل گیا۔ مگر بچ گئے۔ ایک بار اتنا بھاری پتھر ان کے سینے پر لاد دیا کہ بے حال ہو جانے کی وجہ سے زبان باہر نکل آئی۔ کبھی ان کو لوہے کی بیڑیاں پہنا کر جلتی زمین پر الٹا لٹایا جاتا۔ ان کو بھی حضرت ابوبکرؓ نے خرید کر آزاد کرا دیا۔

لبینہؓ ایک کنیز تھیں حضرت عمرؓ اس کو نہایت ظالمانہ طریق سے مارتے' تھک جاتے تو کہتے کہ میں نے رحم کھا کر نہیں' بلکہ تھک جانے کی وجہ سے تجھے چھوڑ دیا ہے۔

زنیرہؓ [1] حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں اس لیے حضرت عمر پوری بے دردی سے مارتے۔ ابو جہل

---

[1] استیعاب میں ان کا نام زنبرہ لکھا ہے۔ سیرت سرور عالم جلد ۲ ص ۵۵۰

نے ان کو ایک مرتبہ اس جاہلانہ شان سے مارا کہ ان کی آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے ایمان کی برکت سے بطور خاص فضل و کرم کے اللہ تعالیٰ نے یکایک بینائی لوٹا دی۔ ان کو بھی حضرت ابوبکرؓ صدیق نے خرید کر آزاد کرایا۔

نہدیہ اور ام عنیس (اور بعض نے عمیس لکھا ہے) بھی دونوں کنیزیں تھیں۔ اور انہوں نے بھی انتہائی سخت ظلم سہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ جو عمر کے لحاظ سے بھی قابل احترام تھے اور مال و جاہ رکھتے تھے جب اسلام لائے تو ان کے اپنے چچا نے رسی سے باندھ کر پیٹا۔

حضرت زبیرؓ بن العوام کو اسلام لانے کی سزا دینے کے لیے ان کے چچا چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں دیتے تھے۔ مگر وہ پوری عزیمت سے فرماتے۔ "میں کفر تو اب ہرگز نہیں کروں گا"۔

سعیدؓ بن زید کو (یہ حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی تھے) حضرت عمرؓ نے رسیوں میں باندھ دیا۔

سعدؓ بن ابی وقاص کے ساتھ بھی ظالمانہ کارروائیاں روا رکھی گئیں۔

عبداللہؓ بن مسعود نے اسلام لانے پر حرم میں پہلی مرتبہ بآواز بلند قرآن پڑھا۔ سورہ رحمن کی تلاوت آپ نے شروع ہی کی تھی کہ کفار ٹوٹ پڑے اور منہ پر طمانچے مارنے لگے۔ مگر پھر بھی تلاوت جاری رکھی اور زخمی چہرے کے ساتھ واپس ہوئے۔

عثمان بن مظعون بن مغیرہ کی پناہ میں ہونے کی وجہ سے ابتداء مامون تھے۔ لیکن رسولؐ خدا کے اصحاب پر جو امتحانی گھڑیاں گزر رہی تھیں ان کو دیکھ کر عثمانؓ کے دل میں احساس پیدا ہوا کہ میں ایک مشرک کے سایہ حمایت میں امن چین سے کیوں رہوں جب کہ میرے ساتھی یہ کچھ بھگت رہے ہیں۔ انہوں نے ولید بن مغیرہ سے بات کی کہ میں پناہ واپس کرتا ہوں۔ ولید نے سمجھایا کہ "بھتیجے میری قوم کا کوئی فرد تمہارے ساتھ بدسلوکی نہ کر بیٹھے"۔ انہوں نے کہا کہ نہیں میں تو اللہ کی پناہ میں رہوں گا اور اس کے ماسوا اور کسی کی پناہ مجھے گوارا نہیں۔ کعبہ میں جا کر انہوں نے بآواز بلند ولید بن مغیرہ کی پناہ واپس کرنے کا اعلان کیا اور اس کے بعد قریش کی مجلس میں جا بیٹھے۔ لبید نے مصرعہ پڑھا۔ الا کل شیئی ماخلا اللہ باطل۔ عثمانؓ بولے تم نے سچ کہا۔ اس نے دوسرا مصرعہ پڑھا۔ وکل نعیم لا محالۃ زائل۔ انہوں نے کہا یہ بات تم نے غلط کہی ہے۔ جنت کی نعمتیں کبھی زائل نہ ہوں گی۔ لبید کا خون کھول گیا کہ یہ جسارت کس کی ہے۔ بولا: اے قریش! کون ہے جو تمہارے ہم نشین سے ایسی بدسلوکی کرتا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ احمقوں میں سے ایک احمق ہے' جنہوں نے ہمارے دین سے روگردانی کر لی ہے۔ سو اس کی بات کا زیادہ احساس نہ کرو۔ عثمان بھی چپ نہ رہ سکے۔ ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس پر وہی شخص اٹھا اور اس نے عثمان بن مظعون کو ایک تھپڑ ایسا مارا کہ ان کی آنکھ پھوٹ گئی۔ اس پر ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم اگر میری پناہ میں رہتے تو آنکھ سے یوں ہاتھ نہ دھو بیٹھتے۔ عثمان نے جواب دیا کہ میری جو آنکھ بچ رہی ہے وہ بھی قربان ہونے کو تیار ہے۔ میں

اس ہستی کی پناہ میں ہوں جو تم سے زیادہ صاحب عزت و مقدرت ہے۔

حضرت ابوذرؓ نے دعوت حق کو قبول کیا تو انقلابی روح سے سرشار ہو کر سیدھے حرم پہنچے' اور وہاں جا کر بآواز بلند اپنے نئے عقیدے کا اعلان کیا۔ قریش سٹ پٹا گئے اور کہنے لگے کہ یہ کون بے دین ہے' مارو اسے۔ چنانچہ مار پیٹ شروع ہو گئی۔ ارادے یہ تھے کہ ان کو جان سے مار دیا جائے۔ مگر حضورؐ کے چچا عباسؓ کا اتفاقاً گزر ہوا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو قبیلہ غفار کا آدمی ہے اور تمہیں تجارت کے لیے اسی قبیلہ کی حدود سے ہو کر جانا ہوتا ہے۔ کچھ ہوش کرو۔ لوگ باز آ گئے۔ دوسرے روز انہوں نے پھر عقیدے کا اعلان کیا۔ اور پھر مار کھائی۔

حضرت ام شریکؓ ایمان لائیں تو ان کے اعزہ و اقارب نے انہیں چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کر دیا۔ اس حالت میں وہ ان کو کھانے کے لیے روٹی کے ساتھ شہد دیتے اور پانی نہ پلاتے' تاکہ حدت کا دوگونہ عذاب بھگتیں۔ تین دن مسلسل اسی عالم میں گزر گئے۔ انتہائی کرب کے لمحوں میں ان سے مطالبہ کیا گیا کہ اسلام کو چھوڑ دو۔ ان کے حواس اس درجہ متاثر ہو چکے تھے کہ وہ اس بات کو سمجھ تک نہ سکی تھیں۔ پھر ظالموں نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ خدائے واحد کا انکار کرو۔ جب وہ مدعا سمجھ گئیں تو کہا کہ خدا کی قسم میں تو اپنے عقیدہ پر قائم ہوں۔

خالدؓ بن العاص کے قبول اسلام پر ان کے باپ نے اس قدر مارا' کہ سر زخمی ہو گیا۔ ان کو فاقہ کا عذاب بھی دیا گیا۔

غرضیکہ کون تھا جسے اس بھٹی میں نہ ڈالا گیا ہو۔ حضرت عثمانؓ کو ان کے چچا حکم بن العاص نے رسیوں میں جکڑ دیا۔ یہی سلوک جناب ابوبکرؓ اور طلحہؓ کے ساتھ ہوا۔ ولیدؓ بن ولید' عیاشؓ بن ابی ربیعہ اور سلمہؓ بن ہشام کو انتہائی اذیتیں دی گئیں اور پھر ان کو ہجرت سے بھی روکا گیا۔ جور و استبداد کا انتہائی مظاہرہ وہ بھی تھا جو اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ حضرت عمرؓ نے روا رکھا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ایک طرف اس زہرہ گداز سلسلۂ تشدد کو دیکھئے اور دوسری طرف تحریک اسلامی کے علمبرداروں کی استقامت ملاحظہ فرمایئے۔ کہ مرد' عورتیں' غلام اور لونڈیاں جو بھی اس مئے حق سے سرشار ہو گیا' پھر اس کا قدم پیچھے نہیں ہٹا۔ مظالم کسی ایک فرد کو بھی ارتداد کی راہ پر نہ ڈال سکے۔ صحیح معنوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انقلابی رو ان ہستیوں کے ذہنوں میں دوڑ رہی تھی اور ان کے صبر نے استبداد کو بالکل شکست دے دی۔ جو کوئی اسلام کی پکار پر لبیک کہہ دیتا۔ اس کے اندر سے بالکل ایک نیا انسان نمودار ہو جاتا اور اس کے سینے میں نئی قوتیں جاگ اٹھتیں۔

ہجرت حبشہ :

ہر مصیبت کی برداشت کی کوئی حد ہوتی ہے۔ امتحان کی جن کٹھن گھڑیوں سے تحریک اسلامی کے

علمبرداروں کو سابقہ درپیش تھا' ان کو سہارنے میں انہوں نے ہمیشہ کے لیے یادگاری نمونہ قائم کر دیا۔ لیکن ظلم و استبداد کی رَو کہیں تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ روز بروز زور پکڑتی جا رہی تھی۔ حضورؐ اپنے رفقاء کا حال دیکھ دیکھ کر کڑھتے۔ مگر کوئی زور نہیں چلتا تھا۔ سہارا تھا تو خدا کے ایمان کا تھا۔ آخرت کے یقین کا تھا' سچائی کی آخری فتح کی قوی امیدوں کا تھا' سوز بھری دعاؤں کا تھا۔ حضورؐ اپنے رفیقوں کو تسلی دلاتے کہ خدا کوئی نہ کوئی راستہ نکالے گا۔ بظاہر مکہ کی فضا یاس انگیز ہوتی جا رہی تھی اور اس امر کے آثار بالکل نہیں تھے کہ تحریک اسلامی کا شجرِ طیبہ اس سنگلاخ زمین میں برگ و بار لا سکے گا۔ حالات بتا رہے تھے کہ نظامِ حق کی تاسیس یہاں نہیں ہونے کی۔ بلکہ کسی دوسرے گوشہ زمین کو یہ سعادت ملنے والی ہے۔ تحریک اسلامی کی تاریخ میں پہلے بھی ہمیشہ ہجرت کا باب ضرور شامل رہا ہے۔ سو اندازہ ہو چلا تھا کہ محسن انسانیتؐ اور اس کے رفیقوں کو بھی وطن چھوڑنا ہو گا۔ ایک ہمہ گیر بین الانسانی دعوت اگرچہ کسی خاص ملک اور قوم میں ہی ابتدا کرتی ہے لیکن وہ وطن پرستی اور قوم پرستی سے بالاتر ہوتی ہے۔ ایک علاقے کے لوگ اگر نااہل ثابت ہوں تو وہ کسی دوسری آبادی کو مخاطب بنا لیتی ہے۔ لیکن جب تک خدا کی طرف سے واضح طور پر اذن نہ ہو جائے' انبیاء کی یہ شان نہیں ہوتی ہے کہ اولین مرکز دعوت کو چھوڑ دیں۔ تاہم حضورؐ جبر اور صبر کی آویزش کو ایسے مراحل میں داخل ہوتے دیکھ رہے تھے جہاں انسانی صبر کا پیمانہ چھلک سکتا ہے۔ مسلمان بے چین تھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ ان حالات میں حضورؐ نے صحابہ کو مشورہ دیا کہ "زمین میں کہیں نکل جاؤ' خدا جلد ہی تم کو کسی جگہ یکجا کر دے گا"۔ پوچھا گیا کہ کدھر جائیں۔ حضورؐ نے ملک حبش کی طرف اشارہ کیا۔ دراصل رسولؐ خدا کے علم میں تھا کہ وہاں کی بادشاہت انصاف پر قائم ہے اور عیسائیت کی مذہبی بنیادوں پر چل رہی ہے۔ آپؐ کے سامنے یہ امکان تھا کہ شاید یہی علاقہ دار الہجرت بننے کے لیے موزوں ہو۔ اسی لیے آپؐ نے اس ملک کے بارے میں فرمایا ھی ارض صدق" [1] (وہ سرزمینِ راستی ہے)

نبوت کے پانچویں سال حضورؐ کی انقلابی جماعت کے گیارہ مردوں اور چار عورتوں کا قافلہ حضرت عثمانؓ بن عفان کی زیرِ قیادت رات کی تاریکی میں حبشہ کو روانہ ہوا۔ حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ یعنی رسولؐ خدا کی صاحبزادی جناب رقیہؓ بھی اس اولین سفرِ ہجرت پر نکلیں۔ حضورؐ نے اس مبارک جوڑے کے متعلق فرمایا۔ لوط اور ابراہیم (علیہما السلام) کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جس نے خدا کی راہ میں وطن چھوڑا۔ [2]

اس قافلے کے نکلنے کے بعد جب قریش کو خبر ہوئی تو تعاقب میں آدمی دوڑے' مگر جب وہ بندرگاہ (جدہ) پہنچے تو معلوم ہوا ان کو عین وقت پر کشتیاں تیار مل گئی تھیں اور وہ رسائی سے باہر ہیں۔ یہ مہاجرین تھوڑا

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۴۳

❷ المواہب اللدنیہ ج ا ص ۵۱۔ رحمتہ للعالمین ج ا ص ۷۲

ہی عرصہ (رجب سے شوال تک) حبشہ میں ٹھہرے۔ ایک افواہ پہنچی کہ قریش نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سب پلٹ آئے۔ مگر مکہ کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ افواہ غلط تھی۔ اب سخت مشکل پیش آگئی کچھ لوگ چھپ کر شہر میں آئے اور کچھ کسی کی حمایت حاصل کر کے داخل ہوئے۔ اس طرح لوٹ آنے کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ پہلے سے بڑھ کر استبداد ہونے لگا۔

دوبارہ بہت بڑا قافلہ جس میں ۸۵ مرد اور ۱۷ عورتیں شامل تھیں' حبشہ جا پہنچا وہاں ان کو پر امن فضاء ملی' اور وہ اطمینان سے اسلام کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے لگے۔

اب دیکھیے کہ دشمنان حق کا کینہ کہاں تک پہنچتا ہے۔ ان لوگوں نے ایک مجلس میں سارے معاملے پر غور کر کے منصوبہ بنایا اور عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص کو سفارت کے لیے مامور کیا کہ یہ شاہ حبش سے جا کر بات کریں اور مہاجرین کو واپس لائیں۔ اس مقصد کے لیے نجاشی اور اس کے درباریوں کے لیے گراں بہا تحائف تیار کیے گئے۔ اور بڑے سرو سامان کے ساتھ سفارت روانہ ہوئی۔ حبش پہنچ کر یہ لوگ درباریوں اور پادریوں سے سازش کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اور ان کو رشوتیں دیں۔ ان کے سامنے معاملہ کی یہ صورت رکھی کہ ہمارے شہر میں چند سر پھرے لوگوں نے ایک مذہبی فتنہ اٹھا کھڑا کیا ہے۔ اور یہ تمہارے مذہب کے لیے بھی اتنا ہی خطرناک ہے جتنا ہمارے آبائی دھرم کے لیے' ہم نے ان کو نکال دیا تھا تو اب یہ یہاں آپ کی پناہ میں آ پڑے ہیں۔ ان کو یہاں ٹکنے نہیں دینا چاہیے۔ اس مقصد میں آپ ہم سے تعاون کریں۔ ان کی اصل کوشش یہ تھی کہ دربار میں سارا قضیہ زیر بحث نہ آنے پائے۔ اور مہاجرین کو سرے سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ بادشاہ یک طرفہ بات سن کر ان کو ہمارے حوالے کر دے۔ اسی مقصد کے لیے رشوت اور ساز باز کے طریقے اختیار کیے گئے تھے۔ یہ لوگ جب درباریوں کو روغن قاز مل چکے تو نجاشی کے سامنے تحائف لے کر پیش ہوئے۔ پھر اپنی غرض بیان کی کہ مکہ کے اشراف نے ہم کو آپ کی خدمت میں اس لیے بھیجا ہے کہ آپ ہمارے آدمیوں کو ہمارے ساتھ واپس کر دیں۔ درباریوں اور پادریوں نے بھی تائید کی۔ مگر نجاشی نے یک طرفہ دعوے پر کارروائی کرنے سے انکار کر دیا۔ اور صاف کہا کہ ان لوگوں سے دریافت احوال کیے بغیر میں ان کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔

دوسرے دن دربار میں دونوں فریق طلب کیے گئے۔ مسلمانوں کو جب طلبی کا پیغام پہنچا تو ان کے درمیان مشورہ ہوا کہ بادشاہ عیسائی ہے اور ہم لوگ اپنے اعتقاد اور مسلک میں اس سے اختلاف رکھتے ہیں تو آخر کیا کہا جائے۔ لیکن فیصلہ یہی ہوا کہ ہم دربار میں وہی کچھ کہیں گے جو کچھ خدا کے نبیؐ نے ہم کو سکھایا ہے۔ اور اس میں ایک سر مو فرق نہ لائیں گے ــــــ جو ہو سو ہو۔ اندازہ کیجیے کہ ان لوگوں کا ایمان کیسا محکم تھا۔ اتنے سنگین حالات میں حق اور راستی پر قائم رہنے کا عزم خدا کی دین ہے۔ پھر جب یہ حضرات دربار میں پہنچے تو مقررہ آداب کے مطابق نجاشی کو سجدہ کرنے سے اجتناب کیا۔ درباریوں نے اس طرز عمل

پر بُرا منایا۔ اور سوال کیا گیا' کہ آخر تم لوگوں نے سجدہ کیوں نہیں کیا۔ حضرت جعفرؓ (متکلم وفد) نے پوری جرأت سے جواب دیا کہ ہم لوگ سوائے اللہ کے کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ اور خود رسولؐ اللہ کو بھی سیدھے سادے طریق سے سلام ہی کہتے ہیں۔ غور کیجئے کن نازک حالات میں پکی توحید کا یہ انقلابی مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ حریف جس طاقت کے سامنے چاپلوسی کر رہے تھے' یہ لوگ اس کے روبرو اصول پسندانہ خود داری کا رنگ دکھا رہے تھے۔

اب سفارت مکہ نے اپنا دعویٰ پیش کیا کہ یہ مہاجرین ہمارے بھگوڑے مجرم ہیں۔ انہوں نے ایک نیا دین گھڑ لیا ہے اور ایک تخریبی طوفان اٹھا کھڑا کیا ہے۔ لہٰذا ان کو ہمارے حوالے کیا جائے۔ نجاشی نے مسلمانوں سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اور عیسائیت اور بت پرستی کے علاوہ وہ کون سا دین ہے جو تم لوگوں نے اختیار کیا ہے۔

حضرت جعفرؓ مسلمانوں کی طرف سے ترجمان بن کے اٹھے اور انہوں نے نجاشی سے اجازت طلب کی کہ پہلے وہ سفارت مکہ سے کچھ سوالات کرلیں۔ اجازت ملنے پر یوں مکالمہ ہوا۔

حضرت جعفرؓ۔ "کیا ہم کسی کے غلام ہیں جو آقا سے بھاگ آئے ہوں؟ اگر ایسا ہو تو ہمیں واپس کیا جانا چاہیے"۔

عمرو بن العاص۔ "نہیں' یہ لوگ کسی کے غلام نہیں۔ آزاد شرفا ہیں"۔

حضرت جعفرؓ۔ "کیا ہم کسی کو ناحق قتل کر کے آئے ہیں؟ اگر ایسا ہو تو آپ ہمیں اولیائے مقتول کے حوالے کردیں"۔

عمرو بن العاص۔ "نہیں۔ انہوں نے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہایا"۔

حضرت جعفر۔ "کیا ہم کسی کا کچھ مال لے کر بھاگے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو ہم اس کی ادائیگی کرنے کو تیار ہیں"۔

عمرو بن العاص: "نہیں۔ ان کے ذمہ کسی کا ایک حبہ بھی نہیں"۔

اس جرح سے جب مسلمانوں کی اخلاقی پوزیشن پوری طرح صاف ہو گئی۔ تو حضرت جعفرؓ نے یہ تقریر کی:

> "اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے' بت پوجتے تھے' مردار کھاتے تھے' بدکاریاں کرتے تھے' ہمسایوں کو ستاتے تھے۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا' قوی لوگ کمزوروں کو کھا جایا کرتے تھے۔ اسی اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت' سچائی اور دیانت سے ہم لوگ پہلے سے آگاہ تھے' اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی۔ اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں۔ سچ بولیں' خونریزی سے باز آئیں' یتیموں کا مال نہ کھائیں' ہمسایوں کو آرام دیں' عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں' نماز پڑھیں' روزے رکھیں۔ صدقہ دیں۔ ہم اس پر

ایمان لائے۔ شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے۔ اس جرم میں ہماری قوم ہماری جانوں کی دشمن ہو گئی۔ اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ پھر اسی گمراہی میں لوٹ جائیں۔ پس ہم اپنا ایمان اور اپنی جانیں لے کر آپ کی طرف بھاگ کر آئے ہیں۔ اگر ہماری قوم ہم کو وطن میں رہنے دیتی تو ہم نہ نکلتے۔ یہ ہے ہماری روداد!"

بات سچی ہو اور کہنے والا دلی جذبات کے ساتھ اسے کہے تو لازماً وہ اثر کرتی ہے۔ نجاشی جیسے خدا ترس بادشاہ کا دل موم ہو گیا۔ اب وہ کہنے لگا' کہ ذرا اس کتاب کا بھی کوئی حصہ سناؤ۔ جو تم لوگوں پر اتری ہے۔ چنانچہ حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کا ایک حصہ پڑھا۔ آیات الٰہی کو سن کر بادشاہ کے دل پر رقت طاری ہو گئی' اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ وہ بے اختیار پکار اٹھا۔ "خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں"۔ بلکہ اس پر مستزاد یہ کہا کہ "محمدؐ تو وہی رسول ہیں جن کی خبر یسوع مسیح نے دی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس رسولؐ کا زمانہ ملا"۔ ساتھ ہی فیصلہ دیا کہ مہاجرین کو واپس نہیں کیا جا سکتا۔ کارروائی ختم ہو گئی۔ اور سفارت ناکام لوٹی۔ بعد میں ان لوگوں نے پھر آپس میں مشورہ کیا کہ ایک کوشش اور کی جانی چاہیے۔ نجاشی عیسائی ہے اور اگر حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ دربار میں نمایاں کرایا جائے تو ممکن ہے کہ شاہ کے اندر مذہبی تعصب کی آگ بھڑک اٹھے۔

دوسرے دن عمرو بن العاص پھر دربار میں پہنچے اور نجاشی کے کان بھرنے کے لیے یہ الزام تراشا کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بہت خراب عقیدہ رکھتے ہیں۔ نجاشی نے پھر مسلمانوں کو طلب کر لیا۔ ان کو جب صورت حالات معلوم ہوئی تو کچھ تردد ہوا کہ عیسیٰ کے "ابن اللہ" ہونے کا انکار کرنے پر نجاشی کا ردعمل نہ جانے کیا ہو۔ لیکن عزیمت نے کہا کہ جو امر حق ہے اسے صاف صاف پیش کر دو۔ حضرت جعفرؓ نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

"ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے اور پیغمبر ہیں۔ اور کلمتہ اللہ ہیں"۔

نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ واللہ! جو تم نے کہا ہے عیسیٰؑ اس سے اس تنکے بھر بھی زیادہ نہیں ہیں۔ پادری جو سازش کا شکار اور رشوت اور ہدایا سے مسخر تھے' دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے نتھنوں سے سانس کی خرخراہٹ سنائی دینے لگی۔ نجاشی نے ان کی کچھ پروا نہیں کی۔ حکم دیا کہ تمام تحائف واپس کر دیے جائیں۔ مکہ کا وفد پوری طرح خائب و خاسر ہو کر لوٹا۔

عمرؓ مفتوح ہو جاتے ہیں:

تشدد کی اس داستان کا وہ باب سب سے ممتاز ہے' جو حضرت عمرؓ کے غیظ و غضب سے مرتب ہوا تھا۔ عمرؓ ستائیسویں سال میں تھے جب کہ نبوت محمدیؐ کا علم بلند ہوا۔ اسلام جلد ہی آپ کے گھرانے میں نفوذ کر گیا۔ آپ کے بہنوئی سعید پہلے پہل اسلام لائے' ان کے اثر سے آپ کی بہن فاطمہ بھی مسلمان ہو گئیں۔

خاندان کی ایک اور با اثر شخصیت نعیم بن عبداللہ نے بھی دعوت حق پر لبیک کہی۔ اول اول ان کو اسلام کے اس نفوذ کا حال معلوم نہیں ہو سکا' جونہی علم ہوا تو یہ آپے سے باہر ہو گئے اور اسلام لانے والوں کے دشمن بن گئے۔ لبینہؓ ان کے خاندان کی کنیز تھیں ان کو مارتے مارتے تھک جاتے تو دم لینے کے لیے الگ ہوتے' پھر تازہ دم ہو کر مارنا شروع کر دیتے۔

آخر ایک دن تہیہ کر لیا کہ کیوں نہ اصل داعیٔ حق ہی پر ہاتھ صاف کر لیا جائے۔ اس کا ایک محرک تاریخی روایات میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ ابوجہل نے رسول خدا کے قتل کرنے والے کے لیے انہی دنوں سو اونٹ کا انعام مقرر کیا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے مزاج سے بعید ہے کہ وہ ایسے لالچ کا شکار ہوئے ہوں۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ وہ اس اقدام کو ایک اخلاقی فرض اور اپنے آبائی دین کی خدمت سمجھ کے کرنا چاہتے تھے۔ بہرحال وہ تلوار لے کر چلے راستے میں نعیم بن عبداللہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو اور بہن اور بہنوئی سے نمٹ لو' پھر کسی اور طرف جانا۔ فوراً پلٹے اور بہن کے گھر پہنچے۔ وہ قرآن پڑھ رہی تھیں۔ آہٹ ہوئی تو خاموش ہو گئیں اور قرآن کے اوراق چھپا لیے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یہ کیا پڑھا جا رہا تھا۔ بہن نے ٹالا۔ کہنے لگے کہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم دونوں مرتد ہو چکے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی پر ٹوٹ پڑے۔ بہن بیچ بچاؤ کے لیے آئیں تو ان کو مارا۔ ان کا جسم لہولہان ہو گیا۔ لیکن ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ عزیمت مندانہ انداز سے کہنے لگیں۔

"عمرؓ! جو کچھ کر سکتے ہو' کرو! لیکن اسلام اب دل سے نہیں نکل سکتا"۔

ایک خاتون' اور وہ بھی بہن ---- ایک پیکر جذبات! ---- جسم زخمی! کپڑے خون آلود۔ آنکھوں میں آنسو! ---- اور زبان پر یہ عزیمت مندانہ بول! اندازہ کیجئے کہ اسلام نے کیسی روح نو خواتین تک کے اندر پیدا کر دی تھی۔ عمرؓ کی قاہرانہ طاقت نے اس مظلومانہ منظر کے سامنے ہار مان لی۔ ہیرے کا جگر پھول کی پتی سے کٹ گیا۔ فرمایا۔ "جو تم پڑھ رہی تھیں' مجھے بھی لا کر سناؤ"۔ وہ گئیں اور اجزائے قرآن نکال لائیں۔ جب یہ الفاظ سامنے آئے کہ "امنوا باللہ و رسولہ" تو بے اختیار پکار اٹھے۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ۔ ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر تحریک حق کے مرکز ---- خانہ ارقم ---- کی طرف چلے۔ وہاں جا کر خدا کے رسولؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس واقعہ پر مسلمانوں نے مارے خوشی کے ایسا نعرہ تکبیر بلند کیا کہ مکہ کا سارا ماحول گونج اٹھا۔ داعیان حق اٹھے اور مکہ میں پھیل گئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی قوت بڑھ گئی ہے۔ حضرت عمرؓ کے ایمان لاتے ہی کعبہ میں پہلی مرتبہ علانیہ نماز باجماعت کی ادائیگی کا سلسلہ شروع ہوا۔

حضرت عمرؓ مکہ کے نوجوانوں میں اپنے جوش اور ذہانت کی وجہ سے امتیازی مقام رکھتے تھے۔ ان کا کردار روح اخلاص سے مملو تھا۔ وہ جاہلیت کے دور میں تھے تو پورے اخلاص سے تحریک اسلامی کے دشمن تھے' نہ کہ کسی ذاتی مفاد کی بنا پر۔ اور جب حقیقت کھل گئی اور فطرت سلیمہ سے پردے اٹھ گئے تو پوری شان

اخلاص سے تحریک اسلامی کا علم اونچا کر دیا۔ ان کے جوش مخالفت کا انداز اگرچہ بے حد طوفانی تھا۔ مگر ان کی ذہانت اور ان کی فطرت سلیمہ برابر حقیقت کی روشنی جذب کرتی رہی۔ مکہ کی فضا میں جو مد و جزر ہو رہا تھا اس کی ہر لہر سے وہ اثر اندوز ہوتے رہے اور یکے بعد دیگرے بہت سے واقعات نے ان کے دل کو قبول حق کے لیے تیار کر دیا۔ ایک طرف روز دعوت حق کے چرچے ان تک پہنچتے ہوں گے' دوسری طرف اس کے مخالفین کی ذہنیت کی پستیاں ان پر نمایاں ہوتی ہوں گی' پھر ایک طرف وہ اس کردار کو دیکھتے ہوں گے جو محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقائے دعوت پیش کر رہے تھے اور دوسری طرف انسانی سیرت کی وہ تاریکیاں ان کی نگاہوں سے گزرتی ہوں گی۔ جن میں مخالفین اسلام ڈوبے ہوئے تھے۔ ہر صبح اور ہر شام یہ تقابلی مناظر مکہ کے اس بیدار دل نوجوان پر اثر انداز ہوتے ہوں گے لیکن اس عمومی صورتِ حالات کے علاوہ بعض خاص واقعات نے بھی کام کیا تھا۔

مثلاً ام عبداللہ بنت ابی حثمہ ہجرت حبشہ کی تیاریوں میں تھیں کہ حضرت عمران کے ہاں پہنچے۔ کہنے لگے "ام عبداللہ! معلوم ہوتا ہے کہ مکہ چھوڑنے کی تیاری ہے؟" ام عبداللہ نے جواب دیا۔ "ہاں' بخدا ہم خدا کی زمین میں ہجرت کر کے نکل جانے والے ہیں' تم لوگوں نے ہمیں بہت دکھ دیا ہے اور ہم پر استبداد ڈھایا۔ تا آنکہ اب خدا ہمارے لیے کوئی راہ نجات کھول دے"۔ عمرؓ کہنے لگے۔ "خدا تمہارا ساتھی ہو"۔ ام عبداللہ کا بیان ہے کہ اس لمحے ان پر ایسی رقت طاری تھی۔ جیسی میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہماری ترک وطن کی تیاریوں کو دیکھ کر وہ حالت اندوہ میں چلے گئے۔ اتنے میں عامر بن ربیعہ (ام عبداللہ کے شوہر) آ گئے' ام عبداللہ نے ان سے تذکرہ کیا کہ "کاش تم اس وقت عمرؓ کی رقت اور غمگینی دیکھتے جو ہماری وجہ سے ان پر طاری ہوئی"۔ عامر کہنے لگے۔ کیا تمہیں اس سے اسلام لانے کی امید بندھ گئی ہے؟ ام عبداللہ نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے کہا۔ "تم نے جسے دیکھا ہے وہ اس وقت تک اسلام نہیں لا سکتا جب تک کہ خطاب (حضرت عمرؓ کے والد کا نام) کا گدھا اسلام نہ لے آئے"۔ ام عبداللہ کہتی ہیں کہ اسلام کے بارے میں ان کی قساوت اور سنگ دلی کی وجہ سے اس درجہ کی ناامیدی تھی۔ [1]

لیکن کسے معلوم کہ اس واقعہ نے احساس کا ایک نیا کانٹا عمرؓ کے دل میں نہ چبھو دیا ہو گا۔ اسی طرح ایک دوسری روایت بتاتی ہے۔ کہ ان کا دل حضورؐ سے قرآن سن کر اثر پذیر ہوا۔ ان کا اپنا بیان یوں ہے کہ:۔

> میں اسلام سے بہت دور تھا۔ دور جاہلیت میں خوگر صہبا تھا۔ شراب سے رغبت تھی اور خوب پیتا تھا۔ حزورہ [2] میں ہماری محفل جمتی تھی۔ جس میں قریشی احباب جمع ہوتے۔ ایک رات میں اپنے انہی ہم نشینوں کی کشش میں اس مجلس میں پہنچا۔ ان کو تلاش کیا۔ مگر ان میں

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۶۵

[2] اس زمانے میں یہ مکہ کا ایک بازار تھا اب وہی قطعہ زمین مسجد میں شامل ہے۔

سے کوئی ایک بھی نہ ملا۔ پھر ایک شراب فروش کا خیال آیا کہ وہاں چل کر شراب پیوں۔ اتفاق سے وہ بھی نہ ملا۔ پھر خیال آیا کہ کیوں نہ کعبہ کا رخ کروں اور سات یا ستر بار طواف کر لوں' وہاں پہنچا تو دیکھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و سلم) کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ رکن اسود اور رکن یمانی کے درمیان (شام ـــــ یعنی بیت المقدس کے رخ) کھڑے تھے۔ ارادہ ہوا کہ بخدا کیوں نہ آج سنا جائے کہ یہ شخص کیا کہتا ہے۔ غلاف کعبہ کے اندر گھس کر آہستہ آہستہ قریب جا کر سنتا رہا۔ میرے اور رسولؐ خدا کے درمیان فقط غلاف کعبہ ہی حائل تھا۔ جب میں نے قرآن سنا تو میرا دل پگھل گیا۔ اور میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں اسی لیے اسلام میرے اندر داخل ہو گیا۔ ●

بقیہ روایت یہ بتاتی ہے کہ عمرؓ اسی وقت حضورؐ کے پیچھے پیچھے گئے اور اسلام قبول کر لیا۔ لیکن عملاً قبول اسلام کی وہی روایت صحیح ہے جس کی رو سے آپ کے ذہن نے آخری پلٹی بہن کے ایمان اور صبر و استقامت سے متاثر ہو کر کھائی۔ اس روایت کا یہ جز اپنی جگہ اہم ہے کہ عمرؓ جیسی شخصیت بغیر اس کے کہاں رہ سکتی ہے کہ بہ گوش خویش دعوت حق کو سنے اور اپنی رائے آپ قائم کرے۔ برسوں کے دور کشمکش میں ایسے واقعہ کا پیش آنا بالکل قرین قیاس ہے کہ حضرت عمرؓ نبی اکرمؐ کی زبان سے قرآن سننے پہنچے ہوں اور پھر آیات الٰہی نے ایمان کا بیج ان کے قلب میں بو دیا ہو۔

قرآن کی مخالفت کرنے والے اور بھی لوگ ـــــ بلکہ اکابرین تک ـــــ ایسے تھے کہ ذوق تجسس انہیں چوری چھپے اس آسمانی نغمہ کو سننے کے لیے آتا تھا۔ حالانکہ بر سر عام یہی لوگ کہا کرتے تھے کہ "قلوبنا فی اکنہ" (ہمارے دل ملفوف ہیں) "و فی اذاننا و قرا" (ہمارے کان بہرے ہیں) مثلاً ایک ہی رات کو ابو سفیان بن حرب' ابو جہل بن ہشام اور اخنس بن شریق چھپ کر حضورؐ کے گھر کے ارد گرد قرآن سن رہے تھے۔ اتفاق سے واپس ہونے لگے تو آمنا سامنا ہو گیا۔ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ ایسا نہ کرنا چاہیے۔ ورنہ اگر کوتاہ عقل عوام نے دیکھ لیا' تو ان کے دلوں میں خواہ مخواہ بات بیٹھ جائے گی۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اگلی رات وہ پھر آ پہنچے اور پھر وہی باتیں ہوئیں۔ اور وہی فیصلہ طے پایا۔ مگر پھر رات آئی تو وہی قصہ دوہرایا گیا۔ بالآخر بڑا تاکیدی عہد باندھا گیا کہ اب ایسی حرکت نہ ہونے پائے گی۔ اسی سلسلے میں یہ سوال اٹھا کہ ہر ایک کی کیا رائے ہے اس کلام کے متعلق جو محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کی زبان سے سنا گیا ہے۔ سب نے کچھ نہ کچھ کہا' اور سب سے آخر میں ابو جہل تنک کر کہنے لگا کہ "ہم اور بنو عبد مناف ہمیشہ حریف رہے۔' انہوں نے مہمانداریاں کیں تو ہم نے بھی کیں' انہوں نے خوں بہا دیئے' تو ہم نے بھی دیئے۔ انہوں نے سخاوت کی تو ہم نے بھی کی' یہاں تک کہ ہم ان کے ہمسر ہو گئے۔ تو اب وہ یہ کہنے پر اتر

● سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۶۸-۳۶۹

آئے ہیں کہ یہ ہمارا نبی ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے۔ ہم ایسی بات آخر کیونکر قبول کر سکتے ہیں۔ خدا کی قسم، ہم اس پر ایمان نہیں لا سکتے اور نہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں"۔ ❶

اس ضمنی قصے کو ہم نے اس لیے بیان کیا ہے کہ اس عمومی تجسس کا اندازہ کیا جا سکے جو کبھی نہ کبھی حضرت عمرؓ کو بھی رسولؐ خدا کے پاس کلام الٰہی بگوش خود سننے کے لیے لے گیا ہو گا۔

تحریک اسلامی کی نئی جست:

بہرحال اسلام عمرؓ ایک بڑا واقعہ تھا جس کے پیچھے بہت سارے محرکات کام کر رہے تھے۔ یہ واقعہ اس لحاظ سے اور بھی زیادہ بڑا ہو جاتا ہے کہ عین دور تشدد کے نصف النہار میں یہ مرد حق پسند آگے بڑھتا ہے۔ مخالف طاقت تشدد اس لیے ڈھا رہی تھی کہ لوگوں کو اسلام سے روکے، لیکن وہی تشدد ان کے منصوبوں کے بخلاف دلوں کو پگھلا رہا تھا۔ یہ صورت حالات اسلام کی صداقت پر بجائے خود بڑی قطعی شہادت ہے کہ جتنی زیادہ مزاحمتیں بڑھتی گئیں، اتنے ہی بہترین دل و دماغ کے لوگ اس کے سامنے مفتوح ہوتے گئے۔ ہجرت حبشہ کے بعد کے دور میں مکہ اپنے آخری جواہر پارے پیش کر رہا تھا۔

عمرؓ جیسی شخصیت سچائی کے پیغام پر لبیک کہے اور پھر کوئی نیا مد جزر پیدا نہ ہو، یہ کیسے ممکن تھا انہوں نے تہیہ کر لیا کہ ایک بار فضا کو چیلنج کر کے رہیں گے۔ ابن عمرؓ (جو اس وقت لڑکے تھے مگر معاملات کو سمجھتے تھے) کا بیان ہے، کہ میرے والد عمرؓ جب ایمان لائے تو معلوم کیا کہ قریش کا کون سا آدمی بات کو اچھی طرح نشر کر سکتا ہے۔ انہیں جمیل بن معمر جمحی کا نام بتایا گیا۔ وہ علی الصباح اس کے ہاں پہنچے اور میں بھی ساتھ گیا کہ دیکھوں کیا کرتے ہیں۔ اس سے جا کر کہنے لگے کہ اے جمیل تمہیں معلوم ہے کہ میں اسلام لا چکا ہوں اور محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کے دین میں شامل ہو گیا ہوں۔ وہ اپنی چادر تھامتے ہوئے مسجد حرام کے دروازے پر پہنچا۔ اور وہاں گلا پھاڑ کر اعلان کیا کہ اے گروہ قریش! سنو! عمرؓ بن خطاب صابی ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ بھی پیچھے سے آ پہنچے اور انہوں نے پکار کر کہا۔ غلط کہتا ہے۔ میں مسلمان ہوا ہوں اور میں نے اعلان کیا ہے کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور اس کے رسولؐ ہیں۔ اہل قریش ان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ والد سے خوب لڑے۔ اور والد ان سے لڑے اور اسی ہاتھا پائی میں سورج سر پر آگیا۔ اسی اثنا میں ایک قریشی سردار یمنی حلہ اوڑھے ہوئے نمودار ہوا۔ اور اس نے پوچھا۔ قصہ کیا ہے؟ اس نے بات سنی اور کہا کہ "اس شخص نے اپنے لیے ایک راستہ پسند کر لیا ہے تو اب تم کیا چاہتے ہو؟ سوچو تو سہی کہ کیا بنو عدی بن کعب اپنے آدمی کو یوں تمہارے ہاتھوں میں دے سکتے ہیں۔ چھوڑ دو اسے۔ یہ تھے عاص بن وائل سہمی، انہوں نے حضرت عمرؓ کو اپنی پناہ میں لے..........

---

❶ [illegible]

لیا۔ ❶

اسی کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ کے جوش ایمانی نے اپنے اظہار کا ایک راستہ اور بھی نکالا۔ انہوں نے ایمان لانے کی پہلی ہی رات کو سوچا کہ رسولؐ خدا کی مخالفت میں انتہائی متشدد کون ہے؟ معلوم ہوا کہ ابوجہل سے بڑھ کر سخت کوئی دوسرا نہیں۔ صبح ہوتے ہی ابوجہل کے ہاں بھی جا پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا ابوجہل نکلا اور خوش آمدید کہہ کر مدعا پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ میں یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ سلم) پر ایمان لے آیا ہوں۔ اور آپؐ کے پیغام کی سچائی کو تسلیم کر چکا ہوں۔ ابوجہل نے بھنا کر دروازہ بند کر لیا۔ اور کہا کہ "خدا کی مار تجھ اور تیری اس اطلاع پر"۔

تیسری طرف انہوں نے تحریک اسلامی کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ مار تو کھائی مگر اس کے جواب میں حرم میں علی الاعلان نماز ادا کرنے کا آغاز کر دیا۔ بقول حضرت عبداللہ بن مسعود: "ہم حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے قبل اس پر قادر نہ تھے کہ کعبہ میں نماز ادا کر سکیں۔ عمرؓ مسلمان ہوئے تو قریش سے لڑ کر کعبہ میں نماز ادا کی اور ہم نے بھی ان کے ساتھ نماز ادا کی"۔

ایک طرف تشدد کا وہ زور دیکھیے اور دوسری طرف یہ سماں ملاحظہ ہو کہ اسلام' دشمنوں میں سے بہترین عنصر کو چھانٹ رہا تھا۔

اسلام حمزہؓ:

ایسا ہی واقعہ حضرت حمزہؓ کا ہے۔ مکہ کا یہ نوجوان ذہانت' شجاعت اور اثر کا مالک تھا۔ حضورؐ کے چچاؤں میں سے جناب ابو طالب کے بعد ایک یہی چچا ایسا تھا جسے اختلاف کے باوجود آپؐ سے محبت تھی۔ عمر بھی صرف دو تین برس زیادہ تھی اور ہم عمری کی وجہ سے بچپن میں چچا بھتیجا ہم جولی رہے تھے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ کوہ صفا کے پاس ابوجہل نے حضورؐ پر دست درازی کی' اور بہت دریدہ دہنی سے کام لیا۔ حضورؐ نے صبر سے اس اذیت کو برداشت کیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اتفاق سے عبداللہ بن جدعان کی لونڈی نے یہ سارا ماجرا دیکھا۔ حضرت حمزہؓ شکار پر گئے ہوئے تھے۔ کمان اٹھائے ہوئے واپس آئے تو اس لونڈی نے قصہ سنایا اور کہا کہ' "ہائے اگر تم خود دیکھ سکتے کہ تمہارے بھتیجے پر کیا گزری"۔ یہ سن کر حمزہؓ کی حمیت جاگ اٹھی۔ سیدھے قریش کی مجلس میں پہنچے' جہاں ابوجہل بیٹھا تھا۔ حرم میں جا کر ابوجہل کے سر پر کمان ماری اور کہا کہ "کیا تم نے محمدؐ کو گالی دی تھی۔ اگر ایسا ہے تو میں بھی اس کے دین پر ہوں اور جو کچھ وہ کہتا ہے وہی کچھ میں بھی کہتا ہوں۔ اب اگر ہمت ہے تو میرے مقابلے پر آؤ"۔ ابوجہل کی حمایت میں بنی مخزوم کا ایک شخص مجلس سے اٹھا مگر ابوجہل نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ جانے دو'

---

❶ سیرت ابن ہشام جلد ۱۔ ص ۳۷۰-۳۷۱

میں نے ابو عمارہ کے بھتیجے کو بہت گندی گالیاں دی ہیں۔ حضرت حمزہؓ اسلام پر ڈٹ گئے اور قریش نے محسوس کر لیا کہ رسولؐ خدا کی قوت بڑھ گئی ہے۔ ❶

مقاطعہ اور نظر بندی:

دشمنان حق اپنی ساری تدبیروں کے علی الرغم یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ حق کا سیلاب آگے ہی آگے بڑھ رہا ہے اور بڑی بڑی اہم شخصیتوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اس پر ان کا اضطراب اور بڑھ جاتا۔ محرم ۷ نبوی میں مکہ کے تمام قبائل نے مل کر ایک معاہدہ کیا کہ خاندان بنو ہاشم سے بائیکاٹ کیا جائے اور کوئی شخص نہ ان سے قرابت رکھے نہ ان سے شادی بیاہ کا تعلق رکھے۔ نہ لین دین کرے' نہ ان سے ملے جلے۔ اور نہ کھانے پینے کا کوئی سامان ان تک پہنچنے دے۔ الا آنکہ بنو ہاشم محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کو ہمارے سپرد کر دیں اور ان کو قتل کرنے کا ہمیں حق دے دیں۔ یہ فیصلہ جناب ابو طالب سے متعدد گفتگوؤں کے بعد اس امر سے مایوس ہو کر کیا گیا تھا کہ نہ ابو طالب رسولؐ اللہ کو اپنی سرپرستی سے نکالنے پر تیار ہیں اور نہ ان کی وجہ سے بنو ہاشم تعلق منقطع کر سکتے ہیں۔ بہرحال قبائلی دور کے لحاظ سے یہ فیصلہ انتہائی سنگین تھا اور ایک آخری کارروائی کی نوعیت رکھتا تھا۔ بنو ہاشم بے بس ہو کر شعب ابی طالب میں پناہ گزین ہو گئے۔ گویا پورا خاندان تحریک اسلامی کے داعی کی وجہ سے ایک طرح کی قید اور نظر بندی میں ڈال دیا گیا۔ اس نظر بندی کا دور تقریباً تین برس تک طویل ہوا۔ اور اس دور میں جو احوال گزرے ہیں ان کو پڑھ کر پتھر بھی پگھلنے لگتا ہے۔ درختوں کے پتے تک کھائے جاتے رہے۔ اور سوکھے چمڑے ابال ابال کر اور آگ پر بھون بھون کر کھائے جاتے رہے۔ حالت یہ ہو گئی۔ کہ بنو ہاشم کے معصوم بچے جب بھوک کے مارے بلکتے تھے تو دور دور تک انکی درد بھری آوازیں جاتی تھیں۔ قریش ان کی آوازوں کو سنتے تو مارے خوشی کے جھوم جھوم جاتے۔ ناکہ بندی اتنی شدید تھی کہ ایک مرتبہ حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ کے بھتیجے) نے کچھ گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ چوری چھپے بھیجا' راستہ میں ابو جہل نے دیکھ لیا اور گیہوں چھیننے کے در پے ہوا۔ اتفاق سے ابوالبختری بھی آ گیا۔ اس کے اندر کسی اچھے انسانی جذبے نے کروٹ لی۔ اور اس نے ابو جہل سے کہا کہ چھوڑو بھی ایک بھتیجا ہے تو تم اسے بھی اب روکتے ہو' اسی طرح ہشام بن عمرو چوری چھپے کچھ غلہ بھیج دیتے تھے۔

یہی ہشام بن عمرو اس ظالمانہ معاہدہ کے خلاف داعی اول بنا۔ پہلے یہ زہیر بن ابی امیہ کے پاس گیا۔ اس سے بات کی کہ کیا تم اس بات پر خوش ہو کہ تم کھاؤ پیو' کپڑا پہنو' شادی بیاہ کرو اور تمہارے ماموؤں کا یہ حال ہو' کہ وہ نہ خرید و فروخت کر سکیں' نہ شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر سکیں۔ اگر معاملہ ابوالحکم ابن

---

❶ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۱۳۔ ۳۱۲

ہشام کے ماموؤں اور ننہیال کا ہوتا اور تم نے اسے ایسے معاہدے کی دعوت دی ہوتی تو وہ کبھی اس کی پروا نہ کرتا۔ یہ سن کر زہیر نے کہا۔ "میں کیا کروں' میں تو اکیلا آدمی ہوں۔ خدا کی قسم! اگر کوئی دوسرا میرے ساتھ ہوتا تو میں اس معاہدے کی منسوخی کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا اور اسے ختم کر کے دم لیتا"۔ ہشام بن عمرو نے کہا۔ کہ "دوسرا ساتھی تو تمہیں مل گیا ہے"۔ زہیر نے پوچھا "کون؟" ہشام نے کہا۔ "میں"! پھر ہشام مطعم بن عدی کے پاس پہنچا۔ اور اسی طرح تحریک کی۔ اس نے بھی وہی جواب دیا۔ کہ "اکیلا ہوں کیا کروں؟" ہشام نے وہی جواب دیا کہ دوسرا میں ہوں مطعم نے کہا۔ کہ اب کسی تیسرے کو ڈھونڈنا چاہیے۔ ہشام نے بتایا کہ وہ تو میں نے مہیا کر لیا ہے' اس نے پوچھا' کون؟ ہشام نے بتایا کہ زہیر بن ابی امیہ۔ مطعم کہنے لگا کہ پھر کسی چوتھے کو حاصل کرنا چاہیے اسی طرح ابوالبختری اور زمعہ بن الاسود تک پہنچ کر ہشام نے بات کی۔

غرض بائیکاٹ کے معاہدے کے خاتمے کی تحریک اندر ہی اندر جب کام کر چکی تو ان سب لوگوں نے ایک جگہ بیٹھ کر طریق کار طے کیا۔ اسکیم یہ بنی کہ بر سر عام ہشام ہی بات چھیڑے گا۔ چنانچہ ہشام نے بیت اللہ کا سات بار طواف کیا۔ پھر لوگوں کی طرف آیا اور کہا کہ مکہ والو! کیا یہ زیبا ہے کہ ہم کھانے کھائیں اور لباس پہنیں' اور بنو ہاشم بھوک سے تڑپ رہے ہوں' نہ وہ کچھ خرید سکیں' اور پھر اس نے اپنا عزم ان الفاظ میں پیش کر دیا:۔

> "خدا کی قسم! میں اس وقت تک نہ بیٹھوں گا جب تک کہ تعلقات کو توڑ دینے والی اس ظالمانہ تحریر کو چاک چاک نہ کر لوں"۔
>
> ابو جہل بھنا کر اٹھا اور چیخ کر بولا۔ "جھوٹے ہو تم۔ خدا کی قسم تم اسے چاک نہیں کر سکتے"۔

زمعہ بن الاسود نے ابوجہل کو جواب دیا۔ "تم' خدا کی قسم! سب سے بڑھ کر جھوٹے ہو۔ یہ معاہدہ معلوم ہے جس ڈھب سے لکھا گیا ہے ہم اسے پسند نہیں کرتے"۔ ابوالبختری بھی بول اٹھا "سچ کہا زمعہ نے ہم کو پسند نہیں جو کچھ اس میں لکھا گیا ہے اور نہ ہم اس کو مانتے ہیں"۔ مطعم نے بھی تائید مزید کی۔ "تم دونوں ٹھیک کہہ رہے ہو اور غلط کہتا ہے جو اس کے علاوہ کچھ کہتا ہے"۔ ہشام نے بھی یہی بات کی۔ اکثریت کو یوں مخالف پا کر ابو جہل اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اور معاہدہ چاک کر دیا گیا۔ لوگ جب اسے دیوار کعبہ سے اتارنے لگے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ اسے دیمک چاٹ چکی تھی۔ صرف "باسمک اللھم" کے الفاظ سلامت تھے۔ [1]

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۱ ۔ ۲۳

سال اندوہ:

دور نظربندی کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ایک بار پھر خدا کا نبیؐ اپنے گھرانے سمیت آزادی کی فضا میں داخل ہوا۔ لیکن اب اس سے بھی سخت تر دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نبوت کا دسواں سال تھا۔ اس سال میں اولین سانحہ یہ پیش آیا کہ حضرت علیؓ کے والد ابو طالب کی وفات ہوگئی۔ اس طرح وہ ایک ظاہری سہارا بھی چھن گیا جو حضورؐ کو اپنے سایہ شفقت میں لیے ہوئے دشمنوں کے لیے پوری استقامت سے آخر دم تک مزاحم رہا تھا۔

اسی سال دوسرا صدمہ حضورؐ کو حضرت خدیجہؓ کی رحلت کا اٹھانا پڑا۔ حضرت خدیجہؓ محض حضورؐ کی بیوی ہی نہ تھیں۔ بلکہ سابقون الاولون میں تھیں۔ اور انہوں نے دور رسالت سے قبل بھی موانست و غمگساری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اور اولین وحی کے نزول سے لے کر تادم آخر راہ حق میں حضورؐ کے ساتھ بھی رفاقت کا حق ادا کر کے دکھلا گئیں۔ تحریک حق کی حمایت میں مال بھی خرچ کیا۔ قدم قدم پر مشورے بھی دیئے اور دلی جذبے سے تعاون دکھایا۔ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ "کانت لہ وزیرا"۔ (وہ حضورؐ کے لیے وزیر تھیں)

ایک طرف تو یکے بعد دیگرے یہ دو صدمے حضورؐ کو سہنے پڑے اور دوسری طرف ان ظاہری سہاروں کے ہٹ جانے کی وجہ سے مخالفت کا طوفان اور زیادہ چڑھاؤ پر آگیا۔ اب تو گویا موجیں سر سے گزرنے لگیں۔ مگر مشیت الٰہی کا تقاضا غالباً یہ تھا کہ سچائی اپنا راستہ آپ بنائے' سچائی اپنی حفاظت آپ کرے۔ سچائی اپنے لیے خود ہی واحد سہارا ثابت ہو۔ اب جو دنیوی سہارے پوری طرح ہٹا لیے گئے تھے' شاید اس کے بغیر سچائی کی روح پوری طرح واضح نہ ہو سکتی۔ انہیں غم انگیز حالات کی وجہ سے یہ سال سال اندوہ یا عام الحزن کے نام سے موسوم ہوا۔

اب قریش انتہائی ذلیل حرکتوں پر اتر آئے۔ لونڈوں کے غول پیچھے لگا دیئے جاتے جو شور مچاتے' اور حضورؐ نماز پڑھتے تو وہ تالیاں پیٹتے۔ راستہ چلتے ہوئے حضورؐ پر غلاظت پھینک دی جاتی۔ دروازے کے سامنے کانٹے بچھائے جاتے۔ کبھی گلا گھونٹ دیا جاتا۔ اور کبھی دست تعدی دراز کیا جاتا۔ کھلم کھلا گالیاں دی جاتیں۔ پھبتیاں کسی جاتیں۔ آپؐ کے چہرۂ مبارک پر خاک پھینکی جاتی۔ بلکہ بعض خبیث بدتمیزی کی اس آخری حد تک پہنچے کہ آپؐ کے رخ انور پر تھوک دیتے۔

ایک بار ابو لہب کی بیوی ام جمیل پتھر لیے حضورؐ کی جستجو میں حرم تک اس ارادے سے آئی کہ بس ایک ہی وار میں کام تمام کر دے۔ مگر حضورؐ اگرچہ حرم میں سامنے ہی موجود تھے لیکن خدا نے اس کی نگاہ کو رسائی نہ دی۔ اور وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے اپنے دل کا بخار نکال کر چلی آئی۔ اس نے اپنے یہ اشعار بھی پڑھے۔

مذمما عصینا و امرہ ابینا و دینہ قلینا۔

مذمم (حضورؐ کو محمدؐ کے بجائے مذمم کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی گئی) کی ہم نے نافرمانی کی اس کی بات ماننے سے ہم نے انکار کیا۔ اس کے دین سے ہم نے بغض رکھا (نام بگاڑنا اور برے برے الفاظ استعمال کرنا اخلاقی پستی کی دلیل ہے۔ حریف جب بالکل ذلت میں گر جاتا ہے تو ان گندے ہتھیاروں سے کام لیتا ہے)

اس پر حضورؐ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان لوگوں کے سب و شتم سے یوں بچاتا ہے کہ یہ مذمم کو گالی دیتے ہیں۔ اور میں محمدؐ ہوں۔

اسی طرح ایک بار ابوجہل نے پتھر سے حضورؐ کو ہلاک کر دینے کا ارادہ کیا۔ اور اسی ارادے میں حضورؐ تک پہنچا بھی۔ مگر خدا نے ابوجہل کو خوف و مرعوبیت کے ایسے عالم میں ڈالا کہ وہ کچھ کر نہ سکا۔

ایک بار دشمنوں کا غول کا غول ٹوٹ پڑا اور محسن انسانیتؐ کو سخت اذیت دی۔ واقعہ یوں ہوا کہ دشمنان حق بیٹھے یہی تذکرہ کر رہے تھے کہ اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملے میں ہم نے جو کچھ برداشت کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی دوران میں حضورؐ تشریف لے آئے۔ ان لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا تم ایسا کہتے ہو۔ حضورؐ نے پوری اخلاقی جرأت سے فرمایا۔ ہاں! میں ہوں جو یہ اور یہ کہتا ہے! بس یہ کہنا تھا کہ چاروں طرف سے دھاوا بول دیا گیا۔ عبداللہ بن عمرو بن عاص کا بیان ہے کہ قریش کی طرف سے اس سے بڑھ کر حضورؐ کے خلاف میں نے کوئی دراز دستی نہیں دیکھی۔

حملہ آور رک گئے تو خدا کے رسولؐ نے بڑی فوق الانسانی جرأت سے کام لے کر ان کو ان الفاظ سے متنبہ کیا کہ "میں تمہارے سامنے یہ پیغام لایا ہوں کہ تم ذبح ہو جانے والے ہو۔" یعنی استبداد کی یہ چھری جو تم مجھ پر تیز کر رہے ہو' تاریخ میں کام کرنے والا قانون الٰہی بالآخر اسی سے خود تم کو ذبح کر ڈالے گا۔ تمہارا یہ زور و اقتدار جو ظلم کے رخ پڑ گیا ہے' یہ یکسر ختم ہو جانے والا ہے۔

ان تفصیلی واقعات کے زمان وقوع کے بارے میں قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ واقعات انتہائی دور تشدد سے متعلق ہو سکتے ہیں اور یہ دور بہرحال جناب ابوطالب کی وفات کے بعد نمودار ہوا تھا۔

حضرت عثمانؓ بن عفان ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ عقبہ بن معیط' ابوجہل اور امیہ بن خلف حطیم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب حضورؐ ان کے سامنے سے گزرتے تو وہ کلمات بد زبانوں پر لاتے۔ تین بار ایسا ہی ہوا۔ آخری مرتبہ حضورؐ نے چہرہ متغیرہ کے ساتھ کہا کہ "بخدا تم بغیر اس کے باز نہ آؤ گے کہ خدا کا عذاب جلد تم پر ٹوٹ پڑے"۔ حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ ہیبت حق تھی کہ یہ سن کر ان میں سے کوئی نہ تھا جو کانپ نہ رہا ہو۔ یہ فرما کر حضورؐ اپنے گھر کو چلے تو حضرت عثمانؓ اور دوسرے لوگ ساتھ ہو لیے۔ اس موقعہ پر حضورؐ نے ہم سے خطاب کر کے فرمایا:

"تم لوگوں کو بشارت ہو۔ اللہ تعالیٰ یقیناً اپنے دین کو غالب کرے گا اور اپنے کلمہ کی تکمیل

کرے گا۔ اور اپنے دین کی مدد کرے گا۔ اور یہ لوگ جنہیں تم دیکھتے ہو' اللہ تعالیٰ بہت جلد تمہارے ہاتھوں سے ذبح کرائے گا"۔

غور کیجئے کہ بظاہر یاس انگیز ماحول میں یہ بشارت دی جا رہی تھی اور پھر کس شان سے یہ بہت ہی جلد پوری ہوئی ---- گویا تحریک حق نے ہتھیلی پر سرسوں جما دی۔

طائف میں دعوت حق:

زمانی لحاظ سے قطعیت کے ساتھ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ واقعہ کب کا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے سورہ مدثر کے شان نزول کے طور پر بیان کیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اسے ابتدائی دور میں رکھنا چاہیے مگر واقعہ کی نوعیت کہتی ہے کہ اس کا زمانہ مکی دور کے اواخر کی طرف ہو گا۔

ایک روز رسول اکرم ﷺ علی الصباح گھر سے نکلے اور خدا کا پیغام سنانے کے لیے مکہ کے مختلف کوچوں میں گھومے پھرے لیکن وہ ایک دن پورا ایسا گزرا کہ آپ کو ایک آدمی بھی ایسا نہ ملا' جو بات کو سنتا۔ نئی اسکیم یہ اختیار کی گئی تھی کہ آپ کو جب آتے دیکھا جائے۔ تو لوگوں کو چاہیے کہ ادھر ادھر سٹک جائیں۔ باتیں سننے سے بات پھیلتی ہے اور مخالفت کرنے سے اور بحثیں چھیڑنے سے وہ اور زیادہ ابھرتی ہے۔ اسکیم کامیاب رہی۔ جو لوگ ملے بھی انہوں نے استہزاء اور غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا۔ اس روز آپ پورا دن گزار کر جب پلٹے تو اداسی کا ایک بھاری بوجھ آپ کے سینے پر لدا ہوا تھا۔ سخت گھٹن تھی ---- ایسی گھٹن جو کسی کی خیر خواہی کرنے والے کو اس وقت ہوتی ہے کہ جس کی وہ خیر خواہی کر رہا ہو' وہی خود محسن کشی پر اتر آئے۔

اس خاص دن کا تجربہ گویا اس امر کی اطلاع تھا کہ مکہ کی کھیتی اب بنجر ہوتی جا رہی ہے اور اسے جو کچھ فصل دینی تھی وہ دے چکی ہے۔ بعد کے حالات ---- بد سے بدتر ہوتے ہوئے حالات نے اس کی توثیق کی اور آہستہ آہستہ جوہر قابل رکھنے والے آخری ذرات بھی محسن انسانیتؐ کے گردست آ گئے۔ شاید اسی دن سے آپؐ کے دل میں یہ رجحان پیدا ہو گیا تھا کہ اب مکہ سے باہر نکل کر کام کرنا چاہیے۔ ایک بصیرت مند داعی جب اپنے ابتدائی مرکز پر اتنا کام کر چکتا ہے کہ وہاں کے کار آمد لوگ لبیک کہہ دیتے ہیں اور باقی صرف ضدی معاندین رہ جاتے ہیں' تو پھر وہ اپنی قوتیں خواہ مخواہ ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ نئی کھیتی تلاش کرتا ہے اور ماحول کو بدل کر تجربہ کرتا ہے۔

ایسے ہی حالات میں نبی اکرمؐ نے مکہ کے گرد و پیش میں کام کرنے کا ارادہ باندھا۔ دعوت کی نسیم فی الحقیقت طائف کے لیے چلی تھی۔ زیدؓ بن حارثہ کو ساتھ لے کر سرور عالمؐ مکہ سے پیدل چلے اور راستے میں جو قبائل آباد تھے' ان سب کے سامنے خدا کا پیغام پیش کیا۔ قریباً ایک مہینہ کی مدت آنے جانے میں صرف ہو گئی۔

طائف ایک بڑا سرسبز قطعہ تھا۔ پانی، سایہ، کھیتیاں، باغات۔ نسبتاً ٹھنڈا مقام۔ لوگ بڑے خوشحال تھے اور دنیا پرستی میں بری طرح مگن۔ انسان ایک مرتبہ معاشی خوشحالی پالے تو پھر وہ خدا فراموشی اور اخلاق باختگی میں دور تک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہی حال اہل طائف کا تھا۔ مکہ والوں میں تو پھر بھی مذہبی سربراہی اور ملکی قیادت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے کسی قدر اخلاقی رکھ رکھاؤ ہو سکتا تھا لیکن طائف کے لوگ پوری طرح لاابالی ڈھب کے تھے۔ اور پھر سود خواری نے ان کے اچھے انسانی احساسات کو بالکل ملیا میٹ کر دیا تھا۔ حضورؐ گویا مکہ سے بدتر ماحول میں قدم رکھ رہے تھے۔

محسن انسانیتؐ طائف میں پہنچے تو پہلے ثقیف کے سرداروں سے ملاقات کی۔ یہ تین بھائی تھے ---- عبد یالیل، مسعود اور حبیب۔ ان میں سے ایک کے گھر میں قریش (بنی جمح) کی ایک عورت تھی۔ اس وجہ سے ایک طرح کی لحاظ داری کی توقع ہو سکتی تھی۔ حضورؐ ان کے پاس جا بیٹھے۔ ان کو بہ طریق احسن اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا۔ اور اپنی دعوت پر گفتگو کی اور ان سے اقامت حق کے کام میں حمایت طلب کی۔ اب جواب سنئے جو تینوں کی طرف سے ملتا ہے:

ایک:۔ "اگر واقعی خدا نے ہی تم کو بھیجا ہے تو بس پھر وہ کعبہ کا غلاف نچوانا چاہتا ہے۔"

دوسرا:۔ "ارے! کیا خدا کو تمہارے علاوہ رسالت کے لیے کوئی اور مناسب آدمی نہ مل سکا"۔

تیسرا:۔ "خدا کی قسم! میں تجھ سے بات بھی نہیں کروں گا۔ کیونکہ اگر تو اپنے کہنے کے مطابق واقعی اللہ کا رسول ہے، تو پھر تجھ ایسے آدمی کو جواب دینا سخت خلاف ادب ہے۔ اور اگر تم نے خدا پر افتراء باندھا ہے تو اس قابل نہیں ہو کہ تم سے بات کی جائے"۔

زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے جو انسانیت کے محسنؐ کے سینے میں پے در پے پیوست ہوتے چلے گئے۔ آپؐ نے تحمل سے اپنے دل پر سارے زخم سہہ لیے اور ان کے سامنے آخری بات یہ رکھی کہ تم اپنی یہ باتیں اپنے ہی تک رکھو اور کم سے کم عوام کو ان سے متاثر نہ کرو۔

مگر انہوں نے اپنے ہاں کے گھٹیا اور بازاری لونڈوں اور نوکروں اور غلاموں کو ہشکا کر آپؐ کے پیچھے لگا دیا۔ کہ جاؤ اور اس شخص کو بستی سے نکال باہر کرو۔ ایک غول کا غول آگے پیچھے ہو لیا۔ یہ لوگ گالیاں دیتے، شور مچاتے اور پتھر مارتے تھے۔ پتھر تاک کر ٹخنوں کی ہڈیوں پر مارتے تاکہ زیادہ اذیت پہنچے۔ حضورؐ جب نڈھال ہو جاتے تو بیٹھ جاتے۔ لیکن طائف کے غنڈے آپؐ کو بازو سے پکڑ کر اٹھا دیتے۔ اور پھر ٹخنوں پر پتھر مارتے اور تالیاں بجا بجا کر ہنستے۔ خون بے تحاشا بہہ رہا تھا، اور جوتیاں اندر اور باہر سے لتھڑ گئیں۔ اس نادر تماشا کو دیکھنے کے لیے بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ غنڈوں کا غول اس طریقے سے آپؐ کو شہر سے نکال کر ایک باغ کے احاطے تک لے آیا۔ جو ربیعہ کے بیٹوں عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ آپؐ نے بالکل بے دم ہو کر انگور کی ایک بیل سے ٹیک لگائی۔ باغ کے مالک آپؐ کو دیکھ رہے تھے اور جو کچھ آپؐ پر بیتی اس کا بھی کچھ مشاہدہ کر چکے تھے۔

یہی وہ موقع تھا جب کہ دوگانہ پڑھنے کے بعد آپؐ کے ہونٹوں سے ذیل کی درد بھری دعا نکلی:

"الٰہی! اپنی قوت کی کمی' اپنی بے سروسامانی اور لوگوں کے مقابلے میں اپنی بے بسی کی فریاد تجھی سے کرتا ہوں۔ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ درماندہ بیکسوں کا پروردگار تو ہی ہے۔ تو ہی میرا مالک ہے آخر تو مجھے کس کے حوالے کرنے والا ہے۔ کیا اس حریف بیگانہ کے جو مجھ سے ترشروئی روا رکھتا ہے یا ایسے دشمن کے جو میرے معاملے پر قابو رکھتا ہے۔ لیکن اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو پھر مجھے کچھ پروا نہیں۔ بس تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ میں اس بات کے مقابلے میں کہ تیرا غضب مجھ پر پڑے یا تیرا عذاب مجھ پر وارد ہو' تیرے ہی نور و جمال کی پناہ طلب کرتا ہوں جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور جس کے ذریعے دین و دنیا کے جملہ معاملات سنور جاتے ہیں مجھے تو تیری رضامندی اور خوشنودی کی طلب ہے۔ بجز تیرے کہیں سے کوئی قوت و طاقت نہیں مل سکتی"۔

اتنے میں باغ کے مالک بھی آپہنچے' ان کے دلوں میں ہمدردی کے جذبات امڈ آئے تھے۔ انہوں نے اپنے نصرانی غلام کو پکارا۔ اس کا نام عداس تھا۔ پھر ایک طشتری میں انگوروں کا خوشہ رکھوا کر بھجوایا۔ عداس انگور پیش کر کے آنحضورؐ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپؐ نے ہاتھ انگور کی طرف بڑھاتے ہی "بسم اللہ" کہا' عداس کہنے لگا! "خدا کی قسم! اس طرح کی بات اس شہر کے لوگ تو کبھی نہیں کہتے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے پوچھا۔ کہ "تم کس شہر کے آدمی ہو۔ اور تمہارا دین کیا ہے؟" اس نے بتایا کہ نصرانی ہوں اور نینوا کا باشندہ۔ آپؐ نے فرمایا "تو تم یونس بن متی جیسے مرد صالح کی بستی کے آدمی ہو؟" عداس نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ کو کیسے معلوم کہ یونس بن متی کون ہے؟" آپؐ نے کہا۔ "وہ میرا بھائی ہے' وہ بھی نبی تھا اور میں بھی نبی ہوں"۔ یہ سنتے ہی عداس آپؐ کے ہاتھ پاؤں کو چومنے لگا۔ ربیعہ کے بیٹوں میں سے ایک نے یہ ماجرا دیکھا تو اس نے عداس کے واپس جانے پر ملامت کی کہ یہ کیا حرکت تم کر رہے تھے۔ تم نے اپنا دھرم خراب کر لیا ہے۔ عداس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا۔ "میرے آقا! اس سے بڑھ کر زمین میں کوئی چیز بھلی نہیں۔ اس شخص نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جسے نبی کے سوا کوئی اور نہیں جان سکتا"۔

درحقیقت اب جناب ابوطالب کی وفات کے بعد مکہ میں آپؐ ظاہری لحاظ سے بالکل بے سہارا تھے اور دشمن شیر ہو گئے تھے۔ خیال فرمایا کہ طائف میں سے شاید کچھ اللہ کے بندے اٹھ کھڑے ہوں۔ وہاں یہ صورت پیش آئی۔ وہاں سے پھر آپؐ نخلہ میں قیام پذیر رہے' وہاں سے واپس آئے اور غار حرا میں تشریف فرما ہوئے۔ یہاں سے مطعم بن عدی کو پیغام بھجوایا کہ "کیا تم مجھے اپنی حمایت میں لے سکتے ہو؟" عرب کے قومی کردار کی ایک روایت یہ تھی کہ حمایت طلب کرنے والے کو حمایت دی جاتی تھی۔ خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو' مطعم نے پیغام قبول کر لیا۔ بیٹوں کو حکم دیا کہ ہتھیار لگا کر حرم میں چلو' خود رسول اللہؐ کو ساتھ لایا۔ اور مکہ میں آکر اونٹ پر سے اعلان کیا' کہ میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دی ہے۔ مطعم کے بیٹے آپؐ کو

تلواروں کے سائے میں حرم میں لائے۔ پھر گھر میں پہنچایا۔

طائف میں حضورؐ پر جو کچھ گزری اسے مشکل ہی سے روایات کے الفاظ ہم تک منتقل کر سکتے ہیں۔ ایک بار حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا کہ "یا رسولؐ اللہ! کیا آپؐ پر احد کے دن سے بھی سخت دن کوئی گزرا ہے؟" فرمایا: "تیری قوم کی طرف سے اور تو جو تکلیفیں پہنچیں سو پہنچیں مگر سب سے بڑھ کر سخت دن وہ تھا جب میں نے طائف میں عبدیالیل [1] کے بیٹے کے سامنے دعوت رکھی اور اس نے اسے رد کر دیا اور اس درجہ صدمہ ہوا کہ قرن الثعالب کے مقام تک جا کر بمشکل طبیعت سنبھلی" [2]

زید بن حارثہ جنہوں نے آپؐ کے نڈھال اور بے ہوش ہو جانے پر طائف سے کندھوں پر آپؐ کو اٹھا کر شہر کے باہر پہنچایا' دل اندوہ گیں کے ساتھ عرض کرنے لگے کہ آپؐ ان لوگوں کے لیے خدا سے بد دعا کریں۔ فرمایا: "میں ان کے لیے کیوں بد دعا کروں۔ اگر یہ لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے تو امید ہے کہ ان کی نسلیں ضرور خدائے واحد کی پرستار ہوں گی"۔

اسی سفر میں جبریل آتے ہیں اور اطلاع دیتے ہیں کہ پہاڑوں کا انچارج فرشتہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اگر آپؐ اشارہ کریں تو وہ ان پہاڑوں کو آپس میں ملا دے جن کے درمیان مکہ اور طائف واقع ہیں اور دونوں شہروں کو پیس کر رکھ دے۔

اسی یاس انگیز فضا میں جنوں کی جماعت آکر قرآن سنتی ہے اور حضورؐ کے ہاتھ پر ایمان لاتی ہے۔ اس طرح سے خدا نے یہ حقیقت واضح کی کہ اگر تمام انسان دعوت حق کو رد کر دیں تو ہماری مخلوقات ایسی موجود ہیں کہ آپؐ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔

---

[1] ص ۱۹۴ پر عبدیالیل' مسعود' اور حبیب کو بھائی بھائی لکھا گیا ہے جن کو حضور نبی اکرمؐ نے دعوت کا اولیں مخاطب بنایا۔ مگر یہاں (ص ۱۹۶) عبارت یوں ہے۔

"سب سے بڑھ کر سخت دن وہ تھا جب میں نے طائف میں عبدیالیل کے بیٹے کے سامنے دعوت رکھی اور اس نے اسے رد کر دیا۔۔۔۔ الخ (بخاری ج ۱ ص ۴۵۸)

قاری کو یہاں سیرت نگار کے متعلق مغالطہ ہو سکتا ہے' مگر دونوں روایتیں درست ہیں اور اسی طرح ہیں۔

توجیہہ یہ کی جا سکتی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے سوال پر دیر بعد پوچھنے پر سخت احساس کرب کی حالت میں یہ جملہ اسی طرح بے ساختہ ادا ہوا ہو جیسے خود حضرت عائشہؓ نے حضرت یوسفؑ کا نام فراموش ہو جانے پر "یعقوبؑ کے بیٹے" کے الفاظ حالت اضطراب میں ادا کیے یا عبدیالیل کا بیٹا بھی سامنے موجود ہو اور اس سے حضورؐ نے تخاطب خاص فرمایا ہو' یا مذکرہ تینوں بھائیوں کے قریبی آباء میں سے کوئی عبدیالیل ہو۔

یہ بہرحال دونوں موقعوں کی روایات اسی طرح ہیں جیسے درج کی گئی ہیں۔

[2] المواہب اللدنیہ جلد ۱ ص ۵۶

نوید سحر:

طائف کا تجربہ ایسا تھا کہ جس سے گزرتے ہوئے محسن انسانیتؐ نے درد و کرب کے اس آخری نقطہ کو چھو لیا جس تک پہنچنے کے بعد مشیت ربانی کامیابی کے دروازے کھول دیا کرتی ہے۔ زمانہ بہ نگاہ ظاہر نظام حق کے داعی کو جتنا زیادہ گرا سکتا تھا' گرا چکا تھا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ اس کا مرتبہ بارگاہ الٰہی میں انتہائی حد تک بلند ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو بھیج کر جب بھی حق و باطل کا معرکہ برپا کرایا ہے اس کا قانون یہ رہا ہے کہ باطل جب آخری حد تک پورا زور دکھا چکتا ہے' اور بندگان حق ایک ایک کر کے تمام مراحل استبداد سے صبر جمیل کے ساتھ گزرتے ہوئے ایک آخری مرد افگن دور کو بھی پار کر جاتے ہیں تو نصرت الٰہی کی صبح نمودار ہوتی ہے۔ جنت کو جانے والی راہ صداقت کانٹوں سے پٹی پڑی ہے۔ اور اس پر گامزن ہونے والوں کے لیے مراد پانے کی بشارت تب آتی ہے' جب:

> "ان کو کٹھنائی اور مصیبت نے آلیا۔ اور وہ خوب جھنجھوڑے گئے' یہاں تک کہ رسولؐ اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے لوگ پکار اٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد (اس مرحلے میں پہنچ کر ان کو بشارت دی جاتی ہے کہ) سنو! اللہ کی مدد قریب ہے"۔

(البقرۃ۔ ۲۱۴)

طائف کے تجربہ کے بعد گویا حضورؐ اس آخری امتحان سے گزر گئے۔ قانون الٰہی کے تحت ناگزیر تھا کہ اب نئے دور کے دروازے کھل جائیں اور طلوع سحر کی بشارت دی جائے۔ یہی بشارت دینے کے لیے حضورؐ کو معراج سے سرفراز کیا گیا۔

معراج کی حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کو قرب الٰہی کا انتہائی بلند مقام نصیب کیا گیا۔ جس فرمانروا کی نمائندگی کرتے ہوئے محسن انسانیتؐ نے کئی برس طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرتے ہوئے اور بدی کی طاقتوں کے خلاف فکری جنگ لڑتے ہوئے گزار دیئے تھے' اس نے اپنے سفیر کو اپنے ہاں کا بلند ترین اعزاز دینے کے لیے اسے اپنے دربار میں طلب کیا۔ کائنات اور زندگی کی جن بنیادی سچائیوں کو منوانے کے لیے ایک سپاہی میدان کارزار میں اتر کر چاروں طرف سے وار پہ وار سہہ رہا تھا' اسے یہ سعادت بخشی گئی کہ ان سچائیوں کا قریب سے مشاہدہ کرے۔ جس بین الانسانی تحریک خیر و فلاح کا احیاء یہ آخری داعی کر رہا تھا' اسے سعادت دی گئی کہ وہ اس تحریک کے ایک بڑے دیرینہ مرکز (بیت المقدس) تک جا کر اور پھر وہاں سے عالم بالا کو پرواز کر کے اس تحریک کے سابق قائدین خاص سے ملاقی ہو۔

سابق انبیاء کو بھی موقع بہ موقع شرف دیا جاتا رہا تھا کہ وہ غیبی حقائق کا مشاہدہ کریں اور قرب خداوندی میں پہنچ کر عنایات خاص سے بہرہ مند ہوں۔ قرآن میں جہاں ایک طرف ابراہیم علیہ السلام کے

بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کو ملکوت السموات والارض کا مشاہدہ کرایا گیا تھا' وہاں موسیٰ علیہ اسلام کو طور پر بلایا گیا' اور وہاں خداوند تعالیٰ نے ایک نور افگن درخت کی اوٹ سے "انی انا اللہ" کہہ کر ہم کلامی سے سرفراز کیا۔ اور پھر دوسرے موقع پر ایسے ہی لمحہ قرب میں شریعت کے احکام تفویض کئے۔ گویا کسی نہ کسی نوع کی معراج جلیل القدر انبیائے سلف کو بھی حاصل ہوتی رہی تھی۔ حضورؐ کی معراج اپنے اندر شان کمال رکھتی ہے۔

واقعہ طائف اور ہجرت کے درمیان اس واقعہ سے زیادہ اہم اور ممتاز واقعہ کوئی دوسرا پیش نہیں آیا۔ اس کی جب اطلاع آپؐ نے دی تو مکہ بھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ آپؐ نے مجمع عام میں اپنے مشاہدات بیان کئے۔ بیت المقدس کا پورا نقشہ کھینچ دیا۔ راستے کی ایسی قطعی علامات بتائیں کہ جن کی بعد میں تصدیق ہو گئی۔

اس لمحہ قرب میں جو خاص وحی کی گئی (فاوحیٰ الی عبدہ ما اوحیٰ .....) [1] وہی سورہ بنی اسرائیل کے عنوان سے ہمارے سامنے ہے۔ اس سورہ کا آغاز ہی واقعہ اسراء کے تذکرے سے ہوتا ہے۔ اور پھر پوری سورہ میں معراج کی روح رچی بسی ہے۔ اس سورۃ کے حسب ذیل پہلو نہایت قابل توجہ ہیں۔

۱۔ بنی اسرائیل کی داستان عبرت سامنے رکھ کر ایک طرف یہ واضح کیا گیا کہ خدا کے قوانین بڑی بڑی طاقتوں کا محاسبہ کرتے ہیں اور ان کی بے راہ روی پر ان کو کسی آلہ کار کے ذریعے پچھاڑ دیتے ہیں۔ دوسری طرف عبرت دلائی گئی کہ غلبہ و کامرانی کے دور میں پہنچ کر کہیں یہ طاقت بھی بنی اسرائیل کی روش نہ اختیار کر لے۔

۲۔ یہ مژدہ انتہائی ناسازگار ماحول میں صاف صاف الفاظ اور فیصلہ کن انداز میں دیا گیا کہ جاء الحق و زھق الباطل۔ (آیت۔ ۸۱) حق آ گیا ہے اور باطل اب دم دبا کر بھاگنے والا ہے۔ تاریکیاں چھٹ جانے کو ہیں اور صبح ہونے والی ہے۔

۳۔ یہ اطلاع دے دی کہ اہل مکہ اب آپؐ کو مکہ سے نکال دینے کے درپے ہوں گے' مگر آپؐ کو نکالنے کے بعد زیادہ دیر تک امن چین سے نہ رہ سکیں گے (آیت۔ ۷۶) [2] دعائے ہجرت ان الفاظ میں سکھائی' کہ "اے میرے رب مجھے (نئے دور میں) صدق کے دروازے سے داخل کر اور (موجودہ ماحول سے) صدق ہی کی راہ سے نکال اور مجھے اپنی بارگاہ سے اقتدار کی صورت میں مدد عطا کر"۔ (آیت۔ ۸۰) [3]۔

---

[1] تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اس نے پہنچائی تھی۔ (النجم۔ ۱۰)

[2] اور یہ لوگ اس بات پر بھی تلے ہوئے ہیں کہ تمہارے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔ (بنی اسرائیل ۷۶)

[3] اور دعا کرو کہ پروردگار' مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ =

اس دعا میں اقتدار کی طلب کو شامل کر کے گویا یہ بشارت بھی دے دی گئی کہ ہجرت کے بعد کا دور دور غلبہ و حکمرانی ہو گا۔

۴۔ آیت ۲۲ تا ۲۹ کے مسلسل پارہ کلام میں اسلامی نظام کے بالکل ابتدائی اصول عطا کیے گئے کہ ان کو بنیاد بنا کر نیا معاشرہ اور نیا تمدن استوار کیا جائے۔

لمحہ معراج کے ان نکات وحی کا نور سینے میں لیے جب سرور عالم مستقبل کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوں گے تو تاریخ کے افق سے روشنی کا ایک سیلاب امڈتا دکھائی دیتا ہو گا۔ کوئی مادہ پرست مکہ کے اس خوف ناک ماحول میں ہوتا تو شاید وہ مایوس ہو کر اپنی سرگرمیوں کا ٹاٹ لپیٹ چکا ہوتا۔ مگر حضورؐ تھے کہ انتہائی ناسازگار اور امید شکن حالات کی تاریکی میں گھرے ہونے پر بھی اس قطعی یقین سے مالا مال تھے کہ صبح آ رہی ہے۔ اور نسیم کے ایک جھونکے نے آکر سرور عالم کے کانوں میں کہہ دیا کہ صبح نو کا مطلع یثرب ہو گا' وہ کہ جہاں کے نوجوانوں نے بڑی اخلاص مندی اور شرح صدر کے ساتھ اسلامی تحریک کو لبیک کہنا شروع کیا۔

مکہ میں زندگی ختم ہو جانے کے بعد حضورؐ طائف سے پوچھنے گئے کہ آیا تم سچائی کی مشعل کو اٹھا سکتے ہو؟ طائف نے جواب دیا کہ میں تو مکہ سے بھی بڑھ کر نا اہل ہوں۔ ابھی حضورؐ اس یاس انگیز جواب کے اثر ہی میں تھے کہ دور سے یثرب کی دھیمی سی آواز آئی کہ میں مدینۃ النبیؐ بننے کو حاضر ہوں۔ میں نور حق کی مشعل کو اٹھاؤں گا اور ساری دنیا کو روشنی دوں گا۔ میری گود میں نیکی کا نظام پرورش پائے گا اور میرے گہواروں میں ایک نئی تاریخ پروان چڑھے گی۔

طائف قریب تھا اور دور ہو گیا۔

یثرب دور تھا مگر قریب آگیا۔

یثرب اس روز بالکل قریب آگیا جس روز (نبوت کے گیارہویں سال) چھ انقلابیوں کے ایک جتھے نے حضورؐ سے پیمان وفا باندھا۔ پھر دوسرے سال ۱۲ افراد نے تحریک اسلامی کی علمبرداری کے لیے باقاعدہ گفت و شنید کر کے پہلی بیعت عقبہ کی گرہ باندھی اور اسلامی توحید اور اخلاقی حدود کے تحفظ کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ پھر حج کے موقع پر ایک بڑی جماعت حاضر ہوئی اور اس نے رات کی تاریکی میں ایک خفیہ مجلس کے اندر دوسری بیعت عقبہ استوار کی جو پوری طرح سیاسی روح سے مملو تھی۔ اسی میں حضورؐ کا ہجرت کر کے مدینہ جانا طے ہوا اور اس والہانہ پیش کش کے ساتھ طے ہوا کہ انصار مدینہ آپؐ کے لیے دنیا جہان سے لڑائی مول لینے کو تیار ہیں۔

شاید یہی دور ---- سفر طائف تا ہجرت ----- ہے جس میں سورہ یوسف" نازل ہوئی تھی اور جس نے حدیث دیگراں کے پردے میں علمبردار حق کو بشارت دی اور اس کے مخالفین کو ان کے گھٹیا اور ظالمانہ طرز

= نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔ (بنی اسرائیل ۸۰)

عمل سے آگاہ کر کے ان کا انجام ان کے سامنے رکھ دیا۔

الوداع !-----اے مکہ!

تشدد کسی متزلزل نظام کا آخری ہتھیار ہوتا ہے اور اگر یہ کارگر نہ ہو تو قاعدہ یہ ہے کہ دشمنان تغیر نقیب انقلاب کی جان لینے پر تل جاتے ہیں۔ اہل مکہ تو پہلے ہی دانت پیستے تھے اور ایسے ہی ارمان رکھتے تھے۔ مگر بس نہیں چلتا تھا۔ اب آخری گھڑی آگئی تھی۔ کش مکش ایک فیصلہ کن مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اب دو متقابل طاقتیں چھنٹ کر بالکل الگ الگ ہو چکی تھیں اب واضح طور پر ایک ذہنی و اعتقادی خط سرحد کھنچ چکا تھا اور جو اس پار تھے' وہ اس پار تھے اور جو اس طرف آگئے تھے وہ بس اسی طرف کے تھے۔ اب دعوت حق کی بہرحال ایک منظم طاقت تھی۔ اس کا جماعتی نظم بڑا مضبوط تھا۔ اس کا کرداری وزن بہت زیادہ تھا۔ اس کا استدلالی اپیل غیر معمولی حد تک زور دار تھا اور اس کے خادموں کی مظلومیت دلوں کو فتح کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ اب سچائی کا ننھا سا بیج ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ اور جو خطرہ کل تک خداوندان جاہلیت کے لیے خیالی تھا وہ اب واقعاتی صورت میں سامنے تھا۔ اب وقت ان سے کہہ رہا تھا کہ یا تو اس خطرے سے نمٹنے کی قوت رکھتے ہو تو نمٹ لو' ورنہ دور نو کا طوفان نور چلا آرہا ہے جس میں تم' تمہارے مناصب' تمہارا مذہب اور تمہاری جاہلانہ روایات سب کچھ بہہ جانے والی ہیں۔ کل تم کو اپنی اکڑی ہوئی گردنیں محمدؐ اور اس کے پیغام کے سامنے خم کر دینی ہوں گی۔ خداوندان جاہلیت تاریخ کا یہ چیلنج سن رہے تھے اور برابر مضطرب ہو رہے تھے' چنانچہ اب وہ داعی حق کے خون کے پیاسے ہو کر ایک نئی سازش کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔

یوں بھی جماعت حق کے افراد کے لیے مکہ کی بھٹی اپنے آخری درجہ حرارت پر آپہنچی تھی' مظالم انسانی برداشت سے باہر ہو گئے تھے' قریش اپنے ظلم کے زہراب کا جام لبریز کر چکے تھے۔ ادھر علمبرداران حق کا صبر کا پیالہ بھی کناروں تک بھر چلا تھا۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ اب حالات کوئی بڑی کروٹ لیں گے۔ اب کوئی راہ نجات نکلے گی اور اب تاریخ کوئی واضح موڑ مڑے گی۔ قریش نے ایک سعادت عظمیٰ کا دروازہ اپنے لیے بند کر لیا تھا' انہوں نے اپنے آپ کو تحریک اسلامی کا پیش رو بننے کے لیے نا اہل ثابت کر دیا تھا۔ اس نفسیاتی ماحول میں معراج واقع ہونے پر حضورؐ نے جب روشن مستقبل کی بشارت دی ہو گی' اشارۃً باب ہجرت وا ہونے اور اس کے بعد دور اقتدار کا آغاز ہونے کا مژدہ سنایا ہو گا' تو مسلم جماعت میں نئی امنگیں ابھر آئی ہوں گی۔ تشدد کا شکار ہونے والوں کی ڈھارس بندھ گئی ہو گی' زخمی کلیجوں کو مرہم سکون مل گیا ہو گا۔ ہمتیں بلند ہو گئی ہوں گی اور ذہنی دنیا میں ایک طرح کی پو پھٹنے لگی ہو گی۔ پھر جب محسن انسانیتؐ کی حساس روح نے وہ موعود گھڑی قریب آتی دیکھی ہو گی تو احساسات کا مدو جزر اور بھی بڑھ گیا ہو گا۔ یہاں تک کہ آپؐ کا دل پیشتر سے یہ غیبی حقیقت سمجھنے لگا کہ ہونے والا دارالہجرت مدینہ ہو گا۔ ایک طرف واضح

حالات انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہے تھے خصوصاً مقام عقبہ کی بیعتیں گواہی دے رہی تھیں اور دوسری طرف ملا اعلیٰ سے بھی اشارات ہو رہے تھے۔

ہجرت کا اذن عام:

آخری بیعت عقبہ (یعنی ذی الحجہ ۱۳ بعد بعثت) کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے کے مسلمانوں کو مدینے کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ اللہ عزوجل نے اب تمہارے لیے بھائی پیدا کر دیئے ہیں اور ایک ایسا شہر فراہم کر دیا ہے جہاں تم امن سے رہ سکتے ہو (ابن ہشام بحوالہ ابن اسحاق) یہ حکم ملتے ہی سب سے پہلے حضرت عامر بن ربیعہ العنزی اپنی بیوی لیلیٰ بنت ابی حثمہ کے ساتھ نکلے۔ پھر حضرت عمارؓ بن یاسر اور حضرت بلالؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ نے ہجرت کی' پھر حضرت عثمانؓ بن عفان اپنی اہلیہ رقیہؓ بنت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ پھر مہاجرت کا ایک سلسلہ چل پڑا اور لوگ پے در پے اس نئے دارالہجرت کی طرف جانے لگے' حتیٰ کہ پورے پورے کنبے اپنے گھربار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ ابن اسحاق کے حوالے سے ابن ہشام نے خاص طور پر تین خاندانوں کا ذکر کیا ہے جن کے سب افراد ہجرت کر گئے اور ان کے گھر خالی پڑے کے پڑے رہ گئے۔ ایک بنی مظعون' دوسرے بنی البکیر' تیسرے بنی جحش بن ریاب ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ بنی جحش کے ساتھ بنی اسد بن خزیمہ کے بھی عورت مرد بچے سب چلے گئے۔ ان دونوں خاندانوں کے جملہ ۲۴ افراد نے ہجرت کی جن میں حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی عبداللہؓ بن جحش اور ابو احمدؓ بن جحش (جن کا نام عبد تھا) اور ان کی بہنیں حضرت زینبؓ بنت جحش (جو بعد میں ام المومنین بنیں) اور حمنہؓ بنت جحش (حضرت مصعب بن عمیر کی بیوی) اور ام حبیبؓ بنت جحش (حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی بیوی) شامل تھیں۔ ❶

ایک مرتبہ ابو جہل اور دوسرے اکابر بنی جحش کے سنسان گھروں سے گزرے تو ابو جہل نے اس منظر کو دیکھ کر یہ ریمارک پاس کیا:

"یہ ہمارے برادر زادے کا کیا دھرا ہے' اس نے ہمارے اجتماع کو پارہ پارہ کر دیا ہماری وحدت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اور ہمیں آپس میں ایک دوسرے سے پھاڑ دیا"۔ ❷

رفقاء کو مدینہ بھیجنے کے باوجود آنحضورؐ نے اپنے مقام دعوت کو نہیں چھوڑا۔ اذن الٰہی کے منتظر رہے اب کوئی مسلمان بھی مکہ میں نہیں رہا تھا' سوائے ایسے لوگوں کے جنہیں قریش نے روک رکھا تھا یا ابتلا میں ڈال رکھا تھا۔ البتہ رفقائے خاص میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما باقی تھے۔ ان حالات میں

---

❶ سیرت سرور عالمؐ از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ج ۲ ص ۷۱۵

❷ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۱۴

قریش نے اندازہ کر لیا کہ اب جب کہ مسلمانوں کو ایک ٹھکانہ مل گیا ہے اور ایک ایک کر کے سب لوگ جا چکے ہیں' قریب ہے کہ محمد ﷺ بھی ہاتھ سے نکل جائیں۔ اور پھر ہمارے دائرہ اثر سے باہر رہ کر قوت پکڑیں اور سارا پچھلا حساب چک جائے۔ یہ لوگ مکہ کے پبلک حال دار الندوہ میں جمع ہوئے [1] اور سوچنے لگے کہ اب محمدؐ کے خلاف کیا کارروائی کی جائے۔ ایک تجویز یہ سامنے آئی کہ آپ کو کسی آہنی قید خانے میں بند کر دیا جائے۔ اور دروازہ بند رکھا جائے۔ اس پر اعتراض ہوا کہ اس شخص کی بات بند آہنی دروازے میں سے بھی نکل جائے گی اور اس کے ساتھی زور پکڑ لیں گے تو اس کو نکال لے جائیں گے' کوئی اور تدبیر سوچو۔ ایک رکن مجلس نے دوسری تجویز پیش کی کہ آپ کو اپنے معاشرے اور حدود اثر سے باہر نکال دیا جائے۔ اس کے بعد ہمیں اس سے کیا مطلب کہ آپؐ پر کیا گزرتی ہے۔ اس پر پھر اعتراض ہوا کہ کیا تم اس کے حسن گفتار کو نہیں جانتے؟ اس کی باتوں کی مٹھاس سے واقف نہیں ہو؟ یہ چیزیں لوگوں کے دلوں پر اس کے چھا جانے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ایسا کرو گے تو تم اس سے نہیں بچ سکتے کہ وہ اہل عرب میں نفوذ کرے اور اپنی دعوت اور باتوں کے زور سے ان پر چھا جائے۔ پھر وہ ان کو لے کر تم پر دھاوا بول دے اور اقتدار کی باگ ڈور تمہارے ہاتھوں سے چھین لے' اور پھر جو سلوک چاہے تمہارے ساتھ روا رکھے۔ اب ابوجہل کی ذہانت دور کی کوڑی لاتی ہے اس نے تجویز کیا کہ ہر قبیلہ سے ایک ایک مضبوط اور معزز نوجوان لیا جائے [2] اور سب کو تلواریں دی جائیں۔ پھر یکبارگی اس (محمدؐ) پر حملہ کر کے کام تمام کر دیں۔ بس ہمیں اس طرح سے چھٹی مل سکتی ہے۔ اس طریقے سے محمدؐ کا خون تمام قبائل پر تقسیم ہو جائے گا اور بنو عبد مناف اتنے سارے قبائل سے بدلہ لینے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ بس اس پر اتفاق آراء ہو گیا اور

---

[1] قریش کے قبائل میں مندرجہ ذیل نمایاں سردار موجود تھے۔

(۱) بنو عبد شمس میں سے شیبہ و عتبہ فرزندان ربیعہ اور ابوسفیان بن حرب۔

(۲) بنو نوفل میں سے طعیمہ بن عدی' جبیر بن مطعم' حارث بن عامر۔

(۳) بنی عبدالدار میں سے۔ نضر بن حارث بن کلدہ۔

(۴) بنو اسد بن عبدالعزیٰ میں سے ابوالبختری بن ہشام' زمعہ بن اسود' حکیم بن حزام۔

(۵) بنو مخزوم میں سے ابوجہل بن ہشام۔

(۶) بنو سہم میں سے نبیہ و منبہ فرزندان حجاج۔

(۷) بنی جمح میں سے امیہ بن خلف (رحمۃ للعالمین از قاضی سلیمان منصور پوری ج ۱ ص ۹۵)

[2] ابن سعد کی روایت کے مطابق آپؐ کے قتل پر مامور یہ جملہ ۱۲ آدمی تھے۔ ابوجہل' حکم بن ابی العاص' عقبہ بن ابی معیط' نضر بن الحارث' امیہ بن خلف' حارث بن قیس ابن الغیطلہ' زمعہ بن الاسود' طعیمہ بن عدی' ابولہب' ابی بن خلف' نبیہ بن حجاج اور منبہ بن حجاج۔ (سیرت سرور عالم از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ج ۲ ص ۷۲۳)

یہ سازشی میٹنگ برخاست ہو گئی۔

اسی میٹنگ کی کارروائی پر قرآن نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا۔

"اور یاد کرو اس گھڑی کو جب کہ کفار تدبیریں کر رہے تھے کہ آپ کو قید میں ڈالیں یا قتل کر دیں یا باہر نکال دیں۔ وہ اپنی سی تدبیر لڑاتے ہیں اور اللہ جوابا دوسری تدبیر کرتا ہے اور اللہ تدبیر کرنے میں سب سے بڑھ کر ہے"۔ (الانفال - ۳۰)

آنے والی پر اسرار رات سامنے تھی۔ حضورؐ دوپہر کو اپنے محبوب ترین رفیق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ جا کر رازدارانہ طریق سے اطلاع دی کہ ہجرت کی اجازت آگئی ہے۔ جناب صدیقؓ نے معیت کی درخواست کی جو پہلے سے قبول تھی۔ اس سعادت کے حصول پر فرط مسرت سے حضرت ابوبکرؓ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ انھوں نے ہجرت کے لیے دو اونٹنیاں پہلے سے خوب اچھی طرح فربہ کر رکھی تھیں پیش کش کی کہ حضورؐ دونوں میں سے جسے پسند فرمائیں' ہدیہ ہے۔ مگر حضورؐ نے باصرار ایک اونٹنی (جس کا نام جدعاء تھا) قیمتاً لی۔ رات ہوئی تو حضورؐ بحکم الٰہی [1] اپنے مکان پر نہ سوئے۔ اور دوسرے محبوب ترین رفیق حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر بلا خوف سو جانے کی ہدایت فرمائی۔ ساتھ ہی لوگوں کی امانتیں ان کے سپرد کیں کہ صبح کو یہ مالکوں کو ادا کر دی جائیں۔ اس اخلاق کی کتنی ایک مثالیں تاریخ کے پاس ہیں کہ ایک فریق تو قتل کی سازش کر رہا ہے۔ اور دوسرا فریق اپنے قاتلوں کو امانتوں کی ادائیگی کرنے کی فکر میں ہے۔ پھر حضورؐ حضرت صدیقؓ کے گھر پہنچے۔ جناب اسماء بنت ابوبکرؓ نے جلدی سے اپنا کمربند پھاڑا اور ایک ٹکڑے میں کھانے کی پوٹلیاں باندھیں اور دوسرے ٹکڑے سے مشکیزہ کا منہ باندھا۔ دو مسافران حق کا یہ قافلہ رات کی تاریکی میں گامزن ہو گیا۔

آج دنیا کا سب سے بڑا محسن و خیر خواہ (ﷺ) بغیر کسی قصور کے بے گھر ہو رہا تھا!

آج وہ ان گلیوں کو الوداع کہہ رہا تھا جن میں وہ چل پھر کر جوان ہوا' اور جن میں اس نے حق کا بول بالا کرنے کے لیے ہزاروں ہی پھیرے کئے تھے۔ اور جن میں اس نے گالیاں سنی تھیں اور ایذائیں سہی تھیں۔

آج وہ حرم کے مرکز روحانی سے جدا ہو رہا تھا جس میں اس نے بارہا سجدے کئے تھے' بارہا قوم کی فلاح کی دعائیں مانگی تھیں۔ بارہا قرآن پڑھا تھا' اور بارہا اس مقدس چار دیواری' اس واحد پناہ گاہ امن و سلامتی ــــ میں بھی مخالفین کے ہاتھوں دکھ اٹھائے تھے اور ان کے دل چھیدنے والے بول سنے تھے۔

آج وہ اس شہر کو آخری سلام کر رہا تھا جس میں ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے کارناموں کا ریکارڈ موجود تھا۔ اور جس کی فضاؤں میں ان کی دعاؤں کی لہریں اب تک متحرک تھیں۔

---

[1] باقاعدہ جبریل علیہ السلام نے حکم پہنچایا۔ سیرت ابن ہشام۔ ج ۱ ص ۴۸۲۔ زاد المعاد۔ ج ۲ ص ۵۲۔

کلیجہ کٹا ہو گا' آنکھیں ڈبڈبائی ہوں گی' جذبات امڈے ہوں گے' مگر خدا کی رضا اور زندگی کا مشن چونکہ اس قربانی کا بھی طالب ہوا' اس لیے انسان کامل نے یہ قربانی بھی دے دی۔

آج مکہ کے پیکر سے اس کی روح نکل گئی تھی' آج اس چمن کے پھولوں سے خوشبو اڑی جا رہی تھی' آج یہ چشمہ سوکھ رہا تھا۔ آج اس کے اندر سے بااصول اور صاحب کردار ہستیوں کا آخری قافلہ روانہ ہو رہا تھا۔

دعوت حق کا پودا مکہ کی سرزمین سے اگا۔ لیکن اس کے پھلوں سے دامن بھرنا مکہ والوں کے نصیب میں نہ تھا۔ پھل مدینہ والوں کے حصہ میں آئے ـــــ ساری دنیا کے حصہ میں آئے! مکہ والے آج دھکیل کر پیچھے ہٹائے جا رہے تھے۔ اور مدینہ والوں کے لیے اگلی صف میں جگہ بنائی جا رہی تھی۔ جو اپنے آپ کو اونچا سمجھتے تھے ان کو پستی میں دھکیلنے کا فیصلہ ہو گیا اور جن کو مقابلتاً نچلے درجے پر رکھا جاتا تھا' وہی لوگ اٹھا کر اوپر لائے جا رہے تھے۔

حضورؐ نے آخری نگاہ ڈالتے ہوئے مکہ سے یہ خطاب فرمایا:

"خدا کی قسم' تو اللہ کی سب سے بہتر زمین ہے۔ اور اللہ کی نگاہ میں سب سے بڑھ کر محبوب۔ اگر یہاں سے مجھے نکالا نہ جاتا تو میں کبھی نہ نکلتا"۔ [1]

چند لمحوں بعد حضورؐ غار ثور میں تھے۔

راستہ خود حضورؐ نے تجویز فرمایا لیا تھا اور عبداللہ بن اریقط اولی کو اجرت دے کر گائیڈ مقرر کیا۔ تین روز آپؐ غار میں رہے۔ عبداللہ بن ابی بکر رات کو مکہ کی ساری خبریں پہنچا آتے۔ عامر بن فہیرہ (حضرت ابوبکر صدیقؓ کا غلام) بکریوں کا ریوڑ لے کے اسی طرف نکلتا اور اندھیرا ہو جانے پر غار کے سامنے جا پہنچتا تا کہ دونوں مہاجر ضرورت کے مطابق دودھ لے لیں۔

ادھر قریش نے حضورؐ کے مکان کا محاصرہ رات بھر رکھا۔ اور پورے شہر کی ناکہ بندی کا کڑا انتظام بھی کیا۔ مگر جب اچانک ان کو یہ معلوم ہوا کہ جس کی تلاش تھی وہ تو نکل گیا ہے تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ حضورؐ کے بستر پر حضرت علیؓ کو پا کر بہت سٹپٹائے اور ان پر غصہ نکال کر چلے گئے۔ تلاش کے لیے چاروں طرف آدمی دوڑائے' کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک گروہ دوڑ دھوپ کرتے ہوئے عین غار ثور کے دروازے پر آ پہنچا۔ ان کے قدم اندر دکھائی دینے لگے۔ کتنا نازک تاریخی لمحہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کو تشویش ہوئی کہ اگر یہ لوگ غار میں داخل ہو گئے تو گویا پوری تحریک خطرے میں پڑ جائے گی۔ ایسے لمحات میں صحیح انسانی فطرت کے اندر جیسا احساس پیدا ہونا چاہیے' ٹھیک ایسا ہی احساس جناب صدیقؓ کا تھا۔ مگر چونکہ

---

[1] ترمذی اور مسند کی روایت ہے کہ مکے سے نکلتے وقت حضورؐ حزورہ کے مقام پر کھڑے ہوئے بیت اللہ کی طرف رخ کیا اور بڑے درد کے ساتھ فرمایا۔ (سیرت سرور عالم ج ۲ ص ۴۲۲)

حضورؐ کے ساتھ حق تعالیٰ کے کچھ وعدے تھے اور اس کی طرف سے حفاظت و نصرت کی یقین دہانی تھی اس لیے پردہ غیب کے پیچھے تک دیکھنے والا دل جانتا تھا' کہ خدا ہمیں صحیح سلامت رکھے گا۔ پھر بھی ٹھیک اسی طرح وحی سکینت نازل ہوئی جیسی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی (لا تخف) ارشاد ہوا۔ "لا تحزن ان اللہ معنا"۔ فکر نہ کرو' اللہ ہمارے ساتھ ہے (التوبہ ۴۰)۔ چنانچہ آنے والا گروہ غار کے دہانے ہی سے واپس لوٹ گیا۔

تین روز غار میں رہنے کے بعد حضورؐ جناب صدیقؓ کی معیت میں اپنے رہبر اور عامر بن فہیرہ کو لے کر نکلے۔ تعاقب سے بچنے کے لیے عام راستہ چھوڑ کر ساحل کا لمبا راستہ اختیار کیا گیا۔ ادھر مکہ میں اعلان کیا گیا کہ دونوں مہاجروں میں سے جس کسی کو بھی کوئی شخص قتل کر دے یا گرفتار کر لائے' اس کے لیے سو اونٹ کا انعام ہے۔ لوگ برابر تلاش میں تھے سراقہ بن مالک بن جعشم کو خبر ملی کہ ایسے ایسے دو آدمی ساحل کے راستہ پر دیکھے گئے ہیں۔ اس نے نیزہ لیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ قریب آکر سراقہ جب تیزی سے جھپٹا تو اس کے گھوڑے کے اگلے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ نے دو تین بار کی ناکام کوشش کے بعد عفو چاہی' نیز درخواست کی کہ ایک تحریر امان لکھ دیجئے۔ گویا اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ ان ہستیوں کے طفیل ایک نیا دور نمودار ہونے والا ہے۔ امان لکھ دی گئی اور فتح مکہ کے دن کام آئی۔ اسی موقع پر حضورؐ نے سراقہ کو ایک بشارت بھی دی' کہ "اے سراقہ' اس وقت تیری کیا شان ہو گی جب تو کسریٰ کے کنگن پہنے گا"۔ (یہ پیش گوئی حضرت عمرؓ کے دور میں فتح ایران کے موقع پر پوری ہو گئی۔)

اسی سفر میں حضرت زبیرؓ کاروان تجارت کے ساتھ شام سے واپس آتے ہوئے ملاقی ہوئے۔ انہوں نے حضورؐ اور جناب صدیقؓ دونوں کی خدمت میں سفید لباس ہدیہ کیا۔

اسی سفر میں بریدہ اسلمی بھی ستر ہمراہیوں کے ساتھ سامنے آئے۔ یہ بھی درحقیقت انعام کے لالچ میں نکلے تھے۔ جب سامنا ہوا تو بریدہ کے دل کی کایا پلٹ گئی۔ تعارفی گفتگو ہی میں جب حضورؐ نے ایک کلمہ بشارت "خرج سھمک" (تیرا حصہ نکل آیا) فرمایا تو بریدہ مع ستر ساتھیوں کے ایمان لے آیا۔ پھر بریدہ نے یہ خواہش کی کہ حضورؐ مدینہ میں داخلے کے وقت آپؐ کے آگے آگے ایک جھنڈا ہونا چاہیے۔ حضورؐ نے اپنا عمامہ نیزے پر باندھ کر بریدہ کو دیا اور اس جھنڈے کو لہراتے ہوئے یہ قافلہ دارالہجرت میں داخل ہوا۔

☆☆☆

"لازماً تمہاری جانچ کی جائے گی جانوں اور مالوں کے نقصان سے! اور تم کو بہت سی بیہودہ باتیں سننی پڑیں گی ——— ان لوگوں سے بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ان لوگوں سے بھی جنہوں نے شرک کا مسلک اختیار کر رکھا ہے! اور اگر تم (ان آزمائشوں کے مقابلے میں) ثابت قدم رہو اور (آلودگیوں سے) دامن بچا بچا کے چلو۔ تو ——— یقیناً یہ ایک کارنامہ ہمت ہے!" (آل عمران۔ ۱۸۶)

کسی نبی کے لیے اس کے قرابت مند جس درجہ برے ہو سکتے ہیں، تم اپنے نبی کے
حق میں ایسے ہی برے ثابت ہوئے!
تم نے مجھے جھٹلایا
اور دوسرے لوگوں نے میری صداقت کی گواہی دی۔
تم نے مجھے وطن سے نکالا!
اور دوسرے لوگوں نے مجھے اپنے پاس جگہ دی۔
تم میرے خلاف لڑنے اٹھے۔
اور دوسرے لوگوں نے مجھے اپنا تعاون پیش کیا!"

ارشاد رسالت مآب
(ﷺ)

(میدان بدر میں مشرکین کی لاشوں سے خطاب کرتے ہوئے!)

باب : ۴

مُحسنِ انسانیت ﷺ

مُخالفتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے

(۲)

مدنی دَور

تاریخ موڑ مڑتی ہے

صبح صبح جب ام احمد نے مجھے عازم سفر دیکھا کہ میں اس ہستی کی حفاظت میں نکل رہا ہوں جس سے بن دیکھے خوف و خشیت رکھتا ہوں'

تو وہ کہنے لگی کہ اگر لازماً تمہیں یہ اقدام کرنا ہی ہے تو یثرب جانے کا خیال چھوڑ دو اور ہمیں کسی دوسرے علاقے میں لے چلو!

اس پر میں نے اسے جواب دیا کہ بس اب تو یثرب ہی ہماری منزل مقصود ہے اور خدائے رحمٰن جدھر چاہتا ہے' بندہ ادھر ہی سوار ہو کے نکلتا ہے۔

کتنے ہی چہیتے ساتھیوں اور کتنے ہی خیر خواہوں کو ہم نے پیچھے چھوڑا اور کتنی ہی غمگسار خواتین تھیں کہ جو آنسو بہاتی اور شیون کرتی رہ گئیں!

تم سمجھتی ہو کہ ہمارا ترک وطن اس غرض سے ہے کہ ہم جلا وطن کرنے والوں سے انتقام لینے کے قابل ہوں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ کچھ اور ہی مقاصد ہیں جن کی ہمیں تمنا ہے!

ایک ہم ہیں' اور ایک ہمارے وہ دوست ہیں' جو راہ راست سے دور ہٹ گئے ہیں اور انہوں نے ہمارے خلاف ظلم کے ہتھیار اٹھائے اور ہنگامہ برپا کر دیا۔

یہ کش مکش کرتے ہوئے دو فریق ہیں جن میں سے ایک کو حق کی علمبرداری کی توفیق ملی ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہے۔ دوسرا فریق خدا کے عذاب کی زد میں آنے والا ہے۔

اگرچہ ہم ان کے ساتھ ارحام کے لحاظ سے گہری قرابتیں رکھتے ہیں' لیکن جہاں (نظریات و مقاصد کا) دلی رشتہ نہ جوڑا گیا ہو' وہاں محض ارحام کی قرابت نہیں چل سکتی!

ایک دن آئے گا جب کہ تمہاری وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی اور تمہارے اجتماعی نظم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس وقت تم اچھی طرح جان لو گے کہ ہم دونوں گروہوں میں سے کون ٹھیک ٹھیک حق پر کاربند ہے۔

انسانیت کے محسن اعظم اور دنیا کے سب سے بڑے تاریخ ساز حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامہ حیات کا مکی دور دعوت و پیغام کا دور ہے اور مدنی دور اقتدار کا دور ہے' مکہ میں افراد تیار کئے گئے' مدینہ میں اجتماعی نظام کی تشکیل ہوئی۔ یہاں مسالہ تیار ہوا' وہاں عمارت کھڑی کی گئی۔

اس فرق کی وجہ سے قرآن اور سیرت و تاریخ کو سرسری نگاہ سے دیکھنے والے عام لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ اسلامی تحریک اور اس کے داعی پر امتحان کی کڑی گھڑیاں صرف مکی دور ہی میں بیتی ہیں۔ مدینہ میں مخالفت کے ویسے شدید طوفانوں سے سابقہ نہ تھا اور یہاں اس طرح کی بھٹیاں گرم نہ ہوتی تھیں۔ یا کم سے کم خیال یہ کیا جاتا ہے کہ مخالفت اب ایک ننگی تلوار بن کر میدان جنگ میں آگئی تھی اور مخالفین کی طرف سے گھٹیا حرکات اور ذلیل کارروائیوں کا وہ دور گزر گیا تھا۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ پہلا شہ قریش کی اولیں مخالف طاقت تو اب زو در رو ہو کر میدان جنگ میں چیلنج کر رہی تھی' لیکن دوسری طرف مدینہ میں تحریک کی پر زور اٹھان نے نئی مخالف طاقتیں ابھار دی تھیں اور وہ شرانگیزی میں اہل مکہ سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ اس شرانگیزی کے نت نئے کرشموں نے داعی حق اور اس کے رفقاء کو شروع سے آخر تک پریشان کیا اور تمدن کی تعمیر نو کے کام میں رکاوٹیں ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

تاریخی کلیہ یہی ہے کہ اصلاح و تعمیر کا کام جتنا جتنا آگے بڑھتا ہے' اصلاح دشمن اور جمود پسند طاقتیں اس کو تباہ کرنے کے لیے جذبات عداوت میں اتنی ہی زیادہ بھکتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ حق جب مظلومی کے تختہ دار سے ایک جست لگا کر تخت اقتدار پر قدم رکھتا ہے تو باطل کا بغض و حسد بھی ساری حدوں سے آگے نکل جاتا ہے۔ یہی صورت مدینہ میں نئی مسلم سوسائٹی کے قیام اور امن و سلامتی کی ریاست کے بپا ہونے پر پیدا ہوئی۔

مدینہ کی مختلف فضا:

تاریخی لحاظ سے یہ صورت واقعہ بجائے خود بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ مدینہ کی سیاسی و مذہبی فضا مکہ سے بالکل مختلف تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دین حق کی جو پنیری وہاں سخت ناساز گار حالات سے دوچار تھی' یہاں لا کر جونہی نصب کی گئی تو وہ تیزی سے برگ و بار لانے لگی۔

پہلی بات یہ کہ مکہ اور اس کے ماحول کی ساری آبادی باہم دگر مربوط تھی' اور مذہبی قبیلوں اور معاہداتی بندھنوں سے بندھی ہوئی تھی اور قریش کا اس پر پورا تسلط تھا۔ لیکن مدینہ اور اس کے ماحول میں دو مختلف عناصر آباد تھے۔ جن کے درمیان کھچاؤ موجود تھا۔

مدینہ' یثرب کے نام سے قدیم شہر تھا۔ اور یہاں یہودی بکثرت آکر آباد ہوئے۔ یہاں جوں جوں ان کی نسل پھیلتی گئی مدینہ کے آس پاس ان کی نئی بستیاں قائم ہوتی گئیں۔ اور ساتھ کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے جنگی قلعے تعمیر ہوتے گئے۔ چنانچہ پورا علاقہ یہود کے مذہبی و سیاسی تسلط میں تھ۔

دوسرا عنصر انصار کا تھا۔ ان کا اصل وطن یمن تھا اور قحطان کا خاندان ان کا نسلی سرچشمہ تھا۔ جس زمانے میں سیل عَرِم نامی مشہور سیلاب نے تباہی مچائی تھی اور بچے کھچے لوگ ادھر ادھر منتشر ہوئے تھے' اس زمانے میں قحطان کے قبیلے میں سے اوس اور خزرج نام کے دو بھائی یثرب آپہنچے اور یہاں آباد ہو گئے۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں اور لوگ بھی آئے ہوں۔ تاہم انہی نو واردوں کے ذریعے اس علاقے میں نئے عنصر کا اضافہ ہوا۔ بعد میں نسل بڑھتی گئی۔ اور آہستہ آہستہ ایک نئی طاقت ابھرنے لگی۔ شروع شروع میں ان لوگوں نے یہودی معاشرے اور تمدن سے منقطع رہ کر پنپنا چاہا' لیکن پہلے کی جمی ہوئی طاقت کے زور و اثر سے دب کر ان سے دوستانہ معاہدہ استوار کر لیا۔ معاہدانہ تعلقات دیر تک خوش اسلوبی سے چلتے رہے۔ لیکن یہود نے جونہی یہ محسوس کیا کہ انصار کی روز افزوں ترقی ان کے اقتدار کے لیے ایک خطرہ بنتی جا رہی ہے' تو انہوں نے حلیفانہ تعلق توڑ لیا۔

یہود کے اندر ایک عیاش رئیس فطیون نامی اٹھا۔ اس نے جبر و قوت سے اپنا یہ حکم نافذ کر دیا کہ اس کی حدود میں جو لڑکی بھی بیاہی جائے وہ اس کے شبستان عیش سے گزر کر ازدواجی زندگی کے دائرے میں داخل ہو' یہود کے بگاڑ کا اس سے اندازہ کیجیے کہ انہوں نے فطیون کے اس حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ آخر ایک دن اس شیطانی حکم نے انصار کی غیرت کو بھی چیلنج کر دیا۔ مالک بن عجلان کی بہن کی شادی ہو رہی تھی کہ عین بارات کے دن وہ بھائی کے سامنے سے پورے انداز بے حجابی کے ساتھ گزری۔ مالک نے ملامت کی تو اس نے کہا کہ کل جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اس سے زیادہ شدید ہے۔ چنانچہ مالک نے فطیون کو جا کر قتل کر دیا اور شام کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں غسانی حکمران ابو جبلہ کا سکہ چل رہا تھا۔ اسے یہ حالات جب معلوم ہوئے تو اس نے حملہ کیا اور بڑے بڑے یہودیوں کو قتل کیا۔ اور اوس و خزرج کو خلعت و انعام سے نوازا۔ ان واقعات نے یہود کا زور توڑ دیا۔ اور انصار کی طاقت بڑھا دی۔ [1]

غرض یہود کے مقابلے میں انصار کا معاملہ برابر کی چوٹ کا معاملہ تھا۔ لیکن اصول و مقصد کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کا اتحاد مضبوط بنیاد نہیں رکھتا تھا۔ آپس کی کش مکش نے دیمک بن کر طاقت کو چاٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اوس و خزرج کے درمیان جنگ بعاث واقع ہوئی اور فریقین کے نہایت قیمتی افراد ایک دوسرے کی تلواروں کا لقمہ ہو گئے۔ اس طرح یہود کے سامنے وہ پھر بے زور ہو کر رہ گئے۔ اسی حالت سے مجبور ہو کر انہوں نے قریب کے زمانے میں قریش کے سامنے حلیفانہ تعلقات کی درخواست رکھی تھی۔ لیکن بعض وجوہ سے یہ کوشش ناکام رہی۔

دوسری طرف یہود کے تفوق کی ایک وجہ ان کی مذہبی سیادت بھی تھی۔ ان کے پاس تورات تھی' اور وہ ایک مستقل مذہبی نظام کے علمبردار تھے' ان کے پاس ایک سرمایہ اعتقاد تھا۔ ایک اخلاقی ضابطہ تھا' فقہی

---

[1] شبلی نعمانی۔ بہ حوالہ "وفاء الوفاء"۔

احکام تھے' مذہبی قانون تھا' کچھ روایات تھیں اور عبادات کی انجام دہی کا طریقہ تھا۔ انصار اس پہلو سے تہی دامن تھے۔ اور وہ اس دائرے میں ان کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور تھے' انہی کے "بیوت المدروس" (یہودیوں کے مذہبی تعلیم کے مراکز) سے وہ استفادہ کرتے تھے۔ حد یہ کہ اگر کسی انصاری کی اولاد زندہ نہ رہتی تھی تو وہ نذر ہی یہ مانتا تھا کہ اگر بچہ زندہ رہا تو اسے یہودی بنایا جائے گا۔ انصار میں اس پہلو سے احساس کمتری موجود تھا اور ان کی غیرت و حمیت اس پر کرب محسوس کرتی تھی۔

اوپر کے حقائق کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مدینہ کے ماحول میں یہود اور انصار کے درمیان کھچاؤ تھا اور تعلقات کی گہرائی میں حریفانہ و رقیبانہ جذبات کام کر رہے تھے۔

اسی سلسلے میں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہود انصار کے سامنے اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ آخری نبی جلد ہی مبعوث ہونے والا ہے' وہ آلے تو پھر ہم اس کے ساتھ ہو کر تمہاری خبرلیں گے۔ یہود کی اس پیش گوئی نے انصار کو بھی اس پیغمبر موعود کا منتظر بنا دیا تھا۔ اور ان کے اندر ایک شعوری رجحان یہ کام کر رہا تھا کہ اگر وہ نبی آجائے تو وہ آگے بڑھ کر اس کا دامن تھام لیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ پیش گوئی سنانے والے خود تو محروم رہے اور جن کو وہ دھمکیاں دیا کرتے تھے وہ نبی آخر زماں کے حلقہ رفاقت میں آئے۔ یہود جن کو پڑانا چاہتے تھے ان کے ہاتھوں سے خود پٹ گئے۔ [1]

مدینہ کی اس فضا اور اس کے پس منظر کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کیوں یہ ماحول مکہ کے مقابلے میں تحریک اسلامی کو زیادہ راس آیا۔

تحریک اسلامی مدینہ میں:

مکہ نے دعوت حق سنی اور مسلسل ۱۳ سال سنی' اس کا پورا استدلال سامنے آیا۔ اس کے نور سے بھری ہوئی ایک لامثال شخصیت کا کردار اس کے سامنے جگمگاتا رہا۔ اس کے علمبرداروں نے ظلم کی چکی میں پستے ہوئے "احد' احد" کی صدا بلند کی' مگر مکہ کی اجتماعی فضا نے شروع سے آخر تک ایک ہی رٹ لگائے رکھی "نہیں منظور"۔

لیکن مدینہ تک گل دعوت کی نکہت کا پہلا جھونکا ہی پہنچا ہو گا کہ اس کی روح وجد میں آکر پکار اٹھی "لبیک"۔ مدینہ کا پہلا نوجوان جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے بہرہ اندوز ہوا' سوید بن صامت تھا۔ یہ ایک ذہین شاعر تھا' ایک ماہر سوار تھا' بہادر جنگجو تھا' ایسے نوجوان بالعموم انقلابی حرکت کے سپاہی بنا کرتے ہیں اور تعمیر و ترقی کی ہر دعوت پر لبیک کہتے اور پھر اپنا سب کچھ لگا دیا کرتے ہیں۔ یہ نوجوان مکہ میں آیا تو سرور عالم نے حسب معمول مل کر دعوت پیش کی۔ سوید نے بتایا کہ ایسی ہی ایک چیز میرے پاس بھی ہے

---

[1] یہ معلومات سیرت النبیؐ از علامہ شبلی مرحوم (حصہ اول) سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ ص ۲۴۰ تا ۲۴۲

یعنی صحیفۂ لقمان' اس کا کچھ حصہ اس نے سنایا بھی۔ پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن سنایا' دیکھیے بے تعصبی کا مظاہرہ' سوید کی فطرت سلیم فوراً پکار اٹھی کہ "ان ھذا القول حسن" یعنی یہ کلام خوبی میں بڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کلام کا پیغام اس کے دل میں گھر کر گیا۔ لیکن افسوس کہ جانے کے بعد جلد ہی وہ خزرجیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بارے میں بعد میں لوگوں نے تذکرہ کیا کہ وہ قتل ہوتے وقت مسلم تھا۔ اور تکبیر اس کی زبان پر تھی۔ اس کی موت جنگ بعاث سے ایک دن قبل ہوئی۔ [1]

متاثر ہونے والا دوسرا یثربی نوجوان ایاس بن معاذ تھا۔ یہ مدینہ کے ایک وفد کا رکن تھا۔ وفد کا مقصد یہ تھا کہ خزرج کے خلاف قریش سے حلیفانہ معاہدہ کریں اور امداد حاصل کریں۔ داعی حق نے ان لوگوں تک بات پہنچانے کا موقع نکالا۔ اسلام کا تعارف کرایا۔ اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ ایاس بن معاذ جو اس وقت لڑکپن کے عالم میں تھا۔ کہنے لگا:- ای قوم! ھذا واللہ خیر مما جئتم بہ"۔ کیا ہی پاکیزہ فطرت بول رہی ہے کہ "اے ساتھیو! تم جس غرض کے لیے آئے ہو اس سے یہ زیادہ بہتر ہے"۔ سردار وفد ابوالحیسر نے مٹی اٹھا کر اس کے منہ پر ماری۔ مطلب یہ تھا کہ یہ تم بیچ میں کیا غضب ڈھا رہے ہو۔ ساتھ ہی کہا۔ "ہم اس مطلب کے لیے نہیں آئے"۔ ابوالحیسر کو فکر تھی قریش کی حمایت حاصل کرنے کی اور وہ خوب سمجھتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانی تو قریش کے دلوں کے دروازے الٹا اور بند ہو جائیں گے۔ ایاس چپ ہو گیا ---- لیکن اس کے دل کی مٹی میں دعوت کا بیج پڑ گیا تھا۔ یہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ اور افسوس کہ مدینہ کا یہ بیدار دل نوجوان بھی جلد ہی جنگ بعاث کی لپیٹ میں آکر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ دم آخر خدا کا ذکر اس کے لب پر تھا۔ [2]

نبوت کے گیارھویں سال حج کے لیے مدینہ سے جو گروہ آیا اس سے ایک نشست میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ آپؐ کی دعوت سن کر وہ لوگ آپس میں کہنے لگے۔ "اے ساتھیو! جان لو کہ قطعی طور پر یہ وہی نبی ہے جس کے بارے میں یہود تمہارے سامنے پیش گوئی کرتے رہتے ہیں۔ سو اب وہ کہیں تم سے آگے نہ بڑھ جائیں"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کھول دیئے اور انہوں نے دین حق کو اپنے سینوں میں جذب کر لیا۔ پھر وہ کہنے لگے:

> "ہم لوگوں نے اپنی قوم کا ساتھ چھوڑا' دوسری کسی قوم میں ہمارے لوگوں کی طرح دشمنی اور خرابی نہ ہو گی۔ شاید کہ آپؐ کی ذات کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان کو پھر جوڑ جاڑ دے۔ ہم ان کے پاس جائیں گے اور آپؐ کے دین کی طرف ان کو دعوت دیں گے اور ان کے سامنے اپنا وہ تاثر رکھ دیں گے' جو اس دین کے لیے آپؐ کے سامنے ہم نے ظاہر کیا ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ

---

1. سیرت ابن ھشام جلد ۲ ص ۳۴ تا ۳۶
2. ایضاً ۳۶۔۳۷

نے انہیں اس دین پر جمع کر دیا تو اس کے بعد آپؐ سے زیادہ قوت رکھنے والا کوئی دوسرا نہ ہو گا"۔ ❶

مکہ کے لوگوں نے جس دعوت کو موجب تفرقہ گردانا' مدینہ کے لوگوں نے اس میں اپنے لیے اتفاق و اتحاد کی بنیاد پہلی نظر ڈالتے ہی دیکھ لی۔ اسلامی تحریک کی علمبرداری کے لیے مدینہ کی یہ پہلی جماعت جس کی تشکیل مکہ میں ہو رہی تھی۔ چھ افراد پر مشتمل تھی۔ (۱) ابوالہیثم بن تیہان (۲) اسعد بن زرارہ (۳) عوف بن حارث (۴) رافع بن مالک بن عجلان (۵) قطبہ بن عامر (۶) جابر بن عبداللہ۔ ❷

یہ لوگ لوٹ کر گئے تو ماحول میں ایک نئی حرکت انہوں نے پیدا کر دی۔ دعوت اسلام پھیلنے لگی اور خوب مقبول ہوئی۔ انصار کے گھرانوں میں سے کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں محمد صلی اللہ علیہ و سلم کا چرچا نہ ہو رہا ہو۔

بیعت عقبہ اولیٰ:

اگلے سال یعنی نبوت کے بارھویں برس بارہ افراد کا وفد آیا اور آ کر بیعت کی۔ اس بیعت کو اصطلاحا "بیعت النساء" یعنی زنانہ بیعت کہتے ہیں۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ اس بیعت میں صرف بنیادی باتوں کا اقرار لیا گیا تھا۔ اور جنگ و تصادم کا کوئی سوال سامنے نہ تھا۔ اس ایمانی اقرار کے اجزاء یہ تھے۔

> "ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے' چوری نہیں کریں گے' زنا نہیں کریں گے' اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گے' کسی کے خلاف جانتے بوجھتے کوئی من گھڑت بہتان گھڑ کر نہیں لائیں گے' اور کسی معروف معاملے میں محمد صلی اللہ علیہ و سلم کی نافرمانی نہیں کریں گے"۔

یہ لوگ فارغ ہو کر اٹھے تو پیغمبر خدا نے معصب بن عمیر بن ہاشم کو مدینہ میں فریضہ دعوت کی انجام دہی پر مامور کیا۔ ان کے ذمے لگایا کہ وہاں جا کر لوگوں کو قرآن پڑھائیں' اسلام کی تعلیم دیں۔ دین کی سوجھ بوجھ پیدا کریں۔ چنانچہ وہ نماز کی امامت بھی کراتے تھے اور اسلام کی آئیڈیالوجی اور اس کے اصول اخلاق کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ ❸

دو لیڈروں کا قبول اسلام:

ایک دن اسعد بن زرارہ (جن کے مکان پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے مامور کردہ داعی معصب

---

❶ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۶۹

❷ فہرست اسماء میں روایات کا کچھ اختلاف ہے مگر غیر اہم۔

❸ سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۷۶۔۷۳

اقامت گزیں تھے) دعوتی مہم کے سلسلے میں اپنے ساتھ مصعب بن عمیرؓ کو لے کر بنی عبدالاشہل اور بنی ظفر کے گھروں تک جانے کے لیے نکلے۔ دونوں مرق نامی کنوئیں کے متصل بنی ظفر کے احاطے میں پہنچے۔ بعض لوگ جو اسلام لا چکے تھے ان کے گرد آ جمع ہوئے۔ سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر دونوں بنی عبدالاشہل کے لیڈر تھے اور ابھی تک اپنی قوم کے مسلک مشرکانہ پر قائم تھے۔ اسعد بن زرارہ اور مصعب کے کار دعوت پر سعد بن معاذ جلا بھنا تو تھا ہی' جونہی دونوں صاحبوں کے ادھر آنے کی اطلاع ملی اس نے اسید کے کان میں پھونکا کہ یہ دونوں ہم میں سے کمزور افراد کو اپنے ہم نوا بنانے آتے ہیں۔ لہٰذا جا کر ان کی خبر لو اور ان کو منع کر دو کہ ہمارے گھروں میں نہ آیا کریں۔ اگر اسعد بن زرارہ میرا خالہ زاد اور عزیز نہ ہوتا تو تمہارے بجائے میں خود اس سے نپٹ لیتا۔ چنانچہ جونہی مدینہ کے حلقہ اسلامی کی یہ مجلس لگی۔ سعد بن معاذ کی تلقین کے زیر اثر اسید بن حضیر آیا اور بھالا تانے ہوئے ان دونوں داعیان اسلام کی طرف لپکا۔ پھر ٹھنک کر بد زبانی کرتے ہوئے کہا کہ "تمہارے یہاں آنے کا مطلب کیا ہے؟ تم ہمارے کمزور آدمیوں کو بے وقوف بناتے ہو۔ اگر تمہیں اپنی جانوں کی ضرورت ہے تو ہم سے کنارہ کرو"۔ مصعب نرمی سے کہنے لگے کہ "کیا تم ذرا بیٹھ نہیں جاتے کہ پہلے غور سے سنو' پھر اگر بات پسند آئے تو مانو۔ ناپسند ہو تو اس سے باز رہو"۔ چنانچہ وہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ بھالا نیچے ڈال دیا۔ اور تحریک اسلامی کے دونوں داعیوں کے پاس سکون سے بیٹھ گیا۔ مصعبؓ نے گفتگو شروع کی۔ اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ دونوں حضرات کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مخاطب کے بولنے سے قبل اس کے چہرے سے قبول اسلام کا جذبہ پڑھ لیا۔ آخر اسید کی زبان کھلی: "کیا ہی خوب ہے یہ کلام بہت ہی پیارا"! پوچھا۔ "تم لوگ اسلام میں داخل ہوتے وقت کیا صورت اختیار کرتے ہو؟" دونوں نے کہا کہ جاؤ جا کر نہاؤ۔ پاک صاف ہو جاؤ اور اپنے کپڑے دھو ڈالو۔ پھر حق کی صداقت کی گواہی دو اور نماز ادا کرو۔ اسید جو ابھی بھالا تانے کھڑا تھا اب خود اسلام کا زندگی بخش بھالا اس کے سینے میں اتر چکا تھا۔ اٹھا نہایا دھویا اور آ کر دو رکعتیں نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر بات چھیڑی اور اسید نے کہا کہ میرے ساتھ کا ایک شخص اور ہے' اگر وہ بھی تمہارے ساتھ ہو جائے تو اس کے قبیلے کا کوئی آدمی سرتابی نہ کرے گا' میں ابھی وقت اس کو بلا لیتا ہوں۔ وہ ہے سعد بن معاذ۔ چنانچہ فوراً بھالا اٹھائے سعد کے ہاں پہنچا۔ وہاں مجلس لگی تھی۔ اس نے دیکھتے ہی ساتھیوں سے کہا کہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسید کا چہرہ وہ نہیں ہے جو تم لوگوں سے اٹھ کر جاتے وقت تھا۔ پھر سعد نے اسید سے پوچھا؟ "کہو کیا کر کے آئے"؟ اسید نے بے ساختہ جواب دیا۔ میں نے دونوں سے بات کی۔ سو خدا کی قسم! ان کی طرف سے کسی طرح کا اندیشہ محسوس نہیں کیا۔ اور انہیں میں نے منع کر دیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہم وہی کریں گے جو تمہیں پسند ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سعد بن معاذ کے جذبات کو حرکت میں لانے کے لیے یہ بھی کہہ دیا کہ بنی حارثہ اسعد بن زرارہ کے قتل کے درپے ہیں اور وہ لوگ یہ جانتے ہوئے اس بات کی جسارت کر رہے ہیں کہ اسعد تمہارا عزیز ہے اور اس طرح وہ تمہاری تحقیر کرنا چاہتے ہیں۔ سعد بن معاذ بنی حارثہ کی طرف سے

ایسی حرکت کا خوف محسوس کرتے ہوئے غضب ناک ہو کر لپکا اور بھالا اسید کے ہاتھ سے اڑس لیا۔ لیکن وہاں پہنچا تو دیکھا کہ اسلام کے دونوں علمبردار سکون سے ہیں۔ سمجھ گیا کہ اسید کا منشا اس چال سے صرف یہ ہے کہ میں براہ راست ان کی بات سنوں۔ ان کو برا بھلا کہتے ہوئے وہ سامنے ٹھٹک گیا۔ اور اسعد بن زرارہ کو مخاطب کر کے کہا کہ تم لوگ ہمارے پاس آتے ہو تو ایسی بات لے کر ہمارے گھروں میں آتے ہو جس سے ہمیں نفرت ہے۔ مصعب نے نرمی کے اسی انداز سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ذرا سنبھلو' بات سنو' پسند ہو تو مانو' نہیں تو پھر ہم وہ چیز تمہارے سامنے نہیں لائیں گے جس سے تمہیں نفرت ہو۔ سعد بن معاذ کہنے لگا۔ "تم نے بات انصاف کی کہی"۔ معاً وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ بھالا نیچے ڈال دیا۔ اور بیٹھ گیا۔ سنانے والے نے حق کا پیغام سنایا۔ اور قرآن پڑھا۔ دوبارہ وہی کیفیت پیش آئی۔ سعد بن معاذ کے بولنے سے قبل اس کے چہرے سے قبول اسلام کا جذبہ جھلکنے لگا۔ یہ دوسرا لیڈر بھی چند لمحوں میں اسلام کے محاذ پر کھڑا تھا۔

سعد "حیات نو" لے کے پلٹے تو اہل مجلس نے دور سے دیکھتے ہی آپس میں کہا کہ چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ آتے ہی اس نے یوں خطاب کیا: "اے بنی عبدالاشہل! میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے" سب کہنے لگے کہ تم ہمارے سردار ہو۔ تمہاری رائے ہم سے پختہ ہے' خوبیوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ بابرکت ہو۔ سعد بن معاذ نے کہا۔ "تو پھر جب تک تم لوگ خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان نہیں لاؤ گے تمہارے مردوں اور عورتوں سے بات کرنا مجھ پر حرام" ! ------ پھر کیا تھا پورے قبیلے کے مرد و زن میں سے کوئی ایک بھی اسلام کے دائرے سے باہر نہ رہا۔

ان دو لیڈروں کے ذریعے جب تحریک حق کی طاقت یکایک اتنی بڑھ گئی تو دعوت کی مہم نے بھی زور پکڑا اور ایک ایک قبیلے اور ایک ایک گھر میں صبح اسلام کی تجلیاں بکھر گئیں۔ [1]

بیعت عقبہ ثانیہ:

اسی دوران میں حج کا زمانہ آگیا۔ اب کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مکہ پہنچی۔ مدینہ کی کھیتی خوب فصل دے رہی تھی۔ یہ نئے جذبہ دینی سے سرشار ہو کر آنے والے حجاج' قریش سے بچ بچ کر راتوں کی تاریکی میں اپنے قائد محبوب سے ملے۔ اس بار پھر عہد وفا از سر نو استوار کیا گیا۔ لیکن اب کی مرحلہ "بیعت النساء" سے بہت آگے تک جا پہنچا۔ پہلی بیعت میں سیاسی پہلو صرف ایک نکتے سے نمایاں ہوتا تھا' یعنی یہ اقرار کہ ہم "محمد صلی اللہ علیہ و سلم کے معروف احکام سے سرتابی نہیں کریں گے"۔ لیکن اس مرتبہ سیاسی پہلو پوری خطرناکیوں کے ساتھ سامنے آگیا۔ اب محمد صلی اللہ علیہ و سلم کا ساتھ دینے کے معنی قریش اور سارے عرب کے ساتھ برسرپیکار ہونے کے تھے۔ اور یہی معنی سامنے رکھ کر بیعت ثانیہ استوار کی گئی۔

---

[1] حالات کی تفصیل ابن ہشام ج ۲ ص ۴۳ تا ۴۶

گفتگو میں تحریک اسلامی کے ان یثربی سپاہیوں نے پیش آئند ممکنات کا پورا اندازہ کر کے یہ کہا' کہ "لوگوں (یعنی یہود) کے ساتھ ہمارے معاہدانہ روابط ہیں اور ہمیں ان روابط کو توڑنا ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب ہم یہ کر چکیں اور پھر اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا کر دے' تو آپؐ اپنے خاندان والوں کی طرف لوٹ جائیں۔ اور ہمیں چھوڑ دیں"۔ اس اندیشے کے جواب میں مسکراتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا۔ "تمہارا خون میرا خون ہے' تمہارے دشمن میرے دشمن ہیں' میں تمہارا اور تم میرے! جس سے تمہاری جنگ اس سے میری جنگ' جس سے تمہاری صلح اس سے میری صلح"۔ عباس بن عبادہ نے کہا: "اے خزرج والو! جانتے ہو کہ اس ہستی کے ساتھ کس بات کا پیمان باندھ رہے ہو؟ــــ یہ لوگوں میں سے سرخ و سیاہ سے جنگ کا پیمان ہے"۔ اہل وفد نے پوری ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے جواب دیا' کہ "ہاں ہم اپنے مالوں کی تباہی' اپنے سرداروں کے قتل کے علی الرغم آپؐ کے ساتھ پیمان باندھ رہے ہیں"۔ اس بیعت کی خاص نوعیت ہی کی وجہ سے اس کا نام "بیعت حرب" پڑ گیا۔ اس بیعت کی ایک مرکزی شرط یہ تھی کہ "ہم تنگی میں' آسانی میں' خوشی میں اور رنج میں آنحضور صلی اللہ علیہ و سلم کا ہر ارشاد سنیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے' حضورؐ کو' حضورؐ کے فرمان کو اپنے آپ پر ترجیح دیں گے' یہ کہ ہم ارباب امر سے کش مکش نہیں کریں گے۔ اور یہ کہ ہم اللہ کے دین کے معاملے میں ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے۔

یہ بیعت گویا اسلامی قصر ریاست کی پہلی اینٹ تھی۔ اور ساتھ کے ساتھ کتاب تحریک میں لکھے جانے والے باب ہجرت کا دیباچہ! اس بیعت کے ذریعے مستقبل کی اسلامی ریاست کے لیے گویا اسکے ہونے والے شہریوں نے برضا و رغبت محمد صلی اللہ علیہ و سلم کی قیادت کو قبول کر لیا۔ علاوہ بریں سمع و طاعت کا نظم استوار ہو گیا۔

اس موقع پر صرف ایک پیمان ہی نہیں باندھا گیا۔ بلکہ اجتماعی نظم کی بنیاد بھی اٹھا دی گئی۔ اسلامی تحریک کے قافلہ سالار نے شہری جماعت کی رائے سے بارہ نقیب مقرر کیے۔ نو خزرج میں سے' تین اوس میں سے! ان نقیبوں کو مامور کیا گیا کہ تم اپنی قوم کے سارے معاملات کے ذمہ دار ہو' بالکل اسی طرح جیسے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے حواری ذمہ دار تھے اور جیسے خود میں اپنی پوری جماعت کا ذمہ دار ہوں۔ یہ گویا آنحضرتؐ کے نائب تھے۔ ان کے تقرر سے منظم معاشرہ کی تعمیر کا کام باقاعدہ شروع ہو گیا۔

قریش کے کان میں بھنک پڑی تو سٹپٹا گئے' وفد جا چکا تھا' اس لیے تعاقب کیا اور سعد بن عبادہ' ور منذر بن عمرو کو گرفتار کر لائے۔ ان پر انہوں نے اپنا غصہ نکالا۔ لیکن سانپ نکل گیا تھا اب لکیر پیٹنے سے کیا حاصل!۔........................

تھا۔ [1]

مدینہ میں تحریک کا نیا مدوجزر:

یہ طاقت مکہ سے نئی سپرٹ لے کر مدینہ پلٹی تو دعوت کا کام علی الاعلان بہت ہی زور و شور سے شروع ہو گیا۔ نوجوان جب کسی تبدیلی کے نقیب بن کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو ان کے مقابلے میں بڑھاپے سے گزرتی ہوئی نسل دیر تک جم نہیں سکتی۔ اور جمے بھی تو اس کا دور زیادہ لمبا نہیں ہو سکتا اور کسی تحریک کے مستقبل کا اندازہ کرنے کے لیے یہ جاننا بہت مفید ہوتا ہے کہ وہ میدان چھوڑتی ہوئی سال خوردہ نسل کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔ یا اس کی رگوں میں نیا خون رواں ہے۔ سو مکہ میں بھی' اور خاص طور پر مدینہ میں نوجوان طاقت دعوت اسلامی کے جھنڈے اٹھائے آگے آگے بڑھ رہی تھی۔

نوجوان طاقت نے کیا کیا کچھ نہ کیا ہو گا۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بڑے بوڑھوں میں سے ایک بزرگ تھے' عمرو بن الجموح جن کا تعلق بنی سلمہ سے تھا۔ ان بڑے میاں نے اپنے گھر میں لکڑی کا ایک بت مناۃ نامی فراہم کر رکھا تھا' یہ اس کی پوجا کرتے تھے۔ اور اس کی جھاڑ پونچھ میں لگے رہتے تھے۔ بنی سلمہ کے دو نوجوان معاذ بن جبل اور معاذ بن عمرو دعوت حق پر ایمان لا کر تحریک اسلامی کے کارکن بن چکے تھے۔ موخر الذکر خود انہی بڑے میاں کے صاحبزادے تھے۔ یہ دونوں رات کی تاریکی میں جاتے اور بڑے میاں کے خداوند کو کیچڑ میں لت پت کر دیتے اور اٹھا کر بنی سلمہ کے گڑھے میں الٹا کر ڈال آتے جہاں لوگ غلاظت اور کوڑا کرکٹ پھینکتے تھے۔ صبح ہوتی تو عمرو بن الجموح چلاتا کہ "یہ کون ہے جس نے رات ہمارے خداوندوں پر دراز دستی کی ہے"۔ پھر وہ اپنے خدائے گم شدہ کو ڈھونڈتا پھرتا۔ اور جب پا لیتا تو اسے دھو دھا کر سنگھاسن پر لا بٹھاتا۔ اگلی رات پھر یہی حادثہ پیش آتا۔ بڑے میاں پھر اسی چکر میں پڑے بڑبڑاتے پھرتے۔ ایک دن عمرو نے تنگ آ کر اپنی تلوار بت کے ساتھ لٹکا دی۔ اور اسے خطاب کر کے کہا کہ "خدا کی قسم' میں نہیں جانتا کہ کون تیرے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے' سو اگر تجھ میں کس بل ہے تو پھر خود ہی اپنا بچاؤ کر' یہ تلوار موجود ہے"۔ شام ہوئی اور عمرو سو گیا۔ تو اس ڈرامے کے دونوں کردار رات کو آئے۔ اور تلوار بت کی گردن سے کھول لی۔ پھر ایک مرا ہوا کتا تلاش کر کے اس کے گلے میں رسی سے باندھا اور اسے ایک اندھے کنوئیں میں جا کر لٹکا آئے۔ جو انسانی غلاظت سے اٹا رہتا تھا۔ صبح اٹھ کر عمرو نے دیکھا تو حضرت پھر غائب تھے۔ تلاش کیا تو یہ حال زار دیکھا۔ عبرت نما یہ نقشہ دیکھتے ہی دل نے کروٹ لی اور وہی عمرو اسلام کی صفوں میں آ شریک ہوا۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۱ تا ۵۹

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مدینہ کی کس طرح کایا پلٹ رہی تھی۔

تحریک کا نیا مرکز:

تحریک حق کا آسمانی لیڈر برابر سوچ میں رہا کہ اگر مکہ کے ظرف میں سمائی نہیں اور یہاں کی سنگین قیادت "جہان نو" کی تاسیس کا موقع دینے پر تیار نہیں ہے تو پھر زمین کا اور کون سا گوشہ ہو سکتا ہے جہاں طاقت کو سمیٹ کر تعمیری کام شروع کیا جا سکے۔ پہلے نگاہ حبش پر گئی اور اسی لیے ساتھیوں کو وہاں بھیجا۔ اگرچہ شاہ نجاشی نے مظلومین مکہ کی حمایت کا حق ادا کر دیا۔ لیکن ایک تو وہاں عیسائی علماء کا گھٹیا کردار سامنے آچکا تھا۔ اور ان کے چھائے ہوئے اثر کے تحت دین حق کا پنپنا آسان نہ تھا۔ دوسرے وہاں کی مقامی آبادی میں بالکل نئے سرے سے کام کرنے کی ضرورت تھی اور اس میں اجنبیت کے بہت سے وجوہ حائل نظر آتے تھے۔ اس لیے کسی دوسرے گوشے کی تلاش تھی۔ مدینہ نے جب کھلے دل سے دعوت حق کو لبیک کہی تو سرور عالم کو امید کی ایک نئی جھلک نظر آئی۔ بیعت عقبہ اولیٰ نے اس امید کو مستحکم کر دیا۔ پھر معصبؓ بن عمیر نے خود وہاں رہ کر اور کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد بیعت عقبہ ثانیہ والے موسم حج سے کچھ قبل آکر حضورؐ کی خدمت میں رپورٹ پیش کی۔ مدینہ کے مسلمانوں کی تفصیل بیان کی' ان کی قوت کا حال بتایا۔ اور خوش خبری دی کہ وہ امسال بڑی تعداد میں آرہے ہیں۔ اس رپورٹ نے حضورؐ کو غور و فکر کی دعوت دی۔ یہ صورت فی الواقع بڑی خوش آئند تھی کہ مدینہ کے مسلمان تعداد اور قوت کے لحاظ سے دن دونی رات رات بڑھ رہے تھے اور پھر یہود کی طرف سے اس طرح کی سنگین مخالفت کا ان کو سامان نہیں کرنا پڑ رہا تھا جیسے ان کے مکی ساتھیوں کو قریش کی طرف سے درپیش تھی۔ اور اہل یثرب مکہ والے رفقاء کے لیے بالعموم کڑھتے تھے' ان کو بہت زیادہ سہولتیں میسر تھیں۔ ان کے ہاں کھیتیاں تھیں اور نخلستان اور تاکستان تھے۔ حضورؐ سوچتے تھے کہ کیا یہ اچھا نہ ہو کہ مکہ کے رفقاء مدینہ چلے جائیں۔ اور قریش کے مظالم سے نجات پا کر دین کے تقاضے پورے کریں۔ چنانچہ آنے والے وفد میں جو لوگ محرم تھے ان سے آپؐ نے اس خیال کا اظہار بھی فرما دیا اور بعد میں جس شکل میں پیمان باندھا گیا وہ اسی پس منظر کے ساتھ تھا۔ [1]

یوں تو ہجرت حبشہ سے مہاجرین کے لوٹ آنے کے بعد ہی سے اکا دکا رفقاء آپؐ کی اجازت سے مدینہ جاتے رہے۔ لیکن بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد رفتار تیز ہو گئی' اور تقریباً طے ہو گیا کہ دوسرا دار الہجرت مدینہ ہی ہو گا۔

سرداران مکہ دیکھ رہے تھے کہ تحریک اسلامی نے ایک نیا مضبوط مرکز پیدا کر لیا ہے۔ ان کی نگاہوں میں مستقبل بڑا بھیانک ہو کر آنے لگا۔ وہ اپنی جگہ خوب سمجھ رہے تھے کہ اب اگر مدینہ میں کلمہ حق کی جڑ

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حیات محمدؐ از محمد حسین ہیکل مصری ص ۲۰۳' ۲۰۴

لگ جاتی ہے تو ہمارے حدود اثر سے باہر ہی یہ کلمہ ایک ناقابل شکست طاقت بن کر ایک دن ہماری ہی خبر لے گا۔ اور ہمیں کو اپنے کرتوتوں کا حساب پائی پائی ادا کرنا ہو گا۔ وہ اس خطرے کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ کہ شام کی تجارتی شاہراہ چونکہ مدینہ سے ہو کر گزرتی ہے اس لیے مدینہ کا نیا اسلامی مرکز شاہراہ کی ناکہ بندی کر سکے گا۔ اور اس طرح ان کی معاشی شاہ رگ کٹ جائے گی۔ ان پر اندر ہی اندر گھبراہٹ کا شدید دورہ پڑ چکا تھا۔ مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کریں کیا؟ وہ دن رات اس اندیشے میں رہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پوری جماعت کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اسی اندیشے کے زیر اثر وہ بالآخر صاحب نبوتؐ کے قتل کے منصوبے بنانے پر اتر آئے۔ ایک تاریخی طاقت جو ان کے اپنے گھر سے ابھری اور ساری دنیا سے زیادہ ان کی اپنی تھی' اسے اپنے ہی کرتوتوں سے "غیر" بنا دیا۔ اور خود اس کے دشمن بن کھڑے ہوئے۔ پس اب جوں جوں وہ زور پکڑتی تھی' ان کے لیے ایک جان لیوا خطرہ بنتی جاتی تھی۔

چنانچہ پہلا مہاجر جب مدینہ کے ارادے سے نکلا تو مکہ والوں نے اس کے ساتھ جفاکارانہ معاملہ کیا۔ یہ اولین مہاجر ابو سلمہؓ عبداللہ بن الاسد مخزومی تھے۔ یہ بیوی بچے کو اونٹ پر سوار کر کے نکلے۔ ان کی بیوی بنو مغیرہ میں سے تھیں' وہ لوگ عین روانگی کے وقت تندی میں آئے اور ام سلمہؓ کے اونٹ کی مہار یہ کہہ کر ابو سلمہؓ سے چھین لی کہ اسے ہم تیرے ساتھ در در پھرنے کے لیے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ اس جذباتی صورت حالات نے ابو سلمہؓ کے قبیلہ والوں میں سخت رد عمل پیدا کر دیا۔ انہوں نے بنو مغیرہ سے کہا کہ اگر تم ہمارے آدمی سے اس کی جورو کو یوں چھینتے ہو تو پھر ہم اپنا ننھا بچہ اس کی گود میں نہ رہنے دیں گے۔ چنانچہ شوہر' بیوی اور بچہ تینوں باہم دگر بچھڑ گئے اور اس عالم میں ابو سلمہؓ نے کوچ کیا۔ ام سلمہؓ نت صبح کو آ کر شہر سے باہر اسی موقع پر زار و قطار رونے لگتیں۔ آخر سال بھر کے بعد کسی کو رحم آ گیا۔ اور اس نے بنو مغیرہ سے کہہ سن کر اونٹ پر سوار کرا کے ام سلمہؓ کو بچے سمیت مدینہ روانہ کرا دیا۔ اور وہ تن تنہا چل کھڑی ہوئیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک مقام پر عثمان بن طلحہ مل گئے اور انہوں نے اس مہاجرہ کو حوالی مدینہ میں پہنچا دیا۔

یعنی ہجرت حبشہ کے تلخ تجربے کے بعد اب پالیسی یہ ٹھہری کہ خدا پرستانہ نظام زندگی کے علمبرداروں کو اپنے قابو سے نکلتے ہوئے روکا جائے۔ وہ نکلیں تو ایسی حالت میں نکلیں کہ ان کا کنبہ قبیلہ بطور یرغمال مکہ والوں کے پاس رہے۔ یہ پالیسی شروع میں ذرا ڈھیلی ڈھالی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں سختی بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ' عیاشؓ بن ابی ربیعہ' ہشامؓ بن عاص بن الوائل دور آخر میں ایسے عالم میں چھپ چھپا کر نکلے کہ ہر وقت دھڑکا تھا کہ کہیں گرفتار نہ ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ اور عیاشؓ بخیریت مدینہ پہنچ گئے۔ مکہ سے ایک سازشی وفد ان کے پیچھے روانہ ہوا۔ یہ ابوجہل بن ہشام اور حارث بن ہشام پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ جا کر عیاشؓ سے ملے اور کہا کہ تمہاری والدہ کا حال ابتر ہے اور اس نے قسم کھائی ہے کہ جب تک تم سے نہ ملے گی سر کے بال نہ سنوارے گی اور چلچلاتی دھوپ میں کھڑی رہے گی۔ ساتھیوں نے سمجھایا کہ یہ واضح

طور پر ایک چال ہے' تم ایک بار مکہ والوں کے پھندے میں پھنس گئے تو یہ تمہیں دین سے ہٹا دیں گے۔ عیاش کو ایک لالچ یہ بھی تھا کہ وہ مالدار آدمی تھے اور کچھ مال نکال لانا چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پیش کش کی کہ میں اس سے زیادہ مال رکھتا ہوں۔ اور تم مجھ سے آدھا مال لے لو۔ ان دونوں کے ساتھ نہ جاؤ۔ عیاش نہ مانے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اچھا اگر یہی طے ہے تو میری اصیل اونٹنی لے جاؤ جہاں کوئی اندیشہ محسوس ہو' بھاگ نکلنا۔ مگر کی سازشیوں نے راستے میں ایسی چال چلی کہ اصیل اونٹنی سے فائدہ اٹھانا بھی عیاش کے بس میں نہ رہا اور ان کی مشکیں کس لی گئیں۔ اہل وفد جب مکہ پہنچے تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو' یوں علاج کرو اپنے اپنے عقل کے ماروں کا جیسے ہم نے کیا ہے۔

بعد میں حضرت عمرؓ نے دست خاص سے ایک خط ہشام بن العاص کو لکھا اور اس میں مشہور آیت یعبادی الذین اسرفوا ---- الخ درج کی۔ اس خط کو مکہ کے پاس "ذی طویٰ" نامی موقع پر ہشام نے پڑھا۔ بار بار غور کیا اور جب بات پائی کہ اس میں اشارہ خود اس کی جانب ہے تو فوراً اونٹ لیا۔ کجاوا کسا اور روانہ ہو گیا۔ لیکن اس سے زیادہ مضبوط روایت یہ ہے کہ جب آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لا چکے تو ایک دن مجلس میں ان دونوں محبوسین کا ذکر چھڑا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "عیاش بن ابی ربیعہ اور ہشام بن عاص کو نجات دلانے کے لیے کون مجھے اپنی خدمات سونپتا ہے؟" ولیدؓ بن مغیرہ [1] نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ ولیدؓ حکم نبویؐ کے مطابق مکہ روانہ ہو گئے۔ چھپتے چھپاتے آبادی کے قریب آئے۔ ایک عورت کھانا لے جاتی نظر آئی۔ پوچھا۔ "اللہ کی بندی کدھر کو جا رہی ہو؟ اس نے جواب دیا کہ "یہاں دو قیدی ہیں' یہ کھانا ان کے لیے ہے"۔ ولید پیچھے ہو لیے۔ وہی دونوں تھے اور ایک بے چھت کے مکان میں بند تھے۔ شام ہو گئی تو یہ دیوار پھاند کر اترے۔ ان کی بیڑیوں کے نیچے پتھر رکھ کر اپنی تلوار سے ان کو کاٹ ڈالا۔ پھر باہر نکال کر دونوں کو اونٹ پر بٹھایا اور راہ فرار اختیار کی۔

اسی طرح اکثر لوگ خود اگر نکلے بھی تو مکہ والوں نے ان سے ان کے اموال رکھوا لیے جیسے بھارت سے جانیں بچا کر نکلنے والے بہت سے مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔

لیکن ہجرت کے اس درجہ جگر آزما ہونے کے باوجود مردہی نہیں' خواتین بھی برابر جادہ فرض پر اقدام کر رہی تھیں۔ تحریک اسلامی کا یہ اعجاز اپنی مثال نہیں رکھتا کہ آج سے صدیوں پہلے کے وحشی عرب کی ان پڑھ خواتین تک میں اس زندگی بخش طاقت نے ایک زوردار حرکت عمل پیدا کر دی۔

مہاجرین کے راستے میں رکاوٹیں ڈال کر قریش اپنی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے' مگر دوسری طرف جس شخصیت سے سابقہ تھا' وہ عالی حوصلگی کی اونچی چوٹی پر کھڑی تھی۔ وہاں سمندر کا سا وسیع ظرف تھا۔ وہ پیکر صبر و استقلال ٹھنڈی عزیمت اور ٹھہراؤ والی فطرت سے آراستہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مرکز دعوت پر ڈٹا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۸۷

رہا۔ اسے آخری حد تک اتمام حجت کا فریضہ ادا کرنا تھا۔ وہ اہل مکہ کے خلاف مشیت الٰہی کے کھیل کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنا فرض صبر و تحمل سے ادا کر رہا تھا۔ اس کی مثال ڈوبتے جہاز کے بہادر کپتان کی سی تھی کہ جو سارے عملے اور سارے مسافروں کو سلامتی کی کشتی پر سوار کرنے کے بعد سب سے آخر میں جہاز کو چھوڑنے والا تھا۔

جب بجز ایسے چند افراد کے کوئی باقی نہ رہا' جنہیں قریش کے جبر نے محصور کر رکھا تھا یا جن کو کسی مفاد یا مصلحت نے باندھ رکھا تھا تو اس وقت آپؐ کو آسمانی حکومت کی طرف سے پروانہ ہجرت ملا۔ آپؐ نکلے تو ایسے عالم میں نکلے جب کہ مکہ والے آپؐ کو زندہ دیکھنے کے روادار نہ تھے اور جب نکلنے کی گھڑی آگئی تو خون کی پیاسی تلواروں کے گھیرے میں سے آپؐ بے خوفی کی شان سے نکل گئے۔

مدینہ ------- ہمہ تن انتظار:

مہاجرین کی تعداد جوں جوں بڑھ رہی تھی مدینہ میں زندگی کی رو زور پکڑ رہی تھی۔ دعوت حق کا اجالا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اور جتنا جتنا اسلام دلوں کی دنیاؤں کو فتح کرتا جاتا تھا۔ اسلام کا پیغام لانے والے محسن کی محبت بڑھتی جاتی تھی۔ خصوصاً بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد سے مدینہ کی چشم انتظار ہر دم مکہ سے آنے والے راستہ پر لگی رہنے لگی۔ ایک فصل لہلہا رہی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ ابر کرم آئے اور برس جائے۔ ایک چمن لالہ و گل آراستہ تھا اور امیدوار تھا کہ باد بہاری کے جھونکے آئیں اور رنگ و بو کے طوفان اہل پڑیں۔ مسالہ جمع پڑا تھا اور ہمہ تن آرزو تھا کہ معمار انسانیت آئے اور تعمیر نو بپا کر دے۔

ہوا کی لہریں یہ اطلاع بھی کسی نہ کسی طرح لے آئیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکل چکے ہیں اور جادہ ہجرت کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ اس خبر پر مدینہ میں اشتیاق کے جذبات اضطراب کی حد کو پہنچ گئے ہوں گے۔ انتظار کی بےچینیاں زور پکڑ گئی ہوں گی۔ سوچو کہ ہر طرف کیا چرچے ہوں گے؟ کیا استفسارات ہوا کرتے ہوں گے؟ کیسی گفتگوئیں محفلوں کی رونق رہتی ہوں گی؟ جذبات و احساسات کا کیا عالم ہو گا۔ مشرکین کا' یہود کا' انصار کا' مسلمانوں کا۔

چھوٹے چھوٹے بچوں کی زبانوں پر یہی بات رہنے لگی کہ رسولؐ آرہے ہیں' رسولؐ آرہے ہیں۔ لوگ ہر صبح گھروں سے نکلتے اور شہر سے باہر جمع ہو کر انتظار کرتے۔ جب گرما کا سورج اونچا ہو جاتا اور دھوپ قابلِ برداشت نہ رہتی تو حسرت زدہ ہو کر لوٹ جاتے۔ یوم قدومت کو بھی لوگ اسی طرح جمع ہو کر لوٹ رہے تھے کہ ایک یہودی نے قلعے پر سے دیکھا اور مژدہ سنایا۔ کہ "اہل یثرب! لو' تمہیں جس بزرگ کا انتظار تھا وہ آپہنچے"۔ تمام شہر تکبیر کے غلغلے سے گونج اٹھا۔ لوگ بے تابانہ وار دوڑے۔ اکثر انصار خوب ہتھیار لگا لگا کر نکلے۔

اولین قیام مقام قبا میں ہوا جو مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک مضافاتی آبادی تھی۔ عمرو بن عوف

کے خاندان نے نعرہ ہائے مسرت کے ساتھ استقبال کیا اور اسی خاندان کو شرف میزبانی حاصل ہوا۔ یہ گھر دراصل تحریک اسلامی کا ایک مرکزی اڈہ (CENTRE) تھا۔ مہاجرین میں اکثر کے لیے منزل اول یہی گھر بنا اور بعض مہاجر صحابی اس وقت بھی یہیں مقیم تھے۔ حضرت علیؓ بھی امانتوں کی ادائی کے بعد روانہ ہو کر یہیں کاروان محبوب کے ساتھ آملے۔ یہاں چودہ روز قیام رہا۔ اور مہاجرین جوق در جوق شرف ملاقات کو آرہے تھے۔ لوگ اس ہستی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کا پیغام ان کے سینوں میں گھر کر چکا تھا۔ اس کے چہرے کی ایک جھلک نگاہوں کے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے تھے' اس کے منہ سے میٹھے بول سننا چاہتے تھے' اس کی دعائے خیر سے حصہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ غائبانہ عقیدت اب محسن انسانیتؐ کو رُو در رو دیکھنا چاہتی تھی۔ سلام' ملاقاتیں' گفتگوئیں' دعائیں' مجلسیں' کیا کچھ نہ ہو گا۔

قبا میں آپؐ نے اپنے ہاتھوں سے ایک مسجد کی بنا رکھی۔ ایک ایک مسلمان اس تعمیر کی مہم میں شریک تھا اور خود دنیا کا سب سے بڑا تاریخ ساز ایک معمولی مزدور کی طرح بھاری بھر کم پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا۔ کام ہو رہا تھا اور ساتھ کے ساتھ گیت گایا جا رہا تھا۔

افلح من یعالج المساجدا   ویقرء القرآن قائما و قاعدا

ولا یبیت اللیل عنه راقدا

یعنی کامیاب وہ ہے جو مسجدیں تعمیر کرے۔ اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھے اور راتوں کو (عبادت کے لیے) جاگے۔ یہ مسجد محض اینٹ پتھر اور گارے اور پھونس کا مجموعہ نہ تھی۔ اس میں خاتم النبیینؐ سے لے کر ایک عامی مسلمان تک ہر ایک نے بہترین جذبات صرف کیے تھے۔ اسی لیے اس کی شان میں قرآن نے کہا۔ "لمسجد اسس علی التقوی"۔ یہ ایسی مسجد ہے کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر استوار کی گئی ہے۔

قبا میں ورود ۸ ربیع الاول ۱ھ (نبوی) بروز جمعرات ہوا تھا[1] چودہ روز بعد انسان اعظمؐ نے رفقاء سمیت مدینہ کا رخ کیا۔ قبا سے مدینہ تک دو رویہ انصار خیر مقدم کے لیے صفیں باندھے کھڑے تھے۔ آپؐ کے ننھیالی رشتہ داروں نے خاص اشتیاق سے ہتھیار لگائے۔ عورتیں چھتوں پر جمع تھیں اور ترانہ خیر مقدم گا رہی تھیں۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا مادعی لله داع

اور چھوٹی بچیوں کے غول گھوم رہے تھے' یہ لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی پھرتی تھیں۔

نحن جوار من بنی نجار   یا حبذا محمدا من جار

ان بچیوں کی پاکیزہ محبت کا جواب سرور عالمؐ نے بھی خاص شفقت سے دیا۔ ان سے باتیں کیں۔ پوچھا۔

---

[1] قبا پہنچنے کی تاریخوں میں خاصا اختلاف ہے۔ تفصیل سیرت سرور عالمؐ ج ۲' ص ۷۔۳۶ پر دیکھیں۔

کہ "کیا تم مجھے چاہتی ہو؟" انہوں نے کہا "جی ہاں"! آپؐ نے فرمایا کہ "میں بھی تم کو چاہتا ہوں۔" [1]

ذرا تصور میں لایئے اس تاریخی گھڑی کو جو مدینے کے نصیب میں آئی تھی۔ گلیوں کی خاک کے ذرے ذرے میں دل دھڑک رہے ہوں گے۔ دیواروں کے درزوں کو آنکھیں مل گئی ہوں گی۔ ہوا کے جھونکوں میں انسانی احساسات پیدا ہو گئے ہوں گے۔

عارضی قیام کے لیے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر کی قسمت جاگی۔ سات ماہ نبی اکرمؐ کا قیام یہیں رہا۔

تعمیری اقدامات:

جونہی ذرا سکون ہوا اور مسافرت کی کیفیت ختم ہوئی تو سرور عالم تعمیری اقدامات کی طرف متوجہ ہوئے۔ اولین مہم مسجد کی تعمیر کی تھی۔ دو یتیم بچوں کی افتادہ زمین خریدی گئی اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ ہی نے قیمت ادا کی۔ اس زمین پر مسجد نبویؐ کی تاسیس ہوئی۔ مسجد کی اہمیت صرف بطور معبد ہی کے نہ تھی۔ بلکہ اسے اسلامی نظام تمدن و ریاست کا سرچشمہ و مرکز بننا تھا۔ وہ حکومت کا دربار، مشورے کا ایوان، سرکاری مہمان خانہ، جمہوری دارالعلوم اور قومی لیکچرہال کی حیثیت سے برپا کی گئی۔ اس اولین تعمیری اقدام پر وہی قبا والا نقشہ پیش آیا۔ کون مسلمان ہو گا جس نے اس میں دل و جان سے حصہ نہ لیا ہو گا۔ خود سرور عالم پتھر اور گارا اٹھا اٹھا کر لاتے۔ اس منظر کو دیکھ کر ایک مسلمان مارے جذبات کے پکار اٹھا کہ:-

لئن قعدنا و النبی یعمل　　لذاک منا العمل المضلل

یعنی اگر خدا کا نبیؐ اس کام میں یوں لگ جائے اور ہم بیٹھے دیکھتے رہیں تو ہمارا کیا کرایا غارت ہوا۔

کام کی گرماگرمی میں کوئی بیہودہ گوئی نہ تھی۔ بلکہ آنحضورؐ سمیت سب کے سب یہ صدا بلند کر رہے تھے۔

لا عیش الا عیش الاخرۃ　　اللھم ارحم الانصار و المھاجرہ

یعنی آخرت کی ابدی زندگی ہی زندگی ہے۔ اور وہ نہ ہو تو پھر زندگی ہیچ ہے۔ اے اللہ! تو انصار اور مہاجرین پر رحم فرما۔ [2]

یہ تھی اسپرٹ اور یہ تھیں دعائیں جو مسجد نبویؐ کی تعمیر کا اصل مسالہ بنیں۔ مسجد کے ساتھ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ و سلم کے لیے گارے اور پھونس کے حجرے (کوارٹرز) تعمیر ہو گئے۔ آپؐ اپنے انہی کوارٹرز میں منتقل ہو گئے۔

---

1 سیرت النبیؐ جلد ۱ صفحہ ۲۵۵ تا ۲۵۹

2 سیرت ابن ہشام جلد ۲ ۱۱۴، ۱۱۵

مدینہ میں حضرت رسالت مآبؐ کی تشریف آوری سے از خود دعوت کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ اور اس سات ماہ کے عرصے میں تحریک حق نے قبیلے قبیلے اور گھر گھر سے جان نثار حاصل کر لیے۔ صرف خطمہ' واقف' وائل اور امیہ کے گھرانوں میں شرک کی تاریکی باقی رہ گئی۔ اور ان سب کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ ❶

تعمیری مہم کے سلسلے میں کار دعوت کا آگے بڑھانا درجہ اول کی اہمیت رکھتا تھا۔ انفرادی دعوت کے علاوہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی طور سے کام کا آغاز جس خطاب عام سے کیا وہ ان الفاظ پر مشتمل تھا۔

(حمد و ثنا کے بعد) ۔۔۔۔۔ "لوگو! اپنی جانوں کے لیے وقت پر کچھ کمائی کر لو' خوب جان لو' خدا کی قسم تم میں سے ہر ایک پر موت وارد ہو گی۔ اور وہ اپنے گلّے کو اس حال میں چھوڑ کر رخصت ہو گا کہ کوئی اس کا چرواہا نہ رہے گا۔ پھر اسے اس کے پروردگار کی طرف سے ایسے عالم میں خطاب کیا جائے گا جب کہ بیچ میں کوئی ترجمان نہ ہو گا۔ کہا جائے گا کہ کیا تجھ تک میرا رسول نہیں پہنچا تھا' جس نے بات تجھ تک پہنچائی ہو۔ پھر کیا میں نے تجھے مال نہیں دیا تھا' اور تجھ پر نوازش نہیں کی تھی؟ تو پھر اپنی جان کے لیے تو نے کیا اندوختہ کیا؟ پس وہ دیکھے گا دائیں بائیں' لیکن کچھ نہ دکھائی دے گا۔ پھر سامنے کی طرف نگاہ ڈالے گا۔ مگر بجز جہنم کے اور کچھ سامنے نہ آئے گا۔ سو جس کو بھی توفیق ہو کہ وہ کھجور کی ایک پھانک کے عوض بھی اپنے چہرے کو دوزخ کی آگ سے بچانے کے لیے کچھ کر سکتا ہو تو کرے۔ جو اتنا بھی نہ کر سکے وہ کوئی بھلی بات کہہ کر ہی بچاؤ کرے۔ کیونکہ نیکی کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ملتا ہے اور تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں وارد ہوں"۔ ❷

دوسرا خطاب عام جو آپؐ نے فرمایا' یہ تھا:

"ساری تعریف اللہ کے لیے ہے۔ میں اسی کی حمد کرتا ہوں۔ اسی سے مدد چاہتا ہوں! ہم سب اپنے دلوں کی شرارتوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں کے مقابلے میں اللہ ہی کی پناہ طلب کرتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ ہدایت سے محروم کر دے اس کے لیے کوئی رہنما نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا' کہ جو ایک ہے اور جس کے ساتھ کوئی دوسرا حصہ دار نہیں' کوئی اور قابل عبادت و طاعت ہستی نہیں۔ بلا شبہ بہترین بیان اللہ تبارک و تعالیٰ کی کتاب ہے' جس شخص کے دل کے لیے اللہ نے اس کو محبوب

---

❶ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۱۸

❷ ایضاً

بنا دیا اور جسے کفر کے بعد اسلام میں داخل کیا۔ اور جس نے اور سارے انسانی بیانوں کے مقابلے میں اسے اپنے لیے پسند کر لیا' اس نے فلاح پائی۔ یہ بہترین بیان ہے اور سب سے زیادہ موثر۔ تم وہی کچھ پسند کرو جو اللہ کو پسند ہے اور اللہ سے اخلاص کے ساتھ محبت کرو۔ اللہ کے کام سے تغافل نہ برتو اور تمہارے دل اس کے لیے سخت نہ ہونے پائیں۔ چونکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ جو کچھ پیدا کرتا ہے اس میں سے بہتر کو چھانٹتا اور منتخب کرتا ہے' سو اس نے اعمال میں سے بہترین اور بندوں میں سے برگزیدہ ترین اور بیانوں میں سے پاکیزہ ترین کو متعین فرما دیا ہے۔ نیز انسانوں کو جو کچھ دیا گیا ہے اس سب میں سے کچھ حلال ہے' کچھ حرام۔ پس اللہ کی غلامی اختیار کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دو۔ اس کے غضب سے اس طرح بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے۔ اور اللہ کے حضورؐ میں وہ سارے پاکیزہ اقوال سچ کر دکھاؤ جن کو تم اپنی زبانوں سے ادا کرتے ہو۔ اور اللہ کی رحمت کے ذریعے ایک دوسرے سے محبت کا رشتہ استوار کرو۔ یقیناً اللہ ناراض ہوتا ہے اگر اس کے ساتھ باندھے ہوئے (ایمان کے) عہد کو توڑا جائے۔ اور تم پر سلامتی ہو"۔ [1]

تقریر کے الفاظ جو روایات سے ملتے ہیں بہت مختصر ہیں اور آنحضورؐ کے خطاب بالعموم مختصر ہوتے تھے۔ لیکن مطالب کی جامعیت دیکھئے کہ وقت کے تمام اہم مسائل ان الفاظ میں بول رہے ہیں۔ تقریر میں اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ قرآن کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ حلال و حرام کی تمیز پیدا کرنے کا درس دیا گیا ہے۔ اور اصولی و مقصدی جذبہ اخوت و رفاقت پیدا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

ان دو تقریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اجتماعی دعوت کی نئی لہر کس انداز سے اٹھائی گئی تھی۔ ایک طرف بنیادی نظریہ کا پیغام دیا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف اسی نظریہ کی اسپرٹ کے ذریعے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے سوسائٹی کو رہنمائی دی جا رہی تھی۔

اسلامی ریاست کی تاسیس:

تیسرا تعمیری اقدام ـــــ اور شاید سیاسی لحاظ سے سب سے بڑا تعمیری اقدام ـــــ یہ تھا کہ ریاست چلانے کے لیے مدینہ کے یہود و مشرکین اور مسلمانوں کی سوسائٹی کو ایک نظم میں پرو دیا گیا۔ سیاسی نوعیت کی تنظیم معاشرہ کے لیے ایک تحریری معاہدہ استوار کیا گیا جس کی نوعیت درحقیقت ایک باقاعدہ تحریری دستور کی ہے۔ اس کو بجا طور پر دنیا کا پہلا تحریری دستور کہا جاتا ہے۔ ہم یہاں اس دستور کی دفعات پر بحث نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ اس کے چند اہم پہلوؤں کا خلاصہ بیان کر دیتے ہیں۔ اس دستوری معاہدے کے

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۱۹' ۱۱۸

ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے جو کچھ حاصل کیا۔ وہ یہ تھا:

----- مدینہ کے منظم ہونے والے معاشرے میں خدا کی حاکیت اور اس کے قانون کو اساسی اہمیت حاصل ہو گئی۔

----- سیاسی' قانونی اور عدالتی لحاظ سے آخری اختیار (Authority) محمد صلی اللہ علیہ و سلم کے ہاتھ آگیا۔

------ دفاعی لحاظ سے مدینہ اور اس کے نواح کی پوری آبادی ایک متحدہ طاقت بن گئی اور اس کے کسی عنصر کے لیے قریش کی حمایت کے دروازے بند ہو گئے۔ نیز دفاعی لحاظ سے بھی مرکزی اور فیصلہ کن اختیار آنحضور صلی اللہ علیہ و سلم کے پاس آگیا۔

اس دستوری معاہدہ سے باضابطہ طور پر اسلامی ریاست اور اسلامی نظام حیات کی تاسیس واقع ہو گئی۔ [1]

اس زمانے کے حالات کی پیچیدگیوں کو سامنے رکھیں تو پھر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کارنامہ کتنے بڑے پیمانے کا کارنامہ تھا۔ اور اس کے پس منظر میں ایک لا مثال سیاسی بصیرت اور گفت و شنید کی مہارت کام کرتی ملتی ہے۔ یہ دستوری دستاویز بھی اور دوسرے معاہدات و معاملات اور جنگی منصوبے بھی ہمیں آگاہ کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ صرف ایک صوفی و درویش نہ تھے بلکہ اجتماعی معاملات کو سنبھالنے اور سنوارنے کے لیے ماہرانہ حکمت سے آراستہ تھے۔ اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی پوری پوری صلاحیتیں رکھتے تھے۔

نظام مواخات:

مدینہ کے معاشرہ کا ایک بڑا مسئلہ سینکڑوں مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ تھا۔ گھر بار چھوڑ چھاڑ کر مسلسل لوگ اکھڑے چلے آرہے تھے اور چند ہزار کی آبادی رکھنے والی متوسط سی بستی کو انہیں اپنے اندر جذب کرنا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے کو جو تاریخ میں جب بھی پیدا ہوتا ہے' پریشان کن بن جایا کرتا ہے' مدینہ کے معاشرے اور اس کے صدر ریاست نے جس کمال حکمت سے حل کیا اس کی کوئی دوسری مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ کوئی آرڈی نینس جاری نہیں کیے گئے۔ کوئی قانون نہیں ٹھونسے گئے۔ الاٹ منٹیں نہیں کی گئیں۔ مہاجرین کی تعداد معین کر کے کوئی قدغن نہیں لگائی گئی۔ کسی جبر سے کام نہیں لیا گیا۔ محض ایک

---

[1] جو طاقت کوئی نصب العین لے کر اٹھتی ہے وہ ہمیشہ سب سے پہلے اس کی فکر کرتی ہے۔ عرب کی جماعت اسلامیہ کی بے سروسامانی کو دیکھیے۔ اور مدینہ کے اجنبی ماحول میں آکر چند اجڑے پچڑے افراد کا عالم ابتلا دیکھیے اور پھر ملاحظہ فرمائیے کہ کیسے اولین اسلامی ریاست کی فوراً تاسیس کی جاتی ہے۔ اور کیسے چند مہینوں میں دستور بن کر نافذ ہو جاتا ہے۔ نسلی اور مذہبی لحاظ سے گوناگوں متضاد عناصر کو اتنا جلد ایک دستور پر متحد کر دکھانا تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔

اخلاقی اپیل کے ذریعے اس پر پیچ مسئلے کو چند روز میں حل کر لیا گیا۔ سرور عالمؐ نے عقیدے اور نظریے اور مقصد کی صحیح معنوں میں ایک نئی برادری پیدا کر دکھائی اور ایک ایک انصاری کے ساتھ ایک ایک مہاجر کا برادرانہ رشتہ قائم کر دیا۔ انصار کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے مال' مساکن' باغات اور کھیت آدھوں آدھ بانٹ کر رفقاء مقصد کو دے رہے تھے بلکہ بعض تو یہاں تک تیار ہو گئے کہ دو دو بیویوں میں سے ایک ایک کو طلاق دے کر اپنے دینی بھائیوں کے نکاح میں دے دیں۔ دوسری طرف مہاجرین کی خودداری کا نقشہ یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمیں کھیت یا بازار کا راستہ دکھا دو' ہم تجارت یا مزدوری کر کے پیٹ پال لیں گے۔

مورخین نے ان بزرگوں کے نام بھی درج کئے ہیں جن میں یہ سلسلہ مواخات مستحکم کیا گیا تھا ہم تبرکاً چند اسماء مبارک درج کرتے ہیں۔

ا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم + علی مرتضیٰؓ

ب۔ ابوبکر الصدیقؓ + خارجہؓ بن زید عقبی بدری
عمر فاروقؓ + عتبانؓ بن مالکؓ بدری
عثمانؓ ذوالنورین + اوس بن ثابت عقبی بدری
جعفرؓ بن ابی طالب ہاشمی + معاذؓ بن جبل عقبی بدری
ابو عبیدہ بن جراح قرشی الفہری + سعدؓ بن معاذ بدری اہتزلہ عرش الرحمٰن
عبدالرحمٰنؓ بن عوف قرشی الزھری + سعدؓ بن ربیع عقبی بدری
زبیرؓ بن العوام قرشی الاسدی + کعبؓ بن مالک عقبی
طلحہؓ بن عبداللہ قرشی التیمی + ابیؓ بن کعب عقبی بدری
سعد بن زید قرشی العدوی + ابی بن کعب عقبی بدری
مصعبؓ بن عمیر قرشی العبدری + ابو ایوبؓ عقبی بدری
ابو حذیفہؓ بن عتبہ + عبادؓ بن بشیر
عمارؓ بن یاسرؓ + حذیفہؓ بن الیمان

ج۔ سلمانؓ فارسی + ابوالدرداءؓ حکیم الامت
منذرؓ بن عمر + ابو ذرؓ غفاری۔ (1)

مجرد' بالخصوص نوعمر مہاجرین جو اپنے آپ کو تعلیم کیلئے وقف کرنا چاہتے تھے ان کی اقامت گاہ "صفہ" (مسجد نبویؐ کا ایک چبوترہ) تھی۔ تعمیری کام کے سلسلے میں یہ ایک اہم ادارہ تھا۔ اصحاب صفہ کی کفالت سوسائٹی کرتی تھی۔ اور آنحضور ﷺ خود ان کی ضروریات کی تکمیل میں سرگرم رہتے۔

---

(1) رحمۃ للعالمین از قاضی سلیمان منصور پوری ج ۱ ص ۲۴۳۔

پھر وہی کشمکش:

یہاں تاریخ و سیرت کے پورے سلسلہ واقعات کو پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ مجملاً ہم نے یہ دکھانا چاہا ہے کہ تحریک اسلامی کی پود مکہ سے آکر مدینہ میں کس طرح نصب ہوتی ہے اور کس طرح نئی کونپلیں نکالنے لگتی ہے۔ ماحول کیا تھا اور اب ایک نئی موثر طاقت کے آجانے سے اس میں کس نہج پر نئی حرکات شروع ہو رہی تھیں۔ سوئے ہوئے معاشرے کو جرس حق نے آکر جگا دیا تھا۔ عمل کا ایک اسٹیج تیار ہو گیا تھا اور اس پر ایک مثبت اور تعمیری طاقت اپنا کردار پیش کر رہی تھی۔ مثبت کردار کے سامنے آتے ہی تاریخی قانون کا یہ تقاضا تھا کہ کوئی نہ کوئی منفی کردار بھی نمودار ہو۔ تعمیری مہم کے مقابل میں مشیت کا ضابطہ لازماً ایک تخریبی طاقت کو حرکت میں لانا چاہتا تھا۔ حق اگر میدان میں آگیا ہو تو پھر ناگزیر تھا کہ باطل کے محاذ پر بھی گرما گرمی پیدا ہو جائے۔ عاشق جانباز اگر کوچہ جاناں کی طرف اقدام کرے تو پھر رقیب رو سیاہ کی ضرورت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مدینہ میں جس نئے معاشرہ کی اٹھان ہو رہی تھی اسے دیکھ دیکھ کر شیطان بری طرح تلملا رہا تھا۔ وہ اپنے کچھ فداکار اور جاں نثار میدان میں لانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسے آلہ کار مل گئے۔ اور وہ ان کو اٹھا کر سٹیج پر لے آیا۔ تحریک کو پہلے سابقہ ابراہیم علیہ السلام کے نام لیواؤں سے تھا' اب اس کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کے جانشین جبہ ہائے تقدس پہنے اور کتاب اللہ بغل میں لیے خراماں خراماں بڑھتے دکھائی دیے۔ تحریک اسلامی کے ڈرامے میں پہلے جو پارٹ متولیان کعبہ نے ادا کیا تھا اب مدینہ میں وہی پارٹ فرزندان بیت المقدس نے اپنے ذمے لیا۔

یہود کا تاریخی مقام اور پارٹ:

تاریخ اسلام و جاہلیت کی یہ عجیب ٹریجیڈی ہے کہ دین حق کی مزاحمت کرنے کی خدمت سب سے بڑھ کر جوش ایمانی کے ساتھ ہمیشہ اہل مذہب ہی نے سرانجام دی ہے۔ اہل مذہب جن کو دین حق کی دعوت کی پہلی آواز سنتے ہی اولین صفوں میں جا کھڑا ہونا چاہیے وہی ہمیشہ "اول کافر بہ" بنتے رہے ہیں (الا ماشاء اللہ) اہل مذہب ابتداء میں مذہب کے خادم اور علمبردار ہوتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ جب ان کا ایک مرتبہ پیدا ہو جاتا ہے' اور ان کے کچھ مفاد مذہب سے وابستہ ہو جاتے ہیں تو پھر وہ مذہب کو اپنا تابعدار بنا لیتے ہیں' وہ آہستہ آہستہ مذہب کے نام پر اپنے کچھ مستقل حقوق پیدا کر لیتے ہیں' پیروان مذہب سے وہ کچھ اپنے طبقاتی مطالبات منوا لیتے ہیں اور کچھ اعزازات ان کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ مذہب اپنے پیرووں کے دور زوال میں ہمیشہ انہی مراحل سے دو چار ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر مذہب ایک اچھے نفع بخش کاروبار کی سطح پر آ جاتا ہے اور وہ ایک موروثی جاگیر بنتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وعظ مال تجارت بن جاتے ہیں۔ علم ذریعہ معاش ٹھہرتا ہے۔ فتوے متاع بازار بن کر اپنا ایک مارکیٹ ریٹ پیدا کر لیتے ہیں۔ دینی مناصب' روحانی قیادت و اقتدار کا زینہ قرار پاتے ہیں۔ اس مقام پر جب ایک بار اہل مذہب آ پہنچتے ہیں تو پھر ان کا کاروباری

ذہن ہر معاملے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہمارا مفادِ محفوظ رہتا ہے یا نہیں' اور ہمارا منصب اور ہماری پوزیشن کسی اور طرف تو منتقل نہیں ہوئی جاتی۔ کاروباری ذہن جب ان اوصاف کے ساتھ دائرہ مذہب میں آگھستا ہے تو اہل مذہب کسی کی طرف سے اختلاف کو گوارا نہیں کر سکتے اور نہ کسی بڑے مقصد کے لیے دوسروں کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔

اپنے اندر کسی کمزوری یا غلطی کو ماننے اور اس کی اصلاح کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

قیادت و اثر کی کرسی چھوڑ کر کسی دوسرے کی دعوت پر ادائے فرض نہیں کر سکتے۔

ٹھیک یہی مقام تھا جس کی آخری سرحد پر یہود آپہنچے تھے۔ وہ یہ ہرگز نہیں مان سکتے تھے کہ حق ان کے گروہی دائرہ کے باہر بھی پایا جا سکتا ہے۔ وہ نہیں مان سکتے تھے کہ ان کے پیچھے لگ کر چلے بغیر بھی کوئی راہ یاب ہو سکتا ہے' وہ نہیں مان سکتے تھے کہ رہنمائی کا منصب کسی دوسرے کو بھی مل سکتا ہے۔

مخالفت قریش مکہ نے بھی کی اور مخالفت یہود نے بھی کی۔ اور دونوں میں سے کسی نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی' مگر دونوں کے مخالفانہ پارٹ میں بڑا بھاری فرق ہے۔ جب ہم تجزیہ و موازنہ کر کے دیکھتے ہیں تو اولین حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ قریش مکہ کی مخالفت میں اصل کار فرما روح جذبہ استکبار کی تھی۔ لیکن یہود پر حسد کا جذبہ چھایا ہوا تھا۔ وہاں احساس برتری کی بیماری تھی اور یہاں احساس کمتری کا روگ تھا۔ اسی لیے وہاں کھلا کھلا انکار اور تصادم تھا اور یہاں مکاری اور عیاری کا مزاج مخالفانہ سرگرمیوں میں نمایاں تھا۔ وہاں بہادرانہ جسارت تھی اور یہاں بزدلانہ شرارت' وہاں مخالفت سیدھی تشدد کے رخ پر ارتقاء کرتی رہی تھی۔ لیکن یہاں وہ نجوئی اور سازش اور نفاق کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ مکہ میں صرف مسلم اور کافر دو گروہ تھے لیکن مدینہ میں مسلم اور کافر طاقتوں کے بیچ میں ایک تیسرا کردار نفاق کا بھی نمودار ہو گیا۔ اس مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جامد مذہبیت اور فاسد دین داری کھلے کھلے کفر و شرک اور صریح جاہلیت سے زیادہ پست فطرت رکھتی ہے اور مخالفت حق میں زیادہ گھٹیا کردار پیش کرتی ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس رزم کفر و دین میں یہود کی جامد مذہبیت اور فاسد دینداری نے اسلام کے مقابلے پر کفر و شرک کی طاقت کے پلڑے میں اپنا پورا پورا وزن تعاون ڈال دیا۔ حالانکہ بڑے سے بڑے اختلاف کے باوجود اسے خدا پرستانہ و اخلاق پسندانہ مسلک کے علمبرداروں کے ساتھ زیادہ ہمدردیاں ہونی چاہئیں تھیں۔ زیادہ سے زیادہ گنجائش اس بات کی ہو سکتی تھی کہ یہود مخالفت اسلام میں اپنی پوزیشن کفار و مشرکین سے بالکل الگ ممیز رکھتے۔ لیکن "تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم"[1] کی دردمندانہ پکار سننے کے باوجود انہوں نے انسان اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں کے پاکیزہ دینی افکار و اعمال کو چھوڑ کر ابوجہل اور ابولہب جیسے گھٹیا انسانوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اور جامد مذہبیت اور فاسد دین داری

---

[1] (آل عمران: ۶۴)

کا یہ بھی ہمیشہ تاریخی رول رہا ہے کہ وہ معرکہ کارزار میں دینی محاذ پر کسی قیمت کے عوض بھی اپنا تعاون پیش نہیں کر سکتی۔ بلکہ لازماً وہ دین کی دشمن طاقتوں کی گود میں جا گرتی ہے۔ اس کا قارورہ ہمیشہ کفر و الحاد اور فسق و فجور کے پیکروں سے ملتا ہے۔ یہاں گفتگو چند مستثنیٰ افراد پر نہیں ہو رہی جو کسی گروہ کے اندر سے بدترین دور فساد میں بھی برآمد ہوتے ہیں۔ ہم عمومی کلیہ اخذ کر رہے ہیں۔

یہ تھا موقف جو یہود نے لیا۔ وہ اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور علم و تقویٰ کے سارے ہتھیار سنبھال کر تخریب پسندانہ منفیت کے مورچوں پر جا ڈٹے اور انہوں نے عملاً کفار و مشرکین کو اپنا پورا تعاون پیش کر دیا۔ انہوں نے داعی حق اور تحریک اسلامی اور اس کے کارکنوں کے خلاف پھبتیاں کسیں' مذاق اڑائے' نت نئے سوالات اور اعتراضات گھڑ گھڑ کر کٹ حجتیاں کیں' الزامات لگائے' پروپیگنڈے کے طوفان اٹھائے' مخبریاں اور جاسوسیاں کیں۔ مسلمانوں کو باہم دگر لڑانے کے منصوبے تیار کئے۔ تکفیر و تفسیق کے فتوے لگائے۔ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی تدبیریں کیں۔ اور جنگ اور ایمرجنسی کے حالات میں سخت قسم کی غداریاں کیں۔ اپنی طرف سے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا۔ لیکن شروع سے آخر تک یہ ایک بڑے مغالطے میں رہے۔ اور منفی مزاج کی تخریبی مہموں کو اٹھانے والی طاقتیں ہمیشہ اس مغالطے میں رہتی ہیں (لیکن بعد والوں کو اس سے سبق لینے کی بھی توفیق نہیں ہوتی) ---- کہ کسی اصولی اور تعمیری تحریک کا توڑ ایسے لوگ کامیابی سے کر سکتے ہیں جو خود بے اصول ہوں' کوئی تعمیری نقشہ نہ رکھتے ہوں اور جو اخلاقی پستی کی آخری گہرائیوں میں جا گرے ہوں۔ درحقیقت ایسے لوگوں کا پارٹ بالکل اسی نوعیت کا ہوتا ہے۔ جیسے چڑھتے سورج کی شعاع افگنی سے چڑ کر چمگادڑ فضا میں اپنے پر پھیلا کر زمانے کو تاریک رکھنے کے درپے ہوں۔ جیسے شہسواروں کے کسی دستے کا راستہ روکنے کے لیے چند مچھر اور چند مکھیاں اپنی بھنبھناہٹ کا پورا زور شور دکھا دیں۔ جیسے چودھویں کے چاند کو دیکھ کر کوئی گنوار اس کی طرف منہ اٹھا کر تھوک دے۔

جن لوگوں میں خود اپنی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہی ہو' جن کے پاس کوئی جاندار پیغام موجود نہ ہو' جن کا اخلاق و کردار زمانے کے لیے کوئی جاذبیت نہ رکھتا ہو' اور جن سے کسی تعمیری خدمت کی توقع انسانیت کو نہ رہی ہو' وہ محض دوسروں کا راستہ روک کر اور ان کا منہ چڑا کر اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکتے۔ جن کے پاس جمود' فساد' بگاڑ اور تخریب کے سوا اور کوئی متاع حیات باقی نہ رہی ہو۔ وہ اصلاحی و تعمیری کام کرنے والی کسی متحرک طاقت کے منہ آ کر اپنے اندر قدر و قیمت پیدا نہیں کر سکتے۔ انجام کار ایسوں کے حصے میں ذلت و نامرادی کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ مگر جب جذباتی ردعمل کی رو میں بہہ کر کوئی فاسد طاقت اندھی ہو جاتی ہے تو پھر وہ انجام کو نہیں سوچتی۔ بس آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ یہود کی فاسد طاقت بھی احساس کمتری اور حسد کے مارے اندھی ہو کر اسلام سے الجھنے لگی۔

یہود کا کردار مسلمانوں کے کردار کے بالمقابل رکھ کر دیکھنے سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ سچائی

کے کسی علمبردار کی صدا پر لبیک کہنے والوں کا اخلاق جتنا بلند ہوتا جاتا ہے۔ اس کی مخالفت کرنے والوں کی سیرتوں میں اتنا ہی زوال پیدا ہوتا جاتا ہے' مثبت تحریک اپنے دائرہ میں انسانیت کو جتنا زیادہ سنوارتی ہے' منفی رد عمل اپنے حلقہ میں اتنا ہی زیادہ فساد اور بگاڑ پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرہ کے سربراہ کار کے سامنے ایک طرف بڑا وسیع اور متعدد پہلو رکھنے والا تعمیری منصوبہ تھا۔ دوسری طرف مسلسل آنے والے مہاجرین کی بحالی اور ان کو معاشی سہارا بہم پہنچانے کا پرابلم تھا۔ تیسری طرف قریش مکہ کی طرف سے ہر لحظہ حملے کا امکان تھا۔ اور اس کے لیے دفاعی استحکام کی ضرورت تھی۔ اور ان ساری مشکلوں میں اضافہ کرنے والی بڑی مشکل یہ تھی کہ مدینہ کی نوخیز ریاست اور زیر تشکیل معاشرے کے اپنے دائرے میں غداروں اور سازشیوں کی ایک بڑی بھاری تعداد فتنہ انگیزیاں کر رہی تھی۔ غور کرو کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریاں کتنی نازک اور پیچیدہ ہو گئی ہوں گی۔ خیال میں لاؤ کہ ایک جان کتنی گوناگوں الجھنوں میں دن رات الجھی رہتی ہو گی۔ اندازہ کرو کہ چھوٹی سی اسلامی جماعت اور ابتدائی مراحل سے گزرتی ہوئی تحریک کیسے جان جوکھم میں پڑی ہو گی اور اس ساری صورت حال کو پیدا کرنے کا سہرا تاریخ میں یہود کے سر بندھا نظر آتا ہے۔ جی ہاں! ایک خدا کو ماننے والوں' ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے پروانوں' تورات کے علمبرداروں اور علم و تفقہ اور تقدس و تقویٰ کے ٹھیکیداروں کے سر۔

"ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو"

ابتداء میں یہود کو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے بڑی اچھی امیدیں تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ نئی طاقت انہی کی طرح بنو اسماعیل سے برسر اختلاف ہے' یہود جن انبیاءؑ کے نام لیوا تھے۔ ان کو مانتی ہے۔ ان کی کتاب کا احترام کرتی ہے اور انہی کے مرکز عبادت' یعنی بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائے ہوئے ہے۔ بنا بریں ان کا اندازہ یہ تھا کہ آہستہ آہستہ ہم محمد رسول اللہؐ اور آپؐ کے رفقاء کو اپنے اندر جذب کر لے جائیں گے۔ یہود کا ذہن حق پرستانہ طرز پر نہیں سوچ رہا تھا' بلکہ یہ خالص سوداگرانہ طرز فکر تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ اجڑے بچھڑے لوگ' جو سینکڑوں کی تعداد میں یوں اکھڑے چلے آ رہے ہیں۔ ان کو ہم اپنے باڑے کی بھیڑیں بنا سکیں گے۔ اسی امید پر انہوں نے مسلمانوں سے لمبی چوڑی رد و کد کے معاہدات استوار کر لیے اور اس سیاسی تنظیم کو گوارا کر لیا' جو مدینہ میں قائم کی جا رہی تھی۔ ان کا اندازہ یہ تھا کہ یہ سیاسی طاقت جو اپنی کونپلیں نکال رہی ہے یہ تو بس ہماری جیب میں ہے۔ ہماری پیری اور مشیخت کی گدیاں اس کو چار جانب سے احاطہ کیے ہوئے ہیں اور ہمارے علم و تقوی کی ساکھ اپنا دامن اس کے اوپر پھیلائے ہوئے ہے۔ کوئی سوال نہ تھا حق و صداقت تک رسائی حاصل کرنے کا' کوئی کاوش نہ تھی فکر و کردار کو سنوارنے کی۔ کوئی اہتمام نہ تھا عاقبت بنانے کا۔ مجرد ایک گروہی مفاد کی سیاست تھی۔ جو ان کمبختوں کے سر پر سوار تھی۔ ان کے نزدیک تو گویا مدینہ کے ماحول میں ان کے گھر کے

دروازوں پر شکار آ آ کر جمع ہو رہا تھا اور وہ اپنے دام و فتراک تیار کئے گھات میں بیٹھے تھے۔ ان کی نگاہ میں گویا مچھلیاں تھیں جو غول در غول ساحل کے پاس آ رہی تھیں۔ اور یہ ماہی گیر کھلی ہوئی باچھوں کے ساتھ مذہبی مکاری کی ڈوریاں اور کنڈیاں پانی میں ڈال رہے تھے۔ مگر کچھ ہی مدت کے تجربے سے ان کی خوش فہمیوں کا خاتمہ ہونے لگا۔ انہیں اسلامی جماعت نے جتا دیا کہ یہ کوئی سستا شکار نہیں ہے' یہ ایسی مضبوط طاقت ہے کہ شکاری اس کے ہاتھوں خود شکار ہو کے رہ جانے والے ہیں۔ ان کی نگاہوں کے سامنے آہستہ آہستہ ایک انقلابی مزاج کی ریاست پروان چڑھنے لگی۔ اور یہ ریاست اپنے وجود میں ایک قلعے کی طرح مضبوط بنتی گئی' یہود کو چند ہی دن میں معلوم ہو گیا کہ یہ ریاست جس کے بنانے میں دستوری معاہدہ کی بناء پر وہ خود بھی حصہ دار ہیں ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہیں بن سکتی' نہ اس میں انگلی دھنسانے کی ان کو کوئی جگہ مل سکتی ہے' انہوں نے اپنے لیے جو مقام سیادت اس میں حاصل کرنا چاہا اس کے بارے میں ان کو جلد ہی نامرادی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے مختلف اداروں اور سرگرمیوں میں انہوں نے نفوذ اور تصرف حاصل کرنے کی جو کوششیں کیں' ان میں بار بار منہ کی کھائی۔ اس ریاست کے صدر اور کارپردازوں اور اس کے اصولوں پر ایمان رکھنے والے شہریوں کو انہوں نے اپنے ہاتھ میں لینے کے جتنے بھی منصوبے اختیار کیے وہ سب ناکامی کا شکار ہو گئے۔ الٹا اولین مراحل میں یہ ہوا کہ یہود کے اپنے آدمیوں نے محسن انسانیتؐ کی پیش کردہ صداقتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا شروع کر دیا۔ یہ "خطرناک" انقلابی رو عامیوں ہی کو نہیں' ان کی بعض سرکردہ ہستیوں کو بھی بہا لے گئی تب ان کی آنکھیں کھلیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا سارا بازار تقدس اجڑ جانے والا ہے اور ان کے باڑے کی بھیڑیں ایک ایک کر کے ہاتھ سے جانے والی ہیں۔ یہ سودا یہود کو بڑا مہنگا پڑا۔ ایک طرف وہ بروئے معاہدہ مسلم ریاست کے نظام کے پابند ہو چکے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ دفاعی مقصد کے لیے حلیفانہ معاہدات استوار کر چکے تھے' اور تیسری طرف وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ سب کچھ جس مقصد کے لیے کیا گیا تھا وہ غارت ہوا جا رہا ہے۔ چنانچہ اندر ہی اندر ان میں ایک حاسدانہ ابال پیدا ہونے لگا اور وقتاً فوقتاً یہ گندا مادہ ان کے اجتماعی بدن کے ناسوروں سے بہنے لگا۔ خصوصاً تحویل قبلہ پر تو یہ جذباتی پیپ یہودی سوسائٹی کے مسام مسام سے رسنے لگی! اس جذبہ نے اولاً شرانگیزی کا راستہ اختیار کیا' پھر یہ تخریبی کارروائیوں کی شکل میں ڈھلا' حتیٰ کہ مرتبہ کمال تک پہنچ کر اس نے غداری کی صورت اختیار کر لی۔ آیئے! ہم مدنی دور میں اس جذبہ کے رد عمل سے پیدا ہونے والی ان مخالفانہ سرگرمیوں کا جائزہ لیں جس سے انسانیت کا سب سے بڑا خیر خواہ اور اس کے ساتھی دوچار ہوئے۔ اور جس سے اپنا وجود سلامتی کے ساتھ بچا نکالنے کے لیے اسلامی ریاست کو سخت مشقتیں اٹھانی پڑیں۔

کھچاؤ:

مدینہ کی نوخیز اسلامی جماعت جن بھاری ذمہ داریوں میں گھری ہوئی تھی ان کے لحاظ سے اس کے ایک ایک کارکن کا پارٹ بڑا اہم تھا۔ علی الخصوص جو لوگ صف اول کے کارکن تھے' ان میں سے کسی ایک کی کمی بھی سرور عالم صلی اللہ علیہ و سلم اور آپؐ کے رفقاء کے لیے بڑا بھاری حادثہ تھی۔ ابو امامہ اسعد بن زرارہ جو بنو نجار پر نقیب مقرر کیے گئے تھے۔ ایسا ہی اہم مقام رکھتے تھے' بالکل ابتدائی دور میں ان کو عالم آخرت سے بلاوا آگیا اور ایک جلیل القدر سپاہی تحریک اسلامی کی صفوں میں سے کم ہو گیا۔ حضورؐ کے لیے یہ صدمہ فی نفسہ بڑا صدمہ تھا۔ لیکن اس صدمہ کو مدینہ کی اسلام دشمن طاقت نے اپنے مفسدانہ پروپیگنڈے کے ذریعے دگنا کر دیا۔ یہود اور ان کا ساتھ دینے والے منافقین یہ کہتے پھرتے تھے کہ اجی کیا ہے' اگر یہ محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کوئی سچا نبی ہوتا' تو اس کا ایسا سرگرم ساتھی ایسے عالم میں کیوں مرا ہوتا۔ گویا مخالفین کے ہاں اس موت پر گھی کے چراغ جل گئے۔ وہ قلب حساس جو چاروں طرف سے دکھوں کے تیروں کی زد پر تھا۔ وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ کہ بئس المیت ابو امامۃ لیھود و منافقی العرب' یقولون لو کان نبیا لم یمت صاحبہ ولا املک لنفسی ولا لصاحبی من اللہ شیئا۔ [1] اس چھوٹے سے واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دشمنوں کے دلوں کے پھوڑے کیسے پکے ہوئے تھے۔ بنو نجار نے آکر حضورؐ سے درخواست کی کہ اب ہمارے لیے کوئی اور نقیب مامور فرما دیجیے۔ بنو نجار کی تسکین کے لیے آپؐ نے خود اپنے آپ ہی کو بربنائے قرابت ان کا نقیب قرار دیا۔ "انتم اخوالی' و انا بما فیکم' و انا نقیبکم"!

یہود نے جن شرائط پر دستوری معاہدہ پر دستخط ثبت کیے تھے' ان کی وجہ سے وہ اس پر قادر نہ تھے کہ تحریک اسلامی کو روز افزوں ترقی سے روک سکیں۔ ان کی ناک کے نیچے عامتہ الناس اور ان کے سربراہ کار اسلام کے جھنڈے کی طرف لپک رہے تھے اور ان کی گدیاں اور پیریاں' ان کی خانقاہیں اور دار الافتاء دم سادھے یہ دور رس انقلاب واقع ہوتے دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ تحریک حق کی لہریں ان کے گھروں کے دروازوں سے داخل ہونے لگیں۔ اور کاروباری مذہبیت کے صبر کا پیانہ اس حادثے کے پیش آجانے پر لازماً چھلک جاتا ہے کہ اس کے اپنے حلقے کے افراد ---- بالخصوص نمایاں اور قیمتی افراد ---- ٹوٹنے لگیں۔ دوسری طرف ہر انقلابی تحریک کی قوت نفوذ ہوتی ہی اس بلا کی ہے کہ منفی رجحان کے ساتھ جو لوگ اس کے مقابلے پر آتے ہیں' وہ خود انہی کے گھروں سے نوجوان طاقت کو اٹھا کر ان کے مقابلے پر لے آتی ہے۔ بیٹے باپوں سے' بہویں خسروں سے' بیٹیاں ماؤں سے' پوتے دادوں سے' غلام آقاؤں سے اختلاف کرتے

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۷ "برا ہوا ابو امامہ کا مرنا یہود اور منافقین عرب کے لیے۔ کہتے ہیں کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو اس کا ساتھی نہ مرتا۔ حالانکہ اللہ کی مشیت سے نہ میں خود بچ سکتا ہوں اور نہ اپنے کسی ساتھی کو بچا سکتا ہوں"۔

دکھائی دیتے ہیں۔ بوڑھی مذہبیت جب نوجوان تحریک کے اس داخلی حملے سے دوچار ہو جاتی ہے تو وہ مغلوب الغضب ہو جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کے صبر و تحمل کا قطعی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مدینہ میں بھی تاریخ نے اپنا یہی معمول دوہرا دیا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کس زور شور سے سچائی کا بول بالا ہو رہا تھا اور کس تیز رفتاری سے گھر گھر نئے نظام کا ڈنکا بج رہا تھا' اس تغیر احوال کو دیکھ کر یہود کے سینوں پر سانپ لوٹ لوٹ جاتے تھے۔ خصوصاً جب قبائل کے سردار اور شہرت یافتہ با اثر شخصیتیں اسلام کی فطری پکار پر لبیک کہتی تھیں' تو حسد اور احساس کمتری کی وجہ سے پورے یہودی معاشرے کے بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ مثلاً ان کے دیکھتے دیکھتے جس دن ابو قیس ابی انس نے کلمہ حق کو سینے میں جگہ دی ہو گی۔ اس دن یہودیت کے سینے میں کیا کیا ابال نہ اٹھے ہوں گے۔ یہ ایک نامور بزرگ تھے۔ دور جاہلیت ہی میں طبیعت پلٹا کھا گئی تھی۔ محض فطرت کی رہنمائی سے بت پرستی چھوڑ دی۔ غسل جنابت کو لازم ٹھہرا لیا۔ حائضہ عورتوں سے پرہیز اختیار کیا۔ پہلے نصرانیت کی طرف مائل ہوئے مگر ٹھٹک گئے۔ اپنے گھر میں مسجد بنا لی جس میں ناپاکی کی حالت میں داخل ہونے سے اجتناب رکھا۔ کہتے تھے کہ میں ابراہیم علیہ السلام کے رب کی بندگی و غلامی کرتا ہوں۔ یہ بزرگ ضعیف العمر تھے۔ حق بات کہنے میں بہت جرات دکھانے والے اور جاہلیت میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اعلان کرنے والے تھے۔ اپنے دلی جذبات کو شعر کا قالب دیا۔ چند اشعار کتابوں میں منقول ہیں۔ ایسے ذہین اور نیک سیرت بزرگ کا مقام خاصا نمایاں ہی ہونا چاہیے۔

کیا بعید کہ یہود کی ان سے بحثیں رہتی ہوں۔ اور انہوں نے ان بزرگ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوششیں کی ہوں۔ لیکن اس شخص کی فطرت صالحہ نے دین حق کا جو ذوق پیدا کر دیا تھا وہ بجز داعی اسلام کے کسی سے تسکین نہ پا سکا۔ حضورؐ مدینہ پہنچے تو قسمت کے جاگ اٹھنے کی گھڑی آگئی۔ اور یہ بزرگ حلقہ تحریک میں شامل ہو گئے۔ اور بہترین طریق سے اسلام پر عمل پیرا ہو گئے۔ اس واقعہ سے یہود میں جو رد عمل ہوا ہو گا۔ اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ قوتِ تصور کے بل پر کیا جا سکتا ہے۔

لیکن یہاں تک تو خیر پھر بھی جو کچھ ہوا بیرون در ہوا۔ سنگین حوادث تو وہ تھے جو تحریک کے درون خانہ گھس آنے پر رونما ہوئے۔ ان میں سے یہود کے ذہنی توازن کو بالکل تلپٹ کر دینے والا واقعہ ان کے ایک جلیل القدر عالم کا ذہنی انقلاب تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اکابر ---- چاہے وہ اہل دنیا ہوں یا اہل مذہب ---- میں قبول حق کی صلاحیتوں کا تناسب بہت کم ہوتا ہے لیکن ہر دائرے میں فطرت صالحہ رکھنے والے افراد ضرور موجود ہوتے ہیں۔ اور وہ خورشید صداقت کے جلوہ آرا ہو جانے پر آنکھیں موند کر تعصب کے غاروں میں جا نہیں چھپتے' بلکہ سنہری اور روپہلی شعاعوں کے لیے دل اور دماغ کے دریچے کھول دیتے ہیں۔ ان صفوں سے اگرچہ کم لوگ آتے ہیں۔ مگر جو آتے ہیں وہ بڑی تیز ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کو مفاد اور مناصب کی بڑی بھاری زنجیریں اور بیڑیاں توڑ کر آنا ہوتا ہے۔ یہود کی صفوں میں ایسے ہی ایک بزرگ عبداللہ بن سلام تھے۔ قبل اسلام ان کا نام حصین تھا۔ یہ بلند پایہ عالم و متقی تھے اور مذہبی لیڈر تھے' ان کا

تعلق بنی قینقاع سے تھا۔ حضورؐ سے ملاقات کے بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور اپنے گھر والوں کو بھی دعوت دی اور متاثر کر لیا۔ چنانچہ سب تحریک اسلام کے حلقے میں داخل ہو گئے۔ ان کے قبول اسلام کی داستان سنئے جسے ان سے ان کے ایک عزیز نے روایت کیا ہے۔

"میں نے جب اللہ کا پیغام لانے والی ہستی کے بارے میں سنا' تو آپؐ کی صفات' آپؐ کے نام اور آپؐ کے زمانے کو پہچان لیا۔ کیونکہ ہم اس کے انتظار میں تھے۔ سو اس اطلاع پر میں دل ہی دل میں خوشی محسوس کر رہا تھا' لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ تا آنکہ رسولؐ خدا مدینہ پہنچے۔ جب آپؐ قبا میں بنی عمرو بن عوف کے گھرانے میں پہنچے تو ایک شخص آیا اور اس نے آپؐ کی تشریف آوری کی اطلاع مجھے اس عالم میں دی کہ میں اپنے کھجور کے درخت کی چوٹی پر چڑھا کام میں مصروف تھا۔ میری پھوپھی خالدہ بنت حارث نیچے بیٹھی تھیں۔ میں نے جونہی تشریف آوری کی خبر سنی' تکبیر بلند کی' پھوپھی نے میری تکبیر سن کر مجھ سے کہا۔ "خدا تجھے غارت کرے۔ تجھے اگر موسیٰ بن عمران کی آمد کا مژدہ بھی ملا ہوتا تو تو اس سے بڑھ کر اظہار مسرت نہ کرتا"۔ میں نے کہا: "پھوپھی جان! خدا کی قسم! یہ موسیٰ بن عمران کے بھائی ہیں۔ اور ان ہی کے دین پر کاربند ہیں۔ یہ وہی پیغام لائے ہیں جو موسیٰ لائے تھے" اس پر وہ کہنے لگیں' "اے میرے برادر زادے! کیا یہ وہی نبی ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا جاتا ہے۔ کہ وہ قیامت کی گھڑی کے قریب اٹھایا جائے گا"؟ میں نے کہا کہ "ہاں یہی تو وہ ہے"۔ پھر میں خدا کا سندیسہ لانے والے کی خدمت میں پہنچا اور میں نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر اپنے گھر والوں کے پاس آیا اور ان کو بھی دعوت دی سو وہ بھی حلقہ اسلامی میں داخل ہو گئے۔ ❶

یہ نو مسلم عالم چونکہ یہود کی کمزوریوں کے راز داں' ان کی حاسدانہ نفسیات اور ان کے ذلیل کردار کے رمز شناس تھے۔ اس لیے خوب سمجھتے تھے کہ میرے ذہنی انقلاب پر کیا تاثر دیا جائے گا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب مفاد پرستی کی بناء پر گروہ بندیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو کردار اتنا گر جاتا ہے کہ اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہنے کے بجائے اپنے بروں کو اچھا اور دوسروں کے اچھوں کو برا قرار دیا جاتا ہے۔ اپنے باڑے کی بھیڑ کالی ہو تو بھی سفید شمار ہوتی ہے اور باہر کی بھیڑ سفید ہو تو بھی اسے کالی کہا جاتا ہے۔ بلکہ اپنے باڑے کی سفید بھیڑ باڑ پھاند کر باہر ہوتے ہی کالی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہر دور میں اس قماش کے مذہب داروں کا حال یہی رہا ہے کہ جب تک کوئی شخصیت ان کے ساتھ رہتی ہے یا کم سے کم اس سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ اس کی سرگرمیاں اپنے کاروبار پر اثر انداز ہونے والی ہیں تو اس کی خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھار تو پورے مبالغہ سے اس کی علمی و کرداری عظمت بیان کی جاتی ہے' لیکن وقت کی چند

---

❶ سیرت ابن ہشام، [illegible] ۱۳۰۔ ۱۳۹

گردشوں کے ساتھ جب ایسی عظیم شخصیت کا پارٹ کسی بزرگ کی مذہبی مارکیٹ کے لیے ضرر رساں بن جاتا ہے تو معاراۓ گرامی کروٹ لیتی ہے' اور زبان و قلم پلٹی کھا جاتے ہیں۔ کوئی عالم تھا تو اب جاہل قرار پاۓ گا' مومن تھا تو اب فاسق و کافر گردانا جاۓ گا۔ خادم دین و ملت تھا تو اب وہ ضال و مضل گنا جاۓ گا' ادب و احترام کا مستحق تھا تو اب گالیوں کا ہدف بن جاۓ گا۔ عبداللہ بن سلام ❶ کے سامنے یہود کی مسخ شدہ فطرت کی یہی پستیاں تھیں۔ اور انہوں نے تہیہ کر لیا کہ ان پستیوں پر سے تصنع کے پردے اٹھوا دیئے جائیں۔ دل ہی دل میں ایک ڈرامے کا نقشہ بنا کر انہوں نے اپنے اسلام کو مخفی رکھا۔ مناسب موقع پر محسن انسانیتؐ کی خدمت میں آۓ اور عرض کیا یہود ایک باطل زدہ گروہ ہیں۔ اور ان کے فساد احوال کو بے نقاب کرنے کے لیے آپؐ مجھے اپنے گھر میں پس پردہ بٹھا دیں اور ان کی نگاہوں سے مخفی رکھ کر ان کی راۓ میرے بارے میں دریافت فرمائیں۔ اور پھر ملاحظہ فرمائیں کہ میرے اسلام لانے سے ناواقف ہوتے ہوۓ مجھے کیا مقام دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر ان کو میر ے قبول اسلام کا علم ہو گیا تو پھر وہ مجھ پر بہتان باندھیں گے اور عیب جوئی کریں گے۔ حضورؐ نے ایسا ہی کیا عبداللہ بن سلام کو گھر میں آڑ کے پیچھے بٹھا دیا۔ اور ادھر یہودی بزرگ آپہنچے۔ باتیں ہوئیں۔ سوالات پوچھتے رہے اور جواب دیئے جاتے رہے۔ آخر میں رسولؐ خدا نے پوچھا۔ "حصین بن سلام تم میں سے کیسے آدمی ہیں؟" کہنے لگے کہ وہ ہمارے سردار ہیں۔ اور ہمارے ایک سردار کے فرزند ہیں۔ ہمارے ایک مرد جلیل ہیں' ایک بلند پایہ عالم ہیں۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکے تو عبداللہ بن سلام اوٹ سے باہر آ گئے اور ان کو مخاطب کر کے کہا: "اے گروہ یہود! خدا کا خوف کرو۔ اور جو دین حضورؐ کے ذریعے آیا ہے اسے اپنا لو۔ کیونکہ خدا کی قسم! تم خوب سمجھتے ہو' کہ آپؐ اللہ کے فرستادہ ہیں۔ تم حضورؐ کے اسم گرامی اور آپؐ کی صفات کا تذکرہ اپنے ہاں تورات میں لکھا دیکھتے ہو' سو میں تو گواہی دیتا ہوں کہ حضورؐ خدا کے فرستادہ ہیں۔ اور آپؐ پر ایمان لاتا ہوں اور آپؐ کی تصدیق کرتا ہوں اور آپ کو پہچانتا ہوں"۔ یہود پردہ اٹھا دینے والے اس ڈرامے کو دیکھ کر بہت سٹپٹاۓ اور کہنے لگے۔ "تم جھوٹے ہو"۔ اور پھر عبداللہ بن سلام کے درپے ہو گئے۔ ابھی چند ثانیے پہلے جس شخص کو سید اور عالم اور مرد جلیل قرار دیا' گھڑی بھر میں اسی کو جھوٹا آدمی کہہ رہے تھے۔ عبداللہ نے رسولؐ اللہ سے عرض کیا کہ میں نے حضورؐ سے کہہ نہیں دیا تھا کہ یہ ایک باطل زدہ گروہ ہے۔ یہ سرکشی' جھوٹ اور برائی سے آراستہ لوگ ہیں۔ اس دلچسپ طریقے سے عبداللہ بن سلام نے اپنے گھر والوں کے اسلام کا اعلان کیا۔ تصور کیجئے کہ یہود کے دل و دماغ پر کیا واردات گزرے ہوں گے۔ ❷

ایسا ہی ایک واقعہ مشہور بزرگ و عالم مخیریق کا ہے جو ذرا بعد کے دور میں پیش آیا۔ یعنی یوم احد پر!

---

❶ لفظ سلام کے لیے یہودیوں کا مقبول تلفظ سلام (بہ تشدید لام تھا)

❷ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۳۹۔ ۱۳۸

یہود میں سے یہ صاحب بہت مالدار بھی تھے اور کھجوروں کے باغات کے مالک تھے۔ اپنے علم کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات سے وہ آپ کو پہچان گئے تھے۔ یہاں تک کہ یوم احد آگیا اور اتفاق سے اسی دن یوم سبت پڑتا تھا۔ کسی مجلس میں انہوں نے کہا کہ: "اے گروہ یہود! خدا کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کرنا تم پر لازم آتا ہے"۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ ---- اہل شرک کے مقابلے میں مسلم جماعت کی امداد اصولاً تم پر واجب ہے' دوسرے بروئے معاہدہ تم اس بات کے پابند ہو کہ پیش آمدہ تصادم میں اس حلیف طاقت کا ساتھ دو۔ اس پر جو جواب یہود نے دیا۔ وہ حیلہ باز اور نکتہ طراز مذہبی ذہن کی گھناؤنی تصویر کو پوری طرح سامنے لے آتا ہے۔ کہنے لگے کہ "آج کا دن تو یوم سبت ہے"۔ اس جواب پر درشتی سے مخیریق نے کہا۔ "کوئی سبت نہیں ہے تمہارے لیے!" پھر اس فرض شناس مجاہد نے ہتھیار سنبھالے اور شہر سے نکل کر میدان احد میں رسول اللہ سے جا ملے۔ جاتے ہوئے اپنے اہل خاندان سے یہ بات طے کرتے گئے کہ اگر میں آج مارا جاؤں تو میرے تمام اموال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیئے جائیں۔ اور وہ اللہ کی رہنمائی کے تحت جس طرح چاہیں ان میں تصرف کریں۔ چنانچہ یہ جانباز میدان میں کام آگیا۔ اور اس کے ترکہ کو رسولؐ خدا نے اپنے قبضہ میں لے کر صرف کیا۔ کسی قدر اختلاف اس بارے میں ہے کہ مخیریق اسلام لائے تھے یا نہیں۔

تحریک اسلامی کی اس فاتحانہ یلغار پر یہود کی فاسد مذہبیت کا جو باطنی ردعمل تھا اس کا اندازہ اسی سلسلے کے ایک دلچسپ واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب یہ روداد بیان کرتی ہیں کہ میں اپنے والد اور چچا کی نگاہ میں ساری اولاد سے زیادہ چہیتی تھی اور دونوں ہمہ وقت ساتھ رکھتے تھے۔ جب رسولؐ خدا مدینہ آئے اور قبا میں قیام فرمایا۔ تو میرے والد حیؔی بن اخطب اور چچا ابویاسر بن اخطب مُنہ اندھیرے ملاقات کے لیے گئے' لوٹے تو غروب آفتاب کا وقت تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بہت تھکے ماندے اور پریشان خاطر ہیں۔ وہ بہت دھیمے انداز سے چلے آرہے تھے۔ میں معمول کے مطابق مسکراتی ہوئی ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ لیکن بخدا پریشانی کے مارے دونوں میں سے کسی نے میری طرف التفات نہ کیا۔ میرے چچا ابویاسر والد سے کہہ رہے تھے۔ "کیا یہ وہی (پیغمبر موعود) ہے؟" والد نے کہا! "ہاں' خدا کی قسم" چچا نے پھر پوچھا۔ "کیا تم نے اسے پہچان لیا ہے۔ اور یقین کر لیا ہے"؟ والد نے جواب دیا "ہاں"۔ اس پر چچا نے دریافت کیا۔ "پھر اس کے لیے تمہارے دل میں کیا جذبہ ہے؟" والد نے کہا: "دشمنی ہی دشمنی ---- جب تک زندہ ہوں! خدا کی قسم"!

یہ تھا یہود کا اصل ذہن! یعنی خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے سامنے آنے والا داعی حق ہے۔ خدا کا پیغام لانے والا ہے۔ اس کا ہر بول اس کی سچائی پر گواہ ہے' اس کا پورا کردار اس کے مرتبہ کو نمایاں کر رہا ہے' اس کا چہرہ اور اس کی وجاہت اس کی نبوت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ سمجھتے ہی نہیں خلوتوں میں زبان سے اقرار تک کرتے ہیں۔ لیکن ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کرنے کی بجائے مخالفت و عداوت کا عزم باندھتے

ہیں۔ یہ فطرت یہود کے ہاں عام تھی' آفتاب نکلتا ہے تو کون نہیں جانتا کہ طوفان نور ابل پڑا۔ آدمی اور حیوانات تو خیر آنکھیں رکھتے ہیں۔ گھاس کی ایک ایک پتی کو علم ہو جاتا ہے کہ وہ ہونے والا واقعہ ہو گیا جو ہر شب تیرہ کے خاتمے پر روز ہوا کرتا ہے۔ بلکہ حرارت اور گرمی مٹی کے بے جان ذروں اور پانی کے قطروں اور ہوا کی موجوں تک کو یہ معرفت دے دیتی ہیں کہ نور کا پیغامبر جلوہ آرا ہو چکا۔ طلوع آفتاب تو ایسا بڑا انقلابی واقعہ ہوتا ہے کہ اسے چمگادڑیں اور الو تک جان جاتے ہیں۔ ان کی فطرت کج کی امتیازی شان بس یہ ہوتی ہے کہ روشنی ہونے پر اور دنیا کی تو آنکھیں کھلتی ہیں اور ان کی آنکھیں بند ہو جایا کرتی ہیں۔ بلکہ ان کے لیے سورج کے نکل آنے کی علامت۔ ہی یہ ہوتی ہے کہ ان کی آنکھیں چندھیا کے رہ جائیں۔ انسان اتنا اندھا نہیں ہو سکتا کہ اس کے سامنے خدا کے انبیاء" مرتبہ اعجاز کو پہنچے ہوئے علم و کردار کے ساتھ جلوہ گر ہوں۔ اور وہ یہ نہ محسوس کرلے کہ کوئی عظمت مآب اور غیر معمولی اہمیت کی شخصیت ابھری ہے۔ آدمی دیکھتا ہے' سمجھتا ہے' جانتا ہے اور جاننے کے بعد آنکھیں بند کرتا ہے۔ پھر بھی اگر روشنی پپوٹوں کے پردوں کو چیر کر اندر جا پہنچتی ہے' تو آنکھوں پر پٹیاں باندھتا ہے۔ ہاتھوں سے ان کو بھینچ لیتا ہے۔ منہ ریت میں چھپا لیتا ہے۔ کمروں کے دروازے کھڑکیاں بند کر کے کالے پردے ان پر ڈال دیتا ہے۔ کہتے ہیں سوتے کو جگایا جا سکتا ہے' جاگتے کو جگانا ممکن نہیں ہوتا۔ ٹھیک اسی طرح انجان کو علم دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جاننے والے کو انجان بن جانے پر جہل کے عالم سے باہر نہیں نکالا جا سکتا' ٹھیک یہی حال تھا جس میں یہود کی اکثریت اور خصوصاً ان کے علماء کبار جا پڑے تھے۔ قرآن نے بھی ان کے اس فساد کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ "یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم"۔ یعنی یہ حق اور داعی حق کو اسی قطعیت کے ساتھ جانتے ہیں۔ جیسے اپنے بچوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ (البقرہ: ۱۴۶)

یہودیت کے سربراہ کار محسن انسانیت کے علو مرتبہ کو دیکھ دیکھ کر جلتے تھے اور جوں جوں عامتہ الناس اور ان کے اپنے ریوڑ کے افراد نئی دعوت کی طرف لپک رہے تھے' ان کے دلوں کی فضا میں کھچاؤ بڑھ رہا تھا۔

مناظرانہ سوالات:

بگڑے ہوئے مذہب داروں کے دلوں میں جب کسی موثر دعوت اور کسی فروغ پاتی ہوئی تحریک اور کسی جلیل القدر داعی کے خلاف کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ قوام پکڑ لیتا ہے تو وہ افہام و تفہیم کے دروازے بند کر کے مناظرے کا دنگل کھول دیتے ہیں۔ مناظرے کی اسپرٹ سے جو سوالات و شکوک اٹھائے جاتے ہیں' ان کا منشا کبھی یہ نہیں ہوتا کہ ایک بات کو سمجھنا ہے بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیدھی سادی بات کو سمجھ کے نہیں دینا ہے۔ یعنی مناظرے کی روح ہے "میں نہ مانوں" لیکن مقصد اتنا ہی نہیں ہوتا' وسیع تر منتہا یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس کو طلب حق کی فطری راہ سے ہٹا کر شکوک و شبہات کے

خارزاروں میں ڈال دیا جائے اور وہ سادہ استدلال سے دور ہو کر نظری سوالات کے چکر میں پڑ جائیں۔ وہ دعوت کی عقلی قدر و قیمت اور اس کے اخلاقی اثرات کو جانچنے کے بجائے پیچیدہ ٹیکنیکل مسائل کی بھول بھلیوں میں گھومتے رہیں۔ علمائے سوء اپنے بارے میں تو سو فیصدی اطمینان رکھتے ہیں کہ ہمیں دعوت حق کبھی ختم نہیں کر سکتی' ڈر انہیں ہوتا ہے اپنی بھیڑوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا' ان کی حفاظت کے لیے وہ ٹیڑھے ٹیڑھے سوالات کے جھاڑ کا باڑا بناتے ہیں۔ یہود کے علماء سوء بھی اس کے سوا اور کیا کرتے؟

عبداللہ بن سلام کے تحریک اسلامی میں شامل ہو جانے کے بعد یہود نے مناظرانہ بحثوں اور کاوشوں کے سورچے جمانے پر پوری پوری توجہ صرف کر دی۔ اور کج بحثوں کے ترکش کھول کر منطقیت کے تیر تحریک اسلامی پر برسانے شروع کر دیئے' مگر یہ ساری جنگی کارروائی بھی کھلے مورچوں سے نہیں' منافقت کی ٹٹیوں سے جاری کی گئی۔ یہ بزرگان تقویٰ کیش حق پژوہی کے بڑے مرعوب کن بہروپ بھر کر تحریک اسلامی کے اجتماعات میں شریک ہوتے۔ پھر باتوں باتوں میں گربہ مسکینی کے طرز سے ہونٹ لٹکا لٹکا کر سوالات سامنے لاتے۔

ایک اجتماع میں حضورؐ رسالت مآب کے سامنے انہوں نے یہ سوال رکھا: "خلق کو جب خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو آخر خود خدا تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟" دیکھا آپ نے ذہن کا ٹیڑھ! ---- یہود خود اسی خدا پر یمان رکھنے کے دعوے دار تھے' اس کے پیغمبروں کے معتقد اور اس کی کتاب کے علمبردار تھے۔ وہ خدا کو پہلے سے جانتے تھے' اس کی صفات سے آگاہ تھے۔ لیکن اسی خدا کی طرف جب اسلام نے بلایا تو خدا کے بارے میں ان کے دلوں میں بڑا بھاری اشکال پیدا ہو گیا۔ اور ان کے سوال کا گویا ظاہری مدعا یہ تھا کہ اگر یہ اشکال رفع ہو جائے تو پھر ان کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ کھل جائے۔ لیکن سوال کا ٹیڑھ بتا رہا ہے کہ مقصود طلب ہدایت نہیں بلکہ لوگوں کو ہدایت سے بچنے کے لیے راہ فرار دکھانا ہے۔ آنحضورؐ نے اس ٹیڑھے سوال کا جواب بہت ہی سیدھے طریق سے دیا۔ یعنی سنجیدگی سے سورہ اخلاص پڑھ دی۔ "کہو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہ اللہ ایک ہے' وہ بے ہمہ ہے' نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور کوئی اس کا ہمتا نہیں ہو سکتا"۔ [1]

آیئے آپ کو ایک اور دلچسپ مجلس گفتگو میں لے چلیں۔ یہود کے بعض نامور مولوی ایک دن حضورؐ کے حلقہ میں آئے اور کہنے لگے کہ ہمارے چار سوالوں کا جواب دیجئے۔ پھر ہم آپؐ کی دعوت مان لیں گے۔ اور آپؐ کی اطاعت قبول کر لیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اب اس عہد کی ذمہ داری تم پر ہے۔ پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے۔ سوالوں کے سامنے آنے سے قبل آپ ذرا خود اندازہ کیجئے کہ تحریک اسلامی کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے معقول لوگوں کی طرف سے کس قسم کے استفسارات کی توقع کی جانی چاہیے۔ وہ پوچھتے تو اساسی

---

[1] حیات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) از محمد حسین مصری

صداقتوں کے بارے میں پوچھتے' اسلام کی اخلاقی قدروں کے بارے میں پوچھتے' سیاسی و معاشی نظام اور اس کے طریق کار کے بارے میں پوچھتے' مسلمان ہونے کے شرائط و لوازم کے بارے میں پوچھتے' اپنی زندگیوں سے تعلق رکھنے والے دوسرے علمی مسائل کے متعلق پوچھتے' لیکن ان چیزوں سے وہاں سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ انہوں نے اپنے علم و فراست کا مظاہرہ کرنے کے لیے یہ سوالات کیے بعد دیگرے پیش کیے۔

۱۔ بچہ ماں کے مشابہ کیوں ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے باپ کے نطفہ سے تشکیل پاتا ہے؟

۲۔ آپؐ کی نیند کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟

۳۔ اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) نے کیا چیزیں اپنے اوپر حرام کرلی تھیں اور کیوں؟ ان کسوٹیوں پر تحریک اسلامی کی حقانیت کو جانچا جا رہا تھا!

۴۔ چوتھا سوال البتہ کچھ نہ کچھ تعلق براہ راست دعوت و تحریک سے رکھتا تھا' مگر اسپرٹ اس کی بھی یہی تھی' پوچھا گیا کہ روح (فرشتہ وحی) کیا ہے؟

حضورؐ نے سکون سے ایک ایک سوال کا جواب دیا۔ اور آخری سوال کے جواب میں فرمایا کہ تم خود اس بارے میں جانتے ہو کہ وہ جبریلؑ ہے اور وہی میرے پاس آتا ہے۔

سب سوالات ہو چکے۔ جواب سامنے آگئے۔ ان جوابوں میں سے کسی کی تردید نہیں کی گئی۔ بلکہ ہر ایک پر کہا گیا۔ "اللھم نعم" یعنی ٹھیک' اے ہمارے اللہ! [1]

آپ توقع کریں گے کہ ان جوابات کے بعد انہوں نے دلوں کے دروازے اسلام کے لیے کھول دیئے ہوں گے۔ ہرگز نہیں! آخری بات پر وہ کہنے لگے: "لیکن اے محمدؐ! (صلی اللہ علیہ وسلم) جبریلؑ تو ہمارا دشمن ہے' وہ ایک فرشتہ ہے کہ جب آتا ہے تو مصیبت اور خون خرابے کا پیغام لے کے آتا ہے"۔ مراد یہ تھی کہ وہ جب خدا کی طرف سے دین کی علمبرداری کا مطالبہ لاتا ہے تو ایک کشمکش ناگزیر ہو جاتی ہے' طرح طرح کے نقصانات سر پڑتے ہیں۔ اور بڑے چرکے کھانے پڑتے ہیں۔ بلکہ نوبت جہاد تک پہنچتی ہے۔ اس سے ہماری نہیں بنتی۔ "بس اس فرشتے کی دشمنی آڑے نہ آئی ہوتی تو پھر ہم آپ ﷺ کا ضرور ساتھ دیتے اور آپؐ کے نقش قدم پر چلتے"۔ یعنی دعوت ٹھیک' پیغام برحق' تحریک درست' مگر اس کے پس منظر میں جس فرشتے کو خدا نے لا ڈالا ہے اس سے ہماری صاحب سلامت ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا جہاں وہ ہو گا وہاں ہم نہیں آسکتے! چاہے فرشتہ خدا کا مقرر کردہ اور مقرب ہو۔ کیا ہی ٹیڑھی کھوپریاں تھیں ان لوگوں کی!

اس کا جواب محسن انسانیتؐ نے قرآن کے الفاظ میں ایسا دیا کہ بس سننے والوں کو ہمیشہ یاد رہا ہو گا۔ فرمایا۔ "کہو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہ جو کوئی جبریلؑ کا دشمن ہو تو (وہ کان کھول کر سن لے کہ) قرآن کو اللہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر۔ ج ا سورہ بقرہ۔ تشریح آیت ۹۷ (پوری تفصیل دیکھیں)

تعالیٰ نے تمہارے دل پر اپنے فرمان کے تحت اتارا ہے جو اپنے سے پہلے کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اور ایمان لانے والوں کے لیے (عداوت اور مصیبت اور خون خرابے کا پیغام نہیں بلکہ) ذریعہ ہدایت وبشارت ہے (البقرہ ۹۷) ❶

ایک اور بحث پیدا ہو گئی۔ سرور عالمؐ نے کسی موقع پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر سلسلہ انبیاء میں فرمایا۔ اس پر یہودی حلقوں میں بڑا چرچا ہوا۔ ہر طرف کہا جانے لگا کہ "(محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی) انوکھی بات سنی؟ کہتے ہیں کہ سلیمانؑ بن داؤدؑ بھی پیغمبر تھے! خدا کی قسم' وہ تو محض ایک جادوگر (نعوذ باللہ) تھے"۔ چنانچہ قرآن نے اس واہیات چرچے کی تردید کی کہ جادوگری تو ایک کافرانہ حرکت ہے اور حضرت سلیمانؑ نے کبھی یہ حرکت نہیں کی۔ چاہ بابل کے جو قصے مشہور ہیں وہ تو شیطان کے کرشمے تھے۔ ❷

طوفان امڈ پڑا:

تحریک اسلامی کے دور اوائل میں یہود بہت سے ایسے پہلو دیکھ رہے تھے جن کی بنا پر ان کو یہ آس لگی رہی کہ آہستہ آہستہ یہ تاریخی طاقت ہمارے ہاتھ میں آجائے گی۔ قرآن میں بنی اسرائیل کی جہانی فضیلت کا ذکر تھا۔۔۔۔ انی فضلتکم علی العلمین (البقرہ۔ ۴۷) ان کے انبیاء کی نبوت کی تصدیق تھی' ان کی کتاب مقدس کی حقانیت کی گواہی تھی۔ ان کے سامنے تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم (آل عمران۔ ۶۴) کی اسپرٹ سے دین کی مرکزی حقیقت کو اجاگر کیا جارہا تھا۔

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے طور طریقوں کے مقابلے میں یہود کے بعض طریقوں کو پسند فرماتے' مثلاً مشرکین بالوں میں مانگ نکالتے تھے اور یہود نہیں نکالتے تھے۔ سو آپؐ نے اس معاملے میں مشرکین کی مخالفت کی اور یہود کی موافقت! جن معاملات میں قرآن میں کوئی حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد نہیں ہوتا تھا ان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب کی موافقت کرتے ❸ مدینہ کے یہودی عاشورا کے دن کا روزہ رکھتے تھے' آپؐ نے بھی اس دن روزہ رکھا' اور مسلمانوں کے لیے عاشورا کا روزہ رکھنا پسند فرمایا۔ کسی یہودی کا جنازہ گزرتا تو آپؐ کھڑے ہو جاتے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کے لیے قبلہ نماز بیت المقدس تھا۔ یہ ایک کھلی ہوئی علامت تھی کہ تحریک اسلامی مشرکین کے مقابلے میں اہل کتاب سے زیادہ اقرب تھی۔ امر واقعہ در حقیقت یہ تھا کہ یہودیت کا قالب تو اس مذہب کے مفاد پرست مولویوں اور پیروں نے پوری طرح مسخ کر ڈالا تھا۔ اور یہ قالب بے جان بھی ہو چکا تھا۔ لیکن

---

❶ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶۸۔۱۶۷

❷ ایضاً " ۱۶۹۔۱۶۸

❸ بخاری۔ کتاب اللباس۔

موسیٰ علیہ السلام جس دین کو لائے تھے وہ وہی اسلام تھا جسے سارے ہی انبیاءؑ نے شرائط کے تھوڑے بہت تفاوت کے ساتھ پیش کیا تھا اور اب اسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے سامنے رکھ رہے تھے بلکہ ایک نظام کی صورت میں برپا کر رہے تھے۔ یہی رشتہ تھا جس کی بنا پر حضورؐ کو بھی امیدیں تھیں کہ یہود اسلامی جد و جہد کو جوں جوں سمجھیں گے اس کا خیر مقدم کریں گے۔ اور اس کام کو اپنا کام سمجھیں گے۔ انہیں خوشی ہو گی کہ خدا کے نام کا جھنڈا بلند ہو رہا ہے اور انبیاءؑ کے دیئے ہوئے اصولِ اخلاق نظام زندگی کی بنیاد بن رہے ہیں۔ اور شریعتِ تورات کی اصل قدروں کے بجھے ہوئے دیئے از سر نو روشن کئے جا رہے ہیں۔ انہی امیدوں کی فضا میں قرآن نے اپنی دعوت یوں پیش کی تھی کہ اصل سوال گروہ بندیوں کا نہیں اصول و عمل کا ہے۔ یہودیوں میں سے' عیسائیوں میں سے' صابیوں میں سے' اور خود اسلام کے نام لیواؤں میں سے جو کوئی فی الحقیقت خدا اور اس کے قانون اور اس کے انبیاءؑ کی دعوت اور محاسبہ روزِ جزا پر ایمان لائے اور پھر اپنی زندگی کو عمل صالح بنا کے دکھا دے تو بس یہ چیز ہے جو مطلوب ہے۔ اصل چیز نام نہیں' کام ہے' مطلوب ٹھپے نہیں' کھرا مال ہے' مقصود نسبتیں نہیں' سیرتیں ہیں۔ مسئلہ کسی دھڑے اور جتھے کے مفاد کا نہیں' انسانیت کی مشترک خیر و فلاح کا ہے۔ لیکن نہ یہودیوں کی طرف سے تحریک اسلامی کی امیدیں پوری ہوئیں' نہ تحریک اسلامی کی طرف سے یہودیوں کی مرادیں بر آئیں۔

اور یکایک تحریک اسلامی ایک انقلابی موڑ مڑ گئی۔ یہ موڑ تھا تحویل قبلہ کا واقعہ! تحریک اسلامی کی بنیادی فطرت ہر دور میں یہ رہی ہے کہ وہ اپنے امتیازی وجود کو نمایاں رکھنا چاہتی ہے اور اپنے افراد کے اندر اصولی و اعتقادی خودی کو زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ مکہ میں اسی تقاضے کے تحت بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا تاکہ نظریہ اسلامی کی علمبردار جماعت کو اپنی جداگانہ حیثیت کا احساس ہو۔ چنانچہ ہجرت تک کے لمبے دور میں مسلمانوں نے مشرکین کے مقابلے میں اپنی مختلف حیثیت کا پوری طرح احساس کر لیا۔ اور خود مشرکین کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ اور مسلمان دو الگ الگ سمتوں میں حرکت کرنے والی طاقتیں ہیں۔ اسی شعور و احساس کی تکمیل تھی جس کا اظہار "لکم دینکم ولی دین" (الکفرون۔ ۲) کے مختصر سے قرآنی بول میں کر دیا گیا۔ بات پوری طرح نتھر گئی کہ تمہاری راہ الگ' ہمارا راستہ جدا۔ ہم میں تم میں کوئی جوڑ میل نہیں۔

اب مدینہ میں آ کر جو کچھ بھی اندیشۂ التباس تھا وہ اہل کتاب سے تھا۔ اور اب اس امر کی ضرورت تھی کہ تحریک اسلامی کو اہل کتاب کی بے روح مذہبیت سے ممیز رکھا جائے۔ اور مسلم معاشرے کو یہودی معاشرے میں ذہنی طور پر تحلیل ہونے سے بچایا جائے۔ اب دور مکہ کی وہ ضرورت ختم ہو چکی تھی جس کے تحت بیت المقدس کو عارضی طور پر قبلہ بنا لیا گیا تھا۔ مسلمانوں کا ذہنی رابطہ قبلہ ابراہیمیؑ ہی سے اقرب تھا اور خود حضورؐ اسی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اور تحریک کے اولین جانباز بھی بنو اسمٰعیلؑ سے تعلق رکھتے تھے۔ امتیاز کا وہ عارضی اہتمام اب غیر ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضورؐ کا قلب حقیقت شناس پہلے سے اس تبدیلی کا منتظر رہا۔ اور اس کا ذکر خود قرآن میں ہے کہ "قد نری تقلب وجهک فی السماء"

تحویل قبلہ کا فرمان صادر کر کے در حقیقت سلطنت زندگی کے فرمانروائے حقیقی نے جہانی امامت کے منصب سے بنی اسرائیل کو معزول کر دیا۔ اور ان کی جگہ ملت اسلام کو مامور فرمایا۔ عالمی دعوت خیر و فلاح کا جو مرکز پہلے بیت المقدس میں چلا آرہا تھا۔ وہ اب حرم کعبہ کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو امت وسط یعنی عالمی دعوت کا مرکزی گروہ قرار دیا گیا۔ جس پر شہادت علی الناس کی ذمہ داری ڈالی گئی اور تمام بنی نوع انسان کی رہنمائی کا فریضہ عائد کیا گیا۔

سولہ مہینے تک مدینہ میں بیت المقدس کے رخ نماز ادا کی جاتی رہی۔ رجب یا شعبان ۲ھ کا واقعہ ہے کہ ابن سعد کی روایت کے بموجب سرور عالم بشر بن براء بن معرور کے ہاں دعوت پر گئے تھے' وہاں ظہر کا وقت آگیا اور آپؐ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکایک وحی کے ذریعے یہ آیت نازل ہوئی کہ فلنولینک قبلة ترضها فول وجهک شطر المسجد الحرام و حيث ما کنتم فولوا وجوهکم شطره۔ کہا گیا کہ "لو ہم تمہیں اسی قبلے کی طرف پھیر دیتے ہیں' جسے تم پسند کرتے ہو۔ سو (اب) مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں بھی تم ہو' اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو"۔

اس حکم کے سنتے ہی خدا کا سب سے زیادہ اطاعت شعار بندہ حالت نماز ہی میں رخ بدل لیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا اتباع کرنے والے تمام نمازی نئے قبلہ کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ بیت المقدس مدینے سے سیدھا شمال میں ہے اور مکہ جنوب میں۔ حالت نماز میں قبلہ کی تبدیلی کے معنی یہ ہوئے کہ امام کو مقتدیوں کے سامنے سے سیدھا پیچھے کی طرف آنا پڑا ہو گا۔ اور نمازیوں کی صف کو بالکل الٹے قدموں گھومنا پڑا ہو گا۔ اس کے بعد مدینہ اور آس پاس کی بستیوں میں عام منادی کرا دی گئی۔ براء بن عازب کا بیان ہے کہ ایک جگہ منادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رکوع میں تھے اور وہ اعلان سنتے ہی اسی حالت میں کعبے کی طرف مڑ گئے۔ انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ بنی سلمہ کے ہاں یہ اطلاع دوسرے روز نماز صبح کے دوران میں پہنچی' لوگ ایک رکعت پڑھ کر دوسری میں تھے کہ منادی کی پکار سنی اور اسے سنتے ہی پوری جماعت نے اپنا رخ بدل لیا۔ [1]

اس تبدیلی پر جو ہنگامہ بپا ہونے والا تھا اس کے بارے میں پہلے سے قرآن نے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا۔ سیقول السفهاء من الناس ما ولهم عن قبلتهم التي کانوا عليها (البقرہ: ۱۴۲) یعنی نادان اور حقیقت نا آشنا لوگ قیل و قال کا طوفان اٹھا دیں گے کہ ان لوگوں نے کس سبب سے قبلہ بدل ڈالا ہے' طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوں گی' عجیب و غریب ذہنی رد عمل رونما ہوں گے' اور تعلقات و روابط پر بڑا اثر پڑے گا' مسلمانوں کو پروپیگنڈے کے آنے والے طوفان میں مضبوط موقف لے کر کھڑے رہنے کی لیے قرآن نے

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۱۹ تا ۱۲۱

تحویل قبلہ کی معنویت کو پیشگی ان کے ذہن نشین کرا دیا۔ انہیں بتایا کہ پہلے بیت المقدس کو قبلہ بنانے سے غرض یہ تھی کہ عربیت کے بت کو توڑا جائے۔ کیونکہ عرب اپنے قومی دائرہ سے باہر کی کسی چیز کی قدر ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اب بیت المقدس سے کعبہ کی طرف رخ گھما دینے کا مدعا یہ ہے کہ اسرائیلیت کا بت بھی ٹوٹ جائے۔ ایک کام پہلے ہو چکا تھا دوسرا اب کر دیا گیا۔ عربیت کے پرستار پہلے چھٹ چکے تھے اور اسرائیلیت کے پرستار اب چھٹ جائیں گے۔ اس طرح نفاق کے گھن سے نیا اسلامی معاشرہ پاک ہو سکے گا۔ اب اس حلقہ میں وہی لوگ رہیں گے جن کی نگاہ میں اصل احترام اللہ کے فرمان اور اس کے رسولؐ کی سنت کا ہے۔ یہ موڑ جس سے تحریک اسلامی گزر رہی ہے' رسولؐ کا دامن پورے اعتماد کے ساتھ تھام کر چلنے والوں کو ان تمام بے اصول افراد کو ان افراد سے چھانٹ کر الگ کرے گا جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہوں کہ مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں اور اصل مرکز اطاعت وہ ہے' نیز جو اس نکتہ کے راز داں ہیں کہ نیکی مشرق یا مغرب کی طرف رخ کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ ان ظاہری اشکال شریعت کے اندر کام کرنے والی جس روح کا نام نیکی ہے' وہ اللہ تعالیٰ پر' یوم آخرت پر' فرشتوں پر' خدا کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا ہے۔ سو تمہیں قبلہ کے ظاہری شعار کو قائم کرنے میں جس چیز کا اہتمام کرنا چاہیے وہ ہے استبقوا الخیرات (البقرہ:۱۴۸) یعنی نیکیوں کی طرف لپکو اور بھلائیوں کی طرف رخ کرو۔ تمہیں چاہیے کہ تم خدا کے بڑے سے بڑے تغیر آفرین اور انقلاب انگیز حکم کی تعمیل کرنے میں کسی مخالف طاقت سے نہ ڈرو۔ صرف اسی ایک سے ڈرو۔ اس کا مطالبہ ہے کہ "فلا تخشوھم واخشونی" (البقرہ:۱۵۰)

قرآن نے حاکم کائنات کا فرمان سناتے ہی کہہ دیا کہ یہ واقعہ بجز اہل ایمان و یقین کے اور ہر کسی پر شاق گزرے گا۔ اس پر جب ہنگامہ کھڑا ہو گا تو گھبراہٹ چھا جائے گی اور گلی گلی وہ کج بحثیاں شروع ہوں گی کہ کمزور لوگوں کے سر چکرا جائیں گے اور جذبات میں ہل چل مچے گی۔ اب سنئے کہ قیل و قال کیا کچھ ہوئی۔

مشرکین نے کہا کہ لیجئے اب ہوش کچھ تو ٹھکانے آئی۔ ہمارا قبلہ اختیار کر لیا ہے تو آہستہ آہستہ یہ لوگ ہمارے مذہب کی طرف بھی از خود لوٹ آئیں گے۔

یہود نے کہا کہ داعی اسلام نے ہماری مخالفت کے جوش میں قبلہ انبیاء کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ اگر یہ نبی ہوتا۔ تو کبھی بھی اس قبلہ کو نہ چھوڑتا۔

نفاق کے مریض کہتے تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا صحیح قبلہ کدھر کو ہے' اگر پہلا قبلہ برحق تھا تو اب وہ چھوڑ دیا۔ اور اگر اب دوسرا قبلہ درست ہے تو پہلے جو کچھ تھا وہ غلط تھا۔ قبلہ کیا ہوا کھیل ہو گیا۔ جدھر جی چاہا ادھر رخ کر لیا۔ تو یہ سارا مذہب ہی بس مرضی کا کھیل ہے۔

اور جو لوگ ایمان و یقین کی روح سے مالا مال تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے حکم سنا اور اس کی اطاعت قبول کی اور ہم اس پر ایمان لائے' یہ سب کچھ ہمارے پروردگار کی جانب سے ....

ہے! [1]

یہی اہل ایمان بیچارے پروپیگنڈہ کی آندھی میں گھر گئے اور چاروں طرف سے سوالات' بحثوں اور طنزو تضحیک کے تیروں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ مجلس مجلس معرکہ آرا گفتگوئیں تھیں' گلی گلی ہاؤ ہو مچ رہی تھی۔ لمحہ لمحہ جذباتی ہیجان پیدا ہوتے تھے۔ انقلابی تحریکوں میں ہر بڑی تبدیلی اور ہر بڑے موڑ پر اور لوگوں کے خیالات کے بتوں کو توڑنے والے ہر اقدام پر اس طرح کے طوفانی ہنگامے پیش آجاتے ہیں اور ایسے حالات میں ان کے کارکن گھبراہٹ اور پریشانی میں مبتلا ہو کر بسا اوقات اشتعال کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔

اس اندیشے کے پیش نظر نصیحت کر دی گئی کہ ان گردابوں کو پار کرنے کے لیے صبر و صلوٰۃ کے مضبوط سفینے ہی کار آمد ہو سکتے ہیں۔ مخالفانہ پروپیگنڈہ کرنے والوں کے بارے میں بتایا گیا کہ ان کا مقصود تلاش حق ہرگز نہیں ہے۔ اور یہ دلائل سے مطمئن ہونے پر بالکل تیار نہیں ہیں۔ ان کے سوالات کا مدعا محض پریشان کرنا ہے۔ یہ اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم اپنا اصول اور نظام چھوڑ کر ان کی مریدی نہ اختیار کر لو۔

بیہودہ نکتہ طرازیوں کے جواب میں اتمام حجت کے طور پر تحریک اسلامی کی طرف سے سنجیدہ اور متین انداز سے زور دار استدلال کیا گیا اور عوام الناس کے سامنے کعبہ کی عظمت کو سورہ آل عمران کے ایک خطاب میں واضح کر دیا گیا۔ ارشاد ہوا۔

> "بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ ابراہیمؑ کا مقام عبادت ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے' اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے"۔ (آل عمران ۹۶۔۹۷)

بیت المقدس کے متعلق یہ حقیقت خود بائیبل سے ثابت تھی کہ اسے حضرت موسیٰؑ کے ساڑھے چار صدیاں بعد حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کرایا تھا۔ اور دور سلیمانیؑ ہی میں اسے خدا پرستوں کا قبلہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس تاریخی اور مذہبی دونوں طرح کی متفقہ اور متواتر روایات سے یہ ثابت تھا کہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ نے استوار کیا تھا۔ اور حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ سے آٹھ نو صدیاں قبل ہو گزرے تھے۔ کعبہ کی زمانی اولیت کے ساتھ ساتھ یہ بتایا گیا کہ اس کے پر تقدس ماحول میں بڑی اہم نشانیاں ہیں' اس میں دین کی بیش قیمت روایات جگمگا رہی ہیں۔ نیکی کی علمبرداری کی ایک تاریخ اس کے سنگ و خشت

---

[1] زاد المعاد۔ ج ۲ ص ۵۷۔۵۸

پر مرقوم ہے۔ پھر اس میں ابراہیم علیہ السلام کی جائے عبادت واقع ہے جس کے سرچشمہ سے آج بھی ذوق توحید سیراب ہو سکتا ہے۔ پھر اس مرکز عبادت کا مقبول بار گاہ حق ہونا اس آیت بینہ سے آشکارا ہے کہ لق و دق صحرا میں تعمیر ہونے والی اس عمارت کے آس پاس ایک انسانی دنیا آباد ہو گئی ہے اور اس کی طرف لمبے لمبے فاصلے طے کر کے لوگ کھچے چلے آتے ہیں۔ پھر اس کے علو مرتبہ کی روشن دلیل یہ ہے کہ بے آب و گیاہ وادی کے آباد کاروں کے پاس ہر طرح کا رزق از خود پہنچ رہا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عرب کے جنگجو بدوی معاشرے کے طوفانی سمندر میں یہ گھر چار ہزار برس سے ایک جزیرہ امن بنا کھڑا ہے۔ جو کوئی اس کے دائرہ حرمت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے جان' مال اور آبرو کو تحفظ مل جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اس کے سائے میں آکر تلواریں نیام میں کر لیتے ہیں اور جذبات کی باگیں تھام لیتے ہیں۔ قاتل اور ڈاکو اس کی فضا میں سانس لیتے ہی امن پسند شہریوں میں بدل جاتے ہیں۔ سو اس گھر کا حق تھا کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا علم بلند کرنے والی تحریک کا روحانی مرکز قرار پائے۔ اس میں دین یا عقل کے خلاف آخر کون سی بات واقع ہوئی ہے کہ اس پر گلی گلی چہ میگوئیاں کی جا رہی ہیں۔

اس استدلال کا اگر کوئی نتیجہ خیز تھا تو وہ صرف عوام کے لیے تھا' رہے یہود' سو انہوں نے تو تحویل قبلہ کے واقعہ کو مسلمانوں کی طرف سے ایک فیصلہ کن مخالفانہ اقدام قرار دیا جس کی وجہ سے ان کی وہ تمام امیدیں ختم ہو گئیں جو وہ مسلمانوں کے بارے میں دلوں کے اندر باندھے بیٹھے تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ طاقت سستا شکار نہیں ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں پر بھی یہود کی نفسیات کے وہ تمام تاریک گوشے آشکارا ہو گئے جن کے ہوتے ہوئے وہ حسن ظن برقرار نہ رہ سکتا تھا جس کے ساتھ' تعلقات کا آغاز کیا گیا تھا۔ ان کو اندازہ ہو گیا کہ مدینہ میں بھی تحریک کو بس اپنے بل بوتے پر چلنا ہو گا اور مذہب و تقویٰ کے کاروباری اجارہ داروں سے کسی تعاون و حمایت کی امیدیں باندھنا فضول ہے' بلکہ الٹا یہ خطرہ آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا کہ یہود' کفار و مشرکین مکہ سے زیادہ گھناؤنے جذبات کے ساتھ تحریک حق کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے' اس کے باوجود حضورؐ اور آپؐ کے رفقائے تحریک کا طرز عمل داعیانہ اخلاق پر استوار رہا۔ اور جیسے کو تیسا کے اصول پر یہود اور دوسرے مخالفین سے کوئی معاملہ نہیں کیا گیا۔ کج بحثیوں اور طنز و تضحیک اور چھچھورپن پر مسلمان طرح دے جاتے' بات کرنی پڑتی تو مہذب اور معقول طریق سے استدلال کرنے پر اکتفا کرتے اور زیادتیوں پر عالی ظرفی سے صبر کرتے۔

بہرحال اب دلوں میں بھرا ہوا طوفان بند توڑ کر امڈ پڑا۔

بدتمیزیاں اور بیہودگیاں:

جو لوگ خود کوئی تعمیری نصب العین نہیں رکھتے وہ کسی تعمیری کام کو محض اس لیے نہیں ہونے دینا چاہتے کہ اس وجہ سے ان کا کھوکھلا پن دنیا بھر کے سامنے بے نقاب ہونے لگتا ہے۔ یہی صورت یہود کی

تھی' وہ برسوں سے مدینہ کے ماحول پر چھائے ہوئے تھے۔ لیکن کبھی وہ اس قابل نہ ہوئے کہ پستیوں میں گری ہوئی انسانیت کو بلندی کردار پر لا سکیں۔ لوگوں کے ذہنوں کا تزکیہ کر سکیں اور ان کے اخلاق سنوار سکیں۔ اور ان کو نظم اور تہذیب سکھا سکیں' ان کو امن و سلامتی کا کوئی نظام دے سکیں۔ وہ گری ہوئی انسانیت کو تو کیا سہارا دیتے خود اپنے آپ کو سنبھالنے کے قابل نہ تھے۔ دنیا کا ہر روگ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اور وہ اپنے کسی روگ کا درماں کرنے کی سوجھ بوجھ نہ رکھتے تھے۔ اب جب ان کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی طاقت ابھری اور اس نے لوگوں کے دل و دماغ میں زندگی بخش اصول و اعتقاد کے چراغ جلانے شروع کیے' ان کے کردار کے کھنڈروں کو صاف کر کے تعمیر نو کا آغاز کیا' ایک مقدس نصب العین کے سانچے میں ڈھال کر افراد تیار کرنے اور ان افراد کے بل پر ایک نظام امن و عدل کی تاسیس کرنے کی مہم شروع کر دی تو یہود بھنا اٹھے اور اس تعمیری تحریک کو ناکام کرنے کی ہر گھٹیا سے گھٹیا تدبیر اختیار کی۔ اس طرح کی منفی اور تخریبی طاقتیں جب کسی کی مخالفت پر کمربستہ ہوتی ہیں تو شرافت اور معقولیت اور تہذیب کو اٹھا کے بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔ نہایت کمینگی کے ساتھ بدتمیزیاں کرنا ان کی شان تقدس کو گوارا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بدتمیزیوں کا محاذ بھی کھول دیا گیا۔

ان جانشینان انبیاءؑ اور علمبرداران کتاب الٰہی اور مسند نشینان درس و افتاء نے بغض و عناد کے میخانے سے جام کے جام چڑھا کر جن کرتوتوں کا مظاہرہ کیا ان میں سے دو تین مثالیں یادگار رہیں گی۔ مذہب و تقویٰ کے یہ اجارہ دار جب حضورؐ سرور عالم صلی اللہ علیہ و سلم سے ملتے تو "السلام علیک" کہنے کی بجائے زبان کو ذرا گھما کر السلام سے حرف لام کو غائب کر دیتے۔ یعنی "السام علیک" کہا کرتے۔ اس کلمہ کے معنی یہ تھے کہ اے مخاطب! تجھ پر موت وارد ہو۔ یہ سلوک کیا جا رہا تھا اس جلیل القدر ہستی سے جو ابراہیم اور موسیٰ اور یعقوب اور یوسف اور اسحاق اور اسماعیل علیہم السلام ہی کے پیش کردہ پیغام کی تجدید کے لیے سرگرم عمل تھی' جو تورات کی اصلی روح کی تجدید کرنے میں منہمک تھی' جو شریعت الٰہی اور قانون آسمانی ہی کے احیاء کے لیے محو جہاد تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ جو دراصل یہود کے فراموش کردہ فریضہ کو ادا کر رہی تھی۔ اور انہی کا چھوڑا ہوا کام کر رہی تھی۔ ایک مرتبہ یہ تقدس مآبان مدینہ پیغمبر حق کے گھر پر آئے تو غنڈوں اور کمینوں کا سا یہی لغت استعمال کیا۔ اس بدتمیزی پر حضرت عائشہؓ نے پردے کے پیچھے سے سخت رد عمل دکھایا' وہ غصے میں جواب دیئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اور کہہ اٹھیں' کہ کمبختو! تم پر موت وارد ہو"۔ سرور عالم (صلی اللہ علیہ و سلم) کے کان میں یہ آواز پڑ گئی۔ آپؐ نے ام المومنین کو سمجھایا۔ "عائشہ! نرمی سے کام لو"! حضرت عائشہؓ نے عرض کیا۔ "کچھ آپؐ نے سنا بھی کہ انہوں نے کیا کہا تھا"؟ فرمایا: "سنا تو تھا۔ لیکن میں نے بھی "وعلیک" کہہ دیا' یہ ہی کافی ہے"!

بدتمیزی کی دوسری مشہور شرمناک مثالیں جن کا ریکارڈ قرآن نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا' ملاحظہ ہوں:

ایک یہ کہ بزم رسالت میں یہ اجارہ داران تقویٰ رونق افروز ہوتے اور دوران گفتگو میں جہاں کہیں یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ذرا ٹھہریئے ہمیں بات سمجھنے کا موقع دیجئے تو اس موقع پر ایک ذو معنی لفظ استعمال کرتے تھے "راعنا" اس لفظ کا ظاہری مطلب تو وہی تھا کہ ہماری کچھ رعایت فرمایئے۔ ہماری بات سن لیجئے' ہماری جانب توجہ رکھیے۔ مگر دوسری طرف عبرانی زبان میں اس سے ملتا جلتا لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا تھا کہ "سن تو بہرا ہو جائے" علاوہ بریں عربی زبان میں بھی قریبی مادوں سے اس کے ہم صورت الفاظ ایسے موجود تھے۔ جن سے معانی سُو نکلتے تھے۔ مثلاً رَعَنَ۔ رعَنَا سے ایک لفظ تھا "الرّعاع" جس کے معنی تھے۔ "سفلۃ الناس"۔ اس کو رعَاعِنَا کی شکل دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ اسی طرح رَعَن و رَعِن و رَعُنَ میں جاہل اور بے عقل ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ ذرا سا زبان کو اور لچکا کر اسے "راعینا" بھی بنایا جا سکتا تھا۔ اور اس صورت میں معنی ہوتے: "اے ہمارے چرواہے' اے ہمارے گڈریے" ! یہ مختلف صورتیں تھیں جنہیں عظمائے یہود باں ہمہ جبہ و دستار مسسی صورت بنا بنا کر اختیار کرتے تھے۔ عوام بیچارے بھلا لغت و ادب کے اتنے ماہر کہاں ہو سکتے تھے' یہ علمائے گرامی قدر تھے جو گھروں سے خوب تیاری کر کر کے آتے کہ آج کیا کیا بدتمیزیاں کی جانی چاہئیں' ان ہستیوں میں سے کم سے کم ایک' یعنی رفاعہ بن زید بن ثابت کے متعلق تو تاریخ میں واضح روایت محفوظ ہے کہ اخلاق و شرافت کی اس شاندار مثال کے قائم کرنے میں اس یہودی مولوی نے بھی حصہ لیا تھا۔ یعنی ظاہراً دیکھیے تو بڑی شائستگی تھی لیکن دلوں کی گہرائیوں میں اتریے تو اندر غنڈوں کی سی نفسیات کام کر رہی تھیں۔ آپس میں جانتے تھے کہ ہم وقت کی ممتاز شخصیت کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ٹوک دیتا تو ارشاد فرماتے کہ واہ ہمیں تم نے بدتمیز سمجھا ہے' ہم تو ادب و احترام کے ساتھ عرض کر رہے ہیں کہ ذرا ہمیں سمجھنے سمجھانے کا موقع دیجئے۔

دوسری یہ کہ دوران گفتگو میں محسن انسانیت ﷺ کو اکثر یہ جانشینان انبیاءؑ و رسل یوں خطاب کرتے: "اسمع غیر مسمع" اس کا ظاہری مطلب یہ تھا کہ ذرا سنئے۔ آپ کا احترام اس میں مانع ہے کہ آپؐ کو کوئی بات آپؐ کی مرضی یا اجازت کے بغیر سنائی جا سکے۔ لیکن ان کی شرپسندانہ ذہنیت اس سے ایک اور مفہوم مراد لیتی۔ یہ کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تم کو کوئی بات سنائی سمجھائی جائے اور یہ کہ خدا کرے تم بہرے ہو جاؤ' سننے کے قابل ہی نہ رہو۔

یہ گندا ذہن و کردار تھا جو محمد ﷺ کے مقابلے کے لیے اٹھا تھا۔

تیسری یہ کہ اہل ایمان حضورؐ کی مجلس میں بیٹھ کر جب کوئی ارشاد سنتے اور سمجھ لیتے تو ہدایت الٰہی کے تحت جذبہ صادق سے پکار اٹھتے "سمعنا و اطعنا" ہم نے ارشاد کو سن لیا۔ اور ہم نے اس کی اطاعت اختیار کر لی۔ لیکن حاملین تورات ایسے موقع پر بڑی ڈرامائی حرکت کرتے' پہلے زور سے پکارتے "سمعنا" --- "جی ہاں! ہم نے سن لیا ہے"۔ پھر ذرا دھیمی آواز سے زبان کو لچکا کر اطعنا کے بجائے عصینا ---- ہم نے تمہاری بات کو رد کیا۔ نافرمانی کا عزم کر لیا ہے۔ یہاں بھی وہی مشکل کہ کوئی گرفت کرتا تو تیوری چڑھا کر کہتے کہ تم

نے ہم لوگوں کو اتنا نامعقول سمجھ لیا ہے۔ مخالفت کے جوش میں آکر ہم پر ایسی گھٹیا حرکت کا الزام لگاتے ہو' تم میں اپنے سے باہر علماء اور بزرگوں کا احترام باقی نہیں رہا' اپنے علاوہ کسی کو تم شریف اور معقول ماننے پر تیار نہیں ہو؟

غور فرمایئے کہ آخر اس طرح کی ذلیل حرکتوں سے کیا محسن انسانیتؐ کے پیغام میں کیڑے پڑ چلے تھے؟ کیا اس کمینگی کے زور سے اسلامی جماعت کا وجود مٹ چلا تھا؟ گالیاں دینے اور منہ چڑانے سے کسی تعمیری طاقت کا ایک بال بھی بیکا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس میں سارا مزہ صرف اس قدر ہوتا ہے کہ مقابل کی جامد' منفی اور تخریبی طاقت کے دل کا بخار نکل جاتا ہے۔ یہ بزرگ جب بزم نبوت میں اس طرح کے کارنامے انجام دے کر رخصت ہوتے ہوں گے تو اپنی محفلوں میں جا کر فخر کرتے ہوں گے' کہ آج تو جی بس ہم ان ہی صاحب کو یہ اور یہ کہہ آئے۔ مریدوں میں بیٹھ کر اپنی قابلیت کا سکہ جماتے ہوں گے کہ ہم نے لفظوں کے الٹ پھیر سے کیا کیا مطلب نکالے اور چسپاں کیے ہیں اور ہمارے صرف و نحو اور فصاحت و بلاغت کے علم نے اس معرکے میں ہمیں کتنی مدد بہم پہنچائی ہے۔

بزرگان یہود کے ان کارناموں میں عبرت کا درس یہ ہے کہ مذہبی لوگ جب انحطاط کا شکار ہوتے ہیں تو ان میں تحریف کلمات کی گندی بیماری پیدا ہو جاتی ہے' دوسرے ان کے اندر سے انسانیت اور شرافت اور تہذیب کے تقاضوں کا لحاظ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرے ان کی حرکات کے ظاہر و باطن میں شرمناک تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ چوتھے ان میں ایک طرح کی بزدلی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ سیدھے سیدھے طریق سے دل کے گندے جذبات کو اگل بھی نہیں سکتے' بلکہ اپنی بدطینتی پر شرافت کی جھلیاں چڑھا چڑھا کر لاتے ہیں۔ یہ ایسی علامات ہیں جو کسی ذہن و فکر کے فاسد ہونے کی قطعی دلیل ہوتی ہیں۔ علی الخصوص بدزبانی اور بازاری انداز خطاب جہاں بھی پایا جائے وہاں حق اور انصاف اور سچائی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ سکتا۔ آدمی کا ہر ہر بول اور اس کا انداز گفتگو اس کی سیرت کا اسی طرح ترجمان ہوتا ہے جس طرح کھانے کی کسی دیگ میں سے اس کی خوشبو پھیل کر دور دور تک کھانے کی نوعیت اور اس کے مسالوں کے معیار کا اعلان کر دیتی ہے۔ اب اگر کسی دل و دماغ کی دیگ سے بدزبانی اور بدتمیزی کی سڑانڈ اٹھ رہی ہو تو کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے اندر پاکیزہ خیالات اور شریفانہ جذبات سے ترکیب پا کر کوئی اعلیٰ سیرت پک رہی ہو گی۔ جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ اختلاف کرنے والوں کے خلاف بدزبانی اور بدتمیزی کی سطح پر اتر آیا ہے تو سمجھو کہ یہ اس کے مقابلے میں دلیل کی بازی بھی ہر چکا اور اخلاق کے مقابلے میں بھی شکست کھا چکا۔ اب یہ ہرا ہوا کھلاڑی محض دل کا بخار نکال رہا ہے اور دل کا بخار نکالنے والی طاقتیں تاریخ میں کوئی اثر نہیں پا سکتیں' وہ بس دل کا بخار نکالتی رہتی ہیں اور تعمیری دعوتوں کے قافلے گام بہ گام آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اتنے ہی پر بس نہیں ہو جاتی' مدینہ میں جب اذان کی ابتداء ہوئی تو چونکہ یہود کے روایتی مسلک کے

خلاف یہ بھی نظام مذہب میں ایک بدعت تھی' لہٰذا وہ اس پر بھی بڑا پیچ و تاب کھاتے۔ خصوصاً وہ دیکھ رہے تھے کہ اذان کے کلمات اسلام کی پوری انقلابی دعوت اور اس کے بنیادی نظریے کو جامعیت سے سامنے لے آتے ہیں اور دن میں پانچ مرتبہ ان کا پکارا جانا ـــــ اور اونچی اور خوش آہنگ آواز میں پکارا جانا ـــــ ایک موثر ذریعہ نشر و اشاعت ہے۔ یہ آواز ان کی عورتوں' ان کے بچوں اور ان کے غلاموں کے کانوں میں پڑتی' ہر روز پڑتی اور پانچ پانچ بار پڑتی۔ تصور کیجیے کہ جب یہ انوکھی آواز بلالی سوز و ساز کے ساتھ گونجی ہو گی تو مدینہ کی ساری فضا میں سناٹا چھا جاتا ہو گا۔ اپنوں پرایوں کے دل متوجہ ہو جاتے ہوں گے۔ خصوصاً ان کو وہ فرق محسوس ہوتا ہو گا جو گھنٹے اور ناقوس بجانے اور اذان پکارنے میں تھا۔ اور جس کے بارے میں خود ان کے عوام بھی کچھ نہ کچھ احساس کرتے ہوں گے۔ گھنٹے اور ناقوس کی آواز بس آواز تھی' اس میں نہ لفظ تھے نہ معنی تھے' بخلاف اس کے اذان کی آواز چند بولوں اور چند کلموں پر مشتمل تھی جن میں عام فہم معانی موجزن تھے۔ گھنٹے اور ناقوس کی آواز میں انسانی جذبات کا اظہار نہیں تھا۔ لیکن اذان کی پکار میں انسانی قلب کا سوز و گداز کار فرما ہوتا تھا۔ اس فرق کو محسوس کر کے یہود بجائے اس کے کہ یہ اعتراف کر لیتے کہ اذان فی الواقع عبادت کی دعوت دینے کا بہتر اور موثر ذریعہ ہے اور اس کے کلمات قدر و قیمت رکھتے ہیں' وہ چڑ میں مبتلا ہو گئے۔ اپنی مجلسوں میں' صحبتوں میں' وہ اذان پکارنے والے کی آواز کو عجیب و غریب تشبیہیں دیتے۔ وہ نقلیں اتارتے اور اذان کے کلمات کو بگاڑ بگاڑ کر سامان تضحیک پیدا کرتے۔ حسد اور کینہ ان مذہب داروں کو بھانڈوں کی سطح تک جا گراتا تھا۔ مگر جو کام اذان کر رہی تھی' اس کی روک تھام تضحیک اور نقالی اور بھانڈ پن سے کیسے ہو سکتی تھی۔

بدتمیزیوں کی آخری حد یہ تھی کہ خود اللہ میاں کو بھی (نعوذ باللہ) نشانہ بنا لیا گیا۔ مثلاً جب یہ آیت اتری کہ "من ذالذی یقرض اللہ قرضا حسنا"۔ یعنی کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے' تو بجائے اس کے کہ اس کے سیدھے صاف مفہوم کو اخذ کیا جاتا' یہود نے یہ کہہ کر مذاق اڑانا شروع کیا' لوگو! سنتے ہو' اب تو اللہ میاں بھی قلاش ہو گئے ہیں' لو اب وہ بندوں سے قرض مانگنے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا سے بے خوفی اور بے شرمی کی اس سے زیادہ ناپاک مثالیں کم ملتی ہیں۔

اسی طرح قرآن میں جہاں مکھی اور مچھر یا ایسی ہی بظاہر حقیر چیزوں کا بطور مثال تذکرہ ہوا ہے اور ان کے وجود سے کوئی استدلال کیا گیا ہے' وہاں یہ لوگ طنز و تحقیر کا طوفان مچانے کا موقع پا لیتے۔ کہتے کہ ان مسلمانوں کا خدا بھی عجیب ہے کہ جسے مثال دینے کے لیے بھی ملتی ہیں تو ایسی حقیر چیزیں ملتی ہیں۔ اس استہزاء میں یہ استدلال بھی شامل ہوتا کہ قرآن خدا کا کلام کیسے ہو سکتا ہے۔ جب کہ اس کے اندر ان گھٹیا چیزوں کا تذکرہ ہے۔ ان لوگوں کو کیا خوب جواب ملا کہ:

"ہاں! اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیل دے۔ جو لوگ حق بات کے قبول کرنے والے ہیں وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق

ہے' جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے' اور جو ماننے والے نہیں ہیں وہ انہیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟" (بقرہ: ۲۶)

مضحکہ انگیز مطالبہ:

یہود کی بد تمیزی طلب حجت کی شکل اختیار کر کے ایک عجیب مضحکہ انگیز مطالبہ بن گئی۔ حضور سے کہنے لگے۔ "لو لا یکلمنا اللہ" (بقرہ: ۱۱۷) آخر یہ کیا جھمیلا ہے کہ خدا تمہاری طرف ایک فرشتہ درپردہ بھیجتا ہے اور بالا بالا ہی تم تک اپنی بات پہنچا دیتا ہے۔ کیوں نہیں وہ سامنے آکر ہم سے براہ راست بات کرتا کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ وہ زمین پر اترے' آنکھوں سے دکھائی دے اور ہم سے رو در رو کہے کہ یہ اور یہ میرے احکام ہیں ان کو مانو اور یہ شخص میرا پیغمبر ہے اس کا دامن تھام کر چلو۔ یہ نہیں تو کم سے کم اتنا ہی کرے کہ کوئی صریح اور قاطع نشانی بھیج دے جس کے بعد کسی کو مجال انکار نہ رہے کہ تم اس کے نبی ہو اور قرآن اس کا کلام ہے۔

یہ قاطع نشانی بھی انہوں نے متعین صورت میں بتا دی جو ان کو مطمئن کر سکتی تھی' تاریخ و سیرت کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ یہود کے حلقوں میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ دیر تک اس کا چرچا رہا اور بار بار یہ آپؐ کے سامنے دوہرایا گیا۔

پہلے سنئے کہ یہ مضحکہ انگیز مطالبہ پیدا کیونکر ہوا۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ مدینہ کے یہود حضورؐ کی بعثت سے قبل اوس و خزرج کو زک دینے کے منصوبے بنا بنا کر' آنے والے نبی کی فوری آمد کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ جب حضورؐ کی نبوت کا آفتاب طلوع ہو گیا تو یکایک انہوں نے پینترا بدل لیا اور انکار اور سرکشی کے مورچوں پر ڈٹ گئے۔ ان کی اس قلب ماہیت پر عام لوگوں میں عجیب ہی حالت استفہام پیدا ہو گئی۔ لوگ آ آکر ان سے پوچھتے کہ یہ قصہ کیا ہے کہ پہلے آپ ہی حضرات یہ یہ دعائیں مانگتے تھے' اور ایک نبی کی آمد کا مژدہ سناتے تھے۔ اور اب آپ خود ہی آنے والے کی آمد پر بگڑ بیٹھے ہیں۔ خصوصاً ایک مجلس میں معاذ بن جبل اور بشر بن براء بن معرور جیسے ذہین اکابر نے یہودی بزرگوں سے صاف صاف کہا کہ "اے گروہ یہود! اللہ سے ڈرو اور سر تسلیم خم کر دو' کیونکہ تم ہمارے خلاف تائید حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے خود ہی بعثت محمدؐ کی آرزوئیں کیا کرتے تھے اور ہمارا حال یہ تھا کہ ہم اہل شرک تھے اور تم ہی ہمیں یہ خبر سنایا کرتے تھے کہ وہ مبعوث ہو چکا ہے اور پھر تم اس کے اوصاف ہمارے سامنے گنوایا کرتے تھے"۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسی گفتگوؤں میں کس بری طرح یہودی ذہن کا پول کھل جاتا ہو گا۔ اور وہ خود محسوس کر لیتے ہوں گے کہ ہمارے متعلق مخاطبین کی رائے کیا ہے۔ اپنی شان دیانت و تقویٰ کے بچاؤ کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ ایک نہ ایک ڈھال فراہم کرتے۔ وہ ڈھال تھی کیا؟ اسے معلوم کرنے کے لیے اوپر کی بات کا جواب سنئے جو بنی نضیر کے ایک بزرگ سلام ابن مشکم کی زبان مبارک سے صادر ہوا۔ فرماتے ہیں: "محمدؐ

(صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھ کوئی ایسی نشانی نہیں لایا' جس کے ذریعے ہم اسے بہ حیثیت نبی کے پہچان سکتے' لہٰذا یہ وہ شخص نہیں ہے جس کے بارے میں ہم تم سے تذکرہ کیا کرتے تھے" ❶ یہی بات ابن صلوبا فطیونی نے خود محسن انسانیت ﷺ سے براہ راست بھی کر دی تھی۔ یعنی ایک فیصلہ کن نشانی چاہیے تھی اور اس کا تعین کرنا یہود کا کام تھا۔ وہ جیسی نشانی کا بھی چاہیں مطالبہ کریں۔ اسی طرح لوگوں کی طرف سے اس میثاق کا سوال اٹھایا گیا جو نبی آخر الزماں کے بارے میں سابق انبیاء سے انہوں نے استوار کیا تھا تو اس پر بھی ان لوگوں نے آئیں بائیں شائیں کر دی۔ مالک بن الصیف نے ایک بار صاف صاف کہہ دیا کہ "خدا کی قسم! محمدؐ کے بارے میں ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا"۔ ❷

ان کے لیے قرآن کے پاکیزہ کلام اور ہل چل مچا دینے والے استدلال میں کوئی نشانی نہ تھی' محسنؐ انسانیتؐ کے کردار میں کوئی نشانی نہ تھی' زندگی کا نقشہ بدلنے والی تحریک کی لہروں میں کوئی نشانی نہ تھی۔ علمبرداران حق کی پروان چڑھتی ہوئی جماعت میں کوئی نشانی نہ تھی' ان قربانیوں اور جانبازیوں میں کوئی نشانی نہ تھی جو مٹھی بھر مسلمان ظلم و تشدد کے ہتھیاروں سے کام لینے والی با اثر طاقتوں کے مقابلے میں دکھا رہے تھے۔ ان کو تو بس کوئی عجوبہ اور کوئی تماشہ چاہیے تھا۔

اب سنئے کہ کس نشانی کا مطالبہ تھا!

رافع بن حریملہ اور وہب بن زید حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ باتیں ہوئیں۔ کہنے لگے کہ:

"اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے سامنے لکھی لکھائی کتاب لاؤ جسے آسمان سے ہمارے اوپر اترواؤ اور ہم اسے بطور خود پڑھیں اور ہمارے سامنے چشمے جاری کر دو' پھر ہم تمہارے پیچھے چلیں گے اور تمہاری صداقت کی گواہی دیں گے۔" ❸

اسی رافع بن حریملہ نے یہ تقاضا بھی کیا کہ "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تم اللہ کے رسول ہو جیسے کہ تم خود کہتے ہو تو اللہ میاں سے یہ کہو کہ وہ ہم سے بات کرے' یہاں تک کہ ہم اس کی بات خود سن لیں"۔ ❹

ایک اور مجلس میں فنحاص' عبداللہ بن صبوریا ابن صلوبا' کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق' اشیع' کعب بن اسد' شمویل بن زید اور جبل بن عمرو بن سکینہ جیسے بزرگان یہود حضور سرور عالم سے گفتگو کر رہے تھے۔

---

❶ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۲۔۱۷۳

❷ ایضا

❸ ایضا

❹ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۲۔۱۷۳

کہنے لگے "اے محمد! (صلی اللہ علیہ و سلم) کیا واقعی یہ قرآن تمہیں کوئی جن یا کوئی انسان نہیں سکھاتا؟" رسول خدا نے فرمایا: "تم خوب سمجھتے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور یہ کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ تم اس حقیقت کو اپنے ہاں تورات میں مرقوم دیکھتے ہو"۔ اس پر وہ کہنے لگے: "اے محمد! (صلی اللہ علیہ و سلم) پھر حقیقت یہ ہے کہ جب خدا اپنے کسی رسول کو برپا کر دیتا ہے تو پھر جو کچھ بھی رسول چاہے' خدا اس کے لیے وہی کچھ کر دیتا ہے اور رسول جس بات کا بھی ارادہ کرے خدا کی طرف سے وہی کچھ کر دکھانے کا اختیار پالیتا ہے۔ سو تم آسمان سے ہمارے اوپر لکھی ہوئی کتاب کو اتروادو جسے ہم پڑھیں اور پہچانیں۔ [1]

یہود نے بڑی کارگر ڈھال تلاش کر لی۔ اب کوئی سوال نہ رہا اس کا کہ داعی حق کی دعوت کیا ہے؟ وہ کیا بات کہتا ہے؟ اس کے لیے دلائل کیا رکھتا ہے؟ اس کی دعوت کے اثر سے کیسی زندگی بنتی ہے؟ اس کی تعلیم و تربیت سے کس نوعیت کی سیرت پروان چڑھتی ہے؟ اس کے تعمیری کام سے کیسا نظام تمدن بنتا ہے؟ یہ سارے سوالات پیچھے چلے گئے اور سامنے یہ مطالبہ آگیا کہ "آسمان سے کتاب اتار کے دکھاؤ۔" اب لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے ایک ذریعہ ہاتھ آگیا۔ جس نے بات چھیڑی اس سے کہہ دیا کہ ہم تو ماننے کو تیار بیٹھے ہیں' لیکن ان سے جا کر کہو کہ وہ نبی برحق ہیں تو اللہ میاں سے کہہ کر ذرا یہ ایک نشانی دکھا دیں۔ اللہ والوں کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں اوپر سے منوا لیتے ہیں' پھر وہ کیسا رسول ہے جس کی بات عالم بالا میں درخور اعتنا نہیں ہے۔ لوگو' چھوڑو ان انتشار انگیز باتوں کو' جاؤ کسی اللہ والے کا دامن تھام لو۔ یہ تو بس یونہی ڈھکوسلہ ہے۔

یہود کا شاخسانہ طرز عمل:

یہ تو معلوم عام حقیقت ہے کہ مدینہ کے محدود ذرائع و وسائل پر جب مہاجرین کی روز افزوں آبادی کا بار پڑنے لگا اور بے سرمایہ و بے سہارا لوگ اپنی معاشی زندگی کی تعمیر نو میں آکر لگے تو تحریک کے بیشتر کارکنوں پر عالم فقر و فاقہ چھا گیا۔ اس امتحان فقر و فاقہ میں خود تحریک کا لیڈر اور اس کے گھر کے لوگ سب عام ساتھیوں کے برابر کے شریک تھے' بلکہ آزمائش میں سے زیادہ حصہ اسی محسن انسانیت کو ملا۔ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی' فقر و فاقہ کی صبر آزمائیوں کو مہاجرین کی بیماری نے دوگنا کر دیا۔ نئی آب و ہوا باہر سے آنے والوں کو راس نہ آئی اور یکے بعد دیگرے سچائی کے نظام کے سپاہی بیمار ہونے لگے۔ بخار کی ایک وبا پھیل گئی اور یہ بخار بڑا ہٹیلا اور موذی ثابت ہوا۔ ناقص غذا کے ساتھ اس نئی بلا نے جس کو نشانہ بنایا اس کو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کے چھوڑا۔ لوگ معاشی تگ و دو کے قابل نہ رہے۔ ایک طرف تحریک کا سفینہ مشکلات اور مخالفتوں کے نت نئے گردابوں سے دوچار تھا۔ نوخیز اسلامی ریاست ہر پہلو سے محتاج تعمیر تھی'

---

[1] ایضاً۔ ص ۲۰۱

اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے طرح طرح کے خطرات تھے' افراد کار صاحب فراش ہو رہے تھے اور پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑے کا پورا پورا انتظام نہ تھا۔ اس مرحلے کو چھوٹی سی انقلابی پارٹی نے جس طاقت کے بل پر پار کیا' وہ ایمان باللہ' مقصد کی محبت اور باہمی جذبہ اخوت کی طاقت تھی۔ دراصل بڑے بڑے تاریخی کارنامے انجام دینے والے افراد اور تنظیموں کی مرکزی طاقت ہوتی ہی ہے ایمان اور اخوت! اسی طاقت نے نحیفوں کو قوی بنائے رکھا اور اسی طاقت نے ذرائع و وسائل کی کمی کے اثرات کو کم سے کمتر کر دیا۔ تاہم ناسازگار حالات کے خلاف جو کچھ جد و جہد ہو رہی تھی' اسے وبائے عام نے بہت کمزور کر دیا اور اس دوران میں یہ چرچا بھی ہونے لگا کہ مدینہ کے یہودیوں نے جادو کر دیا ہے اور اب مسلمان پنپ نہیں سکیں گے۔ حالات کیسے سنگین تھے' آیئے' اس کا اندازہ کرنے کے لیے محسن انسانیت کے چند رفقائے کار سے ملیئے۔

یہ دیکھیے' سیدنا حضرت ابوبکرؓ ہیں۔ بستر مرض پر مارے کرب کے تڑپ رہے ہیں اور ایک شعر میں اپنے دلی اضطراب کا اظہار کر رہے ہیں:

کل امری مصبح فی اهله   والموت ادنی من شراک نعله

حالت یہ ہے کہ اپنے لیے موت کو جوتی کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب پا رہے ہیں۔

اور ادھر ملاحظہ فرمایئے' یہ سیدنا بلالؓ ہیں۔ کروٹیں لے رہے ہیں اور درد بھری لے میں الاپ رہے ہیں:

الا لیت شعری هل ابیتن لیلة   بواد و حولی اذخر و جلیل

وهل اردن یوما میاه مجنة   وهل یبدون لی شامة و طفیل

یہ مکہ کی وادیوں اور چشموں اور پہاڑیوں کی یاد تازہ کی جا رہی ہے۔ اس وادی میں ایک رات گزار لینے کی حسرت کا اظہار ہے جس میں اذخر اور جلیل نام کی گھاسیں اگتی ہیں اور ہاں' مجنہ کے چشمے کا پانی پینے اور شامہ اور طفیل نامی پہاڑیوں کا منظر دیکھنے کے ارمان ابلے چلے آ رہے ہیں۔

اور آیئے۔ ملاحظہ فرمایئے' یہ عامرؓ ہیں۔ لبوں پر کیا ہی بے تاب کن شعر رقصاں ہے۔

انی وجدت الموت قبل ذوقه   ان الجبان حتفه من فوقه

ان کے ابتلائے بدن کا عالم یہ ہے کہ موت کے آنے سے پہلے موت کی آہٹ سن رہے ہیں۔

پھر یہ ہیں حضرت شدادؓ' رسول اللہ اپنے اس رفیق کی عیادت کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ مریض بے قرار رہتا ہے کہ اگر بطحان کا پانی پی لیتا تو اچھا ہوتا۔ رسولؐ فرماتے ہیں کہ "چلے جاؤ کون روکتا ہے۔" مریض کہتا ہے "ہجرت"! رسولؐ تسلی کے لیے فرماتے ہیں کہ "چلے جاؤ تم جہاں بھی ہو گے' مہاجر ہی رہو گے"۔

صلح حدیبیہ پر جب مسلمان مکہ گئے تو ان کے بدن بار بار کی علالتوں نے ایسے چور چور کر دیئے ہوئے تھے کہ اہل مکہ کی طرف سے طعنے دیئے گئے "اور جاؤ نا مدینہ" انہی طعنوں کا رد عمل تھا کہ رسول اللہ کے

ارشاد کے تحت مسلمان اکڑ اکڑ کر چلتے تھے۔

انہی حالات کی بناء پر حضورؐ فرماتے تھے کہ "ان شان الهجرة لشديد"۔ یعنی ہجرت کا معاملہ بڑا سنگین ہے' کوئی کھیل نہیں! اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک بدو نے آ کر سرور عالمؐ کے ہاتھ پر بیعت کی' لیکن مدینہ آتے ہی بخار نے آلیا۔ اس نے اس کو اسلام کی بدشگونی قرار دیا اور اصرار کر کے بیعت ختم کرائی اور چلا گیا۔ اس واقعہ پر حضورؐ نے فرمایا کہ مدینہ سنار کی بھٹی کی مانند ہے کہ کھوٹ میل کو الگ دیتی ہے اور زر خالص کو الگ کر لیتی ہے (بخاری) یعنی تحریکوں کے کار عظیم کے لیے جو لوگ اٹھتے ہیں ان کو قدم قدم پر ایسے مراحل ابتلا پیش آتے ہیں کہ جن کو پار وہی کرتا ہے جس کے پاس ایمان کا زر کامل عیار موجود ہو' کھوٹا مال کسی نہ کسی مرحلے میں الگ ہو جاتا ہے۔ سو مدینہ کا یہ مرحلۂ ابتلاء سنار کی بھٹی کا سا کام کر رہا تھا۔ ❶

یہی دور تھا جب کہ حضور سرور عالمؐ نے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کی کہ "اے اللہ! ہمارے لیے مدینہ کو ویسا ہی دلکش بنا دے جیسے مکہ کو بنایا تھا' یا اس سے بھی زیادہ۔ اور ہمارے لیے اس کے پیمانوں (یعنی غلے اور پیداوار) میں برکت عطا فرما۔ اور اس پر آئی ہوئی وبا کو جحفہ (میقات اہل شام) کی جانب منتقل کر دے۔ ❷

دوسری طرف عالم فقر و فاقہ کی کیفیت حد درجہ تشویش ناک تھی' نئی جگہ آ کر معاشی زندگی کی نیو ڈالنا اور پھر اس میں کسب حلال کا اہتمام کرنا اور وہ بھی اس عالم میں جب کہ ایک تحریک لمحہ لمحہ انفاق مال کے مطالبات لیے سامنے کھڑی ہو' ایسے حالات میں جو ابتلاء پیش آسکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ علمبرداران حق پر جو کچھ گزری اس کی دردناک روداد سے تاریخ' سیرت اور احادیث کے ذخائر بھرے پڑے ہیں۔

حضرت ابو طلحہؓ اس دور ابتلاء کا حال یوں بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ بھوک کی مصیبت میں گھل گھل کر جب تنگ آگئے تو سہارا حاصل کرنے کے لیے سرور عالم صلی اللہ علیہ و سلم کی خدمت میں پہنچے' حال بیان کیا اور پیٹ کھول کر دکھائے کہ کئی روز کے فاقے کی وجہ سے (معدے میں ہونے والی ایک خاص جلن کو روکنے کے لیے) پتھر باندھ رکھے تھے۔ اس پر تاریخ کی اس عظیم ترین شخصیت نے اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ ایک نہیں دو پتھر بندھے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر اپنا دکھڑا بیان کرنے والوں کی تسلی ہو گئی۔ ❸

ایک مرتبہ اسی حال میں حضرت ابو بکرؓ بے وقت آئے اور چاہا کہ تسکین حاصل کرنے کے لیے اپنی

---

❶ اسوہ صحابہ از مولانا عبدالسلام ندوی ص ۳۳-۳۲۔ و سیرت ابن ہشام۔ ج۔ ۲۔ ص ۲۲۲' ۲۲۱

❷ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۳۱

❸ شمائل ترمذی باب ما جاء فی عیش النبی صلی اللہ علیہ و سلم

تکلیف بیان کریں، مگر پھر خیال ہوا کہ اس سے قائدِ اسلام کو خواہ مخواہ مزید پریشانی ہو گی۔ تھوڑی دیر میں حضرت عمرؓ بھی آ پہنچے۔ وہ بھی اسی امتحان کا شکار تھے۔ باعث آمد پوچھا گیا۔ تو انہوں نے صاف صاف عرض کیا کہ بھوک کے مارے بے تاب ہوں۔ حضورؐ نے یہ سنا تو فرمایا کہ میرا بھی حال کچھ ایسا ہی ہے۔ طے پایا کے اپنے رفیق مقصد ابوالہیثم کے ہاں چلیں۔ ابوالہیثم باغات کے مالک اور خوشحال تھے۔ تینوں اپنے رفیق کے ہاں پہنچے تو وہ بے چارے خادم نہ ہونے کے سبب خود ہی پانی لینے گئے ہوئے تھے۔ آئے تو فرط مسرت سے لپٹ گئے اور باغ میں لے جا کر دستر خوان بچھایا۔ اور کھجوریں توڑ کر حاضر کیں۔ کھجوریں کھا کر ان فاقہ کشانِ راہِ حق نے ٹھنڈا پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کرتے، اور ابو الہیثم کے لیے دعائے خیر کرتے واپس ہوئے۔ ❶

سعد بن ابی وقاص نے ایک موقع پر بیان کیا کہ تحریکِ محمدیؐ کا میں ہی وہ رکن ہوں جس کے ہاتھ سے ایک دشمنِ حق کا پہلا خون گرا، میں ہی ہوں جس نے جہاد میں اولین تیر پھینکا۔ ہم لوگوں نے ایسی حالت میں جہاد کیا ہے کہ ہم درختوں کے پتے اور کیکر کی پھلیاں کھایا کرتے تھے اور اس وجہ سے منہ کے کنارے زخمی ہو جاتے تھے اور اجابت اونٹوں اور بکریوں کی مینگنیوں کی شکل اختیار کر جاتی تھی۔ ❷

حضورؐ کے رفیقِ خاص حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ "ایک زمانہ تھا کہ جب میں منبرِ نبویؐ اور حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے درمیان بھوک اور فاقہ کی شدت کے مارے بے ہوش پڑا رہتا اور لوگ مجھ کو جنون زدہ سمجھ کر (بطور علاج) پاؤں سے میری گردن دباتے تھے" حالانکہ مجھے جنون نہیں ہوتا تھا، وہ محض بھوک کا عالم ہوتا تھا۔" ❸ حضرت ابوہریرہؓ ہی کا بیان کردہ ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ آپ حضرت عمرؓ کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ اور کسی آیت کا مفہوم زیرِ بحث تھا، باتیں کرتے کرتے اور ساتھ چلتے چلتے یکایک حضرت ابوہریرہؓ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ فاقہ کشی نے نوبت یہاں تک پہنچا دی تھی۔

اس عالم میں حضورؐ اگرچہ بیت المال میں آنے والی دولت کو ساتھ کے ساتھ رفقاء کو سنبھالنے کے لیے صرف کرتے جاتے تھے مگر دائرۂ صَرف اتنا وسیع تھا کہ بیت المال کی آمدنیاں اور انصار اور خوشحال مہاجرین کے فراخدلانہ انفرادی صدقات بدرجہ ادنیٰ بھی کافی نہ ہوتے تھے۔ عام فاقہ زدہ مہاجرین کے ساتھ ساتھ اصحاب صفہ کا مستقل دارالاقامہ ضرورت مند تھا، مہمان آتے تھے، بدوی لوگ وقتاً فوقتاً اسلام لانے، زیارت کرنے اور احکام معلوم کرنے آتے، سائل آ آ کر سوال کرتے، اور مسلسل نئے مہاجرین کی آمد رہتی۔ ان حالات میں بیت المال بیچارہ بھی کیا کر سکتا تھا۔ جب رفقاء اور اہل حاجت کی ضروریات کا دباؤ

---

❶ ایضاً

❷ ایضاً یہ واقعہ ذرا بعد کے دور سے متعلق ہے لیکن اس سے مدینہ میں پیش آمدہ معاشی ابتلاء کا عمومی اندازہ ہوتا ہے۔

❸ شمائل ترمذی۔ ماجاء فی عیش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

شدید ہوتا تھا' قائد تحریکؐ یا تو اعانت کے لیے اپیل کر دیتے اور لوگ جذبہ صادق سے اپنا مال نچوڑ دیتے' یا پھر قرض لینا پڑتا۔ قرض اپنی جماعت کے اندر سے کچھ زیادہ مل نہ سکتا تھا۔ لہٰذا یہودی مالداروں کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ یہودیوں کا حال یہ تھا کہ یہ لوگ پکے مہاجن اور سود خوار تھے اور ان کے سودی جال تمام علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) اور آپؐ کے ساتھیوں کو وہ جس غرض سے قرض دیتے تھے وہ سود سے زیادہ بڑی چیز تھی' وہ یہ تھی کہ روپے اور احسان داری کے زور سے ان پر قابو پایا جائے اور اس ذہنیت کے ساتھ وہ قرض خواہی میں بالکل شائیلاکی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے اور توہین و تذلیل پر اتر آتے' یہی حال مشرکین کا تھا۔ اس تلخ تجربے سے خود سرور عالم کو بھی گزرنا پڑا اور آپؐ کے ساتھیوں کو بھی۔ بہت سارے واقعات سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ آہ! دنیا کی بھلائی کے لیے زندگیوں کی بازی لگا دینے والوں نے یہ سب کچھ بھی بھگتا۔ مگر اس مفلوک الحالی پر بھی اپنے ایمان اور مقصد کے بارے میں تحریک کے سپاہیوں میں کوئی تزلزل نہیں آیا۔

محسن انسانیتؐ نے اپنے قریبی رفیق اور ذاتی نائب حضرت بلالؓ کو حکم دے رکھا تھا کہ تحریک اور اس کے سپاہیوں کی ضرورت پر وہ آمدنیوں کو بے دریغ صرف کریں۔ حضرت بلالؓ اسی طریق کار پر کاربند رہتے تھے۔ ایک مرتبہ نوے ہزار درہم کی رقم آئی اور ایک بوریے پر ڈھیر لگا دی گئی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے سرور عالم ﷺ نے اسے ضرورت مندوں میں تقسیم کرا دیا۔ اور ایک حبہ باقی نہ رہا۔ تقسیم ہو چکنے کے بعد ایک سائل آ گیا۔ تو اس کے لیے قرض لینے کا حکم دیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ کسی موقع پر سیدنا بلالؓ کے سامنے کھجوروں کا ایک ڈھیر لگا پڑا تھا۔ حضورؐ نے دریافت کیا یہ کیسا مال ہے؟ سیدنا بلالؓ نے عرض کیا کہ اسے مستقبل کی نادیدہ ضرورتوں کے لیے روک رکھنے کا ارادہ ہے۔ فرمایا "کیا تم نچنت ہو گئے ہو کہ کل قیامت کے دن کہیں اس مال کو یوں روک رکھنے کے بدلے جہنم کا دھواں تم تک پہنچے۔ خرچ کرو۔ اے بلالؓ! اور تخت اقتدار کے مالک کی طرف سے کسی طرح کا اندیشہ نہ کرو"۔ حضرت بلالؓ ہی کا بیان ہے کہ مدینہ کا ایک مشرک ان کے پاس آیا۔ اور خود پیش کش کی کہ میرے پاس وافر مال موجود ہے۔ جب ضرورت ہو مجھ سے لے لیا کریں۔ چنانچہ حضرت بلالؓ نے قرض لینا شروع کر دیا۔ یکایک ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت بلالؓ وضو کر کے اذان کہنے کی تیاری میں تھے کہ وہ مہاجن اپنے ساتھ کچھ اور کاروباریوں کو لیے ہوئے آیا اور چلایا کہ "او حبشی"! حضرت بلالؓ اس کے پاس گئے۔ وہ بہت گرم ہوا اور برا بھلا کہنے لگا اور انتباہ دیا کہ "مہینہ ختم ہونے کو ہے' اگر قرضہ وقت پر ادا نہ کیا تو (عرب کے جاہلی طریقے کے مطابق) تم کو غلام بنا لوں گا۔ اور تمہارا وہی حال ہو گا جو پہلے تھا"۔ حضرت بلالؓ بیان کرتے ہیں کہ اس فضیحتے سے مجھ پر وہی کچھ گزری جو ایسے عالم میں ہر شریف آدمی پر گزرتی ہے۔ سیدنا بلالؓ عشاء کی نماز کے بعد اپنا دکھڑا سنانے نبی اکرمؐ کی خدمت میں پہنچے اور ادائیگی کی کوئی تدبیر نہ پا کر روپوش ہو جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ جب قرض ادا کرنے کا کچھ انتظام ہو جائے گا تو میں واپس آ جاؤں گا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ حضرت بلالؓ

اپنے ارادے کو عمل میں لاتے' اگلی ہی صبح نبی اکرمؐ کی طرف سے بلاوا آیا۔ حاضر ہوئے تو دیکھا کہ حاکم فدک کی طرف سے سامان سے لدی ہوئی چار اونٹنیاں ہدیۃً کھڑی ہیں۔ قرض خواہ کو بلا کر حساب بے باق کر دیا گیا۔ اور بقیہ مال حسب معمول مستحقین میں تقسیم کر دیا گیا۔

اسلامی تحریک کے ایک سپاہی ابو حدرد اسلمیؓ ایک یہودی کے مقروض ہو گئے لیکن ادائیگی کے لیے وہ بجز تن کے کپڑوں کے اور کوئی چیز نہ رکھتے تھے۔ ابو حدرد نے یہودی سے مزید مہلت طلب کی۔ لیکن اس کی شائیلاکی ذرا بھی مہلت دینے پر تیار نہ تھی۔ وہ ابو حدردؓ کو پکڑ کر آنحضورؐ کے سامنے لے آیا اور اپنا مطالبہ پیش کیا۔ حضورؐ نے ابو حدردؓ کو ادائیگی کے لیے کہا۔ انہوں نے اپنے حالات سامنے رکھ کر عذر کیا۔ لیکن یہودی قرض خواہ کی غیر انسانی ذہنیت کے پیش نظر آپؐ نے اصرار کیا کہ جیسے بن پڑے ادائیگی کرو۔ انہوں نے پھر گزارش کی کہ غزوہ خیبر سامنے ہے۔ شاید وہاں سے لوٹ کر آنے پر کوئی صورت حل نکل آئے۔ حضورؐ نے پھر بہ شدت اس بلا سے نجات پانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ یہودی ابو حدرد کا تہ بند لے کر ٹلا اور اس مرد حق کو اپنا عمامہ اتار کر کمر سے لپیٹنا پڑا۔ ذرا قرضہ کی رقم کی مقدار کا اندازہ کیجئے۔ اور اس پر یہودی قرض خواہ کا اصرار دیکھئے اور پھر اس ظالمانہ وصولی کا تصور کیجئے کہ اپنے مقروض کے تن کا کپڑا اتروا کے دم لیا۔ [1]

حضرت جابرؓ بن عبداللہ اسلامی تحریک کی ایک اور بزرگ ترین ہستی ہیں۔ یہ مدینہ کے رہنے والے تھے اور خاصے خوشحال تھے۔ پھر بھی حالات و ضروریات کے تحت ایک یہودی مہاجن سے وقتاً فوقتاً قرض لینے پر مجبور ہو جاتے۔ ایک سال اتفاق سے کھجوروں پر پوری طرح پھل نہ آیا اور قرضہ وقت پر ادا نہ ہو سکا۔ یہودی مہاجن سے بہ مشکل اگلی فصل تک کے لیے مہلت مانگی۔ اگلی مرتبہ پھر فصل خراب ہوئی۔ مزید مہلت دینے سے مہاجن نے انکار کر دیا۔ آخر جابرؓ بھی اپنی رام کہانی سنانے اپنے آقا کی خدمت میں پہنچے۔ حضورؐ چند رفقاء کو ساتھ لے کر یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور اس سے اپیل کی کہ وہ جابر کو مہلت دے دے۔ اس نے انکار کیا۔ حضورؐ تھوڑی دیر کے لیے ادھر ادھر گھومے اور ایک بار پھر آ کر اس سے گفتگو کی۔ لیکن پتھر کو کسی طرح جونک نہ لگ سکی۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے آپؐ سو گئے۔ جاگے تو پھر جا کر وہی ذکر چھیڑا۔ مگر وہ ظالم نہ پسیجا۔ آخر کار آپؐ جابرؓ کی کھجوروں کے جھنڈ میں جا کر کھڑے ہوئے اور ان سے فرمایا کہ کھجوریں توڑو۔ کھجوریں توڑی گئیں تو توقع سے بہت زیادہ نکلیں۔ قرضہ بھی ادا ہو گیا اور خاصی مقدار بھی بچ رہی۔ [2]

حضورؐ کی ایک ذاتی زرہ ایک یہودی قرض خواہ کے پاس رہن تھی۔ آخر دم تک آپؐ کے پاس اس کو

---

[1] سیرت النبی ﷺ شبلی ج ۲ ص ۲۴۲

[2] ایضاً

فک کرانے کے لیے اندوختہ نہ ہو سکا۔ ❶

ایک مرتبہ سرور عالمؐ سے ایک بدوی قرض خواہ مطالبہ کرنے آیا۔ اپنے بدویانہ مزاج کے مطابق اس نے نہایت تندی سے گفتگو کی۔ رفقائے نبوت نے اسے احساس دلایا کہ تم دیکھتے نہیں کہ کس ہستی سے ہم کلام ہو۔ وہ کہنے لگا کہ میں تو اپنا حق طلب کر رہا ہوں۔ حضورؐ اپنے رفقاء کو فرماتے ہیں کہ تم لوگوں کو اس کی حمایت کرنی چاہیے کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔ پھر اس کا حساب بے باق کرنے کا حکم دیا اور اس کے حق سے کچھ زیادہ دلوا دیا۔ ❷

زید بن سعنہ کا دلچسپ واقعہ ان حالات پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔ یہ یہودی عالم تھے۔ اور دیانت داری سے حضور پاکؐ کے دعوائے نبوت کا جائزہ مختلف علامات کی روشنی میں لے رہے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک بدو آیا اور حضورؐ سے آکر ملا۔ اس نے بیان کیا کہ میری قوم مسلمان ہو چکی ہے۔ اور میں نے ان کو دعوت دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم اگر اسلام لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تم کو بھرپور رزق دے گا۔ لیکن بد قسمتی سے الٹا قحط پڑ گیا ہے۔ اب اگر ان کو سہارا نہ بہم پہنچایا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کی طرف مستفسرانہ نگاہ سے دیکھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ فی الوقت کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ زید بن سعنہ نے پیش کش کی کہ مجھ سے ۸۰ مثقال سونا لے لیں۔ اور اس کے عوض میں وقت معین پر کھجوریں دے دیں۔ معاملہ طے ہو گیا اور حضورؐ نے سونا لے کر بدوی کے حوالے کر دیا۔ زید بن سعنہ کا بیان ہے کہ مقررہ میعاد میں جب دو تین دن باقی رہ گئے تو وہ حضورؐ سے ایسے عالم میں دوچار ہوئے کہ آپؐ اپنے چند رفقاء سمیت کسی کے جنازے کی نماز سے فارغ ہو کر ایک دیوار کے پاس تشریف فرما تھے۔ زید نے حضورؐ کے کرتے اور چادر کے پلوؤں کو کھینچتے ہوئے نہایت ترشروئی سے کہا۔ "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا قرضہ ادا نہیں کرتے! خدا کی قسم میں تم سب اولاد عبدالمطلب کو خوب جانتا ہوں کہ پکے نادہند ہو"۔

حضرت عمرؓ نے زید کو گرم نگاہوں سے گھورا اور کہا۔ کہ "او خدا کے دشمن! کیا بکتا ہے! خدا کی قسم مجھے (حضورؐ سے) اندیشہ نہ ہوتا تو تیری گردن اڑا دیتا۔" سرور عالمؐ نے حضرت عمرؓ کو سمجھایا کہ "ایسے موقع پر آپ کو چاہیے کہ ایک طرف مجھے حسن و خوبی سے ادائے قرض کرنے کی تلقین کرتے۔ دوسری طرف اس شخص کو مطالبہ کرنے کے بہتر طریقہ کی نصیحت کرتے۔" پھر فرمایا کہ "اب جاؤ اور جا کر اس کا حساب ادا کر دو اور ڈانٹنے کے بدلے میں بیس صاع (مدینہ کا ایک معروف پیمانہ) کھجوریں مزید دو۔"

یہ دراصل زید بن سعنہ کی طرف سے صاحب نبوت کا آخری امتحان تھا۔ حضرت عمرؓ سے اپنا تعارف

---

❶ شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

❷ سیرت النبی ﷺ شبلی جلد ۲ ص ۲۳۹

کرایا اور ان کو گواہ بنا کر اسلام قبول کیا۔ اور اپنا آدھا مال ملت اسلامیہ پر صدقہ کر دیا۔ یہ زید یہودی مہاجنوں کی صف سے بالکل الگ اپنا مقام بلند رکھتے تھے لیکن ان کے واقعہ سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مدینہ میں تحریک اور اس کے افراد کی مالی مشکلات کس درجے کی تھیں اور ان کے زیر اثر آئے دن قرض اٹھانا پڑتا تھا۔ اور قرض خواہوں کی طرف سے سختیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔

یہود اور مالدار مشرکین نے ایک طرف تو مہاجنی محاذ تحریک اسلامی کے خلاف کھول رکھا تھا۔ دوسری طرف وہ ایک اور مہم میں بھی معروف تھے۔ وہ یہ تھی کہ لوگوں کو "انفاق فی سبیل اللہ" سے روکا جائے تا کہ تحریک مالی کمزوری کی وجہ سے سوکھ کر ختم ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک تو وہ ترغیب انفاق کی آیت کا مذاق اڑاتے تھے' کہ لو جی' مسلمانوں کا خدا بھی دیوالیہ ہو کر قرض مانگنے نکل کھڑا ہوا ہے۔ کبھی کہتے کہ اسلامی تحریک کے خدا کا ہاتھ بند ہے۔ یہ باتیں یہودیوں سے چل کر منافقین کی زبانوں پر چڑھ جاتیں اور پوری فضا کو غبار آلود کر دیتیں۔ دوسری طرف وہ انفاق کرنے والوں سے مل مل کر کہتے کہ دیکھو' کیوں اپنا مال غارت کر رہے ہو۔ مکہ کے چند کنگالوں کو کھلا پلا کر تم کیا حاصل کرو گے۔ اپنے بال بچوں کی خدمت کرو' کاروبار چلاؤ۔ آخر مال کا یہ کیا احمقانہ مصرف تم نے ڈھونڈا ہے۔ اس مہم کو چلانے والے یہود اور منافقین ہی کے بارے میں قرآن نے کہا کہ "یا مرون الناس بالبخل" یعنی یہ لوگوں کو کنجوسی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان معلمین بخل میں کردم بن قیس (کعب بن اشرف کا حلیف)' اسامہ بن حبیب' نافع بن ابی نافع' بحری بن عمرو' حیی بن اخطب اور رفاعہ بن زید بن تابوت نامور اور سربر آوردہ حضرات تھے۔ یہ انصار کے پاس آکر بیٹھتے ان سے ناصحانہ انداز میں کہا کرتے۔ "اپنے مال یوں نہ اڑاؤ۔ یہ یوں جائے گا تو ہمیں تمہارے مفلوک الحال ہو جانے کا اندیشہ ہے' سو تم (تحریک اسلامی پر) خرچ کرنے میں اتنی تیزی نہ دکھاؤ' تمہیں کچھ سدھ بدھ نہیں کہ حالات کیا ہو جائیں گے"۔ ❶

یہود کے پانچویں کالم کے کارندوں میں یہ سرگوشیاں ہوتی تھیں کہ رسولؐ اللہ کے ساتھیوں پر مال خرچ کرنے سے باز آجاؤ' تاآنکہ یہ سب چھٹ چھٹا جائیں" ❷

کتنی دور اندیشانہ اسکیم تھی۔ یعنی ایک طرف سے جذبہ انفاق کے سرچشمے کو بند کر دیا جائے۔ اور دوسری طرف مہاجن بن کر اپنے شائیلا کی پنجے کی گرفت تحریک اسلامی کی گردن پر کسی جائے۔ اسکیم کامیاب ہو جاتی تو ایمان و استدلال اور عمل و کردار کے میدان میں مقابلہ کیے بغیر سر پر منڈلاتے ہوئے انقلاب کو شکست دی جا سکتی تھی۔ مگر معاملہ ایک خدائے دانا و بینا اور ایک حاکم قادر و توانا سے تھا۔ اس کی گہری تدابیر نے دشمنان حق کی چالوں کو شکست دے دی۔

---

❶ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۸۸

❷ یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسولؐ اللہ کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کر دو تا کہ یہ منتشر ہو جائیں۔ (المنافقون: ۷)

اس داستان میں دیکھنے کی چیز محسن انسانیتؐ اور تحریک حق کے پروردہ سپاہیوں کا وہ صابرانہ کردار ہے جو مخالفین کی ظالمانہ اور گھٹیا حرکات کے جواب میں نمودار ہوا۔ انسانیت کا وہ کیسا اعلیٰ نمونہ تھا جس نے اخلاقی علو کا دامن سخت مایوس کن اور اذیت دینے والے حالات میں بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

یہود کا پیدا کردہ پانچواں کالم:

تاریخ انسانی کے صدہا تجربات اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ اخلاص کی روح اپنے اندر لیے جب کبھی کوئی دعوت خیر و فلاح فاتحانہ اقدام کرتی ہے تو اس کے مقابلے پر آنے والی رد عملی طاقتوں میں سے ایک وہ ہوتی ہے جو رو در رو ہو کر اس سے ٹکر لیتی ہے اور وقت کی تلوار بے نیام کر کے آخر دم تک مقابلہ کرتی ہے۔ مگر ایسے فاسد عناصر جو اخلاقی پستی کی وجہ سے بزدلی اور کمینگی کی سطح پر گر چکے ہوتے ہیں وہ نفاق کی کمین گاہ میں بیٹھ کر ریشہ دوانیاں کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ مشرکین مکہ کی ردّعملی حرکت پہلی نوعیت کی تھی' مگر مدینہ کے یہود اور ان کے ہم نواؤں نے دوسری پوزیشن اختیار کی۔

تحریک اسلامی اب چونکہ ایک ریاست کی صورت اختیار کر گئی تھی اور یہ ریاست سب کی آنکھوں کے سامنے نشوونما پا رہی تھی۔ اور ہر چہار جانب سے بیدار دل اور متحرک اور عمل پسند افراد کو چن چن کر اپنے ساتھ لے رہی تھی۔ لہٰذا مخالف طاقت حسد اور احساس کمتری کے خوفناک ردّعمل کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ مگر دلوں ہی دلوں میں جو ابال تھا اس کے لیے بہاؤ کا کوئی راستہ نہ تھا' اور حالات پر اثر اندازی کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ نظریہ اسلامی کے مقابلے میں یہود کے پاس کوئی معقول' سیدھا سادہ' عوام کو اپیل کرنے والا اور حرکت پیدا کرنے والا تعمیری نظریہ نہ تھا۔ ان کے پاس کچھ بے جان اور کھوکھلے عقیدے تھے۔ جو الٹا تاریخ کے بہاؤ کو روکنے والے اور انسانی فطرت میں جمود پیدا کر دینے والے تھے۔ ان کے پاس تحریک اسلامی کے پیدا کردہ اخلاقی کردار کے جواب میں برابر کی ٹکر کا اخلاقی کردار نہ تھا۔ بلکہ وہ کردار کے لحاظ سے انسانیت کے کم سے کم مطلوبہ معیار سے بھی گرے ہوئے تھے۔ اور کوئی محرک نہ تھا جو ان کو اس پستی سے اٹھا سکے! انسانیت کی تعمیر نو کی قرآنی دعوت جو نیا انسان بنا کے لائی تھی' یہودیت کا فرسودہ نمونہ انسانیت اس کے سامنے کھڑا ہونے کے قابل نہ تھا' پروپیگنڈہ کے میدان میں غلط فہمیوں اور شرارتوں کا کتنا ہی گرد و غبار وہ اڑاتے پھرے' لیکن استدلال کے میدان میں وہ زک پر زک اٹھا رہے تھے' پھر وہ اپنے آپ کو چاہے کچھ سمجھتے رہیں' تاریخ کی طاقت مسلم تحریک کے ساتھ تھی' اور واقعاتی پیکار گاہ میں یہود پر ہر ہر آن کاری ضربیں پڑ رہی تھیں۔ زمانہ ان کو پیچھے چھوڑ کر اسلامی نظریہ حیات کا جھنڈا لہراتا آگے ہی آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ سیاسی لحاظ سے وہ چاہتے تھے کہ اسلامی انقلاب کی شہ رگ کاٹ ڈالیں لیکن حلیفانہ معاہدات نے ان کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ اس واقعاتی نقشے میں یہ گروہ اپنے آپ کو بے چارگی و بے بسی کے مقام پر پاتے۔ بے چارگی و بے بسی کے اس احساس نے ان کی سیرت کی بنیادی کمزوریوں کے ساتھ مل

کر بزدلی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ بے بسی اور بزدلی کے عالم میں آدمی کے اندر کام کرنے والے حریفانہ جذبات ہمیشہ حسد اور کینہ کی راہ سے اسے نفاق کی کمین گاہ تک لے جاتے ہیں' وہ مخالف پر سامنے سے وار کرنے کے بجائے پیچھے سے شب خون مارتا ہے۔ وہ کھلم کھلا تاخت و تاراج کے بجائے نقب زنی کی اسکیمیں بناتا ہے۔ یہود نے بھی اسی بزدلانہ موقف کو سنبھال لیا۔

منافقین کے ذلیل عنصر کے ظہور کے لیے واقعاتی صورت حال نے دو اسباب پیدا کر دیئے تھے۔ ایک تو وہی یہود اور ان کے ہمنواؤں کا حاسدانہ انتقامی جذبہ بر سر عمل تھا اور اس جذبے میں چونکہ براہ راست حملہ کرنے کی طاقت نہیں تھی' اس وجہ سے نفاق کا خفیہ محاذ بر سر عمل آگیا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر بہت سے لوگ اپنا مستقبل بنانے کے لیے اسی چور دروازے سے اندر داخل ہونے لگے۔

اس چور دروازہ کا افتتاح بہرحال یہودی ذہن نے کیا۔ ان کے اچھے اچھے سردار تھے' جو اسلامی جماعت کی صفوں میں اپنے حریفانہ جذبات کو اسلام کے بہروپ میں چھپائے ہوئے داخل ہونے لگے۔ بنی قینقاع میں سے نمایاں مرتبے کے حسب ذیل بزرگ "پانچویں کالم" کے طور پر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

(۱) سعد ابن حنیف (۲) زید بن لصیت (۳) نعمان بن اوفی ابن عمرو (۴) رافع بن حرملہ (۵) رفاعہ بن زید بن تابوت (۶) سلسلہ ابن برہام (۷) کنانہ ابن صوریا۔

ان میں سے زید بن لصیت وہ شخص ہے جو بنی قینقاع کے بازار میں حضرت عمرؓ سے نبرد آزما ہو گیا تھا۔ پھر یہی تھا جس نے رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کے کھو جانے پر طعنہ دیا تھا کہ "یوں تو آسمان کی خبریں دیتے پھرتے تھے۔ لیکن اتنا پتا نہیں کہ اونٹنی اس وقت کہاں ہے"۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ "بخدا میرا حال یہ ہے کہ میں بجز اس کے کچھ نہیں جانتا جو کچھ کہ اللہ تعالیٰ مجھے بتا دے' اور اب اللہ تعالیٰ نے مجھے اونٹنی کے بارے میں اطلاع دے دی ہے۔ سو وہ اس وادی میں ہے اور ایک درخت کے ساتھ اس کی باگ الجھ گئی ہے"۔ چنانچہ رفقاء تلاش کو گئے تو بالکل یہی صورت واقعہ آنکھوں سے دیکھی۔

ان میں سے رفاع بن حرملہ کا مقام نفاق اتنا بلند تھا کہ جس دن وہ مرا' تو سرور عالم (صلی اللہ علیہ و سلم) نے خود فرمایا کہ "آج منافقین کے سرخیلوں میں سے ایک سرخیل مر گیا ہے"۔ ایسا ہی مقام رفاعہ بن زید بن تابوت کا تھا۔ چنانچہ غزوہ بنی المصطلق سے واپسی پر طوفان صرصر اٹھا اور لوگ کچھ گھبرا گئے تو حضورؐ نے تسلی دلاتے ہوئے فرمایا' کہ یہ طوفان منافقین کے ایک سرخیل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے متحرک ہوا ہے۔ لوگ مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ رفاعہ کی روح اسی طوفان کی لہروں کے ساتھ پرواز کر چکی ہے۔ [1]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۵۔ ۱۷۴

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ منافقین کی صفوں میں جتنے بھی لوگ شریک ہوئے سب کے سب پختہ سال اور خوش حال لوگ تھے۔ ان کے سامنے مفاد تھے اور ان کے مزاج بالعموم غلط جذبات کے سانچے میں ڈھل کر پتھر کی طرح سخت ہو چکے تھے۔ نوجوان طاقت تحریک اسلامی کے ساتھ تھی۔ بروئے تحقیق صرف ایک نوجوان پانچویں کالم میں ملتا ہے جس کا نام قیس بن عمرو بن سہل تھا۔

یہ گروپ اتنا ہی محدود نہ تھا' بلکہ درحقیقت یہ چند حضرات تو پانچویں کالم کے قائد اور سالار تھے یہ اپنے حلقوں سے منافقین بھرتی بھی کرتے' اسلامی جماعت کے اندر سے کمزور افراد کو تلاش کر کر کے ان کو متاثر بھی کرتے اور ان کو استعمال میں لاتے' شکوک و شبہات پھیلا کر اور مسلمانوں کی مجلسوں میں سنجیدہ معاملات میں استہزاء و تضحیک کے پہلو پیدا کر کر کے فضا کو خراب کرنے کے درپے رہتے۔ مسجد میں جا کر تمام اہم گفتگوئیں سنتے اور پھر آ کر اپنی مجالس میں رپورٹ کرتے۔ راتوں کو سازشی مجالس میں بیٹھ کر شرارت کے نئے منصوبے بناتے اور نئے نئے طریقوں سے ان کو روبعمل لاتے۔ یوں تو اپنے انداز و اطوار کی وجہ سے نفاق کا پیدا کردہ یہ بے ڈھنگا کردار نبی اکرمؐ اور مسلمانوں کی نگاہ میں پہچانا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہر مرحلے پر وحی الٰہی کی روشنی ان کے خیالات' ان کی حرکات اور ان کی کارروائیوں اور سازشوں بلکہ ان کے مجرمانہ ضمیر کی خاص خاص علامات کو نمایاں کرتی رہتی تھی۔ لیکن ایک موقع پر مسجد نبویؐ میں ان اکابرین نفاق کی حرکات حد برداشت سے باہر ہو گئیں۔ مجمع عام میں یہ ٹولی کی ٹولی بالکل الگ دھڑا بنی بیٹھی تھی۔ اور اپنی جگہ الگ کھسر پھسر کر رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر سرور عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو مسجد سے نکل جانے کا حکم دیا۔ بعض بزرگ تو ایسے ہٹیلے تھے کہ ان کو "پابہ دست دگرے دست بدست دگرے" کی شان سے نکالا گیا۔

لیکن ان سرخیلان نفاق کی خود اپنی مرکزی قیادت عبداللہ بن ابی کی "ذات گرامی" میں مرتکز تھی۔ یہ شخص جو واقعتاً اِفک میں فتنہ کی بارود کو فتیلہ دکھانے والا ہیرو تھا' اس کی رگ رگ میں اسلامی انقلاب کے خلاف بغض و کینہ کا آتشیں لاوا بھرا پڑا تھا۔ اس لاعلاج بغض و کینہ کی بنیاد کیا تھی' یہ اسید بن حضیر کی زبانی سنیئے۔ جنہوں نے غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر عبداللہ بن ابی کی ایک شرانگیزی پر تبصرہ کرتے ہوئے قائد انسانیتؐ کی خدمت میں عرض کیا۔

> "یا رسول اللہ! اس شخص (کے دکھی جذبات) کی رعایت فرمایئے۔ مدینہ میں جب آپؐ کا ورود ہوا تھا تو اس موقع پر ہم اس کو بادشاہت کی مسند پر بٹھانے کی پوری تیاریاں کر چکے تھے اور اس کے لیے تاج تیار ہو رہا تھا۔ آپؐ کی آمد سے اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ بچارا اسی کی جلن نکال رہا ہے۔" (تفہیم القرآن۔ سورہ نور کا دیباچہ)

جن لوگوں کے بنے بنائے کھیل کسی دعوت یا تحریک کے ہاتھوں بگڑ جاتے ہیں اور جن کے مفاد کی کمند ایسے عالم میں ٹوٹتی ہے کہ سامنے دو چار ہی ہاتھ پر لب بام ہوتا ہے' وہ پھر اپنے سینے میں بس بھرے ساری

عمر پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں۔ ایسے شکست خوردہ حریف کبھی معاف نہیں کیا کرتے۔ اسلام کے بارے میں یہی کیفیت تھی جس میں عبداللہ بن ابی اول روز سے مبتلا ہو گیا تھا اور مرتے دم تک اسی میں مبتلا رہا۔ اول اول اسلام لے آیا تا کہ اس نئی طاقت کے نظام کے اندر اپنی جگہ بنا سکے اور پھر اس کے اندر سے قدم قدم اوپر اٹھ کر قیادت و اقتدار کی چوٹی تک پہنچ سکے۔ لیکن اس نظام کے اندر سے تو جدھر بھی کوئی راستہ جاتا تھا وہ ایمان اور عمل کے بل پر طے ہو سکتا تھا۔ سو عبداللہ بن ابی کے لیے نفاق کے سوا کوئی دوسرا مقام نہ تھا۔ ابتداءً یہ نفاق مخفی رہا۔ لیکن ایک دن اچانک اس کے دل کا ناسور پھٹ پڑا اور گندہ متعفن مادہ بہنے لگا۔

ہوا یہ کہ حضورؐ پاک سعدؓ بن عبادہ کی بیمار پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ حضورؐ گدھے پر سوار تھے' اور اپنے پیچھے آپؐ نے اسامہؓ بن زید بن حارثہ کو بٹھا لیا۔ یہی اسامہؓ بتاتے ہیں کہ راستہ میں ایک جگہ عبداللہ بن ابی مجلس جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے گرد قبیلے کے لوگ حلقہ زن تھے۔ سرور عالم (صلی اللہ علیہ و سلم) کا گزر ہوا' تو اسے برا لگا اور منہ پھیر لیا۔ حضورؐ قریب پہنچے تو سلام کہا۔ پھر ذرا دیر کے لیے رکے اور قرآن کا کچھ حصہ پڑھا۔ اور خدا کی طرف دعوت دی۔ خدا کی یاد دلائی۔ اور اس کے غضب سے ڈر دلایا۔ اسامہؓ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی دم سادھے بیٹھا رہا اور کوئی بات نہیں کی لیکن جب حضورؐ بات سے فارغ ہو کر چلنے لگے تو بڑے گستاخانہ اور بازاری سے انداز میں منہ پھاڑ کے کہا' کہ "اے فلاں! --- بات کرنے کا تیرا یہ ڈھنگ ٹھیک نہیں ----- اپنے گھر میں بیٹھ اور جو کوئی تیرے پاس جائے تو بس اس کو اپنی بات سنا دیا کر ----۔ اور جو کوئی تیرے پاس نہ آئے اسے تنگ نہ کیا کر اور ان کے گھر میں آ کر ایسی دعوت نہ سنا کہ جو اسے ناگوار ہو"۔ دیکھیے ان الفاظ کو' پرکھیے اس انداز بیان کو! لفظ لفظ زہر میں بجھا ہوا ہے۔ اور حرف حرف سے سڑانڈ اٹھ رہی ہے۔ کتنے دل چھیدنے والے بول ہیں۔ کیسے اشتعال دلانے والے جذبات ہیں۔

در حقیقت یہ عبداللہ بن ابی نہیں بول رہا تھا۔ یہ جاہلیت کا مٹتا ہوا دور تھا جو آنے والے دور امن و عافیت کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

اور حضورؐ نے اپنے مقام کی بلندیوں سے پستی کی اس بڑبڑاہٹ کو سنا ----- اس کریم النفس ہستی کو غصہ کی بجائے اغلباً رحم ہی آیا ہو گا۔

مجلس میں عبداللہؓ بن رواحہ بھی موجود تھے جو مسلم جماعت کے رکن تھے۔ ان کی غیرت نے اپنا فرض ادا کیا اور انہوں نے منافق اعظم کو تنک کر جواب دیا۔ "حضورؐ کیوں نہ آئیں۔ ہم آپؐ کو چاہتے ہیں' آپؐ ہمارے گھروں اور ہماری مجلسوں میں آئیں گے۔ ہم آپؐ سے محبت کرتے ہیں اور آپؐ ہی کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سربلندی عطا فرمائی ہے اور آپؐ ہی کے ذریعے سے ہدایت عطا کی ہے"۔

اس تجربے سے گزرنے کے بعد قائد انسانیت سعدؓ بن عبادہ کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے چہرہ کا ایک خاص

رنگ دیکھ کر استفسار کیا۔ آپؐ نے واقعہ بیان کیا۔ سعدؓ نے بھی وہی واقعاتی پس منظر بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو مدینہ لے آیا۔ ورنہ ہم اس کے لیے تاج تیار کرا رہے تھے۔ آپؐ نے تو آکر اس کی بادشاہت کا خواب درہم برہم کردیا۔ مدعا یہ تھا کہ اس کا یہ ردعمل قدرتی ہے' اسے کچھ اہمیت نہ دینی چاہیے۔

یہ شخص نفاق کے پورے ڈرامے کا مرکزی ہیرو بن کر تاریخ کے اسٹیج پر کام کرتا رہا۔ سب سے آگے یہ تھا۔ اس کے پیچھے موٹے موٹے یہودی بزرگ تھے۔ ان کے پیچھے شعوری طور پر نفاق کا کھیل کھیلنے والے عوام تھے۔ ان کے پیچھے ادھ کچرے اور تھڑدلے مسلمان تھے۔ اور سب سے آخر میں جاہل اور ناسمجھ بدوی تھے۔ تحریک اسلامی کے خلاف جو بھی ردعملی حرکت نمودار ہوتی تھی' اس میں درجہ بدرجہ ان مختلف عناصر کا حصہ ہوتا تھا۔

مدینہ میں مسلم جماعت جن جن مخالفتوں اور مزاحمتوں سے دوچار ہوئی' اور سرورِ عالمؐ کو جن جن شرارتوں کے طوفانی ریلوں کا سامنا کرنا پڑا' ان سب میں یہود کے زیر اثر نفاق کی اس فاسد طاقت کا بڑا بھاری پارٹ شامل رہا ہے۔ کمانڈ اگرچہ سارے محاذ مخالفت پر یہود کی رہی لیکن جتنے بھی منفی فتنے محسنِ انسانیتؐ کا راستہ روکنے کے لیے اٹھے ان میں عملاً بہت بڑا حصہ مریضان نفاق کا تھا۔ جو یہود کے آلۂ کار بن کر کام کرتے رہے۔

مفسدانہ پروپیگنڈے کا محاذ:

جمود پسند فاسد عناصر جب کسی دعوت اصلاح و تعمیر سے دوچار ہوتے ہیں تو پھر ہمہ تن ان کے علمبرداروں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ خود تو کچھ کرنا نہیں ہوتا' اور خدا و خلق کی طرف سے کسی طرح کی ذمہ داریاں تسلیم نہیں ہوتیں۔ اس لیے ساری ذہانتیں اور قوتیں بآسانی منفی مصرف میں لگادی جاتی ہیں۔ یہ عناصر غول بن کر داعیان اصلاح و تعمیر کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں' دوربینیں اور خوردبینیں لگ جاتی ہیں۔ اور پیمانے اور مسطر سنبھال لیے جاتے ہیں۔ ہر آن بات بات کا تجزیہ ہوتا ہے۔ ایک ایک واقعہ کا گہرا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ہر ہر معاملے کی چیر پھاڑ ہوتی ہے۔ کوئی ٹیڑھ ادھر سے نکالی جاتی ہے' کوئی کجی ادھر سے تلاش کی جاتی ہے اور پھر ڈونڈی پیٹ پیٹ کر اعلان کیا جاتا ہے کہ لوگو! دیکھو یہ گمراہی ہے' یہ فساد ہے' یہ کفر ہے' یہ اسلام دشمنی ہے' یہ بزرگوں کی توہین ہے' یہ اکابر پر تنقید ہے۔ چنانچہ اندھی مخالفت کے نشے میں بہک کر جب کسی بھلے آدمی اور اس کے مفید انسانیت کام کو نقصان پہنچانا مطلوب ہوتا ہے تو پھر ایک طرف ہر بھلی سے بھلی بات کے اندر سے کیڑے نکال کر دکھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف اس کام کے کرنے والوں سے ذرا سا بھی سہو ہو جائے تو بات کا بتنگڑ بنا کر رائے عام کا طوفان اٹھا دیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ زریں مواقع تخریبی عناصر کے لیے وہ ہوتے ہیں جب کوئی بات یا کوئی واقعہ عام لوگوں کے غلط توہمات اور معتقدات اور مسلمہ رسمیات کے خلاف ہو جائے۔ خواہ وہ بجائے خود کتنا ہی برحق اور اقرب الی

الصواب کیوں نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ اصلاحی' تعمیری اور انقلابی تحریکوں کو عوام کے بہت سارے مسلمات کے بتوں کو توڑنا ہوتا ہے۔ اس لیے مخالفانہ پروپیگنڈے کے لیے نت نئے موضوعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہی صورت حضور سرور عالم ﷺ اور آپ کے رفقاء کو یہود کی طرف سے درپیش تھی۔ صبح شام ایک نہ ایک واویلا مچتا رہتا' اور ایک نہ ایک اشتہار بازی ہوتی رہتی۔

ہوسِ منصب کا الزام:

کسی علمبردارِ حق کے دامنِ خلوص پر نفسانیت کے دھبے ڈالنے کے لیے مخالفین نے ہر دور میں ایک الزام یہ رکھا ہے کہ یہ شخص کچھ بننا چاہتا ہے۔ کوئی منصب حاصل کرنے کے درپے ہے' اپنا کوئی مقام بنانا چاہتا ہے۔ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے خلاف یہی پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ لوگ اپنی حکومت جمانا چاہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے خلاف غوغا کیا گیا کہ یہ صاحب تو یہودیوں کا بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح وفد نجران کی آمد کے موقع پر سرور عالم ﷺ کے خلاف یہودیوں نے ایک پروپیگنڈہ یہ بھی اٹھایا کہ یہ ساری جان ماریاں تو بس اس غرض سے ہیں کہ جو مقام عیسیٰ علیہ السلام کا چلا آ رہا ہے وہ آپؐ کے قبضے میں آجائے۔ اور عیسائیوں اور دوسرے لوگوں کو آہستہ آہستہ گھیر کر اپنی پرستش میں لگا لیا جائے۔ غور فرمایئے' حضورؐ نے اس طرح کا کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ ایسے منصب کی طلب کا اشارہ تک نہیں دیا تھا۔ لیکن مخالف طاقت نے خود ہی اپنے ذہن سے ایک طومار گھڑ لیا اور اپنی جگہ طے کر لیا کہ محمد ﷺ کا مقصد تو یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بن کر پوجا کرائیں۔ دعویٰ نہ کیا ہو تو نہ سہی' دل میں اسی کے ارادے ہیں۔ ابھی یہ ارادے سامنے نہیں آئے تو کیا ہوا۔ آثار بتا رہے ہیں کہ کبھی نہ کبھی یہ سامنے آ کر رہیں گے' وفد نجران کے ارکان کے کان ان فضولیات سے بھرے گئے ہوں گے۔ جبھی تو اس وفد کے ایک رکن ابو نافع قرظی نے یہ سوال حضورؐ سے کھلم کھلا دریافت کیا کہ "کیا آپؐ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپؐ کی اس طرح پوجا کریں جیسے نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں؟" وفد کے ایک دوسرے رکن الربیس (یا الریس یا الرمیس) نے بھی پوچھا کہ: "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپؐ ہم سے یہی چاہتے ہیں اور اسی کے لیے دعوت دیتے ہیں؟" آپؐ نے جواب دیا: "خدا کی پناہ اس بات سے کہ میں خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کروں یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کی دعوت دوں۔ پس مجھے خدا نے اس مقصد کے ساتھ نہیں اٹھایا ہے اور نہ مجھے اس کا حکم دیا ہے"۔ [1] قرآن بھی اس موقع پر پکار اٹھا کہ "کسی انسان کا یہ منصب نہیں ہے کہ خدا اسے کتاب اور حکمت اور نبوت سے سرفراز کرے تو پھر وہ لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ اللہ کے بجائے میرے بندے بن جاؤ"۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۸۱

مسلّمہ مذہبی شعائر کی بے حرمتی کا الزام:

قائد انسانیت ﷺ کے ہجرت کر کے چلے آنے پر مکہ میں انتقامی جذبات نے نئی کروٹ لینی شروع کر دی تھی۔ اور برابر جنگی کارروائی کے لیے سوچا جا رہا تھا۔ ان کے جاسوس مدینہ کے اطراف میں گھومتے تھے' ان کا سلسلۂ نامہ و پیام خفیہ طور پر یہود مدینہ کے ساتھ شروع ہو چکا تھا' اور ان کے فوجی دستے وقتاً فوقتاً اسلامی ریاست کے حدود اثر تک پہنچنے لگے تھے۔ اس کے جواب میں اسلامی ریاست نے بھی اپنا نظام دیدبانی بر سر عمل کر دیا۔ فوج اور غیر فوجی پارٹیاں گشت کے لیے نکلتیں اور قریش کے جاسوسوں اور فوجی دستوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتی رہتیں۔ مدینہ اپنی اس نقل و حرکت سے قریش کو ایک طرف یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہم سوئے نہیں پڑے ہیں اور ساتھ ہی یہ اندیشہ دلانا بھی مقصود تھا کہ اگر تم نے امن کی فضا کو خراب کر دیا تو پھر تمہارے تجارتی قافلوں پر یہ شاہراہ بند ہو جائے گی۔

اسی نظام دیدبانی کے تحت جمادی الاخری ۲ ھ کے آخر میں آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ قریش کی نقل و حرکت اور ان کے آئندہ منصوبوں کا جائزہ لینے کے لیے قائد انسانیتؐ نے روانہ فرمایا۔ اس دستہ کو کسی جنگی کارروائی کا مجاز نہیں ٹھہرایا گیا تھا۔ لیکن ان کی مڈبھیڑ قریش کے ایک چھوٹے سے تجارتی قافلے سے ہوئی تو اس عالم تقابل میں باہمی ذہنی کھچاؤ ایسے نقطہ تک جا پہنچا کہ اسلامی ریاست کے دستے نے حملہ کر کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ بقیہ کو گرفتار کر کے مال و اسباب سمیت مدینہ لے آئے۔ یہ واقعہ چونکہ جمادی الاخری کے خاتمے اور رجب کے آغاز کے دوران میں کسی وقت ہوا تھا اس لیے اشتباہ و التباس کے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف مکہ کے مشرکین نے اور دوسری طرف مدینہ کے یہود و منافقین نے پروپیگنڈہ کا طوفان کھڑا کر دیا۔ انہوں نے اس واقعہ کو قطعی طور پر شعبان سے متعلق کر کے عوام کو اشتعال دلانے میں پورے زور سے کام لیا۔ وہ کہتے پھرتے تھے کہ "یہ لوگ چلے ہیں بڑے اللہ والے بن کر اور حال یہ ہے ماہ حرام تک میں خونریزی سے نہیں چوکتے"۔[1] اس پروپیگنڈہ کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں بہت ہی نقصان دہ تھا۔ یہ مختصر سی نوخیز طاقت جو چاروں طرف سے دشمنوں اور خطروں میں گھری تھی اور جس کے لیے کسی بھی فرد اور کسی بھی عنصر کی حمایت بڑی قیمتی تھی' اس کے بارے میں عرب میں اس تاثر کا پھیل جانا کہ وہ حرام مہینوں کا احترام ختم کیے دے رہی ہے درآنحالیکہ اس حرکت پر ہی عرب کے دینی اور معاشی نظام کا دارومدار تھا ---- اس کے حمایتیوں کو اس سے کاٹ کر اس کے مخالفوں میں دھکیل دینے والا تھا۔ پھر چونکہ اس معاملے کا تعلق عوام کے نازک مذہبی جذبات سے تھا۔ اس لیے یہ وجہ اشتعال بھی تھا۔ خصوصیت سے یہ پروپیگنڈہ مسلمانوں کی خدا پرستی اور دینداری اور اخلاقی لحاظ سے ان کے ذمہ دارانہ پن

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۶۵

پر ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتا تھا۔

نخلہ کا یہ ایک حادثہ ایک اور وجہ سے خود اسلامی ریاست کی نگاہ میں ناپسندیدہ قرار پایا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس دستے کو کسی طرح کے تصادم کا اختیار نہیں دیا تھا۔ بغیر باضابطہ اختیار کے اس دستے نے ایک ایسا قدم اٹھا دیا جو اسلامی ریاست کے اس پورے منصوبے کو متاثر کرنے والا تھا' جو حفاظت اور دیدبانی کی غرض سے پیش نظر تھا اور جس کے مطابق بڑی احتیاط سے ہر کارروائی کی جا رہی تھی۔ اب چونکہ نخلہ کا حادثہ سرے سے ایک بے ضابطہ اور غیر قانونی کارروائی تھی' لہٰذا آں حضورؐ نے متعلقہ افراد سے سختی سے باز پرس کی اور ان کی تادیب کی' اور گرفتار شدہ جنگی قیدیوں کو قبول کرنے اور ان کے اموال کو بیت المال میں لینے سے انکار کر دیا۔

اسلامی ریاست نے اپنے نظم کے تحت اس بے ضابطگی پر جو کارروائی مناسب تھی وہ تو اپنی جگہ کر دی۔ لیکن مخالفین نے مفسدانہ پروپیگنڈے کا جو طوفان اٹھا دیا تھا اس کا مقابلہ زیادہ مضبوط اور مدلل اور اخلاقی اثر رکھنے والے صاف ستھرے پروپیگنڈے سے کیا۔ خود اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس کا جواب سرور عالم ﷺ کی زبان سے ان الفاظ میں دلوایا کہ:۔

"لوگ پوچھتے ہیں کہ ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ اے پیغمبر کہیے کہ اس میں لڑنا بہت برا ہے۔ مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا' حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے! ----- اور فتنہ' خونریزی سے شدید تر ہے!"۔ (البقرہ۔ ۲۱۷)

صاف معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے مخالفین کے اس طوفانی پروپیگنڈے سے جو اسلامی جماعت کے ارکان متاثر ہوئے اور پریشانی میں مبتلا ہو کر انھوں نے سوالات کیے کہ ماہ حرام میں جنگی کارروائی کرنا اسلامی نظریہ و قانون کی روشنی میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ جن لوگوں پر نیکی اور صلح پسندی کا ایک غیر متوازن تصور زیادہ پرتو افگن تھا اور جو ذرا ذرا سی مخالفت سے گھبرا اٹھتے تھے' ان کو خاص طور پر تشویش ہونے لگی تھی کہ کہیں ہم روح دین اور جوہر تقویٰ کو ہاتھ سے دیتے تو نہیں جا رہے اور کہیں ہم سیاست زدہ ذہن کے تحت اپنے اصل مقصد سے دور جا کر عام لوگوں کو خود ہی تو دور نہیں دھکیلتے جا رہے۔ سو اس طرح کے افراد کی پریشانی غیر معمولی نوعیت رکھتی تھی ان کا دلی اطمینان متزلزل ہو چلا تھا۔ لہٰذا وہ خصوصیت سے اس معاملے میں اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سوالات کے پیچھے یہ ذہن خاص طور پر متحرک تھا۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے دشمنان تحریک کو بھرپور جواب دیا گیا۔ فرمایا کہ مشرکین مکہ جو خود تو راہ خدا سے روکنے اور اللہ سے کفر کرنے اور زائرین حرم کا راستہ روکنے اور باشندگان حرم کو حدود حرم سے تنگ کر کر کے نکالنے کے مجرم ہیں' اب وہ ماہ حرام کی حرمت کے محافظ بن کر کس منہ سے میدان میں آ رہے ہیں۔ اس میں یہود اور منافقین کے لیے یہ خطاب مضمر تھا کہ تم جو اہل مکہ کے ان سارے مظالم اور دینی شعائر

کی حرمتوں کو توڑ دینے والی کارروائیوں میں منہ میں گھنگنیاں ڈالے پڑے رہے ہو' اور آج بھی تم کو اس بارے میں کچھ احساس نہیں ہے' واقعہ نخلہ کے سلسلے میں مسلمانوں کی ایک ایسی اتفاقی کارروائی پہ کاہے کو نگہدار شعائر بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہو۔ جس کے لیے نظام ریاست کی طرف سے باقاعدہ اجازت نہیں دی گئی بلکہ چند افراد کی غلطی سے ایک اقدام ہو گیا۔ چنانچہ اس کے نتائج کو قبول کرنے سے ریاست کے سربراہ نے انکار کر دیا۔ اور متعلقہ افراد کو سخت تادیب بھی کر دی۔

اس واقعہ کے تاریخی آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ اہل حق کے دشمن کس طرح گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں کہ کہیں سے ان کو کوئی رخنہ ملے اور وہ اس سے حملہ کر دیں اور کہیں کوئی سہو اور بے احتیاطی کام کرنے والوں سے سرزد ہو اور وہ فوراً اس کو دنیا بھر میں اپنی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ اچھال دیں۔

جہاں ہر ہر لمحہ ہر ہر معاملے میں اس طرح غلط فہمیوں اور بدگمانیوں اور اشتعال انگیزیوں کے طوفان اٹھائے جاتے ہوں گے' وہاں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دشمنوں میں گھری ہوئی ننھی سی ریاست اور اس کو وجود میں لانے والی انقلابی تحریک اور اس تحریک فلاح انسانیت کے قائد پر کیا گزرتی ہو گی۔ شکوک و شبہات' شرپسندانہ اعتراضات اور کارکنوں کو ذہنی طور پر الجھا دینے والے سوالات فضا میں بھنگوں کی طرح اڑتے پھرتے ہوں گے اور زمین پر برسات کے کیڑوں کی طرح ہر طرف رینگتے دکھائی دیتے ہوں گے۔ لیکن بھنگوں اور کیڑوں کی نقل و حرکت نے کبھی کسی اصول و کردار رکھنے والی طاقت کے فاتحانہ اقدام کو روکنے میں کامیابی نہیں حاصل کی۔

دین کے پردے میں نفسانیت کا الزام:

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اسلام کی نافذ کردہ اصلاحات میں سے ایک ایک پر یہودی مولویوں اور مفتیوں نے نامعقول قسم کے ہنگامے بپا کیے تھے۔ بہت بڑی اصلاح منہ بولے بیٹوں کے مقام اور حقوق کے سلسلے میں نافذ کی گئی۔ چنانچہ اس پر مخالفانہ پروپیگنڈے کا ہنگامہ بھی زور شور کے ساتھ اٹھایا گیا۔

ایک اہم تاریخی روایت سابق مذہبی و معاشرتی تصورات کے مطابق یہ چلی آ رہی تھی کہ متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) کی مطلقہ سے حقیقی بہو کی طرح نکاح کرنا ناجائز ہے۔ اس روایت کو ختم کرنے کے لیے مشیت الٰہی نے واقعات کو بڑی عجیب و غریب صورت سے نشوونما دی اور پھر ایک انقلابی نتیجے تک پہنچایا۔ ہوا یہ کہ زیدؓ جو دس برس کی عمر میں غلام بن کر بکے تھے۔ اور جن کو حکیم بن حزام نے حضرت خدیجہؓ کی خدمت میں ہدیہ کیا تھا' حضورؐ کے گھر میں متبنیٰ کی حیثیت رکھتے تھے۔ بعد میں زید کے باپ اور بھائی ان کو لینے آئے اور حضورؐ نے اذن بھی دیا کہ چاہو تو جا سکتے ہو لیکن زیدؓ کو آپؐ سے اب اتنی گہری محبت ہو چکی تھی کہ اس رشتے کا ٹوٹنا گوارا نہ ہوا۔ چونکہ اصلاً اشراف عرب میں سے تھے اس لیے مکہ کے کچھ بزرگوں نے جناب زینب (حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن) کو ان کے نکاح میں دینا تجویز کیا۔ لیکن زینبؓ کے بھائی اس

رشتہ پر راضی نہ ہوئے' کیونکہ نکاح کے لیے جو معیار اور پیمانے اس ماحول میں رائج تھے' ان پر یہ جوڑا پورا نہیں اترتا تھا۔ جاہلی ذہن کی نگاہ میں حضرت زیدؓ کے دامن حیات پر گویا غلامی کے دھبے کا اثر ابھی باقی تھا۔ اور پھر ان کی بے سروسامانی بجائے خود ایک نقص تھی۔ اسلام آیا تو اس نے اس ذہن کو بھی بدلنا ضروری سمجھا اور محسنؐ انسانیت نے خاندانی امتیازات کی روکیں نکاح و ازدواج کے راستے سے ہٹا کر پورے اسلامی معاشرے کو ایک خاندان میں بدل دینے کی کوشش فرمائی۔ چنانچہ فی الواقع یہ دیواریں قطعی طور پر ڈھے گئیں اور "کفو" کا ایک نیا مفہوم پیدا ہو گیا۔ آپؐ نے بڑی تاکید سے لوگوں کا ذوق نگاہ بدلا۔ اور ان کو سکھایا کہ عورتوں کو نکاح میں لینے کے لیے مرتبہ اول پر ان کے دین اور کردار کو دیکھو۔ باقی چیزوں کا لحاظ بعد میں ہے۔ ایک موقع پر تو یہ بھی فرمایا کہ اگر دین و کردار کے بجائے کوئی دوسرا معیار اختیار کرو گے تو معاشرت میں بڑا فساد واقع ہو جائے گا۔ اس طرح "کفو" کا نیا تصور یہ بنا کہ ازدواجی جوڑا اس لحاظ سے بننا چاہیے' کہ اصل مقصد زندگی میں کون بہترین ساتھی بن سکتا ہے اور کس کے ساتھ ذہنی اور ذوقی ساز گاری زیادہ سے زیادہ ممکن ہے۔ اور بے شمار بلکہ اکثر شادیاں اسی نئے رجحان کے مطابق عملاً ہونے لگیں۔ اس ذہنی و معاشرتی تبدیلی کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ حضرت ابو طلحہؓ نے زمانہ کفر میں حضرت ام سلیمؓ کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ درآنحالیکہ موصوفہ اسلام لا چکی تھیں۔ انہوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ تم ٹھہرے کافر اور میں ہوں کہ اسلام لا چکی ہوں۔ اب دو متضاد زندگیاں کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔ ہاں اگر اسلام قبول کر لو' تو میں تم سے بجز قبول اسلام کے اور کوئی مہر بھی نہ لوں گی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رشتہ خود ام سلیمؓ کو بھی مرغوب تھا' لیکن اسلام نے ایسا انقلابی رجحان پیدا کر دیا تھا کہ انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر انکار کر دیا۔ مگر ساتھ ہی ترغیب اسلام بھی دلا دی۔ آخر ابو طلحہؓ اسلام لے آئے۔ نکاح ہوا اور فی الواقع ان کا اسلام ہی مہر قرار پایا۔ [1] غرضیکہ معاملہ ازدواج میں ذوق اور معیار کی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ پھر بھی کچھ رکاوٹیں باقی تھیں۔ انہیں کے سبب حضرت زینبؓ کے بھائی مجوزہ نکاح پر تیار نہ ہوئے۔ حضورؐ بھی چاہتے تھے کہ یہ نکاح ہو۔ لیکن جب اس میں مجرد ایک جاہلی رجحان رکاوٹ بنا تو یہ چیز خدا اور رسول کی نگاہ میں ناپسندیدہ قرار پائی۔ اس سلسلے میں اشارۃً سورہ احزاب میں گرفت کی گئی۔ ملاحظہ ہو آیت ان المسلمین والمسلمت ...... اجراً عظیما۔ (آیت ۳۵) اس آیت کی اصل سپرٹ یہ ہے کہ اسلامی نظریہ اور اسلامی ذہن اور اسلامی کیریکٹر رکھنے والے مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ہمسر اور ہم دوش ہیں۔ اور ان میں قرابت و مودت ہے' یہ ایک دوسرے کے لیے قابل قدر ہیں۔ کجا کہ ان کے بیچ میں خاندانی امتیازات اور فضل و شرف کے جاہلی تصورات آ کے حائل ہوں۔ مگر اشارہ بس اتنا ہی نہیں تھا' اگلی آیت بڑی سخت تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے کو کسی شکل میں طے کر دیں تو پھر کسی

---

[1] ملاحظہ ہو اسوہ صحابیات از مولانا عبدالسلام ندوی صفحہ ۴۸

ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ اس فیصلے کے مقابلے میں اپنی پسند و ناپسند اور اپنے معیارات کو کوئی اہمیت دے' اس طرح سے جو لوگ خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کرتے ہیں تو وہ بہت دور تک بھٹک گئے (احزاب۔ ۳۶) مطلب یہ تھا کہ جب ایک مسلم اور مسلمہ کے درمیان رشتہ ازدواج کے قیام کے لیے دروازے کھول دیئے گئے ہیں تو اب اپنے راستے میں پرانے جاہلی تصورات کو اہمیت دے دے کر حائل کرنا خدا و رسولؐ کی رہ نمائی اور ان کے فیصلوں کے مقابلے میں ایک طرح کی خود سری ہے اور ایسی خود سری گمراہی پر منتج ہوتی ہے۔ چوٹ بڑی سخت تھی۔ اور ٹھیک نشانے پر گی۔ زینبؓ کے بھائی ان آیات کو سن کر اشاروں میں بات کو پا گئے اور نکاح کے لیے تیار ہو گئے۔ گویا شرف و ذلت کے جاہلی معیار کی زنجیر ٹوٹ گئی۔

اللہ تعالیٰ نے اسی واقعے کے ذریعے متبنیٰ کے بارے میں غلط تصور رائج کو بھی توڑنے کا ارادہ فرمالیا۔ بعد میں ہوا یہ کہ زوجین میں سازگاری نہ ہو سکی اور اس میں وہ تفاوت موثر ہوا جو بطور ایک واقعہ کے فریقین میں موجود تھا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایات آنے لگیں لیکن معاملات سلجھنے کے بجائے بگڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر زیدؓ طلاق دینے کا ارادہ آپؐ کے سامنے ظاہر کرنے لگے۔ اس پر آپؐ کو بڑی تشویش ہوئی کہ ایک ایسا نکاح ٹوٹ رہا ہے جو معاشرے میں ایک نئی انقلابی مثال قائم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ نیز اس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک اور مشورے کو بڑا دخل تھا اور آپؐ ہی چونکہ زیدؓ کی طرف سے ولی تھے اس لیے آپؐ کی بڑی ذمہ داری تھی۔ آپؐ نے بار بار اس رابطے کو بچانے اور حضرت زیدؓ کو طلاق سے باز رکھنے کی کوشش کی' لیکن آخر کار یہ ساری کوشش ناکامی کی سرحد کو آپہنچی ----- اور جس طرح کی شکایات پیدا ہو گئی ہوں گی ان کے ازالے کی ایک ہی صورت ممکن تھی اور وہ یہ' کہ آپؐ خود زینبؓ کو اپنے نکاح میں لے لیں۔ شریعت میں پوزیشن بالکل صاف تھی اور اس معاملے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی لیکن سابق جاہلی تاثرات کے تحت اندیشہ تھا کہ لوگوں کو اچنبھا ہو گا اور ساتھ ہی مخالفین پروپیگنڈے کا ایک موضوع پالیں گے لیکن مرضی الٰہی یہ تھی کہ زمانہ جاہلیت سے متبنیٰ کی جو غلط پوزیشن چلی آرہی تھی اس کی نفی خود آپؐ ہی کے ذریعے پوری ہدایت و صراحت سے کر دی جائے تاکہ اس رسمیت کی جڑ بالکل کٹ جائے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے مخفی خیال اور تفکر کو اٹھا کر برسرعام رکھ دیا۔ فرمایا: و تخفی فی نفسک مااللہ مبدیہ و تخشی الناس (احزاب۔ ۳۷) انداز تنبیہہ کا ہے۔ تم اپنے دل کے پردہ خفا میں وہ بات لیے ہوئے ہو جسے اللہ کھول دینے والا ہے ----- اور تم لوگوں سے اندیشہ کرتے ہو' یعنی ایک بات جو خدا کی شریعت میں روا ہے اسے لوگوں کے جاہلی تصورات کے اندیشے سے دل میں چھپائے رکھنا اللہ کو ناپسند ہے۔ اسے سامنے آنا چاہیے اور اس کو واقع ہونا چاہیے۔ تاکہ لکی لا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیاء ھم اذا قضوا منھن وطرا (احزاب۔ ۳۷) مقصود اس سے یہ تھا کہ منہ بولے بیٹوں کے بارے میں وہ غلط قید جو کہ چلی آرہی ہے۔ وہ مسلمانوں کے

اوپر سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔ اسی زنجیر جاہلیت کو کاٹنے کے لیے بھرپور ضرب لگانے کی یہ شکل اختیار کی گئی کہ حضورؐ سے حضرت زینبؓ کا رشتہ نکاح خود اللہ تعالیٰ نے بطور خاص قائم فرما دیا۔

بس اس واقعہ کا ہونا تھا کہ مدینہ کے دشمنان حق کے حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ لوگ پروپیگنڈا کرنے لگے کہ دیکھا' یہ مذہبیت و تقدس کا ڈھونگ! منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی رچالی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زیب داستان کے لیے افسانے بھی گھڑ لیے گئے۔ منہ پھٹ یہود اور منافقین نے یہ چرچا کیا کہ (نعوذ باللہ) اصل میں تو بہو پر عاشق ہو گئے تھے۔ اسی لیے طلاق دلوائی اور پھر نکاح گانٹھ لیا۔ ❶ نکاح بھی ایسا ویسا نہیں' آسمانوں پر منعقد ہو گیا۔ اس نکاح کے لیے زمین ہموار کرنے کو اپنے مطلب کی وحی بھی نازل کرالی۔ اس سے پہلے اب تک اعتقادی اور کلامی اور فقہی امور میں مخالفانہ ہرزہ سرائیاں تھیں' مگر اس واقعہ کے سلسلے میں تو صحیح معنوں میں گندا پروپیگنڈا کیا گیا ہے اور محسنؐ انسانیت کے اخلاقی مرتبے پر ہلہ بولا گیا۔ ظاہر بات ہے کہ کسی تحریک تعمیر و اصلاح کے لیے سب سے زیادہ کاری وار اخلاقی پہلو ہی سے ہو سکتا ہے۔ کسی صاحب دعوت کے بارے میں اگر مخالفین یہ غوغا آرائی کرنے لگیں کہ وہ بندۂ ہوس ہے' وہ اپنی خواہشات نفس کے لیے ہر طریقے سے کار برآری کر سکتا ہے۔ اور وہ کسی اخلاقی معیار کا احترام کرنے پر تیار نہیں تو اس سے بڑھ کر تعمیری کام کو نقصان پہنچانے والا حملہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بڑی آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مدینہ میں دشمنان حق نے کتنی گندگی اس واقعہ پر پھیلائی ہو گی۔ کتنی سڑاند پیدا کر دی ہو گی۔ اور

---

❶ واضح رہے کہ زمانہ حال کے متعصب مستشرقین نے تاریخ کے اوراق سے وہ سارا گندا مواد دامن میں بھر لیا ہے جو تحریک اسلامی کے معاندین نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ خود یہ واقعہ بھی ان اصحاب دانش و تحقیق کے ہاں ایک مقبول ترین موضوع بحث بنا اور اس کو خوب نمک مرچ لگا لگا کر کتابوں کے اوراق پر پھیلا دیا گیا۔ ایک گھٹیا اور بازاری قسم کا افسانہ تشکیل کر کے سامنے لایا جاتا ہے۔ جس کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ حضورؐ کی نگاہ اتفاقاً زینبؓ پر پڑ گئی اور جذبات بے قابو ہو گئے۔ ذرا سوچو کہ وہ شخص جو بے داغ جوانی کو لیے ہوئے ہمہ وقت مصروف رکھنے والی جدوجہد میں ساری عمر منہمک رہا۔ اور جسے چین کا سانس لینا کبھی نصیب نہ ہوا۔ اس کا کردار عین پختگی کے نقطے پر پہنچ کر بس یہی کچھ رہ گیا تھا کہ اس کا دل اس کی آنکھوں کی پلکوں پر دھرا ہوا ہو۔ کیا یہ الزام اس کے مجموعی کردار میں کھپ سکتا ہے۔ پھر حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی کی لڑکی تھیں اور بچپن سے آپؐ کے سامنے کھیلیں اور جوان ہوئیں۔ ان کا وجود کوئی نیا انکشاف نہیں تھا۔ پھر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ آپؐ نے خود بڑے اصرار سے حضرت زیدؓ کے ساتھ ان کا نکاح کرایا تھا اور اس نکاح میں آپ زیدؓ کی طرف سے ولی تھے۔ حالات کی یہ ساری ترتیب کیا اس افسانہ کے لیے واقعی کوئی بنیاد فراہم کرتی ہے جسے مدینہ کے یہود و منافقین نے پروپیگنڈہ کے محاذ کا ایک بم بنانے میں بطور مسالہ استعمال کیا تھا۔ اور اب اسی مسالے کو دوبارہ مستشرقین' اسلام کے خلاف استعمال کر رہے تھے؟ کیا یہ باتیں عقلیت (Rationalism) اور تحقیق (Research) کے دعویداروں کے اپنے معیارات پر پوری اترتی ہیں؟

انسانیت کے سب سے بڑے خیر خواہ پر کئی روز تک کیسی سخت کرب کی گھڑیاں گزری ہوں گی۔

یہود کا یہ پروپیگنڈا بے چارے مسلمانوں کے لیے بھی بے حد پریشانیوں کا موجب ہوا ہو گا۔ ان کو راہ چلتے چھیڑا جاتا ہو گا۔ ان پر فقرے کسے جاتے ہوں گے۔ اور ان کو شبہات کے چکر میں ڈالا جاتا ہو گا۔ ان میں وہ مسلم بھی تھے جو اپنے کچے پن کی وجہ سے گھبرا اٹھتے ہوں گے۔ ان میں منافق بھی گھسے پڑے تھے اور وہ اپنے بن کر عجیب طرح کی دو رنگی باتیں کرتے ہوں گے۔ اس حالت میں مسلمانوں کی تسکین اور تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے چند حقائق ان کے ذہن نشین کرائے۔ ان کو بتایا کہ نبی پر کسی ایسی بات میں کوئی مضائقہ نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے طے کر دیا ہو۔ (احزاب۔ ۳۸) اس اقدام کا مقصد بھی واضح کر دیا کہ مسلمانوں کے لیے منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ سے نکاح کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے (احزاب۔ ۳۷) یہ اعلان بھی کر دیا کہ محمدؐ! (صلی اللہ علیہ و سلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ (احزاب۔ ۴۰) آخر میں خود حضورؐ سے خطاب فرما کر کہا' کہ کافروں اور منافقوں کی نہ مانو اور ان کی دلآزاریوں کو بالائے طاق رکھ دو۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ اور اللہ ہی کار سازی کے لیے کافی ہے۔ (احزاب۔۴۸) اس سنجیدہ اسلوب سے اس مکروہ اور گندے پروپیگنڈے کا جواب دیا گیا جو یہود کی طرف سے حد درجہ کی ذہنی پستی کے ساتھ اٹھایا گیا تھا۔

ایک اور گندے بہتان کا طوفان عظیم:

اوپر کے واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے' کہ تحریک اسلامی کے نظریہ و نصب العین پر جب کسی طرف سے بھرپور وار کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ تو اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا بہترین طریقہ شیطان کی نگاہ میں یہی رہ جاتا ہے' کہ اس کے علمبردار کی شخصیت اور اس کی قیادت عظمیٰ کے دامن تقدس پر گندگی کے چھینٹے ڈال دیئے جائیں۔ سو ایک موقع پر اقتدار طلبی کا اور دوسرے موقع پر نفسانیت کا گھناؤنا الزام اس کے خلاف اچھال دیا گیا۔ اب یہ سلسلہ اور آگے چلتا ہے اور اسلامی تحریک کے قائد اعلیٰ کے حرم کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ جو ساری امت اور ساری انسانیت کے لیے معاشرتی و اخلاقی لحاظ سے مرکزی نمونہ ٹھہرایا گیا تھا۔ اسی حرم کے گرد نئی اسلامی معاشرت کا چھتہ تیار ہو رہا تھا۔ اور اس چھتے کو برباد کرنے کے لیے کارگر ترین وار وہی ہو سکتا تھا جو اس کے مرکز پر کیا جائے۔ مخفی تخریبی طاقت نے یہ آخری وار بھی کر ڈالا۔ اس مخالفانہ وار کی دردناک داستان واقعہ افک کے عنوان سے قرآن' سیرت اور تاریخ کے دفتروں میں عبرت اندوزی کے لیے محفوظ ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اصل واقعہ کی حقیقت سامنے لائیں' یہ بات واضح کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اتنے گندے بہتان کا طوفان عظیم آخر اسلامی تحریک کے پیدا کردہ صالح معاشرے اور تربیت یافتہ نظام جماعت میں اٹھ کیسے سکا؟ کن رخنوں سے یہ طوفان تنظیم کے قلعے میں داخل ہوا اور کیسے اسے کچھ

دیر کے لیے ہولناک اتار چڑھاؤ پیدا کرنے کا موقع ملا۔

فتنہ آرائی کے لیے ساز گار فضا:

شیطان کو اسلامی نظام اجتماعیت میں تخریب و انتشار کے ہنگامے کھڑے کرنے کے لیے بہرحال ایک خاص فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فضا چاہے جماعت کے نظم و اخلاق کی کسی کوتاہی کی وجہ سے موجود ہو یا حالات کی پیدا کردہ ایک مجبوری کے طور پر پائی جائے' بہرحال فتنہ انگیزی کی کچھ صورتیں ہیں جو پوری ہو جائیں تو شیطان کا کید کچھ گل کھلا سکتا ہے۔ نظام مشیت جس نقشے پر گامزن ہے اس میں شیطان کے لیے کام کرنے کے مواقع کسی نہ کسی حد تک ضرور ہی باقی رہتے ہیں۔ خواہ کیسی ہی مثالی سوسائٹی کیوں نہ موجود ہو' درحقیقت انسانی فطرت میں ایسی کمزوریاں موجود ہیں کہ جن کے راستے فتنہ کا سیلاب در آتا ہے۔ نبیؐ کی پیدا کردہ جماعت کے بارے میں بھی یہ گارنٹی نہیں دی جا سکتی کہ اس کے دائرے میں فتنے کی طاقت کو کام کرنے کا سرے سے موقع ہی نہیں ملے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے' جیسے تندرست سے تندرست آدمی بھی کبھی نزلے' زکام یا بخار میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک پاکیزہ سے پاکیزہ معاشرہ کو بھی حالت مرض پیش آسکتی ہے۔ ایک زندگی سے بھرپور اچھے معاشرے سے توقع یہی کی جا سکتی ہے کہ وہ مرض کی مدافعت میں کوتاہی نہ دکھائے گا اور حملہ آور جراثیم کو ہلاک کر کے باہر پھینک دے گا۔ مگر یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس میں کوئی مرض کبھی پیدا ہی نہ ہو گا۔

شیطان کے لیے ایک نظام جماعت میں ساز گار ترین فضا نجویٰ کی فضا ہوتی ہے۔ نجویٰ سرگوشی کو کہتے ہیں۔ کسی اجتماعی نظام میں نجویٰ کے اصطلاحی معنی یہ ہوتے ہیں کہ پوری جماعت کے سامنے کھلم کھلا اپنے خیالات' مشوروں' تنقیدوں اور اعتراضوں کو پیش کرنے کے بجائے متفرق افراد علیحدگی میں بیٹھ کر کھچڑی پکائیں۔ نجویٰ درحقیقت اجتماعی زندگی میں ایک برے راستے کی طرف پیش قدمی کا آغاز ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے' تبھی کھلے بندوں کام کرنے سے آدمی کتراتا ہے اور سامنے آنے سے پہلے چپ چپاتے کھچڑی پکانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی چیز آخر کار سازش کی شکل اختیار کرتی ہے۔

بدقسمتی سے حضور اکرم ﷺ کی نگرانی میں چلتی ہوئی تحریک کے اندر یہود کی سرپرستی میں منافقین نے نجویٰ کی یہ فضا پیدا کر دی تھی اور یہ برابر تحریک کے قائد اور کارکنوں کو پریشان کرتی رہی۔ قرآن اس فضا کے بنانے والوں کو بھی درس اصلاح دیتا رہا۔ اور اسلامی نظام جماعت کے کارکنوں کو بھی اس کے بارے میں برابر انتباہ دیتا رہا۔ وہ پکارا:

> "کیا تم دیکھتے نہیں رہے کہ جن لوگوں کو سرگوشیاں کرنے سے باز آنے کو کہا گیا تھا وہ پھر وہی حرکت کر رہے ہیں۔ جس سے انھیں روکا گیا تھا۔ اور وہ آپس میں بدی اور سرکشی اور رسولؐ کی نافرمانی پر خفیہ مشورے کرتے پھرتے ہیں"۔ (مجادلہ۔۸)

"اے ایمان والو! جب کبھی تم علیحدگی میں باہم مشورے کرو تو بدی اور سرکشی اور رسول کی نافرمانی کے منصوبے نہ باندھو۔ بلکہ نیکی اور تقوی کے لیے مشورے کرو"۔ (مجادلہ۔ ۹)

"یہ خفیہ مشورے شیطان کے کام ہیں تا کہ وہ ایمان لانے والوں کو پریشان کرے' حالانکہ بغیر اللہ کے اذن کے کوئی بھی چیز ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی"۔ (مجادلہ۔ ۱۰)

"یہ (سرگوشیاں کرنے والے) لوگ انسانوں کی نگاہ سے تو او جھل رہ سکتے ہیں' مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ حال یہ ہے کہ جب رات کی تاریکی اور تنہائی کے پردے میں وہ ایسی کوئی بات پکاتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں ہوتی تو اس گھڑی اللہ ان کے ساتھ موجود ہوتا ہے"۔ (النساء۔ ۱۰۸)

"خفیہ مشورے کے لیے کوئی تین آدمی ایسے جمع نہیں ہوتے کہ ان کے ساتھ چوتھا اللہ نہ موجود ہو۔ اور نہ پانچ کہ جن کے ساتھ چھٹا وہ نہ ہو اور نہ اس سے کم یا اس سے زیادہ تعداد کہ ان کے ساتھ وہ موجود نہ ہو ----- خواہ وہ کہیں بھی ہوں"۔ (مجادلہ۔ ۷)

"وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم (جماعت کے فیصلوں اور قیادت کے احکام کی) اطاعت کریں گے! مگر جب (اے نبی صلی اللہ علیہ و سلم) آپؐ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک ٹولی راتوں کو سر جوڑ کر آپؐ کی کہی ہوئی باتوں کے خلاف کھچڑی پکاتی ہے۔ اور اللہ ان کے منصوبوں کو لکھ رہا ہوتا ہے"۔ (النساء۔ ۸۱)

ان آیات میں بات بالکل صاف کر دی گئی ہے کہ اسلامی نظام جماعت اجتماعی طور پر جن طے شدہ خطوط پر چل رہا ہو اور جو اجتماعی فیصلے اور جماعتی روایات اس کے اندر کار فرما ہوں ان کی حمایت و وکالت اور ان کی پابندی و پیروی اور ان کے نفاذ و استحکام کے لیے تو علیحدگی میں افراد باہم دگر علانیہ بھی اور تنہائی میں بھی آزادانہ بات چیت کر سکتے ہیں۔ لیکن ان سے اختلاف کرنے اور ان کو شکست دینے' ان کے خلاف بد دلی پھیلانے اور اعتراضات اٹھانے اور ان کا رخ پھیر دینے کے لیے علیحدگی میں بیٹھ کر افراد کا خفیہ مشورے اور سرگوشیاں کرنا ایک ایسا گھناؤنا گناہ ہے جو ان افراد کی سیرت و عاقبت کو تباہ کر دیتا ہے اور پورے نظام جماعت کو پریشانیوں اور پیچیدگیوں سے دو چار کر دیتا ہے۔ خفیہ اختلافی سرگوشیوں کا اصلی سر رشتہ دار شیطان ہے جس سے اسلامی جماعت کو قرآن نے خبردار کر دیا۔

خفیہ سرگوشیوں کا ایک موضوع "معصیت الرسول" بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ درحقیقت یہی مرکزی موضوع تھا۔ مدینہ کی تحریک اسلامی کے دائرے کے اندر اس امر کی تو سرے سے گنجائش نہ تھی کہ نفس تحریک اور اس کے نظریہ و نصب العین کو پروپیگنڈے کا ہدف بنایا جا سکے اور خود خدا کی نافرمانی اور اس کی کتاب سے بغاوت کا اقدام کیا جا سکے۔ منافقین کے لیے زیادہ سے زیادہ میدان فتنہ اتنا ہی تھا کہ تحریک اسلامی کی قیادت سے الجھیں اور علمبردار اول کی شخصیت کے خلاف لاوا پکاتے رہیں۔ ایک اخلاقی تحریک

کے لیے تباہی کا سب سے زیادہ کارگر اور سہل ترین حربہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کی بہترین شخصیت کو داغدار کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ اقتدار طلبی اور نفسانیت کے الزامات پہلے ہی عائد کیے جا چکے تھے۔ لیکن درحقیقت معاملہ ایک الزام یا دوسرے الزام تک محدود نہیں تھا۔ شوشہ بازی کی ایک مہم (Whispering Campaign) اور "سرد مہم" برابر چلائی جاتی رہی۔

مثلاً بعد کے دور میں جب کہ زکوٰۃ کا نظام وصول و صرف باضابطہ طور پر قائم ہو گیا۔ حضورؐ پر ایک گھٹیا الزام یہ بھی عائد کیا گیا تھا کہ آپؐ بیت المال میں آنے والے صدقات کو من مانے طریق سے اڑا دیتے ہیں۔ ❶ صورت واقعہ یہ تھی کہ تمام اندوختوں اور کاروباری سرمایوں اور مویشی اور زرعی پیداواروں میں سے جب باضابطہ خدا کے حاجت مند بندوں کا حق لیا جانے لگا تو ڈھیروں دولت ایک مرکز پر سمٹنے اور سرکار دو عالم ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے باران رحمت کی طرح تقسیم ہونے لگی۔ دولت کی اس بہتی گنگا کو دیکھ کر زر پرستوں کے منہ میں پانی بھر آتا اور وہ چاہتے کہ جاہلی دور کی طرح آج بھی اس گنگا سے وہی ہاتھ رنگیں جو پہلے سے مضبوط مالی حیثیت کے مالک ہیں' لیکن اسلامی تحریک کے قائم کردہ نظام معیشت نے دولت کے بہاؤ کا رخ' غریب طبقوں کی طرف پھیر دیا تھا اور ارباب جاہ و حشم اس انقلاب پر کڑھتے تھے' وہ فی نفسہ اسلامی نظام معیشت پر تو حملہ کر نہ سکتے تھے۔ جو ان کی جیبیں بھاری کرنے کے بجائے الٹا ان سے بزور قانون "زکوٰۃ" کا "جرمانہ" وصول کر رہا تھا۔ بس دل کا بخار نکالنے کے لیے محسن انسانیتؐ کو نشانہ بنا لیتے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ دولت اپنے حامیوں اور اپنے چہیتوں میں خرچ کی جا رہی ہے۔ اور مہاجرین کو خاص طور پر نوازا جا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدائی خزانے کے بل پر دوست نوازی اور کنبہ پروری ہو رہی ہے۔ متفرق گفتگوؤں میں مسالہ لگا لگا کر کہا جاتا ہو گا' عام لوگوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی خدا کے نام پر نچوڑی جاتی ہے۔ لیکن اسے اپنی دھاک بٹھانے اور اپنا اقتدار مسلط کرنے کے لیے بے دردی سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ پبلک فنڈز کے بارے میں کسی بھی نظام میں قیادت پر الزام لگ جائے تو سنگین ہوتا ہے۔ لیکن خاص طور پر ایک دینی و اخلاقی نظام معاشرہ میں جہاں خزانہ اللہ کا مال کہلاتا ہو اور جس کا ہر آمد و صرف اللہ کے نام سے ----- اور اس کے احکام کے تحت کیا جاتا ہو وہاں ایسے الزام سے شدید جذباتی ہیجان پیدا کیا جا سکتا ہے۔

غور فرمائیے یہ الزام نمونے کی اس شخصیت پر چپکایا جا رہا تھا جس نے صدقہ کی آمدنی کو خود اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے نہیں' پورے خاندان بنی ہاشم کے لیے بمنزلہ حرام کے قرار دے لیا تھا۔ یہ شان

---

❶ و منهم من يلمزك في الصدقٰت۔

اے نبیؐ! ان میں سے بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر اعتراضات کرتے ہیں۔ (التوبہ - ۵۸)

بے لوثی جس کی کوئی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس کے براق دامن پر بھی نہایت ادنی سیرت کے لوگوں نے اٹھ کر دھبے ڈال دیئے۔

پھر یہی لوگ تھے جن کی تعریف قرآن یوں بیان کرتا ہے کہ یہ اپنی باتوں سے نبیؐ کی ذات کو دکھ دیتے ہیں (توبہ - ۶۱)' یعنی تحریک کے اجتماعی مسائل پر صاف دلی سے کھلی فضا میں بات کرنے کے بجائے یہ اس کے عنان بردار کی شخصیت کو نشتر لگاتے رہتے تھے۔ اس نشتر زنی کی ایک مثال قرآن نے خود بیان کر دی ہے۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ اسلامی نظام جماعت میں منافقین کی حرکات و سکنات ایک ایسی بے جوڑ چیز تھیں کہ ان کی بُو' اہل ایمان کی فطرت صالحہ کو ناگوار گزرتی تھی۔ اور وہ مضطرب ہو ہو جاتے تھے۔ اس پر مشکل یہ تھی کہ منافقین کی پر اسرار حرکات پر قانون اور نظم کے تقاضوں کے تحت باقاعدہ گرفت کرنا بھی مشکل اور ان پر دم سادھے رہنا بھی مشکل! اہل ایمان بے چارے جماعتی ذمہ داری کے تقاضے سے مجبور ہو کر اہل نفاق کی غیر صحت مندانہ حرکات سے حضور (صلی اللہ علیہ و سلم) کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ ہر نفاق زدہ آدمی آہستہ آہستہ جماعت میں پہچان لیا جاتا اور اس کے بارے میں عنان بردار تحریک کی شخصیت ایک خاص طرح کا رد عمل دکھاتی جو انتہائی نرمی کے اسلوب سے آہستہ آہستہ سختی کے انداز میں بدلتا گیا۔ ان حالات میں مریضان نفاق اپنے آپ کو ذلیل پا کر چرچا کرنے لگے کہ "ھو اُذن" (توبہ -۶۱) یعنی نعوذ باللہ! یہ شخص تو کان کا کچا ہے۔ معمولی سے معمولی مرتبے کے آدمی' جن کی ہمارے مقابلے میں کوئی ہستی ہی نہیں' جاتے ہیں اور جس کے بارے میں جو بات چاہیں کہہ آتے ہیں۔ اور وہاں ہر چیز پر یقین بھی فوراً کر لیا جاتا ہے۔ میر کارواں (صلی اللہ علیہ و سلم) کی اس کمزوری کی وجہ سے ہم مارے جاتے ہیں' اب ہم تو ٹھہرے منافق اور سازشی' اور کل کے یہ بے حیثیت لونڈے اور فاقوں مارے غلام ہو گئے مقربین خاص!

کچھ ایسے ہی حالات کا رد عمل ہو گا کہ ایک دفعہ منافقین نے تحریک کے علمبردار اول سے علیحدگی میں وقت لینے اور گفتگوئیں کرنے کا ایک چکر چلا دیا۔ مجلس آراستہ ہے' ایک منافق صاحب بیچ میں بول اٹھتے کہ مجھے ذرا علیحدگی میں خاص بات کرنی ہے۔ حضورؐ برِبنائے مروت اس کا موقع ہر کسی کے لیے کھلا رکھتے تھے۔ لیکن علیحدگی میں خاص باتیں کرنے اور وقت لینے کا یہ ڈرامائی سلسلہ کسی اور غرض سے تھا' اس سے منافقین کا مدعا یہ تھا کہ ایک تو جماعت پر اپنی دھاک جمائیں کہ ہم خاص الخاص لوگ ہیں صرف اوپر کے دائرے میں ذمہ دار ترین ہستی سے خاص باتیں کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ حضورؐ کی نگاہ میں مصنوعی طریق سے تقرب و اعتبار حاصل کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اہل اخلاص کے بارے میں بدگمانیاں پیدا کر کے اس ذلت کا اپاؤ نکالا جائے جس میں اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے یہ حضرات گھر گئے تھے لیکن حضورؐ کی مروت نے منافقین کو جس بیش اوقات کا کھلا موقع دے دیا تھا اسے فرمانروائے حقیقی نے یہ حکم دے کر ختم کر دیا کہ:۔

"اے ایمان والو! جب تم پیغمبر سے (خاص وقت لے کر) علیحدگی میں بات کرو تو ہر گفتگوئے خاص

سے قبل صدقہ پیش کرو"۔ (مجادلہ۔ ۱۲)

اس حکم سے بخل کے مارے ہوئے منافقین کی کمر ٹوٹ گئی اور بار بار خاص وقت لینے اور علیحدگی میں بات کرنے کا سلسلہ رک گیا۔ تاہم یہ شروع اسی تصور سے کیا گیا تھا کہ عنان بردار تحریک کان کا کچا (خاک برایشاں) ہے' سو اہل اخلاص کے مقابلے میں کیوں نہ ہم بھی کان بھر کر اسے اپنی رو میں بہا لے جائیں۔ مگر ان کو اندازہ نہیں تھا کہ وہاں اہل اخلاص کے لیے کان جتنے نرم تھے اہل فتنہ کے لیے اتنے ہی ثقیل بھی تھے۔ بہرحال اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ تحریک اسلامی کے اندر رہ کر اس کے عنان بردار اعلیٰ کے خلاف ایسی تحقیر آمیز باتیں کرتے پھرتے ہوں گے ---- ان میں بلظم سے وہ محبت و وابستگی باقی کیسے رہ سکتی تھی جو کسی جماعت کے کارکنوں کو فعال اور متحرک بناتی ہے۔ ایک دینی و اخلاقی نظام جماعت میں تو جو عنصر اس کے نظام امر و قیادت کے خلاف تحقیر کا طوفان اٹھاتا ہے اور سرگوشیوں کی مہم چلاتا ہے۔ وہ درحقیقت سرے سے اس کی حرکت' اس کے اقدام اور اس کی فعالیت کی تباہی کا سامان کرتا ہے۔

تحریک جب دعوت کے مرحلے سے جہاد کے مرحلے کی طرف ایک انقلابی موڑ مڑ رہی تھی اسی وقت ایک بڑی تعداد کا نفاق ابھر آیا تھا۔ تحریکوں کے ایسے موڑ بہت سے لوگوں کو چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر توازن صرف وہی کارکن برقرار رکھ سکتے ہیں جو پہلے سے کچھ سمجھ کر چلے ہوں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ اور کیا کیا منازل راہ میں پڑیں گی۔ ورنہ دنیا بھر کی تحریکوں کو جب کوئی بڑا موڑ پیش آتا ہے اور وہ جست لگا کر ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوتی ہیں تو اس تغیر کا فہم نہ رکھنے والا ضرور ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے --- ایسے ہی تاریخی مواقع پر بسا اوقات اچھے خاصے متحرک افراد ذہنی الجھنوں میں پڑ کر بددلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی تحریک اسلامی کے ساتھ بھی ہوا۔ تحریک دعوت سے جہاد کے مرحلے میں داخل ہوئی تو کچھ لوگ اپنا فکری توازن کھو بیٹھے اور خاص طور پر وہ عنصر تو ہمیشہ کے لیے نفاق کا شکار ہو گیا جو "جہاد" کی گراں بار ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے آمادگی نہیں رکھتا تھا۔ اور پہلے سے ذہن و فکر کو اس مرحلے کے لیے تیار کر کے نہیں لایا تھا۔

قرآن میں مذکور ہے کہ کچھ لوگ تھے جن کو جب پہلے دور میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ "کفوا ایدیکم یعنی دعوت حق پہنچاتے ہوئے ظلم و زیادتی کو خوشی سے برداشت کرو اور ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بس اقامت نماز اور ایتائے زکوٰۃ جیسی سرگرمیوں میں منہمک رہو۔ لیکن ان کو اس دور میں یہ حکم ناگوار تھا' بعد کے مرحلے میں جب انہی لوگوں کو "جہاد" کا حکم سنایا گیا تو وہ انسانی قوتوں سے خوف زدہ ہو کر ٹھٹک سے گئے۔ ان کا ذہنی رد عمل یہ تھا کہ ربنا لم کتبت علینا القتال (النساء۔ ۷۷) ؟ اے ہمارے رب! تو نے جہاد کا حکم ہمارے سر کیوں ڈال دیا؟ ابھی ہم اور دعوت دیتے۔ نماز و زکوٰۃ کے ذریعے اصلاح سیرت کرتے۔ چندے اور تعمیری سرگرمیاں جاری رکھتے۔ ایک مرحلے کے تقاضے پورے ہوئے نہیں کہ وقت سے پہلے نئی ذمہ داریاں لاد دی گئی ہیں۔

مگر بچارے نہ خدا سے بحث کر سکتے تھے نہ اس کے احکام کے آگے کوئی بند کھڑا کر سکتے تھے۔ ان کے سامنے تو صرف رسولؐ کی ذات تھی' چنانچہ اس ذات اور اس شخصیت کو انہوں نے آخر دم تک نہ بخشا۔ ہر ہر معرکہ جہاد سے کنی کاٹتے رہے اور ہر نازک موقع پر طرح طرح کی باتیں گھڑتے رہے' انہوں نے خدا کی عائد کردہ ذمہ داریوں کا انتقام اس کے دین کی تحریک چلانے والے علمبردار حق سے دل کھول کر لیا۔

تحریکیں جب معرکہ آرا ہوتی ہیں تو ان کے علمبردار مخالف طاقت کو جہاں ضربیں لگاتے ہیں وہاں ان کے ہاتھوں چوٹوں پہ چوٹیں کھاتے بھی ہیں۔ تدابیر کے تیر نشانے پہ لگتے بھی ہیں اور اچٹ بھی جاتے ہیں۔ نتائج امیدوں کے مطابق بھی نکلتے ہیں اور خلاف بھی نکل آتے ہیں۔ ایسا تو کوئی بھی میدان کارزار نہیں پایا گیا جس میں ہر نقصان ایک ہی فریق کے حصے میں آئے اور ہر فائدہ دوسرے فریق کے حصے میں رہے' جو فریق آخری فتح بھی حاصل کرتا ہے وہ بھی بہت سی جانیں فتح کی قیمت میں پیش کرتا ہے' بہت سے زخم کھاتا ہے' بہت سا مال جنگ کی آگ میں جھونکتا ہے' لیکن مدینہ کی اسلامی تحریک کے اندر کام کرنے والے منافقین ان مع العسر یسرا (الم نشرح۔۶) کے اس فلسفہ ربانی سے خالی الذہن ہو کر ہر تکلیف اور ہر نقصان اور ہر چوٹ پر بے اختیار چلا اٹھتے تھے کہ یہ نتیجہ ہے تحریک کے کار پرداز کی کوتاہی بصیرت کا (نعوذ باللہ)۔ قرآن میں اس لطنڈے لطنڈے فلسفیانہ پروپیگنڈے کا واضح طور پر تذکرہ موجود ہے:

"اور اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہاری (مراد ہے ذات رسالت مآب) بدولت ہے"۔

(النساء۔ ۷۸)

یعنی تحریک کے معرکوں میں جو جو چوٹیں لگتیں' جو نقصانات پیش آتے' جو قربانیاں دینی پڑتیں اور ---- جن تدابیر کے نتائج حسب مراد نہ برآمد ہوتے ان سب کی ذمہ داری سرور عالمؐ کی گردن پر ڈال دی جاتی' کہ یہ سب انہی کا کیا دھرا ہے۔ مطلب یہ کہ دین فی نفسہٖ برحق ہے' تحریک پاکیزہ' نظام جماعت لاجواب' مگر بس جن ہاتھوں میں رہنمائی ہے انہوں نے سارے کام کو عجیب چکروں میں ڈال دیا ہے۔ ذرا متقیانہ شان ملاحظہ ہو کہ اللہ سے بات بنا رکھی ہے اور فوائد اور کامیابیوں کی نسبت بڑے اہتمام سے اس کی طرف پھیری جا رہی ہے۔ گویا پروپیگنڈہ فلسفیانہ ہی نہیں بڑا متقیانہ بھی تھا مگر یہ منافقانہ شان اتقا جو رسولؐ جیسے سربراہ کار تحریک کی خیر خواہی و اطاعت کا اتنا بھی حق ادا نہ کر سکی جتنا اسلام نے ایک حبشی غلام تک کی امارت کے لیے طلب کیا ہے اور جو خدا کے رسولؐ اور تحریک اسلامی کے بہترین عنان بردار سے بالا بالا خدا سے رشتہ قرابت جوڑ رکھنا چاہتی تھی' اس سے بڑھ کر خود فریبی کی اور کون سی شکل ہو گی جو انسان نے اپنی تباہی کے لیے ایجاد کی ہو۔ اس موقع پر یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "حسنات" کی جو نسبت وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے تھے وہ بربنائے شکر و اعتراف نہ تھی' بلکہ ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ حالات کے اندر جو اچھے پہلو ابھر آتے ہیں اور معرکہ آرائیوں سے جو مفید نتائج برآمد ہو جاتے ہیں ان

اخلاقی نظام جماعت کی پیچیدگیاں:

یہ فضا شیطان کے لیے کام کرنے کا بہترین اور وسیع میدان اپنے اندر رکھتی تھی۔ خاص طور پر اس کے دو پہلو فتنہ پردازوں کے حق میں جاتے تھے۔ تحریک اسلامی کا جماعتی نظام اخلاقی نظام تھا۔ اخلاقی نظام کی ایک خاص پیچیدگی یہ ہے کہ اس میں صریح قابل گرفت واقعات جب تک ثابت شدہ حقائق کی شکل اختیار کر کے سامنے نہ آجائیں' ان پر نہ جماعت گرفت کر سکتی ہے اور نہ خرابی محسوس کرنے والے افراد حالات کے دھندلے پس منظر کو آخری نتائج نکلنے سے قبل بر سر عام لا سکتے ہیں۔ اسلام کا اخلاقی نظام جماعت اپنے افراد کو ایک دوسرے کے بارے میں سوئے ظن سے روکتا ہے۔ اور ایک مخلص آدمی آخری حد تک مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کے مشتبہ طرز عمل کے ہر جز کی بہتر سے بہتر تاویل کرتا رہے اور پھر اگر وہ غیر صحت مندانہ سلسلہ احوال کی بے شمار کڑیوں کے مل جانے پر اپنے ذہن کی گہرائی میں کوئی بری رائے قائم کر بھی لے تو بھی زیادہ سے زیادہ وقفہ اس انتظار میں گزارے کہ شاید اس کے سوئے ظن کی تردید کرنے والی کوئی واضح حقیقت سامنے آجائے۔

محض تاثرات ---- چاہے وہ اس کی اپنی نگاہ میں کتنے ہی وقیع کیوں نہ ہوں ---- اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کو ایک مقدمہ کے طور پر باقاعدہ جماعت کے سامنے لا کر نظم کو متحرک کیا جائے۔ ان وجوہ سے مدینہ میں اہل اخلاص مجبور تھے کہ وہ فتنہ پسندوں کی ابتدائی سرگرمیوں کو جو نجوی کے دھندلکے میں چل رہی تھیں چند ناخوش آیند آثار و علائم کے سامنے آجانے پر بھی چپ چاپ دیکھتے رہیں۔ ہاں جب فتنہ کی فصل باقاعدہ برگ و بر لانے لگتی تو پھر کہیں جا کر اخلاقی نظام جماعت ان کو موقع دیتا کہ وہ زبان کھولیں' اور اجتماعی نظم کو حرکت میں لائیں۔

دوسری پیچیدگی اخلاقی نظام جماعت کی یہ ہوتی ہے کہ اگر ان کے سربراہ کار کی شخصیت اور اس کے دوسرے اہل حل و عقد اور ارباب امر کی ذوات کو کوئی لپیٹ میں لے لے تو ان کی پوزیشن بڑی نازک ہو جاتی ہے۔ ایک طرف وہی ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں جماعت کی انتظامی مشینری کی باگ ڈور ہوتی ہے اور جن کے ہاتھوں فتنوں کا سر کچلا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف فتنے انہی کو نشانہ بنا کر ایسی صورت پیدا کر دیتے ہیں کہ اگر وہ ارباب فتنہ کا پول ساری جماعت کے سامنے پوری طرح کھلنے سے پہلے ان کے خلاف کوئی کارروائی کریں تو ان پر الزام آتا ہے کہ تنقید اور اختلاف کو دباتے ہیں۔ اور آوازہ حق بلند کرنے والوں کو آمرانہ طریقوں سے شکست دیتے ہیں۔ جس طرح افراد کے معاملے میں کہا جا سکتا ہے کہ شرافت جہاں سب سے بڑی طاقت ہے وہاں شرافت ہی سب سے بڑی کمزوری بھی ہوتی ہے' بالکل اسی طرح جماعتوں کے لیے اخلاقی نظام ان کی سب سے بڑی پیچیدگی بھی ہے۔ اس پیچیدگی کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ جماعت اپنے مجموعی ذہن کے لحاظ سے اتنی بیدار اور اپنے کردار کے لحاظ سے اتنی مضبوط ہو کہ وہ اپنے

مزاج کے خلاف کسی چیز کو اپنے اندر چلنے نہ دے۔ اس کے دائرے میں کوئی گوشِ ہوش جماعتی نظم کے خلاف سرگوشیاں سننے کے لیے تیار نہ ہو اور کوئی زبان کان میں پڑی ہوئی ہر بات کو ادھر ادھر پھیلانے کی جرأت نہ کرے۔ مگر اس انتہائی معیار تک عملاً جماعت کی جماعت کا پہنچنا اور ہر آن اس پر قائم رہنا مشکل ہے۔ گھٹیا باتیں سوچنے والے دماغوں' ان کو پھسلانے والی زبانوں اور ان کو سننے والے کانوں سے کوئی انسانی معاشرہ بالکل ہی پاک نہیں ہو سکتا۔ انسانی فکر' نطق اور سماعت میں سے شیطان کچھ نہ کچھ حصہ لے ہی اڑتا ہے۔

منافقین نے اخلاقی نظام کی اس ڈھیل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا' لیکن انجام کار کے لحاظ سے وہ اس کی زبردست طاقت کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ ان کے پورے کارنامے کا خلاصہ قرآن کی زبان میں بس یہ تھا "هموا بما لم ينالوا" وہ جس مقصود کی طرف جھکے تھے۔ اس تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ مگر جماعت کو پریشان تو کیا۔ اسے اضطراب میں تو ڈالے رکھا۔

نجوٰی کی اس سازگار فضا میں جس میں تحریک کے علمبردار اولین کی ذات ہدف بنی چلی آرہی تھی اور یکے بعد دیگرے اس کے خلاف ناوک اندازیاں ہو رہی تھیں' ناپاک سے ناپاک بہتان کے کسی طوفان عظیم کا اٹھا دینا ہرگز ناممکن نہ تھا' بشرطیکہ کوئی اچھا موقع قسمت سے فتنہ پردازوں کے ہاتھ آ جائے۔ شیطان کو اس فضا سے فائدہ اٹھانے اور منافقین کے گروہ کو ڈھنگ سے استعمال کرنے کے لیے دوسری ضرورت ایک فعال کردار کی تھی جس کا ذہن شرارت اٹھانے کے لحاظ سے موجدانہ اور تخلیقی ہو اور جسے نجوٰی کے پیدا کردہ بارود کے ڈھیر میں بی جمالو کی طرح ایک چنگاری اٹھا پھینکنے کی جسارت حاصل ہو۔ سو اس طرح کا فعال کردار عبداللہ بن ابی کی صورت میں پہلے ہی موجود تھا۔ اس شخص کے اندر اپنی شخصیت اور اہمیت کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا...... آخر ہجرت سے پہلے مدینہ کی بادشاہت کا تاج اسی کے سر پر تو رکھے جانے کے لیے زیر تیاری تھا! لیکن محمد ﷺ کا وجود اس کی تمناؤں کے راستے میں روک بن گیا۔ بادشاہت تو دور رہی' اسے اپنے کردار کے سبب تحریک اسلامی کے دائرے میں آکر مرتبۂ اولیں تو کجا' مرتبۂ ثانی و ثالث تک بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اس حادثے نے اس کے ذہن میں بڑا تلخ اور زہریلا ردعمل پیدا کر دیا۔ اور یہ ردّعمل ہر آن ایک نہ ایک نئے فتنے کی شکل میں مدوجزر پیدا کرتا رہتا تھا۔ شیطان انسانوں میں براہ راست تو بہت ہی تھوڑا کام کرتا ہے۔ اسے آلۂ کار کے طور پر شیاطینِ انس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور شیاطینِ انس کو فی سبیل اللہ فساد میں متحرک رکھنے کے لیے وہ ان کے اوپر کوئی سرخیل چاہتا ہے۔ کوئی امام فتنہ! یہ امام فتنہ اسے مدینہ میں بنا بنایا ہاتھ آگیا اور تھا بھی وہ تحریک اسلامی کے دائرے کے اندر! یہ ایک شخصیت ایک پیغمبر کی قیادت میں چلنے والی تحریک پر بظاہر ایماناً و صدقاً بھی کہہ چکی تھی اور دوسری طرف اسی پیغمبر کی ذات اور اس کے مشن کے ساتھ ہر پہلو سے بھڑ بھی رہی تھی۔

انانیت (Self - Importance) کے زیر اثر اس فعال کردار نے بڑے تاریخی موقع پر اپنے جذبہ حسد

کے بھڑکتے آتش دان میں سے چنگاری اٹھا کر حرم نبویؐ میں ڈال دی۔ اور آناً فاناً سارا معاشرہ ذہنی حیثیت سے بھڑ بھڑ جلنے لگا۔

حضرت عائشہؓ کی آپ بیتی:

اس طوفان عظیم میں حضرت عائشہؓ کے سفینہ قلب و روح پر جو کچھ گزری اس کی مستند تفصیل خود آں جنابؓ اور دوسرے رواۃ کی زبانی حدیث' سیرت اور تاریخ کی اہم کتابوں میں محفوظ ہے۔ میرے سامنے اس وقت زاد المعاد (ملاحظہ ہو' جلد ۲ صفحہ ۱۵۔ ۱۱۳) اور سیرت ابن ہشام (ملاحظہ ہو جلد سوم صفحہ ۲۹۷۔۳۴۲) جیسے مستند ماخذ ہیں لیکن چونکہ صاحب تفہیم القرآن نے حضرت عائشہؓ کی روداد کا بہترین الفاظ میں ترجمہ کردیا ہے' لہٰذا اسی کو مستعار لیتا ہوں [1]:

"مدینہ پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی رہی۔ شہر میں اس بہتان کی خبریں اڑ رہی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے کانوں تک بھی بات پہنچ چکی تھی۔ مگر مجھے پتہ نہ تھا۔ البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ آپ گھر میں آتے تو بس یہ پوچھ کر رہ جاتے کیف تیکم (کیسی ہیں یہ؟) اس سے زاید کوئی کلام نہ کرتے۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ آخر آپؐ سے اجازت لے کر میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی تاکہ وہ میری تیمار داری اچھی طرح کر سکیں۔ ایک روز رات کے وقت حاجت کے لیے میں مدینے کے باہر گئی۔ اس وقت تک ہمارے گھروں میں یہ بیت الخلاء نہ تھے اور ہم لوگ جنگل ہی جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ مسطح بن اثاثہ کی ماں بھی تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں۔ (دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے خاندان کی کفالت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ذمے لے رکھی تھی' مگر اس احسان کے باوجود مسطح بھی ان لوگوں میں شریک ہوگئے تھے جو حضرت عائشہؓ کے خلاف اس بہتان کو پھیلا رہے تھے) راستے میں ان کو ٹھوکر لگی۔ اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: غارت ہو مسطح! میں نے کہا: اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو' اور بیٹا بھی وہ جس نے جنگ بدر میں حصہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا' بیٹا! کیا تجھے اس کی باتوں کی کچھ خبر نہیں؟ پھر انہوں نے سارا قصہ سنایا کہ افتراء پرداز لوگ میرے متعلق کیا باتیں اڑا رہے ہیں۔ (منافقین کے سوا خود مسلمانوں میں سے جو لوگ اس فتنے میں شامل ہو گئے تھے ان میں مسطح' حسان بن ثابت مشہور شاعر اسلام اور حمنہ بنت جحش (حضرت زینبؓ کی بہن) کا حصہ سب سے نمایاں تھا۔) یہ داستان سن کر میرا خون

---

[1] ماہنامہ ترجمان القرآن جلد ۳۵ عدد ۲ ص ۱۹۔۱۷

خشک ہو گیا۔ وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لیے آئی تھی' سیدھی گھر گئی اور رات بھر رو رو کر کاٹی (اس موقع پر ابن ہشام کی لی ہوئی روایت میں یہ الفاظ بڑے اہم ہیں کہ "رونے کا عالم یہ رہا کہ مجھے اندیشہ ہو گیا کہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا"۔

حضرت عائشہؓ اس کرب میں جان گھلا رہی تھیں لیکن شہر بھر میں چہ میگوئیوں کا ایک چکر چل رہا تھا۔ ان کی طرف سے سب سے بڑھ کر صفائی دے سکنے والے ان کے والد اور شوہر ہی ہو سکتے تھے جو ان کے ذہن و کردار کا قریبی اور تفصیلی علم و تجربہ رکھتے تھے مگر اس طرح کے بہتان جب ظالم لوگ لگا دیتے ہیں تو جو جتنا قریبی ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ پیچیدگی میں پڑ جاتا ہے۔ اس کی صفائی بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ والد اور شوہر دم بخود تھے اور چار جانب سے زبانوں کے چھوڑے ہوئے تیر کھا رہے تھے۔

انسانیت کے محسنِ اعظم پر یہ گھڑیاں جس درجہ شاق گزری ہوں گی --- ذاتی لحاظ سے بھی' اور تحریک کے مفاد کے لحاظ سے بھی ---- ان کا کچھ تھوڑا اندازہ ہر شریف اور حساس اور ذمہ دار آدمی کر سکتا ہے۔ صبر و سکوت سے بہت کام لیا۔ لیکن اس نازک معاملہ کو موجودہ حالت میں معلق تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ادھر یا ادھر کوئی ایک فیصلہ ناگزیر تھا۔ سو حضورؐ نے غیر جانب دارانہ طریق سے تحقیق شروع کی۔ اپنے دو قریبی رفقاء حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ بن زید کو طلب فرمایا۔ اور ان سے رائے طلب کی۔ حضرت اسامہؓ نے عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! وہ آپؐ کی زوجہ محترمہ ہیں اور ہم ان کے بارے میں بجز خیر کے کچھ نہیں پاتے' یہ سب کچھ کذب اور باطل ہے جسے پھیلایا جا رہا ہے"۔ [1] حضرت علیؓ نے بالکل دوسرے ہی پہلو سے مسئلے کو لیا۔ اور فرمایا: "یا رسولؐ اللہ! عورتوں کی کمی نہیں۔ آپؐ اس کے بجائے دوسری بیوی کر سکتے ہیں۔ یوں آپ لونڈی کو بلا کر تحقیق فرمالیں" [2] اصل میں حضرت علیؓ کا منشاء یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ حضورؐ پریشان رہیں' کیوں نہ ایسی بیوی کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کر لیں جس کے بارے میں ایک طوفان اٹھا دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے خاص رشتے کی وجہ سے اس معاملے کے تحریکی پہلو کی بہ نسبت حضورؐ کی ذاتی پریشانی کو زیادہ اہمیت دی اور وہ رائے دی جس سے آپؐ اس ذہنی الجھن سے نکل کر مطمئن ہو جائیں۔

تاہم حضرت علیؓ کے مشورہ کا دوسرا جز سرورِ عالمؐ نے قبول فرمالیا اور اس کے مطابق گھر کی خادمہ کو طلب کیا گیا۔ حضرت علیؓ نے چھوٹتے ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا اور مار کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سچ سچ کہہ دو۔ اس نے کہا: "خدا کی قسم میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتی اور میں اس کے علاوہ اور کوئی نقص عائشہؓ میں نہیں نکال سکتی کہ میں آٹا گوندھتی تھی اور کہہ کر جاتی کہ ذرا اسے دیکھتی رہنا' اور وہ پڑی

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۳۳۶-۳۳۵

[2] ایضاً

پڑی سو جاتیں اور بکری آکر آٹا کھا جاتی"۔ ❶ اس بے ساختہ بیان میں خادمہ نے جتنی مکمل صفائی حضرت عائشہؓ کی دے دی تھی اس پر کوئی دوسرا بیان مشکل ہی سے اضافہ کر سکتا ہے۔ اس نے ایک ایسی بھولی بھالی اور سادہ منش لڑکی کا حقیقی نقشہ پیش کر دیا جس نقشے میں کسی شر کو انسانی عقل نصب نہیں کر سکتی ----

اس کے ساتھ ساتھ دوسرا اقدام تحریک اسلامی کے سربراہ اعلیٰ ❷ نے یہ کیا کہ مجلس عام میں خطاب فرمایا۔ حمد و ثنا کے بعد بڑے درد بھرے الفاظ زبان سے نکلے۔

"آخر ان لوگوں کا مدعا کیا ہے جو مجھے میرے اہل خانہ کے بارے میں دکھ دیتے ہیں اور ان کے متعلق خلاف واقعہ باتیں کہتے پھرتے ہیں' خدا کی قسم' ان کے بارے میں بجز بھلائی کے کوئی اور بات میرے علم میں نہیں ہے اور وہ یہ بات ایک ایسے شخص کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کی طرف سے بھی بھلائی کے سوا میرے علم میں کوئی اور بات نہیں ہے اور اس نے میرے گھر میں بھی میری موجودگی کے بغیر کبھی قدم نہیں رکھا۔" ❸

دوسری روایت میں ابتدائی الفاظ یہ ہیں:-

"کوئی ہے جو مجھے اس شخص سے بچائے جو میرے گھر والوں کے بارے میں مجھے ایذا دیتا ہے"۔ ❹

یہ سن کر قبیلہ اوس کے سردار اسید بن حضیر نے اٹھ کر عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! اگر ایسے لوگ ہمارے قبیلے کے ہوں تو ہم ان سے نمٹ لیں گے اور اگر ہمارے خزرجی بھائیوں میں سے ہوں' تو آپؐ حکم دیں' خدا کی قسم! ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی گردنیں اڑا دی جائیں"۔ دوسری طرف سے خزرجیوں کے سردار سعد بن عبادہ بھنا کر اٹھے اور کہا' "جھوٹ کہتے ہو' بخدا ہم ان کی گردنیں نہیں ماریں گے۔ ہاں ہاں! خدا کی قسم! تم نے یہ بات اسی بنا پر کہی ہے کہ ان کا تعلق خزرج سے ہے"۔ حضرت سعد کا یہ خلاف توقع جواب اسید بن حضیر کو سخت ناگوار گزرا۔ انہوں نے غالباً یہ محسوس کیا ہو گا کہ جس جماعت میں مجرموں اور فسادیوں اور شرپسندوں کو پناہ اور سرپرستی کسی نمایاں شخصیت کی طرف سے حاصل ہو جاتی ہے اس کے لیے اجتماعی ماحول کی تطہیر آسان نہیں رہتی۔ عبداللہ بن ابی جیسے تحریکوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک مضبوط اور خود شناس نظام جماعت کا معدہ ایسی مکھیوں کو جزو بدن نہیں بننے دیتا بلکہ اگل پھینک

---

❶ ایضاً۔ سیرت ابن ہشام۔ ج ۳ ص ۳۴۶

❷ سیرت ابن ہشام کی روایت کے بموجب واقعہ کا یہ جزء ترتیب وقوع کے لحاظ سے مقدم تھا۔ ملاحظہ ہو جلد سوم ص ۳۴۶

❸ سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۳۴۵

❹ زاد المعاد جلد ۲ ص ۱۱۴

دیتا ہے۔ البتہ اگر کسی شرپسند کو کسی نظام جماعت کے اندر ممتاز اور مضبوط افراد اپنے پروں کے نیچے بینے والے مل جائیں تو پھر مار ہائے آستین پرورش پاتے رہتے ہیں اور جماعتوں کو ان کے ڈنک کھانے پڑتے ہیں۔ اسی تلخ حقیقت کے احساس کی بنا پر حضرت اسید شدت جذبات میں بول اٹھے: "غلط تم کہتے ہو۔ بخدا! بلکہ تم خود منافق ہو' جبھی منافقوں کی وکالت و حمایت کرتے ہو" ❶

یہ ناخوشگوار تر صورت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ اوس و خزرج کے درمیان کھچاؤ پیدا کرنے کے لیے بھی تو متواتر فتنہ کی بارود بچھائی جا رہی تھی۔ جبھی ذرا سی بات پر جذباتی ہیجان پیدا ہو گیا اور جماعت کے دو گونہ عناصر متحرک ہو گئے۔ کچھ ادھر سے اٹھے کچھ ادھر سے' اور قریب تھا کہ اوس و خزرج باہم دگر گتھ جائیں۔ دونوں قبیلوں کو شیر و شکر کرنے والے قائد جلیل کو یہ گوارا نہ تھا کہ برسوں کی محنت سے بندھا ہوا یہ شیرازہ اس کی ذات کی وجہ سے درہم برہم ہو جائے' اور خود تحریک ہی کی چولیں ہل جائیں۔ آپؐ منبر سے اتر آئے۔ لوگوں کو ٹھنڈا کیا۔ اور مجلس برخاست کر دی۔ ❷

حضورؐ کے لیے جماعت کے اس کمزور پہلو کا یہ نیا تجربہ پہلی پریشانی میں کتنے اضافہ کا موجب بن گیا ہو گا۔ یہ دراصل عصبیت کی وہی بارود پھٹ رہی تھی جسے عبداللہ بن ابی غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر دلوں کی گہرائیوں میں بچھا چکا تھا۔

کہانی کا آخری حصہ بھی' جس نے حزنیہ کو طربیہ بنا دیا' خود اس کہانی کے مرکزی کردار (حضرت عائشہؓ) کی زبانی ہی سنیے:

> اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اڑتی رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ و سلم سخت اذیت میں مبتلا رہے۔ میں روتی رہی۔ میرے والدین انتہائی پریشانی اور رنج و غم میں مبتلا رہے۔ آخر کار ایک روز حضورؐ تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے۔ اس پوری مدت میں آپؐ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور ام رومان (حضرت عائشہؓ کی والدہ) نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ دونوں بھی پاس آ کر بیٹھ گئے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ عائشہ مجھے تمہارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری برأت ظاہر فرما دے گا اور اگر تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو۔ بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے۔ (بے گناہ آدمی سے اسی فطری کیفیت کی توقع کرنی چاہیے۔)
>
> میں نے اپنے والد سے عرض کیا' آپ رسول اللہ کی بات کا جواب دیں۔ انہوں نے فرمایا۔

---

❶ سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۳۴۵

❷ ایضاً

بٹی! میری کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا آپ ہی کچھ کہیں۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ میں حیران ہوں' کیا کہوں۔ اس پر میں بولی' آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے۔ اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں ---- اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں ---- تو آپ لوگ نہ مانیں گے' اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی ---- اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی ---- تو آپ لوگ مان لیں گے۔ میں نے اس وقت حضرت یعقوبؑ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر یاد نہ آیا۔ (ایک بے گناہ جب کسی بھاری الزام کی زد پر آکر لاینحل اضطراب میں پڑتا ہے تو اس کے عالم نفسیات میں ایسے ہی حوادث صادر ہوتے ہیں۔) آخر میں نے کہا' اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسفؑ کے والد نے کہی تھی کہ فصبر جمیل (یوسف۔ ۱۸) (اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جب کہ حضرت یعقوبؑ کے سامنے ان کے بیٹے بن یمین پر چوری کا الزام بیان کیا گیا تھا) یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی' بے بسی اور اس کے ساتھ یہ عالم بے نیازی' پھر اسی نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جب کہ کسی بے گناہ پر کوئی الزام چسپاں کیا گیا ہو۔ میں اس وقت اپنے دل میں کہہ رہی تھی' کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے۔ اور وہ ضرور حقیقت کھول دے گا۔ اگرچہ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہو گی جو قیامت تک پڑھی جائے گی۔ میں اپنی ہستی کو اس سے کمتر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے۔ مگر میرا یہ گمان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کوئی خواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالیٰ میری برأت ظاہر فرما دے گا۔ اتنے میں یکایک حضورؐ پر وہ کیفیت طاری ہو گئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ سخت جاڑے کے زمانے میں بھی موتی کی طرح آپؐ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں' وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیے اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ وہ کیفیت دور ہوئی تو حضورؐ بے حد خوش تھے۔ آپؐ نے ہنستے ہوئے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ مبارک ہو عائشہؓ! اللہ نے تمہاری برأت نازل فرما دی اور اس کے بعد حضورؐ نے دس آیتیں سنائیں۔ میری والدہ نے کہا' اٹھو اور رسول اللہ کا شکریہ ادا کرو' میں نے کہا میں نہ ان کا شکریہ ادا کروں گی نہ آپ دونوں کا! بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتی ہوں جس نے میری برات نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو اس بہتان کا انکار تک نہ کیا"[1] (ذرا یہ شکوہ بھرا غیورانہ انداز گفتگو

---

[1] تفہیم القرآن۔ ماخوذ از ماہنامہ ترجمان القرآن جلد ۳۵ ص ۱۰-۹

ملاحظہ ہو' کیا یہ کسی مجرم ضمیر کی ترجمانی کرتا ہے)؟
اس آپ بیتی کا ہر ہر لفظ بول کر کہہ رہا ہے کہ یہ ایک بے گناہ کی داستان درد ہے جو ہر تصنع سے پاک ہے اور جس میں حقیقی کرب کا بے ساختہ اظہار ہے۔

تبصرہ' تجزیہ اور تزکیہ:

پروپیگنڈہ کے اس طوفان اور اس کے پیدا کردہ بحران (Crisis) کی اتھاہ تاریکیوں کا توڑ کرنے کے لیے یکایک افق وحی چمک اٹھا۔ معاشرے کے ذہنی عالم میں صبح الہام نمودار ہوئی' اور آیات بینات کی کرنیں روحانی فضاؤں میں رقص کرنے لگیں۔ کیا ہی خوب مناسبت تھی کہ جو سورۃ اس بحران کا ازالہ کرنے اتری' اس کا نام سورۂ نور قرار پایا۔ اس سورۃ میں جماعت اور معاشرہ پر تبصرہ کیا گیا' اس کی کمزوریاں واضح کی گئیں' اور ان کمزوریوں سے اسے مستقل طور پر پاک کر دینے کے لیے قانونی اور اخلاقی ہدایات دی گئیں۔

اس معرکہ آرا سورۃ کے مضمون کی اٹھان ہی چونکا دینے والی ہے۔ فرمایا گیا:

"یہ ایک سورت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ اور جسے ہم نے ذمہ داری کے طور پر ------ (اسلامی معاشرے کے لیے) لازم ٹھہرایا ہے اور جس میں ہم نے نہایت واضح باتیں پیش کر دی ہیں۔ شاید کہ تم لوگ ان سے استفادہ کرو"! (آیت ۔ ۱)

اب سورہ نور کی صدا معاشرے میں گونجتی ہے۔

"جو لوگ یہ بہتان گھڑ کر لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولا ہیں ------ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا' اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا' اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا' اس کے لیے تو عذاب عظیم ہے۔ (آیت ۔ ۱۱)

کتنا بڑا طنز ہے' کہ ایک بے ثبوت الزام جس کے لیے کوئی واضح قرینہ موجود نہ تھا وہ ایک طوفان کی طرح اٹھا اور کسی بیرونی دشمن اور حریف کی طرف سے نہیں' بلکہ خود برسوں کی تربیت یافتہ مسلم جماعت کے اپنے اندر سے اٹھا۔ پھر یہ ایک آدمی کی وقتی لغزش نہ تھی' مہینہ بھر تک ایک ٹولے کا ٹولا ذہنی مدوجزر پیدا کرتا رہا۔ جتایا جا رہا ہے کہ تمہارے جماعتی ماحول میں یہ کمزوری موجود ہے کہ اس کے معمار ہی اس کی تباہی کی مہم چلا دیں۔ اس فضا میں ایسے رخنے ہیں کہ علمبرداران صداقت کی سوسائٹی میں جھوٹ برگ و بار لائے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ یہ بہتان نہیں تھا' عصیان کی ایک بہتی گنگا تھی جس سے کسی نے خم اور کسی نے جام بھرا۔ اور کسی نے چلو ہی لیا ---- سو جس نے جتنا بھی حصہ لیا اپنے لیے برائی ہی سمیٹی۔ پھر اشارہ کیا گیا اس سرخیل فتنہ اور اس امام شر کی طرف جس نے پہلی چنگاری ڈالی تھی اور پھر برابر شعلوں کو دامن سے ہوا دیتا رہا۔ یعنی عبداللہ بن ابی۔

سورہ نور سوال کرتی ہے کہ:

"جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اسی وقت کیوں نہ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟" (آیت۔ ۱۲)

کتنی اخلاقی اپیل ہے اس میں ---- شریفانہ جذبات اور مومنانہ حس کے لیے کتنا تیز کچوکا ہے ان الفاظ میں! مدعا یہ ہے کہ محض اتنی سی بات کہ اسلامی معاشرہ کی ایک شریف ترین خاتون قافلے سے بچھڑ جاتی ہیں اور اسی معاشرے کا ایک دوسرا معزز رکن ان کو راستے میں پاکر ساتھ لے آتا ہے' تمہارے لیے درجۂ آخر کی بدگمانی کی بنیاد کیوں بن گئی؟ کیا تم میں سے کوئی مرد و عورت ایک اتفاقی حادثے کے طور پر اس صورت سے دو چار ہوتا تو وہ لازماً اسی پستی میں گرتا؟ کیا اپنے اخلاق و کردار کے بارے میں تمہارا اندازہ یہی تھا؟ کیا تمہارے معاشرے کی سطح اتنی گری ہوئی ہے کہ اس کے دو افراد اگر اتفاقاً علیحدگی میں رہ جائیں تو وہ بدکاری سے ورے ورے نہیں رکنے کے! اگر تم اپنے بارے میں اس پستی کا تصور نہیں کر سکتے تو تمہیں اپنی جماعت کی ایک بہترین خاتون اور اس کے ایک ممتاز رکن کے بارے میں ایسا ذلیل تصور باندھنے کا کیا حق تھا؟

اور اس معاشرے کی بڑی اکثریت اس دور بحران میں بھی اپنی اخلاقی عظمت پر قائم تھی' ورنہ اگر سارا جسم اس زہر کو قبول کر لیتا اور اس کی ذہنی مدافعت کرنے میں عاجز رہ جاتا تو یہ حملہ اس کا شیرازہ وجود بکھیر کر رکھ دیتا۔ کتنا صحیح رد عمل تھا حضرت ابو ایوب انصاری کا' جب ان کی بیوی نے ان سے ان گندی افواہوں کا تذکرہ کیا۔ وہ کہنے لگے: "ایوب کی ماں! اگر تم عائشہؓ کی جگہ اس موقع پر ہوتیں تو کیا ایسا فعل کرتیں؟" وہ بولیں۔ "خدا کی قسم! میں یہ حرکت ہرگز نہ کرتی"۔ حضرت ابو ایوب نے کہا' "تو عائشہؓ تم سے بدرجہا بہتر ہیں' اور میں کہتا ہوں کہ اگر صفوان کی جگہ میں ہوتا تو اس طرح کا خیال تک نہ کر سکتا تھا۔ صفوان تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے۔" [1]

اس کے بعد سورہ نور قانونی نقطہ نظر سے سوال اٹھاتی ہے کہ:

"وہ لوگ (اپنے الزام کے ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں"۔ (آیت۔ ۱۳)

یعنی کسی مرد و عورت کی عصمت کے دامن پر دھبہ ڈالنا محض ایک دل لگی نہیں ہے' یہ ایک سنگین معاملہ ہے اور اس پر ایک زندہ نظام معاشرہ میں قانونی کارروائی واجب ہو جاتی ہے۔ جس طرح کسی شریف شہری کے بارے میں اٹھ کر یہ کہہ دینا کہ اس نے قتل کیا ہے' اس نے چوری کی ہے' اسی طرح ---- بلکہ

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۸۔ ۳۲۷

اس سے بڑھ کر --- یہ دعویٰ کرنا کہ فلاں شخص نے بدکاری کی ہے' ایک سرسری سی بات نہیں ہے کہ آئی گئی ہو جائے۔ یہ انتہائی ذمہ دارانہ احساس چاہتی ہے۔ ایسے الزام لگانے پر ان کا ثبوت دینا اور ان کے لیے قانونی شہادت فراہم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اب جو لوگ اسلامی معاشرہ کے دو شریف اور معزز شہریوں کے متعلق اپنی آنکھوں سے کوئی بات دیکھے بغیر محض افسانہ طرازی کے طور پر ایک بہتان کا چرچا کرتے پھر رہے ہیں ان کا فرض یہ ہے کہ وہ ثبوت اور شہادت لائیں۔ ورنہ قانون کے مطابق وہ خود جھوٹے اور مجرم ہیں۔

پھر سورہ نور مسلم معاشرہ کے کمزور عنصر کی کمزوری کو نمایاں کرتی ہے کہ:

"ذرا غور تو کرو' اس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے' جب کہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا' تم نے اسے ایک معمولی بات سمجھا' حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات ہے۔ کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا۔ سبحان اللہ یہ تو ایک بہتان عظیم ہے۔ (آیت ۱۵۔۱۶)

یہ کسی بھی معاشرے اور کسی بھی نظام جماعت کی ---- خصوصاً جب کہ وہ دنیا بھر کی اخلاقی اصلاح کے لیے قائم ہوا ہو اور اس کے زیر اثر ایک تمدنی و سیاسی تحریک بھی چل رہی ہو ---- بڑی بھاری کمزوری ہے کہ اس میں بے سروپا اور بے ہودہ اور غیر ذمہ دارانہ باتوں کا آسانی سے چلن ہو سکے۔ کان جو کچھ سنیں' اٹھا کر دل میں رکھ لیں اور دل زبانوں کے حوالے کر دیں اور زبانیں آگے منتقل کرتی چلی جائیں۔ کوئی غور و تامل نہ ہو' کوئی تحقیق نہ ہو' کوئی رد و کد نہ ہو' اور کسی جگہ جا کر سلسلہ رکے نہیں۔ جو جس شخص کے خلاف جیسے کچھ کلمات بھی کہتا جائے' بالکل جھوٹ ہو۔ جو جس کی پگڑی اچھالنا چاہے اسے پوری آزادی ہو اور جو جس کے دامن عفت کی دھجیاں بکھیرنا چاہے ماحول اسے وسیع موقع بہم پہنچا دے۔ اچھا چمن افکار و کردار ہو گا جس میں فتنہ کا مالی کانٹے بوتا رہے اور زبانوں کی کیاریاں کانٹے اگاتی رہیں۔ جس معاشرے میں سرور عالم (صلی اللہ علیہ و سلم) اور عائشہؓ صدیقہ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور صفوانؓ جیسی ہستیاں ایک منافق کے چھوڑے ہوئے شوشے سے محفوظ نہیں رہ سکتیں اس میں اور کس کی عزت و آبرو کی خیر ہو گی۔

سورہ نور کی آواز میں ایک گونج اور پیدا ہوئی:

"جو لوگ پاک دامن اور بھولی بھالی ایمان دار عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے"۔ (آیت۔ ۲۳)

اس آیت میں تو گویا حضرت عائشہؓ کے کردار کی تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی۔ ایک ایمان دار اور پاک دامن خاتون جو مزاج کی سیدھی سادھی تھیں اور جن کو تصور تک نہ تھا کہ بدچلنی کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے اور جن کے حاشیہ خیال میں بھی کبھی یہ اندیشہ نہ گزرا ہو گا کہ کوئی ان پر بھی ایک گھناؤنا الزام لگا دے گا اس آیت میں ان کی مظلومیت پوری طرح بول رہی ہے۔ مظلومیت کی یہ تصویر اخلاقی طور پر ایک

ایک دل کو جھنجوڑ دیتی ہے۔

بدقسمتی سے جو مخلص' ایمان دار اور رسول اللہ ﷺ اور جماعت اور تحریک کے وفادار افراد اس سیل تند و تیز میں بہہ گئے تھے' ان میں سے ایک وہ ہستی بھی ہے جس نے تحریک کی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ اور جس نے اس کے فکری و ادبی سرمائے میں اضافہ کیا تھا۔ یہ تھے حسانؓ بن ثابت۔ سورہ نور کی الہامی شعاعیں جن حساس لوگوں کے دلوں میں نشتر بن کر اتر رہی تھیں آج حسانؓ بھی ان کے زمرے میں تھے۔ ان کا مرتبہ دائرہ تحریک اور دربار نبوت میں خاصا بلند تھا۔ مختلف مواقع پر حضورؐ بطور خاص فرمائش کرتے اور توجہ دلاتے کہ شعر و ادب کی جاہلی طاقت کے حملوں کا جواب شعر و ادب ہی سے دیں' اور اسلام کی ترجمانی کریں۔ اس سعادت کا تصور کیجئے کہ محسنؐ انسانیت نے حسانؓ کو خود منبر پر بٹھایا کہ وہ اسلامی تحریک کا ترانہ الاپیں۔ ان کے اسی مرتبہ کا لحاظ خود حضرت عائشہؓ کو اس قدر تھا' کہ اس بحرانی دور کے گزر جانے کے بعد وہ ہمیشہ ان کی عزت کرتی رہیں۔ بسا اوقات ان کو یاد دلایا جاتا کہ اس شخص نے آپ کے خلاف کیچڑ اچھالنے کی مہم میں حصہ لیا تھا' تو وہ شرافت نفس کے انتہائی بلند مقام سے فرماتیں کہ جانے دو' انھوں نے مخالف اسلام شعراء کو رسول اکرمؐ اور اسلامی تحریک کی طرف سے ہمیشہ پر زور جواب دیا ہے اور شاعری کے محاذ پر خاصا جوہر دکھایا ہے۔

لیکن امرواقعہ بہرحال یہی ہے کہ تحریک اسلامی کے یہ ممتاز فرد ---- منافقین کے اٹھائے ہوئے فتنہ کے گھیرے میں آگئے۔ اس بحران میں ان کا ---- اپنی جگہ مخلصانہ' مگر تحریک کے لیے نہایت مضر پارٹ دیکھ کر آدمی یہ درس عبرت حاصل کرتا ہے کہ نہ کوئی بہتر سے بہتر شخص اپنے بارے میں یہ ضمانت رکھتا ہے کہ وہ مغالطے کے کسی چکر میں نہ پڑے گا' اور نہ دوسری نمایاں ترین شخصیتوں کے بارے میں وہ بے فکر ہو سکتا ہے کہ وہ کسی فتنے کے گھیرے میں نہ آئیں گی۔ ہر انسان' بڑا ہو یا چھوٹا ہر وقت شیطان کی کمان سے نکلنے والے تیروں کی زد میں ہے۔ بلکہ فتنے ہر اہم اور بڑے آدمی کے گرد گھیرا ڈالنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے تحریک اسلامی کی دی ہوئی بنیادی فکر یہ ہے کہ اشخاص کے بجائے اصولوں کے گرد جماعت مجتمع ہو۔

عبداللہ بن ابی اور اس کے مریدوں کے لیے کتنی بڑی کامیابی تھی کہ انھوں نے تحریک اسلامی کے ایک ممتاز فرد کو شکار کرلیا تھا۔۔۔۔ منافقین نفاق کے مارے شرانگیزی کر رہے تھے اور حسانؓ بن ثابت اخلاص کے ساتھ ان کے برپا کردہ فتنے کو تکمیل تک پہنچانے میں سرگرم تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا' کہ تحریک کے لیے عبداللہ بن ابی کا نفاق اتنا خطرناک اور مضرنہ تھا جتنا حسانؓ بن ثابت کا اخلاص! جو اقدام اخلاص اور نیک نیتی سے کئے جاتے ہیں وہ ضرر رسانی میں زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔ بمقابلہ ان اقدامات کے جو دانستہ شرارت کے طور پر کیئے جاتے ہیں۔

حسانؓ بن ثابت اس بات کا احساس نہ کر سکے کہ وہ کن لوگوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں' وہ کیسے

افراد کے نقطہ نظر کو پھیلا رہے ہیں۔ وہ کن شخصیتوں کے خیالات و عزائم کی ترجمانی کر رہے ہیں اور ان کی حرکات و سکنات معاشرے کے کس عنصر کی حمایت میں جاری ہیں اور جماعت کی کیسی ٹولی کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہیں۔ مشیت ربانی تھی کہ وہ اس معاملہ میں فراست مومن سے کام نہ لے سکے۔

عبداللہ بن ابی کے ساتھ اسلامی معاشرہ کا معاملہ دوری اور بیگانگی کا تھا۔ اس کی کلوخ اندازی قابل برداشت تھی لیکن حسانؓ بن ثابت سے جماعت کی جو یگانگت تھی' اس کی وجہ سے جذبات میں کھولاؤ پیدا ہوتا تھا کہ ہمارے نیام کی ایک تلوار ہمارے ہی خلاف استعمال ہو رہی ہے۔ یہ صورت جب بھی کسی تحریک اور تنظیم میں پیدا ہوتی ہے تو صبر کے پیمانے لبریز ہو جاتے ہیں۔ صبر کے پیمانے لبریز ہوئے ہوں گے۔ مگر مسلم جماعت کا کڑا اخلاقی ڈسپلن جذبات کے آگے روک بنا کھڑا تھا۔ ایک شخصیت ایسی تھی جو ضبط برقرار نہ رکھ سکی۔ یہ صفوانؓ بن المعطل تھے۔ جن کو ایک یہ صدمہ تھا کہ حضرت عائشہؓ جو ان کے لیے بمنزلہ ماں کے تھیں ان پر تہمت لگائی جا رہی تھی اور دوسری طرف یہ کرب کہ افسانے کا دوسرا سرا خود ان کی ذات سے جوڑا گیا تھا۔ وہ شخص کہ جو اصحاب بدر میں سے تھا جس نے تحریک کی خدمات سرانجام دی تھیں جو جتی ستی ہونے کے لحاظ سے معروف تھا' جس کے کردار میں آج تک کوئی آثار فسق و فجور کے نہ پائے گئے تھے اور جس نے ایک شرمیلے بیٹے کی حیثیت میں حضرت عائشہؓ کو دیکھے بغیر اور سارے راستے بات کیے بغیر پوری احتیاط کے ساتھ پچھلے پڑاؤ سے لشکر گاہ تک پہنچایا تھا ان کا خون اس زیادتی پر بری طرح کھولا۔

صفوان نے حضرت حسان کے کچھ اشعار سنے جو منافقین کے لگائے ہوئے بہتان عظیم پر مشتمل تھے۔ زبان حضرت حسانؓ کی تھی' جسے وقتی طور پر اشرار کے خیالات نے مستعار لے لیا تھا۔ فن ان کا تھا اور ذہن غیروں کا بول رہا تھا۔

صفوانؓ کی ان سے جھڑپ ہو گئی اور انہوں نے تلوار سے وار کر دیا۔ ثابت بن قیس بن شماس نے موقع پر بچاؤ کیا اور صفوانؓ کو پکڑ کر باندھ لیا۔ اور بنی حرث کی حویلی میں لے گئے۔ آخر یہ قضیہ محسن انسانیتؐ کی خدمت میں پہنچا۔ حسانؓ اور صفوانؓ دونوں کی طلبی ہوئی۔ صفوان نے عرض کیا! "اے اللہ کے رسولؐ! اس شخص نے مجھے اذیت دی ہے اور میرے حق میں سخت بدگوئی کی ہے سو مجھ پر غصہ آسوار ہوا اور میں نے اسے مارا"۔ آپؐ نے ملامت سے حسانؓ کو سمجھایا بجھایا۔ اور بعد میں صفوانؓ کی طرف سے تلوار کے زخم کے بدلے دیت دلوائی [1]

صفوانؓ کی غیرت چونکہ بالکل فطری تھی سو حسانؓ بن ثابت نرم پڑ گئے۔ اور خدا نے ان کو اس خطرے سے بچا لیا کہ وہ کسی غلط جذبے کی رو میں آگے بہتے چلے جاتے۔ اور تحریک کے لیے مزید موجب ضرر

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۳۵۲

ہوتے۔

حضرت حسانؓ کا یہ جذبۂ ندامت آخر ایک قصیدے کی صورت میں اُمڈ پڑا' جس میں شعر کے پانی سے انھوں نے اپنے ہی لگائے ہوئے دھبے کو حضرت عائشہؓ کے دامن پاک سے دھونے کی کوشش کی۔ کیا خوب فرمایا:

حصان رزان ما تظن بریبة
و تصبح غرثی من لحوم الغوافل
مھذبة قد طیب اللہ خیمھا
وطھرھا من کل سوء وباطل
فان الذی قد قیل لیس بلائط
ولکنہ قول امری بی ماحل

"وہ ایک عفت مآب خاتون ہیں' پردہ نشین' ہر شک و شبہ سے بالاتر۔ وہ اس سے پاک ہیں کہ بھولی بھالی عورتوں کے عزت و ناموس سے تعرض کریں۔ وہ شائستہ اطوار ہیں۔ خدا نے ان کو مزاج کے لحاظ سے نکھارا' اور نکھارا ہے اور ان کو گناہ اور باطل سے پاک کیا ہے۔ وہ جو کچھ کہ اب تک کہا جا چکا ہے وہ موصوفہ پر چسپاں ہونے والا ہرگز نہیں ہے' وہ تو ایک ایسے شخص کی کہی ہوئی بات تھی' جس نے میرے سامنے نمک مرچ لگا کر اور جھوٹ گھڑ کر چغل خوری کی تھی"۔ [1]

پھر سورہ نور نے ایک معاشرتی حقیقت کو اصولی استدلال کے طور پر مسلم جماعت کے سامنے کھول کر رکھا کہ:

"خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے' پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ ان کا دامن پاک ہے ان باتوں سے جو گھڑنے والے گھڑتے ہیں"۔ (آیت۔ ۲۶)

یعنی ازدواج کے لیے یوں بھی ذہنی و اخلاقی لحاظ سے جوڑا تلاش کیا جاتا ہے اور نفسیاتی طور پر آدمی کی نگاہ انتخاب وہیں ٹکتی ہے جہاں اسے اپنے کردار کا عکس نظر آتا ہے۔ خصوصیت سے کسی اصول و مقصد کو لے کر جو لوگ ساری متاع حیات اس میں لگا دیتے ہیں' وہ ازدواجی رابطے کے لیے بھی ایسا ہی رفیق تلاش کرتے ہیں جو زندگی کے مشن میں مدد اور مفید ثابت ہو سکے۔ پھر عالمگیر پیمانے کی یہ تجربی صداقت کیسے نظر انداز کی جاسکتی ہے کہ نبھاؤ اور صلح و سازگاری کسی جوڑے میں تبھی ہوتی ہے کہ قلب و نظر کا جوڑ میل پیدا ہو جائے اور ذہن و کردار میں یکسانی ہو۔ ورنہ از اول تا آخر تصادم رہے گا۔ یہ آیت بہتان طرازوں کو

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۳۵۴۔ ۳۵۳

. دعوت فکر دیتی ہے کہ تم نے یہ نہ دیکھا کہ دائرہ ازدواج میں تحریک اسلامی کے بلند مرتبت رہنما کی نگاہ

انتخاب جس ہستی پر پڑی تھی، جس سے گہرا قلبی لگاؤ تھا اور جس کے ساتھ قلب و نظر کی سازگاری و ہم آہنگی ایک معیاری نمونہ تھی وہ کیا تمام تر ملمع کا کرشمہ تھی کہ ایک آن میں ملمع اتر گیا اور کھوٹ باقی رہ گیا۔

ایک پاکیزہ گھرانے کی نور چشم جس کے ماں باپ تحریک اسلامی کے اولین علمبرداروں میں سے تھے اور جس کا بچپن اسی تحریک کی نت اٹھتی گھٹاؤں کے سائے میں تربیت فکر و نظر پاتے گزرا، پھر جسے سرکار رسالت مآب کے ساتھ یکجائی کا شرف حاصل ہوا۔ جسے قریب ہو کر آپؐ کے نورانی کردار سے استفادہ کرنے کا سب سے بڑھ کر موقع ملا۔ جسے محسنؐ انسانیت کی تربیت کا فیضان خاص حاصل ہوا اور جس کے حجرے میں بارہا وحی و الہام کی کرنوں کی بوچھاڑیں ہوتی رہیں۔ کیا ایسے پاکیزہ ماحول کے سانچے میں ڈھلی ہوئی خاتون کا کردار ایسا ہونا چاہیے تھا کہ ایک غلیظ ترین بہتان کا جامہ اس کے قامت پر راست آجائے۔ درآنحالیکہ اس کے والدین کو اور نہ سرور عالمؐ کو اور نہ عام معاشرے کو اس کے بارے میں اس بہتان طرازی سے قبل ایسا کوئی اندازہ ہو سکا ہو۔ برسوں سے ایک کردار جو حسن و پاکیزگی کے خطوط پر ارتقا کرتا رہا ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ یکایک اس کے اندر سے ایک بدترین قسم کی گھناؤنی حرکت نمودار ہو جائے کہ جس کے کوئی ابتدائی آثار کبھی کسی کے سامنے نہ آئے ہوں۔ ایک شجرہ طیبہ کمال شادابی کے ساتھ پاکیزہ برگ و بار دیتے دیتے یکایک ایک دن خبیث پھل لے آئے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے؟

قانون حرکت میں آتا ہے:

سورہ نور کی روشنی سے اہل ایمان کے دلوں کی بستیاں جگمگا اٹھیں، رائے عام یکسو ہو گئی۔ معاشرہ نے مدوجزر کے ایک لمبے دور کے بعد اپنی سطح کو پرسکون اور ہموار کر لیا۔ سورہ نور حدِّ قذف کے قانون کا کوڑا اپنے ساتھ لائی تھی۔ سو جن جن اصحاب نے سرگرمی سے بہتان طرازی کی اس مہم میں حصہ لیا تھا اور جو اپنے اخلاص کی وجہ سے نادم ہو کر جرم کے اقراری بھی ہوئے اور جن کے بارے میں شہادت بھی موجود تھی انہوں نے اپنی پیٹھیں اسلامی نظام عدل و قانون کے سامنے پیش کر دیں اور اسی کوڑے کھا کر انہوں نے اپنے ضمیروں کی پاکیزگی کو بحال کر لیا۔ یہ تھے مسطح ابن اثاثہ، حسانؓ بن ثابت اور حمنہؓ بنت جحش۔

لیکن اصل بانی شروفساد قانون کی گرفت سے بچ نکلا ---- البتہ رائے عام کی نگاہ میں اس کی فطرت کی پستی مکمل طور پر آشکارا ہو گئی اور اسلامی معاشرے نے اسے بے وقعت بنا کر ایک طرف ڈال دیا۔

غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں اور کس ماحول اور کس جماعت میں (انبیاءؑ کے خصوصی استثنی کے ساتھ) انسانی فطرت مقام امتحان سے نکل کر عصمت کاملہ کی قدسیانہ سطح پر پہنچ سکتی ہے، لیکن قصہ آدمؑ کے دو متقابل کرداروں کی روشنی میں دیکھیں تو غلطی سرزد ہو جانے پر غلط کار کے سامنے دو راستے کھل جاتے

ہیں۔ ایک شیطان کا پسندیدہ راستہ --- کہ غلطی ہو جانے کے بعد اس پر آدمی ڈٹ جائے' اور الٹا بپھر جائے۔ دوسرا آدم علیہ السلام کی فطرت سلیم کا پسندیدہ راستہ ---- کہ غلطی کے بعد نادم ہو کر اپنی اصلاح کر لی جائے۔ سو عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی تو شیطانی راستے کی طرف مڑ گئے اور حسانؓ اور مسطحؓ اور حمنہؓ نے اصلاح کا راستہ اختیار کیا۔

عدو شرے برانگیزد کہ خیرمادراں باشد:

سلسلہ اوقات کو نگاہ تصور میں تازہ کریں اور اپنے آپ کو مدینہ کے اس ماحول میں لے جائیں جس میں یہ بہتان کا جھکڑ مہینہ بھر چلتا رہا تھا۔ تو ایک ہولناک اور دردناک سماں سامنے آتا ہے۔ ایک تحریک جو ایک ایک فرد کو آہستہ آہستہ ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے کاروان انقلاب کی شکل اختیار کر سکی تھی' جس نے کتنی ہی مرد آزما منزلوں کو پار کر کے اسلامی ریاست کا ایک چھوٹا سا گھروندا انسانیت کو پناہ دینے کے لیے سالہا سال کے لمبے دور فساد کے بعد کرہ ارضی کے ایک گوشے میں تیار کیا تھا' جو چاروں طرف سے دشمنوں کی زد میں تھی۔ اور جس کو ہر آن کسی نہ کسی جانب سے فوج کشی کا خطرہ تھا اور جو خود اپنے غیر مسلم شہریوں کی ایک بڑی تعداد کی شرارتوں کے گھیرے میں تھی' اس کے بالکل اندرون سے اگر ایک تباہ کن طوفان ابل پڑے تو اس سے بڑھ کر اور کون سا موقع اضطراب ہو سکتا تھا۔

لیکن قرآن نے تسلی دلائی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ---- "اسے اپنے حق میں موجب ضرر نہ سمجھو' یہ تو تمہارے لیے بھلائی کا ذریعہ ہے"۔ (نور --- ۱۱)

اور واقعہ یہ ہے کہ اصولی و انقلابی تحریکوں کے لیے ذہنی شکست و ریخت کے ہنگامے خواہ باہر سے اٹھیں' خواہ اندر سے ---- انجام کار کے لحاظ سے مزید فلاح و ترقی' تعمیر و اصلاح اور قوت و سطوت کا سامان بن کے رہتے ہیں۔ جس طرح اونچا مقصد رکھنے والے صلاحیت دار افراد کے لیے حوادث روزگار معاون ترقی ہوتے ہیں اسی طرح روح فکر و عمل رکھنے والی تحریکوں کے لیے مخالفتوں اور مزاحمتوں اور فتنوں کے طوفان وسیلہ استحکام و ارتقا بن جاتے ہیں' جس نظام جماعت میں نصب العین کا شعور کارفرما ہو' جس کا ایک اجتماعی ذہن بن چکا ہو' جس کا فکری و اخلاقی مزاج پختہ ہو چکا ہو' جس کے سر پر ایک فعال اور بیدار مغز قیادت بیٹھی ہو اور جس میں فتنوں اور مخالفتوں کے ہر مدوجزر پر نظر رکھنے والے' طوفانوں کو تہہ تک پڑھ لینے والے اور ان کے مقابل میں سینہ سپر ہو جانے والے مضبوط کارکن موجود ہوں اور جس کی رائے عام کسی فاسد نظریہ و اقدام کو اپنے دائرے میں چلنے نہ دے۔ ایسا نظام جماعت ہر مخالفت و شرارت سے بھی کچھ کما کر نکلتا ہے۔

چنانچہ پروپیگنڈے کے اس گندے طوفان کی موجوں سے بھی مدینہ کی اس عظیم المرتبت اسلامی جماعت نے کئی پہلوؤں سے اپنے دامن میں خیر و فلاح کے موتی سمیٹے اور وہ اس سے نکلی تو پہلے سے زیادہ مضبوط

اور پہلے سے زیادہ چاق و چوبند تھی۔

نیکی اور سچائی کی اس نورانی تحریک کے علمبرداروں کو انسانیت کی ان خطرناک اور وسیع الاثر کمزوریوں کا علم براہ راست تلخ تجربے کے ذریعے ہوا جس کا تصور بھی کسی خانقاہ میں بیٹھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انسانی سیرت کو تیار کیا جا سکتا ہے۔ جماعتی زندگی کے وہ رخنے پوری طرح سامنے آگئے جن میں سے معاشرے کو تہ و بالا کر دینے والے مفاسد کا داخلہ ہوتا ہے۔ حضور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے رفقاء کے سامنے جماعت کے مختلف عناصر ---- نفاق کے روگی، ضعیف الایمان لوگ، سطحی اور جذباتی مزاج رکھنے والے، نیک نیتی کے ساتھ کسی غلط رو میں بہہ جانے والے اور دشمنوں کا شکار ہو جانے والے سادہ لوح افراد سبھی الگ الگ نمایاں اور ممیز ہو گئے۔ خصوصیت سے نفاق کے شیطان نے جماعت کے اندر جو ایک الگ ٹکڑی منظم کر دی تھی، اس کے بارے میں پوری طرح وضاحت ہو گئی کہ وہ کہاں تک جا سکتی ہے۔

عملی تجربے کے میدان میں جماعت کے اندرونی ماحول کی ان کمزوریوں کے سامنے آجانے سے وہ خاص ذہنی کیفیت پیدا ہوئی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طرف نئی اخلاقی ہدایات دے کر تربیت کا انتظام کیا گیا اور دوسری طرف ایسے معاشرتی احکام کا نفاذ کیا گیا جو گوناگوں مفاسد سے جماعت کو بچانے کا ذریعہ ہو سکتے تھے۔ تیسری طرف نئے قوانین اور حدود تعزیرات پر مشتمل ایک کڑا ضابطہ نازل ہوا جو ہمیشہ کے لیے انسانیت کی اجتماعی فلاح و بہبود کا ضامن بنا۔

اس واقعہ نے مدینہ کی سوسائٹی کے ضمیر کو جھنجوڑ دیا۔ اس کو اخلاقی حس کی چوٹیں لگا کر بیدار اور اس کی جماعتی حمیت و غیرت کو تازیانے برسا کر متحرک کر دیا۔ پوری جماعت نفاق کے اس اضطراب انگیز حملے سے نکلی تو اس کا ایک ایک فرد پہلے سے زیادہ چوکنا اور مضبوط تھا۔

اس ہنگامہ کے طوفان سے گزرتے ہوئے حضرت عائشہؓ کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ مظلوم ذات خود محسن انسانیت ہی کی تھی۔ لیکن جس عالی ظرفی، حوصلہ مندی اور صبر و تحمل کا مظاہرہ حضورؐ نے اپنے ٹھنڈے غیر جذباتی اور باوقار طرز عمل سے کیا، وہ انسان کو حیرت میں ڈال دینے والا ہے۔ اور اس میں حضورؐ کے بعد اسلامی تحریک اور نظام جماعت کی قیادت کرنے والوں کے لیے ایک جذبہ پرور نمونہ پایا جاتا ہے۔ کس بڑے پیمانے کی ایذا تھی جو سہنے والے نے محض اس قصور میں سہی کہ وہ دنیائے انسانیت کو ایک نظام رحمت سے مالا مال کرنا چاہتا تھا۔ جو سارے انسانوں کے ناموس بچانے کے لیے اٹھا تھا اسے زمانے نے صلہ یہ دیا کہ خود اس کے ناموس پر گندگی اچھال دی۔ کوئی دوسرا اس چکر میں پڑا ہوتا تو یا تو مخالفین کو پیس کر رکھ دیتا، یا پھر بیزار اور مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو جاتا۔ مگر وہ پیکر صبر و عزیمت فرض کی راہ پر چلتا رہا، چلتا رہا ---- کانٹے اس کے قدموں کو لہولہان کرتے رہے اور وہ پھر بھی آگے ہی بڑھتا رہا۔

شرانگیزیاں:

مدینہ کے یہودی قبائل ایک طرف اپنی جمی جمائی قوت کے زعم میں اور دوسری طرف سیاسی ضرورتوں کے تحت حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ایک دستوری معاہدے کے پابند ہو کر اسلامی ریاست کے نظم میں آچکے تھے۔ اول تو وہ اس نئی سیاسی ہیئت کو وقت پر پوری طرح سمجھ بھی نہ پائے ہوں گے پھر ان کو اس کے روشن مستقبل کا مشکل ہی سے کچھ اندازہ ہو سکا ہو گا کہ یہ انتہائی تیز رفتاری سے نشوونما پائے گی اور چند بے خانماں افراد مدینہ کے انصار کے تعاون سے ایمان و کردار کے بل پر تاریخ کی باگ ڈور تھامنے والی قوت بن جائیں گے۔ ان کے اندازے یہ ہوں گے کہ شاخسار وطن سے ٹوٹ گرنے والی یہ چند مسلی ہوئی خشک پتیاں اول تو حادثات کے جھونکوں میں اڑ جائیں گی۔ اور اگر یہ پڑی بھی رہیں تو ان سے کوئی چمن شاداب تو وجود پانے کا نہیں۔ مگر کلمہ طیبہ کی عظیم انقلابی روح کا اعجاز تھا کہ مخالفتوں بھرے ماحول میں گھری ہوئی ان چند جانوں سے ایک پر زور سیاسی ہیئت تشکیل پاتی چلی گئی اور چند مہینوں کی گردشوں میں یہود کو اندازہ ہو گیا کہ اسلامی ریاست ایک ایسا چڑھتا سورج ہے کہ جس کے سامنے ان کے اثر و رسوخ کی مشعلیں روشن نہ رہ سکیں گی۔ خصوصاً جنگ بدر سے اسلامی تحریک کا نہ صرف زندہ و سلامت بچ نکلنا بلکہ علم فتح لہراتے ہوئے مدینہ پلٹنا یہود کے لیے ایسا مبہوت کن واقعہ تھا کہ یقیناً وہ سارے معاملے کو از سرنو سوچنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔

معاہدانہ تعلق نے ان کو اسلامی ریاست کا حلیف بلکہ پابند دستور و قانون شہری بنا دیا تھا لیکن ان کی روحیں حریفانہ و باغیانہ رجحانات سے بھرپور تھیں۔ مارے حسد کے ان کے جگر اندر ہی اندر کباب ہوئے جاتے تھے۔

اس متضاد پوزیشن نے ان کو فتنہ انگیزی کی راہ پر ڈال دیا۔ وہ ہر موقع سامنے آنے پر بلکہ خود ایسے مواقع پیدا کر کر کے یہ کوشش کرتے کہ کسی طرح اسلامی معاشرہ کی وحدت پارہ پارہ ہو۔ کسی طرح مسلمانوں کو اشتعال میں ڈال دیا جائے۔ کسی طرح نظم کو معطل کیا جائے۔ لاء اینڈ آرڈر کو غارت کیا جائے اور بحران پیدا کر دیا جائے۔ کسی طرح حضورؐ کی قیادت کو کمزور کر دیا جائے۔ اُن لوگوں کے اپنے ہی آدمی نفاق کا جامہ اوڑھ کر مسلم معاشرہ کے اندر موجود تھے اور وہ انصار میں سے ضعیف الایمان لوگوں کو ساتھ ملا کر یہود کے منصوبوں کو جامہ عمل پہناتے تھے۔

ان کینہ توز دشمنوں کی شرپسندی نے ایک راہ یہ نکالی تھی کہ یہ لوگ مسلمان خواتین کے نام لے لے کر فحش اشعار کہتے اور ان کو پھیلاتے۔ ان کے ناموس کو رسوا کرنے کی کوشش کرتے۔ اس گندی شاعری نے ان کے ذہنوں کو اس طرح پر نشوونما دی کہ عصمت جیسی بنیادی تہذیبی قدر کا احترام بھی ان کے دلوں سے اٹھ گیا۔ یہود کے اس حیا باختہ ذہن کا اظہار ایک موقع پر ایسے ہوا کہ کچھ یہودی افراد بالکل بازاری

غنڈوں کی سطح پر اتر آئے تھے۔ بنو قینقاع کی ایک مستقل آبادی مدینہ کا ایک جز تھی۔ ان کے بازار میں ایک مسلمان عربی عورت سودا لینے گئی۔ دکاندار نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی' اور بالآخر اسے سربازار ننگا کر دیا۔ اس حرکت پر وہ اور اس کے ہم جلیس شرمندہ ہونے کے بجائے اس کی ہنسی اڑانے لگے۔ عربی طریقے پر وہ چلائی اور اس نے مدد کے لیے صدا بلند کی۔ ایک عربی نوجوان کی حمیت اس کی چیخ سن کر حرکت میں آگئی۔ اس نے جوش غیرت میں بے قابو ہو کر بدمعاش یہودی کو قتل کر دیا۔ اشرار کی مراد بر آئی۔ مسلمان عربوں اور یہودیوں کے درمیان بلوای ہو گیا۔ حضورؐ کو اطلاع ہوئی تو موقع پر تشریف لے گئے۔ بنو قینقاع کو ایسی گندی حرکت پر ملامت کی۔ اور متنبہ بھی کیا کہ "اے گروہ یہود! اپنی اصلاح کر لو' پیشتر اس کے کہ تم کو بھی وہی کچھ پیش آئے جو کچھ کہ (بدر میں) قریش کو پیش آیا ہے"۔

بنو قینقاع کے سینوں میں چونکہ بروایت ابن سعدؒ بغض و حسد کے جذبات موجزن تھے اس لیے انہوں نے بہت ہی تیز و تند لہجے میں جواب یہ دیا۔ کہ "اے محمدؐ! تمہیں اپنے بارے میں اس بنا پر کوئی مغالطہ نہ ہو کہ تم نے قریش کے کچھ آدمی مار دیئے ہیں۔ وہ بے طاقتے لوگ ہیں۔ وہ لڑنا جانتے ہی نہیں۔ خدا کی قسم اگر تم نے ہمارے خلاف تلوار اٹھائی تو تم خود جان لو گے کہ ہم ہیں لڑنے والے لوگ! ہماری طرح کے لوگوں سے تمہیں ہرگز سابقہ نہیں پڑا"۔ ❶

یہود کو یہ بات بہت بری طرح کھلتی تھی کہ انصار جو ان کے مقابلے میں ذہنی اور سیاسی اور معاشی لحاظ سے کمزور تھے' اسلامی تحریک نے ان میں زندگی کی نئی روح دوڑا دی تھی اور ایک مقدس نصب العین کی لگن نے ان کو آپس میں بھی اور مہاجرین کے ساتھ بھی وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ یہود کا مشہور زیرک بڈھا شاس بن قیس حالات کی اس تبدیلی کو بڑی تشویش سے دیکھتا اور تحریک حق کے علمبرداروں کے خلاف اس کا سینہ حسد اور کینہ سے بھرا رہتا۔ ایک بار اس نے نبی اکرم (ﷺ) کے رفقاء کی ایک مجلس کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا جس میں اوس اور خزرج کے کچھ لوگ بات چیت کر رہے تھے' ان کی باہمی الفت' خیر سگالی اور اسلام کی پیدا کردہ اجتماعیت کا رنگ دیکھ کر اس کا کلیجہ جل بھن گیا۔ کجا جاہلیت کی وہ آویزش اور کجا یک جان ہونے کا یہ منظر! دل ہی دل میں کہنے لگا' اس شہر میں اب قیلہ (انصاریوں کی جدہ) کی اولاد شیرو شکر ہو گئی ہے۔ یہ لوگ اگر اس طرح مربوط ہو جائیں تو پھر ہمارے لیے چین حرام ہے۔ ❷

اس کے خاندان نے ایک منصوبہ پکایا اور ایک یہودی نوجوان کو اس نے آلہ کار بنا کر تلقین کی کہ تم جا کر ان لوگوں میں بیٹھو اور ان میں گھل مل کر جنگ بعاث اور اس سے قبل کے معرکوں کی یاد تازہ کرو۔ جب کہ اوس و خزرج لڑا کرتے تھے۔ چنانچہ اس آلہ کار نے اپنا پارٹ بخوبی ادا کیا۔ ایک مجلس میں اوس و

---

❶ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۷۹

❷ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۸۳

خزرج کے لوگ مل کر بیٹھے تھے۔ جاہلی تاریخ کا تاریک باب ان کے سامنے آیا تو وہی موضوع گفتگو بن گیا۔ آہستہ آہستہ منافرت ہونے لگی' طنز و تعریض کی جانے لگی۔ تیزی آگئی' دونوں طرف سے جوشیلے جانباز آمنے سامنے آکھڑے ہوئے کہ کیوں نہ نئے سرے سے معرکہ لڑ کے دیکھ لیا جائے کہ کون کیا ہے۔ "ہتھیار لاؤ' ہتھیار" کا شور بلند ہوا۔ اوس نے اوس والوں کو پکارا' اور خزرج نے خزرجیوں کو! معرکہ کے لیے جگہ اور وقت کا بھی تعین ہو گیا۔ جوش میں بپھرے ہوئے لوگ تیار ہو کر نکل ہی رہے تھے کہ حضورؐ مہاجرین میں سے چند اصحاب کو لے کر موقع پر جا پہنچے' اور ان کو بالفاظ ذیل خطاب فرمایا:۔

> "اے گروہ مسلمانان! اللہ' اللہ کرو! بعد اس کے کہ اللہ نے تم کو اسلام کا راستہ دکھایا اور اس کے ذریعے تمہیں سربلند کیا' تمہاری گردنوں سے نظام جاہلیت کا قلادہ کاٹ پھینکا' تمہیں کفر سے نجات دلا دی اور تمہارے دلوں کو محبت سے جوڑ دیا' تم میرے موجود ہوتے ہوئے جاہلیت کے نعرے بلند کرنے لگے ہو؟"

یہ تقریر سن کر لوگوں نے محسوس کیا کہ یہ سارا ہنگامہ شیطانی فتنہ ہے اور دشمنوں کی رخنہ اندازی کا مقت کش۔ انھوں نے ندامت سے گردنیں جھکا دیں اور مطیعانہ شان سے حضورؐ کے ساتھ واپس ہوئے۔

ایسا ہی ایک موقع غزوہ بنو مصطلق کے سفر میں آیا جہاں یہود کے آلۂ کار بننے والے منافقین نے عبداللہ بن ابی کے زیر اشارت مہاجرین و انصار میں خوف ناک حد تک اشتعال پیدا کر دیا۔ اس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ حضورؐ نے اس موقع پر بھی بڑی حکمت سے صورت حالات کو سنبھالا۔

اس طرح کے فتنوں میں سب سے بڑھ کر منظم فتنہ وہ تھا جس نے مسجد ضرار کی صورت میں ظہور کیا۔ اس فتنہ کا اصل بانی مبانی قبیلہ خزرج کا ایک شخص ابو عامر راہب تھا۔ حضورؐ کے مدینہ آنے سے قبل یہ اپنے علم کتاب اور تقشف کی وجہ سے بہت با اثر تھا۔ حضور جب مدینہ آکر مرجع خاص و عام بن گئے تو ابو عامر کے اثر و رسوخ کا چراغ گل ہو گیا۔ دل ہی دل میں وہ کڑھتا۔ بدر کے واقعہ نے جو مستقبل اس کے سامنے نمایاں کیا اس کا مشاہدہ کر کے اس کی آنکھوں میں نشتر اتر گئے۔ اس نے ایک طرف جنگ احد کے لیے سرداران مکہ کو اکسایا' دوسری طرف عرب کے مختلف سرداروں سے ساز باز کی' تیسری طرف خود انصار کو رسول اکرم کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی دعوت دی' اور چوتھی جانب ہرقل روم کو فوجیں چڑھا لینے کی دعوت دی۔ ●

اس نے منافقین سے یہ ساز باز کی کہ حضورؐ کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک متوازی اڈہ کھڑا کیا جائے۔ چنانچہ اسی منصوبہ کے تحت مسجد ضرار کھڑی کی گئی۔ اس مرکز فساد کے بانیوں نے حضورؐ سے بڑے ڈرامائی انداز میں یہ درخواست کی ہم نے یہ مسجد ایسے کمزوروں اور معذوروں کے لیے تعمیر کی ہے جو زیادہ دور

● تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۸-۳۸۷

نہیں جاسکتے۔ نیز اندھیری راتوں اور بارش اور طوفان کی صورت میں آس پاس کے لوگ اس میں آسانی سے جمع ہو سکیں گے۔ آپؐ اس میں چلیں' اس کا افتتاح فرمائیں اور اسے برکت اندوز کریں۔ حضورؐ اس وقت تبوک روانہ ہو رہے تھے' لہٰذا آپؐ نے اس معاملے کو واپسی تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ واپسی میں وحی کے ذریعے آپؐ کو متنبہ کر دیا گیا کہ:

"اور وہ لوگ جنہوں نے (اسلامی معاشرہ کو) ضرر پہنچانے' کفر کرنے' مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور پہلے سے خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کو گھات لگانے کا اڈہ فراہم کرنے کے لیے مسجد کھڑی کی ہے ---- اور ہاں وہی جو قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ (اس کام میں) ہم نے تو فقط نیک مقاصد ملحوظ رکھے ہیں (ان کی حقیقت یہ ہے کہ) اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ قطعی طور پر جھوٹے ہیں۔

اس میں آپؐ ہرگز ہرگز کبھی قیام نہ فرمائیں۔ ہاں وہ مسجد (یعنی مسجد قبا) کہ جس کی بنیاد اول روز سے پرہیزگاری (کے جذبات) پر رکھی گئی ہے۔ وہی زیادہ مستحق ہے کہ آپؐ اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو اس بات کے خواہاں ہیں کہ پاکیزگی اختیار کریں۔ اور اللہ پاکیزگی چاہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے"۔ (التوبہ آیات۔ ۱۰۷' ۱۰۸)

عبرت لیجیے' کہ جذبہ حسد و رقابت کا ننھا سا بیج کس طرح ایک شجرہ خبیثہ پیدا کرتا ہے' دیکھیے کہ کس طرح اسلامی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے کفر بھی ایک مسجد کا خوشنا پردہ فراہم کرتا ہے۔ توجہ دیجیے اس پر کہ دین کو نقصان پہنچانے کے لیے جو فتنے کھڑے کیے جاتے ہیں وہ کس طرح اپنے قامت پر دین و تقویٰ ہی کے جامے راست کر کے نمودار ہوتے ہیں۔ سبق لیجیے کہ کتنی جماعت بندیاں کتنی خانقاہیں' کتنی مسجدیں' کتنے حلقہ ہائے درس' کتنے اشاعتی ادارے اور کتنے جرائد آج بھی ہمارے سامنے نمودار ہوتے اور نشوونما پاتے چلے جاتے ہیں جس میں اسی مسجد ضرار کی سی روح بدکام کر رہی ہوتی ہے۔ اور ان کے بانی دعویٰ یہی لے کر اٹھتے ہیں کہ "ان اردنا الا الحسنیٰ" (التوبہ۔ ۱۰۷)

اگر یہ مسجد خدا کی عبادت ہی کے لیے بنائی گئی ہوتی' اگر اس کا مقصود معذور مسلمانوں کو نماز کی سہولت فراہم کرنا ہی ہوتا تو یہ ضرورت خود حضورؐ کے سامنے پیش کی گئی ہوتی۔ اسلامی معاشرہ کی قیادت اس کی تعمیر کا فیصلہ کرتی اور جس طرح دوسری مساجد پوری جماعت کے اشتراک سے بنی تھیں' اسی طرح یہ بھی وجود پاتی۔ جماعت اور اس کی قیادت سے بالا بالا بیٹھ کر کچھ لوگ سرگوشیاں کر کے ایک خفیہ منصوبہ بناتے ہیں۔ اور چپکے سے صحیح معنوں میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کھڑی کر دیتے ہیں ---- درآنحالیکہ مسجد قبا اس کے قریب ہی پہلے سے موجود تھی ---- تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس منافقانہ کارنامہ کی دال میں کچھ نہ کچھ کالا ہے۔ اسے وحی نے نکال کر معاشرے کے سامنے رکھ دیا۔ کسی مقصد کے لیے کام کرنے والے نظام جماعت کے ہوتے ہوئے کچھ لوگ اس کے اندر اگر اپنی الگ ٹکڑی بنا کے سوچتے ہیں اور مجموعی نقشہ کار سے الگ ہی الگ اپنے منصوبے بناتے اور روبہ عمل لاتے ہیں تو وہ اپنی شان تقویٰ

بازی کو منوانے کے لیے کتنی ہی لفاظی کرتے پھریں اور کیسے ہی خوشنما بہروپ بھریں نتیجہ بہرحال ضرار' کفر اور تفریق کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ مسجد کے مقدس نام سے قائم ہونے والا یہ ناپاک اڈا فرمان نبوت کے تحت جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ تا کہ اس کے ساتھ اس کی منحوس تاریخ بھی ملیامیٹ ہو کر رہ جائے۔ [1]

مختصر یہ کہ الٰہی ہدایت کے ان ٹھیکیداروں اور انبیاءؑ کے وارثوں نے شرانگیزی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ان پریشان کن حرکتوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ان کی وہ تخریبی سازشیں تباہ کن تھیں جو ہر موقع جنگ پر اسلامی دفاع کو نقصان پہنچانے کیلئے عمل میں لائی جاتی رہیں۔ ان کا تذکرہ ہم آگے کریں گے۔

نظامِ انصاف میں رخنہ اندازی:

کسی بھی نظام حکومت کا چلنا اس کے دو وظائف کے صحیح طور پر انجام پانے پر منحصر ہے۔ ایک یہ کہ اس کا دفاع مضبوط رہے' دوسرے یہ کہ اس کا عدالتی نظام ٹھیک طریق سے کام کرتا رہے اور اس کے قوانین نافذ ہوتے رہیں۔ پہلا وظیفہ بیرونی حملوں سے بچاؤ کے لیے ہے۔ اور دوسرا وظیفہ اندرونی مفاسد کی روک تھام کے لیے ہے۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کو ان دونوں وظائف کی انجام دہی میں یہود و منافقین کی طرف سے شدید مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان مزاحم قوتوں نے کس طرح اسلامی ریاست کے نظام عدل میں خلل اندازیاں کیں اور سول نظم کو کمزور کرنے کے لیے کیا کارستانیاں دکھائیں۔ ایک نوخیز ریاست کے سول نظم کو ہی اگر قائم نہ ہونے دیا جائے تو وہ نہ تو داخلی مشکلات پر قابو پا سکتی ہے اور نہ خارجی قوتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس کا عین وجود بالکل ابتدائی مراحل میں خطرے کی زد پر آجاتا ہے چنانچہ تاریخ میں بے شمار نظائر موجود ہیں کہ فاتحین یا انقلابیوں نے جہاں کہیں بھی کوئی نئی حکومت قائم کی ہے وہاں سول نظم کو نافذ کرنے میں ابتداء غیر معمولی جبر و سختی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن محسن انسانیتؐ کی حکومت جس اخلاقی نظریے اور جس تصور عدل پر قائم تھی اس میں بے جا سختی کا موقع نہ تھا۔ اس لیے مدینہ کے پانچویں کالم کو کسی قدر کھل کھیلنے کی راہیں مل گئی تھیں۔

مدینہ کی اسلامی ریاست کا وہ دستوری معاہدہ جس کے تحت مسلمان مہاجرین و انصار اور یہود کے قبائل ایک سیاسی ہیئت اجتماعیہ میں جمع ہوئے تھے' اس میں تسلیم کر لیا گیا تھا کہ سیاسی اور عدالتی لحاظ سے اختیار اعلیٰ (Final Authority) محمد ﷺ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ دستاویز آج تک محفوظ ہے اور اس میں حسب ذیل دو واضح دفعات موجود ہیں۔ [2]

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۱۸۵

[2] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۰۱ تا ۱۰۴ و کتاب الاموال ابو عبید قاسم بن سلام پیرا ۵۱۸ ص ۲۰۲

و انکم مهما اختلفتم فیه من شئی فان مرده
الی الله عز و جل و الی محمد ﷺ ❶

(ترجمہ: اور یہ کہ جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف پیدا ہو جائے تو اللہ اور محمد ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے۔)

و انه ما کان بین اهل هذه الصحیفة من
حدث او اشتجار یخاف فساده فان مرده الی
الله عز و جل والی محمد ﷺ ❷

(ترجمہ: اور یہ کہ اس نوشتہ کو قبول کرنے والوں کے درمیان کوئی نیا معاملہ یا جھگڑا پیدا ہو جائے' جس پر فساد رونما ہونے کا اندیشہ ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کے رسول محمد ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا۔)

اس دستوری بیان کے بعد معاہد یہودی قبائل پر شرعاً' اخلاقاً اور سیاسی و قانونی حیثیت سے یہ فرض عائد ہو گیا کہ وہ اس نظام عدل و قانون کو کامیاب بنانے میں پوری طرح تعاون کریں اور اس کی وفادارانہ اطاعت کریں جو سرور عالم (صلی اللہ علیہ و سلم) کی سرکردگی میں چل رہا تھا۔ یوں بھی دیکھا جائے تو ایک غیر منظم معاشرہ کو قانون کی عملداری کے اصول پر باقاعدہ شہری نظم میں لانا محسن انسانیتؐ کی ایک عظیم الشان قابل قدر خدمت تھی۔ اور جرائم اور بدکاریوں کے استیصال کے لیے انصاف کے فطری اور دائمی اصولوں کی مساویانہ تنفیذ ایک ایسا بابرکت اقدام تھا کہ جس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی حالت امن و امان یہودیوں کے لیے بھی اتنی ہی نافع تھی جتنی دوسروں کے لیے۔ پھر قانون الٰہی کے نظام کی اقامت خود ان کے اپنے مشن میں شامل تھی۔

اوپر سے معاہدانہ ذمہ داری انہوں نے بہ رضا و رغبت قبول کی تھی۔

لیکن جہاں انہیں یہ محسوس ہوا کہ اسلامی ریاست کے بے لاگ قانون کی زد ان کے کسی مفاد پر پڑتی ہے اور ان کی کوئی شخصیت اس کی لپیٹ میں آتی ہے' تو وہ اپنی معاہدانہ' سیاسی' اخلاقی اور شرعی ذمہ داریوں اور معاشرے اور انسانیت کے مجموعی مفاد کو یکسر نظرانداز کر کے الٹے راستے پر پڑ جاتے رہے۔

یہود کے ایک شادی شدہ مرد نے کسی منکوحہ یہودیہ سے زنا کیا۔ معاملہ یہود کے سرداروں کے سامنے آیا۔ یہ اکابر بیت مدراس میں جمع ہوئے اور آپس میں صلاح ٹھہرانے کے بعد ایک آدمی کو سرور عالمؐ کی خدمت میں دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ ایسی حرکت پر کیا سزا دی جائے گی۔ انہوں نے پیشتر سے رائے

---

❶ سیرت ابن ہشام۔ ج ۲ ص ۱۲۱ تا ۱۲۳ نیز کتاب الاموال ابو عبید قاسم بن سلام۔ پیرا ۴' ۵۔ ص ۲۰۴

❷ ایضاً

قائم کرلی کہ اگر ہماری رواجی سزا (تحمیہ) بتائی جائے تو محمد (ﷺ) کو ایک بادشاہ سمجھو اور بات مان لو۔ لیکن اگر کتاب الٰہی کے مطابق رجم کی شرعی حد جاری کرنے کو کہیں تو پھر وہ (اپنے علم صحیح اور اپنی جراءت حق اور اتباع فرمان الٰہی کی رو سے) نبی ہیں اور ان سے بچنا کہ تمہارا جو کچھ قائدانہ اثر باقی ہے وہ بھی نہ جاتا رہے۔ سو آدمی پہنچا اور اس نے پیغام دیا۔ اور اکابر یہود کی طرف سے پیش کش کی کہ ہم آپ کو حَکم بناتے ہیں۔ یہ پیش کش دستوری معاہدے سے ٹکراتی تھی۔ معاہدے کی رو سے حضورؐ مستقل طور پر مدینہ کے حکم اور عدلیہ کے سربراہ تھے ہی۔ غالباً یہی وجہ ہوئی کہ حضورؐ اٹھ کر سیدھے بیت مدراس تشریف لے گئے' اور جا کر یہود سے فرمایا کہ اپنے عالموں کو لاؤ۔ عبداللہ بن صوریا کو پیش کیا گیا۔ بعض روایتوں کے مطابق اس شخص کے ساتھ ابو یاسر بن اخطب اور وہب بن یہودا بھی تھے۔ دوران گفتگو سب نے عبداللہ بن صوریا کو علم تورات میں فاضل ترین مستند شخصیت قرار دیا۔ حضورؐ نے اس عالم سے علیحدگی میں گفتگو کی اور خدا کا خوف دلا کر بنی اسرائیل کے زریں ابواب تاریخ کی یاد تازہ کرا کے دریافت کیا کہ کیا تم جانتے ہو کہ شادی شدہ زانی کے لیے تورات میں رجم کا حکم آیا ہے؟" اس نے جواب دیا "اللھم نعم"! ہاں! بخدا! وحی سے جو حقیقت حضورؐ پر آشکارا تھی۔ اس کی تصدیق فریق مخالف کی طرف سے بھی ہو گئی۔ لیکن مجلس عام میں یہودی سردار اور علماء کج بحثی کرتے رہے۔ ان کو اصرار تھا کہ ہمارے قانون شریعت میں زنا کی سزا تحمیہ ہے۔ اس اصطلاح کے مفہوم کے مطابق یہودی زانیوں کا منہ کالا کر کے ان کو گدھے پر سوار کرتے اور بستی میں گھماتے۔ تورات کا حکم رجم انہوں نے بالائے طاق ڈال دیا تھا۔ ان کے اندر جب زنا کی وبا پھیلی اور ان کے اونچے طبقوں تک کے لوگ اس اخلاقی فساد میں ملوث ہو گئے تو معاشرے نے شریعت کا ساتھ دینے کے بجائے مجرم کی حمایت کا رخ اختیار کر لیا اور سزا میں کمی کر دی۔ اب اکابر یہود کو اندیشہ یہ تھا کہ اگر تورات کے قانونِ رجم کا احیا ہو جاتا ہے تو پھر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ آج تم کل ہماری باری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ رجم کی سزا کا نفاذ رکوانا چاہتے تھے۔ مجبوراً حضورؐ نے مجلس عام میں ان سے تورات منگوائی۔ (فاتوا بالتورٰۃ فاتلوھا ان کنتم صدقین۔ (آل عمران۔ ۹۳) ایک یہودی عالم نے متعلقہ مقام کی قرأت کی۔ اس نسخہ میں آیت رجم موجود تھی اور اس ستم گر عالم نے آیت پر ہاتھ رکھ کر آگے پیچھے سے پڑھ ڈالا۔ عبداللہ بن سلام (مشہور یہودی عالم جو ایمان لے آئے تھے) نے لپک کر اس کا ہاتھ ہٹا دیا اور حضورؐ کو دکھایا کہ "اے پیغمبر خدا! ملاحظہ کیجیے یہ رہی آیت رجم" [1]! حضورؐ نے اس مکاری پر یہود

---

[1] انجیل یوحنا میں واضح ثبوت موجود ہے کہ محصن زانیہ کے لیے اصل تورات میں رجم ہی کا حکم موجود تھا۔ ملاحظہ ہو یوحنا باب ۸ آیت ۵ کے یہ الفاظ۔

"توریت میں موسیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں"۔

تورات کے متداول نسخوں میں یہودی مفسرین اور فقہاء اور اہل تحریف کی آمیزشوں کے ساتھ زنا کی بعض

کو سخت ملامت کی اور یہ کہہ کر مجرموں پر حد جاری کر دی کہ "میں پہلا شخص ہوں جو خدا کے حکم اور اس کی کتاب اور اس پر عمل پیرا ہونے کے مسلک کی تجدید کرتا ہوں"۔ ❶

یہ تھے وقت کے حاملان دین مبین اور حامیان شرع متین جو بغلوں میں قانون الٰہی لیے ہوئے من گھڑت رواجی قانون کا کھوٹا سکہ چلا رہے تھے اور اس کردار کے ساتھ وہ اس مقدس ہستی کے مقابلے کو نکلے تھے جو قانون الٰہی کا بے لاگ طریقے سے احیا کرنے اٹھی۔ اور قرآن کا یہ نغمہ حق فضاؤں میں گونج رہا تھا کہ "لستم علی شیئ حتی تقیموا التورٰۃ والانجیل و ما انزل الیکم من ربکم۔" (المائدہ۔ ۶۸) اس وقت تک تمہاری کوئی بنیاد ہی نہیں ہے جب تک کہ تم تورات اور انجیل کو اور اللہ کی طرف سے جو کچھ قوانین نازل ہوئے ہیں ان کو نافذ نہ کر دکھاؤ۔ جب تک تمہارے عقیدہ و عمل میں یہ بھاری تضاد موجود ہے۔ تمہاری کچھ بھی حقیقت نہیں ہے۔ تم ایک بے معنی اور بے وزن ٹولی ہو۔

یہودی معاشرہ کے فساد عام کا ایک بڑا مظہر یہ تھا کہ ان میں اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کی تقسیم مستقل طور پر قائم ہو چکی تھی اور قانونی مساوات یکسر ختم ہو گئی تھی بااثر لوگوں کے لیے قانون الگ تھا اور کمزور کے لیے الگ' انصاف کی ندی پھٹ کر الگ الگ دھاروں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ان کے قاضی اور مفتی میزان عدل کے پلڑے نابرابر کر چکے تھے۔ اب دوہرے اور تہرے باٹ استعمال کر رہے تھے چنانچہ بنو نضیر اور بنو قریظہ میں ان کے غلبہ و ضعف کی وجہ سے نامساویانہ نظام دیت رائج تھا۔ کوئی نضیری کسی قریظی کو قتل کر دیتا تو دیت سو وسق لی جاتی۔ اور صورت جرم الٹی ہوتی تو پچاس وسق دی جاتی۔ حضورؐ کے مدینہ آنے اور اسلامی نظام عدل کے قائم ہو جانے کے بعد بنو نضیر کے کسی آدمی نے بنو قریظہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ بنو نضیر نے دوگنی دیت دینے سے انکار کیا اور مساوات کا حق منوانے کی کوشش کی۔ اب تو ان کے سامنے ایک سہارا موجود تھا۔ بحث میں تیزی آتے آتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں قبیلوں میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخر دونوں اس پر راضی ہوئے کہ معاملہ محمد ﷺ کے سامنے لے جایا جائے۔ اور وہاں سے جو فیصلہ ہو اسے قبول کر لیا جائے۔

حضورؐ نے فاحکم بینھم بالقسط کے حکم کے تحت دیت کے اس غیر مساویانہ نظام کو ختم کر کے ترازو

= صورتوں میں قتل اور سنگساری کی سزا مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو:

"اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتا پکڑا جائے تو وہ دونوں مار دیے جائیں"۔ (استثنا باب۔ آیت ۲۱۔ ۲۲)

"اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہو گئی ہو اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم ان دونوں کو شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں"۔ (استثناء باب ۲۲۔ آیت ۲۳)

آیت ۲۶ میں بھی قتل کا حکم ایسے شخص کے لیے دیا گیا ہے جو جبراً کسی کی عصمت دری کرے۔

❶ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۹۳ تا ۱۹۴۔ مسلم باب رجم الیہود اہل الذمۃ فی الزنا زاد المعاد۔ ج ۳ ص ۲۰۷

کے پلڑے ہمیشہ کے لیے برابر کر دیئے [1] اور ساتھ ہی قرآن نے عدل کے خدائی نظام کو بگاڑنے والوں سے خطاب کر کے انتباہ دیا کہ:

"جو لوگ خدا کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق معاملات کے فیصلے نہیں کرتے وہی کافر ہیں"۔ (مائدہ-۴۴)

اسلامی نظام انصاف اور اقامت حدود میں اگر تنہا یہود مدینہ ہی رکاوٹ ہوتے تو بھی غنیمت ہوتا۔ مشکل یہ تھی کہ مجموعی طور پر سارے عرب میں انصاف میں دو رنگی پائی جاتی تھی۔ با اثر طبقوں کے لیے قانون دوسرا تھا۔ کمزوروں اور عام لوگوں کے لیے دوسرا۔

فتح مکہ کا موقع تھا کہ فاطمہ نامی ایک مخزومی عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی' چونکہ وہ با اثر قبیلے سے تعلق رکھتی تھی' اس لیے قریش کے لوگ اس کی گرفتاری پر بڑے بے چین ہوئے' اور ان کے تصور میں یہ بات سمانہ رہی تھی کہ ایسی عورت پر بھی قانون کا وہی حکم عقوبت چل جائے جو عام لوگوں کے لیے ہے۔ ان لوگوں نے مشورہ کیا کہ رسولؐ خدا سے کہہ کہا کر اسے چھڑا لیا جائے۔ مگر آگے ہو کر بات کون کرے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے اسامہؓ بن زید کو سفارشی بنایا۔ اسامہؓ نے جا کر مدعا عرض کیا۔ حضورؐ کے چہرے کا رنگ بات سن کر متغیر ہو گیا اور فرمایا۔ "کیا تم اللہ کی ایک حد کے بارے میں (اسے رکوانے کی) سفارش کرتے ہو؟" بس اتنے ہی پر اسامہؓ کو احساس ہو گیا اور انہوں نے معافی طلب کی۔ دن ختم ہونے پر حضورؐ نے مجمع میں خطاب فرمایا کہ:۔

"تم سے پہلے کے لوگوں کا ایک سبب ہلاکت یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی ممتاز آدمی چوری کرتا تو وہ اس سے چشم پوشی کر لیتے اور جب کوئی کمزور درجے کا آدمی یہی جرم کرتا تو اس پر سزا نافذ کر دیتے۔ میں اپنے بارے میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالوں"۔ [2]

یہی مروجہ ذہنیت ام حارثہ کے معاملے میں بھی سامنے آئی۔ اس عورت نے کسی کا دانت توڑ ڈالا۔ مقدمہ حضورؐ کے سامنے لایا گیا۔ حضورؐ نے قصاص کا حکم سنایا۔ ام ربیع (غالباً مجرمہ کی بہن تھیں' لیکن اس معاملہ میں روایات میں کچھ التباس ہو گیا ہے) نے یہ فیصلہ سنا تو حضورؐ سے بہ تعجب پوچھا کہ کیا فلانی سے بھی قصاص لیا جائے گا۔ خدا کی قسم اس سے قصاص نہیں لیا جا سکتا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "اری ام ربیع! قصاص تو خدائی نوشتہ ہے"! مگر وہ کہنے لگی' کہ "نہیں! خدا کی قسم' اس سے ہرگز قصاص نہیں لیا جا سکتا"۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا' کہ اس درجے کی مجرمہ کا دانت کیسے توڑا جا سکتا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۶۰ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۹۲

[2] مسلم۔ باب النہی عن الشفاعۃ فی الحدود۔

ادھر عملاً یہ ہوا کہ فریقین کے درمیان دیت پر معاملہ طے ہو گیا۔ اس طرح حکم قصاص (جس میں دیت کی گنجائش بھی شامل تھی) بھی پورا ہو گیا۔ اور ام ربیع کی بات بھی رہ گئی۔ چنانچہ بطور لطیفہ حضورؐ نے فرمایا۔ کہ خدا کے ایسے بندے بھی ہیں کہ جب وہ قسم کھالیں تو خدا ان کی قسم کو پورا کر دیتا ہے۔ ❶

یہود نے صرف اسلامی عدلیہ ہی کے کام میں رخنہ اندازیاں کرنے پر اکتفا نہیں کی' بلکہ مجموعی سول نظم و نسق میں جہاں موقع ملتا گڑبڑ پیدا کرنے سے باز نہ آتے۔ اس کی ایک بڑی مثال یہ ہے کہ فتح خیبر کے بعد خیبر کے یہودیوں کی درخواست پر جب ان کو بطور کاشت کاران اراضی نصف بٹائی پر رکھ لیا گیا' اور اسلامی حکومت کا تحصیلدار ان سے پہلی بار بٹائی لینے پہنچا تو انہوں نے اسے رشوت دینے کی کوشش کی۔ خیانت کے جس خوف ناک روگ میں ان کی قوم مبتلا تھی' اس کی چھوت انہوں نے نئے نظام کے کارپردازوں کو بھی لگا دینا چاہی۔ یہ تحصیلدار عبداللہ بن رواحہؓ تھے۔ رسولؐ خدا کا بھیجا ہوا معتمد علیہ تحصیلدار یہود خیبر کے اندازوں سے بہت اونچا تھا۔ انہوں نے ان سے صاف صاف کہا کہ "اے خدا کے دشمنو! کیا مجھے حرام مال کھلانا چاہتے ہو" ❷

ان پر اپنا مدعا واضح کر دیا کہ مجھے تو کانٹے کے تول معاملہ کرنا ہے۔ فرمایا:

"رسول ﷺ نے مجھے یہاں اس لیے نہیں بھیجا کہ تمہارا مال کھا جاؤں' بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ تمہارے اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم عمل میں لاؤں۔ تم چاہو تو میں اندازہ کر کے نصف تمہیں دے دوں اور اگر چاہو تو تم خود اندازہ کر کے نصف ہمیں دے دو۔"

چنانچہ ابن رواحہ نے ۴۰ ہزار وسق کا تخمینہ لگایا اور ۲۰ ہزار وسق مسلمانوں کا حصہ لے لیا۔ اس بے لاگ تقسیم پر جہاں بعض گھٹیا ذہن کے یہودیوں نے بھنا کر کہا کہ یہ تو ظلم ہے وہاں انصاف پسند عوام نے تسلیم کیا کہ اسی عدل پر آسمان اور زمین قائم ہیں۔" عبداللہ بن رواحہ ہی زندگی بھر اس منصب کو سرانجام دیتے رہے۔ ❸

غرضیکہ ایک نیم منظم معاشرے کو باقاعدہ ایک منظم ریاست بنانے اور خدائی انصاف کے اصولوں کو جاری کرنے میں محسن انسانیتؐ کو تعاون بہم پہنچانے کے بجائے تہذیب اور مذہب کے قدیمی ٹھیکیداروں نے سخت مزاحمتیں کیں۔ اور نظام حق کی جڑوں کو ابتدائی مراحل میں کھوکھلا کرنے کی ناقابل عفو کوششیں کیں۔

---

❶ مسلم باب القصاص من الجراح الا ان یرضوا بالدیۃ

❷ سیرت النبی از مولانا شبلی جلد ۲ ص ۷۵ بحوالہ فتوح البلدان ص ۳۱۔

❸ بخاری باب المزارعۃ و کتاب الشرکت۔

خانۂ نبوت میں چنگاریاں:

مدینہ کے مخالفین اسلام نے شرارت کی چنگاریاں حضورؐ کے حرم میں پھینکنے کے ناپاک جتن بھی کیے' ان کی نگاہ میں حضورؐ کے خاندان اور ان کے رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوانے کا یہ بہت ہی سیدھا اور آسان راستہ تھا۔ تحریک اسلامی کے سربراہ کو گھریلو جھگڑوں میں پھنسا دینے کی تدبیر اگر کامیاب ہو جاتی تو اس کے نتائج بڑے ہی مہلک ہوتے۔ مدینہ کی عام عورتیں حضورؐ کے گھر آتی جاتی تو تھیں ہی۔ پھر وہ جو کچھ بھی دیکھتی ہوں گی اسے نسائی نفسیات کے مطابق بیان کرتی پھرتی ہوں گی۔ اس طرح اشرار و منافقین کو بخوبی علم رہتا ہو گا کہ حضورؐ کے گھر میں کس طرح فقر و فاقہ کا سماں چھایا رہتا ہے۔ حضورؐ کی ازواج بڑے بڑے گھرانوں کی خواتین تھیں۔ ان کے ذوق کسی سے کم اونچے نہ تھے۔ لیکن دوسری طرف معاشی حالات جیسے تھے اور جن پر حضورؐ دل سے راضی تھے وہ ان کے سابق ذہنی معیارات سے بہت ہی فروتر تھے۔ حضور کے ساتھ ازواج بھی مسلک صبر پر گامزن تھیں اور ان کو خود یہ شعور تھا کہ عالم نو کا معمار اعظم جان جوکھوں کے جس عالم سے گزر رہا ہے۔ اس میں عیش و تنعم کی جنتیں آراستہ نہیں کی جاسکتیں۔ مگر انسان پھر انسان ہے اور انسان ہمیشہ ان خواہشات و جذبات کے درمیان گھرا رہتا ہے جنہیں اس کی فطرت میں گوندھ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف ازواج مطہرات ایمان و اخلاق کے لحاظ سے عالی مرتبت ہونے کے باوجود اور اتحاد و یک جہتی اور مسکینی و حلیمی کا ایک شاندار معیار دنیا کے سامنے پیش کرنے کے باوجود کبھی نہ کبھی باہمی رشک کے جذبات سے ہلکا سا اثر لے سکتی تھیں جو ایک گھر کی رونق بننے والی خواتین کے درمیان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قریش کی عورتوں میں شوہروں کی وفاداری و طاعت کی جو کڑی روایات چلی آرہی تھیں ان کے خلاف مدینہ کی عورتیں مردوں کے مقابل میں خاصا زور رکھتی تھیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ جیسے رعب و تمکنت والے مرد عظیم نے مدینہ کے دور میں ایک بار اپنی زوجہ محترمہ کو ڈانٹا تو انہوں نے آگے سے جواب دیا۔ اس پر حیرت سے حضرت عمرؓ نے کہا کہ "تم مجھے جواب دیتی ہو؟" اسی موقع پر ان کو اندازہ ہوا کہ معاشرہ کی ازدواجی زندگی میں مکہ کی روایات پر مدینہ کی فضا کا اثر خاصا پڑ چکا ہے۔

یہ نقشہ احوال اشرار و منافقین کے سامنے تھا اور اسی کے اندر سے انہوں نے شرارت کی راہ نکالی۔ انہوں نے بعض عورتوں کو اس غرض کے لیے آلۂ کار بنا کر استعمال کیا کہ حضورؐ کے گھر میں فتنہ کی 'چنگاری پھینک کر آگ بھڑکائیں۔ ایک ایسی عورت ام جلدح کا نام ہمارے سامنے آتا ہے جس کا پارٹ یہ تھا کہ "كانت تحرش بين ازواج النبی صلعم "۔ [1] یعنی وہ ازواج مطہرات کو بھڑکایا کرتی تھی۔ اسی طرح کی عورتوں کی مدد سے افک کی چنگاری سے شعلے اٹھائے گئے تھے۔

---

[1] سیرت النبی مولانا شبلی جلد ۱ ص ۵۰۹ بحوالہ اصابہ ابن حجر۔

اشرار کی ان در اندازیوں کی وجہ سے پے در پے چند واقعات ایسے ہوئے کہ جو خاصے تشویش ناک ہو سکتے تھے۔ لیکن خدا کی مدد' رسول اللہ ﷺ کے کردار' صحابہ خاص کے تعاون اور ازواج کی شرافت کے اثر سے بروقت اصلاح ہو گئی۔

ان میں سے سب سے بڑا واقعہ ازواج کا وہ متحدہ مظاہرہ تھا جس کا مدعا توسیع نفقہ تھا۔ یہی ایلاء کا محرک ہوا۔ خدا کا فضل خاص تھا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے پورے اخلاص کے ساتھ حضورؐ کا پہلو مضبوط کیا اور اپنی صاحبزادیوں کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے ان کو سختی سے ڈانٹا۔ ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے چیلنج آگیا کہ:

"اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے" کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی اور اس کی زینت و آرائش مطلوب ہو تو (وہ اس گھر میں نہیں ملے گی) آؤ میں تم کو رخصتی کے جوڑے دے کر بطریق احسن رخصت کر دوں۔ اور اگر تم کو خدا' خدا کا رسولؐ اور آخرت کا ٹھکانہ مطلوب ہے تو خدا نے نیکو کار خواتین کے لیے بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے"۔ (احزاب ۲۸۔۲۹)

دو راستے ازواج کے سامنے رکھ دیے گئے کہ جسے چاہیں اختیار کریں۔ اب یہ ازواج کی شرافت تھی کہ ان کو فوراً تنبہ ہو گیا۔ حضرت عائشہؓ جو اپنے اثر و رسوخ اور اپنی غیر معمولی ذہانت و متانت کی وجہ سے اس مظاہرہ کی لیڈر بنی ہوئی تھیں انہی کو سب سے پہلے بالاخانے سے اتر کر حضورؐ نے اس خدائی فیصلے سے آگاہ کیا اور انہی نے سب سے پہلے اعلان کیا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر خدا اور رسولؐ کو لیتی ہوں۔ ان کے بعد تمام ازواج نے اپنے مطالبہ سے شرح صدر کے ساتھ دست برداری کر لی۔

دشمنوں کے درمیان گھرے ہوئے ایک بڑے گھرانے میں اگر اشرار کی مسلسل رخنہ اندازیوں اور گھٹیا عورتوں کی لگائی بجھائی کے نتیجے میں کسی ایک موقع پر کھچاؤ پیدا ہو گیا ہو تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ بلکہ اتنی شرارتوں کے باوجود اس گھر کے سفینے کا بخیر و خوبی بچ کے نکل جانا اس کے اہل کی مضبوطی' شرافت اور یک جہتی کا ثبوت ہے۔

اب اندازہ کر لیجئے کہ حضورؐ کے ہر چہار طرف کس طرح رنگا رنگ شرارتوں کے ڈائنامیٹ بچھائے جا رہے تھے۔ کہاں کہاں فتیلے رکھے جا رہے تھے۔

قتل کی سازشیں:

سچائی جب کسی کی دعوت پر تحریک بن کے اٹھتی ہے تو اس کی مزاحم طاقتیں مخالفت بے جا میں پڑ کر مسلسل پستی کی طرف لڑھکتی چلی جاتی ہیں' یہاں تک کہ جب وہ اصل دعوت کے مقابلے میں دلیل کی بازی بھی ہار جاتی ہیں' اور فتنہ انگیزیوں اور تشدد کاریوں کو بھی ناکام دیکھتی ہیں تو پھر ان کا حسد اور ان کا کینہ ان کے اندر جرائم پیشہ ڈاکوؤں اور قاتلوں کی سی گندی ذہنیت ابھار دیتا ہے۔ اس مرحلے میں آکر

وہ داعی حق اور تحریک عدل کے قائد کی جان لینے کے در پے ہو جاتی ہیں۔ ایسے اشرار اگر قوت و اقتیار رکھتے ہوں تو وہ حریف کو سیاسی جبر کے شکنجے میں کستے ہیں اور قانون کی تلوار کو حرکت میں لا کر اور عدالتی ڈرامہ اسٹیج کر کے خادمان انسانیت کے خون سے ہاتھ رنگتے ہیں۔ قوت و اقتیار سے محروم ہوں تو پھر قتل کی سازشی تدبیریں اختیار کرتے ہیں۔ ٹھیک یہی راہ مکہ کے ارباب جہالت نے اختیار کی تھی۔ اور اب اسی ناپاک راستے پر مدینہ کے سکہ بند اللہ والے بھی گامزن ہو نکلے۔

ایک مرتبہ (۴ ھ) عمرو بن امیہ ضمری نے قبیلہ عامر کے دو آدمی قتل کر دیئے تھے ان کی دیت وصول کرنے کیلئے نیز معاہدانہ ذمہ داریوں کی یاد دہانی کیلئے رسول خدا (ﷺ)' بنو نضیر کے ہاں پہنچے۔ وہاں کے لوگوں نے آپؐ کو ایک گڑھی کے سائے میں بٹھایا' پھر وہ لوگ علیحدگی میں مل کر یہ منصوبہ باندھنے لگے' کہ کوئی شخص جا کر اوپر سے پتھر (چکی کا پاٹ) گرا دے اور حضورؐ کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ عمرو بن جحاش بن کعب نے یہ "مقدس" ذمہ داری اپنے سر لی۔ ادھر حضورؐ پر انکا ارادہ بد منکشف ہو گیا اور آپؐ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔ [1]

مشہور یہودی سردار کعب بن اشرف جس کا باپ قبیلہ طے سے تھا اور جس کی ماں یہود کے مال دار مقتداء ابو رافع بن ابی حقیق کی بیٹی تھی' اپنے اس دو گونہ تعلق کی وجہ سے عربوں اور یہودیوں کے درمیان یکساں رسوخ رکھتا تھا۔ ایک طرف وہ مالی قوت رکھتا تھا' دوسری طرف اس کی شاعری کی بھی دھاک تھی۔ اسکے سینے میں اسلام کے خلاف بڑا زہریلا لاوا بھرا تھا۔ چنانچہ ایک دوسری روایت (فتح الباری) اسکی موید ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کعب نے حضورؐ کی دعوت کی اور کچھ آدمیوں کو مامور کر دیا کہ جب حضورؐ آئیں تو وہ ان کو قتل کر دیں۔ یہ روایات اپنی مستقل حیثیت میں چاہے بہت زوردار نہ ہوں مگر کعب کے بغض اور اسکی مجموعی سرگرمیوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو ایسا ہونا بڑی حد تک قرین قیاس ہے۔

جس زمانے میں بنو قریظہ سے حضورؐ نے تجدید معاہدہ کی' اسی زمانے میں بنو نضیر نے حضورؐ کو پیغام بھجوایا کہ آپؐ اپنے ساتھ تین آدمی لائیں اور ہم بھی اپنے تین عالم پیش کریں گے۔ آپؐ اپنی بات اس مجلس میں بیان کریں۔ اگر ہمارے عالموں نے آپؐ کی تصدیق کر دی تو ہم سب بھی آپؐ پر ایمان لے آئیں گے۔ حضورؐ روانہ ہوئے تو راستہ میں آپؐ کو اطلاع ہو گئی کہ یہود تلواریں باندھے اس ارادے سے آپؐ کے منتظر ہیں کہ آپؐ کو قتل کر دیا جائے۔ آپؐ واپس آ گئے۔

فتح خیبر

فتح خیبر کے موقع پر ایک یہودی عورت زینب بنت الحرث (زوجہ سلام بن مشکم) نے ایک بکری کا

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۹۲۔ رحمۃ للعالمین از قاضی سلیمان منصور پوری جلد ۱ ص ۱۸۰' رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی محمد حمید اللہ ص ۳۳۲۔

گوشت بھون کر تیار کیا اور اس میں زہر ملا دیا۔ پھر یہ معلوم کیا کہ حضورؐ کو کون سا حصہ زیادہ مرغوب ہے۔ پھر جب معلوم ہو گیا کہ دست کا گوشت خاص طور پر پسند ہے تو اس نے اس میں باقی گوشت سے زیادہ مقدار میں بہت ہی تیز قسم کا مہلک زہر ملا دیا۔ پھر یہ گوشت حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے لیے تحفے میں بھیجا۔ حضورؐ نے لقمہ منہ میں رکھا (شاید کچھ حصہ نگلا بھی گیا ہو) اور جلد ہی تھوک دیا۔ فرمایا: کہ "اس گوشت نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے" پھر خود بھی نہیں کھایا اور ساتھیوں کو بھی روک دیا۔ بعد میں اس یہودیہ کو بلایا گیا تو اس نے اقرار کر لیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے پیچھے بہت سے یہود کی سازش کام کر رہی تھی۔ حضورؐ نے جب مجلس عام میں ان کو بلوا کر بات کی تو انہوں نے بھی اعتراف کیا۔ مگر بات یہ گھڑی کی ہم نے آپؐ کی جانچ کرنا چاہی تھی کہ آپؐ اگر سچے نبی ہوں گے تو آپؐ پر حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ ورنہ ہم کو نجات مل جائے گی۔ ❶

کھانے کی اس مجلس میں جو صحابہ شریک تھے ان میں حضرت براءؓ بن معرور بھی شامل تھے۔ انہوں نے لقمہ لیا اور زہر کی تلخی محسوس کرنے کے باوجود بہ تقاضائے ادب حضورؐ کے سامنے اگلنا پسند نہ کیا اور کسی نہ کسی طرح اسے حلق سے اتار لیا۔ اسی ایک لقمہ کے زہر سے ان کا انتقال ہو گیا۔ ❷

تبوک سے جب حضورؐ کی واپسی ہوئی اور منافقین کے دل اس مہم کی کامیابی سے بیٹھے جا رہے تھے کیونکہ ان چھپے دشمنوں کے ارمان کچھ اور تھے تو انہوں نے حضورؐ کے قتل کی ناپاک سازش باندھی' اس سازش میں بارہ آدمی شریک ہوئے۔ یہ عبداللہ بن ابیؓ' سعد بن ابی سرح' ابو فاطر اعرابی' عامر' ابو عامر راہب۔ جلاس بن سوید' مجمع بن جاریہ' ملیح تیمی' حصن بن نمیر' طعیمہ بن ابیرق' عبداللہ بن عیینہ اور مرہ بن ربیع تھے۔

سازش کی مجلس میں جلاس نے کہا کہ:

> "آج رات ہم محمدؐ (ﷺ) کو عقبہ سے گرائے بغیر نہ رہیں گے' چاہے محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھی ہم سے بہتر ہوں' مگر ہم لوگ بکریاں ہیں اور یہ ہمارے چرواہے بن گئے ہیں۔ ہم گویا بے عقل ہیں اور یہ لوگ بڑے خرد مند ہیں"۔

اسی شخص سے یہ قول بھی منسوب ہے کہ:

> "اگر یہ شخص (محمد ﷺ) سچا ہے تو پھر ہم لوگ تو گدھوں سے بھی بدتر ہیں" ❸

---

❶ سیرت النبی علامہ شبلی جلد ۱ ص ۴۷۶ بحوالہ فتح الباری۔

❷ زاد المعاد جلد ۲ ص ۱۳۹،۱۴۰ شمائل ترمذی باب ماجاء فی صفۃ ادام رسول اللہ ﷺ حدیث ۱۷۔ اصح السیر۔ مولانا عبدالرؤف۔ دانا پوری۔ ۲۳۶۔

❸ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۷۱

عبداللہ نے کہا تھا کہ "آج کی رات جاگو تو پھر ہمیشہ سلامتی سے رہو گے۔ تمہارا کوئی کام اس کے سوا نہیں ہے کہ اس شخص کو آج قتل کر دو۔"

مرہ نے کہا تھا کہ "بس اگر ہم اس ایک شخص کو قتل کر دیں تو سب کو اطمینان ہو جائے گا۔"

ان میں سے حصن بن نمیر کا ایک کارنامہ یہ تھا کہ اس نے صدقہ کے مال پر ڈاکہ ڈالا تھا۔

ان میں سے ابو عامر بظاہر راہب تھا' اور صوفی و درویش بنا پھرتا تھا مگر مسجد ضرار کے فتنہ کا بانی تھا۔ اور غسان اور روم کے حکمرانوں سے حضورؐ کے خلاف ساز باز رکھتا تھا۔ اس کے لباس تقویٰ میں طرح طرح کے شرار رقص کرتے تھے۔

طے پایا کہ حضورؐ جب عقبہ سے گزریں تو ان کو نیچے گرا دیا جائے۔ اسی منصوبے کے مطابق یہ بارہ مفسدین حضورؐ کے ساتھ ساتھ لگے رہے۔ حضورؐ جب عقبہ کے قریب پہنچے تو ارشاد فرمایا کہ جو لوگ بطن وادی کے کشادہ راستہ سے ہو کر جانا چاہیں وہ ادھر سے جاسکتے ہیں۔ آپؐ نے عقبہ کا راستہ لیا۔ صحابہ کی کثیر تعداد بطن وادی کی طرف چلی گئی۔ مگر سازشی گروہ بطور خاص حضورؐ کے ساتھ رہا۔ حضورؐ کی نگاہ یوں بھی دلوں کی گہرائی میں اتر کر مخفی جذبات کو پڑھ لینے والی تھی۔ اور پھر اپنے سامنے پر پرزے نکالنے والے منافقین کا نبض شناس آپؐ سے بڑھ کر کون ہو گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے غیبی اشارہ دے کر آپ کو اس چال سے مطلع بھی کر دیا۔ آپؐ نے دو رفیقوں کو ساتھ لیا۔ ایک حضرت حذیفہؓ بن یمان تھے' دوسرے عمارؓ بن یاسر۔ حضرت عمارؓ کو حکم دیا کہ وہ آگے رہیں' اور ناقہ کی مہار تھامیں اور حضرت حذیفہؓ سے فرمایا کہ وہ پیچھے پیچھے چلیں۔ جب عقبہ کا خاص مقام آگیا تو سازشی ٹولی لپکتی ہوئی آئی۔ رات کی تاریکی بھی تھی اور انہوں نے چہروں پر نقابیں بھی ڈال رکھی تھیں۔ حضورؐ کو آہٹ ہوئی تو ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کو پیچھے لوٹا دیں۔ حضرت حذیفہؓ لپک کر گئے۔ اوز ان لوگوں کا اونٹ دکھائی دیا اور انہوں نے اپنا ترکش اس کی تھوتھنی پر مارا۔ وہ لوگ حضرت حذیفہؓ کو جب پہچان گئے تو سمجھے کہ راز فاش ہو گیا۔ اور پیچھے بھاگ کر لوگوں میں گھل مل گئے۔

حضرت حذیفہؓ واپس ہوئے تو حضورؐ نے حکم دیا کہ اس مقام سے اونٹ کو تیز ہنکا کر نکال لے چلو۔ پھر حضرت حذیفہؓ سے پوچھا۔ کہ کیا تم نے ان لوگوں کو پہچانا۔ انہوں نے کہا کہ فلاں اور فلاں کی سواری تو پہچان لی۔ مگر آدمی نہیں پہچانا۔ حضورؐ نے پوچھا کہ تم نے ان کا عندیہ سمجھا۔ انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ پھر حضورؐ نے ان کو خود آگاہ کیا۔ کہ یہ ہمیں عقبہ سے گرا دینا چاہتے تھے۔

صبح ہوئی تو حضورؐ نے اشارہ غیبی کے مطابق نام بہ نام ان بارہ سازشیوں کو طلب کیا۔ اور ہر ایک کے دلی جذبات اور مجلس سازش میں کہی ہوئی اس کی باتوں کو اس کے سامنے رکھ دیا۔ اور باری باری ہر ایک سے صفائی طلب کی۔

ان کے جواب بڑے دلچسپ رہے ہوں گے۔ مثلاً حصن بن نمیر کہنے لگا کہ "مجھے یقین نہ تھا کہ آپ کو

اس کی خبر ہو گی۔ مگر آج معلوم ہوا کہ واقعی آپؐ خدا کے رسولؐ ہیں۔ اس سے قبل میں سچا مسلمان نہ تھا۔ اب صدق دل سے اسلام لاتا ہوں"۔

سب نے اس طرح کی مختلف باتیں بنائیں' عذر کیے اور بعض نے معافی چاہی۔ حضورؐ نے سب سے درگزر فرمایا[1]

کافی زور دار روایات اس مدعا کی ہیں کہ حضورؐ نے ان اشخاص کے نام صرف حضرت حذیفہؓ کو راز داری سے بتا دیئے تھے۔ اور عام مسلمانوں پر فاش نہیں کیے۔ علاوہ ازیں ان ناموں میں سے بعض کے بارے میں جزوی اختلافات ہیں۔ نیز ان میں دو تین افراد کے بارے میں یہ بحثیں بھی کی گئی ہیں کہ کم سے کم بعد میں ان کے اندر کوئی علامت نفاق نہیں پائی گئی۔

مگر اصل واقعہ اپنی جگہ تاریخی طور پر ثابت ہے اور اسی کا ذکر قرآن نے "همو ابما لم ينالوا" (اس چیز کا ارادہ باندھا کہ جس تک پہنچ نہ سکے) کہہ کر کیا۔

اس محسن انسانیتؐ کی عالی ظرفی کی کوئی مثال ڈھونڈ کے لاؤ تاریخ سے' جو نوع انسانی کی خدمت کے لیے خون پسینہ ایک کر کے انقلاب برپا کرتا ہے۔ اور چند اشرار عین دور کشمکش میں اس کے کارنامے کی جڑ کاٹنے کے لیے اس کے قتل کا منصوبہ بنا کر عملی اقدام بھی کرتے ہیں' ان کا راز فاش بھی ہو جاتا ہے' اور وہ اقبال بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ معراج انسانیت اتنے بڑے جرم پر بھی عفو سے کام لیتا ہے۔ حضورؐ سے درخواست بھی کی گئی کہ "آپؐ ان میں سے ہر ایک کے اہل قبیلہ کو حکم دیں کہ وہ اپنے اپنے آدمی کا سر آپؐ کے سامنے لا کے پیش کر دیں"۔ جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ: "میں یہ پسند نہیں کرتا کہ عربوں میں یہ چرچا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر دشمنوں کا مقابلہ کیا' اور پھر جب غلبہ پا لیا تو خود اپنے ساتھیوں کو قتل کرنے لگا۔"[2] حضورؐ کا منشا یہ تھا کہ تحریک اسلامی کی اصل طاقت (اس کی امتیازی شان برقرار نہ رہ سکے گی۔ سو اپنی جان کے لیے خطرات بھی انگیز کر لیے اور لو بہ لو فتنوں اور شرارتوں کا مقابلہ کرنا بھی گوارا کر لیا۔ مگر یہ پسند نہ کیا کہ حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے جبر و قوت کا لٹھ چلائیں۔ اور جہاں کوئی خرابی دیکھیں۔ اسے اقتدار اور قانون کے زور سے بے تحاشا کچل دیں۔ انسانی معاشرہ کا نظام چلاتے ہوئے بے شمار حکمتیں اور مصالح پیش نظر ہوتے ہیں۔ اور اصلاح کی بہت سی تدبیریں مختلف پہلوؤں سے استعمال کرنی ہوتی ہیں۔ اسلامی انقلاب عام دنیوی انقلابوں سے زیادہ کٹھن اسی لیے ہے کہ اس کی نازک اخلاقی روح کا تحفظ قدم قدم پر کرنا پڑتا ہے کہ اس آئینہ میں کہیں کسی عمومی غلط فہمی اور کسی مخالفانہ پروپیگنڈے کا غبار نہ آجائے۔

---

[1] اصح السیر۔ مولانا عبدالرؤف داناپوری ص ۳۷۵ تا ۳۷۷

[2] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۷۲

انہی واقعات میں سے یہ بھی ہے کہ یہودیوں نے آپؐ پر جادو کا ایک حملہ بھی کیا تھا۔ بہادر دشمن وہ ہوتا ہے جو کھل کر مقابلہ کرے۔ اور اگر وہ جان کے درپے ہو تو چیلنج کر کے کھلم کھلا حملہ آور ہو۔ لیکن یہودیوں میں اتنا بل بوتہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ سازش کی راہ پر پڑے جو بزدلوں اور کمینہ فطرت لوگوں کی راہ ہوتی ہے۔ لیکن اس سے آگے جادو' ٹونے' وظیفوں اور جھاڑ پھونکوں کے زور سے وہ لوگ کسی پر حملہ کرتے ہیں جو دوں ہمتی اور سفلگی کے لحاظ سے آخری مرتبہ سے بھی فروتر ہو جائیں' سو ان لوگوں نے بغض کے مارے یہ گھٹیا حرکت بھی حضورؐ کے خلاف کر ڈالی۔

بنی زریق کا ایک شخص لبید بن اعصم یہودیوں کا حلیف تھا۔ اور منافقانہ شخصیت کا حامل۔ اس کے ہاتھوں عمل سحر کرایا گیا۔ ایک یہودی لڑکا اپنی اچھی فطرت کی وجہ سے حضورؐ کی طرف مائل تھا۔ اور آپؐ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ اس کو مجبور کر کے بعض یہودیوں نے حضورؐ کے سر کے بال اور کنگھی کے دندانے حاصل کئے۔ اور ان پر جادو کا عمل کر کے بارہ گرہوں والا گنڈا بنایا گیا اور ذروان نامی کنوئیں میں اسے رکھوایا گیا۔

احادیث میں آتا ہے کہ اس عمل سحر کی وجہ سے حضورؐ ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرتے' کسی کام کا خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے۔ حالانکہ نہ کیا ہوتا۔ جنسی میلان پر بھی کچھ اثرات تھے۔ القائے ربانی سے آپؐ اس عمل سحر سے آگاہ ہوئے۔ وہ گنڈا نکلوایا گیا اور آپؐ کی طبیعت معمول پر آگئی ●

اس واقعہ سے متعلق ایک مشہور بحث یہ چلتی ہے کہ نبی پر سحر کا اثر ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ قطعاً اثر نہیں ہو سکتا۔ اس دلیل کو لے کر منکرین حدیث نے احادیث کو ناقابل اعتماد ثابت کرنے میں بھی استعمال کیا ہے۔ حالانکہ ایک نبی کا انسانی جسم جس طرح امراض اور ضربات اور زہروں سے اثر لیتا ہے۔ اسی طرح اس کے نفسیاتی قویٰ بھی ہر طرح کے ظاہر و پنہاں محرکات سے اثر لیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ پر فرعون کے جادوگروں کے عمل کو دیکھ کر ذہنی اثر ہوا۔ اور آپؑ نے ان کی رسیوں کو سانپ محسوس کر کے خوف محسوس کیا۔ (فاوجس فی نفسه خیفة موسی (طه۔ ۶۷) جادو کے جس اثر کی نفی انبیاء کے حق میں کی گئی ہے۔ وہ ایسا اثر ہے جو کار نبوت میں قادح ہو سکے اور ذہن کسی دوسرے کے قبضے میں چلا جائے۔ اور قوت ارادی کی باگ ڈور ہاتھ سے بالکل چھوٹ جائے۔ ●

اس بحث سے قطع نظر یہ واقعہ مان لینے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے کہ یہود نے اپنی طرف سے حضورؐ پر عمل سحر کرنے کا اقدام کر ڈالا تھا۔ ان کا جرم اپنی جگہ ثابت ہے۔

یہ واقعات جب ہمارے سامنے آتے ہیں تو اس وقت ہم پر اس تشویش کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جو

● تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۵۷۴ و ج ۷ تفسیر سورہ فلق۔

● تفہیم القرآن جلد ۶ حاشیہ نمبر ۱۳ ص ۴۳

حضورؐ کی جان کے متعلق مدنی دور میں اسلامی جماعت کو لاحق رہتی تھی۔ حضورؐ کو اگر کبھی رات کے وقت گھر سے نکلنا پڑتا تو رفقاء کو سخت اضطراب رہتا۔ طلحہؓ بن براء نے انہی حالات کو مدنظر رکھ کر مرض الموت میں وصیت کی کہ اگر میرا دم واپسیں رات کو مقدر ہو تو حضورؐ کو اطلاع نہ کی جائے۔ کیونکہ یہود کی طرف سے خطرہ ہے۔ خدانخواستہ دشمنوں کے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچے۔ اگر حضورؐ اتفاقاً نگاہوں سے ذرا بھی اوجھل ہو جاتے تو رفقاء میں گھبراہٹ پھیل جاتی اور وہ تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ مشہور اور معرکۃ الآرا روایت جس میں شہادت لا الٰہ الا اللہ کو داخلہ جنت کی ضمانت قرار دیا گیا ہے' اپنے اندر ان حالات کی ایک جھلک رکھتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ:

"ہم لوگ رسول اللہ (ﷺ) کے ارد گرد بیٹھے تھے اور ہماری اس مجلس میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی شریک تھے۔ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے درمیان سے اٹھ کر کہیں چلے گئے اور خاصی دیر لگا دی ہمیں تشویش لاحق ہوئی کہ ہمارے ساتھ موجود نہ ہونے کی صورت میں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا دیا جائے۔ ہم لوگ اس خیال سے گھبرا سے گئے اور اٹھ کھڑے ہوئے جس پر سب سے پہلے گھبراہٹ طاری ہوئی' وہ میں ہی تھا۔ سو میں حضورؐ کی تلاش میں نکل ہی کھڑا ہوا" ❶

کھوج لگاتے لگاتے حضرت ابو ہریرہؓ بنو نجار کے ایک انصاری کے باغ تک جا پہنچے۔ احاطے کی دیوار کے گرد گھوم پھر کر دیکھا کہ کدھر کوئی دروازہ ہے لیکن احاطہ لمبا ہو گا۔ اور گھبراہٹ اور جلدی میں ان کو کوئی نزدیکی راستہ نہ ملا۔ آخر انہوں نے دیکھا کہ پانی کی ایک نالی احاطہ کی دیوار کے نیچے سے گزرتی ہے۔ سمٹ سمٹا کر (ان کے اپنے الفاظ ہیں کہ میں لومڑی کی طرح سمٹ کر نکلا) نالی کی راہ سے اندر پہنچے۔ حضورؐ کو وہاں دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ اس کے بعد پھر گفتگو ہوئی جس میں حضورؐ نے مشہور بشارت دی۔

ایک صحابی خاص کے اس بیان کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہود و منافقین کی نت نئی قاتلانہ سازشوں کے باعث مدینہ کی فضا کیسی رہتی تھی۔ اور حضورؐ کی زندگی کن خطروں میں گھری رہتی تھی مگر وہاں اعتماد علی اللہ کا حال یہ تھا کہ ایک بار انہی خطرات و خدشات کے پیش نظر صحابہ کرام نے حفاظتی پہرے کا انتظام کیا۔ مگر حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کے مطابق کہ واللہ یعصمک من الناس۔ (المائدہ۔ ۶۸) (اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا) اسی وقت خیمہ سے سر باہر نکال کر فرمایا:

"لوگو! واپس چلے جاؤ' میری حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لے لیا ہے"۔ ❷

یہ وہی ایمان تھا جو حضورؐ کے خلاف ارادہ قتل کر کے گرفتار ہو جانے والے ایک مجرم کے سامنے بھی

---

❶ مشکوٰۃ جلد اول۔ کتاب الایمان فصل سوم

❷ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۷۹

ظاہر ہوا۔ جب کہ آپؐ نے فرمایا، کہ:

"اسے چھوڑ دو! کیونکہ یہ مجھ کو قتل کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا" ❶

ذرا انسانیت کے اس معمار کے مقام کا تصور کیجئے کہ جس کے گرد قتل کی سازشیں عشق پیچاں کی بیلوں کی طرح نشو ونما پاتی تھیں اور فتنے تیندوے کی تاروں کی طرح پھیلے تھے۔ مدینہ میں کچھ مکڑے بیٹھے تھے۔ اور دن رات وہ بیشۂ شجاعت کے شیر کا شکار کرنے کے لیے جالے تنتے رہتے تھے۔

ادھر مکہ کا کوہ آتش فشاں بھی روز بروز زیادہ کھولتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے سینے میں بھی عناد اور کمینگی کا لاوہ برابر زور کر رہا تھا۔ ہجرت سے پہلے حضورؐ کے قتل کی جو بہت بڑی اجتماعی سازش کی گئی تھی۔ اگرچہ اس نے اب باقاعدہ جنگی مہمات کی شکل اختیار کر لی تھی مگر ان کھلی کھلی مہمات کی ناکامیوں قتل کی خفیہ سازشوں کی محرک بھی بن رہی تھیں۔

معرکہ بدر میں حضورؐ کی مٹھی بھر جماعت نے مظلومانہ صبر کے نام سے حق کی تیغ برق دم نکال کر جب اپنے ہاتھ دکھائے تھے تو فرزندان جاہلیت کو وہ وہ چرکے لگے کہ جن کی ٹیسوں نے انھیں برسوں آتش زیر پا رکھا۔ کوئی گھرانا نہ تھا جس کے اچھے اچھے سردار اور جوان کھیت نہ رہے ہوں۔ لیکن گنتی کے چند بے سرو سامان انقلابی مسلمانوں کے ہاتھوں سے مار کھا کر اب اُف کی صدا نکالنا بھی مزید رسوائی کا سبب تھا۔ اس لیے قریش نے منادی کرا دی کہ کوئی شخص مقتولین بدر کا ماتم نہ کرے۔ اس لڑائی میں اسود کے تین بیٹے مارے گئے تھے اور اس کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ مگر منہ سے بھاپ نہیں نکال سکتا تھا۔ ایک دن اسے رونے کی آواز سنائی دی۔ خادم سے کہا کہ ذرا دیکھنا، کیا رونے کی اجازت ہو گئی ہے۔ خادم نے دریافت کر کے بتایا کہ ایک عورت کا اونٹ گم ہو گیا ہے اور وہ اس کے لیے رو رہی ہے۔ اسود کے جذبے کو اس اطلاع نے مہمیز کیا۔ اور بے اختیار اس نے چند شعر الاپے جو خاص ادبی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان میں سے تین ملاحظہ ہوں:

اتبکی ان یضل لھا بعیر ویمنعھا من النوم السھود
فلاتبکی علی بکر ولکن علی بدر تقاصرت الحدود
و بکی ان بکیت علی عقیل و بکی حارثا اسد الاسود

"وہ ایک اونٹ کے کھو جانے پر روتی ہے۔ اور اس کو نیند نہیں آتی۔ اونٹ کے لیے نہ رو، رونا ہے تو بدر کے حادثے پر رو۔ جہاں نصیبہ کوتاہ ہو گیا۔ روتی ہے تو پھر عقیل کے لیے رو اور اس حارث کے لیے رو جو شیروں میں ایک شیر تھا۔"

مکہ کے ایسے غم آگیں ماحول میں عمیر بن وہب اور صفوان بن امیہ یکجا بیٹھے مقتولین پر رو رہے تھے،

---

❶ ایضاً۔

صفوان نے کہا۔ "اب جینے میں لطف نہیں رہا"۔ عمیر کہنے لگا "اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہو کر جاتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر آتا۔ میرا بیٹا بھی وہاں قید میں پڑا ہے"۔ صفوان نے اس کے بچوں اور قرض کی ذمہ داری لی۔ اور عمیر نے فوراً گھر آ کر تلوار زہر میں بجھائی اور مدینہ روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو حضرت عمرؓ نے اس کے مخفی جذبے کو اس کی پیشانی سے پڑھ لیا' اور گلے سے پکڑے پکڑے حضورؐ کے سامنے لائے۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا' کہ اسے چھوڑ دو۔ قریب بلایا۔ پوچھا کس ارادے سے آئے ہو۔ عمیر نے کہا کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں۔ پوچھا' کہ یہ تلوار کیوں لٹکا رکھی ہے۔ عمیر نے کہا' کہ آخر تلواریں بدر میں کیا کام دے سکیں؟

حضورؐ نے اب اس کے سینے کا رازِ نہاں کھول کے اس کے سامنے رکھ دیا' کہ "تم نے اور صفوان نے حجرے میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش کی ہے۔ لیکن اللہ تمہارے اور تمہارے اس ارادے کے بیچ میں حائل ہے"۔

عمیر نے یہ سنا تو مبہوت ہو گیا۔ بولا' "بخدا! آپؐ سچے پیغمبر ہیں۔ میرے اور صفوان کے علاوہ اس معاملہ کی اور کسی کو خبر نہ تھی"۔

عمیر مسلمان ہو کر واپس مکہ پہنچا۔ اور جرأت کے ساتھ اسلام کی دعوت دی اور بہت بڑی تعداد کو اسلامی انقلاب کے جھنڈے تلے لے آیا۔ [1]

فتح مکہ کے موقع پر فضالہ بن عمیر کے سینے میں بھی انتقام کی بجلی کوندی۔ دل ہی دل میں حضورؐ کے قتل کا ارادہ باندھا۔ حضورؐ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے کہ فضالہ نمودار ہوا۔ قریب آیا تو آپؐ نے بلایا۔ "فضالہ! تم ہو؟" اس نے جواب دیا' "ہاں! یا رسول اللہ فضالہ"! فرمایا' "کیا بات تم نے اپنے دل میں ٹھان رکھی ہے؟" فضالہ نے گھبرا کر جواب دیا "کچھ بھی نہیں۔ میں تو خدا کا ذکر کر رہا ہوں"۔

حضورؐ یہ جواب سن کر ہنس پڑے اور نصیحت کی کہ "خدا سے مغفرت طلب کرو"۔ اور یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ فضالہ کے سینے پر رکھ دیا اور اس کا دل ٹھکانے آ گیا۔ فضالہ کا بیان ہے' کہ "حضورؐ نے جب اپنا ہاتھ میرے سینے سے اٹھایا تو خدا کی مخلوق میں سے میرے لیے حضورؐ سے بڑھ کر اور کچھ محبوب نہ رہا"۔

فضالہ اس قلبی انقلاب سے گزر کر گھر چلے گئے۔ [2]

فاتح مکہ ---- بلکہ فاتح عرب کے خلاف ایک شخص قتل کا ارادہ باندھ کر آتا ہے اور اس کی بارگاہ سے نئی زندگی لے کر روانہ ہوتا ہے۔ کاری زخم لگانے آتا ہے اور اپنے زخموں کے لیے مرہم لے کے جاتا ہے۔

قریش اور یہود اور منافقین سب کے سب اپنی چالیں چلتے رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۳۰۶ تا ۳۰۹

[2] سیرت ابن ہشام جلد ۴ ص ۳۷

دکھایا۔ اور آخر دم تک اپنے بندے اور اپنے رسولؐ کی حفاظت فرمائی۔

ان سازشوں کا اصل مقصود مجرد ایک فرد کا قتل نہیں تھا بلکہ یہ لوگ اسلامی تحریک کو قتل کرنا چاہتے تھے کہ یہ سچائی کی اس صبح درخشاں کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے جس کے دامن نور کے نیچے تاریکیوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ یہ اس نظام نو کا گلا کاٹنا چاہتے تھے۔ جس نے صدیوں کے زخم خوردہ مظلوم طبقوں کو پہلی مرتبہ زندگی' آزادی' مساوات اور عزت و آبرو سے مالا مال کیا تھا۔

ہلاکت انگیز غداریاں:

اوپر ہم نے مدینہ کی اسلام دشمن طاقتوں کی جن شرارتوں کا ذکر کیا ہے وہ اخلاقی اور قانونی لحاظ سے سنگین جرائم کی تعریف میں آتی ہیں۔ اور اگر ان پر سخت ترین کارروائی کی جاتی تو دین و سیاست کے بہترین اصول عدل کے عین مطابق ہوتی۔ مگر حضورؐ پاک نے بڑا ہی ٹھنڈا اور صابرانہ رویہ اختیار کیا۔ جس تحریک کے سامنے اصل مقصود انسانیت کی اخلاقی اصلاح و تعمیر ہو وہ اقتدار کی تلوار اور قانون کے ڈنڈے پر سارا انحصار نہیں کر سکتی۔ لوگ کتنی بھی پستی دکھائیں' وہ انسانی فطرت سے مایوسی کو اپنا نقطہ آغاز نہیں بناتی' بلکہ لمبی امیدیں باندھ کر قدم بڑھاتی ہے۔ اس کی اصل قوت تعلیم و تنظیم ہوتی ہے نہ کہ تعزیر و تہدید۔ اقتدار اور قانون کی طاقت سے ایک مناسب حد تک کام لیے بغیر تو کوئی نظام ریاست وجود ہی قائم نہیں رکھ سکتا۔ لیکن انسانوں کے ذہن و کردار کی تبدیلی کا کام تلواروں اور کوڑوں سے کبھی نہیں ہوتا۔ عقلی دلیل اور اخلاقی اپیل سے ہوتا ہے۔ اس راہ میں غصہ کے بجائے تحمل اور انتقام کے بجائے صبر زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ انسانیت کے محسن اعظمؐ نے تاریخ کی فضاؤں کو حسن اخلاق سے روشن کرنا چاہا۔ مخالفوں کی زیادتیوں اور فتنہ سازیوں پر مرد افگن درجے کا صبر دکھایا۔ اتنے بڑے عفو اور اتنی بڑی چشم پوشی کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی کہ کچھ لوگ حضورؐ کی برسوں کی کمائی کو فتنوں کے جھکڑوں میں اڑا دینا چاہتے ہیں۔ نظم اور قانون کو معطل کرنے کے سامان کرتے ہیں۔ قتل کی سازشیں گانٹھتے ہیں' ذلیل طریقوں سے پریشان کرتے ہیں اور دنیا بھر میں اپنے نمونے کی پہلی نوخیز ریاست کا سربراہ شر و فساد کے اس طوفان کے نرغے میں سے بڑے وقار اور سکون کے ساتھ ------ بلکہ موجوں اور خشکوں کو ایک خندہ استہزاء سے داد دیتا ہوا ------ چھوٹی سی ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کو نکال لیے جا رہا ہے۔

لیکن مخالف طاقتوں نے بھی جرم و شرارت کی آخری حد کو چھوئے بغیر دم نہ لیا۔ انہوں نے ایک بار نہیں' بار بار باغیانہ غداری (High treason) کے کھلے کھلے اقدامات کئے اور کوئی لحاظ اس بات کا نہیں کیا کہ وہ ایک دستوری معاہدہ کا قلادہ اپنے گلے میں ڈال کر جس ریاست کے شہری بنے ہیں اس کی وفاداری ان پر دین و سیاست کے تقاضے سے واجب ہو چکی ہے۔ غداری کے کھلے کھلے اقدامات ایسے ہیں کہ جن کی سزا نہ آج سے پہلے' اور نہ آج' سلب شہریت اور موت سے کم رکھی گئی ہے۔ مگر وہ جو تمدن کی تقدیر بدلنے

آیا تھا۔ اس نے اسے بڑے اور مہلک جرائم کے مقابلے میں بھی حد درجہ کا تحمل دکھایا اور آخر دم تک یہ کوشش جاری رکھی کہ دشمن طاقت کی حس شرافت بیدار ہو' اس کی سوچنے کی طاقتیں جاگ اٹھیں' وہ معقولیت کی طرف مڑ جائے' اور ایک بار' دوسری بار' تیسری بار سنبھل جائے۔ مگر جو لوگ ٹیڑھے راستے پر پڑ گئے تھے' ان کی آنکھیں نامرادی کے گڑھے میں گرنے سے پہلے پہلے نہیں کھل سکیں۔ الا ماشاء اللہ!

ہلاکت انگیز غدارانہ اقدامات کی چند نمایاں مثالیں ہم یہاں پیش کر رہے ہیں' جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ سچائی اور نیکی کا نظام قائم کرنے والوں کو کن خارزاروں سے گزرنا پڑا ہے۔

یہ بات روشن ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ کی مجلس میں صدق و اخلاص کے جن پیکروں نے رسولؐ برحق کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا' اس شعور کے ساتھ دیا تھا کہ حضورؐ کے مدینہ جانے اور وہاں تحریک اسلامی کا مرکز بننے کے معنی جنگ ہیں۔ یہ واقعہ قریش کے لیے بہت سے وجوہ سے بڑا بھاری چیلنج ہو گا اور وہ سخت جذباتی اشتعال میں آکر تلواریں سونت لیں گے۔ اس بنا پر حقیقت بھی واضح ہے کہ حضورؐ کی جان' آپؐ کی قائم کردہ جماعت کا وجود اور دوسرے مرکزِ تحریک کا تحفظ تائید ایزدی کے تحت تمام تر اب اہل مدینہ کے تعاون پر منحصر تھا۔ اسی مقصد سے انصار کے نمائندہ اور فعال نوجوانوں سے حضورؐ نے بیعت لی اور اسی غرض کے لیے یہودی قبائل سے پہلے ہی سال ہجرت میں معاہدات استوار کر لیے۔ انصار نے تو اپنی بیعت کا بہ حیثیت مجموعی آخر دم تک حق ادا کیا۔ مگر خدا کی کتاب کے امانت داروں اور انبیاءؑ کے وارثوں نے اور ان کے عقیدت مندوں نے اپنے باندھے ہوئے معاہدوں کو بار بار خود ہی پامال کیا۔

سب سے پہلا اور نمایاں واقعہ غداری یہ ہے کہ قریش مکہ نے عبداللہ بن ابی کو کارآمد ترین آدمی پا کر اسے ایک مخفیہ خط بھیجا اور اس کے ذریعہ مدینہ کے فاسد اور کمزور عناصر کو اپنے اثر میں لینے کے لیے ایک ہمہ گیر پیغام بھیجا۔ لکھا کہ:۔

> "تم لوگوں نے ہمارے آدمی (یعنی محمد ﷺ) کو اپنے ہاں پناہ دی ہے اور ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم اسے مار ڈالو یا مدینہ سے نکال باہر کرو۔ ورنہ ہم سب مل کر تمہارے خلاف چڑھائی کریں گے اور تم کو قتل کریں گے۔ اور تمہاری عورتوں کو اپنے لیے سامان عشرت بنائیں گے۔" [1]

عبداللہ بن ابی اگر ایماندار اور شریف شہری ہوتا تو وہ فوراً اس خط کو حضورؐ تک پہنچاتا اور اس کی دلی خواہش یہ ہوتی کہ قریش کی دھمکی کے مقابلے میں سارے مدینہ کے جذبات حمیت کو صف آرا کر دیا جائے۔ لیکن غداری تو اس کی روح میں رچی بسی تھی۔ وہ اپنی محرومی اقتدار کا انتقام لینے کے لیے اس پر تل گیا کہ قریش کا منشاء پورا کر دیا جائے۔ اسے اندازہ تھا کہ تحریک اسلامی کے مقابلے پر مدینہ کے باسیوں میں

---

[1] سنن ابو داؤد باب خبر النضیر۔

شرپسندوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ لیکن یہ راز بہت جلد کھل گیا اور حضورؐ مطلع ہو گئے۔ خود عبداللہ بن ابی کے پاس تشریف لے گئے اور اسے سمجھایا کہ تم لوگوں کے اپنے ہی بیٹے' بھتیجے اور بھانجے اپنی پوری قوت شباب کے ساتھ دین حق کی علمبرداری کر رہے ہیں اور اگر کوئی ایسی ویسی صورت پیدا ہو گئی' تو تم دیکھو گے کہ تمہاری ہی اولادیں تمہارے مقابلے میں کھڑی ہیں۔ تمہیں اپنے ہی بچوں سے لڑنا ہو گا۔ عبداللہ بن ابی کی سمجھ میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ اپنے منصوبے سے باز آگیا۔ واضح رہے کہ جنگ بدر کے بعد قریش نے پھر ایسا ہی ایک خط عبداللہ کو بھیجا تھا۔

اسی فتنہ گر نے ایک نہایت ہی نازک موقع پر سخت غدارانہ اقدام یہ کیا کہ جب بنو نضیر کی بار بار کی عہد شکنی اور تخریبی حرکات پر اسلامی ریاست کی طرف سے ان کو دس روز کے اندر اندر مدینہ کی حدود سے نکل جانے کا حکم ہوا' اور وہ اس کے لیے تیاریاں بھی کرنے لگے' تو عبداللہ بن ابی نے ان کو کہلا بھیجا کہ خبردار! اس حکم کی تعمیل نہ کرنا اور اپنی بستی کو نہ چھوڑنا۔ ہم دو ہزار آدمیوں کی کمک لے کر آرہے ہیں۔ اور پھر یہ امید بھی دلائی کہ ایک طرف بنو قریظہ تمہاری مدد کریں گے اور دوسری طرف بنو غطفان تمہارے حلیف ہیں۔ چنانچہ بنو نضیر نے حضورؐ کو کہلا بھیجا کہ ہم یہاں سے نہیں جاسکتے۔ آپؐ کا جو جی چاہے کریں۔ بالآخر اسلامی حکومت کو اپنا حکم منوانے کے لیے فوجی کارروائی کرنی پڑی۔ [1]

پھر اسی شخص نے جنگ احد کے انتہائی نازک اور فیصلہ کن موقع پر یہ گل کھلایا کہ جب اسلامی فوج مدینہ سے نکل کر شوط کے مقام پر پہنچی تو یہ تین سو منافقین کو لے کر مدینہ لوٹ گیا۔ یہ حرکت اسلامی فوج کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف تھی۔ کہتا یہ تھا کہ جب ہماری رائے پر عمل نہیں کیا جاتا اور اختیارات دوسروں کے ہاتھوں میں ہیں تو ہم اپنی گردنیں کیوں کٹوائیں۔ دراصل عبداللہ بن ابی کی رائے یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نہ نکلا جائے۔ [2]

غدارانہ ساز باز کے لحاظ سے دوسری نمایاں شخصیت ابو عامر کی تھی۔ ہم مسجد ضرار کے سلسلے میں اس کا تعارف کرا چکے ہیں۔ اس فتنہ گر نے معرکہ بدر کے بعد نبیؐ اکرم کی فتح سے جل بھن کر مکہ کا سفر کیا اور ابوسفیان سے مل کر قریشی سرداروں کو انتقام کے لیے بھڑکایا۔ جنگ احد کی آگ کو دہکانے میں اس کا بھی حصہ تھا۔ یہ خود بھی قریشی لشکر کے ساتھ میدان جنگ میں اس زعم کے ساتھ اترا کہ میرے کہنے پر قبیلہ اوس کے لوگ اسلام کا ساتھ چھوڑ کر قریش کی طرف آجائیں گے۔ اس نے میدان جنگ میں اوس والوں کو پکارا۔ مگر اس کو وہ جواب ملا کہ دماغ درست ہو گیا۔ اور تو اور خود اس کے فرزند حضرت حنظلہ نہایت اخلاص اور جاں نثاری سے سرور عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اشاروں پر سر بکف کھڑے تھے۔ پھر احد

---

[1] اصح السیر از مولانا عبدالرؤف داناپوری ص ۱۶۷

[2] ایضاً ص ۱۴۶۔ سیرت النبیؐ از شبلی نعمانی جلد ۱ ص ۳۴۲

کے بعد یہ ہرقل روم کے پاس پہنچا تاکہ وہاں سے فوجیں چڑھالائے۔ ادھر منافقین کو درپردہ بھروسہ دلایا گیا تھا کہ تم تیار رہنا۔ میں کمک لے کے آرہا ہوں۔ اس شخص کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے مقام حنین کے قریب حضورؐ کو اذیت دینے کے لیے گڑھے کھدوائے تھے۔ چنانچہ آپؐ ایک گڑھے میں گرے اور متعدد چوٹیں آئیں۔ ❶

غدارانہ سرگرمیوں کا تیسرا بڑا امام کعب بن اشرف تھا۔ اور اس کا تذکرہ بھی اوپر ہم کر چکے ہیں۔ اس شخص نے ایک طرف مدینہ میں وظیفے جاری کر کر کے کرائے کے پٹھو پیدا کر رکھے تھے۔ اور دوسری طرف یہ مکہ والوں کو مدینہ پر چڑھائی کے لیے بھڑکاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے اثر و رسوخ اپنے فن شعر اور اپنی دولت کو خوب خوب استعمال کیا۔ اس کی تحریک سے ابوسفیان اور دوسرے لوگوں نے غلاف کعبہ کو تھام کر بدر کا انتقام لینے کا حلف لیا۔

اس سازشی ماحول نے اسلامی جماعت کو خاص حفاظتی انتظامات اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ حضورؐ راتوں کو جاگا کرتے تھے۔ اور اپنے رفقاء کو باری باری پہرے پر مامور کرتے۔ اسی دور کا واقعہ ہے کہ ایک بار آپؐ نے مجلس عام میں فرمایا' "آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دے"۔ یہ اشارہ سن کر سعد بن ابی وقاصؓ نے ہتھیار لگائے اور رات بھر پہرہ دیا۔ حال یہ تھا کہ صحابہ صبح تک ہتھیار لگائے لگائے سویا کرتے تھے۔ اور غالباً یہی وہ دور ہے۔ جس سے حضورؐ کا یہ ارشاد تعلق رکھتا ہے کہ:

رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا و ما فیھا۔ الخ ❷

"خدا کی راہ میں ایک دن کا پہرہ دینا دنیا و مافیہا کے مقابلے میں بہتر ہے۔

اور یہ کہ:

رباط یوم و لیلۃ خیر من صیام شھر و قیامہ۔ ❸

(خدا کی راہ میں) ایک دن رات کا پہرہ دینا مہینے بھر کے (نفلی) روزوں اور شبانہ قیام نماز سے افضل ہے۔"

اس خدمت کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ اس کا اجر قیامت تک بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہ عذاب قبر سے نجات کا ذریعہ ہے۔ ❹

علاوہ ازیں ان سازشوں کے زیر اثر اچانک حملے کے اندیشہ سے حضورؐ نے اپنے علاقہ کی "آخری حدوں

---

❶ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۸۷-۸

❷ ریاض الصالحین کتاب الجہاد

❸ ایضاً

❹ ایضاً

تک ختم ہی میں تدریجاً توسیع ہوتی گئی) طلایہ گردی کا انتظام فرما دیا تھا۔ تاکہ دشمن کو معلوم رہے کہ اسلامی ریاست سوئی ہوئی نہیں بلکہ چاق و چوبند ہے۔

مدینہ کے "پانچویں کالم" کے لیے تحریک اسلامی کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا بہترین موقع معرکہ ہائے جہاد کے دور میں پیدا ہوتا تھا۔ یوں تو مدینہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس برس کا جو زمانہ گزارا ہے اس کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ نازک اور ہنگامی صورت حالات (State of Emergency) چھائی رہی لیکن حق و باطل کی باہم آویزش جب جب بھی (تھوڑے تھوڑے وقفوں پر بار بار ایسا ہوتا رہا) معروف معنوں میں جنگ کی صورت اختیار کرتی' یہود اور منافقین غدارانہ حرکتوں میں لگ جاتے۔ اسلامی ریاست کے پاسبانوں کے لیے کیسی سنگین صورت حالات ہوتی ہو گی جب کہ ایک طرف شدید معاشی مشکلات اور دوسری طرف معرکہ ہائے پیکاران کو اپنے گھیرے میں لیے ہوں اور تیسری طرف اپنے اندر کے مارہائے آستین اپنے ڈنک لگا رہے ہوں۔

احد کا واقعہ ہم اوپر بیان کر ہی آئے ہیں کہ اسلامی فوج میدان جنگ کی طرف مارچ کر رہی ہے اور راستے میں سازشیوں کا لیڈر عبداللہ بن ابی تین سو آدمیوں کو الگ کر کے واپس لے جاتا ہے۔ اگر حضورؐ اور آپؐ کے جان نثاروں کی جگہ کوئی دنیاوی طاقت اس صورت حالات سے دوچار ہوتی' کہ تین ہزار دشمنوں کے مقابلے پر جانے والی کل ایک ہزار کے لگ بھگ تو سپاہ ہو اور اس میں سے بھی تین سو آدمی یکایک الگ ہو جائیں' اور بقیہ سات سو میں بھی کچھ افراد شرانگیزی کے لیے گھلے ملے رہ جائیں تو شاید وہیں دل ٹوٹ جاتے اور ہمتیں جواب دے جاتیں۔ چنانچہ بنو سلمہ اور بنو حارثہ کے لوگ دل شکستہ ہو کر واپسی کی سوچنے لگے تھے۔ لیکن صحابہ کے ہمت بندھانے سے رک گئے۔ مگر خدا پر ایمان' روح صداقت کی برتری کا یقین' اخلاقی قوت کی کامیابی کا تصور اور غیبی امداد پر بھروسہ علمبرداران اسلام کا اصل سرمایہ تھا۔ ان کی قوتوں میں ذرا بھی اضمحلال پیدا نہ ہوا' اور وہ اسی عزم کے ساتھ میدان احد کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ پھر میدان احد میں جب سخت وقت آیا' اور نبی کریم ﷺ کی شہادت کی خبر اڑی تو منافقین نے اس تجویز کے لیے حامی پیدا کرنے چاہے کہ عبداللہ بن ابی کی منت سماجت کر کے اسے آمادہ کیا جائے کہ وہ ابو سفیان سے امان لے دے۔ پھر اس موقع پر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کی کمزوریوں پر گرفت کرنے کے لیے ایک طرح کی جو ہزیمت دی تھی' اس پر ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ محمد (ﷺ) اگر نبی ہوتے تو کیوں ہزیمت کھاتے۔ یہ تو دنیاوی حکمرانوں کا سا معاملہ ہوا کہ کبھی جیت ہو گئی' کبھی ہار۔ اس پروپیگنڈے کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر شبہات پیدا ہو بھی گئے۔ بعض لوگ اس طرح سوچنے لگے کہ ہم جب خدا کی راہ میں لڑنے گئے تھے اور خدا کے پیغمبر کی قیادت میں تھے تو پھر آخر ہمیں زک کیوں ہوئی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے قرآن نے کہا کہ "ھو من عند انفسکم" (آل عمران۔ ۱۶۵) (یہ مصیبت تمہاری اپنی ہی لائی ہوئی ہے یعنی تمہاری بعض کمزوریاں رنگ لائی ہیں)

اور پھر کوئی جنگ ایسی نہیں ہوئی جس کے پہلے' جس کے بیچ میں اور جس کے خاتمے پر ان چھپے رستموں نے غداری کے جوہر نہ دکھائے ہوں' جہاں عملاً کوئی کارنامہ انجام نہ دیا جا سکا' وہاں زبان کے نشتر چلا چلا کر تحریک اسلامی کی رگیں کاٹنے اور مدینہ کی ریاست کا جگر چھیدنے کی کوشش ضرور کی گئی۔ لوگوں کی ہمتیں پست کرنا' ان کو ڈراوے دینا' حضورؐ سے فریب کرنے کی پٹی پڑھانا' اتفاق سے روکنا' اسلامی فوج کا مذاق اڑانا' نبی اکرم ﷺ کی قیادت پر حرف گیری کرنا۔ غرضیکہ کسی پہلو سے کوئی کسر نہ رہنے دی۔

البتہ اس پانچویں کالم نے سب سے بڑھ کر اپنے جوہر جنگ احزاب (غزوہ خندق) کے موقع پر دکھائے۔ میدان بدر کے اولین معرکے میں قریش کی قوت کو کاری ضرب لگ چکی تھی۔ اس کا انتقام لینے کے لیے انہوں نے بڑی تیاریوں سے فوج کشی کی اور احد میں مقابلہ ہوا۔ لیکن وہ پوری طرح بازی سر کیے بغیر ہی پلٹنے پر مجبور ہو گئے۔ ۵ ھ میں وہ اپنی اور اپنے سارے حامیوں اور مدینہ کے سازشیوں کی قوتیں مجتمع کر کے اور مختلف قبائل کو اکسا اکسا کر لائے۔ گویا ہر طرف سے لشکروں (احزاب) نے آ کر مسلمانوں کو گھیر لیا۔ یہ بڑا ہی فیصلہ کن معرکہ تھا۔ اور اس کے بعد قریش اور دوسرے دشمنان اسلام کا زور ٹوٹ گیا۔ اور مسلمانوں نے مدافعانہ پالیسی کو ترک کر کے دشمنوں کی سرکوبی کے لیے پیش قدمی کی پالیسی اختیار کی۔ جنگ احزاب کے خاتمے کے دن ہی درحقیقت فتح مکہ کا دروازہ کھل گیا تھا۔

اس فیصلہ کن معرکہ کے پس منظر میں جن عناصر نے سازشی سرگرمی دکھائی ان میں سرفہرست بنو نضیر کے یہودیوں کو رکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے جو لوگ خیبر میں جا کر بسے' انہوں نے حالات کے اتار چڑھاؤ پر برابر نگاہ رکھی' جب انہیں جنگ احد کا حال معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو بڑی سخت صورت حالات پیش آئی اور قریش اگرچہ کامل فتح کا سہرا نہیں باندھ سکے لیکن خاصا زور دکھا کے آئے ہیں' تو انہوں نے متحرک ہو کر تاریخ کے مدوجزر کو تیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ بنو نضیر میں سے سلام بن ابی الحقیق' سلام بن مشکم' حیی بن اخطب' کنانہ بن الربیع جیسے نامی گرامی سردار نکلے اور انہوں نے بنو وائل میں سے ہوذہ بن قیس' ابو عمارہ اور بعض دوسروں کو ساتھ لیا۔ مکہ جا کر انہوں نے قریش کو مدینہ پر چڑھائی کرنے کی ترغیب دلائی اور اپنی حمایت کی پیش کش کی۔ پھر یہ لوگ بنو غطفان کے ہاں پہنچے اور ان کو بھی تیار کیا۔ پھر دوسرے متفرق قبائل میں گھومے۔ قریش نے بھی قبائل میں اپنے پورے اثر کو استعمال کیا۔ چنانچہ دس ہزار سپاہیوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ [1]

آغاز جنگ سے قبل حیی بن اخطب نے کعب بن اسد سے ساز باز کر کے بنو قریظہ کا معاہدہ تڑوا دیا [2] جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھا۔ اس خبر کو سن کر مسلمانوں کو سخت پریشانی لاحق ہوئی اور بنو قریظہ کی طرف

---

[1] اصح السیر۔ از مولانا عبدالرؤف دانا پوری ص ۱۸۳۔۱۸۶ و سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ ص ۲۳۰۔۲۲۹

[2] سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ ص ۲۳۶۔۲۳۵

سے حملہ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرنے کے لیے حضورؐ نے فوری طور پر تین سو سپاہیوں کا دستہ مامور کیا۔ ادھر منافقین اور تھڑدلے لوگوں نے بے اعتمادی' بزدلی کی باتیں پھیلانا شروع کر دیں اور بعض گھروں کی حفاظت کے بہانے مورچے سے جانے لگے۔ یہاں تک طعن کیا جانے لگا کہ "ایک طرف تو محمد (ﷺ) ہمیں قیصرو کسریٰ کی سلطنت کی کنجیاں پانے کی بشارت دیتے ہیں اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص آج رفع حاجت کے لیے بھی اطمینان سے نہیں جا سکتا"۔ [1]

ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ عین معرکہ کے وقت جب کہ عورتوں کی قیام گاہ کی حفاظت کا معقول انتظام نہ تھا' ایک یہودی مشتبہ حالت میں چکر لگاتا ہوا پایا گیا۔ حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب نے ایک چوب لی اور جا کر اس کا کام تمام کر دیا۔ [2]

اسلامی تحریک کے پاسبانوں کو سب سے زیادہ اضطراب انگیز حالات اسی موقع پر پیش آئے مگر علمبرداران حق کے لیے اللہ تعالیٰ کی تائید خاص تھی۔ اس لیے ایک طرف خندق کی نئی دفاعی تدبیر' دوسری طرف قریش اور بنو قریظہ کی ساز باز توڑنے میں نعیم بن مسعود کا حکیمانہ کمال' تیسری طرف حضورؐ اور آپؐ کے تربیت یافتہ قائدین اور پوری جماعت کا مضبوط مجاہدانہ کردار اور چوتھی طرف مشیت کی بھیجی ہوئی آندھی نے یہ نتیجہ دکھایا کہ دشمن یکایک میدان سے اس طرح رخصت ہو گیا جیسے پل بھر میں بدلیاں چھٹ جاتی ہیں۔

پھر ایک موقع غزوہ تبوک کا ہے۔ جب کہ مدینہ کے پانچویں کالم نے اپنے فن لطیف کے کچھ شاہکار پیش کیے۔ ہرقل روم حضورؐ کا نامہ دعوت پانے کے وقت ہی سے برافروختہ تھا۔ بیچ میں ارباب سازش نے بھی دربار روم میں رسائی حاصل کر کے اسے اکسانے کی کوششیں کی تھیں۔ خبر اڑی کہ ہرقل نے چالیس ہزار کا لشکر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دیا ہے۔

حالات کچھ عجیب تھے۔ قحط کا زمانہ تھا۔ درختوں میں پھل تیار تھے۔ موسم سخت گرم تھا۔ فوج بڑی تعداد میں زیادہ فاصلے پر روانہ کی جانی تھی۔ مگر مالیات کا پہلو کمزور تھا۔ اور سواری' ساز و سامان اور نان و نفقہ کی حد درجہ قلت تھی۔ اسی لیے اسے "جیش عسرت" کا نام بھی دیا گیا ہے۔ منافقین نے اس حالت کو دیکھ کر اور یہ اندازہ کر کے کہ اس معرکے میں غنیمت ہاتھ آنے کا کم ہی امکان ہے' عدم تعاون کی پالیسی اختیار کی اور جھوٹے عذر گھڑ گھڑ کر بیٹھ رہے۔ اس پہلو سے اسے غزوہ فاضحہ (یعنی منافقین کا پول کھول دینے والا معرکہ) بھی کہتے ہیں۔ عذرات کی مضحکہ انگیز نوعیت کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ الجد بن قیس نے آکر حضورؐ سے کہا کہ لوگ جانتے ہیں کہ مجھے عورتوں کی طرف بہت زیادہ رغبت ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ بنی

---

[1] ایضاً

[2] ایضاً ص ۲۴۶

الاصفر کی عورتوں کو دیکھ کر فتنہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں لہٰذا مجھے معذور رکھئے۔ یہ لوگ خود تو رہے ہی تھے' ہر کسی سے کہتے پھرتے تھے کہ خدا خدا کرو' دیوانے ہو گئے ہو۔ اس جھلستی گرمی میں تم جہاد کرنے چلے ہو۔ (وقالوا لا تنفروا فی الحر) (التوبہ۔ ۸۱) انھوں نے ایک اڈا سویلم یہودی کے مکان پر بنا رکھا تھا۔ اس میں لوگ جمع ہوتے تو ان کو غزوہ میں جانے سے روکتے۔ آخر اس اڈے کا ناپاک وجود ہی ختم کر دیا گیا۔

ادھر عبداللہ بن ابی کی فعال شخصیت نے ثنیۃ الوداع میں ذباب کی جانب یہودیوں اور منافقوں پر مشتمل الگ لشکر شرپسندانہ مقاصد کے لیے ترتیب دے لیا۔ جو خاصی تعداد میں تھا۔ لیکن یہ لشکر حضورؐ کے ساتھ روانہ نہ ہو سکا۔

پھر لشکر کی روانگی کے بعد ان لوگوں نے ایک اور فتنہ پیدا کر دیا۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو اہل بیت کی دیکھ بھال کے لیے بطور ذاتی نائب کے چھوڑا تھا۔ یہ لوگ کہنے لگے کہ آج کل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت حضرت علیؓ کے بارے میں مکدر ہے اسی لیے ان کو ساتھ نہیں لیا۔ حضرت علیؓ کی غیرت کو اس نشتر نے ابھار دیا۔ اور ہتھیار لگا کر آپ حضور پاک (ﷺ) سے جا ملے۔ اور منافقین کی شرانگیزی کا قصہ بیان کیا۔ حضورؐ نے انہیں سمجھا بجھا کر واپس بھیجا کہ مدینہ میں ان لوگوں سے خدشہ ہے۔

تبوک پہنچ کر ساتھ جانے والے منافقین (اور کچھ نہ کچھ تعداد فتنہ انگیزی کے لیے ہمیشہ شریک ہوتی تھی) نے حق کے سپاہیوں کو یہ کہہ کر ڈرانا شروع کیا کہ بنو اصفر کے شیر دل جنگ آزماؤں کو تم لوگوں نے عربوں پر قیاس کر رکھا ہے۔ کل تم پر اپنی غلط فہمی کا حال کھل جائے گا جب کہ تم سب کے سب غلام بن کے جکڑے ہوئے ہو گے۔ باز پرس کی گئی تو کہنے لگے کہ ہم تو مذاق مذاق میں کچھ باتیں کر رہے تھے کوئی سنجیدہ معاملہ نہ تھا۔ [1]

رومی لشکر تو آیا ہی نہیں تھا۔ لیکن اس مہم سے ایک طرف رومیوں کو اندازہ ہو گیا کہ مدینہ پوری طرح چوکنا ہے اور ہمارے مقابلے پر آنے کی طاقت رکھتا ہے۔ دوسری طرف ایلہ' جربا اور دومتہ الجندل کے علاقے زیر اثر آجانے سے بیرونی حملہ کے امکانات کم ہو گئے۔

اس سفر میں دو مواقع پر حضورؐ نے چشموں سے بلا اجازت پانی پینے سے فوج کو منع کر دیا تھا۔ لیکن بعض منافقوں نے حکم عدولی کر کے اپنے دلی روگ کو عیاں کر دیا۔

اسی سفر میں عقبہ کے مقام پر حضورؐ کو ہلاک کر دینے کی ناکام سازش کی گئی۔ جس کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔

اہل نفاق کی اتنی غداریوں اور سازشوں کے باوجود حضور اس مہم میں کامیابی حاصل کر کے واپس ہوئے اور بڑی شان سے آپؐ درگزر کرتے گئے۔ تین مخلص ساتھی کعبؓ بن مالک۔ ہلالؓ بن امیہ اور مرارہؓ بن

---

[1] اصح السیر مولانا عبدالروف دانا پوری ص ۳۸۵' ۳۸۶

رہ گئے جو تساہل کی وجہ سے رہ گئے تھے' انہوں نے اعتراف قصور کیا اور ان کو پچاس دن تک حکم الٰہی کے انتظار میں معاشرہ سے الگ رہنا پڑا۔ اس امتحان سے یہ لوگ اس خوبی سے گزرے کہ انہوں نے اپنے آپ کو زریں کردار سے مالا مال کر لیا۔ ان کی بھی توبہ قبول ہوئی۔ مگر منافق کہتے تھے کہ عجب بے وقوف لوگ ہیں ہماری طرح کوئی عذر کر دیتے' خواہ مخواہ اپنے آپ کو وبال میں ڈال لیا ہے' اب بھگتیں۔

اندازہ کیجئے کہ اسلامی ریاست اور اسلامی تحریک کو کیسے کیسے سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور نوع انسانی کو فلاح کا راستہ دکھانے والی ہستی کو پیروان موسیٰ اور ان کی امت کے منافقین کے ہاتھوں کیسی کیسی غدارانہ کارروائیوں سے سابقہ پیش آیا۔

مگر اسلامی ریاست کا پھیلاؤ بڑھتا ہی گیا۔ تحریک حق کی شعاعیں فضا میں پھیلتی ہی چلی گئیں اور محمد ﷺ کا پیغام گونجتا ہی چلا گیا۔ اخلاص پھولا اور پھلا' مگر غداریوں کے جھاڑ جھنکاڑ پھل تو کیا لاتے' ان کی جڑیں ہی کھد گئیں۔

قریش کی ذلیل انتقامی حرکات:

مدینہ کے ابتدائی دور میں ---- جنگ چھڑنے سے قبل --- قبیلہ اوس کے ممتاز سردار سعدؓ بن معاذ عمرہ کرنے کے لیے مکہ معظمہ گئے۔ امیہ بن خلف سے چونکہ ان کے دیرینہ تعلقات تھے' اس لیے اسی کے ہاں قیام کیا۔ وہ امیہ کو لے کر کعبہ کا طواف کرنے لگے۔ اتفاقاً ابوجہل بھی ادھر آنکلا۔ اس نے پکار کر امیہ سے پوچھا "کون ہے تمہارے ساتھ؟" امیہ نے بتایا کہ سعد ہیں۔ ابوجہل نے غضب ناک ہو کر کہا۔ کہ "تم لوگ ان بد مذہب ("صابی") لوگوں کو پناہ دیتے ہو"۔ پھر سعد سے کہا کہ "میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم لوگ کعبہ میں قدم رکھ سکو۔ اگر تم امیہ کی حمایت میں نہ ہوتے تو آج زندہ بچ کر جانہ سکتے" [1]

دیکھئے کہ سیاسی انتقام کا جذبہ قریش کے ایک لیڈر کو یہاں تک لے آیا ہے کہ وہ خدا کے گھر کے دروازے اس کے بندوں پر بند کرتا ہے۔ اور ان کو ایک عبادت سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ گویا کعبہ بھی ان لوگوں کی ایک جاگیر تھی۔ اور حرم کی تولیت کو انہوں نے درحقیقت اپنی سیاسی قوت کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ یوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جن رفقاء کو ہجرت پر مجبور کر دیا گیا تھا' ان کے لیے حرم پاک کے دروازے بند تھے ہی۔ مگر سعدؓ بن معاذ کو یوں صاف صاف لفظوں میں روک کر ابوجہل نے اپنی غلط پوزیشن کو بری طرح الم نشرح کر دیا۔ ادھر سعد بھی کوئی خودی کش درویش تو تھے نہیں۔ ان کے اندر اسلام کی روح حمیت کارفرما تھی اور وہ مدینہ کی سیاسی قوت کے معنی جانتے تھے۔ انہوں نے مختصر لفظوں میں ایسا جواب دیا کہ ابوجہل اور قریش کے سامنے ایک خطرہ عظیم نمودار ہو گیا۔ سعد نے کہا: "اگر تم نے ہم کو حج

---

[1] سیرت النبی از شبلی نعمانی جلد ۱ صفحہ ۲۸۳ بحوالہ مسلم و بخاری۔

سے روکا تو ہم تمہارا مدینہ کا (تجارتی) راستہ روک دیں گے"۔ دوسرے لفظوں میں یہ قریش کی معاشی شاہ رگ کو کاٹ دینے کی دھمکی تھی۔ اس دھمکی نے سارے مکہ کو چونکا دیا۔ بعد میں مدینہ کی پالیسی سعد کے اسی قول کے مطابق تشکیل پائی اور قریش بے بس ہو کر آخری بازی کھیل جانے پر تیار ہو گئے۔

ابو جہل جذباتی ہیجان میں کہنے کو تو یہ کہہ گیا' لیکن اس بے جا دھمکی سے قریش کے اثر کو سخت دھکا لگا۔ قرآن نے ان کی حرم کی اس ٹھیکہ داری کو جس کے بل پر وہ بندگان خدا کو خانہ خدا میں داخلہ سے روک رہے تھے' بھرپور تنقید کا نشانہ بنایا۔ مختلف مواقع پر یہ آیات نازل ہوئیں:

"اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور (اس طریقے سے) ان کی ویرانی کے درپے ہو"۔ (البقرہ۔ ۱۱۴)

---- "لوگ پوچھتے ہیں کہ ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو اس میں لڑنا بہت برا ہے۔ مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے"۔ (البقرہ ۲۱۷)

---- "لیکن اب کیوں نہ وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) ان پر عذاب نازل کرے۔ جب کہ وہ مسجد حرام کا راستہ روک رہے ہیں۔ حالانکہ وہ اس مسجد کے جائز متولی نہیں ہیں"۔ (الانفال۔ ۳۴)

اور قرآن کی یہ بات تمام عرب میں آہستہ آہستہ پھیلتی گئی اور قریش کی مذہبی دھاک کا زور کم ہوتا گیا۔

خود صلح حدیبیہ (ذی القعدہ ۶ھ) کے موقع پر قریش نے اسی "صدعن المسجد الحرام" کا ذرا بڑے پیمانے پر مظاہرہ کیا۔ ایک القائے غیبی کے تحت سرور عالم ﷺ نے فقط عمرہ کے ارادے سے یہ سفر کیا۔ کوئی نفیر جنگ نہیں ہوئی۔ رضا کارانہ طور پر لوگ عمرہ کے لیے نکلے۔ قربانی کے جانور ساتھ لیے گئے۔ اور جنگی ضرورت سے اسلحہ بندی کے بغیر محض معمولی حفاظتی ہتھیاروں کے ساتھ قافلہ روانہ ہوا۔ ذوالحلیفہ کے مقام پر مشہور مقررہ شعار کے مطابق قربانی کے اونٹوں کو نشان زد کیا گیا۔ اور ان کے گلے میں قلادے ڈالے گئے۔ اس سے ایک نظر میں دیکھنے والے کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ یہ اونٹ حرم میں قربانی پیش کرنے کے لیے لے جائے جا رہے ہیں۔ یہ جنگی سواریاں نہیں ہیں۔ راستے ہی میں مخبر ---- بشر بن سفیان الکعبی ---- کے ذریعے اطلاع مل گئی کہ بنی کعب بن لوی جنگی تیاری کر رہے ہیں اور کسی قیمت پر حرم میں نہ جانے دیں گے۔ حدیبیہ پہنچ کر حضور ﷺ نے پیغام بھجوایا کہ ہم لڑنے نہیں آئے۔ عمرہ کرنے آئے ہیں۔ بدیل بن ورقاء خزاعی نے مصالحت کی کوشش کی۔ پھر عروہ بن مسعود نے گفت و شنید کو آگے بڑھایا۔ اس کے بعد بنی کنانہ کا ایک شخص حلیس بات چیت کرنے کے لیے بیچ میں آیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے جب قلادہ والے اونٹوں کا ایک سیلاب وادی میں متحرک دیکھا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اس نے اپنا یہ تاثر قریش سے بیان کیا۔ تو انہوں نے یہ کہہ کر اس کی بڑی حوصلہ شکنی کی کہ تم دیہاتی آدمی ان معاملات کو کیا جانو' حلیس کو اس پر بڑا رنج ہوا۔ اس نے کہا:

"اے قریش! ہمارا تمہارا یہ معاہدہ نہیں۔ نہ اس پر ہم نے حلیفانہ تعلق قائم کیا ہے۔ کیا خدا کے گھر سے ایسے شخص کو روکا جائے گا جو اس کی شان بڑھانے کے لیے آیا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں حلیس کی جان ہے تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو موقع دو کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں، کریں۔ ورنہ ہم اپنے تمام گروہوں کو واپس لے جاتے ہیں"۔

حضورؐ کا سیدھا صاف موقف اس شخص کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ اور اس کی حس تمیز کام کرنے لگ گئی تھی۔ اور اس کا ضمیر قریش کی دھاندلی کے خلاف حرکت میں آگیا۔ آخر اس کی دلداری کرتے ہوئے یہ بات کہہ کر اسے ٹھنڈا کیا گیا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ مناسب شرطیں منوالی جائیں۔ تم ذرا خاموش رہو۔ پھر شرطیں ایسی طے کیں کہ حضورؐ اور آپؐ کے رفقاء کو ۶ ھ کے اس مجوزہ عمرہ سے عملاً روکا اور کچھ اور نہ بن سکا تو اپنی ہٹ پوری کرنے کے لیے اسے ایک برس کے لیے موخر کرا دیا۔ [1]

قرآن نے اس موقع پر بھی کعبہ کے اجارہ داروں کی پستی کردار کو یہ کہہ کر نمایاں کیا:

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے (دین حق سے) انکار کی راہ اختیار کی۔ اور تم کو مسجد حرام سے روکا، اور اس میں رکاوٹ ڈالی کہ قربانی کے جانور اپنے حلال ہونے کے مقام تک پہنچ سکیں"۔ (فتح --- ۲۵)

شعائر دینی ---- جو ابراہیم علیہ السلام کے دور سے متفق علیہ چلے آرہے تھے ---- میں قریش کی اس رخنہ اندازی نے ان کا موقف بری طرح کمزور کیا۔ اور انہوں نے اپنی حماقت سے اپنے حق میں ایک مخالفانہ چرچا سارے عرب میں پیدا کر دیا۔ یہ بات عام لوگوں پر کھل گئی کہ قریش خدا ترسی، مذہب و تقویٰ اور شرافت کے جوہر سے خالی ہو کر سراسر ضد م ضدا پر اتر آئے ہیں۔

قریش کے جذبہ انتقام کا کمینگی کی حد تک جا پہنچنا شاید اس سے بڑھ کر کسی اور واقعہ سے واضح نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے دل ٹھنڈے کرنے کے لیے حضورؐ کی صاحبزادیوں کو ان کے شوہروں سے طلاقیں دلوائیں۔ یہ بڑے ہی زہریلے ڈنک تھے جو ٹھیک محسن انسانیتؐ کے کلیجے پر لگائے گئے تھے۔

حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثوم (رضی اللہ عنہما) ابو لہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ دستور کے موافق انتہائی قرابت دار گھر میں ان کا یہ تعلق پہلے سے قائم تھا۔ ابولہب کی آتشیں شخصیت اتنی عالی مرتبہ کبھی تھی ہی نہیں کہ وہ اصولی نزاع کو ذاتی اور نجی تعلقات سے الگ رکھ سکتا۔ اور قرابت داری کے حقوق کو اختلاف کی لپیٹ میں نہ آنے دیتا۔ وہ اپنے بغض میں ہمیشہ تند اور اپنے کرتوتوں کے لحاظ سے ہمیشہ پست رہا تھا۔ اس کی ذلیل حرکتوں کی بنا پر جب سورہ لہب نازل ہوئی اور آسمانوں سے

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۸۔ ۱۹۴، سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۶۴۔ ۳۵۵، اصح السیر مولانا عبدالرؤف دانا پوری ص ۱۸۔ ۲۱۰

صدا دی گئی کہ ابو لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے۔ یعنی وہ ساری مخالفانہ حرکات سے کام لینے کے باوجود تحریک اسلامی کا بال بیکا نہیں کر سکتا اور سچائی کی طاقت اس کے ہاتھوں کو توڑتی ہوئی آگے بڑھ جانے والی ہے تو وہ بھنا گیا۔ اس نے اپنے بیٹوں پر دباؤ ڈالا کہ اب تمہارے لیے یہ بات قطعاً حرام ہے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کی بیٹیوں کو اپنے گھروں میں رکھو۔ اور ان کو طلاق نہ دے دو۔ حضرت رقیہؓ اپنے گھر میں بس رس رہی تھیں۔ عتبہ نے باپ کے اشارے پر طلاق دے دی اور بعد میں حضرت عثمانؓ سے ان کا ازدواج ہوا۔ ابو لہب کو بھڑکانے اور اس کے بیٹوں کو اس حرکت پر آمادہ کرنے کے لیے قریش کے دوسرے سرداروں نے بھی خاصا کام کیا۔ انہوں نے باہم دگر اس امر پر غور کیا کہ محمد (ﷺ) کو پریشان کرنے کا سلسلہ کچھ رک سا گیا ہے۔ سو کوئی نیا نشتر تیز کرنا چاہیے۔ جس سے کچھ اور ناسور ڈالے جا سکیں۔ کیوں نہ اس کی صاحبزادیوں کو اپنے شوہروں سے طلاق دلوائی جائے۔ تاکہ ایک نئی مصیبت اس شخص کے لیے پیدا ہو جائے۔ اس مشورے کے تحت انہوں نے عتبہ بن ابی لہب کو پیش کش کی کہ قریش کی جس عورت کو چاہو گے فراہم کر دی جائے گی۔ بس شرط یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کی بیٹی کو اپنے سے الگ کر دو۔ سو اس ظالم نے یہ اقدام کر ڈالا۔ عتیبہ نے ذرا زیادہ تندی دکھائی۔ اور حضرت ام کلثوم کو طلاق دے کر دندناتا ہوا سرور عالم (ﷺ) کے پاس پہنچا۔ ڈھٹائی سے کہنے لگا کہ "میں نے تیرے دین سے کفر کیا۔ اور تیری بیٹی کو طلاق دی۔ نہ تجھے مجھ سے محبت ہے اور نہ میں تجھے پسند کرتا ہوں"۔ نہایت گستاخانہ انداز سے دراز دستی کی اور حضورؐ کا کرتہ نوچا۔ ایک قرابت دار نوجوان کا اپنے کینہ توز باپ کی شہ پر ایک طرف ایک شریف زادی کو طلاق دے کر ظلم کرنا اور دوسری طرف یوں غنڈوں کی طرح پیش آنا اتنا تکلیف دہ واقعہ تھا کہ بے اختیار حضورؐ کی زبان سے یہ بد دعا نکلی کہ: "اے اللہ! اپنے درندوں میں سے کسی درندے کو اس پر مسلط کر"۔ ابو طالب نے سنا تو عتیبہ سے کہہ دیا کہ اب تمہیں میرے بھتیجے کی اس بددعا سے کوئی تدبیر بچا نہ سکے گی۔ چنانچہ شام میں ایک جگہ وہ تجارتی قافلے کے ساتھ شب باش ہوا۔ اور رات کو ایک شیر نے سارے قافلے میں سے چھانٹ کر اسی کا سر چبا لیا۔ [1]

حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد حضورؐ نے اپنی ان دوسری صاحبزادی ام کلثومؓ کا نکاح بھی حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ اس لیے آنجناب ذوالنورین کہلائے۔

فتنہ گران قریش نے جس طرح عتبہ بن ابی لہب پر دباؤ ڈالا تھا' ٹھیک اسی طرح انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت ابو العاص پر بھی زور دیا اور ان کو بھی وہی پیش کش کی کہ تم اگر بنت محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کو طلاق دے دو' تو جس بہترین عورت پر نظر ڈالو گے تمہارے نکاح میں دے دی جائے گی۔ ابو العاص میں شرافت کا جوہر تاباں موجود تھا' انہوں نے کہا کہ خدا خدا کرو' ایسا ہرگز نہیں ہو

---

[1] المواہب اللدنیہ جلد ۱ ص ۱۹۷

سکتا کہ میں اپنی اہلیہ کو جدا کر دوں۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ زینبؓ کے بدلے میں قریش کی کوئی اور عورت میرے گھر میں ہو۔ بعد میں حضورؐ ابوالعاص کی اس مضبوطی کردار کی تعریف فرماتے تھے۔ اور اس کے اس شریفانہ رویہ کا جواب انہوں نے دو موقعوں پر بہت بڑے احسانات کی صورت میں دیا۔ ایک اس وقت جب وہ اسیران بدر میں آئے تھے اور فدیہ میں حضرت زینبؓ کا بھیجا ہوا ہار واپس کرایا۔ اور دوسری بار جب کہ ان کا تجارتی مال' مال غنیمت کے طور پر مسلمانوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اور حضورؐ کے اشارے سے وہ جوں کا توں ان کو لوٹا دیا گیا۔ ❶

جنگ بدر کے بعد جب ابوالعاص کو حضورؐ نے بطور احسان خاص کے رہائی دلوائی تو باتوں باتوں میں ان سے وعدہ لیا کہ وہ حضرت زینبؓ کو مدینہ آنے کا موقع دیں گے۔ یہ بات عام لوگوں سے مخفی رہی۔ چنانچہ حضرت زینبؓ کی روانگی کے مقررہ وقت پر دو صحابیوں حضرت زید بن حارثہ اور ایک انصاری کو بھیجا کہ تم یاجج (ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے ۸ میل کی دوری پر تھی) کے بیچ میں ٹھہرنا اور جب زینبؓ آجائیں تو ان کو ساتھ لے آنا۔ ادھر ابوالعاص نے حضرت زینبؓ کو تیار کیا اور انہوں نے سامان وغیرہ درست کر لیا۔ ان کا دیور کنانہ بن ربیع علی الصباح ان کو ہودج میں بٹھلا کر نکلا۔ قریش کو خبر ہوئی تو ان خبیثوں نے یوں سوچا کہ محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کی بیٹی یوں صحیح سلامت ہمارے درمیان سے چلی جائے' تو حیف ہے۔ کچھ لوگ تعاقب کو نکلے اور ذی طوی میں ان کو جالیا۔ ہبار بن اسود نے بھیر کر ہودج پر تیر چلایا۔ حضرت زینبؓ اس وقت امید سے تھیں' تیر لگنے سے وہ سنگین حادثہ سے دو چار ہو گئیں اور جنین کا اسقاط ہو گیا۔ پھر جب ان کے دیور نے تیر کمان درست کر کے ان کو للکارا' تو مکہ کے یہ خستہ مزاج بہادر پیچھے ہٹ گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں ابو سفیان بھی آ پہنچا۔ اس نے دور ہی سے حملہ آوروں کو پکار کر کہا کہ میری بات سن لو۔ اس نے کنانہ بن ربیع کو ٹوکا کہ آخر یہ تم نے کیا کیا کہ علی الاعلان اس بی بی کو لے نکلے۔ حالانکہ تم دشمنی کی اس فضا کو جانتے ہو جو محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کی وجہ سے ہمارے سر پر محیط ہے۔ یوں دن دہاڑے اس طرح کے اقدام میں مکہ کے لوگ ذلت محسوس کرتے ہیں۔ مجھے اپنی جان کی قسم' ہمیں محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کی بیٹی کو روکنے سے کچھ غرض نہیں۔ اس وقت اسے واپس لے چلو۔ کسی وقت چپکے سے لے جانا۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مکہ والے حضورؐ کو اذیت پہنچانے کے لیے کن آخری حدود خباثت کو چھو رہے تھے۔ ان کے دلوں میں قرابت کا کوئی لحاظ نہیں رہا تھا۔ ان کو ایک عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ان کے حلقوں میں ظلم کو ظلم سمجھنے کا مادہ ہی ختم ہو چکا تھا۔ اور ان کی نگاہوں میں انسانیت کی کوئی قدر اور ہم جنسوں کے کوئی حقوق باقی نہیں رہے تھے.........................

---

❶ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۹۶

❶

اب ایک اور واقعہ لیجئے جو سرتا سر خونخوارانہ ذہنیت کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتا ہے۔ حضورؐ نے ملحقہ علاقوں میں تعلیمی وفود بھیجنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کے تحت غزوہ احد کے متصلاً بعد (ماہ صفر میں) عضل و قارہ (بنوہذیل) کے لوگوں کی خواہش پر ..... جس کے پیچھے سازش کام کر رہی تھی ---- چھ آدمیوں کا ایک وفد روانہ کیا جس میں سے چار کو بمقام رجیع (چشمہ زار) شہید کر دیا گیا اور حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ بن وثنہ کو قیدی بنا کر مکہ لے جایا گیا❷ وہاں بنو ہذیل کے دو قیدی قریش کے پاس تھے۔ جنہیں تبادلہ کر کے انہوں نے چھڑایا۔ حجر بن اہاب تمیمی نے حضرت خبیبؓ کو عقبہ بن حارث بن عامر کے لیے لیا۔ تاکہ ان سے حارث کا بدلہ لے۔ جسے حضرت خبیبؓ نے میدان بدر میں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ زیدؓ بن وثنہ کو صفوان بن امیہ نے اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلے میں قتل کرنے کے لیے خریدا۔

یہ اپنی شجاعت کے گن گانے والے میدان جنگ میں قلیل التعداد اور بے سروسامان مسلمانوں سے پٹنے کے بعد اب دو بے بس قیدیوں کی جان لے کر آتش کینہ کو بجھانا چاہتے تھے۔ اسلامی معاشرہ کی دو قیمتی ہستیوں کو اگرچہ شہادت کا پیالہ پلا دیا گیا۔ لیکن اس موقع پر دونوں کے کرداروں کا ایسا واضح تقابل ہو گیا کہ اس کے اثرات وقت کی تاریخ کی رگوں میں پھیل گئے۔

صفوان نے زید بن وثنہ کو اپنے غلام نسطاس کے سپرد کیا کہ وہ حرم کے باہر تنعیم میں جا کر ان کا کام تمام کر دے۔ اس دلچسپ ڈرامے سے خوش وقت ہونے کے لیے قریش کا ایک مجمع موقع پر موجود تھا۔ اور ان میں ابوسفیان بہ نفس نفیس شریک تھا۔ ابوسفیان نے قریب ہو کر زیدؓ سے پوچھا کہ کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے۔ اور تم اپنے بال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہو سہو اور تمہارے بجائے ہم محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کا خاتمہ کر دیں۔ زیدؓ جس کے سامنے موت کھڑی مسکرا رہی تھی' ایمان کی کن بلندیوں سے جواب دیتا ہے کہ:۔

"واللہ! ہم لوگوں کو اتنی سی بات کے عوض بھی آزاد ہو کر اپنے اہل و عیال میں جا رہنا پسند نہیں کہ اس وقت محمد ﷺ جہاں ہیں' وہاں بھی ان کو ایک کانٹا تک چبھے"۔

ابوسفیان یہ جواب سن کر دنگ رہ گیا اور پکار اٹھا کہ میں نے کسی کو کسی کا ایسا محب نہیں پایا جیسا کہ محمد (ﷺ) کو اس کے رفیق محبوب رکھتے ہیں۔ پھر اس مجسمۂ صدق و صفا کو تلوار کا لقمہ بنا دیا گیا۔ کون جانتا ہے کہ زیدؓ کے اس کردار نے کتنے دلوں میں جگہ بنائی ہو گی۔ اور کتنی روحیں قریش کی اس ظالمانہ اور کمینہ

---

❶ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۹۹-۱۲۹۲ اصح السیر مولانا عبدالرؤف دانا پوری ص ۱۳۰-۱۳۹

❷ واقعہ رجیع کے دوسرے پہلو تفصیل سے ہم بعد کی ایک فصل میں دے رہے ہیں۔ اسی طرح ترسیل وفود کا تذکرہ بھی دوسری جگہ آئے گا۔

کارروائی پر ماتم کر رہی ہوں گی [1]

حضرت خبیبؓ بعد تک قید میں رہے۔ قید میں رہ کر انہوں نے اپنے ایمان و اخلاق کی جو جھلک متواتر دکھائی اس کا ایک واضح نتیجہ تو یہ ہوا کہ حجر بن اہاب کی لونڈی ماویہ بعد میں اسلامی تحریک میں جذب ہو گئی۔ اور اسی کے ذریعے حضرت خبیبؓ کی روداد اسیری سامنے آئی۔ ماویہ کا بیان ہے کہ ان کے قتل کا مقررہ وقت جب قریب آ لگا تو انہوں نے صفائی کے لیے استرہ منگوایا جو بھجوا دیا گیا۔ مگر بعد میں یہ دیکھ کر زمین میرے پیروں تلے سے نکل گئی کہ استرہ ان کے ہاتھ میں ہے اور چھوٹا بچہ خبیبؓ کی گود میں بیٹھا ہے۔ جس قیدی کو اس ظالمانہ طریق سے زندگی سے محروم کیا جا رہا ہو اس کے قابو میں دشمن کا ایک بچہ آ جائے۔ اور ہتھیار بھی اس کے ہاتھوں میں ہو تو جو اندیشے ہو سکتے ہیں ظاہر ہیں۔ میرے اضطراب کو خبیبؓ نے بھانپ لیا اور اطمینان دلایا کہ میں کسی حال میں اس معصوم کی جان نہیں لینے کا۔ انہوں نے فوراً لڑکے کو الگ کر دیا۔ یہ بلندی کردار کیا ایک مشعل کی طرح مکہ کی تیرہ و تار فضاؤں میں جگمگا نہ اٹھی ہو گی؟

پھر ان کو صلیب پر چڑھانے کے لیے تنعیم لے جایا گیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اجازت لے کر آخری نفلی نماز بہ اطمینان پڑھی اور شہادت گاہ الفت میں قدم رکھنے والوں کے لیے ایک مبارک سنت قائم کر دی۔ پھر جلد ہی فارغ ہو کر کہا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں موت کے ڈر سے نماز میں تاخیر کر رہا ہوں۔ یہ مختصر سی دعا مانگی۔

> "اے اللہ! ہم نے تیرے رسولؐ کے پیغام کو پہنچا دیا۔ تو کل صبح اس ہستی کو اس سے آگاہ فرما دے جو کچھ کہ ہمارے ساتھ ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔
>
> اے اللہ ان (دشمنوں) کی تعداد کو کم کر۔ ان کو تفرقہ میں ڈال کر ہلاک کر اور ایسے خونخواروں میں سے کسی کو جیتا نہ چھوڑ"۔

اور صلیب پر لٹکا دیئے گئے اور آخر میں ابو مغیرہ نے حربہ مار کر ان کا رشتہ حیات منقطع کر دیا۔ عین اسی آخری لمحے ان کی زبان پر کچھ اشعار آئے جس میں سے مشہور ترین یہ ہے:

ولست ابالی ۔ حین اقتل مسلمًا
علی ای شق کان فی اللہ مضجعی

میں جب اسلام سے مالا مال ہو کر قتل کیا جا رہا ہوں تو پھر مجھے اس بات کی کچھ فکر نہیں ہے کہ خدا کی راہ میں مجھے کس کروٹ گرنا نصیب ہو رہا ہے۔ [2]

---

1. سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۱۹۴ اصح السیر۔ از مولانا عبدالرؤف دانا پوری ص ۱۔۱۹۰
2. سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۔۶۔۱۹۵۔ اصح السیر ص ۱۹۱

ان دو جانوں کو لے کر قریش نے بزعم خویش یہ سمجھا ہو گا کہ ہم نے تحریک اسلامی کی قوت گھٹا دی۔ لیکن ان کو اندازہ نہیں تھا کہ ان مظلوموں کے خون شہادت کے قطرے دلوں کی کھیتیوں میں ایسے بیج بن کر پڑے ہوں گے کہ آگے چل کر ان سے اسلام کی نئی فصلیں لہلہا اٹھنی تھیں۔

انہی گھٹیا انتقامی حرکات کے ساتھ ہم قریش کی اس سیاسی خیانت کو بھی پیش کرتے ہیں جن کا مظاہرہ انہوں نے معاہدہ حدیبیہ کو توڑ کر کیا۔ اس عظیم تاریخی معاہدہ کے تحت طے پایا تھا کہ عربی قبائل میں سے جس کا جی چاہے' وہ قریش کے ساتھ معاہدانہ تعلق قائم کرے اور جس کو پسند ہو وہ اسلامی ریاست کے ساتھ حلیفانہ رشتہ استوار کر لے۔ قبائل کو پوری آزادی ہو گی اور کسی طرف سے ان پر جبر نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ وہیں موقع پر بنو بکر نے قریش سے اور بنو خزاعہ نے حضور صلی اللہ علیہ و سلم سے معاہدانہ تعلق جوڑ لیا۔

دور اسلامی سے قبل ان دونوں قبیلوں کے درمیان ایک قتل کے سلسلہ میں انتقام در انتقام کا منحوس چکر چل رہا تھا۔ اور ان کے مابین متعدد واقعات قتل ہو چکے تھے۔ بنو بکر اپنی باری پر بدلہ لینے کے لیے تل ہی رہے تھے کہ اسلامی تحریک نے تاریخ میں شدید مد و جزر پیدا کر کے جاہلی عرب کے تمام قبائل کی توجہ ادھر کھینچ لی اور وہ باہمی معاملات کو در کنار رکھ کر اس نئے پیغام کی مخالفت میں صف بستہ ہو گئے۔ تحریک اسلامی کے عناد نے جو سطحی سا اتحاد ان میں پیدا کر دیا تھا۔ اس کا زور معاہدہ حدیبیہ کے بعد ٹھنڈا پڑنے لگا۔ اب ان لوگوں کو اپنے پرانے جھگڑے یاد آئے۔ بنو بکر کی ایک شاخ بنو دیل تھے۔ بنو دیل کے ایک شخص اسود بن رزن کے مقتول لڑکوں کا بدلہ لینے کے لیے بنو دیل کے سردار نوفل بن معاویہ نے قبیلہ کے لوگوں کو ساتھ لیا۔ اور ایام ہدنہ (یعنی مصالحت) کے وقفے کو غنیمت جان کر بنو خزاعہ پر حملہ کیا۔ اور آغاز شرارت کے طور پر چشمہ الوتیر کے پاس ایک خزاعی کے خون سے ہاتھ رنگے۔ بقیہ خزاعی اس نادیدہ عہد شکنی کی وجہ سے سراسیمہ ہو کر بھاگے۔ اور انہیں حملہ آوروں نے تعاقب کر کے قتل کیا۔

قریش نے معاہدہ حدیبیہ کی ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھ کر بنو بکر کو ہتھیار بھی فراہم کئے' اور رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر خزاعیوں سے لڑے۔ بنی خزاعہ نے حرم میں جا کر پناہ لی' اور بنو بکر کے سردار کو پکار کر کہا' کہ "اے نوفل! دیکھو' اب ہم حرم میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب باز آجاؤ ---- خدا کے لیے! خدا کے لیے!!" مگر وہ فتح کے نشے میں بہک رہا تھا۔ اس نے کہا "آج کوئی خدا نہیں۔ اے بنو بکر! اپنا پورا پورا بدلہ لو! کیا حرم کے احترام میں اپنی عزتوں کا انتقام لینا فراموش کر دو گے"۔ چنانچہ ان ظالموں نے حرم میں خونریزی کی اور کچھ خزاعی بمشکل جانیں بچا کر بدیل بن ورقاء اور اس کے غلام رافع کے مکان میں جا چھپے۔

قریش نے قبائلی رقابتوں کے تحت جذباتی ہیجان میں آکر یہ ایسی بڑی حماقت کی کہ جس کا خمیازہ انہیں نقد انقد بھگتنا پڑا۔ یہی واقعہ فتح مکہ کا محرک ہوا۔ قریش نے قطعاً نہ سوچا کہ تحریک اسلامی کی لحہ بہ لحہ آگے بڑھتی ہوئی طاقتور رو کے مقابلے میں ان کی قوت اخلاقی اور سیاسی دونوں لحاظ سے حد درجہ گر چکی ہے۔ اور

ان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔ اس واقعہ کی وجہ سے عرب کے قبائلی معاشرہ میں قریش کی بد عہدی کا خوب چرچا ہوا ہو گا۔ اور ان کی ساکھ حد درجہ گری ہو گی۔ پھر بنو بکر کی انتہائی ظالمانہ روش اور بنو خزاعہ کی حد درجہ شان مظلومی نے تمام قبائل کو چوکنا کر دیا ہو گا کہ قریش کی قیادت امن اور انصاف بہم نہیں پہنچا سکتی۔ پھر اس واقعہ میں خدا کے نام کے تقدس اور حرم کی حرمت کو صدیوں کی روایات کے بخلاف جس بری طرح سے پامال کیا گیا تھا' اس نے عوام کے دلوں میں جذباتی ہل چل برپا کر دی ہو گی۔ اس ہنگامے سے قریش نے اپنا وزن ظالم عنصر کے پلڑے میں ڈال کر اپنے آپ کو ذلیل کر لیا۔ علاوہ ازیں قریش نے سوچا تو یہ ہو گا کہ ہم اسلامی ریاست کے ایک حلیف کو کچل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی آتش کینہ کو ٹھنڈا کر رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ نہ سوچا کہ ہم جاہلی نظام کی پشت پناہی کرنے والے بچے کھچے قبائل کا شیرازہ اپنے ہاتھوں سے درہم برہم کر رہے ہیں۔ اور بعض ہمسایہ قبائل کو خود ہی دھکیل کر مدینہ کے حوالے کر رہے ہیں۔

دراصل ہر بوسیدہ نظام اور ہر فرسودہ قیادت ---- جو اعلیٰ اصول و مقاصد اور اخلاقی معیارات اور تعمیری نقشہ تمدن سے محروم ہو کر محض اس منفی مقصد کو اپنا لے کہ وقت کے افق سے ابھرنے والی ہر اصلاح اور تعمیر کیش قوت کو کچلنا ہے ---- اس کی تقدیر یہی ہے کہ اس کی عقل اسے حماقتوں کی راہ پر لے جاتی ہے۔ اس کا زور اسے ضعف کے گڑھے میں گراتا ہے۔ اس کا احساس برتری اسے ذلیل کرتا ہے اور اس کی پیش قدمی اس کی پسپائی کا موجب بنتی ہے۔

عمرو بن سالم خزاعی مدینہ روانہ ہو گئے اور سرور عالم کے حضور میں جا کر بنو بکر اور قریش کے مظالم کا دکھڑا سنایا۔ حضورؐ مسجد میں سر مجلس تشریف رکھتے تھے۔ عمرو بن سالم نے عربی روایت کے مطابق اپنی داستان درد کو دل شگاف اشعار میں بیان کیا۔

لَاھُمَّ (1) اِنِّی نَاشِدٌ مُحَمَّدَا
حِلْفَ اَبِینَا وَ ابِیهِ الْاَتْلَدَا
فَانْصُرْ هَدَاكَ اللّٰهُ نَصْراً اَعْتَدَا
وَادْعُ عِبَادَ اللّٰهِ یَاْتُوا مَدَدَا
فِیْ فَیْلَقٍ کَالْبَحْرِ یَجْرِی مُزْبِدَا
اِنَّ قُرَیْشًا اَخْلَفُوْكَ الْمَوْعِدَا
هُمْ بَیَّتُونَا بِالْوَتِیْرِ هُجَّدَا
وَقَتَلُوْنَا رُكَّعًا وَسُجَّدَا"

---

(1) لاھم کے بجائے یا رب بھی روایت کیا گیا ہے۔ مثلا ابن ہشام کے یہاں۔

اے اللہ ! ---- میں محمدؐ کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا' جو ہمارے اور ان کے قدیمی گھرانوں کے درمیان ہوا ہے اے پیغمبرؐ! ہماری مدد کیجئے اور خدا کے بندوں کو پکاریئے' تاکہ وہ مدد کے لیے آپؐ کے گرد مجتمع ہوں۔ ایک ایسے لشکر جرار کے درمیان اٹھئے جو سمندر کی طرح موجزن ہو کر جھاگ اٹھا رہا ہو۔ کیونکہ قریش نے آپؐ کا معاہدہ توڑ ڈالا ہے۔ انھوں نے ہمیں رات کی تاریکی میں وتیر کے پاس آلیا۔ سوتے میں ہم پر حملہ کیا ہے اور پھر ہمارے لوگوں کو رکوع و سجود کرنے کی حالت میں گھائل کیا"۔

جواب ملا: "نصرت یا عمرو بن سالم"۔ تمہاری امداد کی جائے گی۔

اب قریش کی آنکھیں کھلیں کہ ہم نے کیسی ہلاکت انگیز حرکت کر ڈالی۔ اور ابو سفیان دوڑا دوڑا مدینہ پہنچا کہ تجدید عہد کرائے۔ مگر وہاں کی فضا کا عالم یہ تھا کہ ابو سفیان اپنی بیٹی کے گھر جا کر جب بستر پر بیٹھنے لگا تو بیٹی نے بستر لپیٹ کر اٹھا لیا۔ اور کہا کہ "یہ رسولؐ خدا کا بستر ہے اور تم ایک ناپاک مشرک ہوتے ہوئے اس پر نہیں بیٹھ سکتے" ---- ابو سفیان نامراد لوٹا اور چند ہی دن بعد یکایک مکہ نے دیکھا کہ ایک عظیم لشکر اس کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ [1]

ان واقعات سے یہ واضح ہے کہ اس تاریخی کشمکش میں جاہلی قیادت کی منفی قوت کو اس کا ہر اقدام' اس کی ہر شرارت' اس کی ہر انتقامی حرکت اور اس کی ہر مزاحمانہ کارروائی اس کا موقف کمزور کرتی چلی گئی اور دوسری طرف مثبت' اصولی اور تعمیری طاقت آہستہ آہستہ زور پکڑتی اور آگے بڑھتی چلی گئی۔

ان حرکتوں کے مقابلے میں آپ ذرا محسنؐ انسانیت کے طرز عمل کو دیکھئے کہ فریقین کے درمیان حالت جنگ چل رہی ہے۔ اور رئیس یمامہ اسلام قبول کر کے مستقل طور پر مکہ کو جانے والی غلہ کی رسد کو بند کر دیتا ہے۔ عین اسی زمانے میں مکہ کے لوگ قحط سے دو چار تھے۔ حضورؐ نے مکہ کے غریب طبقوں کا خیال کرتے ہوئے یمامہ سے از خود کہہ کر رسد جاری کرائی اور پھر اپنے پاس سے فقراء مکہ کے لیے پانچ سو اشرفیاں روانہ کیں۔ ایک اسی احسان نے مکہ کے عوام کے دلوں کو کس قدر موہ لیا ہو گا۔ ایک روایت میں تو یہ آتا ہے کہ مکہ والوں نے خود حضورؐ کو لکھا کہ آپؐ تو صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں' لیکن آپ نے ہمارے ساتھ یہ رشتہ توڑ لیا"۔ یہ فقرہ بھی مذکور ہے کہ قتلت الاباء بالسیف والابناء بالجوع۔ "باپوں کو تلواروں سے ختم کر دیا اور ان کی اولادوں کو بھوکوں مار رہے ہو"۔ [2]

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۴ ص ۱۳-۳۰' اصح السیر۔ مولانا عبدالرؤف دانا پوری ص ۹۰-۲۸۸ سیرت النبیؐ شبلی نعمانی جلد ۱ ص ۷-۵۰۶

[2] سیرت ابن ہشام جلد ۴ ص ۳۱۰۔ اصح السیر' مولانا عبدالرؤف ص ۱۹۹۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی' ڈاکٹر حمید اللہ ص

باب: ۵

محسنِ انسانیت ﷺ

تلواروں کی چھاؤں میں

أَنَا نَبِيُّ الرَّحْمَةِ
أَنَا نَبِيُّ الْمَلْحَمَةِ

میں رحمت کا پیغامبر ہوں
میں معرکوں کا پیغامبر ہوں

محسنِ انسانیت

تلواروں کی چھاؤں میں

دعوت حق کا قافلہ وادی سینا سے چلے یا فاران کے دامن سے' اس کی راہ تلواروں کی چھاؤں میں سے ہو کر گزرتی ہے۔

اسلام کی انقلابی تحریک دلیل کے زور سے دلوں کی دنیا فتح کر رہی تھی' وہ قبائلی انتشار کے مقابلے پر ایک نظام اخوت کو نشوونما دے رہی تھی' وہ غیر منظم انبوہوں کو تنظیم کے راستے پر ڈال رہی تھی' وہ لاقانونی اور نراج کی جگہ ایک جمہوری دستوری ریاست اور قانون و عدالت کے ادارے تشکیل دے رہی تھی۔ وہ سوئی ہوئی علمی قوتوں میں تحریک پیدا کر رہی تھی' جہالت کی تاریکیوں میں علم کی مشعلیں روشن کرتی جا رہی تھی' وہ خدا پرستی کی مردہ اور گم شدہ روح کا احیا کر رہی تھی۔ وہ اخلاقی قدروں کے بجھے ہوئے دیوں کو جگمگا رہی تھی۔ وہ قدیم جاہلی نظم سے اکتائی ہوئی دنیا کو اور معاشی و معاشرتی حیثیت سے پسے ہوئے طبقوں کو سماجی انصاف کی جنت کا راستہ دکھا رہی تھی اور اس کی گود میں انسانیت کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تشکیل پا رہا تھا۔

مقابلے پر وہ جاہلیت تھی جس کے پاس کوئی حرکت انگیز نظریہ نہ تھا۔ جو انتشار اور نراج کا تحفظ کر رہی تھی' جو نفس پرستانہ معاشرہ چلا رہی تھی۔ جس نے مذہب کو ایک ڈھکوسلہ بنا دیا تھا اور اس کی بنا پر مقدس کاروبار چل رہے تھے۔ رہی سہی قدیمی اخلاقی اقدار بھی اس کے ہاتھوں تباہ ہو رہی تھیں غرضیکہ وہ آزادی' امن' انصاف اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ اپنی اسی کمزوری کی وجہ سے وہ پسپا ہوتے ہوتے زچ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے دلائل کے ترکش خالی ہو چکے تھے' اس کے تشدد کے ہتھیار کند ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی سازشیں ناکام ہو رہی تھیں' اس کا انسان ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا تھا۔

جاہلیت کے قائدین اعلیٰ نے اپنی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے رفقاء کو مکہ سے نکال کر بڑا کاری وار کیا تھا۔ لیکن بہت جلد انہیں اندازہ ہو گیا کہ بیعت عقبہ کے ذریعے حضورؐ کو انصار کا تعاون حاصل ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اب مدینہ تحریک اسلامی کا ایک مضبوط مرکز بنے' وہاں ایک نظام حکومت نمودار ہو اور پھر مسلم معاشرہ ایک ایسی قوت بن کر سامنے آئے کہ جس کا راستہ روکنا ہرگز ممکن نہ رہے۔

پھر حضورؐ نے مدینہ پہنچ کر مدینہ کے یہودیوں اور دوسرے قبائل سے سیاسی معاہدات استوار کر لیے تو قریش کے لیے خطرہ واضح تر ہو گیا۔ اس کے بعد فوراً ہی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دفاعی قوت کی

تنظیم کا آغاز کیا اور ریاست مدینہ کی سرحدات کی نگرانی اور ملحقہ علاقوں میں دشمن کی نقل و حرکت کی دیکھ بھال کے لیے طلایہ گردی کے طور پر مہمات بھیجنا شروع کیں تو قریش کے سامنے بہت سارے نئے خوف ناک امکانات آگئے۔ ان کی شام کو جانے والی تجارتی شاہراہ مدینہ کے قریب سے ہو کر گزرتی تھی۔ اور اب سارے تجارتی نظام کے تباہ ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ بلکہ سعد بن معاذ کو جب حرم میں عمرہ کرنے سے ابوجہل نے روکا تو انہوں نے صاف صاف انتباہ دیا کہ ایسا کرو گے تو تمہاری تجارتی شاہ رگ کاٹ دی جائے گی۔ حضورؐ اور ان کے ساتھی جو پہلے بالکل ان کے پنجے میں جکڑے ہوئے تھے اب ان کی گرفت سے آزاد تھے۔ پہلے صرف داعی تھے' اور اب وہ اقتدار سے بھی بہرہ مند تھے۔ پہلے مظلوم تھے اور ہر ظلم پر صبر کرنا ان کا شیوہ تھا۔ مگر اب وہ ظلم کا توڑ کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ قریش سچائی کی دعوت کی مخالفت کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے اب جس مقام تک آچکے تھے اس سے اگلا قدم لازمی طور پر معرکہ کار زار گرم ہونا ہی ہو سکتا تھا۔ تحریک اسلامی کے نقیبوں کو بدترین مظالم کا نشانہ بنانے اور حضورؐ کے قتل کے منصوبے باندھنے کے بعد لازماً ان کے اندر ایک قاتلانہ اور خونخوارانہ ذہنیت پک چکی تھی۔ ادھر حضورؐ نے دور نو کی تعمیر کے لیے جو تھوڑی سی پونجی مدینہ میں جمع کی تھی اور جس کے بل پر نئی ریاست کا سنگ اساس رکھا جا چکا تھا اس کے تاراج ہو جانے کے معنی سارے کیے کرائے کام کے خاتمے کے تھے' کجا کہ نظام حق پوری طرح برگ و بار لائے۔ اس کی نشوونما اور حفاظت کے معاملے میں رفتار وقت کا لحاظ بڑا ضروری تھا۔ اگر ہر خطرے کو وقت پر محسوس نہ کیا جائے اور وقت پر اس کے انسداد کی تدبیریں نہ کی جائیں تو کسی قیادت کی اس سے بڑی کوتاہی کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جو اقدام جس بہترین وقت پر ---- بلکہ بہترین اول وقت پر ---- ہونا چاہیے' ٹھیک اسی وقت پر ہو۔ ورنہ برق رفتار زمانہ کبھی بھی رک تھم کر کسی کی راہ نہیں دیکھا کرتا۔ ہر دعوت و تحریک کو اپنا ہی آپ نہیں دیکھنا ہوتا۔ بلکہ اپنے آپ کو حریف طاقتوں کے مقابل پر رکھ کر دیکھنا ہوتا ہے کہ کب کون کتنی آگے اور کون کتنی پیچھے جا رہی ہے۔ رسول اکرمؐ اور آپؐ کے ذہین رفقا کو خوب معلوم تھا کہ ہجرت کی فصل سے آگے کا باب لازماً جہاد کا باب ہے اور بقا کی راہ قریش کی تلواروں کے درمیان سے ہو کر نکل رہی ہے۔ اس لیے مہاجرین کی بحالی اور مدینہ کے نئے توازن قوت کے قائم ہوتے ہی حضورؐ نے ایک ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے دفاعی انتظامات کی طرف پوری توجہ صرف کی۔

اسلامی نظریہ جہاد:

یہاں ہم اس اصولی حقیقت کو اجمالاً بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جہاد کسی بھی ریاست کا ویسا ہی طبعی وظیفہ ہے جیسا کہ انسداد جرائم کے لیے پولیس اور عدالت کا انتظام اس کا فطری عمل ہے۔ لیکن ایک نوخیز ریاست' ایک نو تشکیل یافتہ معاشرہ اور اپنے زمانہ کی ابتدا کرنے والا ایک نظام تو قطعی طور پر مجبور ہوتا

ہے کہ وہ عین اپنی بقا اور نشوونما کے لیے ایک سنگین دور جہاد گزارے۔ خصوصیت سے جب کوئی جدید ہیئت اجتماعیہ کسی انقلابی نظریے پر اٹھی ہو تو اس کے مقابلے میں لازماً قدیم انقلاب دشمن طاقتیں صف بستہ ہو کے آتی ہیں۔ ایسی انقلاب دشمن طاقتوں کے مقابلے میں محض دفاع ہی کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کو تہس نہس کیے بغیر قطعاً ممکن ہی نہیں ہوتا کہ کوئی انقلاب اپنی موجودہ حدود اور معیار پر بھی قائم رہ سکے۔ سو اسلامی نظریہ جہاد یہیں تک نہیں جاتا کہ کوئی حملہ کرے تو چاروناچار اس کا سامنا کر لیا جائے بلکہ وہ یہ رہنمائی دیتا ہے کہ اسلامی انقلاب کے داعی ایک طرف اپنی ریاست کے موجودہ وجود کے ایک ایک ذرے کو بچا رکھنے کے لیے بوقت ضرورت جان و مال کی قربانیاں دیں' دوسری طرف لاکھوں بندگان خدا کو ظلم' جہالت' معاشی خستہ حالی اور اخلاقی پستی سے نکالنے اور انقلاب کی تکمیل کرنے کے لیے انقلاب دشمن طاقتوں کی سرکوبی کریں۔ اس کے علاوہ کسی انقلابی نظریہ پر استوار ہونے والی ریاست کے لیے کوئی چارہ نہیں ہے [1]

---

[1] یہاں ہم ایک شبہ کا ازالہ کرنے کے لیے یہ ضروری وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ اصلاح و تعمیر کا کوئی بھی کام کسی بھی دائرے میں کیجئے اس کے لیے کسی نہ کسی لوح سے قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جس طرح ماں باپ اپنے بچوں کی بہتری کے لئے اور حکومتیں باشندوں کی بہتری کے لیے دلیل' نصیحت اور تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ قوت سے کام لیتی ہیں اسی طرح اصلاحی و تعمیری انقلابوں کے علمبردار بھی کسی نہ کسی حد تک قوت کے استعمال پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ عرب کے جاہلی دور میں قبائلی نظام کی جو کچھ بھی شکل کار فرما تھی اور عوام اس کے تحت جس بھی حالت پر پڑے تھے اسے بدلنے کا کسی کو استحقاق ہی کیا تھا؟ اصلاح و تعمیر کے لیے کوئی انقلاب اٹھانا اور پھر اس کی تکمیل چاہنا اور اس سلسلے میں قوت سے کام لینا سرے سے جائز ہی کیوں مانا جائے۔ اس اعتراض کو اگر کچھ بھی وقعت دی جائے تو پھر کسی باپ یا ماں کو آپ آخر یہ حق کس بنا پر دیں گے کہ وہ اپنی اولاد کے ذہن میں کسی خیال کو ٹھونسے' کوئی آداب اس پر مسلط کرے اور کسی اخلاقی شعور سے اسے جبراً آراستہ کرے۔ آپ کسی حکومت کو یہ حق کس بنا پر دیں گے' کہ وہ شہریوں کو بعض اعمال سے روکے اور بعض کے کرنے پر قوت سے مجبور کرے؟ وہ جہالت' گندگی' بداخلاقی کے خلاف اصلاحی تدابیر عمل میں لائے۔ اور جو قوت بھی ان تدابیر میں مزاحم ہو اس کی مزاحمت ختم کر دے؟ اصلاح و تعمیر کا کوئی کام کسی دائرے میں ممکن التصور نہیں ہے جس میں کوئی مزاحمت نہ ہو اور اس مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے قوت سے کام نہ لینا پڑے۔ آپ اگر مزاحم طاقتوں کو کھلی چھٹی دے دیتے ہیں تو سرے سے کسی اصلاح و تعمیر کا کام ممکن نہیں ہے۔ اصلاح و تعمیر کے ہر اقدام کے حق میں خود فطرت انسانی اپنی پوری طاقت سے موجود رہتی ہے۔ پس ایک قوم یا ملک کو پستی سے نکال کر فلاح کی راہ پر ڈالنے کے لیے جب کوئی تعمیری انقلاب نمودار ہوتا ہے تو انسانی فطرت ہی اس کے حق میں سب سے بڑی دلیل بنتی ہے اور یہی دلیل رائے عام کو اس کے حق میں ہموار کرتی ہے۔ رہا یہ امر کہ فطرت انسانی کے داعیات چونکہ ابہام کے دھندلکے میں ہونے کی وجہ سے واضح نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ قطعی معیار کیا ہے جو =

خدا نے توفیق دی تو ہم یہ بحث تفصیل سے کتاب کے اس حصے میں کریں گے جس میں حضورؐ کے دور کی جنگی کارروائیوں کو تفصیل سے لیا جانا ہے۔

اس موضوع پر ایک نہایت غلط بحث' نہایت غلط ذہنیت کے ساتھ اہل مغرب کی طرف سے اٹھائی گئی۔ اور پھر خود نا آشنا مسلمانوں کا فرنگیت زدہ عنصر بھی پریشان خیالی میں مبتلا ہو گیا۔ معترضین نے ریاست مدینہ کی جنگی کارروائیوں کو یہ معنی پہنائے کہ گویا ایک مذہب کو جبراً لوگوں پر ٹھونسنے کے لیے تلوار کو استعمال کیا گیا۔ حالانکہ معاملہ نرے ایک مذہب کا نہ تھا' ایک انقلابی تحریک کا تھا جس نے جان و مال کی بیش بہا قربانیوں کے بل پر انسانیت کی تعمیر نو کے کام کا آغاز کیا تھا۔ اور مفاد پرست' انقلاب دشمن طاقتیں اس کی تکمیل سے پہلے ہی اسے ملیامیٹ کر دینا چاہتی تھیں۔ پھر معاملہ ایک ریاست کا تھا جس کی نیو ڈالنے کے لیے اس کے معماروں نے تیرہ برس تک انتہائی مظالم سہنے کے بعد گھربار سب لٹوا دیئے تھے اور بالکل بے وطن اور تہی دست ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے خطہ میں سمیٹ لیا تھا جہاں وہ اپنی پسند کے نظام زندگی کے سائے میں زندگیاں گزار سکیں اور جہاں سے وہ دنیا بھر کو سلامتی کا راستہ دکھا سکیں۔

یہ نیا زریں باب جو تاریخ میں کھولا جا رہا تھا اسے مدینہ کے یہودی اور منافق ایک طرف اور مکہ کے قریش اور ان کے حمایتی قبائل دوسری طرف اور بعد کے دور میں بعض بڑے بڑے بیرونی حکمران تیسری طرف تکمیل سے قبل ہی غارت کر دینا چاہتے تھے اور مسلم انقلابیوں کو اس کا موقع ہی دینا نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس کے اوراق پر زندگی کی تقدیر نو کو منقش کر سکیں۔ مذہب اسلامی تحریک کا ایک اہم جزو (وہ بھی لفظ مذہب کے ان مسخ شدہ تصورات سے مختلف مفہوم کے ساتھ) ضرور تھا لیکن اس کے ساتھ بہت سے دوسرے اہم اجزا مل کر دینی تحریک نے وجود پایا تھا۔ چنانچہ مدینہ کی ریاست نے مذہب کے محدود دائرے میں غیر مسلم عناصر کو پوری طرح آزادی کی ضمانت فراہم کی۔ انہوں نے مذہب کے لیے نہیں بلکہ تحریک اور دین اور اسلامی ریاست کے تقاضوں کے تحت تلوار ہاتھ میں لی۔ ان کا اصل مسئلہ اپنی اس مقدس سیاسی ہیئت کے بقا اور نشوونما کا تھا اور وہ خدا پرستانہ اخلاق کی بنیادوں پر سیاست کاری کا ایک نیا زریں تجربہ شروع کر چکے تھے۔ جس کو قریش اور یہود اور بدوی قبائل فوری طور پر ناکام بنا دینے کے لیے مضطرب تھے۔ اس

= بتائے کہ کوئی انقلاب تعمیری و اصلاحی ہے یا نہیں تو اس کے جواب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی آئیڈیالوجی خدائی ہدایت کو ہمارے سامنے رکھتی ہے۔ انسانوں کے خوشنما دعوں کو پرکھنے کی کسوٹی یہ ہے کہ خدا نے اپنے انبیاءؑ کے ذریعے تعمیر و فلاح کے راستے کی نشان دہی کس طرف کی ہے۔ عرب کو نراج کی حالت سے منظم سلطنت کی بلندی پر لانا' قبائلی ٹکڑیوں کو جوڑ کر ایک سیاسی وحدت بنانا' لاکھوں باشندوں کو علم و اخلاق سے آراستہ کرنا اور انہیں امن و انصاف کا ایک نیا دور عطا کرنا ایک ایسا مقدس کارنامہ ہے کہ اگر اس کے لیے قوت کا استعمال روا نہیں تو پھر سرے سے انسانی تاریخ میں قوت کے استعمال کا کوئی بھی مقام باقی نہیں رہ جاتا۔

صورت حالات میں یہ لایعنی بحث پیدا ہی کہاں ہوتی ہے کہ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے تبلیغ کے لیے تلوار استعمال کی یا نہیں؟ یہ سوال ہی کیسے اٹھتا ہے کہ جنگی کارروائیاں دفاعی تھیں یا جارحانہ؟ ----- مگر ہمارے غیرتیں مسلمانانِ کرام نے ان لایعنی بحثوں کو قبول کرلیا۔ اور ان کی مکروہ اور یاوہ روحِ استدلال کو تسلیم کرکے انہوں نے اپنے دامن تاریخ سے بزعم خویش کچھ شرمناک دھبے دھونے کے لیے کاغذی گھاٹ کھول دیئے۔ اور اپنے اوپر سے سارا اعتماد ختم کرکے مستشرقین کے نظریاتی دربار میں بڑی لجاجت سے معذرت خواہی پر اتر آئے۔ انہوں نے اسلام کا نہایت غلط اور محدود تصور ذہنوں میں بٹھالیا۔ اور پھر نظریہ جہاد کو بالکل مسخ کرکے رکھ دیا۔ ان کے مغربی ائمہ تہذیب کا اپنا حال یہ ہے کہ ان کے مذہبی اکابر نے محض نفسانیت کے لیے اور ان کے تاجداروں نے فقط توسیع سلطنت کے لیے جو گھناؤنی جنگیں ماضی میں لڑی ہیں وہ ان کی دنیائے شعر و ادب میں آج تک سرمایہ افتخار بنی ہوئی ہیں۔ مختلف ممالک کو غلام بنانے کے لیے جو ظالمانہ کارروائیاں کی گئی ہیں ان کے گیت ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ گائے گئے ہیں اور خود محکوم قوموں کے ذہنوں میں بسا دیئے گئے ہیں۔ ان کے بحری قزاقوں کے جرائم اگر نوآبادیاتی مہموں میں مفید بیٹھ گئے ہیں تو ان کو انہوں نے ہمیشہ کے لیے اپنا ہیرو بنا لیا ہے۔ لیکن اگر مدینہ کی اسلامی ریاست چو طرفہ خطروں میں گھرے ہوئے نظام نو کا تحفظ اور بعض جان لیوا اور خناسی قوتوں کا انسداد کرنے کے لیے' نیز وحدت' نظم' امن' سلامتی' عدل آزادی اور جمہوریت کی نعمتوں سے خود اپنے ہی ملک کو مالا مال کرنے کے لیے بالکل بے لوث جد و جہد کرتی ہے تو اس کے خلاف چارج شیٹ مرتب کرنے اور مقدمہ ثابت کرنے کے لیے مغرب کے بے شمار بہترین دماغ یکے بعد دیگرے اپنی کاوشیں کھپاتے چلے جاتے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ اب خود ان مدعیوں اور ان وکیلوں کے خلاف تاریخ کی عدالت میں علمی مقدمہ چلایا جائے اور ان کی دسیسہ کاریوں کا پول کھولنے کے لیے فرد قرارداد جرم مرتب کی جائے۔ ہماری یہ ملی ضرورت منتظر ہے کہ تاریخ و سیرت کے نوجوان طالب علم اس فریضہ کی ادائی کے لیے آگے بڑھیں۔

ہمارا نظریہ جہاد قطعاً اس محدود دفاعی تصور پر مبنی نہیں ہے جو عام طور پر ذہنوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ البتہ وہ اس معنی میں دفاعی ہے کہ:

اس کا مقصد قائم شدہ اسلامی ریاست اور اسلامی سماج کا تحفظ ہے۔

اس کا مقصد اس آئیڈیالوجی کا تحفظ ہے جس کی اساس پر نظام حق قائم ہوتا ہے۔

اس کا مقصد ہر اس فعال تخریبی قوت کا انسداد ہے جو اسلامی انقلاب کے کیے ہوئے کام کے لیے باعث خطر ہو اور جو اس کی تکمیل میں حائل ہونے والی ہے۔

اس کا مقصد ہر ایسے ظالمانہ اقتدار ---- خواہ وہ سیاسی ہو' معاشی ہو' مذہبی ہو یا معاشرتی --- کا قلع قمع کرنا ہے جو تہذیب کے نشوو ارتقاء اور انسانیت کی بھلائی کے راستے کا روڑا بن رہا ہو۔

قرآن کا فلسفہ جنگ:

یہاں تفصیلی بحثوں کا موقع نہیں' تاہم قرآن کی دو تین انتہائی ضروری آیات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے' کہا گیا ہے کہ:-

"ان لوگوں کو (تلوار اٹھانے کی) اجازت دی جاتی ہے۔ جن کے خلاف جنگ چھیڑی جا رہی ہے ---- کیونکہ ان کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا ہے اور (ان مظلوموں کے مخالفین کان کھول کر سن لیں کہ) اللہ ان کی مدد کرنے کے لیے پوری پوری طاقت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں' جو کسی جائز بنیاد کے بغیر محض اس بنا پر گھروں سے نکالے گئے ہیں کہ ان کی پکار یہ ہے کہ "اللہ ہی ہمارا رب ہے" اور اگر اللہ تعالیٰ (یوں اذن جنگ دے کر) کچھ لوگوں کو (جو بگاڑ کے علمبردار ہیں) کچھ دوسرے لوگوں کے ہاتھوں (جو اصلاح و تعمیر کے داعی ہیں) اقتدار سے برطرف نہ کرا دے تو (بدی کے زور پکڑ جانے کے باعث) درویشوں کے صومعے' نصاریٰ کے گرجے' یہودیوں کے معبد اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام پکارا جاتا ہے' اجڑ جائیں۔ اور اللہ تو انہی کی مدد کرے گا' جو اللہ کے کام میں اپنا تعاون پیش کرتے ہیں۔ اور یقیناً (ان کو مدد دینے کے لیے) اللہ پوری طاقت رکھتا ہے اور غالب و برتر ہے۔"

"یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دیں تو یہ (نفس پرستی اور غارت گری میں پڑنے کے بجائے) نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور ناپسندیدہ امور کا انسداد کریں گے۔ اور کشمکش کے ایسے تمام معاملات کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے"۔ (حج۔ ۳۹ تا ۴۱)

"خدا کی راہ میں (اس کے نظام حق کی اقامت اور تحفظ کے لیے) ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے خلاف لڑیں۔ لیکن زیادتی [1] نہ کرو۔ اللہ کو زیادتی کرنے والے لوگ پسند نہیں ہیں۔ دشمنوں کو جہاں بھی پاؤ ان کو جیتا نہ چھوڑو اور جہاں سے تم کو انہوں نے نکال دیا تھا تم بھی ان کو نکال باہر کرو کیونکہ فتنہ و شر (اقامت حق میں مزاحمت) کا ہونا قتل سے زیادہ بڑی برائی ہے۔ ان کے خلاف مسجد حرام کے ماحول میں نہ لڑو' تا آنکہ وہ خود ہی (اس حرمت کا پاس ختم کر

---

[1] تفسیری نکات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ زیادتی سے روکنے کا وسیع مفہوم یہ ہے کہ ایک تو گندم کے ساتھ گھن کو نہ پیسا جائے۔ یعنی جو عنصر بالفعل برامن ہو اس پر قوت آزمائی نہ کی جائے۔ دوسرے جنگی کارروائی اس حد سے زیادہ نہ کی جائے جتنی بالکل ناگزیر ہو' اور تیسرے دوران جنگ میں اسلام کے اخلاقی حدود کا پورا احترام کیا جائے اور قانون جنگ کو ملحوظ رکھا جائے۔

کے) تم سے لڑیں۔ پھر اگر وہ واقعی (حدود حرم میں) تم سے جنگ آزما ہوں تو تم بھی (کسی جھجک کے بغیر) ان سے جنگ کرو۔ ان کافروں (یعنی اسلامی انقلاب کے دشمنوں) کو اسی طرح کیفر کردار تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور (ہاں) ان کے خلاف اس وقت تک جنگی کارروائی جاری رکھو کہ نظام حق کی راہ سے مزاحمتوں کا قلع قمع ہو جائے اور پورے کا پورا نظام حیات اللہ کی ہدایت کے تابع ہو جائے۔ پھر اگر وہ مزاحمت چھوڑ دیں تو ان پر ---- ماسوائے مجرمین کے ---- کوئی گرفت نہیں"۔ (البقرہ ۱۹۰ تا ۱۹۳)

"تمہیں ہو کیا گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں ---- اور خصوصاً ان بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کو ظلم سے بچانے کے لیے جنگ کرنے کو نہیں اٹھ رہے ہو' جن کا حال یہ ہے کہ وہ دعائیں کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی جناب سے کسی کو حمایتی بنا کے بھیج' اور اپنی جناب سے کسی کو ہمارا مددگار بنا کے اٹھا"۔ (النساء۔ ۷۵)

"پھر اگر وہ قول و قرار کرنے کے بعد اپنے پیمان توڑ دیں۔ اور تمہارے معاملات میں نشتر زنی کریں (اور یہ ثابت کر دیں کہ وہ شرانگیزی پر تلے ہوئے ہیں) تو تم ان مخالف اسلام طاقتوں کے سربراہ کاروں کے خلاف دھاوا بولو۔ ان کے لیے پیمان کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ شاید (تم ان کی خبر لو تو) یہ باز آجائیں۔ کیا تم ایسے ٹولے کے خلاف نہیں لڑو گے جنہوں نے عہد و پیمان توڑ ڈالے اور جنہوں نے (اسلامی تحریک کی جڑ اکھاڑنے کے لیے) رسولؐ کو (مدینہ سے) نکال دینے کے منصوبے باندھے اور جنہوں نے تمہارے خلاف شرارت کرنے میں پہل کی ہے"۔ (التوبہ ۱۲۔ ۱۳)

"اگر تم (جہاد کے لیے) نہیں نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ اقتدار پر کسی اور گروہ کو لے آئے گا۔ جس کا تم بال بھی بیکا نہ کر سکو گے اور اللہ ہر اقدام پر قادر ہے۔" (التوبہ۔ ۳۹)

اسلام کے نظریہ جہاد اور حضورؐ پاک کی اختیار کردہ جنگی پالیسی پر قرآن میں اور بہت سے اہم اور غور طلب مقامات ہیں لیکن ہم نے نہایت ہی واضح قسم کی وہ آیات لے لی ہیں جن سے اصولی باتیں اخذ ہو سکتی ہیں۔ ان آیات میں جو نکات ذہن نشین کرائے گئے ہیں وہ یہ ہیں:-

۱۔ بہ حیثیت مجموعی اسلامی جماعت سالہا سال سے مظلومی کے مقام پر چلی آ رہی تھی اور حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو مکہ بدر کر کے اجتماعی ظلم کا آخری وار کیا جا چکا تھا۔ مقابل کی طاقت کا موقف شروع سے ظالمانہ تھا۔ کیونکہ وہ مسلم معاشرہ کو پنپنے نہیں دے رہی تھی۔ وہ یہ موقع نہیں دے رہی تھی کہ حق شناس لوگ اللہ کو اپنا رب بنا کے اس کی ہدایت کے تحت زندگیوں کی تشکیل کر سکیں۔ وہ عقیدہ و رائے' اظہار

خیال، دعوت حق اور جماعتی تنظیم کی آزادیوں کو سلب کیے ہوئے تھی۔ اور اس نے کئی سال تک شان بربریت کے ساتھ شریف، پر امن اور صبر کیش مسلم انقلابیوں پر تشدد کے وار کیے تھے اور بالآخر ان کے لیے اپنے زاد بوم میں سانس لینے کا موقع ہی نہ چھوڑا۔

۲۔ اسلام اپنے مخالفین کو زیادہ سے زیادہ حد تک بات کو سمجھنے اور تبدیلی قبول کرنے کا موقع تو دیتا ہے اور یہی موقع فراہم کرنے کے لیے وہ اپنے پیرووں کو ایک دور صبر سے گزارتا ہے لیکن وہ اسے گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے صبر کیش علمبردار مستقل طور پر مظلومی میں پڑ کر ظالموں کے کبر نفس کی غذا بنتے رہیں۔ اس کا منشا انسانی تمدن میں کچھ درندوں کو پال رکھنے کے لیے سستے شکار فراہم کرنا ہرگز نہیں ہے، وہ اپنے صبر کیشوں کو تیاری اس لیے کرتا ہے کہ وہ ظالم طاقتوں کا استیصال کر کے انسانیت پر فلاح کی راہیں کھول دیں۔

۳۔ ظالم اور تخریب پسند طاقتوں کا استیصال اس بنا پر ایک نہایت ہی اہم تمدنی ضرورت ہے کہ اگر فاسد گروہوں کو بزور اقتدار سے ہٹا نہ دیا جائے اور ان کو کام کرنے کی چھوٹ ہمیشہ کے لیے حاصل رہے تو خدا پرستی اور نیکی اور شرافت کی ساری قدریں غارت ہو کے رہ جائیں۔

۴۔ اسلامی نظریہ انقلاب بوقت ضرورت قوت شمشیر کا استعمال کر کے اقتدار کو ایسے ہاتھوں سے سلب کر لینا چاہتا ہے جو انتشار، جہالت، بدی اور ظلم کے پشت پناہ ہوں، اور ایسے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہے جو خدا پرستی اور نماز و زکوٰۃ کے نظام کو قائم کریں، جو نیکیوں کو فروغ دیں اور برائیوں کا سد باب کریں۔

۵۔ "ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے خلاف لڑیں"۔ کا مطلب یہ نہیں ہے، کہ اگر کبھی مخالفین تمہارے اوپر چڑھائی کر دیں، تو تم کچھ تھوڑا بہت بچاؤ کر لیا کرو۔ یہاں اشارہ یہ ہے کہ ایک تو وہ لوگ ہیں جو مخالفت و مزاحمت میں فعال نہیں ہیں، سو ان سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ لوگ جو تمہارے کام میں مزاحمت ڈالتے ہیں اور لڑ کر تمہیں اور تمہارے نظام کو ختم کر دینے کے درپے ہیں، ان کے خلاف تو تلوار اٹھائے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ اسلامی ریاست پر ان کے حملہ آور ہو جانے ہی کا انتظار کیا جائے۔ بلکہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں ان کی سرکوبی کی جائے۔ اس کی واضح دلیل بھی سامنے رکھ دی گئی ہے اور وہ یہ کہ قتل مقاتلہ فی نفسہٖ کوئی اچھا کام نہیں، لیکن دوسری طرف اسلامی تحریک اور اسلامی نظام کے خلاف فتنہ یا مزاحمت کی موجودگی کئی گنا زیادہ برائی ہے جسے اگر پنپنے دیا جائے تو سرے سے وہ اسلام ہی کی جڑیں اکھاڑ پھینکے۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ اس بڑی برائی سے بچنے کے لیے خنجر جہاد کو متحرک کیا جائے۔ اس وقت تک پوری قوت سے معرکہ آرائی کی جائے کہ راہ حق کی مزاحم طاقتوں کی سرکوبی ہو جائے اور پورے کے پورے دائرہ حیات میں خدا کا پورے کا پورا دین جاری ہو جائے۔

۶۔ جہاں یہ تاکید کی گئی کہ دینی شعائر کی حرمتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے وہاں اس غلط تصور تقویٰ سے مسلمانوں کو بچایا گیا کہ اگر مخالفین ان حرمتوں کو توڑ کر دراز دستی سے کام لیں تو تم چپ چاپ ذبح

ہوتے رہو اور دم نہ مارا کرو کہ ہم تو حرم یا ماہ حرام کا احترام کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ اگر کسی حرمت کو توڑیں تو انہیں بھرپور جواب دیا جائے۔

۷۔ مسلمانوں کا دینی و اخلاقی فرض صرف اپنا ہی بچاؤ نہیں قرار دیا گیا۔ بلکہ انسانیت کے کمزور طبقے اور بے بس عناصر اگر کسی علاقے یا ماحول یا نظام میں پس رہے ہوں اور وہ ظالم طاقتوں سے نجات پانے کے لیے تڑپ رہے ہوں تو اسلامی نظام کا فرض ہے کہ ان کی پکار پر لبیک کہے۔ یعنی اسلامی تحریک جملہ بنی آدم کے لیے نجات دہندہ بنائی گئی ہے۔ اور اس کا حقیقی وسیع فریضہ تہذیب و دین کی اعلیٰ قدروں کا تحفظ ہے۔

۸۔ مزاحمتوں کو توڑنے کے لیے عہد و پیمان بھی ایک پر امن ذریعہ ہے۔ اور اس ذریعہ سے رسولؐ پاک نے پورا پورا کام لیا۔ لیکن عہد شکنی کرنے والوں کے بارے میں قرآن نے سخت تاکید کی کہ ان کا دماغ قوت سے درست کر دیا جائے۔ خصوصاً ایسے عناصر جو عہد توڑ کر اسلامی مرکز کو برباد کرنے' قائد نظام کو برطرف کرنے اور قائم شدہ نظم کو اجاڑ دینے کے لیے منصوبے باندھیں اور پھر شرانگیزی میں پہل کریں۔ وہ اگر اعلان جنگ نہ بھی کر چکے ہوں تو بھی ان کی ہر حرکت ایک اعلان جنگ ہے ان کو پھلنے پھولنے نہیں دیا جا سکتا۔

۹۔ اسی سلسلے میں اس امر پر مسلم حکومت کو توجہ دلائی گئی کہ جنگی کارروائیوں کا اصل مقصود عوام کی جانیں لینا نہیں بلکہ ائمۂ کفر اور انقلاب دشمن قیادتوں کو کچلنا ہے۔

۱۰۔ جہاد کے فریضہ کی ادائی میں تغافل کرنے کے معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ تمہاری یہ ریاست' تمہارا یہ اقتدار' تمہارا یہ نظام ختم ہو جائے گا۔ تم آگے نہیں بڑھو گے' تو مخالف قوتیں اٹھ کے آئیں گی اور تمہیں ہٹا کر بلکہ پوری طرح پامال کر کے اپنا سکہ چلائیں گی پھر تم ٹک ٹک دیکھا کرو گے اور دم نہ مار سکو گے' سوچ لو کہ ایسی صورت میں تم کتنے بڑے دردناک عذاب سے گزرو گے۔

تم نہیں یا ہم نہیں!

ان اشارات کی روشنی میں اسلامی نظریہ جہاد کو ذہن نشین کیے بغیر ہم ان معرکہ ہائے کارزار کی نوعیت سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جو اسلامی انقلاب کے علمبرداروں اور انقلاب دشمنوں کے درمیان واقع ہوئے۔ سمجھنے کی بنیادی حقیقت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ عرب کے میدان تاریخ میں دو قوتیں مقابلے ہو گئی تھیں۔ ایک فاسد اور ظالمانہ جاہلی نظام سے عوام کو نجات دلا کر امن و انصاف کا دور نو پیدا کرنا چاہتی تھی۔ دوسری فرسودہ جاہلی نظام کو جوں کا توں قائم رکھنے کے لیے اسلامی تحریک کو ملیامیٹ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ دونوں کے نظریات و مقاصد میں کوئی سمجھوتہ ممکن نہ تھا' اور نہ لین دین کر کے فریقین کوئی سودا کر سکتے تھے۔ پوزیشن "تم نہیں' یا ہم نہیں" کی تھی۔ یا مشہور انگریزی محاورے کے مطابق یوں کہیے۔ کہ "تم اسے پہلے مار لو' ورنہ وہ تم کو ختم کر دے گا"۔ معاملہ کی نوعیت وہ ہے جو ایک باغبان اور

جنگل کے وحشی جانوروں کے درمیان اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب کہ کوئی پیکر عمل اجاڑ زمین کو تیار کر کے اس میں چمن بندی کرنے لگے۔ وہ اگر جنگلی جانوروں سے تعرض نہیں کرتا تو اس کا باغ ختم ہوتا ہے۔ اور باغ کو وہ بچانا چاہے تو جنگلی جانوروں کے لیے اسے بہرحال سنگ دل بننا پڑتا ہے۔ تاریخ میں کوئی بھی جامع انقلاب ایسا نہیں آیا' جس کے ظہور پر اس کے علمبرداروں اور مخالفوں کے درمیان یہی فیصلہ کن صورت پیدا نہ ہو گئی ہو۔ یہ حقیقت اگر ذہن نشین ہو جائے تو سرے سے یہ لایعنی بحث غیر ضروری ہو جاتی ہے کہ اسلامی جنگوں کی نوعیت دفاعی تھی' یا نہیں تھی۔ اس نامعقول اعتراض کا راستہ بھی بند ہو جاتا ہے کہ تلوار کو اپنی بات منوانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ پھر ضرورت یہ بھی نہیں رہتی کہ ایک ایک لڑائی کو الگ الگ لے کر اس کے فوری اور وقتی اسباب و محرکات کی چھان بین کی جائے اور جان بوجھ کر حقائق کو غلط رنگ دینے والوں کو یقین دلایا جائے کہ مسلم حکومت کو یہ جنگ اپنی مدافعت کے لیے چاروناچار لڑنی پڑی اور اس کی اصل ذمہ داری دوسرے فریق پر تھی۔ آج ہم جب دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض فاضل پیش رووں نے مختلف جنگوں اور خصوصاً اولین معرکہ بدر کے محرکات کا تجزیہ کرنے اور حالات کا ایک خاص نقشہ مرتب کرنے میں بڑی طرح دماغ سوزیاں کی ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ایسی ایسی باریک نکتہ آرائیاں کرنے والوں کو وہ سیدھی سی بنیادی حقیقت کیوں نہ ہاتھ آئی جس کو ایک بار واضح کر کے وہ معذرت خواہانہ نقطہ نظر سے نجات پا جاتے۔ سیرت پر ان کے انتہائی محنت سے کئے ہوئے قیمتی کارناموں میں ایسی جھلک ملتی ہے گویا یہ منصب تو بس اہل مغرب کا ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ حقیقت کیا تھی اور کیا نہ تھی اور ہم لوگ ان کے دربار میں اپنا صفائی کا بیان مرتب کر کے گھگھیا گھگھیا کے ایک ایک بات پیش کرتے پھریں اور پھر اس عدالت عالیہ کے چہرے کو پڑھا کریں کہ کیسا اثر مرتب ہو رہا ہے۔ ہم مجلس کی اس ترتیب کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ اپنے دین' اپنی تاریخ اور اپنے نبیؐ کی سیرت کو سمجھنے سمجھانے والی سب سے بڑی اتھارٹی ہم خود ہیں۔ اور ہمارا دین اور ہمارا رسول اپنے پاس سے ہمیں فکر و نظر کے معیارات دیتا ہے۔ اولین مرتبے پر ہم خود اپنے معاملات کو جانچنے والے ہیں۔ مغرب کے لوگ ہوں یا شمال کے یا جنوب کے --- یہ ان کا منصب نہیں کہ وہ ہم کو ہمارا دین اور ہماری تاریخ سکھائیں۔ ان کا مقام یہ ہے کہ وہ ہم سے معلوم کریں کہ ہمارے دین و تاریخ کی کون سی حقیقت کیا مفہوم رکھتی ہے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ اپنے ماضی کے کارناموں کا مفہوم ہم خود بیان کریں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے ہاں کی اصطلاحات کا مدعا سمجھائیں۔ ہمارا دین' ہماری تاریخ اور ہمارے نبیؐ کی سیرت کو سرے سے وہ کسوٹیاں ہی قبول نہیں ہیں جو قدیم عیسائی کلیسا یا جدید مادہ پرستانہ تمدن نے وضع کی ہیں۔ ہم ان باطل کسوٹیوں پر اپنے سرمایہ ماضی کی جانچ کر کے دکھانے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔

مدینہ کی جنگی کارروائیوں کی نوعیت:

اس جملہ معترضہ کی روشنی میں یہ امر خوب اچھی طرح پیش نظر رکھئے کہ اسلامی ریاست کی جنگی کارروائیاں نہ تو دو سلطنتوں کی باہم آویزش کی نوعیت رکھتی ہیں۔ اور نہ وہ دو مذہبی فرقوں کے تصادم کی تعریف میں آتی ہیں۔ یہاں سکندر اور نپولین کی طرح دنیا کو فتح کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا اور نہ ہالینڈ' فرانس اور انگلستان کی طرح آزاد قوم کی آزادی سلب کرکے نو آبادیات پیدا کرنے کا کوئی پروگرام تھا۔ یہاں ایک ہی ملک اور ایک ہی نسب کے لوگوں کے درمیان کشمکش اس بات پر تھی کہ ایک فریق تعمیر نو کے لیے بے لوث جانفشانیاں دکھا رہا تھا اور دوسرا اسے ناکام بنانے بلکہ صفحہ ہستی سے محو کر دینے پر تلا ہوا تھا۔ تاریخ کے صالح ترین انقلاب کے خلاف قریش اور یہود اور بدوی قبائل ایک رد عملی جذبے میں بھک کر وہ گھٹیا حرکات' شرارتیں' سازشیں اور قاتلانہ تدبیریں پے در پے کر رہے تھے جن کو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ برسوں کے معاندانہ اقدامات کے بعد اب اگلا قدم ان کے لیے رہ یہی گیا تھا کہ وہ اپنے تیغ غضب کو بالکل بے نیام کر کے کھلے میدان میں آجائیں اور بس چلے تو اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ چنانچہ آگے آگے قریش اٹھے اور پیچھے پیچھے دوسرے عناصر ا---- لیکن ان کا اپنا ہی قصہ پاک ہو گیا۔ ان جنگوں کی نوعیت ---- بلا تشبیہ تام ---- ویسی تھی جیسے کہ روس میں انقلاب فروری سے انقلاب اکتوبر تک معرکہ آرائیاں ہوئیں یا انقلاب فرانس کے زیر عنوان شاہ پسندوں اور انقلابیوں میں آویزش ہوئی یا جیسے امریکہ میں سول وار ہوئی۔ مکہ اور مدینہ کی لڑائیاں بھی معنوی طور پر ایک طرح کی سول وار ہی تھیں۔ اس سول وار کی اولین بنائے نزاع یہ تھی کہ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم آبائی نظام جاہلیت کی اندھی تقلید کو چھوڑ کر خدا کی ہدایت کے مطابق ایک روشن فکر اختیار کر رہے تھے۔ اور قریش ان کو آزادی ضمیر سے کام لینے کا حق نہیں دینا چاہتے تھے۔ جاہلیت کے پاسبانوں نے جبرا تشدد سے کام لے کر نوجوانوں کی بیدار دل قوت کو اعتقاد و مسلک کی آزادی سے محروم رکھنا چاہا۔ اور اس بیدار دل قوت نے اپنا فطری حق حاصل کرنے اور دوسروں کو اسی حق سے بہرہ مند کرنے کی ٹھانی۔

مدینہ کی ابتدائی ریاست کی دہ سالہ جنگی کارروائیوں کی یہ خاص نوعیت جانی نقصان کے اعداد و شمار سامنے رکھنے سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ ماننا پڑتا ہے کہ حضورؐ نے "کم سے کم خونریزی" کا اصول سامنے رکھا۔ اور برائے نام حد تک قلیل جانی نقصان کے ساتھ دس لاکھ مربع میل رقبہ کی سلطنت قائم کر دکھائی۔ مسلم شہداء اور دشمن مقتولین کی کل تعداد جو تکمیل انقلاب کے لیے کام آئی' وہ علی الترتیب ۲۵۵ اور ۷۵۹ ہے۔ [1] کئی لاکھ عربوں کی فلاح کا راستہ کھولنے کے لیے صرف چند سو جنگجو مزاحمین کا خاتمہ کرنا پڑا۔

---

[1] رحمۃ للعالمین۔ قاضی سلمان منصور پوری جلد ۲ ص ۲۱۵

اب ذرا اس تعداد کو سامنے رکھ کر معترضین اپنے نظریہ و تصورات کو تاریخ میں نصب کر کے دیکھیں۔ یہ جنگیں اگر مذہبی تبلیغ کے لیے ہوئی ہوتیں تو نہ صرف یہ کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح ان میں بدترین جفاکاریوں سے کام لیا گیا ہوتا۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ تعداد تو ایک ایک جنگ میں موت کے گھاٹ اتار دی گئی ہوتی۔ اگر فاتحانہ امنگوں کے ساتھ حضورؐ اٹھے ہوتے تو جس طرح بڑے بڑے جنگجوؤں نے دل کھول کے خونریزیاں کی ہیں اور تاریخ کے دامن کو لالہ زار کر دیا ہے' اس طرح آپؐ نے بھی ریگستان عرب کے ذرے ذرے کو انسانی خون پلا دیا ہوتا۔ یہ اگر دو مخالف سلطنتوں کی آویزش ہوتی تو بھی جانی نقصان بہت زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح اسیران جنگ کی تعداد اگرچہ ۶۵۶۴ تھی لیکن ان میں سے صرف دو قیدیوں کو ان کے ثابت شدہ جرائم کی بناء پر سزائے موت دی گئی' ۶۳۴۷ کو رہا کر دینا ثابت ہے۔ مؤلف رحمتہ للعالمین نے اس بارے میں بڑا تفحص کر کے بتایا ہے کہ صرف ۲۱۵ قیدیوں کے بارے میں ابھی وضاحت نہیں ہو سکی' شاید بعد کے لوگ ان کے متعلق بھی تحقیقات کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اغلب یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام قبول کر کے مسلم معاشرہ کا جزو بن گئے ہوں گے۔ یہاں تو ایک نشوونما پاتے ہوئے نظام اور اپنی تکمیل کرتی ہوئی ریاست کو داخلی مزاحمت کا سامنا تھا۔ اور ایک ہی سرزمین کے قرابت دار باشندوں کے درمیان آویزش پیدا ہو گئی تھی۔ یہ بہت تھوڑی مدت میں تین چار بڑے بڑے معرکوں کے بعد بہت تھوڑے جانی نقصان پر فیصل ہو گئی کیونکہ درحقیقت اس کا فیصلہ رائے عام کے وسیع دائرہ میں ہو رہا تھا۔

غور کیا جا سکتا ہے کہ اگر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ صحیح معنوں میں کوئی جنگجو شخصیت میدان میں آئی ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے سپاہیوں کو بدر کے عرصہ پیکار میں یہ ہدایات دیتی کہ بنو ہاشم کو قتل نہ کرنا' کیونکہ وہ اپنی مرضی سے لڑنے نہیں آئے' چارو ناچار شامل ہیں۔ عباس بن عبدالمطلب اور ابوالبختری بن ہشام کو نہ مارنا (سہواً موخر الذکر مارا گیا)۔ کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ بدر کے قیدیوں کی بے چینی سے متاثر ہو کر مدینہ کا فاتح مسند حاکم سکون سے سو نہ سکے۔ اور شب میں جا کر ان کی بندشیں ڈھیلی کرائے؟ کیا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خونریزی کے لیے کوئی صاحب خنجر اٹھا ہوتا تو وہ عین حالت جنگ میں مکہ کی درخواست پر غلہ کی رکی ہوئی رسد یمامہ سے جاری کراتا۔ بلکہ پانچ سو اشرفیاں قحط زدہ غرباء کے لیے اپنی جانب سے بھجواتا؟ اور پھر فتح مکہ کے دن جس شخص کا پھریرا آسمانوں میں اڑ رہا تھا وہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے کوئی اور ہوتا اور اس کا مشن نظام حق کے غلبہ کے علاوہ کوئی دوسرا ہوتا تو کیا وہ پندرہ بیس برس کے وحشیانہ مظالم کے زخموں کی بھاری تاریخ کو طاق عفو پر ڈال کر لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء ! کا اعلان کر سکتا؟ جی نہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو مکہ کی گلیوں میں قریش خون کے دریا بہہ گئے ہوتے۔

دراصل حضورؐ کو اگرچہ چارو ناچار میدان جنگ میں اترنا پڑا' کیونکہ شہادت گہ الفت کے باہر باہر سے

کوئی راہ نصب العین کی طرف جاتی نہ تھی' لیکن آپ زمین کے ٹکڑوں کے بجائے روحوں کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ تلوار کے زور سے بدنوں کو مطیع بنانے کے بجائے دلیل سے دماغوں کو اور اخلاق سے دلوں کو مسخر کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ کا اصل معرکہ رائے عام کے میدان میں تھا۔ اور اس میدان میں حریفوں نے زک پہ زک اٹھائی اور تیزی سے بازی ہرتے چلے گئے۔ جنگی کارروائی اس تصادم کا بہت چھوٹا جز ہے جو حضورؐ کو انقلاب دشمنوں سے پیش آیا۔

حضورؐ کی جنگی پالیسی:

محسن انسانیتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی پالیسی کا اساسی کلیہ یہ تھا کہ مخالف عنصر کا خون بہانے کے بجائے اسے بے بس کر دیا جائے۔ تا آنکہ یا تو وہ تعاون کرے یا وہ مزاحمت چھوڑ دے۔ چنانچہ حضورؐ کی حیات طیبہ کے ابواب کو جن محققین و مفکرین نے ہمارے سامنے بے نقاب کیا ہے ان میں ارض ہندو پاک کا ایک مایہ ناز فرزند ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ہے۔ موصوف نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی پالیسی کو یوں بیان کیا ہے:۔

"اصل میں آنحضرت ﷺ نے دشمن کو نیست و نابود کرنے کی جگہ مجبور کرنا پسند فرمایا" [1]

دوسری جگہ لکھا ہے کہ:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست قریش کو تباہ و نابود کرنے پر نہیں' بلکہ بالکل محفوظ رکھ کر بے بس اور مغلوب کر دینے پر مشتمل تھی" [2]

اپنے اس نظریے کو حضورؐ کی اختیار کردہ تدابیر کی تفصیل دے کر اور سلسلہ واقعات پر تبصرہ کر کے فاضل محقق نے بڑی خوبی سے ثابت کیا ہے۔ اس پالیسی کے لیے حضورؐ پاک نے عملی خطوط حسب ذیل اختیار کیے:

اپنی دفاعی طاقت کو تعداد' تنظیم' جفاکشی' جنگی تیاری اور اخلاقی تربیت کے لحاظ سے تیزی سے نشوونما دی اور پھر اس کو مشین کی طرح نقل و حرکت میں رکھا اور مخالف طاقتوں کو مرعوبیت اور خوف کا ہدف بنایا۔

مکہ والوں کی تجارتی شاہراہ کی ناکہ بندی (Blokade) کر کے ان کا زور توڑ دیا۔

معاہداتی رابطوں کے ذریعے مختلف قبائل کو تدریجاً دشمن سے توڑ کر اپنے ساتھ لے لیا۔

فوجی کارروائی کے لیے کبھی اچانک کسی موقع پر دشمن کو تیاری کا موقع دیئے بغیر جا لیا (مثلاً فتح مکہ) کبھی

---

1. عہد نبویؐ کے میدان ہائے جنگ۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص ۴۴

2. عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص ۲۴۰

غیر متوقع راستے اختیار کر کے اور نقل و حرکت کی منزل مقصود کو اخفا میں رکھ کر مخالف طاقت کو غلط فہمی میں ڈالا۔ (مثلاً غزوہ بنو مصطلق) کبھی اپنا نقشہ جنگ پہلے سے اپنے حق میں بنا لیا۔ (مثلاً معرکہ بدر) اور کبھی کوئی ایسی نئی دفاعی تدبیر اختیار کر لی جس کا تجربہ دشمن کو نہ رہا ہو (مثلاً غزوہ خندق)

ریاست مدینہ کا پورا دہ سالہ نظام دفاع مذکورہ بالا اصولی پالیسی کا بین ثبوت ہے۔ پھر جب ہم اس کے ساتھ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عالی ظرفانہ نقطہ نظر کو لیتے ہیں جو اپنے اندر کسی فاتح کے بجائے ایک مشنری کی سی روح رکھتا ہے اور ایک جنگجو کے سے جذبہ غیظ و غضب کے بجائے ایک معلم کی سی ہمدردی و خیر خواہی کے گہرے احساس کا ترجمان ہے تو وہ تمام معترضانہ نکتہ آرائیاں عبث قرار پاتی ہیں جو کرنے والوں نے کیں اور پھر ہم ان کی صفائی دینے کے لیے نقشہ واقعات ہی کو مسخ کرنے بیٹھ گئے۔ حضورؐ پاک کے سینے میں انسانیت کے لیے جو ہمدردانہ جذبہ اصلاح کارفرما تھا اسے عیاں کرنے کے لیے ہم چند موقعوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مکہ میں جب مظالم کا دور شدت اختیار کر گیا اور قریش کے آفتاب غضب میں بڑی تمازت آگئی تو اس وقت تشدد کے محاذ پر دو سرگرم ترین افراد حضورؐ کے سامنے تھے' ایک ابوجہل' دوسرے ابن الخطاب۔ ایسے کٹر دشمنوں کے بارے میں کسی دنیوی سیاست کار کا ذہن سخت عناد میں پڑے بغیر نہ رہتا اور وہ دل سے ان کی ہلاکت کا خواہاں ہوتا۔ لیکن تشدد کی گرم بھٹی میں اذیت پہ اذیت برداشت کرتے ہوئے حضورؐ بہ الحاح یہ دعا کرتے ہیں کہ خدا ان دونوں میں سے کم سے کم کسی ایک کو اسلامی محاذ پر لے آئے۔ یہ دعا گواہی دیتی ہے کہ انسانیت کا معمار اپنے مخالفوں کی ہلاکت پر ان کی اصلاح کو ترجیح دیتا تھا اور آخر دم تک ان سے اچھی امیدیں رکھتا تھا۔ اور یہ دعا حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے پوری ہوئی۔

دوسرا موقع طائف کے باشندوں کے ہاتھوں ان کی خیر خواہی کے جرم میں زخمی ہونے کا ہے۔ دنیوی سیاست کے کسی علمبردار سے اس موقع پر آپ اس کے علاوہ کچھ توقع نہیں کر سکتے کہ اس کے دل کے دروازے ان لوگوں کے لیے ہمیشہ کو بند ہو جائیں اور اس کا بس چلتا تو وہ اسی وقت پوری بستی کو الٹ دیتا ورنہ یہ زخم اس کے کلیجے میں عمر بھر ہرا رہتا۔ اور جب بھی اسے قوت حاصل کرنے کے بعد پہلا موقع ملتا تو وہ ایسے ناہنجار شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ حضورؐ کے ساتھی کا کلیجہ طائف کی اس ظالمانہ کارروائی سے جب شق ہوتا ہے تو وہ فی الواقع اسی نہج پر سوچتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے بد دعا کیجیے ---- بلکہ جبرئیلؑ بھی جذبہ پنہاں کے امتحان کے لیے یہ پیش کش کر دیتا ہے کہ اشارہ ہو تو کوہستانوں کا فرشتہ مکہ اور طائف کو پہاڑوں کے درمیان پیس کے رکھ دے۔ مگر حضورؐ کہتے ہیں کہ نہیں' یہ لوگ نادانی کی وجہ سے غلط روش پر چل رہے ہیں۔ یہ اگر نہیں مانتے تو ان کی اولادیں سچائی کا پیغام قبول کر کے خدائے واحد کی پرستار بنیں گی۔

تیسرا موقع وہ ہے جب کہ میدان احد میں مسلمانوں کو بعض کوتاہیوں کی وجہ سے خدا کی طرف سے

اختتام ہزیمت میں ڈالا گیا تھا اور خود حضورؐ کو شدید قسم کے زخم آئے تھے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ انتہائی تلخ جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ ان حالات سے بظاہر بجا طور پر متاثر ہونے والے بعض ساتھیوں نے عرض کیا کہ آپؐ ان مشرکوں کے لیے خدا سے بد دعا کریں کہ ان پر لعنت برسے۔ آپؐ نے جواب دیا کہ مجھے لعنت برسانے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا' بلکہ ایک پیغام پہنچانے اور رحمت کا مژدہ سنانے پر مامور ہوں۔ یہ کہہ کر میدان جنگ میں حملہ کر کے سخت نقصان پہنچانے والے دشمنوں کے لیے دعا یوں فرمائی کہ :۔ "اے اللہ! میری قوم کے لوگوں کو ہدایت دے۔ کیونکہ وہ (اصل حقیقت کو) جانتے نہیں ہیں"۔ یعنی قریش کی تلواروں کے زخم کھا کر بھی یہ جذبہ نہیں اٹھتا کہ ان کو تہس نہس ہو جانا چاہیے۔ بلکہ حالت جنگ میں بھی یہی آرزو اور امید ہے کہ وہ ہدایت پا جائیں۔

غزوہ خیبر کی مہم کے دوران میں قلعہ قموص کو فتح کرنے کے لیے حضرت علیؓ کو سرور عالمؐ نے علم خاص عنایت فرماتے ہوئے تاکید کی کہ :

"اے علیؓ! اگر تمہارے ذریعے سے ایک شخص کو بھی ہدایت ہو گئی تو یہ تمہارے لیے سب سے بڑی نعمت ہو گی"۔

یعنی اصل مطلوب دشمن کا جانی نقصان اور خونریزی نہیں ہے بلکہ فوقیت اس بات کو ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد کے دل و دماغ میں تبدیلی واقع ہو اور وہ نظام نو کو قبول کر لیں۔

یہ چند نمایاں مواقع ہم نے محض بطور نمونہ کے لیے ہیں۔ ورنہ ایسے شواہد کی کمی نہیں جن سے حضورؐ کا بنیادی نقطہ نظر سامنے آ جاتا ہے۔ جنگجوئی اور خونریزی کرنے والے لوگ مغضوب الغضب اور جلد باز ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے ہم انسانیت کے محسن کو ٹھنڈے عزم اور لمبے حوصلے سے آراستہ پاتے ہیں۔ اور آپؐ کی سیاست میں قوت کے استعمال کے بجائے حکمت و زیرکی کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔ سیاسی حکمت و زیرکی کا اس سے بڑا معجزانہ ثبوت اور کیا ہو گا کہ حضورؐ مدینہ میں جاتے ہی مختلف عناصر کو گفت و شنید سے جوڑ جاڑ کر اسلامی سلطنت کی اساس رکھ دیتے ہیں۔ کسی انقلابی نظریے پر بغیر ایک قطرہ خون بہائے نظام ریاست کو یوں استوار کر دینے کی مثال شاید ساری تاریخ میں نہ مل سکے گی۔ صحیح معنوں میں غیر خونی (Bloodless) انقلاب ہمیں یہی ایک ملتا ہے جس کی بنیادوں میں انسانی خون کا ایک قطرہ نہ گرا اور جس کی نیو کے پتھروں میں کسی ایک فرزند آدم کا لاشہ شامل نہیں ہے۔ یہ محیر العقول واقعہ خود مزاج نبوت کی مخصوص شان کا ترجمان ہے۔

یہ بھی نہ بھولیے کہ واقعاتی تاریخ خود گواہ ہے کہ اسلامی ریاست کی ساری جنگی کارروائیاں قریش اور ان یہودی قبائل کے خلاف ہوئی ہیں' جنہوں نے اسے مجبور کر کے میدان جنگ کی طرف کھینچا ہے۔ بقیہ سارا عرب اپنی معمول کی زندگی میں سرگرم رہا۔ تھوڑے سے علاقے کو چھوڑ کر باقی ماندہ خطے میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ بلکہ عرب کی عام آبادی دونوں طاقتوں کے مقاصد' کردار اور سیاسی قوت کا خاموشی سے جائزہ

لیتی رہی اور جب مسلم طاقت نے اپنی فوقیت ہر پہلو سے ثابت کر دی' تو مختلف علاقوں اور قبیلوں کے نمائندہ وفود نے آگے بڑھ بڑھ کر اسلام کو لبیک کہی۔ یہ امر کسی بھی تحقیق پسند کی توجہ کھینچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تمام بڑی بڑی لڑائیاں' بدر' احد' احزاب دشمن نے بہ حیثیت حملہ آور مدینہ کے گرد وپیش میں خود آکر لڑی ہیں۔ اور حضورؐ کو مجبور کر دیا ہے کہ اس سلسلے کا خاتمہ کرنے کے لیے دشمن کے مراکز قوت کو زیر نگین کریں۔ چنانچہ قریش اور ان کے حلیفوں کا زور توڑنے کے لیے مدینہ کی طرف سے ایک ہی بار فیصلہ کن اقدام ہوا۔ اور فتح مکہ کے بعد حنین اور طائف کے معرکوں نے حریف کی قوت ختم کر دی۔ دوسری طرف کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ یہود کے اڈے اکھیڑ دیئے گئے۔

ایک وسیع غلط فہمی:

غزوات و سرایا کی جو لمبی فہرست حدیث' سیرت اور مغازی کی کتابوں میں ملتی ہے اس کی وجہ سے اغیار تو اغیار' خود مسلمانان کرام بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہوتے رہے ہیں۔ حالانکہ غزوہ اور سریہ کتب احادیث و مغازی کی خاص اصطلاحات ہیں۔ اور ان کا اپنا اپنا متعین مفہوم ہے۔ فوجی اور دفاعی اقدام' دیدبانی یا طلایہ گردی اور باغیوں یا مجرموں کی سرکوبی یا تعلیم اور دعوت عام دینے یا معاہدہ باندھنے وغیرہ مختلف ضروریات کے تحت جب کبھی کوئی دستہ (خواہ وہ دو ہی نفوس پر مشتمل ہو) بھیجا گیا ہے تو اسے سریہ کا عنوان دیا گیا ہے۔ اور جس دستہ کے ساتھ حضورؐ خود بہ نفس نفیس نکلے ہیں وہ غزوہ کہلایا ہے۔ ضروری نہیں کہ واقعی کوئی تصادم یا کسی اور طرح کی کارروائی عملاً واقع بھی ہوئی ہو۔ علاوہ ازیں اگر کچھ مسلم افراد کو اتفاقیہ کسی تصادم یا سرحدی جھڑپ سے دو چار ہونا پڑا ہو تو ایسے واقعات کو بھی سرایا کے زیر عنوان درج کیا گیا ہے۔ اس طرح کے تمام واقعات کو اگر چھانٹ دیا جائے تو صحیح معنوں میں جنگی معرکے صرف چند رہ جاتے ہیں۔ یعنی بدر' احد' احزاب' خیبر' مکہ (مع حنین) واضح رہے کہ تبوک اور ملحقہ علاقوں کو جیش عسرت کی ترسیل شام کی غیر ملکی حکومت کی طرف سے اندیشہ جنگ ہونے پر کی گئی تھی۔ اور اس کی نوعیت مختلف ہے۔ ہم اجمالاً ان جنگی کارروائیوں پر ایک نگاہ ڈالیں گے۔

سب سے پہلے توجہ اس سوال پر جاتی ہے کہ آویزش کا آغاز کیسے ہوا؟ اس کا جواب دینے کے لیے ہم فریقین کی پوزیشن کا جائزہ لیتے ہیں۔

قریش کی جارحانہ ذہنیت:

قریش کی پوزیشن اس واقعہ سے از خود متعین ہو جاتی ہے کہ انھوں نے جب حضورؐ کے قتل کی اجتماعی سازش باندھی تھی تو اس میں مکہ کی قیادت نے بحث کرتے ہوئے اپنا ذہن کھول کر رکھ دیا تھا۔ ایک تجویز آئی تھی کہ سچائی کے اس داعی کو آہنی زندان میں بند کر دیا جائے اور اس کا دروازہ مقفل رکھا جائے۔ یہاں تک کہ وہ گھل گھل کر ختم ہو جائے۔ ایک شیخ نجدی نے اس پر کہا تھا کہ "اگر تم اسے قید کرو گے تو

اس کی دعوت آہنی زنداں کے بند دروازوں سے بھی نکل نکل کر پھیلے گی اور اس کے ساتھیوں تک اس کے اثرات پہنچیں گے بلکہ بعید نہیں کہ یہ لوگ اسے نکال کے لے جائیں۔ پھر تمہارے مقابلے میں وہ بلحاظ تعداد بڑھ جائیں اور آخر کار اس جدوجہد میں تم کو زک دے دیں"۔ دوسری تجویز یہ بھی آئی تھی کہ ہم اس شخص کو اپنے درمیان سے الگ کر دیں اور اپنے وطن سے خارج کر دیں۔ پھر جب وہ ہمارے ہاں سے نکال دیا گیا ہو تو پھر ہمیں کیا کاوش کہ وہ کدھر گیا اور کہاں گیا۔ بس وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے اور ہم اس سے نجات پا کر اپنے معاملات کو ٹھیک ٹھاک کر لیں اور باہمی الفت کو حسب سابق بحال کر لیں [1]۔ نہایت اہم تبصرہ ہے جو اس تجویز کو مسترد کرنے کے لیے شیخ نجدی نے کیا اور جسے مجلس نے قبول کر لیا' ملاحظہ ہو:

> "نہیں' خدا کی قسم! تمہارے لیے یہ صورت مناسب نہیں۔ کیا تم اُس کی خوبی گفتار' اس کی شیرینی کلام کو نہیں دیکھتے کہ جس کے بل پر لوگوں کے دلوں پر وہ اپنا اثر بٹھا لیتا ہے۔ خدا کی قسم! اگر تم نے ایسا کیا تو پھر تم اس صورت میں اپنا کوئی بچاؤ نہیں کر سکتے کہ وہ عرب کے کسی قبیلے کے پاس پہنچے اور اپنے کلام و گفتار سے لوگوں پر اپنا اثر بٹھا لے اور وہ اس کے پیچھے لگ جائیں۔ پھر وہ انہیں لے کر تم پر چڑھائی کر دے اور تمہاری بستیوں میں آگھسے اور تمہارے ہاتھوں سے تمہارا اقتدار چھین کر تمہارے ساتھ جو سلوک چاہے روا رکھے۔ پس کوئی اور تدبیر نکالو" [2]

شیخ نجدی کے یہ الفاظ پڑھنے سے اندازہ ہو تا ہے کہ کم بخت کتنا زیرک اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے محسن انسانیتؐ کی شخصیت کو پڑھنے میں ذرا بھی سہو نہیں کیا۔ اسی کے ساتھ اس ساری بحث سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مکہ کے کارپرداز تیرہ برس کے تجربہ کی روشنی میں حضورؐ کے وجود' افکار' پیغام اور حسن کردار کو اب ایک مستقل سیاسی خطرہ اور ایک مہلک خطرہ سمجھتے تھے۔ اب ان کو یہ صورت بھی گوارا نہ تھی کہ انسانیت کا یہ محسنؐ زمین کے کسی بھی گوشے میں زندہ رہ سکے اور کہیں بھی بیٹھ کر اپنے مشن کو چلا سکے۔ ورنہ وہ جانتے تھے کہ جو مظالم انہوں نے ڈھائے ہیں اور مسلم نوجوانوں کو ان کے گھروں سے نکال کر جو جرم کیا ہے اس کا حساب ایک دن انہیں دینا پڑے گا۔ پھر ان کا حضورؐ کے قتل پر متفق ہو جانا اور آپؐ کے بچ کر نکل جانے پر قابو پانے کے لیے دوڑ دھوپ کرنا اور بھاری انعام مقرر کرنا اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ اگر بس چلے تو وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی کی سانس لینے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ اب حضورؐ کا عین وجود ان کے لیے خطرہ اور آپؐ کی زندگی ہی ان کے لیے چیلنج تھی۔ قریش کی اس

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۴

[2] ایضاً

ذہنیت سے کوئی وجہ نہیں کہ حضورؐ پاک کو فوراً اطلاع نہ مل گئی ہو۔

ذرا اس موقع سے بھی پیچھے چلے جائیے۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر حضرت عباسؓ نے انصار کو انتباہ دیا تھا کہ "جس مقصد کے لیے حضورؐ کو دعوت دے رہے ہو' اگر اسے نبھا سکو اور ان کی جو مخالفت کی جائے گی اس کا مقابلہ کر سکو تو پھر تمہارا وہ بھاری ذمہ داری اٹھانا درست جو تم نے اٹھائی ہے"۔ پھر حضورؐ کا بیعت کے مضمون میں یہ افتتاحی کلمات شامل کرنا کہ "جس طرح تم اپنے اہل و عیال کی مدافعت کرتے ہو' اسی طرح میری مدافعت کرو گے"۔ پھر انصار کا یہ جواب دینا" کہ "اطمینان رکھئے۔ ہم جنگجو لوگ ہیں" اور یہ سوال اٹھانا کہ "آپ کی خاطر ہمارے بہت سے معاہدانہ رابطے ٹوٹ جائیں گے تو ایسا تو نہ ہو کہ ہم سب کچھ بھگتیں اور آپؐ پھر اپنے خاندانی لوگوں میں لوٹ آئیں۔ اور ہمیں چھوڑ دیں"۔ اس پر حضورؐ کا یقین دلانا کہ "انا منکم و انتم منی"۔ پھر عباس بن عبادہ انصاری کا اپنے ساتھیوں کو تاکیداً انتباہ دینا کہ "تم لوگ انسانوں کے متعدد سرخ و سیاہ گروہوں سے جنگ مول لے رہے ہو پھر ایسا نہ ہو کہ جب تم مالوں کی تباہی اور اپنے سرداران قوم کے قتل کے حادثوں سے دو چار ہو تو پھر حضورؐ کو دشمنوں کے حوالے کر دو۔ یہ سب کچھ ابھی سے سوچ لو"۔

ان گفتگوؤں کے معنی یہ ہیں کہ قریش کی طرف سے ماحول کے قرطاس پر مستقبل کا اعلان جنگ ایسے جلی الفاظ میں لکھا ہوا موجود تھا کہ حضورؐ اور حضرت عباسؓ ہی نہیں اسے دور دراز سے آنے والے انصار نے بھی پڑھ لیا تھا۔

پھر اس مجلس بیعت کی روداد کسی شیطان نے چھپ کر سنی اور قریش کو آگاہ کر دیا تو اکابر نے انصار کی قیام گاہوں پر جا کر یوں بات چیت کی کہ "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم ہمارے اس شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ہو اور اس کو ہمارے درمیان سے نکال لے جانا چاہتے ہو اور تم نے اس کے ہاتھوں پر ہمارے خلاف جنگ کرنے کا معاہدہ باندھا ہے حالانکہ ہمیں عرب کے کسی بھی قبیلے اور اپنے درمیان جنگ چھڑنے سے زیادہ ناپسند یہ ہے کہ تمہارے ساتھ ہماری لڑائی ٹھن جائے۔ یعنی انصار اگر حضورؐ کو مکہ سے نکال لے جائیں اور ان کو اپنی حفاظت میں رکھیں تو مکہ اسے اعلان جنگ کے معنی میں لے گا۔ اور اس صورت میں قیادت قریش کی جانب سے گویا واضح طور پر پیشگی اعلان جنگ سنا دیا گیا" لیکن کچھ لوگ تو اس قصے سے ناواقف تھے۔ اور جو جانتے تھے انہوں نے رازداری سے کام لیا۔

پھر جب انصار کے اصحاب بیعت مکہ سے نکل گئے۔ تو بعد میں معاملہ پر بحث و تمحیص ہوئی اور مشورہ کر کے تعاقب کیا گیا۔ مدنی قافلہ بچ بچا کر نکل گیا۔ البتہ مکہ والے سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرو کو پکڑ لے گئے اور ان کو مارا پیٹا۔ یہ واقعہ بھی بتاتا ہے کہ حضورؐ کا مکہ سے بچ کر نکل جانا مکہ والوں کو کتنا ناپسند تھا اور انہیں حضورؐ کو اپنی حفاظت میں لینے کا عہد کرنے والوں پر کتنا غصہ تھا۔

علاوہ ازیں مہاجرین حبشہ کو واپس لانے اور مدینہ جانے والے مہاجرین کو ابتداءً ہجرت سے روکنے کے

لیے جو اقدامات قریش کی طرف سے ہوئے وہ بھی بتاتے ہیں کہ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ کسی دوسری سر زمین میں اسلامی تحریک جڑ پکڑ سکے۔ ایسے ہر امکان کا وہ سد باب کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔

ان سارے واقعاتی شواہد سے یہ بالکل واضح ہے کہ ہجرت سے قبل ہی قریش کی طرف سے کسی بھی ایسی طاقت کے لیے جنگی چیلنج فضاء میں موجود تھا۔ جو حضورؐ کو اپنے ہاں جگہ دے اور اسلامی تحریک کے پودے کی جڑ اپنی سرزمین میں لگنے دے۔ اسلامی انقلاب کے علمبردار اتنے سادہ لوح اور خوش فہم نہ تھے کہ وہ اس چیلنج سے صرف نظر کر سکتے۔

آخر ماحول کے قرطاس پر لکھا ہوا یہ اعلان جنگ اس سازشی خط کی شکل میں واضح طور پر سامنے آگیا جو مکہ سے غداران مدینہ کے سرخیل عبداللہ بن ابی کو موصول ہوا۔ جس میں مدینہ کے یہود و انصار سبھی کے لیے یہ دھمکی مرقوم تھی کہ یا تو تم از خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حدود سے نکال دو یا پھر' ہم چڑھائی کریں گے اور تمہیں قتل کر کے تمہاری عورتوں کو سرمایہ نشاط بنائیں گے۔

پھر یہودیوں سے ساز باز کر کے قریش نے براہ راست مسلمانوں کو پیغام بھجوایا' کہ "تم لوگ اس پر مغرور نہ ہو جاؤ کہ مکہ سے بچ سلامت نکل گئے۔ ہم مدینہ پہنچ کر تمہاری خبر لیں گے"۔

اسی زمانے میں سعدؓ بن معاذ کو ابوجہل نے طواف کعبہ سے روکا اور صاف صاف کہہ سنایا کہ مجھے یہ گوارا نہیں کہ تم لوگ کعبہ میں قدم رکھ سکو۔

پھر اس دوران میں مکہ سے برابر شرارت اور غارت گری کے لیے چھوٹی چھوٹی فوجی ٹولیاں نکلنے لگیں۔ حضورؐ ان اقدامات کی اطلاع ملتے ہی جواباً طلایہ گرد دستے بھیجے۔ متعدد بار مدینہ کے دستوں نے مکہ کی ان ٹولیوں کو دیکھا جو مسلم طاقت کو چوکس پا کر پلٹ جاتی رہیں۔

ہجرت کے تیرھویں ہی مہینے کا یہ واقعہ انتہائی چونکا دینے والا تھا کہ کرز بن جابر فہری نے ڈاکہ زنی کی اور مدینہ کی چراگاہ سے حضورؐ کے مویشی' سرکاری اونٹ اور دوسرے لوگوں کے جانور ہنکا لے گیا۔ اس واردات کا واضح مدعا یہ تھا کہ ہم تین سو میل سے آکر تمہارے حدود میں سے یوں تمہاری دولت پر ہاتھ صاف کر سکتے ہیں [1] حضورؐ بہ نفس نفیس ایک مختصر دستہ لے کر تعاقب کو نکلے اور مدینہ میں زید بن حارثہ کو قائم مقامی کا منصب سونپا۔ وادی صفوان (متصل بہ بدر) تک گئے لیکن کرز دسترس سے نکل گیا تھا۔ یہ دشمن کی ایک ایسی جسارت تھی کہ جسے کوئی بھی ایسی ریاست برداشت نہیں کر سکتی جس کے کار پرداز حمیت و شجاعت سے مالا مال ہوں اور ان کو اپنی آزادی اور اپنی سرزمین کی حرمت کا پاس ہو۔ یہ ڈاکہ زنی سیاسی لحاظ سے حملہ کے مترادف تھی۔ اب ایک دور کارزار اور ایک خون آلود مستقبل مدینہ کے سامنے تھا۔

---

[1] ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۳۸۔ اصح السیر۔ مولانا عبدالرؤف ص ۱۲۵۔ رحمتہ للعالمین قاضی سلمان منصور پوری جلد ۱ ص

مکہ کا مدینہ پر حملہ آور ہونا ۲ھ تک اگر مؤخر ہوا تو اُس کی ایک بڑی اہم وجہ تھی۔ کوئی رکاوٹ اگر حائل نہ ہوتی تو شاید قریش کی تلوار اس سے بہت قبل برہنہ ہو جاتی اور وہ مدینہ کے نئے اسلامی مرکز کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ دیتی۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان بنو کنانہ کا علاقہ حائل تھا۔ جن سے قریش کی دیرینہ مخاصمت تھی۔ اندیشہ تھا کہ بنو کنانہ اول تو قریش قوم کو اپنے علاقہ سے گزرنے نہ دیں گے۔ اور ایسا ہوا بھی تو دوسرا خطرہ یہ تھا کہ بنو کنانہ مکہ کو خالی دیکھ کر حملہ نہ کر دیں۔ یا کم سے کم قریشی فوج کا مکہ سے رابطہ کسی نازک موقع پر کاٹ نہ دیں۔ سراقہ بن مالک مدلجی کنانی اس درمیانی علاقہ کا سردار تھا۔ اسے جب اطلاع ہوئی کہ قریش ایسے ایسے اندیشوں کی وجہ سے اقدام نہیں کر رہے تو اس نے خود مکہ جا کر قریش کو تعاون کا یقین دلایا۔ اس گٹھ جوڑ کے معنی جنگ بدر تھے۔

اس تصریح سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ قریش کو مسلمانوں کی طرف سے نہ کسی اقدام کا انتظار تھا اور نہ وہ جنگی کارروائی کے لیے کسی چھیڑے کی تلاش میں تھے۔ ان کے اندر جارحیت کی روح پوری آتشیں شان سے کام کر رہی تھی [1] قرآن کریم ان کو صاف الفاظ میں یہ کہتا ہے کہ "ھم بدء وکم اول مرۃ" (التوبہ۔ ۱۳) یعنی پہلے پہل تم پر خود انہوں نے وار کیا۔

مدینہ کا دفاعی نظام:

اب آیئے دوسرے فریق کو لیجیے:

جب ہم محسن انسانیتؐ اور آپؐ کی انقلابی جماعت کے حالات کا گہرا تجزیہ کرتے ہیں تو ہر پہلو سے یہی شہادت ملتی ہے کہ اس فریق کے لیے جنگی کارروائی سے زیادہ ناپسندیدہ صورت کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ اجڑے بچھڑے لوگوں کا ایک نئے ماحول میں داخل ہونا' آدمی جماعت کا معاشی تباہی سے دوچار ہو کر اپنی بحالی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا' ایک نئے ماحول کو انقلابی دعوت کے لیے آہستہ آہستہ تیار کرنا' مختلف قابلیت زدہ عناصر میں اخوت کا جوڑ لگانا اور ان کی ذہنی و اخلاقی تربیت کرنا نیز ایک نئی ریاست قائم کر کے اس کے جملہ شعبوں کا نظم و نسق تعمیر کرنا' یہ سارے کام بیک دم اسلامی انقلاب کے علمبرداروں کے سامنے آگئے تھے اور ان میں سے ہر کام دیر تک پوری پوری توجہ اور محنت چاہتا تھا۔ ایسے کٹھن مسائل میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی جماعت کبھی بھی کوئی لڑائی مول لینے کو تیار نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن دوسری طرف یہ لوگ ایک عظیم بین الانسانی مشن رکھنے والے لوگ تھے۔ ان کے سامنے دنیا بھر کی بھلائی کا ایک مقدس نصب العین تھا۔ انہوں نے زندگی کی عظیم ترین سچائی ---- یعنی ایک ہی خدا کی ربوبیت و الہیت ---- کے نور سے تمدن کو جگمگا دینے کے لیے اپنے سارے مفاد اور آرام قربان کر رکھے تھے۔ اور صبر اور ایثار کی خوف

---

[1] رحمتہ للعالمین۔ قاضی سلمان منصور پوری جلد ۲ ص ۶۱۔ ۲۶۰

ناک وادیاں طے کر کر کے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کا تو سرمایہ حیات ہی نظریہ حق تھا۔ اپنی چھوٹی سی جماعت تھی اور مدینہ کی نو تشکیل یافتہ ریاست تھی۔ ان کا سارا مستقبل اس پونجی سے وابستہ تھا۔ وہ اس کی حفاظت کے لیے ٹھیک وہی مقدس فطری جذبہ رکھتے تھے۔ جس سے سرشار ہو کر کوئی مرغی جب کسی چیل کو منڈلاتے دیکھتی ہے تو سب کچھ فراموش کر کے اپنے چوزوں کو پروں تلے سمیٹ لیتی ہے۔ وہ فاقے کاٹ کر مال خرچ کرتے تھے۔ وہ سوکھے ہوئے جسموں کے ساتھ چٹانوں سے ٹکرا جانے کے لیے تیار تھے۔ وہ ساری لذتیں اور مفاد فراموش کر کے دیوانہ وار ہر اس طاقت کے بازو توڑ دینے کے لیے سچا ولولہ رکھتے تھے جو ان کے مقصد حیات کو غارت کرنے کے لیے ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے۔ وہ مدینہ کی سرور انگیز ہواؤں اور باغوں میں اخوت کی لا مثال فضاؤں میں آکر بھی تشدد کے زخموں کو فراموش کر کے کبھی چین سے غفلت کی نیند نہ سوئے اور ان کی نگاہ سروں پر لٹکتے ہوئے اس خنجر پیکار سے کبھی نہ ہٹی جس کے قبضہ پر مکہ کی قیادت کا ہاتھ تھا اور جس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا کہ کب وہ برق خرمن سوز کی طرح اچانک ٹوٹ پڑے۔ نہ حضورؐ نے حفاظتی انتظامات سے تغافل برتا اور نہ آپؐ کے رفقاء نے اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کرنے میں کوئی کوتاہی دکھائی۔ آخر یہ لوگ درویش اور جوگی نہ تھے۔ نہایت زیرک اور فعال شخصیتوں کے ساتھ ایک نئی دنیا بنانے چلے تھے۔ ایسے تاریخ ساز لوگ مخالفین کو طاقت کا جواب طاقت سے دینے کا دماغ رکھتے تھے۔

حضورؐ کی دفاعی تدابیر:

آیئے جائزہ لیں کہ حضورؐ نے حفاظتی تدابیر کیا کیا اختیار فرمائیں۔

مدینہ میں محسن انسانیتؐ کے ساتھ آنے والے مہاجرین محض اپنے لیے جائے امن و سکون تلاش کرنے والے لوگ نہ تھے۔ اور نہ ان کی تبدیلی وطن کا اقدام کچھ معاشی حوصلوں کی تکمیل کے لیے تھا۔ وہ ایک اونچے مقصد کے لیے آئے تھے اور اسے فراموش کر کے وہ اپنے لیے ٹھکانے حاصل کرنے اور اقتصادی عروج کی راہیں تلاش کرنے میں گم نہیں ہو گئے۔ بلکہ حضورؐ نے ان کو منظم طریق سے بسایا اور انصار کے ساتھ ان کی معاشی و سماجی اخوت قائم کی۔ اور پھر ان کو مسجدوں کے تمدنی مراکز کے ذریعے جماعتی تنظیم میں پرو دیا۔ عبادات، مواعظ، تعلیم قرآن اور دوسری تدابیر سے ان کی ذہنی، عملی اور اخلاقی تربیت کا کام فوراً شروع کر دیا۔ اور اس کام کو تیزی سے توسیع دی۔ اس کے ساتھ ساتھ نظام ریاست کے ذریعہ ان کی شیرازہ بندی کر دی۔ یوں بے سرو سامان مہاجرین انصار سے مل کر ایک مضبوط قوت بن گئے اور یہ قوت برابر نشوونما پاتی چلی گئی۔ دوسرے لفظوں میں انسانی قوت کو اولیت دے کر اسے تیار کیا گیا۔

ضمناً یہاں یہ اہم نکتہ بیان کر دینا نہایت ضروری ہے کہ مکہ کی طرح مدینہ دفاعی لحاظ سے بہت ہی موزوں مقام تھا، قطع نظر اس جغرافیائی پوزیشن کے جو مدینہ کو حاصل تھی کہ شام و عراق کے اہم علاقوں

کے وہ بالکل سامنے تھا۔ عرب کی عظیم ترین تجارتی شاہ راہ کے سرے پر تھا۔ اور سمندر سے صرف ۷۰' ۷۵ میل کے فاصلہ پر تھا۔ خود اس شہر کو قدرتی تحفظات کا ایک مضبوط قلعہ مہیا تھا۔ اور ذرا سی چوکسی' باشندوں کی تنظیم اور دفاع کی مناسب تدابیر اسے مضبوط تر بنا سکتی تھیں۔ شہر تقریباً دس میل لمبے اور دس میل چوڑے میدان میں پھیلا ہوا تھا۔ اور فاصلے فاصلے پر مختلف قبائل کی چھوٹی چھوٹی بستیاں اس وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ قطعہ "جوف مدینہ" کہلایا اور اسی کو "حرم" قرار دیا گیا۔ اس ناہموار میدان کے بیچ میں "سلع" نامی پہاڑ واقع ہے۔ اور دوسری چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ جبل عیر اور جبل ثور نے اسے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ قبائلی بستیوں میں آجام یا آطام کے نام سے مضبوط حفاظتی گڑھیاں موجود تھیں۔ جن کی تعداد ایک وقت میں یک صد بھی رہی ہے۔

"مدینہ النبیؐ" جہاں مسجد النبیؐ اور حجرات نبویؐ تھے اور جو دارالسلطنت تھا وسطی حصے میں واقع تھا۔ اس کے جنوب میں گنجان باغ تھے۔ جنوب مشرق میں قبا اور عوالی کی بستیاں اپنے باغوں سمیت موجود تھیں۔ مشرق میں قبا سے احد تک یہودی محلے شرقاً غرباً پھیلے ہوئے تھے۔ جنوب مغرب میں بھی آبادیوں اور باغوں کا سپتا چھدرا سلسلہ تھا۔ قدیم فصیل مدینہ کے باب الشامی کے پاس بنو ساعدہ (جن کی چوپال میں خلیفہ اول کی نامزدگی ہوئی تھی) رہتے تھے اور ان سے آگے جبل سلع پر بنو حرام کی آبادی تھی۔ شمال مغرب میں وادی العقیق کے کنارے بئر رومہ تک بکثرت باغات تھے۔ جنوب میں بلند پہاڑیاں تھیں۔ اور کٹھن راستہ وادیوں اور گھاٹیوں سے گزرتا تھا۔ مدینہ کے مشرق اور جنوب میں لاوے کے پتھریلے میدان تھے جو نہ جنگی پڑاؤ کے لیے موزوں تھے۔ اور نہ میدان کارزار بننے کے لیے۔ صرف شمال کی جانب سے شہر کا راستہ فوجی لحاظ سے کھلا تھا۔ چنانچہ بدر و احد کی جنگیں لڑنے کے لیے قریش نے وہی سمت پسند کی۔ لیکن مکہ کی فوجوں کا شمال کی طرف سے جا کر حملہ کرنا جنگی لحاظ سے ایسی پیچیدگیاں رکھتا ہے جو مدینہ کے لیے مفید پڑ سکتی ہیں[1]

لیکن مدینہ کے محل وقوع اور اس کی موزوں ترتیب سے فائدہ اٹھانے کا انحصار اس پر تھا کہ اس کی آبادی کو ایک نظم میں پرو دیا جائے۔ اس غرض کے لیے دوسرا بڑا کارنامہ حضورؐ نے یہ سرانجام دیا کہ معاہدات کے ذریعے یہود اور اوس اور خزرج اور دوسرے متعلقہ قبائل کو ان کے مذہبی' تمدنی اور معاشی فروق کے باوجود ایک نظم میں پرو دیا۔ حضورؐ کی سیاسی مہارت کا یہ ایک درخشاں ثبوت ہے کہ ایک شخص بالکل اجنبی ماحول میں جاتا ہے اور وہ متضاد عناصر کو چند ہی ماہ میں ایک سیاسی وحدت بنا دیتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ اس سیاسی وحدت کے تحریری دستور میں نہایت واضح طور پر عدالتی' تشریعی' فوجی اور تنفیذی اختیارات حضورؐ کے ہاتھوں میں دے دیئے جاتے ہیں اور یہ نوشتہ خدا کی حاکمیت کی اصولی روح سے آراستہ ہے۔ اس سیاسی دستاویز میں جملہ شرکا سے یہ منوا لیا گیا کہ عربی قبائل میں جو مشرک اور یہودی

---

[1] عہد نبویؐ کے میدان ہائے جنگ۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص ۲۹۔ ۲۷

شامل ہوں۔ وہ مسلمانوں کے تابع اور جنگ کی صورت میں ان کے معاون ہوں گے۔ نیز یہ کہ وہ قریش مکہ کے جان و مال کو نہ تو خود کوئی امان دیں گے اور نہ مسلمانوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ اس صورت میں ڈالیں گے جب کہ وہ کسی قریشی پر حملہ آور ہوں۔ اس میں یہ بھی منوالیا گیا کہ جنگ و صلح کے معاملات مشترک ہوں گے۔ کوئی جنگ سب کے لیے جنگ ہوگی۔ فوجی خدمت لازمی اور جبری ہوگی۔ البتہ جملہ حلیف اپنے اپنے حصے کے مصارف جنگ خود ادا کریں گے۔ یہودیوں کے ساتھ یہ امر پوری وضاحت سے طے ہو گیا کہ وہ ان سب سے لڑیں گے جن سے مسلمان لڑیں۔ اور وہ ان سب سے صلح کریں گے جن سے مسلمان صلح کریں۔ وہ مدینہ کی مدافعت میں مساویانہ طور پر حصہ لیں گے۔ مسلمانوں پر کوئی حملہ آور ہو تو یہودی مسلمانوں کی مدد کریں گے اور جواباً اگر یہودیوں پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمان ان کی مدد کریں گے۔ [1]

مدینہ کی دستوری دستاویز میں اس سلسلے کی دفعات اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ سرور عالمؐ کے سامنے واضح طور پر قریش کی طرف سے جنگی کارروائی کا اندیشہ تھا اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے سیاسی طور سے پوری پوری پیش بندی کر لی گئی تھی۔

ایک نہایت ہی اہم اقدام مدینہ کو حرم (City of Peace) قرار دینا ہے۔ یہ بہت بڑا فیصلہ بھی اسی دستوری دستاویز میں طے ہو گیا۔ اس کی معنویت مذہبی لحاظ سے یہ تھی کہ پورے ماحول کو ایک تقدس حاصل ہے اور اس ماحول کا احترام اس کے باشندوں کو کرنا ہو گا۔ اس کا سیاسی مفہوم یہ تھا کہ جس طرح قریش ایک حرم میں محفوظ تھے اسی طرح حضورؐ نے ریاست مدینہ کے باشندوں کے لیے تحفظ فراہم کر دیا۔ گویا اب مکہ اور مدینہ کی اس لحاظ سے پوزیشن مساویانہ تھی۔ اور اس میں ایک چیلنج اہل مکہ کے لیے مضمر تھا کہ اگر تم حرم مدینہ کا احترام توڑ کر اس کے باشندوں پر زیادتی کرو گے تو پھر تم بھی حرم مکہ کے حصار تقدس میں محفوظ نہ رہ سکو گے۔

مدینہ کے حدود حرم --- جو اسلامی مرکز حکومت کی حد بندی بھی کرتے تھے' کو مستقل طور پر معین کرنے کے لیے حضورؐ نے خاصا اہتمام کیا اور کعب بن مالک کو مامور فرمایا کہ حرم مدینہ کی بلندیوں پر منارے یا برجیاں (روایت میں اصطلاحی لفظ "علم" آیا ہے) تعمیر کراؤ۔ چنانچہ انہوں نے ذات الجیش (حفیرہ پہاڑی کے ساتھ جو بیدا کے وسط میں ہے اور مکے اور مدینے کے راستے پر ہے) کے ٹیلوں پر' مشیرب (ذات الجیش سے متصل) پر' مخیض کے پہاڑوں پر (شام کے راستہ میں) حفیا (یا حفیہ' مدینہ کے شمال کا جنگل) میں۔ ذوالعشیر کے مقام پر' (جو حفیا کے کنارے واقع ہے) اور تیم پہاڑ پر' (مدینہ کے مشرق میں) جابجا علامتی برجیاں نصب کیں۔ جن کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ یہ نشان زدہ علاقہ تقریباً ایک منزل طویل اور ایک منزل عریض..

---

[1] عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی۔ مقالہ۔ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور۔

ہے۔ ❶

مدینہ کے داخلی نظم کی تاسیس کرنے کے ساتھ ساتھ حضورؐ نے گردو نواح کے قبائل کی طرف فوراً توجہ فرمائی۔ چنانچہ مدینے کے جنوب مغرب کے علاقے اور بحراحمر کے ساحلی حصے کا آپؐ نے متعدد بار دورہ کیا۔ سب سے پہلے آپؐ وَدّان کے مقام پر گئے' جو مکہ کے راستے پر ابواء سے سات میل کی دوری پر واقع ہے۔ وہاں بنی حمزہ سے حلیفانہ تعلق قائم کرلیا۔ اسی طرح ینبوع کے اطراف میں رہنے والے قبائل سے بھی بہت جلد معاہدانہ تعلقات استوار کر لیے۔ اس اہم سیاسی علاقہ میں ۲ھ میں جہینہ کا اور ۲ھ کے اوائل میں بنو ضمرہ' بنو زرعہ' بنو الربعہ اور ۲ھ کے اواخر میں بنو مدلج کا تعاون بھی حاصل ہو گیا۔ بعض کے ساتھ تو مشترکہ دفاعی معاہدات طے پا گئے کہ ان پر حملہ ہو تو مسلمان مدد دیں گے اور مسلمانوں پر حملہ ہو تو وہ امداد کو آئیں گے۔ بعض معاہدوں میں اتنے پر اکتفا کیا گیا کہ حضور ﷺ کے دشمنوں سے دوستانہ تعلقات نہ رکھے جائیں۔ اور بعض میں غیر جانبداری تسلیم کرائی گئی کہ اسلامی ریاست کے ساتھ اگر کسی دشمن کی لڑائی ہو تو معاہد قبیلہ غیر جانب دار رہے گا۔ گویا تدبیر کے دائرے میں حضورؐ کی سیاسی حکمت بہت ہی لچک رکھتی تھی ❷

ظاہر بات ہے کہ اس حلیفانہ فضا نے ان قبائل میں دعوت اسلامی کے راستے کھول دیئے اور تحریک کے علمبردار اور حامی بھی پیدا ہونے لگے۔

بعد ازاں سیاست نبویؐ کی یہ تدبیر ایک مستقل باب بن گئی اور ہر زمانے میں متعدد سفر آپؐ نے اسی غرض سے کئے اور دیدبانی کی مہمات ہوں یا جنگی اقدامات جب بھی آپؐ مدینہ سے نکلے' حلیفانہ تعلقات کو توسیع دینے کا لائحہ عمل ہمیشہ سامنے رہا۔ یہاں ہم تفصیل نہیں دے رہے' اس کا موقع کسی اور باب میں آئے گا۔ دشمن کو کمزور کرنے' اسلامی تحریک کو آگے بڑھانے' اپنی دفاعی سیاست کو مضبوط کرنے اور حدود ریاست کو وسیع کرنے کا ایک نہایت ہی موثر ذریعہ یہی معاہدانہ تعلقات کا پھیلاؤ تھا۔

ان تدابیر کے ساتھ اسلامی انقلاب کے داعی اول اور اس کے رفقاء نے یہ امرواقعہ اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ ہمیں ایک طوفانی سمندر کے درمیان جو ننھا سا جزیرہ پاؤں ٹکانے کے لیے نصیب ہوا ہے اس کا وجود ہر آن معرض خطر میں ہے۔ یا تو طوفانوں کا منہ پھیر کر چو طرفہ سمندر کو مسخر کرنا ہو گا۔ یا پھر یہ جزیرہ بھی ایک بلبلے کی طرح طوفانوں میں گم ہو جائے گا۔ انہوں نے نہایت تیزی سے اپنے آپ کو ایک متحرک جنگی قوت میں بدل لیا۔ یہ ہستیاں بدلتے ہوئے حالات میں تحریک اسلامی کے نت نئے تقاضوں کو اس خوبی

---

❶ عہد نبویؐ کے میدان ہائے جنگ۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص ۱۱-۱۲

❷ عہد نبویؐ کے میدان ہائے جنگ۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص ۱۴-۴۳۔ حدیث دفاع از میجر جنرل محمد اکبر خان ص ۱۳۴۔ تفہیم القرآن از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ج ۲ ص ۱۳۲

سے سمجھتی تھیں کہ نئے مراحل کے لیے فوراً نئی صلاحیتیں اپنے اندر ابھار لیتی تھیں۔ مدینہ میں جب دور جہاد نے ان کو پکارا تو یہ ایک ثانیہ کے لیے بھی اپنی سابق پوزیشن سے نئے موقف پر آتے ہوئے نہیں جھجکے۔ ان میں سے کبھی کسی نے یوں نہیں سوچا کہ ہم تو داعی اور واعظ لوگ ہیں۔ ہمیں بھلا جنگ و پیکار کے ہنگاموں سے کیا واسطہ' یہ تو دنیوی سیاست کاروں اور سلطنتیں فتح کرنے والوں کے مشغلے ہیں اور اصلاح پسندوں کو یہ کہاں زیب دیتے ہیں۔ حکومت و سلطنت اور جنگ و پیکار کی راہ مبلغوں کی راہ کہاں ہو سکتی ہے۔ مبلغوں کا کام تو بس پڑے پڑے مار کھاتے رہنا اور اس حالت میں برداشت کا کمال دکھانا ہوتا ہے۔ اگر مدینہ کی جماعت اسلامی اس طرح سوچتی۔ تحریک کے تقاضوں کی تبدیلی کا شعور نہ پا سکتی' آگے بڑھتے بڑھتے بحث و نزاع میں لگ جاتی' تو چار تنکوں سے تحریک نے جو آشیانہ بنایا تھا' وہ آشیاں سازوں کے جذبات کی اپنی ہی کسی چنگاری سے جل چکا ہوتا۔ اس کے لیے کسی خارجی برق درخشاں کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

یہ مقالی شان کے گنے چنے افراد جہاں اپنے نظریہ صداقت کے سرگرم داعی تھے۔ وہاں یہ اس نظریہ پر قائم ہونے والی ریاست کا دفاع کرنے کے لیے بہترین جانباز سپاہی بھی ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو منظم سپاہ میں بدلنے کے لیے فوری اقدام کیے اور جہاں مدینہ ایک دار الامن' ایک تعلیم گاہ اور تہذیب اسلامی کا ایک چمن زار بن رہا تھا۔ وہیں وہ ایک مضبوط فوجی کیمپ کی حیثیت بھی اختیار کر گیا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی پاک ﷺ کے سرِ آب ایک کمانڈر کی ذمہ داریاں بھی آ پڑی تھیں۔ جن کی انجام دہی انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں آپؐ نے اس خوبی' کمال فن اور حکمت بالغہ کے ساتھ فرمائی کہ تنہا یہ موضوع تصانیف کا ایک دفتر بے پایاں چاہتا ہے۔

طلایہ گردی کا نظام اور اس کے مقاصد:

ریاست مدینہ کے عظمت مآبؐ سربراہ نے ہجرت کے چار چھ ماہ بعد ملحقہ علاقے میں طلایہ گردی کے لیے فوجی دستوں کی ترسیل شروع کر دی۔ معرکہ بدر سے پہلے حسب ذیل دستے روانہ کیے گئے:

۱۔ امیر حمزہؓ بن عبدالمطلب کی سرکردگی میں ۳۰ آدمیوں کا دستہ سیف البحر کی جانب دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کو بھیجا گیا تھا۔ ابوجہل تین سو آدمیوں کے ساتھ مکہ سے نکلا تھا۔ لیکن مسلمانوں کو چوکنا پا کر پلٹ گیا (رمضان ۱ھ)

۲۔ ۶۰ سپاہیوں پر مشتمل جیش رابغ عبیدہؓ بن حارث کی کمان میں اہل مکہ کے فوجی حالات معلوم کرنے کو بھیجا گیا۔ دشمن کے ۲۰۰ آدمی عکرمہ یا ابو سفیان کی سرکردگی میں ثنیۃ المرۃ کے مقام پر موجود پائے گئے۔ گشت لگا کر یہ جیش سلامتی سے واپس آیا۔ (شوال ۱ھ)

۳۔ سعدؓ بن ابی وقاص کی قیادت میں ۸۰ افراد کا جیش طلایہ گردی کے لیے جحفہ تک بھیجا گیا۔ یہ لوگ بغیر کسی واردات کے واپس آ گئے (ذی قعدہ ۱ھ)

۴۔ نبی اکرم ﷺ خود ۷۰ افراد کو لے کر ابواء کے علاقے میں تشریف لے گئے۔ جہاں سے قریشی شاہ راہ تجارت گزرتی تھی۔ حضورؐ عمرو بن فخشی ضمری سے معاہدہ کر کے بغیر کسی تصادم کے واپس آ گئے۔ (صفر ۲ ھ)

۵۔ حضورؐ نے بہ نفس نفیس ۲۰۰ سپاہیوں کو لے کر بواط کی جانب (رضوی پہاڑ کا علاقہ جو ینبوع کے قریب ہے) اقدام کیا۔ راستہ میں امیہ بن خلف کی سرکردگی میں ایک سو افراد پر مشتمل قریش کا قافلہ ملا۔ مگر کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ (ربیع الاول ۲ ھ)

۶۔ کرز بن جابر الفہری نے مدینہ کے مویشیوں پر ڈاکہ ڈالا تو اطلاع ملتے ہی حضور پاکؐ نے ۷۰ سپاہیوں کا دستہ ساتھ لے کر تعاقب کیا۔ کرز اگرچہ بچ کر نکل گیا۔ مگر اس تعاقب سے یہ مفید اثر ضرور پڑا کہ مدینہ بہرحال ایک متحرک قوت ہے (ربیع الاول ۲ ھ)۔

۷۔ حضور ۱۵۰ افراد کا ایک جیش لے کر ذوالعشیرہ (جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ینبوع کے قریب ہے) تشریف لے گئے اور وہاں بنی مدلج اور بنی ضمرہ سے معاہدہ کیا۔ (جمادی الآخر ۲ ھ)

۸۔ عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں ۱۲-۵ افراد کے ساتھ ایک مہم نخلہ کی جانب طلایہ گردی کے لیے بھیجی گئی۔ قریش کے ایک قافلے سے مڈبھیڑ ہو گئی (رجب ۲ ھ)

ان مہمات کی ترسیل تصادم کے لیے نہیں کی جاتی رہی تھی۔ بلکہ نخلہ میں وقتی فضا کے زیر اثر مدینہ کی طے شدہ پالیسی کے خلاف جو تصادم ہوا۔ اسے حضورؐ نے ناپسند (Discourage) فرمایا اور قیدی رہا کر دیئے گئے اور مقتول کا خون بہا ادا کیا گیا۔ ان سے دوسرے بہت ہی بڑے بڑے مقاصد وابستہ تھے۔ یعنی:

ان مہمات کے ذریعے ریاست مدینہ کی سرحدات کی حفاظت کا انتظام رہے اور دشمن کی نقل و حرکت کا اندازہ رہے۔ قریش اور دیگر قبائل کو یہ نئی حقیقت محسوس کرانا بھی مقصود تھا۔ کہ اب یہاں ایک باقاعدہ نظام حکومت موجود ہے اور مدینہ اس کا مرکز ہے۔

مسلم انقلابی جماعت کے رضاکار سپاہی آس پاس کے علاقہ' اس کی بستیوں اس کے نشیب و فراز' اس کے راستوں' اس کے چشموں سے براہ راست واقف ہوں۔

ان کو کمان کرنے' کمان میں رہ کر فرض ادا کرنے' باہم تقسیم کار اور تقسیم اوقات کرنے' تدبیریں سوچنے' وقت کے وقت فیصلے کرنے کی مہارت حاصل ہو جس کے بغیر کوئی دفاعی نظام چل نہیں سکتا۔

قریش کو محسوس ہو جائے کہ اب ان کی معاشی شاہ رگ مدینہ کے پنجے میں آ چکی ہے۔ اور وہ ان کی تجارتی شاہ راہ کو روک کر ان کے کاروانوں کا گزر جب چاہیں بند کر سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ حضورؐ نے بچپن میں بصریٰ اور مدینہ کی طرف اور جوانی میں دوبارہ شام کی جانب جو سفر کیے تھے اس کے دوران میں آپؐ نے مدینہ کی جغرافی اور سیاسی اہمیت سمجھ لی تھی اور قریش کی تجارتی شاہ راہ کے ہر پیچ و خم سے آپؐ واقف تھے۔ اپنی سابق واقفیت کی بنا پر خوف دلانے اور دباؤ ڈالنے کی پالیسی فوراً بنانے میں آپؐ کو کوئی

وقت پیش نہیں آئی۔ دوسری طرف آپؐ نہ صرف قریش کا ایک قریبی فرد ہونے کی بنا پر بلکہ خود تاجر رہ کر اور کاروانوں میں شریک ہو کر قریش کی معیشت کے سب سے بڑے تجارتی ذریعہ سے آگاہ تھے۔ طائف اور یمن و نجران کی تجارتی مہمات کو درکنار رکھ کر دیکھیں تو محض شام و عراق کی شاہ راہ پر تجارتی سفروں سے قریش کو ڈھائی لاکھ اشرفی سالانہ کی آمدنی تھی [1]

ان مہمات کی ترسیل جس تربیتی نقشے کے تحت کی گئی۔ اس میں اہتمام تھا کہ سپاہیوں کو منظم جنگی کارروائی کی مشق ہو' وہ ایک مرکزی کمانڈ کے تحت مشین کے پرزوں کی طرح حرکت کر سکیں' صف بندی کی مشق پیدا کریں' علم اور فوجی رموز و اشارات کا استعمال کرنا سیکھیں' روزہ داری اور نمازوں کی پابندی اور مشکل ترین حالات میں احکام کے مطابق ادائے فرض کر کے جفاکشی کی صلاحیت پیدا کرلیں۔ اسی کے ساتھ آپؐ نے خبر رسانی کا ایک مضبوط نظام قائم کر دیا جس کے بل پر آپؐ مکہ اور گرد و پیش کے قبائل اور اپنے سرحدی علاقے کے حالات سے پوری طرح باخبر رہتے۔ اسی سلسلہ میں آپؐ نے مرکز ریاست کی حفاظت کے لیے دیدبانی اور پہرہ کا انتظام بھی کیا۔

یہ تھے دو طرفہ حالات جن کے زیر اثر قریش نے معرکہ بدر لڑنے کا فیصلہ کیا۔

دو واقعاتی محرکات:

اس میں کیا شک ہے کہ جنگ کے لیے ماحول تیار بہ تیار موجود تھا۔ کرز بن جابر فہری کی ڈاکہ زنی مدینہ کے لیے قطعی طور پر ایک جنگی چیلنج تھی۔ کیونکہ کوئی زندہ و بیدار حکومت اپنی حدود میں غیروں کی ایسی مجرمانہ مداخلت کو جنگ کے ہم معنی سمجھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دوسری طرف نخلہ کا حادثہ ہو گیا۔ جس کی نوعیت اگرچہ ویسی ہی سرحدی جھڑپوں کی تھی جیسی حکومتوں اور جنگی کمانڈروں کی مرضی کے بغیر سپاہیوں کے درمیان ہر دو ملکوں کی سرحدوں پر واقع ہوتی رہتی ہے۔ مگر اہل مکہ کو اس واقعہ کی بنیاد پر مخالفانہ پروپیگنڈا کی مہم چلانے کا سنہری موقع ملا۔ انہوں نے خوب غوغا مچایا کہ لیجیے نئے دین کے علمبرداروں نے ماہ حرام کی حرمت بھی پامال کر دی۔ ادھر حضورؐ نے قیدی چھوڑ دیئے۔ مقتول کا خون بہا ادا کیا اور اپنے آپ کو بہ حیثیت سربراہ حکومت کے اس حادثہ کی ذمہ داری سے بری قرار دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن نے مکہ کے پروپیگنڈے کی دھجیاں یوں بکھیر دیں کہ ماہ حرام میں قتال کوئی اچھی بات نہیں لیکن تمہارا لوگوں کو خدا کے دین سے روکنا' ان کو حرم سے نکالنا اور اصلاح انسانیت کی راہ میں روڑے اٹکانا اس سے زیادہ بڑی برائی ہے۔ اور اس برائی کا قلع قمع کرنے کے لیے مسلمان اگر خنجر قتال کو حرکت میں لائیں تو وہ ایک خدمت انجام دیں گے۔ واقعہ نخلہ کا انفرادی پہلو یہ تھا کہ قریش کی آنکھیں کھل گئیں کہ جن لوگوں کو

---

[1] تفہیم القرآن۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جلد ۲ صفحہ ۱۴۱

انہوں نے بے سرو سامان بنا کر نکالا تھا اور جنہیں وہ خالہ بلی کے منہ کا نوالہ سمجھ رہے تھے۔ وہ ضرورت پڑنے پر اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ تاہم مکہ کی پروپیگنڈا مشینری نے آتش غضب کو بھڑکانے میں واقعہ نخلہ سے خوب فائدہ اٹھایا۔

قریش کی سہ گانہ ضروریات:

مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لیے قریش کے سامنے تین بڑے مسائل تھے۔ ایک بنو کنانہ کے تعاون کا حصول۔ دوسرے جنگجو سپاہیوں کی فراہمی اور تیسرے جنگی مصارف کا بندوبست اول الذکر الجھن کے حل ہونے کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ دوسری ضرورت یوں پوری ہوئی کہ قریش کا معاملہ احابیش سے طے پا گیا۔ مکہ کے قریب حُبشی نام کی ایک پہاڑی ہے۔ جس کے متصل چند قبائل (بنو نضیر' بنو مالک اور ملیحییّن) نے حلیفانہ معاہدہ استوار کیا تھا۔ اور اس سے ان کا نام احابیش پڑا۔ مکہ کے شہریوں کے مقابل میں یہ لوگ جنگجویانہ صلاحیتوں میں بڑھے ہوئے تھے۔ اور حلیفانہ بنیادوں کے علاوہ معاوضے پر بھی لڑائیوں میں کام دیتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ جلدی کی وجہ سے پہلے معرکہ میں عملاً ان کو ساتھ نہ لیا جا سکا۔ اور قریشی سرداروں کو جنگ بدر کا نتیجہ دیکھ کر اس کوتاہی کا افسوس بھی ہوا۔ ادھر بنو مصطلق سے بھی' (جو بارہ ضمنی خانوادوں پر مشتمل تھے) قریش کا معاملہ طے پا گیا۔ [1]

تیسرے مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ قریش کا جو تجارتی قافلہ اپنے موسم پر شام جا رہا تھا' اس کے سامنے مکہ نے اپنا زیادہ سے زیادہ سرمایہ لا کر ڈھیر کر دیا۔ غیر تاجر عورتوں تک نے اپنے زیورات اور اندوختے لا لا کے دیئے۔ خود ابو سفیان کا قول ہے کہ مکہ کے قریشی مرد و زن میں سے کوئی ایسا نہ تھا کہ جس نے اس موقع پر حصہ نہ لیا ہو [2] مدعا یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگا کر زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے۔ اور اس آمدنی کے بل پر جنگی مہم بھیج کر ریاست مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔

قریشی قافلہ تجارت جنگ کا دیباچہ تھا:

ظاہر بات یہ ہے کہ معرکہ کی دوسری تیاریوں کے ساتھ (جن کی اطلاع حضورؐ کو ساتھ کے ساتھ رہتی) اس تدبیر کے اختیار کرنے کے معنے یہ تھے کہ قریش کا یہ قافلۂ تجارت بجائے خود جنگی کارروائی کا دیباچہ تھا۔ یوں کہیے کہ اسلامی تحریک کا گلا کاٹنے کے لیے یہ قافلہ سونے کا خنجر لیے نکلا تھا۔ حالات ایسے ہوں تو کون سی مہذب ترین حکومت آج بھی ملحقہ شاہ راہوں' پانیوں اور فضاؤں سے حریف سلطنت کو سلامتی سے گزر جانے کا موقع دے سکتی ہے۔ ہوائی جہاز مار گرائے جاتے ہیں' بحری جہازوں کو پکڑ لیا جاتا ہے یا

---

1. رحمۃ للعالمین۔ قاضی سلمان منصور پوری جلد ۲ ص ۲۴۳-۲۴۱
2. سیرت النبی ﷺ۔ شبلی نعمانی جلد ۱ ص ۲۴۲

تارپیڈو کر دیا جاتا ہے' سرمائے ضبط کر لیے جاتے ہیں' ڈاک روک دی جاتی ہے' تجارتی مبادلہ ختم ہو جاتا ہے۔ آخر مدینہ ہی کی ریاست کے لیے یہ انوکھا تقاضا کیوں وضع کر لیا گیا ہے کہ اسے حریف کو اپنے سینے پر مونگ دلنے کی کھلی چھٹی دیئے رکھنی چاہیے تھی۔ اور اگر نہیں دی تو اس کی مزاحمتی کارروائیوں کو لوٹ مار کی مہموں کا نام کیوں دیا جاتا ہے؟ جب یہ حقیقت واضح ہے کہ تجارتی شاہ راہ ایسے علاقوں سے گزرتی تھی جو معاہدانہ تعلقات کی بناء پر مدینہ کے زیر نگیں علاقے تھے' تو آخر اسلامی حکومت کیوں اپنے علاقوں سے حریف طاقت کو گزرنے کا موقع دیتی؟

کوئی وجہ نہیں کہ مدینہ میں اس قافلہ پر چھاپہ مارنے کا جو رجحان پایا جاتا تھا اس کے سلسلے میں کچھ بھی معذرت کی جائے۔ اور کسی بھی درجے میں اس کو سیاسی یا دفاعی گناہ تصور کیا جائے۔ اس قافلہ پر ہاتھ ڈالنے کے لیے اگر مسلم طاقت میں کچھ بھی داعیہ موجود تھا تو وہ اپنی جگہ بالکل بجا تھا اور ابو سفیان کو اسی قسم کا اندیشہ ہوا تو نہایت درست ہوا۔ اندیشہ کی اس فضا میں یہ افواہ بھی مدینہ کے کسی اقدام سے قبل شائع ہو گئی کہ قافلہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ادھر ابو سفیان نے شام جاتے ہوئے بھی مدینہ کی فضا کو سونگھنے کی کوشش کی تھی۔ اور واپسی پر وہ بہت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اس نے جائزہ لے کر جب یہ محسوس کر لیا کہ پر اسرار قسم کی نقل و حرکت ہو رہی ہے اور خطرہ بالکل سامنے ہے تو اس نے فوجی امداد طلب کرنے کے لیے اپنا قاصد مکہ دوڑا دیا اور قافلے کا راستہ بدل دیا۔ قاصد نے مکہ پہنچ کر عربوں کے مخصوص اسلوب پر اونٹ کے کان کاٹے' ناک چیری۔ کجاوا الٹا کر دیا۔ قمیض پھاڑ دی' اور روایتی "نذیر عریاں" بن کر دہائی دی کہ قریش کے لوگو! اپنے قافلہ کو محمد (ﷺ) سے بچانے کے لیے نکلو۔ کہیں تمہارے پہنچنے سے قبل اس کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ اس مروج ڈرامائی انداز نے مکہ بھر میں سخت جذباتی ہیجان پیدا کر دیا۔ اور جلد از جلد ایک مضبوط فوج جس کے ساتھ ابو لہب کے علاوہ تمام کے تمام اکابر خود شامل تھے۔ کیل کانٹے سے لیس ہو کر نکل کھڑی ہوئی۔ سرداران فوج کے سامنے قافلہ کو بچا لانے کا محدود مشن ہی نہ تھا۔ بلکہ جس طنطنے سے وہ نکلے تھے وہ خود گواہ ہے کہ وہ مسلم طاقت کو پہلے ہی دور میں کچل کر ہمیشہ کے لیے قصہ پاک کر دینا چاہتے تھے۔

اس موقع پر اگر مسلم طاقت ذرا بھی کمزوری دکھاتی۔ دبک کے بیٹھ رہتی۔ اور کوئی فوجی نقل و حرکت نہ کرتی۔ ابو سفیان اپنا قافلہ بھی اطمینان سے گزار لے جاتا اور قریشی فوج بھی مدینہ کے علاقے میں گھس کر بلکہ مدینہ کے دروازے پر تاریخی دستک دے کر بخیریت واپس چلی جاتی تو پھر اس نو خیز ریاست کی ہوا اکھڑ گئی ہوتی۔ مدینہ کے یہود اور منافق الگ سرکش ہو جاتے۔ آس پاس کے قبائل کی نگاہوں میں وقعت نہ رہتی اور اس حکومت میں اتنا اثر ہی نہ رہتا کہ وہ حلیفانہ تعلقات کو بڑھا سکے بلکہ مٹھی بھر افراد کا اپنے جان' مال اور آبرو کو بچا رکھنا بھی مشکل ہو جاتا۔ کشمکش کرنے والی طاقت کو ایسے مراحل پیش آتے ہیں کہ اپنی قلت تعداد و وسائل اور سنگین مشکلات کے باوجود اسے نہایت جرأت مندی سے حالات کے چیلنج کو

قبول کرنا پڑتا ہے۔ ایسے موقعے کبھی کبھی آتے ہیں اور ان موقعوں پر اگر وقت کا فرض مردانگی سے ادا نہ کر دیا جائے تو اس بری طرح پسپائی ہوتی ہے کہ پھر برسوں میں تلافی نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ کبھی تو وقت سے پیچھے رہ جانا ہمیشہ کے لیے پوری بازی کو چوپٹ کر دیتا ہے۔ ایسے تاریخی موقع ہائے تصادم جب سامنے آجاتے ہیں تو پھر سپاہیوں کی گنتی اور اسلحہ اور رسد کی مقداروں ہی کو سامنے رکھ کر منصوبہ اقدام نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ سوال یہ پیش نظر ہوتا ہے کہ وقت سے پیچھے رہ جانے پر تاریخ کی رو کہیں سروں کے اوپر سے نہ گزر جائے۔ درحقیقت ایسے ہی مواقع پر قیادت کی صلاحیتوں کی جانچ بھی ہو جاتی ہے۔ اور پیروکاروں کی بھی۔ سو مدینہ کو ایسا ہی فیصلہ کن تاریخی موقع درپیش تھا۔ ننھی سی مسلم ریاست اگر کافی قوت رکھتی تو یقیناً اسے نہ قافلے کو بچ کے جانے دینا چاہیے تھا اور نہ قریشی فوج کے چھکے چھڑانے میں کوتاہی کرنی چاہیے تھی۔ مگر بیک وقت دونوں مہمات چونکہ دسترس سے باہر تھیں اس لیے مشیت کا فیصلہ بھی یہی ہوا کہ کوئی ایک ہی بازی (احدی الطائفتین) لی جا سکتی ہے۔ خدا نے یہ چاہا کہ معرکہ ہو تو ایسا کہ جس سے احقاق حق اور ابطال باطل ہو جائے۔ اور کفر کی جڑیں کٹ جائیں۔

محسن انسانیت ﷺ کو اپنے نظام خبر رسانی کے ذریعے قافلے اور فوج دونوں طرف کی اطلاعات مسلسل مل رہی تھیں' آخر آپؐ نے وادی ذفران میں مشاورتی اجتماع طلب کیا۔ اور پوری صورت حالات سامنے رکھ کر جائزہ لینا چاہا کہ آیا جماعت میں ایک بڑی بازی کھیل جانے کا بل بوتہ ہے بھی یا نہیں (1) خود آپؐ عزم رکھتے تھے کہ جو کچھ قوت فراہم ہے اسے زندگی اور موت کی بازی میں لگا دیا جائے۔ حضورؐ نے دونوں امکانات جماعت کے سامنے رکھ دیئے کہ ادھر قافلہ ہے ادھر فوج۔ کس طرف اقدام کیا جائے۔ ایک خاصے

---

(1) ہمارے دور کے سیرت نگاروں میں اس امر میں سخت اختلاف ہے کہ آیا حضورؐ مدینہ ہی میں مہاجرین و انصار کی خصوصی مشاورت کر کے قافلہ کو چھوڑ کر قریشی فوج سے جھڑپ لینے نکلے تھے۔ یا مدینہ سے نکلتے وقت تو قافلہ مد نظر تھا اور بعد میں جب وادی ذفران پہنچ کر قافلہ کے نکل جانے سے نئی صورت حالات سامنے آگئی تو آپؐ نے وہیں ہنگامی مشاورت منعقد کی اور فوج سے معرکہ آرا ہونے کا فیصلہ فرمایا۔ یہ بحث مستشرقین کے اس گھٹیا الزام سے پیدا ہوئی ہے کہ مدینہ کی حکومت (نعوذ باللہ) لوٹ مار کی کارروائیاں کر کے معاشی بحران کا ازالہ کرنے کے درپے تھی۔ چنانچہ تفسیر' حدیث' مغازی اور سیرت کے کثیر دفاتر کے خلاف جا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع ہوئی کہ حضورؐ دستہ لے کر قافلہ کو نشانہ بنانے نہیں نکلے تھے بلکہ مدینہ ہی میں مشاورت ہو کر فوج سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس نقطہ نظر کے سب سے بڑے وکیل مولانا شبلی نعمانی تھے۔ اور انھوں نے قرآن کو اپنے حق میں ناطق قرار دیا۔ لیکن درحقیقت ان کی تعبیر واقعات کے حق میں نہ تو قرآن فی الواقع ایسا ناطق ہے' نہ کثیر التعداد معضبوط روایات کو بالائے طاق رکھا جا سکتا ہے' نہ سلسلہ واقعات ان کی تائید میں ہے اور نہ سرے سے وہ اعتراض ہی درست ہے' جس سے یہ بحث پیدا ہوئی۔ ہم ان شاء اللہ یہ بحث اس کے اصل موقع پر پوری تفصیل سے اٹھائیں گے۔ موخر الذکر نقطہ نظر ہی درست ہے۔

بڑے گروہ نے قافلے کی طرف اقدام کرنے کی تجویز کی حمایت کی اور قرآنی اشارے کے بموجب اس گروہ میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل تھے جو سہل پسندی کا شکار تھے اور جن کے لیے مالی مفاد بھی اہمیت رکھتا تھا۔ آپؐ نے دوبارہ سوال دوہرایا جس کے معنی یہ تھے کہ حضورؐ قافلے والی تجویز کے حق میں نہیں تھے۔ اس اشارہ کو سمجھ کر مہاجرین کی طرف سے حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ اور مقدادؓ بن عمرو نے بھرپور انداز سے تعاون پیش کیا کہ آپؐ حکم الٰہی کے مطابق جدھر بھی اقدام کریں گے ہم ساتھ ہوں گے اور بنی اسرائیل کی طرح یہ کہہ کر بیٹھ نہیں رہیں گے کہ "موسیٰؑ! جاؤ تم اور تمہارا خدا مل کر لڑیں۔ ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے"! حضورؐ نے پھر اپنا سوال دہرایا اور مدعا یہ تھا کہ انصار کا نقطہ نظر سامنے آئے۔ ان سے معاہدہ عقبہ میں صرف اتنی بات طے تھی کہ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ بچاؤ کریں گے۔ وہ اگر حضورؐ کے ساتھ مدینے سے نکلے تھے۔ تو محض قافلے سے تعرض کرنے کے لیے۔ لیکن بعد میں یکایک حالات نے باقاعدہ جنگی معرکہ واجب کر دیا۔ سو اب ان کا عندیہ سامنے آنا چاہیے تھا۔ اس مدعا کو سمجھ کر سعدؓ بن معاذ انصار کی طرف سے بولے اور انہوں نے پورے ایمانی جذبے سے پیش کش کی کہ آپؐ اپنے عزم کے مطابق عمل فرمایئے۔ ہم آپؐ کے ساتھ سمندر میں بھی کودنے کو تیار ہیں۔

بہرحال ۱۲ رمضان ۲ھ کو ریاست مدینہ کا سربراہ کار (صلی اللہ علیہ و سلم) بہ نفس نفیس تین سو سے زائد سپاہیوں کے ساتھ (جن میں ۸۶ مہاجر ۱۷۰ خزرجی اور ۶۱ افراد قبیلہ اوس کے تھے ..... حالانکہ مشہور عام تعداد ۳۱۳ ہے) شہر سے نکلا۔ حضورؐ نے اقدام ایسے حکیمانہ طرز سے کیا کہ زد دونوں طرف پڑتی معلوم ہو۔ ایک نگاہ قافلے کی طرف تھی تاکہ ابوسفیان کو محسوس ہو جائے کہ راستہ پرخار ہے۔ دوسری نگاہ فوج پر تھی۔ یہ معلومات حاصل کرنا بھی اشد ضروری تھا کہ قافلہ کدھر اور فوج کہاں ہے۔ دونوں کے درمیان فاصلہ کس قدر ہے۔ اور دونوں کے مل جانے کا تو امکان نہیں۔ قافلہ پیچھے رکا رہتا ہے یا ساحل کی طرف رخ کرتا ہے۔ تاہم مقام صفراء میں پہنچ کر آپؐ نے بسبس بن عمرو الجہنی اور عدی بن الرغباء کو بدر کی جانب بھیجا کہ قافلے کا پتہ لگائیں۔ اور خود وادی ذفران جا پہنچے۔ اطلاع ملی کہ قافلہ بدر کا راستہ چھوڑ کر ساحل کے لمبے راستے کی طرف نکل گیا ہے۔ اور خاصا دور جا چکا ہے۔ حضورؐ نے اب بدر کا رخ کیا۔

ادھر ابوسفیان نے ساحلی علاقے میں پہنچنے کے بعد اپنے آپ کو محفوظ پا کر قریشی فوج کو پیغام بھیجا کہ اب ہم بچ کر نکل آئے ہیں۔ لہٰذا تم لوگ بھی لوٹ آؤ۔ مگر ابوجہل کے ذہن میں دوسرا ہی سودا سما رہا تھا۔ اس نے بدر جانے کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں پر حملہ کی ٹھان لی۔ قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداروں کو چونکہ قافلہ کے بچاؤ کے لیے ساتھ لیا گیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے واپس چلنے کی تحریک کی۔ ان کی بات نہ سنی گئی تو وہ اپنے آدمیوں کو لے کر لوٹ گئے۔ حکیم بن حزام اور عتبہ نے بھی جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر ابوجہل ان باتوں کو سن کر آگ بگولہ ہو گیا۔ اور اس نے حامیان امن کو سخت طعن و تشنیع کی اور ساتھ ہی واقعہ نخلہ کے مقتول حضرمی کے بھائی عامر کے جذبات کو بھڑکا دیا۔ عامر نے شور مچا کر ایک جذباتی طوفان برپا

کر دیا۔ آخر قریشی فوج بڑے طنطنے کے ساتھ بدر کے کنارے آ پہنچی۔

حضورؐ نے ساتھیوں کے مشورے سے زیادہ بہتر جگہ پر قبضہ کیا اور مناسب جنگی منصوبہ بنا کر محاذ کی ترتیب سوچ لی۔ دشمن کی تعداد اور اہم افراد کے بارے میں تجسس کرایا۔ اور جب نام بنام ہر ایک کا علم ہوا تو رفقاء سے فرمایا' کہ "مکہ نے اپنے جگر پارے تمہارے سامنے لا ڈالے ہیں"۔ دشمن کی ایک ہزار سپاہ جس میں چھ سو زرہ پوش' یک صد سوار شامل تھے۔ جس کے ساتھ اونٹوں کا ہجوم تھا' اسلحہ کی فراوانی تھی' رسد بافراط تھی۔ جانبازوں کی خوشنودی کے لیے شراب کے مٹکے اور گانے کے لیے لونڈیاں حاضر تھیں۔ اس کے مقابل میں تین سو سے کچھ زائد بے سرو سامانوں کو میدان میں اتار دینا محض تہور نہ تھا۔ جنگی قوت تعداد اور اسلحہ کے علاوہ اور بہت سے عناصر پر مشتمل ہوتی ہے۔ حضورؐ خوب جانتے تھے کہ وہ جن سپاہیوں کو تین کے مقابلے میں ایک کے تناسب سے لا رہے ہیں ان میں مظلومی کی روح موجزن ہے ان میں اپنے نظریہ کی صداقت پر زلزلہ افگن ایمان کار فرما ہے۔ وہ تنظیم اور کردار کے لحاظ سے فائق تر ہیں۔ پھر ان پر یہ احساس چھایا ہوا ہے کہ سوال محض ایک جنگ کے جیتنے یا ہارنے کا نہیں بلکہ تحریک کی پوری بازی مار لینے یا گنوا دینے کا ہے۔ ان کا ماضی' حال اور مستقبل سارا کچھ میدان بدر میں سمٹ آیا تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کو خدا کی نصرت پر یقین تھا جو ان کی نگاہ میں اصل فیصلہ کن طاقت تھی۔ اور نصرت الٰہی کے بادل اس لمحے کس شان سے امڈ آئے ہوں گے جب حضورؐ نے گڑگڑا کر بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ اپنے پروردگار کو ان درد بھرے لفظوں میں پکارا ہو گا کہ:

اللھم ھذہ قریش قداقبلت بخیلاء ھا و فخرھا تحادک و تکذب رسولک' اللھم فنصرک الذی وعدتنی! اللھم احنھم الغداۃ!

"اے اللہ! یہ ہیں قریش! یہ اپنے کبر و اعجاب کے نشے میں سرشار ہو کر اس غرض سے آرہے ہیں کہ تیرے بندوں کو تیری اطاعت سے باز رکھیں اور تیرے رسولؐ کو جھٹلائیں۔ پس اے اللہ! اپنی نصرت بھیج جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے۔ اے اللہ! کل ان کو ہلاکت میں ڈال دے!"

اور پھر یہ جملہ کہ "خداوندا! اگر یہ چند جانیں [1] آج ختم ہو گئیں تو پھر قیامت تک تیری عبادت نہ ہو گی"۔ حضورؐ جیسی ہستی جب اپنا کل سرمایۂ تحریک میدان عمل میں رکھ کر ایسی رقت آفریں دعا کا قاصد عرش پر دستک دینے کے لیے بھیجے تو کیوں نہ فرشتوں کی فوجیں اتر پڑیں۔ چنانچہ فتح کی بشارت آگئی۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۶۱۔۲۶۰

معرکہ بدر کا نتیجہ:

وقت کی تاریخ گویا بدر کے چھوٹے سے میدان میں سمٹ آئی تھی اور اس کو حرکت میں رکھنے والی دوگونہ قوتیں اپنے اپنے جذبہ میں پوری طرح سرشار ہو کر آمنے سامنے تھیں۔ ایک طرف آبائی مذہب' قدیم رسم و رواج' اپنی قیادت اور معاشی مفاد کا بچاؤ کرنے کے لیے خون کھول رہا تھا۔ اور دوسری طرف کرنوں کا ایک غول تھا جو مدینہ کے افق سے ظہور کرنے والی صبح نو کو پورے خطہ حیات میں پھیلا دینا چاہتا تھا۔ اور جس کی نگاہ میں جاہلیت کی تاریکیوں کا سینہ چیدنا ایک مقدس فریضہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس معرکہ میں باپ اور بیٹے' چچا اور بھتیجے' بھائی اور بھائی' خسر اور داماد خونی رشتوں کو فراموش کر کے اپنے اپنے تصور حیات کے بچاؤ کے لیے آمنے سامنے آگئے تھے۔ اس موقع پر انصار نے یہ جانتے ہوئے سرکار رسالت مآب ﷺ کا دل و جان سے ساتھ دیا کہ وہ پورے عرب کے تیروں اور تلواروں کی زد پر جا رہے ہیں۔ بڑا کٹھن امتحان تھا جس میں سرخرو ہو کر حضورؐ کے رفقاء نے ثابت کر دیا کہ وہ تحریک اسلامی کے سچے اور بے لوث اور جی دار علمبردار ہیں۔ یہ معرکہ محیر العقول نتیجہ کے اعتبار سے تاریخ انسانی میں اپنی مثال آپ ٹھہرا' کہنا چاہیے کہ ابابیلوں کے ذریعے قدرت نے ایک بار پھر ہاتھیوں کے لشکر کو تس نس کرا دکھایا۔ ۱۷ رمضان کو مقابلہ ہوا۔ اسلامی فوج کے ۲۲ جانبازوں [1] نے اپنی جانیں اپنے نصب العین پر نچھاور کر کے دکھا دیا کہ وہ عظیم ترین سچائی کے اخلاص مند گواہ ہیں۔ لیکن دوسری طرف دشمن کے ستر آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور اپنا کوئی آدمی ان کے ہاتھ میں دیئے بغیر ۷۰ ہی افراد کو جنگی قیدی بنایا۔ نیز مال غنیمت حاصل کیا۔ عظیم درجے کے رؤسائے قریش جن میں شیبہ' عتبہ' ابو جہل' ابوالبختری' زمعہ بن الاسود' عاص بن ہشام' امیہ بن خلف' منبہ بن الحجاج جیسی شخصیتیں شامل تھیں اسلامی تیغ جہاد کا لقمہ ہو گئے۔ ان کی قیادت کی صفیں غارت ہو گئیں۔ قریش کی کمر در حقیقت اسی پہلے معرکے میں ٹوٹ گئی اور ان کا غرور

---

[1] شہداء بدر

(۱) مہجع بن صالح --- حضرت عمرؓ کے آزاد کردہ غلام۔ پہلے شہید۔ آپ نے فرمایا: یومئذ مھجع سید الشہداء "آج کے روز مہجع سردار شہداء ہے"

(۲) عبیدہؓ بن حارث بن مطلب بن عبد کنان --- اسلامی سریہ کے سب سے پہلے سردار

(۳) عمیرؓ بن ابی وقاص (مالک) بن اہیب بن عبد مناف --- سعدؓ بن ابی وقاص کے برادر خورد

(۴) عاقلؓ بن بکیر بن عبدیالیل --- لیثی

(۵) عمیرؓ بن عمیر بن نضلہ --- حلیف بنو زہرہ۔ ذوالشمالین لقب

(۶) عوفؓ یا عوذ بن عفراء --- عفراء والدہ کا نام ہے والد کا نام حارث تھا۔

یہ وہ حواشی ہیں جو نعیم صدیقی صاحب نے اضافہ کیے تھے (علی حیدر)

قوت پامال ہو کر رہ گیا۔ اور اسلامی تحریک یکایک اپنا سر اونچا کر کے مستقبل کے نئے افق دیکھنے کے قابل ہو گئی۔ اسی بناء پر قرآن نے معرکہ بدر کے دن کو "یوم الفرقان" یعنی حق و باطل کو نکھار دینے والی کسوٹی قرار دیا۔ اس معرکے نے درحقیقت فیصلہ کر دیا کہ قریش کے محبوب نظام جاہلیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ اسلام میں سے کس کو زندہ رہنے اور پنپنے کا حق ہے اور کس میں یہ صلاحیت ہے۔ اسی لیے قرآن نے اپنے تبصرہ میں کہا کہ دونوں میں سے اب زندہ اسی کو رہنا ہے جو اپنے زندہ رہنے کے لیے واضح دلیل جواز رکھتی ہو اور عوام کو بھی جس کا دامن تھامنا ہو وہ دلیل کی بنیاد پر تھامیں --- پھر چاہیں تو جاہلیت کی خندق ہلاکت میں گریں اور چاہیں تو اسلام کی زندگی افروز فضاؤں میں پرواز کریں۔

قیدیوں کو چار چار ہزار درہم (بعض امراء سے زیادہ رقوم لی گئیں) فدیہ لے کر واپس کر دیا گیا۔ اس طرح قریش پر ڈھائی لاکھ درہم سے زائد کا مالی بار پڑ گیا۔ اور اس معاشی چوٹ نے ان کی طاقت کو اور بھی مضمحل کر دیا۔ سیاسی حیثیت سے بدر کے اس غیر متوقع (قریش کے نقطہ نظر سے) نتیجے کا اثر یہ ہوا کہ قبائل عرب کی نگاہوں میں اسلامی تحریک اور ریاست مدینہ کا وزن بڑھ گیا۔ اور یہ قوت امید گاہ مستقبل قرار پانے کے قابل ہو گئی۔ چنانچہ (ایک نقطہ نظر کے مطابق) مدینہ کے بعض یہودی قبائل جنگ بدر کے بعد ہی مدینہ کے دستوری معاہدہ میں شریک ہوئے۔ بکثرت باشندگان مدینہ ایمان لائے۔ صحیح معنوں میں اسلام معرکہ بدر

---

(۷) معوذؓ بن عفراء

(۸) حارثؓ یا حارثہ بن سراقہ بن حارث -- ان کی والدہ انس بن مالک کی پھوپھی ہیں۔

(۹) یزیدؓ بن حارث یا حرث بن قیس بن مالک -- مواخاۃ میں ذی الشمالینؓ کا بھائی تھا۔

(۱۰) رافعؓ بن معلی بن لوذان -- انصاری

(۱۱) عمیرؓ بن حمام بن جموح بن زید بن حرام -- حضرت عبیدہؓ نمبر ۲ کے ساتھ مواخاۃ تھی۔

(۱۲) عمارؓ بن زیاد بن سکین بن رافع -- انصاری اشہلی

(۱۳) سعدؓ بن خثیمہ -- انصاری دوسی

(۱۴) مبشرؓ بن عبدالمنذر بن زبیر بن زید --- انصاری اوسی

زرقانی ج ۱ ص ۴۴۳ پر یہ عبارت ہے کہ "استشهد یوم بدر من المسلمین اربعة عشر رجلا" یعنی بدر کے دن مسلمانوں کے چودہ آدمی شہید ہوئے۔

یہ فہرست زرقانی اور الاستیعاب کی متفق علیہ ہے۔

بعض نے ۲۲ تعداد بتائی ہے مجھے ان کے علاوہ سعدؓ بن خولی' صفوانؓ بن بیضاء فہری اور عبداللہؓ بن سعید بن عاصؓ اموی کے نام بھی ملے ہیں۔ اس طرح فہرست کے اسماء کی تعداد ۱۷ ہے۔

(قاضی محمد سلیمان منصور پوری۔ رحمۃ للعالمین ج ۲ ص ۲۲۲۔ ۲۲۳)

کے بعد ہی ایک مسلّمہ عام ریاست بنا۔ کیونکہ اس نے اپنا سیاسی قوت ہونا چیلنج منوا لیا۔

واذکروا اذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس فاٰوٰکم و ایدکم بنصرہ و رزقکم من الطیبت لعلکم تشکرون ○ (الانفال۔ ۲۶)

"اور یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا' تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تم کو مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی۔ اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا تاکہ تم شکر گزار بنو۔"

یہ آیت درحقیقت ہر دور کی اسلامی تحریک کے دو بڑے ادوار کو عیاں کرتی ہے۔ ایک قلت' ضعف اور خوف و خطر کا دور۔ دوسرا جماؤ' مضبوطی' اقتدار' فاتحانہ اقدام اور معاشی فلاح کا دور۔ اسلام میں جیسے پہلا مرحلہ فطری اور لازم ہے ویسے ہی دوسرا مرحلہ بھی طبعی اور واجب ہے۔ اس آغاز کا منطقی انجام یہی ہے۔ لیکن جو تصور اسلام افراد اور اقوام کو مستقلاً اولین حالت میں ڈالے اسی پر قانع کر دے اور آگے کے دور روشن کی طرف کوئی راہ نکال کے نہ دے رہا ہو وہ نبی اکرمؐ کے سکھائے ہوئے اسلام سے کہیں نہ کہیں انحراف کر جانے والا ہو گا۔

اس موقع پر کفار کو بھی نصیحت کے ساتھ چیلنج کیا گیا کہ اگر تم لوگ واضح فیصلہ چاہتے تھے تو لو وہ فیصلہ تمہارے سامنے آ گیا۔ اب باز آ جاؤ۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے' ورنہ اگر تم پھر پلٹ کر اس حماقت کا اعادہ کرو گے۔ تو ہم بھی دوبارہ تمہاری خبر لے ڈالیں گے ----" (الانفال۔ ۱۹) پھر مسلم قوم کی طرف رخ پھیر کر کہا گیا کہ اب کمریں کھول دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اب اُن ہاتھوں کو شل کیے بغیر دم نہ لو جنہوں نے تیغ کارزاری کو بے نیام کر لیا ہے۔ "اب ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے"۔ (انفال۔۳۹) یعنی جنگ اور فتنہ کی جو آگ قریش نے دہکا دی ہے۔ اب اسے پوری طرح بجھائے بغیر کار دین کی تکمیل ہو نہیں سکتی۔

دو قوتوں کا فرق:

معرکہ بدر کو حق تعالیٰ نے جس بنا پر یوم الفرقان (انفال:۴۱) قرار دیا' جس بنا پر کہا کہ جاء کم الفتح (لو! فیصلہ تمہارے سامنے آ گیا۔ الانفال:۱۹) جس بنا پر سورہ آل عمران میں فرمایا کہ "تمہارے لیے نشانی ہے دو لشکروں کے تصادم میں" (آل عمران۔ ۱۳) نیز توجہ دلائی کہ "اس واقعہ میں دیدہ بینا رکھنے والوں کے لیے نصیحت ہے" وہ درحقیقت نظریاتی و اخلاقی فرق ہے جو دونوں طاقتوں کے بالمقابل آنے پر پوری طرح واضح ہو گیا۔ ایک لشکر دنیوی مقاصد و اغراض اور قبائلی و نسلی تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر محض اللہ کی راہ میں نوع انسانی کی عظیم فلاح کے لیے اٹھتا ہے۔ دوسرا لشکر اپنی سرداری' اپنے نسلی غرور' اپنے تجارتی مفاد اور اپنے اندھے جذبات کی خاطر آگے بڑھتا ہے۔ وہ لشکر خدا کے سامنے عاجزی کرتا ہوا' نمازوں اور رکوع و

سجود میں مگن اور رضائے الٰہی پر نگاہیں جمائے میدان میں اترتا ہے۔ یہ لشکر دعوتیں اور ضیافتیں کرتا' شرابوں کے دور چلاتا' موسیقی کی تانوں میں بھکتا اور رقاصاؤں کی بدنی حرکات سے دل بہلاتا سامنے آتا ہے۔ وہ لشکر افراد کی تعداد اور اسلحہ کی کمی کے ساتھ ایمان' وحدت' نظم اور کردار کے لحاظ سے زیادہ اونچی قوتوں سے آراستہ ہے۔ یہ لشکر تعداد میں بڑا اور سامان کے لحاظ سے بھاری ہے مگر اخلاقی قوت کے لحاظ سے نہایت بودا' اور پھر قدرت دونوں کے درمیان فتح و شکست کا انتہائی بیّن فیصلہ کرتی ہے کہ اندھوں کو بھی دکھائی دینے لگے کہ مٹنے والی قوت کون سی ہے اور پھلنے پھولنے والی کون سی؟

یہ فرق بعض واقعات کو سامنے رکھنے سے اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔

ابو حذیفہؓ بن یمان اور ابو حسیلؓ دو مسلم نوجوان اس زمانے میں مکہ سے آئے۔ راستے میں کفار نے روکا کہ ہم تم کو محمد (ﷺ) کی مدد کے لیے نہ جانے دیں گے۔ انہوں نے عدم شرکت کا وعدہ کر کے نجات حاصل کی۔ حضورؐ کی خدمت میں آکر سارا واقعہ سنایا۔ قلت تعداد کے ساتھ یہ نازک موقع جب کہ ایک چیونٹی کی مدد بھی ملتی تو گراں بہا محسوس ہوتی۔ حضورؐ نے فیصلہ فرمایا کہ تم نے جو وعدہ کر لیا ہے' اسے لازماً ایفا کرو' ہماری مدد اللہ تعالیٰ خود فرمائے گا۔ تاریخ کے پاس ایسی زریں مثالیں کتنی ہوں گی؟

کفار مقتولین کی لاشوں کو آپؐ نے گڑھا کھدوا کر دفن کرایا۔ کسی لاش کی بے حرمتی نہیں ہوئی۔

مال غنیمت کے بارے میں عام طریقہ یہ تھا کہ جو کچھ جس کے ہتھے چڑھ گیا وہ اس کا ہوتا اور اس قاعدے کی وجہ سے فتح کے آثار پیدا ہوتے ہی ہڑبونگ اور ہاتھاپائی مچ جاتی۔ لیکن قرآن نے مال غنیمت کا نیا ضابطہ مقرر کیا جس کے لیے اساسی تصور یہ دیا کہ "الانفال لله و للرسول"۔ یعنی مال غنیمت اللہ کا اور رسولؐ کا ہے "(الانفال :۱) اور اس میں تصرف کرنا اور اسے تقسیم کرنا اسلامی حکومت کا کام ہے۔ اس نئے ضابطہ کی بنا پر پورا مال غنیمت پائی پائی اور رتی رتی سالار لشکر کے قدموں میں ڈال دیا جانے لگا۔ اور پھر اس میں سے پانچواں حصہ ریاست کی اجتماعی ضروریات کے لیے روک کر بقیہ کو سپاہ پر تقسیم کیا جاتا۔

جاہلی نظام میں اسیران جنگ فاتح کے رحم و کرم پر ہوتے اور ان پر ظلم توڑے جاتے۔ ان سے بدسلوکی کی جاتی اور ان کو غلامی میں ڈال دیا جاتا ـــــ اور آج کے دور تہذیب میں بھی جنگی قیدیوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ واضح ہے ـــــ لیکن حضورؐ نے جنگی قیدیوں کو نیا مرتبہ دیا۔ ہدایت دی گئی تھی کہ قیدیوں کو نہایت آرام سے رکھا جائے۔ بعض صحابہؓ نے اس کی تعمیل میں خود کھجوریں کھا کر اپنے چارج میں آئے ہوئے قیدیوں کو پیٹ بھر اچھا کھانا کھلایا۔ خود ایک بدری قیدی ابو عزیز (مصعب بن عمیر کے بھائی) کا بیان ہے کہ جن انصاریوں کے ہاں مجھے رکھا گیا تھا وہ خود کھجوروں پر گزر کرتے اور مجھے اچھا کھانا لا کر دیتے۔ اس سلوک کی وجہ سے میں سخت شرمسار ہوتا۔ جن اسیروں کے پاس لباس کم تھا ان کو کپڑے دیئے گئے۔ حضرت عباسؓ کے بدن پر لمبے قد کی وجہ سے کوئی کرتا پورا نہ اترتا تھا۔ اس لیے ان کے لیے عبداللہ بن ابی نے کرتہ بھجوایا۔ اسی احسان کے بدلے میں حضورؐ نے اس کے کفن کے لیے اپنا کرتہ عطا کیا

تھا۔ قیدیوں میں سہیل بن عمرو بھی تھا۔ جو اپنا پورا زور فصاحت حضورؐ کے خلاف تقاریر کرنے میں صرف کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس کے سامنے کے دانت اکھڑوا دیئے جائیں تاکہ آئندہ یہ جوش خطابت نہ دکھا سکے۔ کوئی اور ہوتا تو اپنے ایک بے بس قیدی کے ساتھ بدترین سلوک کرنے میں بھی تامل نہ کرتا۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ اگر میں اس کے کسی حصہ بدن کو بگاڑوں (اصطلاح میں اسے مثلہ کرنا کہتے ہیں) تو میرے نبیؐ ہونے کے باوجود خدا اس کی سزا کے طور پر میرے بھی اسی حصہ بدن کو بگاڑے گا۔

فاتح طاقت بالعموم نشہ پندار میں بدمست ہو کر نہایت غیر سنجیدہ ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں میں ایسے اوچھے پن کی کوئی جھلک نہیں دکھائی دیتی۔ یہاں تک کہ جب ابوجہل کی ہلاکت کی خبر ملتی ہے اور اس کا سر آپؐ کے سامنے لایا جاتا ہے تو اس وقت خدا کی تعریف کے کلمات آپؐ کی زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ مدینہ کی طرف فاتح فوج کا مارچ ہوتا ہے تو اس وقت بھی نہ کوئی بینڈ باجے کا انتظام ہوتا ہے اور نہ مدینہ پہنچ کر کوئی جشن مسرت منایا جاتا ہے۔ فقط ایک جذبہ شکر دلوں پر طاری ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد اس احساس پر ہے کہ یہ فتح اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔

بجائے اس کے کہ مسلم سپاہی اپنے زعم قوت کا شکار ہو جائیں۔ ان کا کمانڈر (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن کی آیات کے آئینے میں ان کو رہی سہی ذہنی و اخلاقی کمزوریوں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کے جنگی کردار پر ناقدانہ تبصرہ کر کے نامطلوب پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔ اس طرح ان میں مزید تعمیر و اصلاح کے لیے تحریک پیدا کی جاتی ہے۔

اس بحث میں اگرچہ گنجائش اتنی نہیں کہ ساری جنگی کارروائیوں پر ایک فصل میں اتنی تفصیل سے کام لیا جائے لیکن ہم نے اولین معرکہ پر اتنی توجہ اس لیے صرف کی ہے کہ قاری اس کے ذریعے وہ نقطہ نظر جان لے جس کے بغیر بعد کے جنگی واقعات کو سمجھنا ممکن نہیں ہے[1] بقیہ جنگوں کی روداد ہم نسبتاً اختصار سے بیان کریں گے۔

معرکہ بدر کے بعد:

معرکہ بدر میں اسلامی ریاست کے ایک مختصر دستہ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اگرچہ قریش کو ایک سبق سکھانے والی شکست دی' لیکن اس کے ساتھ مستقبل میں ایک سلسلہ آویزش

---

[1] جنگ بدر کے متعلق اوپر کی معلومات فراہم کرنے کے لیے حسب ذیل کتب پیش نظر رہیں۔

(۱) تفہیم القرآن۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جلد ۲ سورہ انفال کا دیباچہ اور حواشی (۲) سیرت النبیؐ از علامہ شبلی نعمانی جلد ۱ ص ۲۳۷-۲۹۲ (۳) اصح السیر۔ مولانا عبدالرؤف ص ۱۳۲-۱۲۸ (۴) عہد نبویؐ کے میدان ہائے جنگ۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص ۲۵-۱۴ (۵) حدیث دفاع۔ میجر جنرل محمد اکبر خاں ص ۱۲۵-۱۳۲۔

واجب ہوگیا۔ مکہ کی تلوار کے ایک بار بے نیام ہو جانے کے بعد اب قیام امن بغیر اس کے ممکن نہ رہا کہ اس تلوار کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے اور اسے لہرانے والے ہاتھوں کو شل کر دیا جائے۔ حریف جب زخم کھا لیتا ہے تو پھر اس کا جذبہ انتقام اس سانپ کی طرح پیچ و تاب کھاتا ہے جس کی دم کچل دی گئی ہو۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ اگرچہ قریشی قیادت کی صف سرگرم اور ذی فہم سرداروں سے یکایک خالی ہو گئی تھی' ان کا اقتصادی مستقبل خطرے میں پڑ چکا تھا اور ان کی طاقت کی جو ہوا بندھی چلی آرہی تھی وہ پہلی بار کسی قدر اکھڑنے لگی تھی۔ لیکن تاریخ کا یہ بھی ایک کلیہ ہے کہ مذہبی' سیاسی یا معاشی اقتدار جس کسی کو حاصل ہوتا ہے وہ اسے بچانے کے لیے آخری بازی تک کھیلتا ہے۔ خصوصاً پشت ہا پشت سے جو طبقے اور عناصر سماج پر تسلط پا لیتے ہیں وہ کسی ایسی طاقت کے لیے جیتے جی راستہ نہیں چھوڑ سکتے جس کے فروغ کا لازمی نتیجہ ان کی قیادت کے خاتمہ کی صورت میں رونما ہونے والا ہے۔ وہ دانتوں اور ناخنوں کا پورا زور صرف کر کے آخری سانس تک لڑتے ہیں۔ پس حضورؐ خوب سمجھتے تھے کہ بدر کی فتح اسلامی ریاست کے لیے دفاعی لحاظ سے مستقبل کی کتنی بھاری ذمہ داریاں اپنے ساتھ لے کے آئی ہے۔ حضورؐ کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ قریش اپنے پورے کے پورے مذہبی و سیاسی اثر' اپنے پرانے حلیفانہ تعلقات اور اپنی مکمل معاشی قوت کو کھپا کر بھی اپنے اس جنگی پھریرے کو بلند رکھنے کی کوشش کریں گے جسے لہراتے ہوئے ان کی فوج مکہ سے پہلی بار نکلی تھی۔ یوں گویا تعمیر و اصلاح کے داعی اور سچائی اور انصاف کے علمبردار کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ تعمیری کام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جماعت کی مختصر سی قوت کو ہر آن چوکنا اور نت نئے معرکوں کے لیے تیار رکھے۔ چنانچہ عملاً معرکہ بدر کے بعد پے در پے حضورؐ کو دفاعی اقدامات کرنے پڑے۔

معرکہ بدر سے واپسی کے بعد سات ہی روز گزرے تھے کہ حضورؐ کو فوجی مہم لے کر مدینہ سے ماء الکدر جانا پڑا۔ جہاں سے اطلاع ملی تھی کہ بنی سلیم اور بنی غطفان کے کچھ لوگوں نے جنگی ارادے سے کچھ قوت اکٹھی کی تھی۔ مگر حریف سامنے نہیں آیا اور تین روز پڑاؤ رکھ کر آپؐ واپس آگئے۔ بعد میں پھر ان لوگوں کے جمع ہونے کی خبر آئی تو غالبؓ بن عبداللہ ایک دستہ لے کر گئے' مختصر سی جھڑپ ہوئی اور مفسدین بھاگ گئے۔ حضورؐ جب بدر کی مہم پر مدینہ سے باہر تھے تو پیچھے بنی قینقاع نے معاہدہ توڑ کر بلوہ کر دیا تھا۔ اتنے بڑے واقعہ کو نظر انداز کرنا گویا آئندہ کے لیے مدینہ کو تباہی کے حوالے کرنا تھا۔ اس لیے شوال ۲ھ میں حضورؐ نے ان کے خلاف فوجی طاقت کے ساتھ ایک نوع کی پولیس کارروائی (Police Action) کی اور ان کے حسب خواہش ثالثی کرائی گئی۔ جس کے فیصلے کے بموجب اس عنصر کو حدود مدینہ سے نکال دیا گیا۔

معرکہ بدر کے دو ماہ بعد (ذی الحجہ) ابو سفیان دو سو آدمیوں کے ساتھ مدینہ کے علاقہ میں آیا اور خفیہ طور پر سلام بن مشکم سے مل کر جنگی ساز باز کرنا چاہی۔ مگر کامیابی کی کوئی صورت نہ دیکھ کر مقام عریض میں درختوں کو جلا کر کے اور ایک انصاری کو قتل کر کے فرار ہو گیا۔ حضورؐ تعاقب کرتے ہوئے قرقرة الکدر کے مقام تک گئے۔ مگر غارت گروں کا دستہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ بھاگتے ہوئے ان لوگوں نے بوجھ کم

کرنے کے لیے ستوؤں کے تھیلے گرا دیئے جو اسلامی دستہ کے قبضے میں آئے۔ اسی لیے مہم کا نام غزوہ سویق پڑ گیا۔ ذی الحجہ کا بقیہ مہینہ مدینہ میں گزرا۔ لیکن محرم ۳ ھ میں اطلاع ملی کہ بنو ثعلبہ و بنو محارب حملہ کے لیے مجتمع ہو رہے ہیں۔ مہینے کے آخر میں آپؐ نجد تشریف لے گئے اور تقریباً صفر کا پورا مہینہ اسی علاقے میں گزارا۔ دشمن مقابلے پر نہیں آیا۔ بغیر تصادم کے واپسی ہوئی۔ اثنا وقت آپؐ نے اس غرض سے صرف کیا کہ اس علاقے میں حلیفانہ تعلقات بڑھ جائیں۔ تا کہ قریش ادھر سے تجارتی راستہ اختیار نہ کر سکیں [1]

ربیع الآخر میں قریش کی طرف سے حملہ کا اندیشہ ہوا۔ مدینہ میں ابن ام مکتومؓ کو قائم مقام بنا کر حضورؐ مقابلہ کے لیے بحران [2] کے مقام تک پہنچے اور جمادی الاولیٰ تک سرحدوں کی حفاظت کے لیے فوجی کیمپ ڈالے رکھا۔ بغیر کسی تصادم کے واپسی ہوئی۔ ۳ ھ میں قریش کا ایک تجارتی قافلہ پھر نکلا تو اس کے مجوزہ راستے میں انسداد کے لیے فوجی نقل و حرکت کی گئی۔ زید بن حارثہ جمادی الاخریٰ میں یک صد سپاہ کے ساتھ موقع پر پہنچے۔ قافلہ کا رہنما (گائیڈ) فرات بن حیان گرفتار ہو کر اسلامی جماعت میں شامل ہوا۔ ایک لاکھ درہم کی چاندی قافلہ سے لے کر ضبط کر لی گئی۔

حالات کا یہ تسلسل تھا جو معرکہ احد پر منتج ہوا۔

دوسرا بڑا معرکہ ---- احد:

تاریخ انسانی میں جب بھی کبھی مثبت اور منفی نظریاتی قوتوں کا تصادم ہوتا ہے اور ایک انسانیت کو راستی اور فلاح و ترقی کی راہ پر لے جانے کے لیے اٹھانا چاہتی ہے اور دوسری آبائی نظام کا تحفظ کرنے کے درپے ہوتی ہے تو ایسے تصادم میں بڑا جوش و خروش کام کرتا ہے۔ اسلام اور جاہلیت کی آویزش نے معرکہ احد میں ایسے ہی غیر معمولی جوش و خروش کا سماں دکھایا۔

قریش کو معرکہ بدر میں جو دوسرے ناقابل تلافی نقصان پہنچے تھے' ان کے علاوہ اقتصادی چوٹ سخت کاری لگی تھی۔ ڈھائی لاکھ درہم سے زائد قیدیوں کے فدیہ میں دینے پڑے۔ پھر قافلہ کے لمبے راستے سے گھوم کر آنے کی وجہ سے مصارف بڑھ گئے اور نفع کی مقدار پہلے سے کم رہی۔ اس امر پر مستزاد یہ کہ آئندہ کے لیے نظام تجارت مستقلاً خطرے میں پڑ گیا۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں قریش کے تجارتی قافلہ سے ایک لاکھ درہم کی چاندی مسلمانوں نے ضبط کر لی۔ ہندوستان اور یورپ کے درمیان بین الاقوامی تجارت کی جتنی بھی نقل و حرکت ہوتی تھی وہ یمن و مکہ کے راستے سے ہوتی تھی' قریش مکہ کے واسطے سے ہوتی تھی۔ اور قریش مکہ اپنے معاہداتی نظام کے بل پر خفارے کا انتظام کر کے خاصی بڑی کمائی کرتے

---

[1] اس مہم کو غزوہ ذی امر اور غزوہ انمار کا نام بھی دیا گیا ہے۔

[2] اس کا تلفظ بحران بھی ہے۔ ابن ہشام ج ۲ ص ۳۳۶۔ ۴۲۵

تھے۔ طائف اور دوسرے علاقوں کی تجارتی آمدنی درکنار رکھتے ہوئے محض شامی راہ سے قریش کو ڈھائی لاکھ اشرفی سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ اب مکہ کے سر پر ایک خوفناک اقتصادی بحران منڈلا رہا تھا۔ ان حالات میں بدر کے انتقام کا لاوہ اندر ہی اندر کھولنے لگا۔

نئے معرکہ کے لیے بہت جلد تیاریوں کا آغاز ہو گیا۔ قافلہ شام سے حاصل شدہ مجموعی منافع جنگی فنڈ میں لے لیا گیا۔ عمرو جمحی اور مسافع جیسے نامور شعراء نے اپنے فن لطیف سے پوری طرح کام لے کر جنگ کی آگ بھڑکائی۔ مکہ کی عورتوں نے اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی موت کے جو زخم کھائے تھے ان کی ٹیسوں سے بیتاب ہو ہو کر وہ منتیں مان رہی تھیں کہ آئندہ جنگ میں وہ مسلم شہدا کا خون پئیں گی۔ چنانچہ عملاً فوج کے ساتھ بڑے بڑے گھرانوں کی ممتاز عورتیں میدان جنگ کو روانہ ہوئیں۔ مثلاً ہند (عتبہ کی بیٹی ابو سفیان کی زوجہ اور امیر معاویہ کی ماں) ام حکیم (عکرمہ بن ابوجہل کی زوجہ) فاطمہ (حضرت خالد کی بہن) برزہ (مسعود ثقفی رئیس طائف کی بیٹی) ریطہ (عمرو بن العاص کی زوجہ) خناس (حضرت مصعب بن عمیر کی والدہ وغیرہ)۔

قریش نے اپنی رضاکارانہ سپاہ کو تیار کرنے کے ساتھ ساتھ احابیش کو بھی ساتھ ملایا۔ نیز عمرو بن العاص' عبداللہ بن الزبعری' ہبیرہ بن ابی وہب' مسافع بن عبد مناف اور عمرو بن عبداللہ جمحی کو مختلف عربی قبائل میں' مدینہ کے خلاف ترغیب جنگ دلانے کے لیے روانہ کیا۔ اس طرح خاصی طاقت جمع ہو گئی۔ تین ہزار سپاہ جس میں سات سو زرہ پوش اور دو سو گھوڑ سوار شامل تھے' اپنی جگہ دل دہلا دینے والی طاقت تھی۔ فوجی طاقت کا یہ سیلاب تھا جو سال بھر کی تیاری کے بعد مکہ سے روانہ ہوا' مدینہ کی چراگاہوں میں پہنچا تو اطمینان سے اپنے جانوروں کو سبز چارہ کھلا کھلا کر موٹا کیا اور کئی دن راستے میں گزار کر بدھ کے روز احد پر انہوں نے پڑاؤ ڈالا۔

حضرت عباسؓ دل سے حضورؐ کے وفادار اور اسلامی تحریک کے حامی تھے اور اذن خاص سے مکہ میں تھے تاکہ دشمن کے کیمپ کے اندرونی حالات پر نظر رکھیں۔ انہوں نے تیز رو قاصد دوڑا کر ان تیاریوں کی اطلاع حضورؐ کو پہنچا دی۔ پھر حضورؐ کو اپنے خاص جنگی نظام خبر رسانی کے ذریعے ۵ شوال ۳ ھ کو اطلاع ملی کہ قریشی لشکر مدینہ کے پاس پہنچ گیا ہے اور عریض کی چراگاہ کو اس کے جانوروں نے صاف کر دیا ہے۔ پھر اس کی تعداد اور اس کی قوت کے صحیح اندازے کی رپورٹ بھی پہنچ گئی۔ شہر میں رات کو پہرے کا انتظام فوری طور پر کر دیا گیا۔ صبح کو آپؐ نے مشاورت طلب کی۔ بیشتر مہاجرین اور اکابر انصار نے شہر میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تجویز رکھی۔ لیکن بدر کی شرکت سے محروم رہ جانے والے نوجوانوں نے جوش و خروش سے اس رائے پر زور دیا کہ باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ حضورؐ ہر دو نقطہ ہائے نظر کے سامنے آجانے کے بعد گھر تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر واپس تشریف لائے گویا دوسری تجویز کو آپؐ نے قبول فرما لیا۔ اس سلسلے میں نہ بھولیے کہ عبداللہ بن ابی بھی اول الذکر رائے کا علمبردار تھا اور یہ بات معلوم عام تھی کہ قریشی ساز

باز کے تار اس کی ذات سے آکر جڑتے تھے۔ دوسری بڑی جنگ کے موقع پر قریش نے اس سے قارورہ ملا رکھا تھا۔ حضورؐ نے اسی حقیقت کو جانتے ہوئے کوئی بحث کیے بغیر خاموشی سے نوجوان طبقے کی رائے قبول کر لی۔ جمعہ کے روز جمعہ پڑھ کر آپؐ کی کمان میں ایک ہزار مسلم سپاہ روانہ ہوئی۔ عبداللہ بن ابی بھی ساتھ تھا۔ اپنی پہلی تجویز مسترد ہونے کے بعد اس نے شرانگیزی کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے ایک خاص موقع محاذ جنگ بنانے کے لیے تجویز کیا۔ یہ تجویز بھی جب حضورؐ نے نامنظور کر دی تو وہ فتنہ گر مایوس ہو گیا اور مقام شوط سے تین سو حمایتیوں کو ساتھ لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ اسے شکایت تھی کہ ہماری بات جب نہیں مانی جاتی اور اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ نہیں ہے تو ہم کیوں لڑیں۔ اس منافقانہ حرکت کا برا اثر دوسروں پر بھی پڑا۔ مثلاً بنو سلمہ اور بنو حارثہ بھی دل شکستہ ہو کر واپس جانے لگے۔ لیکن جی دار ہستیوں نے ان کی ہمت بندھائی۔

مدینہ سے باہر جا کر مدینہ میں اترنے سے قبل حضورؐ نے سپاہ کا جائزہ لیا۔ متعدد لڑکے بھی جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر ساتھ چلے تھے۔ ان کو حضورؐ نے واپس جانے کا حکم دیا۔ پھر بھی ہر ایک کی کوشش تھی کہ کسی طرح اسے شریک معرکہ ہونے کا موقع ملے۔ رافع بن خدیج نے ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر اپنے آپ کو لڑائی کا اہل ثابت کیا اور سمرہ نے کشتی میں رافع کو پچھاڑ کر اپنی قوت تسلیم کرائی۔ نئی نسل کا یہ کردار نتیجہ تھا ایک صالح ماحول کی تربیت کا! مسلم خواتین پر اگرچہ جہاد فرض نہ تھا۔ لیکن تحریک کے لیے نہایت ہی نازک صورت حال کو دیکھ کر ان کے جذبات بھی امڈ رہے تھے۔ چنانچہ متعدد خواتین مثلاً حضرت عائشہؓ ام سلیطؓ (ابو سعیدؓ خدری کی والدہ) ام سلیمؓ (حضرت انسؓ کی والدہ) ام عمارہؓ اور بعض دوسری خواتین مسلم فوج کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ اور انہوں نے شاندار خدمات انجام دیں۔ مسلم فوج کی کل سپاہ سات سو تھی جس میں ایک سو افراد زرہ پوش تھے۔ ان کی ایمانی قوت تھی کہ یہ اپنے سے چار گنی اور خوب آراستہ فوج سے ٹکر لینے جا رہے تھے۔

حضورؐ نے کوہ احد کو پشت پر لے کر محاذ کا نہایت بہترین نقشہ ترتیب دیا۔ مصعبؓ بن عمیر کو اسلامی علم تفویض کیا۔ زبیرؓ بن عوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے۔ حضرت حمزہ غیر زرہ پوش سپاہیوں کے کمانڈر بنائے گئے۔ پشت کی طرف جبل عینین (جبل رماۃ) کے درے پر پچاس تیر اندازوں کا دستہ تعینات کیا گیا۔ اور اس دستہ کی قیادت عبداللہؓ بن جبیر کو سونپی گئی۔ قریش نے بھی بدر کے تجربے کی روشنی میں منظم جنگ کے اس نئے طریقے کی تقلید کی جسے اسلامی سپاہ نے اختیار کیا تھا۔ میمنہ' میسرہ' سواروں اور تیر اندازوں کے دستے الگ الگ کمانوں میں ترتیب دیئے گئے۔

جنگ کی تمہید کے طور پر چودہ قریشی عورتوں کی ایک ٹولی نے ہندہ کی قیادت میں دف بجا کر جنگی راگ الاپنا شروع کیا۔ اس نغمہ کی جذباتی تحریک کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکتا ہے:

نحن بنات طارق - نمشی علی النمارق

ان تقبلوا نعانق او تدبروا نفارق

ہم آسمانی ستاروں کی بیٹیاں ہیں اور ہم قالینوں پر خرام کرتی ہیں۔ اگر تم آگے قدم بڑھاؤ گے تو ہم تمہیں گلے لگائیں گے اور پیچھے ہٹو گے تو تم سے الگ ہو جائیں گے۔

ایک طرف یہ شاعرانہ رومانی اور شہوانی اکساہٹ تھی اور دوسری طرف اللہ کی رضا کے علاوہ کوئی چیز باعث تحریک نہ تھی۔

یکایک میدان میں مشہور ابوعامر راہب نمودار ہوتا ہے۔ اور انصار پر اپنے اثر کے زعم میں ان کو پکارتا ہے۔ انصار اس کے زہد کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے جس کا رشتہ قریش کے جاہلی' مشرکانہ اور انتہائی فسد نظام سے جا ملا تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ "او فاسق! ہم تجھے خوب پہچانتے ہیں"۔ انسانی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی کہ اسی ابو عامر کے بیٹے حضرت حنظلہ نے حضورؐ سے والد پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی مگر حضورؐ کے جذبہ رحمت کو یہ پسند نہ آیا کہ بیٹے کی تلوار سے باپ کا خاتمہ ہو۔ اس کے بعد طلحہ کس بل دکھاتا ہوا للکارنے لگا۔ حضرت علیؓ نے بڑھ کر اس کے وجود کو معاً پیوند زمین کر دیا۔ پھر اس کا بیٹا عثمان اس شان سے فخریہ اشعار پڑھتا سامنے آیا کہ اس کے پیچھے عورتوں کا ایک غول رجز گا رہا تھا۔ حضرت حمزہ کی تلوار نے اسے بھی ڈھیر کر دیا۔ بس اب معرکہ عام شروع ہو گیا۔

یوں تو ساری ہی مسلم فوج اپنی قلت تعداد و سامان کی تلافی والہانہ ایمانی جذبے سے کر رہی تھی اور روشن مستقبل کی لہریں قدامت کے ساحل سے خوب ہی ٹکرائیں مگر حضرت حمزہؓ' حضرت علیؓ اور حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہم کی شان جانبازی سب سے بڑھ کر نمایاں تھی۔ آخر جاہلیت پرستوں کے قدم اکھڑ گئے اور ان کی رجز خوان نازنینیں بدحواسی میں بھاگیں تو چھلاووں کی طرح غائب ہو گئیں۔ مسلم سپاہ نے محسوس کیا کہ بس اب بازی تمام ہوئی۔ سو انہوں نے دشمن کو آئندہ کے لیے بے سروسامان کرنے کا مقصد سامنے رکھ کر سامان جنگ اور رسد اور دوسری اشیاء پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ محاذ کا نظام ٹوٹ گیا۔ ہڑبونگ پھیل گئی۔ افراد مرکزی کمانڈ سے بے توجہ ہو گئے۔ اور غضب یہ ہوا کہ نازک ترین عقبی ناکے کو تیر اندازوں کے اس دستے نے بھی چھوڑ دیا جسے تاکید کی گئی تھی کہ وہ فتح و شکست کسی بھی حالت میں وہاں سے مت ٹلے۔ حضورؐ کے یہ الفاظ تھے کہ "اگر تم دیکھو کہ پرندے ہماری بوٹیاں نوچے لیے جا رہے ہیں تو بھی تم اس جگہ سے نہ ٹلنا"۔ اس لغزش کا بڑا خوف ناک خمیازہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ اور جیسے ان کے قدموں کو چومتی ہوئی فتح روٹھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ قریشی فوج میں خالد جیسا زیرک اور بہادر جنگی لیڈر موجود تھا۔ اس نے دور ہی سے پورے محاذ کا سماں دیکھا تو چند سواروں کی معیت میں پہاڑ کے پیچھے سے ہو کر اسی نازک عقبی ناکے سے (جبل عینین) جو خالی پڑا تھا اچانک ہلہ بول دیا۔ اب تو قریشی فوج کے مزید دستے بھی پلٹ کر حملہ آور ہوئے۔ اپنی فتح کے سرور سے مسلمان چونکے تو دیکھا کہ تلواروں کی برق ہائے بے تاب سروں پر

چمک رہی ہیں۔ ادھر دشمن نے حضورؐ پر حملہ کرنے کے لیے ہجوم کر دیا۔ آپؐ دوڑتے ہوئے مسلمانوں کو پکار رہے تھے "الیّٰ عباد اللہ' الیّٰ عباد اللہ!" (خدا کے بندو! ادھر میری طرف آؤ) مگر لوگ بدحواسی میں کچھ سن نہیں رہے تھے۔ ایک نازک لمحہ ایسا آیا کہ صرف گیارہ رفقاء آپؐ کے گرد رہ گئے۔ موقعہ پا کر عبداللہ بن قمیہ نے چہرہ مبارک پر تلوار ماری جس سے مغفر کی کڑیاں ٹوٹ کر جبڑے میں گڑ گئیں۔ ایک بار دشمن کے ہجوم کی وجہ سے آپ گڑھے میں گر گئے اور کچھ چوٹیں بھی آئیں۔ لیکن مٹھی بھر رفقاء نے دور نو کے اس آسمانی نقیب کا بچاؤ کرنے میں جس کا وجود تحریک اسلامی کی روح رواں تھا ایسی فداکاری کا مظاہرہ کیا کہ اس کی مشکل ہی سے کوئی مثال تاریخ کے دوسرے ابواب میں مل سکتی ہے۔ حضورؐ کا اس محشر انگیز لمحے میں جمے کھڑے رہنا بلکہ چوکس رہتے ہوئے مدافعت کرنا اور ابی بن خلف کی گردن پر اپنے حربے سے خود زخم لگانا غیر معمولی شجاعت کا ثبوت ہیں۔ تاہم اس موقع پر حضورؐ کے زخمی ہونے اور گڑھے میں گر کر نگاہوں سے اوجھل ہونے' اور پھر آپؐ کے ہم شباہت مصعب بن عمیر کے شہید ہو جانے کی بناء پر مخالفین نے حضورؐ کی وفات کا غل مچا دیا۔ اس سے مسلمانوں میں اور زیادہ پریشانی پھیل گئی۔ اس غلغلہ کا ردعمل دوگونہ ہوا۔ حضرت عمرؓ نے ہتھیار پھینک کر کہا کہ "اب لڑ کے کیا لینا جب کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی شہید ہو گئے۔" ان پر حضورؐ کی محبت کا اتنا غلبہ تھا کہ ان کی نگاہ میں اس سب سے قیمتی متاع کو کھو دینے کے بعد بڑی سے بڑی فتح بھی فتح نہ تھی۔ ابن نضر (حضرت انس انصاریؓ کے چچا) نے یہ سنا تو کہا۔ "رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے"۔ اور پھر اس بے جگری سے لڑے کہ چند ہی لمحوں میں اسی (۸۰) سے زیادہ زخموں کی لذت سمیٹ کر شہادت کا پیالہ لبوں سے لگا لیا۔ بہرحال اس پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں مسلمان مسلمانوں کی زد پر آئے یہاں تک کہ حضرت حذیفہؓ کے والد اپنے ہی رفیقوں کی تلواروں سے شہید ہو گئے۔

پھر حالت پلٹنا شروع ہوئی۔ ہر مسلم سپاہی اپنی اپنی جگہ تلواروں میں گھرا تھا اور حضورؐ کو دیکھنے کے لیے بے تاب۔ سب سے پہلے کعب بن مالک نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا۔ اور پکار کر کہا کہ "مسلمانو! یہ رہے خدا کے رسولؐ"! پھر جوں جوں یہ مژدہ جانفزا پھیلتا گیا۔ مسلم سپاہ میں نئی روح دوڑنے لگی۔ جانباز ہر طرف سے مرکز کی طرف سمٹتے گئے۔ دشمنوں کا ہجوم کم ہونے لگا۔ تو حضورؐ پہاڑ کی چوٹی پر چلے گئے' ابوسفیان نے ادھر کا رخ کیا تو صحابہ نے بلندی سے پتھر برسا کر اسے لوٹا دیا۔ اب دشمن کو اندیشہ ہوا کہ اسے جو اتفاقی غلبہ حاصل ہو چکا ہے' کہیں وہ ہاتھ سے جاتا نہ رہے لہٰذا کفی فوج کے دستے بھی سمٹنے لگے۔

ابوسفیان نے مقابل کی ایک پہاڑی پر چڑھ کر حضورؐ کے متعلق یقینی معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ آخر اس نے بلند آواز سے حضورؐ اور ابوبکرؓ اور عمرؓ کے نام لے کر پکارا کہ کوئی ہے۔ ادھر سے مصلحتاً کوئی جواب نہ دیا گیا تو کہنے لگا۔ "سب مارے گئے"۔ حضرت عمرؓ تڑپ کر بول اٹھے: "او خدا کے دشمن! ہم سب زندہ و سلامت ہیں"۔ ابوسفیان نے نعرہ لگایا۔

"اے ہبل! تو سربلند رہے"۔

جواب ملا:

"اللہ ہی کی ذات بلند و برتر ہے"۔

ابو سفیان نے پھر ہانک لگائی:

"ہمارے ساتھ عزیٰ ہے! تمہارے ساتھ عزیٰ نہیں"۔

ادھر سے پکارا گیا:

"اللہ ہمارا آقا ہے، تمہارا کوئی آقا نہیں"!

دراصل ان مختصر نعروں میں وہ دو نظریات بول رہے تھے جن کے ٹکراؤ نے تاریخ میں یہ سارا مد و جزر پیدا کیا تھا۔

اس معرکہ میں ۷۰ مسلمان شہید ہوئے اور ۴۰ زخمی۔ دوسری طرف مخالف فوج کے صرف ۳۰ آدمی موت کے گھاٹ اتارے جا سکے۔ حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ جیسا بہادر جرنیل اور آپؐ کے پھوپھیرے بھائی عبداللہؓ بن جحش، ذی مرتبت صحابیوں میں سے مصعبؓ بن عمیر، حنظلہؓ بن ابی عامر، رافعؓ بن مالک بن عجلان (ہر سہ بیعت ہائے عقبہ میں شریک ہوئے) عبداللہؓ بن عمرو خزرجی۔ عمروؓ بن جموح اور متعدد بدری صحابی دنیا کی عظیم ترین سچائی کے شجر طیبہ کو اپنے خون سے سیراب کر گئے۔

بہرحال جونہی مسلم فوج اپنے آپے میں آئی اور ہائی کمانڈ سے اس کا تعلق جڑا، انقلاب دشمن طاقت جلد جلد پیچھے ہٹ کر میدان جنگ سے کوچ کر گئی۔ اس طرح اتفاقی فتح کے پردے میں چھپی ہوئی کمزوری کا پول کھل گیا اور مسلم فوج نے ایک بار پھر اپنا وزن محسوس کیا۔

مسلمانوں نے اپنی ایک لغزش کے سبب نقصان ضرور اٹھایا تھا۔ لیکن نہ وہ شکست خوردہ تھے اور نہ ان کی قوت نے کوئی خم کھایا تھا۔ چنانچہ حضورؐ کے ارشاد سے ستر آدمیوں کا ایک دستہ قریشی فوج کے تعاقب کو نکلا۔ ادھر ابو سفیان نے روحاء کے مقام پر پہنچ کر جب صورت حالات کا جائزہ لیا تو اسے سخت پشیمانی ہوئی کہ احد کی حاصل شدہ فتح کا طرہ تو وہ جلدی میں میدان احد ہی میں چھوڑ آیا ہے اور مدینہ کی قوت کو چکنا چور کرنے کا کام ناتمام رہ گیا ہے۔ اب اسے تلافی مافات کی فکر ہوئی مگر بعد از وقت۔ یہ گویا مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید کی صورت تھی۔ حضورؐ کو پہلے سے اس کا اندیشہ تھا۔ آپؐ مدینہ واپس جانے کے بجائے اپنی پوری فوج ساتھ لے کر مدینہ سے ۸ میل دور مقام حمراء الاسد تک جا پہنچے اسی اثناء میں قبیلہ خزاعہ (جو اسلام نہیں لایا تھا مگر اسلامی حکومت کا دل سے حمایتی تھا)۔ [illegible] معبد نے ابو سفیان کو بذات خود جا کر خوف دلایا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بہت بڑی قوت کے ساتھ آ رہے ہیں"۔ اس خبر سے ہراساں ہو کر ابو سفیان رخصت ہو گیا۔

معرکہ احد کے چند خاص پہلو:

اب ہم اس معرکہ کے خاص خاص قابل غور پہلوؤں پر ایک اجمالی نگاہ ڈالتے ہیں۔

(۱) نظم اور ڈسپلن تحریکوں کی اصل طاقت ہوتا ہے اور پھر ہر قسم کے مقابلوں میں اس کی اہمیت اساسی ہے۔ اور نظم اور ڈسپلن کی بنیاد اس اخلاقی صفت پر استوار ہوتی ہے جس کا نام صبر ہے۔ یعنی اپنے اوپر اتنا قابو ہونا کہ خوف و نقصان اور مفادات کے مقابلے میں ثبات اور جماؤ برقرار رہے۔ اسلامی جماعت چونکہ زیر تربیت تھی' اور خصوصاً میدان جنگ کا اسلامی کردار مضبوط کرنے کے لیے ابھی تک تجربہ وسیع نہیں ہوا تھا' کیونکہ احد سے پہلے ایک ہی معرکہ پیش آیا تھا اس لیے لغزش ہو گئی۔ کوئی بھی انسانی جماعت کسی نظریے پر نیا کردار تعمیر کرتے ہوئے لغزشوں سے بالکل محفوظ رہ کر کمال حاصل نہیں کر سکتی۔ لیکن اس ذرا سی لغزش پر مشیت نے جماعت کو ایسا واقعاتی سبق دیا کہ جو محض وعظ و نصیحت سے کبھی دلوں میں اتر نہ سکتا۔ اس سبق نے یہ نکتہ بھی کھول کے سمجھا دیا کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین نہایت بے لاگ طریقے سے کام کرتے ہیں اور اگر ان کو توڑا جائے تو بہترین انسان بھی عقوبت سے بچ نہیں سکتے۔

پھر اس معرکہ پر قرآن نے مفصل تبصرہ کرتے ہوئے ان کمزوریوں پر شدید گرفت کی جو ابھی تک جماعت میں کام کر رہی تھیں۔ ان کو صبر پر کاربند ہونے کی تلقین کی (آل عمران۔ ۱۲۵) [1] ان کو مال و دولت کی اس اندھی ہوس سے اجتناب کی نصیحت کی جو سود خواری کا اصل سبب تھی اور جس نے میدان جنگ میں مال غنیمت حاصل کرنے کا اضطراب پیدا کر دیا۔ ان کو اشارۃً سمجھایا کہ سود خورانہ ذہنیت کے ساتھ نہ صبر قائم رکھا جا سکتا ہے نہ ضبط و نظم کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور نہ کسی اعلیٰ نصب العین کے لیے تاریخی معرکے لڑے جا سکتے ہیں۔ اس نفسیاتی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر سود خواری کو حرام کر دیا۔ (آل عمران۔ ۱۳۰) [2] ان کو بتایا کہ اسلامی انقلاب کی علمبرداری تو ایسے لوگ کر سکتے ہیں جو سود کی کمائیاں سمیٹنے اور مال و دولت کی ہوس میں پڑنے کے بجائے الٹا اپنے مال مقصد کے لیے خرچ کرنے والے ہوں اور جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے ان پر قابو رکھتے ہوں (آل عمران۔ ۱۳۴) [3] یہ بھی سنا دیا

---

[1] بے شک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اسی آن تمہارا رب (تین ہزار) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ (آل عمران ۔ ۱۲۵)

[2] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' یہ بڑھتا چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو۔ امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ (آل عمران۔ ۱۳۰)

[3] جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں' خواہ بدحال ہوں یا خوش حال۔ جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسرے کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔ (آل عمران ۔ ۱۳۴)

کہ جو کوئی دنیوی مفاد حاصل کرنے کے درپے ہو گا اس کو جو کچھ یہاں مل گیا' سو مل گیا' آخرت میں اس کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور جو کوئی دنیوی مفاد کا نقصان گوارا کر کے اپنی عاقبت بنانا چاہے اس کی کارگزاری کی قدر کی جائے گی (آل عمران۔۱۴۵)۔ ساتھ ہی ان کو تاکید کی کہ ایک چوٹ کھا کر دل شکستہ اور اندوہگیں نہ ہو۔ تم کو آج اگر یہ چوٹ آئی ہے۔ تو کل دشمن کو تمہارے ہاتھوں کاری زخم لگ چکے ہیں۔ کسی بھی کشمکش اور تصادم کے دوران میں اتار چڑھاؤ کے دور تو آتے ہی رہتے ہیں۔ یقین رکھو کہ آخر کار تم ہی کو غلبہ ملنا ہے (آل عمران ۴۰۔۱۳۹)۔ پھر ان کو صاف صاف آگاہ کر دیا کہ اللہ کی رضا اور اس کی جنت کوئی سستا مال نہیں ہے۔ اس سعادت کو وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو خدا کی راہ حق میں جانیں لڑانے والے اور صبر و ثبات کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔ یہی کٹھن آزمائشیں چھانٹ چھانٹ کر ان لوگوں کو نمایاں کرتی ہیں جو سچے ایمان سے مالا مال ہوں اور سچائی کے گواہ بننے کے قابل ہوں (آل عمران۔ ۱۴۰ تا ۱۴۲)۔ ان کے اس مایوسانہ ردّ عمل پر گرفت کی گئی جو رسولؐ خدا کی سچی محبت کی وجہ سے نمودار ہوا تھا۔ صاف صاف کہا گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا نہیں ہیں۔ ایک رسول ہیں اور جیسے پہلے رسول وفات پا گئے' ان کو بھی ایک نہ ایک دن تم سے جدا ہو جانا ہے۔ پھر یہ کیوں کر درست ہو گا کہ ان کے اٹھ جانے پر تم تحریک حق کی ساری بساط لپیٹ کے رکھ دو اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہو (آل عمران۔ ۱۴۴)۔ تمہیں ان خدا پرستوں کا نمونہ سامنے رکھنا چاہیے جنھوں نے سابق تاریخ میں انبیاءؑ کے ساتھ ہو کر جانیں دیں اور باطل کے سامنے سرنگوں ہونے پر تیار نہیں ہوئے۔ اللہ ایسے ہی صبر کیش لوگوں کو پسند کرتا ہے (آل عمران۔ ۱۴۶)۔ ان اصولی تلقینات کے ساتھ قرآن نے مسلم فوج کی اس حالت کا عبرت انگیز نقشہ جماعت کے سامنے کھینچ کر رکھ دیا۔ جو نظم توڑ دینے کی وجہ سے پیش آئی۔ تفہیم القرآن کے ترجمہ کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔

> "اللہ نے تائید و نصرت کا جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا تو جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مال غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا۔ تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا۔ کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔"

> "یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے' کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا اور رسولؐ تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لیے تمہیں سبق ملے اور جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر

ہے"۔ (آل عمران۔ ۵۳۔۱۵۲)

اس تبصرے کو دیکھیے جو حضورؐ کی زبان سے معرکہ احد میں اسلامی فوج کے کردار پر ہو رہا تھا اور پھر اندازہ کیجئے کہ دنیا کے جنگجو حکمرانوں سے اس کا مزاج کتنا مختلف ہے۔ نہ سپاہیوں کے من پر چانے کا اہتمام' نہ انہیں خود فریبی میں ڈالنے کی تدبیر' نہ واقعات کی غلط تعبیر کرنے کی کوشش۔ یہ ایک بے لاگ کڑی تنقید تھی' جس میں خدا پرستی کی روح رچی بسی تھی۔ اور جس کا مقصود اخلاقی تربیت ہے۔

(۲) اس معرکہ میں حضورؐ کے مٹھی بھر رفقاء نے جس سرفروشانہ محبت اور والہانہ فداکاری کا مظاہرہ کیا اس کا تصور بھی رہتی دنیا تک عالم اسلام کو اپنی روح مقدس سے مالا مال کرتا رہے گا۔ دراصل کوئی بھی تحریک ہو' اس کے داعی اول اور اس کے قائد اعلیٰ کی شخصیت بہرحال اس کی ایک اہم قوت ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی تحریک میں تو داعی اور قائد کے لیے گہری محبت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ خصوصاً اس منصب پر جب رسول و نبیؐ کی ہستی رونق افروز ہو تو اس کے لیے انتہائی فداکاری لازم ہے۔ اسلامی تحریک کسی طرح بھی اپنے داعی و قائد کو ایک طرف ڈال کر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ تحریک اور اس کے داعی دونوں کی قوت' عزت اور دائرہ اثر کی وسعت بالکل مشترک ہو جاتی ہے۔ وہ جماعت بہت ہی اندھی جماعت ہو سکتی ہے جو داعی و قائد کو نظرانداز کر کے اور اس کو بے وقعت بنا کر یا محض "یکے از منا" قرار دے کر تحریک کے مجرد اصولوں کو غالب کرنے جانا چاہے۔ تحریکوں کے لیے اصول اور قیادت دونوں ایسے لازم و ملزوم عنصر ہیں کہ اصولوں پر محکم ایمان اور قیادت کے لیے گہری محبت و فداکاری ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ حضورؐ کے رفقاء آپ کی ہستی پر رسول ہونے کی حیثیت سے بھی پروانہ وار فدا ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف یہ شعور رکھنے کی وجہ سے بھی کہ آپ کا وجود تحریک کی جان ہے' آپ کی زندگی کے تحفظ' آپؐ کی عزت کی بلندی اور آپؐ کے اثر و رسوخ کی توسیع کے لیے جانیں نثار کرتے تھے۔ حضورؐ کی سچی محبت کے لازوال نقوش انہوں نے میدان احد کے قرطاس پر ثبت کئے ہیں۔

دشمن کے دَل کے دَل نے جب ہجوم کیا تو سرور عالم ﷺ کی صدا گونجی۔ "کون مجھ پر جان قربان کرتا ہے"۔ زیاد بن سکن چند انصاریوں کے ساتھ بڑھے اور یکے بعد دیگرے سات عشاق نے اپنے آپ کو نثار کر دیا۔ ان میں ایک زیاد تھے جن کو نیم جان حالت میں لایا گیا تو آخری قوت سے کام لے کر انہوں نے اپنا سر آگے بڑھا کر حضورؐ کے قدموں سے مس کرایا۔ عبداللہ بن قمیہ نے جب تلوار کا وار کیا تو ام عمارہ لپک کر حضورؐ کے سامنے آگئیں اور بہت گہرا زخم کندھے پر لیا۔ انہی کے حائل ہونے کی وجہ سے یہ وار حضورؐ کے حق میں اوچھا ہو گیا۔ ابودجانہ نے آپؐ کو اپنے جسم سے ڈھانپ لیا اور اپنی پیٹھ کو سپر بنا دیا جس پر کتنے ہی تیر آ آ کے پیوست ہو گئے۔ طلحہ نے دشمن کی تلواریں ہاتھوں پر روکیں اور ان کا ایک ہاتھ کٹ کر گر گیا۔ ابو طلحہؓ حضورؐ کے سامنے سپر لیے کھڑے رہے اور ساتھ ہی اس جوش سے ناوک اندازی کی کہ دو تین کمانیں ٹوٹ گئیں۔ ایک سیدھا سادہ مسلمان کھجوریں کھاتے کھاتے اتفاقاً آ پہنچا۔ یہ عالم دیکھ کر اس کے

اندر بھی جذبہ شوق اٹھ آیا۔ حضورؐ سے پوچھا کہ میں اگر لڑ کر قربان ہو جاؤں تو میرا انجام کیسا ہو گا۔ فرمایا۔ "جنت" کہنے لگا "اچھا! اگر میں نے ان کھجوروں کو کھانے کی مہلت پالی تو بڑی عمر پائی" وہ ایک دم ٹوٹ پڑا اور زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ شہادت گہِ عشق میں کشتگانِ خنجرِ تسلیم میں شامل ہو گیا۔ جس تحریک میں ایسا ایثار محبت کام کر رہا ہو اس کی موجوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ پھر ایک نمونہ تھا جو سعد بن ربیع نے پیش کیا حضورؐ چونکہ خود بھی اپنے رفیقوں سے گہری محبت و شفقت رکھتے تھے اور ہر ایک پر آپؐ کی نگاہ توجہ رہتی تھی۔ اس لیے جنگ کے خاتمے پر ایک ایک کی تحقیق حال فرمائی۔ اس سلسلہ میں پوچھا کہ سعد بن ربیع کہاں ہیں؟ تلاش کیا گیا تو ایک طرف جسد جاں بلب پڑا تھا۔ آخری لمحے حضورؐ کے لیے سلام شوق اور دعائے محبت کا ہدیہ بھیجنا نیز ساتھیوں کو بطور وصیت پیغام دیا کہ اگر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ و سلم) تک دشمن کا ہاتھ پہنچ گیا اور تم میں سے ایک آنکھ بھی دیکھنے والی موجود ہوئی تو پھر بارگاہ الٰہی میں تمہاری کوتاہی کا کوئی عذر نہ سنا جائے گا۔ نہ اپنے کرب کا خیال، نہ اعزہ و اقربا کی فکر، نہ مال و جائداد کے مستقبل پر کوئی کاوش ..... لے دے کے خیال ہے تو نصب العین کا اور اس کے داعی کا۔

(۳) مکہ کی انقلاب دشمن فوج نے اپنے گھناؤنے جذبات کا مظاہرہ یوں کیا کہ مسلم شہدا کی لاشوں کی بے حرمتی کی۔ خصوصاً ان کی خواتین نے اپنی منتوں کو پورا کرنے کے لیے لاشوں کے پیٹ پھاڑے اور ان کے ناک کان کاٹ کر ہار بنا بنا کے گلوں میں ڈالے۔ "ہند" زوجہ ابو سفیان جو زنانے دستے کی سربراہ تھی۔ اس نے شان درندگی کا افسوس ناک نمونہ پیش کیا۔ اور حضرت حمزہؓ کا چہرہ بگاڑا اور پیٹ چاک کر کے ان کا کلیجہ نکال کے چبایا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن جحش کا مثلہ کیا گیا۔ خود ابو سفیان کی یہ حرکت دیکھئے کہ وہ حضرت حمزہ کے دہن مبارک پر کمان سے مار مار کر کہتا دیکھا گیا کہ لو اب مزہ چکھو۔ لیکن دوسری طرف حضورؐ نے مسلم فوج کو سختی سے باز رکھا کہ وہ دشمن کی لاشوں کا مثلہ کریں یا ان کی بے حرمتی کے مرتکب ہوں۔ اسلامی تحریک کے اصولوں میں انسانیت کا احترام شامل تھا۔ اور وہ اپنے علمبرداروں کو یہ اذن نہیں دیتی تھی کہ دوسرے اگر پستی میں گریں تو جواباً مسلمان بھی پستی میں گر سکتے ہیں۔

ابو سفیان کو جب اپنے لوگوں کے اس کرتوت کی خبر ملی تو اس نے خوشی سے اس کا خیر مقدم کیا مگر ایک ساتھی کے گرفت کرنے پر اسے متنبہ ہوا کہ ایسی ذمہ داری لے کر کہیں کوئی جوابی کارروائی نہ بھگتنی پڑے۔ نیز رائے عامہ کے دائرے میں اپنا اثر اور نہ گر جائے۔ ابو سفیان جب آخر وقت میں پہاڑی پر آیا تھا تو اسی احساس کے تحت اس نے اعلان کیا کہ "یہ واقعات میری مرضی سے نہیں ہوئے"۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ گیا کہ "ان کے ہونے پر میں رنجیدہ بھی نہیں ہوں"۔

آج اندازہ کرنا مشکل ہے کہ انقلاب دشمن قوت کی اس کمینہ حرکت نے اس کے عوامی اثر میں کتنی کمی کی ہو گی۔ البتہ ایک واقعہ سامنے ہے کہ ابو سفیان کو حضرت حمزہؓ کے چہرے پر کمان مارتے دیکھ کر جلیس بن زبان کنانی نے اپنی قوم سے کہا کہ اے بنی کنانہ! قریش کے بڑے سردار کو دیکھتے ہو یہ اپنے ابن عم

کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے؟ اس پر ابو سفیان چونکا۔

(۴) حضورؐ اپنی جماعت کو میدان جنگ کا جو پاکیزہ اخلاق سکھا رہے تھے اس کی ایک جھلک اس واقعہ میں دیکھی جا سکتی ہے کہ ابو دجانہ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے بڑھے تو ہند ان کے سامنے آگئیں۔ ہند اگرچہ میدان میں شریک جنگ تھی اور مسلمانوں کے خلاف اس کے جذبات نہایت زہریلے تھے۔ لیکن ابو دجانہ نے اس کے سر پر تلوار تان دینے کے بعد اس احساس سے چونک کر روک لی' کہ رسولؐ اللہ کی عطا کردہ تلوار کے شایان شان نہیں کہ اس سے کسی عورت کی جان لی جائے۔ کتنا زریں واقعہ ہے۔

(۵) مسلم خواتین نے معرکہ احد کے سلسلے میں جس ایمان' شجاعت' صبر اور تحریک کی وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ کی تحریک نے اس صنف کو حالت جمود میں پڑا نہیں رہنے دیا بلکہ اسے متحرک کیا۔ اس کی تربیت کی اور اس سے خدمات لیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہم نے اوپر بیان کیا کہ کس طرح ام عمارہ نے ایک عورت ہوتے ہوئے اپنے آپ کو حضورؐ کے لیے سپر بنا دیا۔

حضرت حمزہؓ کی بہن جناب صفیہؓ رنجیدہ اطلاعات سن کر مدینہ سے جب احد پہنچیں تو حضورؐ نے ان کے صاحبزادے زبیر سے کہا کہ جناب صفیہؓ کو اپنے ماموں کی نعش تک نہ جانے دو۔ کیونکہ اس منظر کی یہ تاب نہ لا سکیں گی۔ صفیہؓ کہنے لگیں کہ میں سارا قصہ سن چکی ہوں اور راہ حق میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ ان کو اجازت دے دی گئی۔ بڑے صابرانہ طریق سے ایک نگاہ ڈالی۔ دعائے مغفرت کی اور چلی آئیں۔

ہند نامی ایک انصاریہ (جو عمرو بن جموح کی زوجہ اور خلاد بدری کی والدہ تھیں) کے لیے یہ آزمائش بہت ہی کڑی تھی کہ ان کے باپ' بھائی' شوہر سبھی اسلام پر نثار ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں نے ان سارے زخموں کو حوصلہ مندی سے کلیجے پر لے کر بار بار یہی دریافت کیا' کہ "کیا خدا کے رسولؐ صحیح سلامت ہیں"۔ جب ان کو ادھر سے اطمینان ہوا تو پکار اٹھیں: کل مصیبۃ بعدک جلل یعنی آپ سلامت ہیں تو پھر کوئی مصیبت بھاری نہیں' سب کچھ گوارا ہے۔

حضرت عائشہؓ' ام سلیمؓ اور ام سلیطؓ جیسی معزز پردہ نشین خواتین ہنگامی مصیبت کے عالم میں پائینچے چڑھائے ہوئے دوڑ دوڑ کر پانی کی مشکیں بھر کر لاتیں اور زخمیوں کو پلاتیں۔

مسلمانوں کی شکست کی اطلاع اور حضورؐ کی وفات کی غلط خبر پا کر جناب فاطمہ زہراؓ بھی احد آ گئی تھیں۔ انہوں نے آکر حضورؐ کے زخموں کو دھویا اور مرہم پٹی کی۔

(۶) قائد انسانیت ﷺ نے اپنی تلوار جب حضرت ابودجانہؓ کو عنایت کی تو وہ سر پر سرخ رومال باندھے تلوار لہراتے ہوئے خوب اکڑ اکڑ کر دشمن کی صفوں کی طرف بڑھے۔ اس منظر کو دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا۔ کہ "یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے مگر اس طرح کے مواقع پر پسند ہے"۔ آپؐ نے گویا بڑے اہم نکتہ کی وضاحت کر دی۔ عام زندگی میں افراد کا کسی بھی پہلو سے اکڑ دکھانا اسلام میں سخت ناپسندیدہ ہے لیکن

دشمنوں سے کش مکش اور تصادم کرتے ہوئے مفاخرت اور اکڑ کا انداز عین مطلوب ہے۔ انکسار خوبی ہے مگر وہ کوئی غیر حکیم شخص ہی ہو سکتا ہے' جو جنگ کے میدان میں بھی ایک اچھے اخلاقی اصول کو غلط طور پر استعمال کر کے دشمن کے سامنے تواضع اور عجز و انکسار کا مظاہرہ کرنے لگے۔ حضورؐ نے اس ایک کلمے سے اس غیر حکیمانہ مذہبی ذہنیت کا ازالہ کر دیا جو اصول پرستی کے غلط زعم میں پڑ کر بعض اخلاقی قدروں کو بے محل طور پر الٹے مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگتی ہے۔ عرضہ پیکار کے علاوہ شعر و خطابت کے میدان میں بھی جو اس دور میں سیاسی رنگ رکھتا تھا۔ آپؐ نے اپنے شاعروں اور خطیبوں کے ذریعے مفاخرت کرائی ہے۔ اسی طرح عمرۃ القضا کے موقع پر حضورؐ نے صحابہ کو طواف میں بھی پھیل کر مظاہرہ قوت کا حکم دیا۔ اور سعی کرتے وقت بھی تن کر قدم اٹھانے اور مشی کے بعد دوڑ لگانے (ہرول) کی تاکید کی۔ بعد میں یہی سنت قائم ہو گئی۔ اس موقع پر آپؐ نے بطور دعا یہ بھی کہا کہ خدا اس شخص پر رحم کرے جو آج کفار کے سامنے قوت کا اظہار کرے گویا کشاکش کے کسی بھی دائرے میں عجز و انکسار کا استعمال مہلک حد تک غلط ہو گا۔ اسلامی تحریک ایسے اندھے جنون کے بل پر نہیں چل سکتی جو اخلاقی اصول و اقدار کا صحیح استعمال مواقع کے فرق کو پہچان کر نہ کر سکے۔

(۷) سچائی اور نیکی ایسی طاقتیں ہیں کہ جو انسانی جوہر کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ مدینہ کے ایک صالح نوجوان عمر بن صامت تھے۔ جن کا معاملہ مسلمانوں سے حامیانہ و ہمدردانہ تھا۔ لیکن اب تک انہوں نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ معرکہ احد نے ان کے سوئے جذبے کو جگایا۔ ایمان لائے اور تلوار لے کر چپکے سے جنگ میں شریک ہو گئے اور شہادت پائی۔ دم آخر بنی عبدالاشہل کے لوگوں نے اپنے آدمی کو پہچانا اور ماجرا پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ خدا اور رسولؐ کی محبت سے حق کی حمایت میں لڑا ہوں۔ حضورؐ نے بشارت دی کہ یہ ایسا جنتی ہے جس نے ایک نماز بھی نہیں پڑھی۔ دوسری مثال مخیریق یہودی (بنی ثعلبہ) کی ہے جس نے سچی یہودیت کا تقاضا سمجھتے ہوئے حضورؐ کی حمایت میں لڑنے کا فیصلہ کیا اور دوسرے یہودیوں کو بھی دعوت دی۔ انہوں نے ایک مقدس عذر پیش کر دیا کہ آج یوم سبت ہے۔ جنگ کے لیے نکلنا روا نہیں مخیریق نے کہا اس وقت سبت وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ وہ تنہا ہی میدان میں پہنچا' لڑا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ بالکل دوسری نوعیت کی ایک مثال قزمان کی بھی ہے جس کے جہنمی ہونے کی خبر حضورؐ نے دی تھی۔ یہ شخص مسلمانوں کے ساتھ ہو کر خوب لڑا اور زخموں سے نڈھال پایا گیا۔ لوگوں نے تحسین کی کہ تو نے بڑا کام کیا۔ اس نے کہا' کہ میں تو فقط قومی حمیت میں لڑا ہوں۔ بدنصیب نے زخموں کے کرب کے مارے خود کشی کر لی۔ خدا نے اس سے کفار کے خلاف کام بھی لے لیا۔ اس کی جان بھی کھپ گئی اور ٹھکانہ بھی جہنم ہوا۔ خدا اس انجام سے بچائے۔

۸۔ جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ اس موقعہ پر جاہلیت کی منفی قوت بھی نشہ پندار میں خوب مست تھی۔ اور کفر کی حمایت کا جذبہ بھی پورے زور سے کام کر رہا تھا۔ قریش کا جھنڈا اٹھانے والے

علمبردار اگرچہ ایک ایک کر کے قتل ہوئے اور کسی کو جم کے کھڑا رہنا نصیب نہ ہوا۔ لیکن نئے افراد آگے بڑھ کر ان کی جگہ لیتے گئے۔ آخر جب صواب نامی ایک شخص نے جھنڈا تھاما تو ایک ہی ایسی تلوار پڑی کہ اس کے دونوں ہاتھ کٹ کر گر گئے۔ اور علم کے ساتھ ہی سینہ کے بل اس کے اوپر گرا۔ اور یہ کہتے ہوئے ختم ہو گیا' کہ "میں نے اپنا فرض ادا کر دیا"۔ کچھ دیر علم اسی طرح خاک پر پڑا رہا آخر عمرہ بنت علقمہ نامی خاتون بہادری سے آگے بڑھی اور علم اٹھالیا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مثبت انقلابی قوت کے ظہور سے قدامت میں بھی کچھ دیر کے لیے نئی رو دوڑنے لگتی ہے۔ مگر احد میں درحقیقت مکہ کی قوت نے اپنا آخری ابال دکھایا تھا۔

(۹) مسلم فوج کی مادی بے سروسامانی کا رقت انگیز منظر شہداء کی تجہیز و تکفین کے وقت سامنے آیا۔ جملہ ستر میتیں تھیں' مگر ان کے لیے کفن کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ مصعب بن عمیر کی نعش پر صرف سر کی جانب کپڑا ڈالا جا سکا اور پیروں پر اذخر گھاس رکھ دی گئی۔ ان حالات کی جب بھی یاد آتی تو مسلمانوں کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ یہ حالات خود گواہ ہیں کہ مسلم ریاست کے لیے جنگ کرنا کتنا مجبورانہ اقدام تھا۔ مگر جب یہ مجبورانہ اقدام کرنا پڑ گیا تو انہوں نے ہر کمی کی تلافی اپنے نظریہ حیات کے یقین اور اپنے عظیم نصب العین کی محبت اور رسول اللہ ﷺ کی سچی رفاقت سے کی۔

(۱۰) قرآن نے مسلمانوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرنے اور ان کی اصلاح پر توجہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے سپاہیانہ شعور کی آبیاری بھی کی۔ ان کو ذہن نشین کرایا کہ معرکہ کارزار میں فیصلہ کن طاقت اخلاقی طاقت ہوتی ہے۔ اور اس اخلاقی طاقت کا اہم ترین شعبہ صبر ہے۔ ان کو تلقین کی کہ وہ رزم خیر و شر میں عصبیتی جذبات اور دنیوی مفادات کو بالکل بالائے طاق رکھ کر صرف خدا کی رضا' حق کے غلبے اور آخرت کی کامیابی کو پیش نظر رکھیں۔ ان کے دلوں میں یہ بات بھی بٹھائی کہ فتح و شکست کا فیصلہ بہرحال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اسی کی تائید و نصرت کسی قوت کو غالب کرتی ہے۔ للہذا اسی کے قوانین اور اسی کی خوشنودی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس حقیقت کو ایک دعائیہ پیرائے میں سمو کر ان کے ورد زبان کیا کہ:۔

> "کہو! خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں۔ جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے۔ اور بے جان میں سے جاندار کو اور جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے"۔
>
> (آل عمران ۲۷۔۲۶)

ان کے دلوں سے موت کے خوف کو بھی یہ حقیقت کھول کر نکالا گیا کہ موت بہرحال مقررہ وقت پر اللہ کے اذن سے آ کے رہے گی۔ اور جان بچانے کے لیے ادائے فرض سے کوتاہی کرنا زندگی کی گھڑیوں کو

طویل نہیں بنا سکتا۔ لہٰذا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تمہیں اقدام کرنا ہے۔ ان قیمتی اسباق کے ساتھ ان کے سامنے ایک زریں نکتہ یہ بھی رکھا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں (سچائی کے گواہ بن کر) اپنی جانیں نچھاور کرتے ہیں ان کا مرنا عام لوگوں کا سا مرنا نہیں ہے۔ ان کی موت نہایت ہی قابل احترام ہے' سو ان کو عام مرنے والوں کی طرح سے مردہ نہ سمجھو اور مردہ نہ کہو' وہ اپنے رب کی بارگاہ میں حیات نو سے بہرہ مند ہیں۔ ان کی روحیں نورانی رزق پاتی ہیں۔ وہ عطیات الٰہی پا کر مسرور ہیں اور اپنے ہم مسلک ساتھیوں کے بارے میں بھی اطمینان رکھتے ہیں۔ یوں شہادت کا ایک اعلیٰ مفہوم نمایاں ہوا۔ اور خدا کی راہ میں پیش آنے والی موت کے معنے ایسے بدلے کہ اس سے خوف کھانے کے بجائے اس کے لیے دعائیں مانگی جانے لگیں۔ اسی سلسلے میں آپؐ نے تنبیہہ فرمائی کہ شہدا کے غم کا اظہار بین کر کے اور سینہ کوبی کی صورت میں نہ کیا جائے۔ ایک صالح انقلابی تحریک جب رونما ہوتی ہے تو وہ اسی طرح اپنی خاص اصطلاحات پیدا کرتی ہے۔ اور ان میں مخصوص معانی سموتی ہے اور مروجہ تصورات کے معنی بدل دیتی ہے۔ ان ساری تلقینات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں جنگ کوئی دنیاوی کارروائی نہ تھی' عین دینی تقاضا اور خالص عبادت الٰہی تھی۔

(۱۱) منافقین کی کچھ تعداد میدان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاں ایک نازک لمحہ میں مسلمانوں کے اندر انتشار پھیلانے اور نظم توڑنے میں ان کا خاصا ہاتھ تھا' وہاں معرکہ کے بعد بھی انہوں نے خوب خوب چہ میگوئیاں کیں کہ اگر یوں ہوتا تو فلاں نتیجہ نکلتا اور ووں نہ ہوتا تو فلاں واقعات رونما نہ ہوتے۔ نیز یہ کہ اگر قیادت میں ہمارا کچھ بھی دخل چلتا تو جنگ احد کا نقشہ یوں نہ ہوتا۔ خود عقبی درہ کے تیر اندازوں کے ذہن پوری طرح صاف نہ تھے۔ ان سے مدینہ میں جب باز پرس کی گئی۔ کہ تم نے اپنا مورچہ کیوں چھوڑا؟ تو انہوں نے بودے عذرات پیش کئے جنہیں سن کر حضورؐ نے فرمایا' کہ "نہیں۔ بلکہ حقیقت میں تم لوگوں کو یہ بدگمانی ہوئی کہ ہم تمہارے ساتھ خیانت کریں گے اور تمہارا حصہ ادا نہ کریں گے"۔ قرآن نے اسی بدگمانی کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ کہ "کسی نبی کی شان سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ خیانت کرے گا" (آل عمران۔ ۱۶۱)

۱۲۔ دشمن نے جب حضورؐ کو زخمی کر دیا تو کسی ساتھی نے کہا کہ ان ظالموں کے لیے بددعا کیجئے کہ خدا ان کو ہلاک کر دے۔ آپؐ نے جواب دیا۔ کہ "مجھے دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے' نہ کہ لعنت برسانے کے لیے"۔ پھر دعا فرمائی۔ "اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے' یہ لوگ (مجھے' میرے مشن کو اور زندگی کی حقیقتوں کو) جانتے نہیں"۔ ہم پہلے بھی اشارہ کر آئے ہیں کہ اس جواب اور اس دعا میں حضورؐ کا وہ نقطہ نظر پوری طرح منعکس ہے جس سے آپؐ اپنے مخالفین کو دیکھتے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ آپؐ کے اندر کوئی ذاتی جذبہ انتقام موجود نہ تھا۔ آپؐ ان کا خاتمہ نہیں چاہتے تھے۔ صرف ان کی اصلاح چاہتے تھے۔ ان کے جنگی اقدامات کا بھی آپؐ نے جواب دیا تو مجبوری سے دیا۔ کیونکہ اس کے بغیر چارہ کار کوئی تھا نہیں۔

احد کے بعد:

اگرچہ مسلم فوج نے احد میں پہلے فتح کا اور پھر عارضی ہزیمت کا دور دیکھا۔ لیکن آخر وقت میں انہی کے حق میں پلڑا جھکنے لگا تھا۔ خصوصاً قریش کا اپنی فتح کو ناتمام چھوڑ کے چل دینا اور مسلم فوج کا ان کے تعاقب میں نکلنا اور ابوسفیان کا ایک بار پھر پلٹنے کا ارادہ کرنے کے بعد مکہ کو روانہ ہو جانا مسلم فوج کی ہوا بندھنے میں ممد ہوا۔ درحقیقت قریش اس جنگ کا قطعی فیصلہ کیے بغیر اسے معلق حالت میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کا زور توڑنے میں کامیاب نہ رہا۔ ایسی صورت لازماً "باقی آئندہ" کا مفہوم رکھتی ہے۔ اور قریش کی طرف سے تو ابوسفیان صاف صاف چیلنج دے گیا کہ اب آئندہ سال بدر میں ہم پھر ٹکر لینے آئیں گے۔ بدر کی جنگ ایک فیصلہ کن نتیجہ رکھتی تھی۔ مگر احد کا معرکہ فیصلہ کن نہ ہو سکا۔ یہ فیصلہ آئندہ کے لیے مؤخر ہو گیا۔

مسلم طاقت اگر فاتح نہیں تھی تو بلاشک وہ شکست خوردہ بھی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی بدر کی فتح کا جو اثر ارد گرد کے علاقوں میں پڑا تھا اس میں کچھ نہ کچھ کمی آئی اور قدامت پسند قبائل کی امیدیں ایک بار پھر قریش کی جاہلی قوت سے وابستہ ہونے لگیں۔ بعض جرائم پیشہ اور شرپسند عناصر میں بغاوت کا رجحان بھی ابھر آیا۔ چاروں طرف کے نیم متاثر قبائل بے باکی سے باغیانہ حرکات کرنے لگے۔ گویا احد کے وقتی اثر سے اسلامی ریاست کو شدید پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جماعت اتنی چاق و چوبند اور قیادت اتنی مضبوط تھی کہ اس نے شرارت کی فوری سرکوبی کی اور آہستہ آہستہ حالات کے دھارے کو صحیح رخ پر ڈال لیا گیا۔ لوگوں کو محسوس کرا دیا کہ اسلامی حکومت جان رکھتی ہے اور لا اینڈ آرڈر قائم رکھنے اور اپنے علاقے کا تحفظ کرنے کے لیے کوئی کوتاہی کرنے والی نہیں ہے۔ تاہم ایک اچھا خاصا دور اسلامی ریاست کے اثر کی بحالی میں صرف ہوا۔

مخالف رجحانات رکھنے والے جن عناصر نے واقعہ احد کے بعد سر اٹھانا شروع کیا ان میں پہل قطن کے طلحہ بن خویلد اور سلمہ بن خویلد نے کی۔ ان سرغنوں نے بنی اسد بن خزیمہ کو مدینہ کے خلاف باغیانہ اقدام پر تیار کیا۔ صحیح تر نقطہ نظر غالباً یہی ہے کہ پروگرام ایک طرح کی مسلح ڈاکہ زنی کا تھا۔ محرم ۴ ھ کا چاند ہوتے کے ساتھ ہی یہ اطلاع موصول ہوئی۔ ابوسلمہ مخزومی کی سرکردگی میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا دستہ خطرے کا انسداد کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ یہ لوگ قطن پہنچے تو مویشیوں کا گلہ چھوڑ کر ڈکیتوں کی ٹولی تتر بتر ہو گئی مویشی اسلامی حکومت نے ضبط کر لیے۔ اور رضا کاروں میں تقسیم کر دیے۔ بغیر کسی وقفے کے ۵ محرم کو ایک اور جانب سے خبر آئی کہ خالد بن سفیان الہذلی نے حملہ کرنے کے لیے جمعیت اکٹھی کی ہے۔ عبداللہ بن انیس جہنی انصاری کو روانہ کیا گیا جو اس فتنہ گر کا خاتمہ کر کے اس کا سر کاٹ لائے۔ تن تنہا ایسا بہادرانہ کارنامہ انجام دینے پر حضورؐ نے اپنا عصا بطور انعام ان کو عطا فرمایا۔

پھر دو تین ہفتوں ہی کے وقفے سے ایک بڑا حادثہ پیش آیا۔ ماہ صفر کے آغاز میں قبیلہ عضل و قارہ کے لوگ سازش کر کے مدینہ آئے اور حضورؐ سے درخواست کی کہ ہم میں سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے آپؐ اپنے معلمین بھیجیے۔ دس اہل علم کا ایک تعلیمی وفد روانہ کیا گیا۔ (یہ تعداد صحیح بخاری کی روایت کے بموجب ہے' سیرت نگاروں نے وفد کو سات آدمیوں پر مشتمل قرار دیا ہے) جس کے امیر مرثد بن ابی المرثد تھے۔ مقام رجیع (یہ بنو ہذیل کا گھاٹ تھا) میں پہنچ کر سازشیوں نے بجز خبیب اور زید کے باقی سب کو تہ تیغ کر دیا۔ ان دونوں کو قریش مکہ کے ہاتھ بیچ دیا جنہوں نے دونوں کو صلیب دے کر شہید کیا۔ اس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس واقعہ سے خوب اندازہ ہو سکتا ہے کہ جنگ احد کے بعد مخالف عناصر میں کیسی کیسی جسارتیں ابھر آئی تھیں۔ اس سانحہ نے حضورؐ کے دل کو کس قدر صدمہ پہنچایا ہو گا۔ جب کہ آپؐ کی قلیل التعداد جماعت کے متعدد قیمتی افراد تعلیمی مشن پر جاتے جاتے بے بسی کے عالم میں شہید ہو گئے۔ یہ نورانی ہستیاں علم کی شعائیں پھیلا کر جن لوگوں کو کسی معاوضے کے بغیر نئی زندگی دینا چاہتی تھیں ان ظالموں نے ان سے استفادہ کیے بغیر ان کی زندگیوں کے چراغ گل کر دیے۔ لیکن اسی مہینہ میں اس سے بڑا حادثہ بئر معونہ کا پیش آیا۔ ابو براء عامر بن مالک علاقہ نجد سے آکر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا آپؐ نے اسلام کی دعوت دی۔ مگر اس نے نہ اسے قبول کیا نہ رد۔ البتہ بڑے مخلصانہ انداز سے مشورہ دیا کہ آپؐ اپنے رفقاء کو نجد روانہ فرمائیں۔ امید ہے کہ لوگ اسلام کے پیغام کو قبول کریں گے۔ حضورؐ نے نجد کے بارے میں اندیشہ ظاہر کیا۔ واقعہ رجیع تو سامنے تھا ہی۔ ابو براء نے حفاظت کی ذمہ داری لی۔ چونکہ بعض سیاسی ضرورتیں متقاضی تھیں کہ نجد کے علاقے میں اسلامی حکومت کا اثر پھیلے اس لیے حضورؐ نے ابو براء کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے ستر آدمیوں کی ایک جمعیت (یہ تعداد صحیح بخاری نے بیان کی ہے۔ ابن اسحٰق کے ہاں چالیس مذکور ہے) جس میں اول درجے کے حفاظ' قاری اور معلم و داعی شامل تھے منذر بن عمرو کی امارت میں روانہ کی۔ یہ دعوتی وفد جب بئر معونہ پہنچا جو ارض بنی عامر اور حرہ بنی سلیم کے درمیان واقع ہے تو وہاں سے حرام بن ملحان رسول اللہ کا خط لے کر عامر بن طفیل کی طرف روانہ ہوئے۔ اس نے خط دیکھنے سے پہلے ہی اپنے آدمی کو اشارہ کر کے انہیں قتل کرا دیا۔ اس کے بعد اس نے بنی عامر میں اعلان کیا کہ مدینے کے وفد پر حملہ کرنے کو نکلو۔ بنو عامر نے ابو براء کی ضمانت کا احترام توڑنا گوارا نہ کیا۔ تب اس مفسد نے بنی سلیم کی شاخوں یعنی رعل' ذکوان' عصیہ' اور بنی لحیان کو دعوت دی' یہ لوگ تیار ہو گئے اور مدینہ کے دعوتی وفد کو آکر گھیر لیا۔ وفد کی طرف سے کہا گیا کہ ہم لوگ لڑنے نہیں آئے اور یہاں ہمیں ٹھہرنا بھی نہیں بلکہ آگے جانا چاہتے ہیں ہمارے ساتھ تعرض نہ کرو۔ لیکن وہ ظالم نہ مانے اور ۶۹ افراد تہ تیغ کر دیے۔ سترویں رکن وفد کعب بن زید بھی لہولہان ہو کر لاشوں کے ڈھیر میں شامل ہو گئے۔ لیکن زندگی باقی تھی' بچ کر مدینہ پہنچے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ مخالفتوں سے گھری ہوئی ایک نوخیز جماعت کی اس آزمائش کا اندازہ کیجیے کہ اس کی ۶۹ قابل شخصیتیں نہایت بے رحمی سے یکبارگی شہید ہو جاتی ہیں۔ حضورؐ کا قلب

حساس اس واقعہ سے بے حد دکھا۔ آپؐ نے دکھے ہوئے دل کے ساتھ ایک مہینہ تک نماز فجر میں اپنے معلمین کے قاتلوں کے حق میں بد دعا کی۔ اس بد دعا کا اصطلاحی نام قنوت نازلہ ہے۔

ان ظالموں کے رویہ کے مقابلہ میں محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل عمروؓ بن امیہ کے واقعہ میں دیکھئے۔ عمروؓ بن امیہ نے کہیں سے سنا کہ معلمین کی جماعت کو بئرمعونہ کے قریب سازشی دشمن اسلام قبائل نے تہ تیغ کر دیا ہے جس میں عمروؓ بن امیہ کے رشتہ دار بھی شامل تھے۔ انہوں نے راستہ میں معلمین کے قاتل گروہ کے دو افراد کو سوتے ہوئے دیکھا اور انتقاماً قتل کر دیا۔ دراصل یہ لوگ حلیف قبیلہ کے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کا خون بہا ادا کیا۔ آخر وہاں کے ظلم انگیز مزاج کے مقابلہ میں حضورؐ اسی نظام عدل کے لیے سارے جتن کر رہے تھے۔

ان بیرونی حالات کی اصلاح بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ مدینہ داخلی طور پر مستحکم رہے۔ مگر یہاں شر انگیز عناصر موجود تھے۔ وہ اپنی دولت' زمینوں اور قلعہ بندیوں کے بل پر خاصا دم خم رکھتے تھے۔ اور اسلامی ریاست کے عین قلب میں بیٹھ کر انتہائی غدارانہ سازشیں کرتے اور مسلم جماعت کے ہر اقدام میں رخنہ اندازی کرتے تھے۔ خصوصاً یہودی قبائل وحدت مدینہ کے معاہدہ میں شریک ہونے کے باوجود آئے دن باغیانہ حرکات کرتے تھے۔ ان میں سے بنو نضیر کا گڑھ بڑا مضبوط تھا اور وہ عناد اور سرکشی کی راہ پر سرپٹ بڑھے جا رہے تھے۔ انہوں نے احد اور واقعہ رجیع اور بئرمعونہ کے سانحہ کے بعد نازک ترین ہنگامی حالت میں حضورؐ کے قتل کے لیے کھلم کھلا اقدام کیا (جس کا ہم ذکر پہلے کر چکے ہیں) پچھلی حرکات کے بعد یہ کھلم کھلا اقدام اس امر کے لیے کافی بلکہ ضروری تھا کہ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کن کارروائی کی جائے۔ حضورؐ نے جنگ چھیڑنے اور کوئی جانی نقصان پہنچانے سے بچنا چاہا۔ [1] اس لیے فقط سلب شہریت کا نوٹس دیا کہ وہ دس روز کے اندر اندر پرامن طریق سے حدود مدینہ سے نکل جائیں ورنہ پھر ان کے ساتھ دشمن کا سا معاملہ کیا جائے گا۔ عبداللہ بن ابی نے بھاری مدد دینے کا وعدہ کر کے انہیں حضورؐ کے خلاف لڑنے پر اکسایا۔ بنو نضیر اس کے بھرے میں آگئے اور اسلامی ریاست کو انہوں نے صاف صاف چیلنج کر دیا کہ نوٹس کی ہم تعمیل نہیں کرتے' جو چاہو کرو۔ ربیع الاول ۴ھ میں حضورؐ اسلامی فوج کو لے کر نکلے اور بنو نضیر کو محاصرہ میں لے لیا۔ کوئی بھی ان کی مدد کو نہ آیا۔ لہٰذا بے بس ہو کر انہوں نے بستی خالی کر دی۔ حضورؐ کی کریمانہ

---

[1] اسلامی تحریک اپنے مزاج کے اعتبار سے جنگ پسند نہیں۔ علاوہ ازیں معاملہ دنیا کے ایک مستقل مذہبی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد کا تھا۔ اور تحریک اسلامی کو بہرحال اس گروہ کے دائرے میں کام کرنا تھا۔ ورنہ ان کے جرائم ایسے تھے کہ انہیں زندہ رہنے کا بھی حق نہ رہا تھا۔

شان تھی کہ نہ صرف جانیں بلکہ اونٹوں پر اپنے قیمتی اموال بھی وہ لوگ لاد کر لے گئے۔ کھچاؤ کے اس انتہائی ناخوشگوار ماحول میں بھی بنو نضیر کے اندر سے دو سعید روحیں ایسی نکلیں جنھوں نے اپنے قبیلے کی نامعقولیت کے ساتھ ساتھ حضور کی دعوت حق کے نور کو پہچانا اور حلقہ اسلامی میں شرکت کی۔ یہ تھے یامین بن عمیر اور ابو سعد بن وہب۔

اس موقع پر مسلم فوج کو چند درخت کاٹنے پڑے اور یہ کوئی اہم بات نہ تھی' لیکن مغربی نکتہ طرازوں نے اس میں سے بھی پروپیگنڈا کا مواد نکال لیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ناگزیر اقدام تھا جیسا آج بھی کسی فوج کو راستہ بنانے' دشمن کی کمین گاہوں کو ختم کرنے اور دوسری ضروریات کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ پولیس کو بھی مجرموں کی گرفتاری کے لیے بسا اوقات اس طرح کی کارروائیاں عمل میں لانی پڑتی ہیں۔ عمارتیں گرا دی جاتی ہیں کھیتوں اور باغوں میں حسب ضرورت تصرف کیا جاتا ہے۔

خطرناک ترین حالات کے باوجود شرپسند عناصر کی سرکوبی کر کے حضورؐ نے نہ صرف اپنی مشکلات گھٹا لیں بلکہ آس پاس کے لوگوں پر یہ اثر بھی بحال کر لیا کہ مسلم حکومت میں پورا پورا دم خم موجود ہے۔

ابو سفیان میدان احد کے اعلان کے مطابق دو ہزار پیادوں اور ۵۰ سواروں پر مشتمل ایک مضبوط لشکر لے کر حملہ کے لیے نکلا۔ حضورؐ بھی اطلاع پاتے ہی پندرہ سو پیادوں اور دس سواروں کے ساتھ بدر پہنچے۔ آٹھ روز وہیں کیمپ ڈال کر قریش کی فوج کا انتظار کیا۔ مگر ابو سفیان مکہ سے ایک منزل دوری پر --- بمقام ظہران یا عسفان ---- آکر واپس چلا گیا کہ خشک سالی کی وجہ سے یہ سال جنگ کے لیے مناسب نہیں۔ آخر حضورؐ بھی ابو سفیان کی واپسی کی اطلاع پا کر مدینہ تشریف لے آئے۔

محرم ۴ ھ (بعض روایات کی رو سے جمادی الاولیٰ) میں بنی غطفان کے ذیلی قبائل بنی محارب اور بنی ثعلبہ کی جنگی تیاریوں کی اطلاع آئی۔ حضورؐ چار سو (بعض روایات کے مطابق' سات سو) رضا کاروں کی جمعیت لے کر نکلے۔ مقابلہ کے لیے ایک جمعیت واقعی موجود تھی۔ لیکن وہ عملاً معرکہ آرا نہ ہو سکی۔ اسی مقام کا واقعہ ہے کہ غورث نامی مشرک اپنی قوم کے سامنے یہ عزم بیان کر کے نکلا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر کے رہوں گا۔ وہ آیا تو حضورؐ ایک درخت کے سائے میں تنہا استراحت فرما تھے' آپؐ کی تلوار درخت سے لٹک رہی تھی غورث نے وہی تلوار تان کر للکارا کہ بتاؤ اب کون تمہیں بچا سکتا ہے۔ حضورؐ نے بے خوف ہو کر کہا "خدا بچانے والا ہے"۔

دومتہ الجندل تجارتی کاروانوں کا جنکشن بھی تھا اور یہاں عیسائیوں اور یہودیوں کے مذہبی مبلغ اور سیاسی گماشتے بھی کام کرتے تھے۔ پھر بنو نضیر کے خیبر وغیرہ میں جانے کی وجہ سے ان کی مدینہ کے خلاف ریشہ دوانیوں کا بھی یہ اڈا بننے لگا تھا۔ خصوصاً یہ واقعہ بڑی سیاسی اہمیت رکھتا ہے کہ قریش مکہ اور یہود خیبر کی سازباز کے زیر اثر نصرانی سردار اکیدر نے مدینہ کے لیے غلہ لاتے والے کاروانوں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ حضورؐ تک اطلاع پہنچی کہ دومتہ الجندل میں دشمن اپنی طاقت جمع کر کے مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔

ربیع الاول ۵ ھ میں آپؐ نے ایک ہزار کی جمعیت لے کر فوراً اقدام کیا۔ دومتہ الجندل میں جب مسلم فوج کی روانگی کی اطلاع پہنچی تو دشمن بکھر گئے۔ حضورؐ نے پیش قدمی کی ضرورت نہ سمجھی اور راستہ میں حلیفانہ تعلقات بڑھانے کا کام کیا۔ چنانچہ عیینہ بن حصن سے معاہدہ ہوا۔ بعد میں (۶ ھ) حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف ایک دعوتی و سیاسی مہم لے کے گئے۔ اور قبیلہ کلب کی فضا مدینہ کے حق میں سازگار ہونے لگی۔ اس کے بعد بھی تبوک کی مہم کے سلسلے میں (۹ ھ) اس علاقے پر پورا پورا غلبہ ہو گیا۔

اب بنو مصطلق کے بارے میں خبر آئی کہ وہ حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ بریدہ اسلمی کو بھیج کر تحقیقات کرائی گئی۔ خبر صحیح نکلی۔ حضورؐ نے ۳ شعبان ۵ ھ کو فوجی اقدام کیا۔ نہایت تیز رفتاری سے مریسیع (پانی کا چشمہ) جا پہنچے۔ حارث بن ابی ضرار (سردار بنی مصطلق) آمادہ جنگ تھا۔ حضورؐ کے یکایک جا پہنچنے سے اس کی سپاہ بکھر گئی اور صرف اسی کے قبیلہ کے لوگ باقی رہے۔ پہلے ہی ہلہ میں حارث کے جتھے کو پوری طرح شکست ہو گئی۔ بکثرت مویشی مال غنیمت میں آئے اور ساری تعداد جنگی قیدی بن گئی۔ گرفتار شدگان میں جویریہؓ بھی تھیں۔ انہوں نے حضورؐ کے سامنے کلمہ حق پکارا اور کہا کہ میں اسلام لا کر حاضر ہوئی ہوں۔ حضورؐ نے ان کی رضامندی سے انہیں اپنے نکاح میں لے لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے تمام قیدیوں کو یہ کہہ کر آزاد کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کو ہم اب اسیر نہیں رکھ سکتے۔

یہی وہ موقع ہے کہ اسلام کی فتح کو دیکھ کر منافقین جل اٹھے اور پہلے انہوں نے پانی پر جھگڑا کھڑا کر کے مہاجرین و انصار کو لڑانا چاہا۔ اور واپسی میں سارے راستے مہاجرین کو مدینہ سے نکلوانے کے لیے انصار کو اشتعال دلانے میں لگے رہے۔ اسی سفر میں حضرت عائشہؓ کے قافلہ سے بچھڑ جانے کی بنا پر منافقین کو افک کا طوفان اٹھانے کا موقع ملا۔ یہ سارا حال ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

جنگ احد کے بعد اور معرکہ خندق سے پہلے یہ مختلف چھوٹی چھوٹی کارروائیاں تھیں جو اسلامی ریاست کو اپنے تحفظ، لا اینڈ آرڈر کی بحالی اور دستوری نظام کے بچاؤ کے لیے کرنی پڑیں۔ ان میں سے معلمین کے وفود کے واقعات کو چھوڑ کر بقیہ صورتوں میں یا تو محض سرحد پر فوجی طاقت بھیجی گئی۔ یا ایک نوع کی پولیس کارروائی کی گئی۔ خالص جنگی نوعیت کی جھڑپیں بہت کم تھیں اور وہ بھی بالکل چھوٹی چھوٹی ان کو خواہ مخواہ اہمیت دے کر تفصیل سے بیان کیا جائے تو پڑھنے والے کو بڑا مغالطہ ہوتا ہے۔ اصل صورت حالات یہ تھی کہ عرب، قبائل کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں منقسم تھا۔ اور ہر قبیلہ بلکہ قبیلوں کی ذیلی شاخیں اپنی اپنی جگہ مستقل تنظیمی و سیاسی یونٹ تھیں۔ کبھی ایک ٹولی مخالفت کے لیے سر اٹھاتی کبھی دوسری حملے یا ڈاکے کے لیے تیار ہو جاتی۔ ایک شرارت پر قابو پایا جاتا تو کسی اور طرف سے فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ ایسی حالت میں جب بھی کبھی ایک مرکزی نظم قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تو بکھرے ہوئے مختلف قبیلوں کے ساتھ بار بار چھوٹی چھوٹی جھڑپیں لیے بغیر کبھی کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا۔

تیسرا بڑا معرکہ ---- خندق:

جنگ احد میں اگرچہ قریش کو ایک اتفاقی موقع مسلمانوں کو زور دکھانے کا مل گیا تھا۔ اور بظاہر انہوں نے بدر کے زخموں کا انتقام لے لیا تھا۔ لیکن وہ خوب سمجھتے تھے کہ وہ احد سے فاتح بن کر نہیں لوٹے اور یہ بھی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ اپنی موجودہ طاقت کے ساتھ مدینہ کی مسلم ریاست کو زک دینے کے قابل نہیں ہیں۔ وہ ایک سال کے وقفے میں مزید تیاری اور فراہمی سپاہ کے بعد لڑنے کا تہیہ کر کے احد سے رخصت ہوئے تھے۔ اور اس ارادے کا اعلان بھی ابو سفیان نے کر دیا تھا۔ مگر مکہ سے فوج لے کر نکلنے کے بعد وہ حالات کی ناسازگاری کے باعث واپس لوٹ گیا۔ قریش اور مسلم ریاست میں ایک بڑا بھاری فرق تھا۔ جاہلیت کی طاقت اپنی روح کے اعتبار سے جامد اور مضمحل بھی تھی اور کسی طرح کے نشوونما کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ اس کا کچھ نہ کچھ جز ہر آن کٹ کر مدینہ کے پلڑے میں گر رہا تھا۔ مدینہ کی مسلم طاقت ایک اصولی، نظریاتی، دعوتی اور عوامی طاقت تھی۔ لہٰذا وہ متحرک تھی، فعال تھی، سرگرم تھی، اور اس میں نشوونما کی صلاحیت تھی۔ اس فرق کی وجہ سے وقت کا گزرنا مدینہ کے حق میں مفید پڑتا تھا۔ بلحاظ تعداد افراد، بلحاظ تربیت اخلاق، بلحاظ معاہدانہ تعلقات، بلحاظ دفاعی طاقت اور بلحاظ رقبہ کی وسعت کے مدینہ برابر نشوونما پا رہا تھا۔ اسلامی ریاست قریش کی تجارتی شاہراہیں عملاً بند کرنے میں کامیاب تھی۔ مکہ معاشی بحران کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ اسلامی جماعت احد کے بعد کے دو سالوں میں سخت پیچیدگیوں سے دوچار ہونے کے باوجود خاصا ارتقاء کر چکی تھی۔ اور قریش نے جس معرکہ کو ایک سال کے لیے مؤخر کیا تھا۔ وہ ایک سال کی دیر ہو جانے کی وجہ سے اب ان سے بہت زیادہ جارحانہ قوت مانگتا تھا۔ تنہا قریش شاید اتنی مطلوبہ قوت آسانی سے نہ لا سکتے۔ لیکن مسلم ریاست کے مختلف دشمنوں نے حالات کی مجبوری سے باہمی اتحاد کی راہیں نکالیں خیبر اور وادی القریٰ میں جا بسنے والے جلاوطن شدہ یہود نے خاصی سرگرمی سے مدینہ پر حملہ کرانے کے لیے تگ و تاز کی۔ ان کی شرانگیزی کا آغاز مدینہ کے لیے غلہ لانے والے کاروانوں کے لیے رکاوٹیں پیدا کرنے سے ہوا۔ پھر جب احد کے حالات ان تک پہنچے، اور ابو سفیان کے مزید ارادہ جنگ کی اطلاع ان کو ملی اور ان کی جسارتیں بڑھیں تو انہوں نے بنی غطفان کو خیبر کی کھجوروں کی سال بھر کی پیداوار دے کر اور آئندہ کے لیے بھی ایک مقررہ حصہ ادا کرنے کا پیمان باندھ کر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ اتنا کام کر چکنے کے بعد انہوں نے اپنا ایک وفد مکہ بھیجا۔ جس میں سلام بن ابی الحقیق۔ سلام بن مشکم، حیی بن اخطب، کنانہ بن الربیع (بنو نضیر) اور ہوذہ بن قیس، ابو عمارہ (بنو وائل) جیسے اکابر شامل تھے۔ انہوں نے قریش کو یقین دلایا کہ تم حملہ کرو اور جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پوری طرح استیصال نہ ہو جائے، ہم ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ وفد یہاں سے کامیاب ہو کر لوٹا تو بنو غطفان کے علاوہ بعض دوسرے قبائل میں گھوما۔ قریش نے بھی اپنے حامیوں اور حلیفوں میں تحریک کی اور احابیش کو امداد

کے لیے پکارا۔ گویا اب کی بار جاہلیت نے پورے عرب میں سے اپنی حمایتی قوت نچوڑی۔ اور غالب کے شعر کا سا سماں پیدا کر دیا کہ:

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

ابو سفیان کی کمان میں ۴ ہزار سپاہ روانہ ہوئی۔ جس کے ساتھ تین سو گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ تھے۔ یہ لشکر جب مرالظہران کے مقام پر پہنچا تو بنی سلیم بھی جو قریش سے روابط رکھتے تھے آملے۔ ادھر بنو اسد، فزارہ، اشجع اور بنو مرہ، بھی اپنے اپنے علاقوں سے نکلے۔ بنی غطفان نے عیینہ بن حصن کی سرکردگی میں مارچ کیا۔ مجموعی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۶، ۷ ہزار، بعض نے ۱۰ ہزار اور بعض نے ۲۴ ہزار تک کا اندازہ دیا ہے۔ ترجیح کے قابل غالباً درمیانی روایت ہے جسے اکثر سیرت نگاروں نے لیا ہے۔

حضورؐ کو ان تیاریوں کی اطلاع دومۃ الجندل کے سفر ہی میں مل گئی تھی اور آپؐ اسی کے اندیشے سے جلدی واپس بھی آگئے تھے۔ مشاورت منعقد ہوئی۔ تجویز مدینہ ہی میں رہ کر مدافعت کرنے کی ہوئی اور شہر کی حفاظت کے لیے حضرت سلمان فارسی کا یہ مشورہ قبول کیا گیا کہ ایران کے طریقے پر خندق کھودی جائے اس میں جہاں افادیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ اس طریق دفاع کا نیا پن عرب حملہ آوروں کے لیے مشکلات کا باعث ہو سکتا تھا وہاں زیادہ بڑے مفید پہلو یہ تھے کہ سخت جسمانی محنت سے وہ کام ہو سکتا تھا جو کسی مضبوط اور بلند فصیل سے ہوتا۔ نیز اس طریقے سے کم تعداد کے ساتھ کثیر التعداد دشمن کو روکا جا سکتا تھا اور جانی نقصان بھی کم سے کم حد تک متوقع تھا۔ حضورؐ گھوڑے پر سوار ہو کر خود خندق کا نقشہ متعین کرنے نکلے چونکہ شہر تین اطراف سے مکانات اور احاطہ بند باغات کے ذریعے رکا ہوا تھا۔ للذا خندق کی ضرورت شمال ہی کے کھلے حصے کی طرف تھی۔ طے پایا کہ حرہ شرقی اور حرہ غربی (لاوے کے میدان) کو ملاتی ہوئی خندق نیم دائرے کی صورت میں جبل سلع کے مغربی کنارے تک پہنچائی جائے۔ اس حصے کی کھدائی تو فوجی انتظام سے کرائی گئی۔ لیکن بعض قبائل نے بطور خود اپنے اپنے مساکن کی حفاظت کے لیے اسے اور آگے بڑھایا اور جنوب میں عید گاہ (مسجد غمامہ یا مصلّٰی) کے مغرب سے گزار کر قبا کی جانب دور تک طویل کر دیا۔ خندق کی کھدائی کے لیے وہی تین ہزار مسلم رضا کار مزدور بنے جنہیں سپاہیانہ ذمہ داری ادا کرنی تھی۔ دس دس آدمیوں کی ٹولیاں بنائی گئیں اور ہر ٹولی کو ۴۰ ذراع (۲۰ گز) ٹکڑا سونپا گیا۔ اندازاً اس کی چوڑائی، دس گز رکھی گئی ہوگی۔ کیونکہ دشمن کے بعض سوار گھوڑوں کو اس پر سے کداتے ہوئے اندر گر کر ہلاک ہو گئے تھے۔ اسی طرح اس کا تخمینی عمق ۵ گز سے کم نہیں ہوگا۔ مجموعی طور پر اس کا طول ساڑھے تین میل تھا۔ یہ واقعہ حیرت ناک ہے کہ تین ہفتے میں اتنا بڑا کام مسلم رضا کاروں نے مکمل کر لیا۔ تقریباً ۳ لاکھ آٹھ ہزار مکعب گز مٹی کو کھودنا اور اسے منتقل کرنا کوئی کھیل نہ تھا، فی کس یک صد سے زیادہ مکعب گز مٹی آتی ہے۔ پھر بلحاظ سامان کے حالت یہ تھی کہ کھدائی کے کچھ آلات بنو قریظہ سے معاہدہ کے تحت مستعار لیے گئے

تھے۔ اور ٹوکریاں نہ ہونے کے سبب عام مسلمان تو کیا' ابوبکرؓ و عمرؓ جیسی ہستیاں چادروں اور دامنوں میں بھر بھر کر مٹی اٹھاتی تھیں۔ خندق کے ساتھ جابجا چوکیاں بنا دی گئیں جہاں سے اس کے ہر حصے کی نگرانی کی جا سکے۔

ادھر خندق کی تکمیل ہوئی ادھر شوال ۵ ھ میں اسلامی ریاست کے متحدہ دشمن ٹڈی دل فوجیں لیے آپہنچے۔ قریش' کنانہ اور احابیش (یا احباش) نے وادی عقیق کے قریب بئر رومہ پر پڑاؤ ڈالا غطفان اور بنو اسد مشرق میں وادی النعمان کے پاس ذنب نقمیٰ نامی مقام سے جبل احد تک پھیل کر خیمہ زن ہوئے۔ ادھر مسلم فوج نے جبل سلع کو پشت پر لے کر مرکزی کیمپ قائم کیا۔ یہاں حضورؐ کا کیمپ جس موقع پر نصب ہوا۔ اس کی یادگار کے طور پر آج مسجد فتح موجود ہے۔

انقلابؑ دشمن اگرچہ بڑی تعداد میں محاذ آرا تھے۔ مگر یہ خندق ان کے لیے بالکل نیا مسئلہ تھی۔ اس طرح کی مزاحمت کا سامنا پہلے انہیں کبھی نہ ہوا تھا اور اس سلسلے کی تدابیر سے وہ ناواقف تھے۔ ان کے گھوڑے اور اونٹ خندق کے بیرونی کنارے تک ہی کارآمد ہوتے۔ اکا دکا گھوڑ سواروں نے جوش میں آکر خندق پار کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس کے اندر گر کر ختم ہو گئے۔ مختلف مواقع سے وہ رخ کرتے مگر مسلم دستے غفلت سے کام لیے بغیر سامنے موجود ہوتے اور تیر انداز دشمن کا منہ پھیر دیتے۔ تلواریں اور نیزے بالکل بے کار تھے۔ بس دونوں طرف سے کچھ نہ کچھ تیر اندازی ہر روز ہو جاتی۔ کئی روز کے محاصرے سے تنگ آکر ایک روز دشمن نے بڑا زور دکھایا۔ کبھی یہاں سے حملہ کیا' کبھی وہاں سے مگر کچھ پیش نہ جاتی۔ آخر کار قریش کا شہرت یافتہ معمر شہسوار عمرو بن عبد ود جوش میں بھر کر نکلا اور اس نے عکرمہ بن ابوجہل' ہبیرہ بن ابی وہب اور ضرار بن الخطاب کو اکسایا اور پھر بنی کنانہ کے کچھ لوگوں کو ساتھ لیا۔ اور ایک مناسب مقام تاک کر گھوڑا کدا کر پار ہو گیا دو چار ساتھی بھی اس کے پیچھے پیچھے خندق پار کر گئے۔ بقیہ لوگ کنارے پر کھڑے رہے۔ اندر پہنچ کر اس نے للکارا۔ حضرت علیؓ مقابلہ پر آئے اور ایک زخم کھانے کے بعد اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ ایک دن مسلم فوج کے لیے اتنا سخت تھا کہ مختلف اطراف سے دشمن ٹولیوں کی مدافعت کرنے میں چار نمازیں قضا ہوئیں۔

محاصرہ کی طوالت مسلمانوں کے لیے بھی باعث اضطراب تھی۔ مگر حریف بھی اپنی جگہ پریشان تھا۔ صلاح مشورے کے بعد ایک بھرپور حملہ کرنے کے لیے یہ طے پایا' کہ بنو قریظہ کو حضورؐ کے خلاف عہد شکنی پر آمادہ کیا جائے۔ اور وہ اندر سے حملہ آور ہوں۔ ابوسفیان کے کہنے پر حیی بن اخطب نے یہ مشن اپنے ذمے لیا۔ وہ بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس پہنچا۔ اور مدعا بیان کیا۔ اس نے پہلے تو انکار کیا کہ میں نے محمدؐ کو ہمیشہ صادق الوعد پایا ہے' ان سے عہد شکنی کرنا مروت کے خلاف ہے۔ مگر ابن اخطب نے پورے زور سے بات دہرائی کہ ہم لوگ فوجوں کا سیلاب لے کر آئے ہیں۔ تمام عرب ہمارے ساتھ امڈ آیا ہے۔ اور یہ ساری طاقت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خون کی پیاسی ہے۔ یہ موقع ہاتھ سے دینے کا نہیں۔

بس اب اسلام کے خاتمہ کا وقت آگیا ہے۔ غرض فن ترغیب کا جادو چل گیا۔ اس صورت حالات کی خبر مسلمانوں تک پہنچ گئی۔ حضورؐ نے تحقیق کرائی۔ بات صحیح نکلی۔ صحابہ کے وفد نے جب آکر افواہ کی تصدیق کی۔ تو حضورؐ کی زبان سے بس اتنا کلمہ نکلا۔ "اللہ اکبر! حسبنا اللہ و نعم الوکیل"۔

محاذ کی وسعت' محاصرہ کی طوالت۔ تعداد کی قلت' بے سروسامانی کی انتہا' فاقہ کشی کا عالم' اس کے ساتھ شب بیداریاں' منافقین کا عذرات گھڑ گھڑ کر (بیوتنا عورۃ) کنارہ کش ہوتے جانا۔ اور پھر اس درجہ کی جان ماری کہ نمازیں قضا ہو ہو گئیں۔ یہ کچھ معمولی درجہ کا امتحان نہ تھا۔ اس پر جب مدینہ کے اندرون میں غداری کی بارودی سرنگ بچھ گئی۔ اور بنو قریظہ (جن کے پاس ڈیڑھ ہزار سے زائد مردان جنگی تھے) کی طرف سے بغلی چھرا گھونپنے کا خطرہ سر پر آگیا۔ تو آج ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ تین ہزار بلاکشوں کے جذبات کس رنگ میں ہوں گے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بیان ہے کہ اس اطلاع کے ملنے کے بعد بڑی تشویش یہ تھی کہ کہیں ہمارے پیچھے عورتوں اور بچوں پر حملہ نہ ہو جائے اور اس تشویش کے مارے میں بار بار کوہ سلع پر چڑھ کر دیکھتا تھا کہ کوئی واقعہ ہو تو نہیں گیا۔ اپنے گھروں کو پر سکون دیکھتا تو خدا کا شکر ادا کرتا۔ حضورؐ نے تین سو افراد کا ایک دستہ مدینہ کی حفاظت کے لیے روانہ فرما دیا۔ اس وقت کا نقشہ قرآن کریم نے یوں کھینچا ہے۔

(یاد کرو) جس وقت کہ (دشمن) بالائی جانب سے بھی اور زیریں جانب سے بھی تمہاری طرف بڑھے اور جب کہ آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے مونہوں کو آگئے اور اللہ کے بارے میں تمہارے دلوں میں طرح طرح کے گمان آنے لگے"۔ (الاحزاب۔ ۱۰)

حق یہ ہے کہ اس موقع پر مسلم طاقت کا جیسا کڑا امتحان ہوا۔ ایسا پہلے کے دونوں بڑے معرکوں میں نہ ہوا تھا۔ احد میں رنج و غم کے پہاڑ ٹوٹے تھے مگر جو کچھ ہوا ایک دن میں ہو گیا۔ اب کی بار تو لمبی منزل تھی اور مقابل میں صرف قریش نہ تھے' اور بہت سارے عناصر تھے۔ مسلمانوں کے کرب و اضطراب کو دیکھ کر حضورؐ نے یہ تدبیر نکالی کہ دشمن کی کسی نہ کسی طاقت کو مصالحانہ تدبیر سے محاذ سے الگ کرایا جائے۔ آپؐ نے بنی غطفان (جن کو مالی مفاد بہت عزیز تھا) کے دو سرداروں عیینہ بن حصن اور حارث بن عوف کو بلوایا اور بات چیت کی۔ مدینہ کی تہائی پیداوار پر سمجھوتہ ہونے کا امکان نکلا اور معاہدہ کا مسودہ تیار کرایا گیا۔ لیکن دستخط فرمانے سے قبل حضورؐ نے سعدؓ بن معاذ اور سعدؓ بن عبادہ (اوس اور خزرج کے سردار) سے مشورہ لینا ضروری سمجھا۔ آپؐ نے بات واضح کی کہ آپ لوگ اتنے کثیر دشمنوں میں گھر گئے ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں پس دشمنوں کا زور توڑنے کے لیے یہی ایک راستہ ہے۔ ان حضرات کی حمیت حرکت میں آگئی۔ انہوں نے عرض کیا کہ جب ہم کفر کی حالت میں تھے اس وقت تو یہ قبائل ہمارا مال اس طرح نہ لے سکے۔ اور آج جب کہ ہم نور اسلام سے مالا مال ہو کر پہلے سے زیادہ قوی ہیں تو اب ہم اپنے ہاتھوں سے انہیں اپنے مال سونپیں؟ خدا کی قسم! ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں ایسے معاہدہ کی ضرورت نہیں۔ حضورؐ یہ

جواب سن کر بہت خوش ہوئے۔ وہ تحریر آپؐ نے حضرت معاذؓ کو دی اور انہوں نے چاک کر دی۔

لیکن صورت حالات کی کٹھنائی اپنی جگہ پر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یکایک ایک صورتِ حل نکالی۔ کتنا عجیب واقعہ ہے اور تحریک اسلامی کی عقلی و اخلاقی صداقت کا ثبوت کہ اس قیامت خیز لمحہ میں نعیمؓ بن مسعود آگے بڑھتے ہیں اور حضورؐ کی خدمت میں آکر عرض کرتے ہیں۔ کہ "اے اللہ کے رسولؐ! میں مسلمان ہو گیا ہوں"۔ اور پھر عقیدہ حق کا اعلان کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے پیش کش کی کہ ابھی تک چونکہ دشمنوں کو میرا اسلام لانا معلوم نہیں۔ لہٰذا اذن ہو تو میں قریش اور بنو قریظہ کا اتحاد توڑنے کے لیے کچھ کام کروں۔ حضورؐ نے اجازت دی۔ نعیمؓ بنو قریظہ کے پاس گئے ان سے ابتدائی بات چیت کے بعد کہا کہ اگر فتح ہو تو خیر لیکن شکست کی صورت میں قریش اور بنی غطفان سبھی چلے جائیں گے اور تم لوگ تنہا محمد ﷺ کی زد پر رہ جاؤ گے۔ پس تم احتیاطاً قریش اور بنی غطفان سے کہو کہ وہ کچھ آدمی تمہارے پاس بطور رہن رکھیں۔ یہ شرط پوری ہو تو ساتھ دینا ورنہ کنارہ کرلینا۔ پھر وہ قریش کے پاس پہنچے ان سے کہا کہ مجھے کچھ باتیں معلوم ہوئی ہیں جن سے تمہیں مطلع کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ بنو قریظہ نے اب موقف بدل لیا ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ آپ لوگوں سے بطور یرغمال کچھ اشخاص کا مطالبہ کریں گے۔ چنانچہ جب قریش نے بنو قریظہ کو پیغام بھیجا کہ ہم محاصرہ کی طوالت سے تنگ آگئے ہیں۔ لہٰذا اب تم ساتھ دو تو ہلہ بول دیا جائے بنو قریظہ نے ان سے اپنے آدمی رہن رکھنے کا مطالبہ کیا۔ قریش کو اب نعیمؓ کی بات کا یقین آگیا۔ اور وہ بنو قریظہ کے تعاون سے مایوس ہو گئے۔ اس تدبیر سے حالات کا نقشہ معاً بدل گیا۔

انقلاب، دشمن' عناصر پھوٹ پڑنے کی وجہ سے اب محاصرہ کی ساری تکلیف کی تھکن محسوس کرنے لگے۔ گھروں سے نکلے ہوئے مہینہ بھر ہونے کو آیا۔ کاموں کا نقصان ہوا۔ مصارف بے تحاشا اٹھانے پڑے اور نتیجہ کچھ نہیں۔ ادھر اتنی بڑی فوج کے افراد اور جانوروں کے لیے رسد کا مسئلہ پیچیدگی اختیار کرنے لگا۔ قریش کی رسد کی ایک بھاری قسط راستے ہی میں ایک مسلم فوجی دستے کے ہاتھ آگئی۔ پھر موسم ناسازگار ہو گیا اور سردی ناقابل برداشت حد تک بڑھ گئی۔ ایسے تاریخی مواقع پر بسا اوقات طبعی عناصر فیصلہ کن عمل کرتے ہیں۔ اور مشیت ایک اشارے سے معاملات کو کسی شکل میں طے کرا دیتی ہے۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ طبعی عوامل بھی نازک لمحوں میں اپنا وزن حق کی قوت کے پلڑے میں ڈالا کرتے ہیں۔ ایک رات اچانک سخت طوفانی آندھی چلی جس نے حملہ آوروں کے خیمے اکھاڑ دیئے' طنابیں توڑ ڈالیں' چولھے بجھا دیئے' ہانڈیاں اور برتن الٹ دیئے۔ جانوروں کو وحشت زدہ کر دیا۔ اور فی الجملہ جنگی حوصلوں پر اوس پڑ گئی۔ بلکہ ایک حواس باختگی کا عالم طاری ہو گیا۔ اسی غیبی امداد کا احسان اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ:۔

"اپنے حق میں اللہ کی اس نعمت کا تصور کرو۔ جب کہ تمہارے خلاف لشکر جمع ہوئے اور ہم نے ان کے خلاف آندھی کی مصیبت بھیجی اور وہ غیبی لشکر بھیجے کہ جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے"۔ (الاحزاب۔ ۹)

ہر طرف گھبراہٹ اور مایوسی پھیل گئی جس کی بنا پر ابو سفیان نے فیصلہ کیا کہ اب ہم مزید نہیں ٹھہر سکتے۔ چنانچہ ٹڈی دل فوجیں یکایک کوچ کر گئیں۔ مدینہ کا مطلع صاف تھا۔ حضورؐ نے خوب فرمایا کہ "اب قریش کی چڑھائیاں ختم ہو گئیں" یعنی اپنی قوت کو تو وہ بدر و احد میں آزما چکے تھے۔ اور اب کی بار انہوں نے عرب بھر سے مخالفین اسلام کو مشکلوں سے سمیٹ کر دھاوا بولا تھا سو وہ بھی ناکام گیا۔ اب جب کہ اتنی قوت کو بھی دوبارہ مجتمع کرنا ممکن نہیں تو قریش کس طرح آئندہ کوئی معرکہ لڑ سکتے ہیں۔ جب کہ بعد کا معرکہ اس سے زیادہ قوت طلب کرے گا۔

اس معرکہ میں دو طرفہ جانی نقصان برائے نام ہوا۔ اور مسلم فوج کا تو اور بھی کم۔ کل ۶ آدمی شہید ہوئے۔ لیکن ان میں سعدؓ بن معاذ جیسی عظیم شخصیت بھی شامل تھی۔ ان کو تیر کا زخم آیا۔ اور چند روز بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

غزوہ خندق کے اہم نکات:

اس غزوہ کے سبق آموز واقعات پر ایک نگاہ ڈال لیجئے۔

۱۔ سب سے بڑھ کر ایمان پرور چیز مسلم رضا کاروں کا والہانہ طرز عمل ہے۔ انہوں نے نہ صرف اتنے خوف ناک حالات میں بہ حیثیت مجموعی صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ خندق کی کھدائی کا کام اس طرح کیا جیسے کہ جنات کی کوئی فوج زمین کا تختہ الٹ دے۔ یہ لوگ نغمے گا گا کر اور شعر پڑھ کر جوق در جوق کام کرتے دکھائی دیتے ہیں' کوئی ٹولی الاپتی ہے۔

نحن الذین بایعوا محمدا علی الجهاد مابقینا ابدا

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے تا عین حیات جہاد کرنے کا عہد محمدؐ کے ہاتھ پر باندھا ہے۔ کسی دوسرے گروہ کی صدا گونجتی ہے:۔

اِن الاولی قد بغوا علینا اذا ارادوا فتنة ابینا

دشمن ہم پر چڑھ آئے ہیں' یہ لوگ ہمیں راہ حق سے روکتے ہیں اور ہمیں رکنے سے سخت انکار ہے پھر "ابینا ابینا" کی جب تکرار ہوتی تو فضا میں جذبہ عزیمت کی لہریں اٹھ جاتیں۔

اس والہانہ جذبہ کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کا حاصل عمر خطرے میں تھا۔ اور اسلامی تحریک اور مدینہ کی ریاست ان کے لیے ایک محبوب کی حیثیت رکھتی تھی کہ جس کے قدموں پر وہ ساری متاع حیات نچھاور کر دینا سعادت سمجھتے تھے۔ انسانی فلاح کا مقدس مشن ان کے لیے ایک جنون آموز دلبر تھا۔ لیکن اس کی دوسری وجہ اور بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا محبوب لیڈر ان کے درمیان میدان عمل میں نہ صرف موجود تھا بلکہ بہ نفس نفیس کام میں شریک۔ جونہی کھدائی کا کام شروع ہوا۔ حضورؐ اپنے مکان سے منتقل ہو کر موقع پر آ گئے اور ایک ملحقہ پہاڑی پر آپؐ کا خیمہ نصب ہو گیا۔ آج اس مقام پر مسجد ذباب جلوہ گر ہے۔ پھر حضورؐ

خود بھی دس افراد کی ایک ٹولی کے رکن تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت سلمان فارسی چونکہ دوسروں سے دس گنا کام کرتے تھے۔ لہٰذا ہر ٹولی ان کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس کشمکش کا فیصلہ آپؐ نے یہ فرمایا کہ "سلمان منا اھل البیت" (یعنی سلمان ہمارے اہل بیت کی ٹولی میں ہیں) اس طرح جناب سلمان کا اعزاز بھی ہوا۔ اور مختلف ٹولیوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں رشک کرنے کا موقع بھی نہ رہا حضورؐ نے نہ صرف مٹی ڈھوئی بلکہ کدال کا کام بھی کیا۔ بلکہ جب کوئی سخت چٹان آجاتی تو آپؐ خود پہنچتے اور کدال لے کر اسے اپنے ہاتھوں سے توڑتے۔ دو چٹانوں کے توڑنے کا واقعہ مذکور ہے۔

۲۔ ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اس موقع پر کس درجہ بے سروسامانی تھی۔ کھدائی کا سامان بنو قریظہ سے مستعار لیا گیا۔ مٹی ڈھونے کے لیے ٹوکریوں تک کا انتظام نہ تھا۔ لوگ اپنے کپڑوں کو اس کام میں استعمال کرتے رہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ سامان خوراک کی سخت قلت تھی۔ پھر چونکہ تین ہزار مردان کار دو تین ہفتے کھدائی کے کام میں اور پھر دو تین ہفتے محاذ جنگ پر مصروف رہے اور تمام زرعی و تجارتی کاروبار معطل رہے اس لیے اقتصادی بحران ناگزیر تھا۔ مسلم سپاہیوں نے پسینہ بہاتے ہوئے تین تین دن کے متواتر فاقے کاٹے۔ یہ حالت بھی خوشی خوشی سے اس لیے قابل برداشت ہوئی کہ اس فاقہ کشی میں جماعت کا سربراہ خود حصہ دار تھا۔ بلکہ اس نے بھوک کی تکلیف میں سے زیادہ حاصل کیا۔ دوسرے لوگوں نے اگر بیان کیا کہ ان کے پچکے ہوئے پیٹوں پر پتھر بندھے ہیں تو حضورؐ نے کپڑا اٹھا کے دکھلایا کہ یہاں تو دو دو پتھر باندھنے کی نوبت آگئی ہے۔ ایثار اور قربانی کی یہ صفت جبھی قائم رہتی ہے جب کہ ساری جماعت اس میں حصہ دار ہو۔ لیکن اگر کچھ لوگ اپنے آپ کو بالاتر رکھ کے ایثار و قربانی کی ذمہ داری دوسروں کے سر ڈالنا چاہیں تو ساری جماعت سے یہ خوبی جاتی رہتی ہے۔ خصوصیت سے اسلامی جماعت کے سربراہوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اس خوبی میں عام جماعت سے پیش پیش رہیں۔

۳۔ معاشرہ میں نظم اور ڈسپلن پیدا کرنا یوں بھی اسلامی تحریک کا ایک لازمی تقاضا تھا۔ لیکن میدان جنگ میں تو مشینی نظم کے بغیر دشمن سے بخوبی عہدہ برآ ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ حضورؐ نے اولین معرکہ ہی سے جنگی نظم کی تربیت دی تھی۔ اب تو تجربات وسیع ہو چکے تھے۔ اس لیے معرکہ خندق میں نظم کا پہلو خاصا مضبوط تھا۔ خندق کی کھدائی بھی انتہائی نظم اور تقسیم کار کے ساتھ کی گئی تھی۔ پھر اس کی نگرانی کے لیے اور محاذ پر قابو رکھنے کے لیے جا بجا چوکیاں قائم کی گئیں اور پہرے کی باریاں مقرر تھیں۔ علاوہ ازیں مسلم سپاہیوں کے درمیان باہمی شناخت کے لیے کوڈ مقرر تھے۔ بنو قریظہ کی غداری کی تصدیق کر کے وفد واپس آیا تو اس نے بھی اشاراتی طریق سے حضورؐ کو اطلاع دی۔ ارکان وفد نے صرف اتنا کہا' "عضل و قارہ" طے شدہ مفہوم یہ تھا کہ انہوں نے اسی طرح غداری کی ہے جیسے عضل و قارہ کے لوگوں نے معلمین کے وفد کے ساتھ کی تھی۔ پھر بھی ایک موقع پر رات کی تاریکی میں سہو ہو جانے کے باعث مسلم سپاہ کی دو ٹولیوں میں ٹکراؤ ہو گیا اور ایک جان بھی شہید ہوئی۔ کھدائی کا کام شروع ہونے سے لے کر تا دم آخر

مخلص مسلمان حضورؐ کی اجازت لیے بغیر موقع سے نہیں جاتے تھے۔

۴۔ حضورؐ نے بنو غطفان کے ساتھ مصالحتی معاہدہ کرنے کی جو راہ نکالی تھی اس سے یہ حکمت اخذ ہوتی ہے کہ تحریک اسلامی کو شدید مخالفتوں سے بچا نکالنے اور دشمنوں کا زور گھٹانے کے لیے اگر کبھی قدم پیچھے ہٹانا پڑے یا جھکاؤ اختیار کرنا پڑے تو یہ کوئی ناممکن التصور چیز نہیں ہے۔ ایک لمبی کش مکش کرتے ہوئے جن مختلف عناصر سے سابقہ پڑتا ہے' ان سے بارہا ایسے معاملات کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ تحریک اسلامی کی یہی وہ پیچیدہ ضروریات ہیں جو اسے چلانے کے لیے حکمت کو لازم ٹھہراتی ہیں۔ حالات کو سمجھنا اور ان میں سے بہترین راستہ نکال لینا ایک بصیرت مند قیادت کی لازمی صفت ہونی چاہیے۔ ایسے لوگ جو اصولوں کی طرح طریق کار کے دائرے میں بھی ایک ہی فارمولے کو ہر قسم کے حالات میں استعمال کرنا چاہیں' مشکل ہی سے تاریخ میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ حضورؐ کے لیے اس مصالحانہ تجویز کا اصل محرک یہ احساس تھا کہ کہیں انصار مدینہ یہ محسوس نہ کریں کہ ان کے سر ناقابل برداشت مصیبت آپڑی ہے۔ آپؐ نے چاہا کہ ان کی طرف سے ایسے کسی اظہار سے پہلے ہی حل نکالا جائے۔ مگر اوس و خزرج کے سرداروں نے مضبوطی دکھائی اور آپ کو تسلی ہو گئی۔

۵۔ اس مصالحانہ تجویز کو آخری طور پر عمل میں لے آنے سے قبل حضورؐ نے انصاری سرداروں سے مشورہ کر کے اصول شورائیت کو مستحکم کر دیا۔ میدان جنگ میں بھی آپؐ نے بطور خود فیصلہ کا بڑا قدم نہیں اٹھایا۔

۶۔ نعیم بن مسعود نے دشمن میں پھوٹ ڈلوانے کا جو پارٹ ادا کیا' وہ حضورؐ کی منظوری سے کیا۔ اور حضورؐ نے اس کی اجازت "الحرب خدعۃ" کے کلیہ کے تحت دی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ کشمکش اور خصوصاً جنگ کرتے ہوئے مختلف تدبیریں اور چالیں (اٹل اخلاقی حدود کے اندر رہ کر) اختیار کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں اشد ضروری ہو جاتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر سادگی سے بیٹھے حالات کو دیکھتے رہیے تو ہلاکت تک کا خطرہ ہوتا ہے۔ ابن اسحاق کی کمزور روایت کو درکنار رکھ دیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ نعیم بن مسعود نے بغیر جھوٹ بولے اور بغیر کسی اخلاقی حد کو توڑے بڑی خوبی سے ایک عظیم مہم سر کر دکھائی۔

۷۔ حضرت سلمانؓ کا بیان ہے جو حضورؐ والی ٹولی میں شریک تھے کہ ایک چٹان کھدائی میں ایسی آئی کہ مجھ سے ٹوٹتی نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ قریب ہی تھے۔ آپؐ نے کدال مجھ سے لے کر ضربیں لگائیں۔ پہلی ضرب لگا کر فرمایا کہ یمن میرے لیے فتح ہوا۔ دوسری ضرب پر فرمایا کہ شام اور المغرب میرے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ تیسری بار فرمایا کہ خطہ مشرق (ایران) مفتوح ہوا۔ یہ بشارت دو پہلوؤں سے بڑی اہم ہے ایک تو اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضورؐ شروع سے لے کر آخر تک اپنی تحریک کے آخری مراحل

کامیابی کا ایک مستقل تصور رکھتے تھے۔ اور اس تصور کے حق میں آپؐ کے دل پر آسمانی القاء بھی ہوتا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ انتہائی ناسازگار حالات میں جب کہ قوت کم اور مصائب زیادہ تھے' آپؐ کو یہ یقین رہا کہ یہ یہ ہو کر رہنا ہے۔

بلکہ ضمناً ہم یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آپؐ کا یہ مقولہ کہ اسلام کے سامنے عرب و عجم مفتوح ہوں گے۔ مکہ سے لے کر مدینہ تک اتنی بار سامنے آیا ہے اور اس دور میں ایسا زبان زد عام رہا ہے کہ اس کی نوعیت تحریک اسلامی کے مستقل سلوگن کی سی معلوم ہوتی ہے۔ ہم اس پر منفصل کلام کسی دوسرے مقالے میں کریں گے۔ اضطراب کی سخت گھڑیوں میں اسی بشارت پر طنز کرتے ہوئے معتب بن قشیر نے کہا تھا کہ "ایک طرف تو محمد (ﷺ) ہمیں قیصرو کسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں دلواتے ہیں اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص مارے خوف کے اجابت کے لیے بھی نہیں نکل سکتا"۔

۸۔ اس معرکہ میں مخصوص حالات کی بنا پر اگرچہ خواتین اور بچوں کو قلعوں میں بھیج دیا گیا تھا۔ تاہم اس موقع پر بھی خواتین نے اونچے کردار کا ثبوت دیا۔ ایک خاتون رشیدہؓ کچھ دوائیں اور مرہم پٹی کا سامان لے کر محاذ پر پہنچیں اور انہوں نے زخمیوں کی خدمت کی۔ سعدؓ بن معاذ کی مرہم پٹی بھی انہی نے کی۔ خواتین کے ایک کیمپ کے گرد ایک یہودی چکر لگاتا دیکھا گیا۔ حضرت صفیہؓ (حضورؐ کی پھوپھی) وہیں تھیں۔ انہوں نے حسانؓ بن ثابت سے جو علالت کی وجہ سے وہیں رکھے گئے تھے کہا کہ اس کی خبر لے ڈالو۔ انہوں نے معذرت کی تو اس شیر دل خاتون نے خود ہی چوب سے اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر اس کا سر بھی کاٹ کر خود ہی قلعہ سے پرے پھینکا۔ اس واقعہ کے بعد کسی دشمن کو ادھر آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حضرت عائشہؓ جس قلعہ میں تھیں۔ اسی میں سعدؓ بن معاذ کی والدہ بھی مقیم تھیں۔ حضرت عائشہؓ قلعہ سے نکلیں اور قدموں کی آہٹ سن کر دیکھا تو سعدؓ حربہ ہاتھ میں لیے تیز تیز جا رہے تھے۔ یہ شعران کی زبان پر تھا۔

لبث قلیلا تدرک الھیجا جمل　　لا باس بالموت اذا الموت نزل

ذرا رکو کہ ایک اور جوان بھی معرکہ میں شریک ہولے۔ موت کی جب گھڑی آگئی ہو تو پھر موت سے کیا ڈرنا!

سعدؓ کی والدہ نے بیٹے کی آواز سنی تو پکاریں۔ "بیٹا لپک کے جاؤ' تم نے تو دیر لگا دی"۔ شعر کا مفہوم پورا ہو گیا۔ جب سعدؓ کی رگ اکحل میں تیر آ کے لگا اور پھر زخم جان لیوا ثابت ہوا۔ ایک ماں کا بہادرانہ جذبہ دیکھیے۔

۹۔ معرکہ احزاب (خندق) کے زلزلہ افگن حالات میں گھرے ہوئے مخلص مسلمانوں نے جب مصائب کا یہ طوفان دیکھا تو وہ بے اختیار پکار اٹھے کہ یہ تو ٹھیک وہی مراحل ہیں جن کے پیش آنے کی اطلاع پہلے سے خدا و رسولؐ نے ہمیں دے رکھی تھی --- وہ مراحل کہ جن سے گزرے بغیر نہ دنیا میں غلبہ حق ممکن ہے اور نہ آخرت میں جنت ہاتھ آ سکتی ہے۔ سورہ احزاب میں ایسے پیکر ہائے اخلاص کی تحسین کی گئی ہے

لوگ تحریک کا اصل سرمایہ قوت تھے۔

۱۰۔ حضورؐ کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ آپؐ نے اپنی جماعت کو ایک مستقل جداگانہ تہذیب پر اٹھاتے ہوئے یہ کلیہ خوب اچھی طرح دلوں میں اتارا کہ معاشرت و ثقافت کے دائرے میں دوسری قوموں اور ملتوں کی تقلید ہرگز نہ کی جائے بلکہ نئی تمدنی قدریں اپنے ہی اصولوں کے سانچے میں ڈھالی جائیں اور ہر ثقافتی نقش اپنے ہی مخصوص اسلامی ذوق کے رنگ سے تیار کیا جائے۔ لیکن جب ہم حضورؐ کو خندق کے ایرانی طریق دفاع کو کھلے دل سے قبول کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت کھلتی ہے کہ مادی ذرائع و وسائل، عملی فنون (Technology) اور تجربی تدابیر کا لین دین ساری انسانیت کے درمیان کھلا رکھا گیا ہے۔ کسی ایک وقت میں جو وسائل، عملی فنون اور تجربی تدابیر زیر عمل آئیں، ہرگز ضروری نہیں کہ ان کو ہمیشہ ہر قسم کے حالات اور ہر دور تمدن میں جوں کا توں لازم سمجھا جائے اور یوں سوچا جائے کہ ان چیزوں پر بھی شریعت یا سنت کا عنوان زیب دے سکتا ہے۔ اس دائرے میں دوسری قوموں اور تہذیبوں سے استفادہ لازم ہے۔ ایک مسلم ریاست اور اس کی قیادت کا دینی فرض یہ ہے کہ وہ وقت کے زیادہ سے زیادہ موثر ذرائع کو کام میں لائے۔ اپنے باشندوں کو عملی فنون میں پیش پیش رکھے اور کامیاب ترین تجربی تدابیر دوسروں سے بھی اخذ کرے اور خود بھی ایجاد کرے۔

معرکہ خندق سے فتح مکہ تک:

ان دو بڑی جنگوں کے درمیان دو برس کے زمانے میں بعض اہم سیاسی اقدامات اور چھوٹی چھوٹی فوجی کارروائیاں عمل میں آئیں۔ حالات کے تسلسل کو نگاہ میں رکھنے کے لیے ان پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

بنو قریظہ یہود کے فساد ذہن و اخلاق کی ایک گھناؤنی مثال تھے۔ بدزبانی اور بدکرداری ان میں عام تھی۔ اسلامی ریاست کے دستوری معاہدہ میں بندھ کر اس کے شہری ہونے کے باوجود ہر طرح کی سازشیں اور فتنہ انگیزیاں کرتے چلے آرہے تھے۔ لیکن معرکہ خندق میں کھلم کھلا عہد شکنی کر کے حملہ آور دشمنوں سے ان کا سانٹھ گانٹھ کر لینا انتہا درجہ کا غدارانہ اقدام تھا۔ جس کے مجرمین کے لیے سزائے موت کسی بھی دور اور کسی بھی نظام میں خلاف انصاف نہیں ہو سکتی۔ ان لوگوں نے اپنے ارادوں کے لحاظ سے تو گویا سرور عالمؐ، اسلامی جماعت، تحریک امن و انصاف اور مدینہ کی ریاست کا خاتمہ کر ہی ڈالا تھا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کو کیفر کردار تک نہ پہنچایا جاتا۔ حملہ آوروں کے رخصت ہو جانے کے بعد حضورؐ اور مسلم رضا کار صبح صبح خندق کے مورچے چھوڑ کر گھروں میں واپس پہنچے۔ ہتھیار اتار کر حضورؐ نے غسل فرمایا۔ اور اسی دوران میں القاء ہوا کہ بنو قریظہ کی طرف کوچ کیا جائے۔ ابھی سپاہ نے کمریں بھی نہ کھولی تھیں کہ ان کو ایک نئی مہم کے لیے طلب کر لیا گیا۔ مسلم فوج نے اس غدار قبیلے کو محاصرہ میں لے لیا۔ جس کا تسلسل ۲۵ روز قائم رہا۔ عین اس نازک موقع پر انھوں نے قلعہ پر سے حضورؐ کو گالیاں تک دیں۔ آخر بنی قریظہ بالکل زچ ہو

گئے۔ اور ان کے سردار کعب بن اسد نے الجھن سے نکلنے کے لیے ان کے سامنے مختلف صورتیں رکھیں جن میں سے کسی کو انہوں نے قبول نہ کیا۔ آخر بلا شرط انہوں نے اپنے آپ کو مسلم ریاست کے حوالے کر دیا۔ حضورؐ نے ان سے گفت و شنید کر کے ان کی رضامندی سے سعد بن معاذ کو حکم ٹھہرایا اور دونوں طرف سے پورے اعتماد کے ساتھ فیصلہ ان پر چھوڑ دیا گیا۔ سعد بن معاذ نے یہود ہی کے قانون تورات کو سامنے رکھ کر فیصلہ دیا کہ ان کے نوجوانوں کو قتل کی سزا دی جائے۔ اس طرح ایک فتنہ طراز گروہ کا بحیثیت ایک جنگی و سیاسی قوت کے خاتمہ ہو گیا۔ واضح رہے کہ تلخی کے اس موقع پر بھی بنو قریظہ کا ایک فرد عمر بن سعد دین حق کے حصہ میں آیا۔ اس سعید روح نے بنو قریظہ کو پہلے سے بد عہدی سے روکنا چاہا تھا۔ انتہائی بنجر زمین نے بھی ایک گل رنگین تلواروں کی کڑکتی بجلیوں کی چھاؤں میں پیش کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد انقلاب دشمن سازشیوں کا ایک نہایت ہی سرگرم لیڈر ابو رافع عبداللہ بن الحقیق (جسے سلام بھی کہتے تھے) جس نے جنگ خندق کے لیے فوجیں چڑھالانے میں خاصی تگ و دو کی تھی۔ قبیلہ خزرج کے چند نوجوانوں کے ہاتھوں شام میں قتل ہوا۔

محمدؓ بن مسلمہ انصاری ۳۰ سواروں کے ساتھ سرحدی گشت پر تھے کہ علاقہ نجد کے سردار ثمامہ بن اثال سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ مدینہ کی طرف اس کا رخ دیکھ کر کمانڈر موصوف نے گرفتار کر لیا اور حضورؐ کے سامنے پیش کیا۔ اس نے دربار نبوت میں اتنا ہی کہا کہ "اے محمد! (ﷺ) اگر قتل کرو تو ایک مستوجب قتل کو قتل کرو گے۔ اگر چھوڑو گے تو ایک احسان شناس کو چھوڑو گے اور اگر مال چاہتے ہو تو مقدار بتاؤ‘ دیا جائے گا"۔ حضورؐ نے عزت مندانہ طریق سے اسے رہا کر دیا اور وہ اس محسنانہ طرز عمل سے متاثر ہو کر اسلامی جماعت کا رکن بن گیا۔ ثمامہؓ نے قبول اسلام کے بعد اپنا دل حضورؐ کے سامنے یہ کہہ کر پوری طرح کھول دیا کہ "آج سے پہلے حضورؐ کے چہرے سے بڑھ کر کوئی اور چہرہ مبغوض نہ تھا اور آج اس چہرے سے زیادہ محبوب چہرہ کوئی نہیں"۔ اس طرح گویا نجد جیسے اہم سیاسی علاقے میں تحریک کے لیے راستے کھل گئے۔ اسی ثمامہ نے مکہ میں جا کر قریش کو چیلنج کیا تھا کہ اب تم کو غلہ کا ایک دانہ بھی نہ مل سکے گا۔

اہل رجیع جو تعلیمی وفد کے دس ارکان کے قاتل تھے۔ ان کی سزا دہی کے لیے بطور پولیس ایکشن حضور نے دو سو سواروں کے ساتھ اقدام فرمایا۔ وہ لوگ بھاگ گئے۔ بغیر کسی جھڑپ کے واپسی ہوئی۔ بطور سیاسی تدبیر کے حضورؐ نے دس آدمیوں کو طلایہ گردی کے لیے کراع الغمیم تک بھیجا تاکہ قریش جان لیں کہ مدینہ بیدار ہے۔

علاقہ بنی غطفان کی جانب مدینہ سے ایک منزل کی دوری پر ذی قرد نامی چشمہ ہے اس طرف مدینہ کے سرکاری اونٹوں اور مویشیوں کی چراگاہ تھی۔ عسفان کا ایک شخص راعی تھا۔ حضورؐ نے رباحؓ نامی غلام کو خبر گیری کے لیے بھیجا۔ سلمہ بن الاکوع فوجی حیثیت سے محافظ تھے۔ وہ بھی ڈیوٹی پر جا رہے تھے۔ علی الصباح یہ لوگ راستہ ہی میں تھے کہ عیینہ بن حصن فزاری (یا عبدالرحمٰن بن عیینہ) نے اونٹوں پر ڈاکہ ڈالا۔ اور ان

کو ہانک لے چلے۔ راعی کو ڈاکوؤں نے قتل کیا اور اس کی عورت کو بھی ساتھ لے گئے۔ سلمہ نے یہ غارت گری دیکھی تو مدینہ کی طرف رخ کر کے "یا صباحاہ" کا نعرہ لگایا اور رباح کو کمک لینے کے لیے دوڑایا۔ خود تن تنہا ڈاکوؤں کے تعاقب میں دوڑے۔ تیر اندازی کے ماہر تھے۔ ٹولی کے پیچھے سے نعرہ لگا کر تیر پھینکتے۔ اور ہر تیر نشانہ پر لگ کر ایک نہ ایک مجرم کو زخمی کر دیتا۔ پکارتے کہ "میں ابن الاکوع ہوں آج امتحان کی گھڑی ہے کہ کس نے اپنی ماں کا کتنا دودھ پیا ہے"۔ راستہ پہاڑی تھا اور آس پاس درخت تھے۔ ڈاکو متوجہ ہوتے تو یہ چھپ جاتے اور ناوک پھینکتے۔ گویا گوریلا طریق جنگ سے کام لے رہے تھے۔ ایک موقع پر پتھر برسا کر دشمن کو زچ کیا۔ ڈاکوؤں نے بدحواس ہو کر پہلے تو اونٹ چھوڑے۔ پھر بوجھ گھٹانے کے لیے چادریں اور نیزے پھینکتے گئے۔ ادھر مدینہ سے فوری طور پر مقدادؓ بن عمرو کو سلمہؓ کی امداد کے لیے روانہ کرنے کے بعد حضورؐ بہ نفس نفیس ایک دستہ لے کر نکلے۔ چند مسلم سپاہی باقی ساتھیوں سے پہلے ہی پہلے ڈاکوؤں کے سر پر جا پہنچے۔ وہ بھاگے محرزؓ بن نضلہ المعروف بہ اخرمؓ شہادت کے شوق میں تن تنہا سب سے آگے نکل گئے اور مقابلہ شروع کر دیا۔ شہادت پائی۔ بعد میں ابوقتادہؓ نے ایک بڑے ڈاکو (عبدالرحمٰن بن عیینہ یا حبیب بن عیینہ) کو موت کے گھاٹ اتارا۔ حضرت سلمہؓ نے مزید تعاقب کیا اور دو گھوڑے چھین کر واپس آئے۔ پلٹ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپؐ ایک سو سپاہی میرے ساتھ روانہ فرمایئے تو میں سب کا خاتمہ کر آؤں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "خدا نے جب تمہیں غلبہ دے ہی دیا ہے تو اب نرمی سے کام لو"۔ ان حضرات کی جانبازی کو دیکھیے کہ ایک ایک فرد میں جیسے کہ بجلیاں بھری تھیں۔ ان کا کردار عام جنگجوؤں اور مار دھاڑ کرنے والوں سے بین طور پر مختلف تھا۔ یہ ایک درخشاں نصب العین کے جانباز تھے۔ جس کی محبت انہیں بغیر کسی تردد کے جان جوکھوں میں ڈالتی تھی اور یہ جس معرکے میں پڑتے بھاری تھے۔

ایک طلایہ گرد دستہ عکاشہ بن حصن اسدی کی سرکردگی میں سرحدی گشت کے لیے نکلا۔ افواہ یہ تھی کہ بنی اسد مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے مجتمع ہو رہے ہیں۔ دستہ جب علاقے میں پہنچا تو مفسدین مکان خالی چھوڑ کر منتشر ہو گئے۔ چراگاہ سے سپاہی ان کے دو سو اونٹ ضبط کر لائے۔

ربیع الاول ۶ ھ میں ایک دعوتی و تعلیمی وفد محمد بن مسلمہؓ کی امارت میں بنی ثعلبہ کی طرف بھیجا گیا تھا۔ یہ حضرات ذی القصہ پہنچے کہ رات کو سوتے میں انہیں شہید کر دیا گیا۔ صرف محمد بن مسلمہ سخت زخمی حالت میں بچے اور کوئی مسلمان ان کو پیٹھ پر لاد کر مدینہ لایا۔ چنانچہ ربیع الثانی میں حضرت ابوعبیدہؓ چالیس سپاہیوں کا دستہ لے کر مجرمین کی سرکوبی کے لیے رات کو روانہ ہوئے اور صبح صبح ہلہ بول دیا۔ مفسدین بھاگ گئے۔ مفرورین کی املاک ضبط کر لی گئیں۔

زیدؓ بن حارثہ ایک طلایہ گرد پارٹی لیے ہوئے جموح (بطن نخلہ کے پاس) کی طرف سے گزرے یہاں بنو سلیم کی بستیاں تھیں جو مدینہ کے لیے معاندانہ گروہ تھا۔ باہم برسر جنگ فریقین ایک دوسرے کو نقصان

پہنچانے اور کمزور کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں دیا کرتے۔ پھر ایک عورت حلیمہ نے ان کے بارے میں مخبری بھی کی تھی۔ پارٹی نے ہلکا سا چھاپہ مارا اور کچھ افراد کو قید کر لائے اور کچھ مویشی بھی قبضے میں کر لیے۔ بعد میں حضورؐ نے گرفتار شدگان کو رہا کر دیا۔ کیونکہ حلیمہؓ نے غلط مخبری کی تھی۔

زیدؓ بن حارث ایک چھوٹا سا دستہ اپنے علاوہ (۱۴ افراد) لے کر مجرمین ذی القصہ کی سزا دہی کے لیے پولیس کارروائی کے طور سے بہ جانب طرق (بنی ثعلبہ کا چشمہ) روانہ ہوئے۔ مجرمین بھاگ گئے۔ ان کے ۲۰ شتر ضبط کر لیے گئے۔

دومتہ الجندل کی اقتصادی' سیاسی اور دفاعی اہمیت کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ابھی تک یہ انتہائی مرکزی مقام باعث خطر تھا۔ حضورؐ پہلے ادھر اقدام کر کے تکمیل مہم کے بغیر واپس آ گئے تھے۔ اب کی بار حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو دعوتی مشن پر دومتہ الجندل بھیجا گیا۔ ان کی افہام و تفہیم سے بہت بڑے مقامی قبیلہ کا عیسائی سردار اصبغ بن عمرو کلبی دائرہ اسلام میں آیا اور اس کے ساتھ عوام قبیلہ بھی عیسائیت ترک کر کے مسلمان ہوئے۔ سردار نے اپنی لڑکی تماضر عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے نکاح میں دے کر مسلم ریاست سے اپنا سیاسی رابطہ مستحکم کر لیا۔

فدک سے مدینہ میں اطلاع آئی کہ قبیلہ بنی سعد بن بکر فوجی قوت جمع کر رہا تھا' تاکہ اسلامی حکومت کے خلاف یہود خیبر کو حملہ کرنے میں مدد دے۔ حضرت علیؓ نے دو سو سپاہی لے کر بڑی احتیاط سے مارچ کیا۔ راتوں کو چلتے اور دن کو چھپ چھپا کے پڑ رہتے۔ راستے میں بنی سعد کا ایک قاصد خیبر جاتا ہوا پکڑا گیا جو یہ پیغام لے جا رہا تھا کہ امداد اس شرط پر دی جائے گی کہ خیبر کی کھجوریں بنی سعد کو دی جائیں۔ حضرت علیؓ نے ناگہانی حملہ کیا اور دشمن گھبرا کر بھاگ نکلا۔ مسلم فوج نے بغیر کوئی نقصان اٹھائے بنی سعد کے مویشی قبضے میں لے لیے۔

ایک حادثہ یہ پیش آیا کہ زیدؓ بن حارثہ اپنا اور دوسرے صحابیوں کا سرمایہ اور مال لے کر شام کے تجارتی سفر پر گئے۔ واپسی پر وادی القریٰ میں بنی بدر نے ان کے قافلہ پر ڈاکہ ڈالا۔ قافلہ کی تعداد کم تھی' لہٰذا ڈاکوؤں نے ۹ آدمیوں کو شہید کیا اور ایک کو زخمی کر کے سارا مال چھین لے گئے۔ آخر دو مہینے بعد حضرت ابوبکرؓ کی سرکردگی میں مجرموں کی سزا دہی کے لیے مہم بھیجی گئی۔ چنانچہ کچھ ڈاکہ زن مقتول ہوئے' باقی بھاگ گئے۔

عقل اور عرینہ نامی دو قبائل کے کچھ لوگ مدینہ آ کر مسلمان ہوئے۔ مگر نئی آب و ہوا میں بیمار پڑ گئے مدینہ کے باہر مقیم ہو کر سرکاری انتظام سے زیر علاج رہے۔ اچھے ہوئے تو سرکاری چرواہے کو پکڑا۔ اس کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیری۔ پھر اسے بے رحمانہ طریقے سے قتل کیا اور مویشی ساتھ لے کر بھاگ گئے۔ حضورؐ نے کرزؓ بن خالد فہری کی سرکردگی میں ۲۰ سواروں کا دستہ ان کی گرفتاری کے لیے بھیجا' گرفتار ہوئے۔ ارتداد' ڈاکہ' قتل اور محاربہ اور بے رحمانہ کارروائیوں کے گوناگوں جرائم کے تحت ان کو عبرت ناک

سزا دی گئی اور ٹھیک عدل سے انتقام لیا گیا۔ ورنہ اگر ایک منظم حکومت کے خلاف ہر کوئی اس طرح کی جسارت کرنے لگے تو سارا معاملہ مذاق بن کر رہ جائے اور کوئی نظم ایک دن نہ چلایا جا سکے۔

اس دور کا سب سے بڑا واقعہ جس کے دوررس اثرات سیاسی اور دفاعی حالات پر پڑے' صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ حضورؐ ذی قعدہ ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر فروکش ہوئے۔ قریش سے مصالحتی معاہدہ باندھ کر آپؐ بہت بڑے حریف سے فارغ ہو گئے۔ اور دعوتی اور تعمیری کام کرنے کے لیے وسیع مواقع پیدا ہو گئے۔ نیز مدینہ کے متصلہ علاقوں میں شرانگیز عناصر کی سرکوبی آسان ہو گئی۔

حدیبیہ سے سرور عالمؐ ذی الحجہ میں واپس مدینہ آئے اور چند روز مقیم رہ کر ۷ محرم ۷ھ کو خیبر روانہ ہو گئے۔ خیبر اسلامی ریاست کے خلاف ایک نہایت ہی فعال سیاسی اڈا بھی تھا اور جنگی سازشوں کا مرکز بھی۔ خیبر کے یہود نہ صرف احد کے پس منظر میں محاربانہ حرکتیں کر چکے تھے بلکہ جنگ احزاب میں ان کا پارٹ بہت ہی سرگرمی کا تھا۔ مدینہ کی زندہ و بیدار حکومت اپنی گردن پر ایک تنے ہوئے چھرے کا وجود بہرحال گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس معرکہ کی نوعیت غیر معمولی ہے اور بڑے معرکوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہم نے اسے معمولی کارروائیوں میں اس لیے رکھا ہے کہ یہ بدر' احد اور خندق کے سلسلہ جنگ کی کڑی نہیں ہے' یہ ایک مختلف نوعیت کی کارروائی ہے۔ تحریک اسلامی کی دعوت چونکہ ابھی تک بین الاقوامی دور میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ اور قریش اور اہل عرب کی طرح سے دوسری قوموں اور دوسرے مذہبوں کے لوگ درجہ اول کے مخاطب نہیں تھے۔ اس لیے یہود خیبر سے انقلابی دعوت کی بنا پر کوئی تصادم نہ تھا۔ ان کے سیاسی جرائم ہی اصل وجہ اقدام تھے۔ اور اسی لیے ان سے معاملہ بھی سیاسی جنگ کا سا کیا گیا' وہ بازی ہر گئے تو ان کی سرزمین کو باقاعدہ مفتوح بنایا گیا۔ اور ان کو رعیت کی حیثیت دی گئی۔ حضورؐ نے یہ طرز معاملہ صرف علاقہ خیبر ہی میں روا رکھا اور کہیں نہیں۔ بہرحال قریش کی طرف سے مامون ہو جانے کے بعد اب خیبر کی طرف چڑھائی کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ تھی۔ اس موقع پر صرف انہی لوگوں کو مہم میں شریک کیا گیا جو خالصتاً للہ جہاد کا جذبہ لے کر چلیں۔ واضح رہے کہ اس مہم میں خواتین بھی بغیر اطلاع شریک ہو گئی تھیں بعد میں حضورؐ کو پتہ چلا تو خفا ہو کر ان سے باز پرس کی۔ کہ تم لوگ کیوں آئے؟ لیکن جب انہوں نے لشکر کی خدمت کرنے کا جذبہ ظاہر کیا تو آپؐ نے رضامندی دے دی۔ بلکہ آخر میں مال غنیمت میں سے حصہ بھی دیا۔ مدینہ میں سباعؓ بن عرفطہ کو قائم مقام بنا کر چودہ سو سپاہ کے ساتھ حضورؐ روانہ ہوئے۔ بمقام رجیع پڑاؤ ڈالا گیا۔ مسلم فوج جب خیبر والوں کے سامنے اچانک نمودار ہوئی' تو وہ بھاگ کر قلعوں میں پناہ گزین ہو گئے۔ پہلا حملہ قلعہ النطاۃ پر ہوا۔ دونوں طرف سے تیر پھینکے جاتے تھے۔ بالآخر فتح ہوئی۔ پھر قلعہ صعب کا محاصرہ ہوا۔ مرحب یہودی مبارزت کو نکلا۔ عامرؓ بن الاکوع مقابلے میں آئے اور شہادت پائی۔ بہرحال محاصرہ فتح پر منتج ہوا۔ قلعہ قموص سب سے زیادہ مستحکم تھا اور حضورؐ شدید درد سر کی وجہ سے خود شریک معرکہ ہونے سے معذور رہے۔ آپؐ نے خاص اعلان کے ساتھ حضرت علیؓ کو اس مہم کے لیے نامزد

فرمایا۔ قلعہ سے مرحب رجز پڑھتا ہوا آیا۔ محمدؓ بن مسلمہ نے بھائی کا انتقام لینے کے جذبے سے بڑھ کر ہاتھ مارا تو اس کی ٹانگیں کٹ گئیں۔ پھر حضرت علیؓ کی تلوار نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ مرحب کے بعد اس کا بھائی یاسر نکلا۔ مقابلے پر حضرت زبیرؓ بن العوام آگے بڑھے۔ اور ان کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔ یہ اہم ترین قلعہ ۲۰ روز کے محاصرہ کے بعد حضرت علیؓ کی کمان میں فتح ہوا اور اسی لیے آنجناب کو فاتح خیبر کہا جاتا ہے۔ یہود جب اس قلعہ سے بھاگ گئے تو مشہور دشمن اسلام حیی ابن اخطب کی صاحبزادی جناب صفیہؓ مع اپنی دو چچا زاد بہنوں کے اسیر ہو کر آئیں۔ یہ ایک معزز سردار کی بیٹی تھیں اس لیے صحابہ کے مشورے سے حضورؐ نے ان کو اپنے حرم میں لیا۔ پھر یہودی قلعہ الزبیر میں جا مجتمع ہوئے۔ یہاں سہ روز محاصرہ کے بعد وہ باہر نکل کر زور شور سے لڑے۔ دس یہودی مارے گئے چند مسلم سپاہی شہید ہوئے اور قلعہ پر قبضہ ہو گیا۔ اب تین قلعے الکتیبہ' الوطیح' اور السلالم باقی تھے۔ یہود کی تمام جانی و مالی قوت اب ان کے اندر اکٹھی ہو گئی تھی۔ مسلم فوج نے چودہ روز محاصرہ جاری رکھا۔ بالآخر منجنیق نصب کر کے سنگ باری کرنے کا فیصلہ ہوا۔ محصورین کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے آپ کو بے بس پایا۔ گفتگوئے مصلحت کے لیے سلسلہ جنبانی کی۔ گفتگو کے بعد ان کے لیے فیصلہ ہوا کہ صرف جانیں لے کر چلے جائیں۔ جانے سے پہلے انہوں نے دوبارہ درخواست کی کہ ان کو زمین اور باغوں کی کاشت پر لگا لیا جائے اور یہیں رہنے دیا جائے۔ حضورؐ نے فراخ دلی سے یہ درخواست قبول کی اور نصف پیداوار پر معاملہ ہوا۔ فدک والوں نے اس صورت معاملہ کی خبر سنی تو انہوں نے بھی اسی کے لیے منظوری مانگی۔ ان کو بھی منظوری مل گئی۔ اس کارروائی کے دوران میں دو یہودی نوجوان حویصہؓ اور محیصہؓ اسلامی تحریک کے دائرے میں آ گئے۔

اس معرکہ کے دوران میں جب کہ قلعہ نطاہ محاصرے میں تھا۔ اہل خیبر کا ایک حبشی چرواہا اسودؓ راعی معاذ ہی انقلاب سے دو چار ہوا۔ اس نے یہود سے دریافت کیا کہ کس سے لڑائی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس شخص سے جو نبوت کا دعوی کرتا ہے۔ اس کی روح میں اتنی بات سن کر تحریک پیدا ہوئی اور اس نے حضورؐ کی خدمت میں آ کر معلوم کیا کہ آپؐ کی دعوت کیا ہے؟ حضورؐ نے اسلام کا عقیدہ توحید اس پر واضح کیا۔ اس کے دل و دماغ اسلام کے سامنے مفتوح ہو گئے۔ پھر اس نے پوچھا کہ یہود کی بکریاں میرے ساتھ ہیں' ان کو کیا کروں۔ حضورؐ چاہتے تو ان محاربین کی بکریاں قبضہ میں کر کے فوج کے سامان خوراک میں شامل کر سکتے تھے۔ مگر آپؐ نے اسود راعی کو ایسے موقع پر بھی امانت داری کا حق ادا کرنے کی تلقین کی اور اس نے حضورؐ کے ارشاد کے مطابق ان کو قلعہ کے قریب لے جا کر کنکریوں سے آبادی کی طرف ہانک دیا۔ پھر اس نے واپس آ کر دریافت کیا کہ میں اگر لڑ کر مارا جاؤں' تو آخرت میں میرا کیا بنے گا۔ حضورؐ نے جنت کا مژدہ دیا۔ وہ پیکر اخلاص لڑا اور اپنی جان سچائی کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھا دی۔

ایک نو مسلم اعرابی خیبر کی مہم میں شریک ہو کر آئے تھے۔ ان کے لیے جب مال غنیمت میں حصہ لگایا گیا۔ تو انہوں نے کہا۔ "یا رسول اللہ! میں آپؐ کے پیچھے اس چیز کے لیے نہیں آیا۔ میں تو اس لیے آیا

ہوں کہ میری رگ جان راہ حق میں کٹے اور جنت نصیب ہو"۔ حضورؐ نے بشارت دی کہ تمہاری یہ مراد بھی پوری ہو جائے گی۔ یہ مجسمہ ایمان بھی رن میں اترا اور شہادت کی مقدس موت نے اسے سینے سے لگا لیا۔

فتح خیبر کی مسرتیں کئی گنا بڑھ گئیں۔ جب یکایک حضرت جعفرؓ بن ابی طالب بہت سے ساتھیوں کے ساتھ حضورؐ اور اپنی ہم مسلک ایمانی برادری کے ساتھ آملے۔

حجاج بن علاط سلمی جو ارض بنی سلیم کی کانوں کے مالک تھے اور اسی زمانے میں مسلمان ہوئے تھے۔ فتح خیبر کی تکمیل سے قبل حضورؐ سے اجازت لے کر تیزی سے مکہ پہنچے تا کہ اپنی بیوی اور مال کثیر کو بروقت نکال لائیں۔ درپردہ انہوں نے حضرت عباسؓ کو فتح خیبر کا مژدہ سنایا۔

خیبر کا قضیہ طے پا چکا تو مسلم فوج نے وادی القریٰ کا رخ کیا جہاں یہود کے ساتھ کچھ اہل عرب بھی مقیم تھے۔ یہاں بھی مخالفت کا گڑھ تھا۔ فوج کے جاتے ہی سامنے سے پتھر برسائے گئے اور مدعم نامی غلام گھائل ہوا۔ حضورؐ کی طرف سے بار بار اسلام کی دعوت دی جاتی رہی۔ مگر ادھر سے ایک ایک آدمی مقابلے پر نکلتا اور ختم ہوتا گیا۔ متواتر گیارہ آدمی اس طرح آتے رہے۔ رات ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اگلے روز صبح کے جلد ہی بعد فتح ہوئی۔ سابق نظائر کے مطابق وادی القریٰ والوں کو بھی زمینوں اور باغوں کی کاشت کا کام دے دیا اور ان پر اپنا انتظامی حاکم مقرر کر دیا۔ اہل تیما کے یہود نے جب اس صورت معاملہ کی اطلاع پائی تو انہوں نے ازخود مصالحت کی خواہش کی اور ان کو بھی اراضی پر برقرار رہنے دیا گیا۔

اس فاتحانہ کارروائی کے نتیجے میں جن وسیع زرخیز قطعات اراضی پر قبضہ ہوا ان میں سے فدک اور خیبر کے رقبے سرکاری زمین (State Land) قرار دیئے گئے۔ اور ان سے ریاست کے سربراہ کار ان کے لواحقین اور معاشرہ کے غرباء کی کفالت کی جانے لگی۔ انہی خاص قطعات کے بارے میں حضورؐ کی وفات کے بعد کچھ اختلاف ہوا۔ مگر جناب صدیقؓ اور بصیرت مند صحابہؓ نے ان کو جوں کا توں سرکاری ملکیت میں رکھا۔ بقیہ اراضی مسلمانوں کی ملکیت میں دی گئی اور ان کی پیداوار ان میں تقسیم ہونے لگی۔

حضرت عمرؓ بن الخطاب طلایہ گرد دستہ لے کر بنو ہوازن کو انتباہ دینے گئے۔ بنو ہوازن منتشر ہو گئے۔

بشیر بن دارم (یا اسیر بن رزام) یہودی کے متعلق خبر آئی کہ بنو غطفان کو جنگ کے لیے تیار کر رہا ہے عبداللہؓ بن رواحہ ایک دستہ لے کر گئے۔ کسی طریقے سے انہوں نے بشیر کو مدینہ چل کر حضورؐ سے گفت و شنید کرنے پر آمادہ کر لیا۔ مسلمان چونکہ تیس کی تعداد میں تھے۔ اس نے بھی احتیاطاً تیس آدمی ساتھ لیے اور ہر اونٹ پر ایک یہودی اور مسلمان مشترک ہو کر سوار ہوئے۔ بشیر یا اسیر نے رات کی تاریکی میں عبداللہؓ کی تلوار پر ہاتھ ڈالا۔ وہ چونک کر اونٹ سے کود گئے اور تلوار سونت لی۔ دونوں سرداروں کو اس حالت میں دیکھ کر دونوں کے ساتھی بھی لڑنے لگے۔ پورے اکتیس یہودی کھیت رہے۔

محرم ۷ ھ میں یہ اطلاع پا کر بنو غطفان' بنو محارب' بنو ثعلبہ اور بنو انمار حملہ کے لیے تیار ہو رہے ہیں

حضورؐ ۴۰۰ افراد کا دستہ لے کر گشت کے لیے نکلے۔ دشمن منتشر ہو گیا۔ یہ ذات الرقاع کی مہم کہلاتی ہے۔

صلح حدیبیہ کے بعد قریش کے لیے تجارتی شاہ راہ کھل گئی تھی۔ مگر ابو جندلؓ قریش کی قید سے بھاگے تو مدینہ میں معاہدہ کی وجہ سے جانے کا موقع نہ پا کر وہ ساحل کے متصل شام کی ایک پہاڑی پر مقیم ہو گئے۔ بعد میں ابو بصیر اور دوسرے لوگوں نے بھی وہیں ٹھکانا بنایا اور خاصی جمعیت ہونے لگی۔ انہوں نے قریش کے ایک تجارتی قافلے پر حملہ کیا اور مال چھین لیا۔ مگر حضورؐ کی سفارش ان تک پہنچی' تو انہوں نے مال واپس کر دیا۔ اب قریش کو اپنی سب سے کڑی شرط معاہدہ کے نقصان کا اندازہ ہوا اور پچھتائے۔ بعد میں حضورؐ نے ابو جندلؓ کو مدینہ بلا لیا۔

بنو طرح نے اصحاب بشیر بن سوید کو قتل کیا تھا۔ ان کی تنبیہہ کے لیے عبداللہ بیش ایک پارٹی لے کر گئے۔ معمولی جھڑپ ہوئی۔ دشمن لوگوں کے کچھ اموال ضبط کر لیے گئے۔

ہنید بن عوص جزری نے مسلم ریاست کے خلاف یہ سنگین اقدام کیا تھا کہ ہرقل کے دربار سے حضورؐ کے سفیر دحیہ کلبیؓ تحائف لے کر واپس آ رہے تھے اور اس نے ڈاکہ ڈال کر سب کچھ لوٹ لیا تھا۔ اس کی سرکوبی کے لیے زید بن حارثہ ایک دستہ لے کے گئے جھڑپ ہوئی۔ ہنید مارا گیا۔ اور اس کے ساتھی تائب ہوئے۔

بنو کلاب شورش کی تیاریوں میں تھے کہ حضرت صدیقؓ کارروائی کے لیے جا پہنچے۔ جھڑپ ہوئی اور دشمن بھاگ گیا۔

جہینہ کے علاقے میں شورش کا اندیشہ ہوا' تو اسامہؓ بن زید حالات پر قابو پانے کے لیے بھیجے گئے انہوں نے پہلے افہام و تفہیم کی کوشش کی۔ لیکن آخر جھڑپ ہوئی۔ اس موقع پر حضرت اسامہؓ نہیک بن مرداس کا تعاقب کر رہے تھے کہ اس نے کلمہ طیبہ پڑھ لیا۔ مگر حضرت اسامہؓ نے یہ سمجھا کہ قابو میں آ کر جان بچانے کا حیلہ کر رہا ہے۔ انہوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ حضورؐ کو اس سے سخت صدمہ ہوا ---- کیونکہ انسانوں کی اصلاح آپؐ کا اصل مطلوب تھا نہ کہ ان کا خاتمہ۔

اہل فزارہ و عذرہ نے معرکہ خیبر میں یہود کی امداد کی تھی' ان کی سرسری تنبیہہ کے لیے بشیرؓ بن سعد بن ثعلبہ خزرجی مختصر سا دستہ لے کر گئے۔ معمولی جھڑپ ہوئی اور حریف مغلوب ہوا۔

بنو سلیم کے بارے میں حملہ کی تیاریوں کی اطلاع ملنے پر ابن ابی العوجا پچاس آدمیوں کا دستہ طلایہ گردی کے لیے لے کر دشمن کی سرحد تک گئے۔ مخالفین کی تعداد زیادہ تھی انہوں نے حملہ کر کے پورے دستہ کو شہید کر دیا۔ صرف کمانڈر زخمی حالت میں مدینہ پہنچ سکے۔ اسی طرح بنو قضاعہ کی جانب (ذات اطلح کا علاقہ) کعبؓ بن عمیر انصاری بہت ہی چھوٹی پارٹی لے کر گشت کے لیے گئے۔ حریف طاقتور تھا۔ اس لیے یہ پورا دستہ بھی کام آیا۔ شاید کوئی ایک صحابی بچ کے لوٹے۔

بنی ہوازن اسلام دشمن طاقتوں کو متعدد بار جنگی مدد دے چکے تھے۔ ان کے بارے میں جب اطلاع آئی کہ

مدینہ سے ۵ منزل کی دوری پر وہ حملہ کے لیے قوت جمع کر رہے ہیں۔ ایک مختصر سا دستہ شجاع بن وہب اسدی کے زیر کمان گشت کے لیے بھیجا گیا۔ کوئی جھڑپ نہ ہوئی۔

اسی زمانے میں (جمادی الاولیٰ ۸ھ) جنگ موتہ واقع ہوئی۔ مگر چونکہ وہ صحیح معنوں میں ایک غیر ملکی طاقت سے لڑائی تھی ...... اس لیے اس کا تذکرہ ہم جنگ تبوک کے ساتھ علیحدہ کریں گے۔

رفاعہ بن قیس (سردار بنی جشم) کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہ حملہ کے لیے آدمی جمع کر رہا ہے۔ ابو حدرد اسلمی کو دو آدمیوں کے ساتھ محض گشت کے لیے بھیجا گیا انہوں نے بڑی حکمت سے بغیر کسی قوت کے دشمن جتھے کو خوفزدہ کر کے منتشر کر دیا اور ان کے جانور بھی ضبط کر لائے۔

بنو قضاعہ کے متعلق خبر ملی کہ وہ کچھ دوسرے عناصر کو ساتھ لے کر چڑھائی کرنا چاہتے ہیں۔ عمرؓو بن العاص ذات السلاسل کے مقام پر ۳ سو سپاہیوں کا دستہ لے کے پہنچے۔ یہ جگہ وادی القریٰ سے آگے ہے اور یہ پورے کا پورا علاقہ اسلامی ریاست کے حق میں برسوں خطرناک رہا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ دشمنوں کی طاقت زیادہ ہے عمرؓو بن العاص نے قاصد بھیج کر مزید کمک طلب کی۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کی کمان میں دو سو آدمیوں کا ایک دستہ فوراً بھیجا گیا۔ حملہ ہوتے ہی دشمنوں کا گروہ بھاگ گیا۔ ان کے کچھ مویشی قبضے میں کر لیے گئے۔

ابو قتادہؓ اور محلم بن جثامہ کسی موقع پر گشت کے لیے نکلے۔ اتفاقاً عامر بن الاضبط اشجعی چند آدمیوں کو ساتھ لیے ہوئے ملا۔ اس نے مسلمانوں کی طرح سلام کہا لیکن محلم نے اس کے سلام کو ایک چال سمجھا اور دشمن قرار دے کر قتل کر دیا۔ اس واقعہ پر قرآن نے یوں گرفت کی۔ کہ یا یھا الذین امنوا اذا ضربتم فی سبیل اللہ فتبینوا ولا تقولوا لمن القی الیکم السلم لست مومنا (سورہ نساء۔ ۹۴) یعنی گشت کو نکلو تو آدمیوں سے تعارف حاصل کرو اور تحقیق حال کر کے انہیں اچھی طرح سمجھو اور جو کوئی تم کو (اسلامی طریق پر) سلام کہے۔ خواہ مخواہ اسے غیر مسلم نہ قرار دے لو۔ حضورؐ نے بھی سخت تنبیہہ کی۔ بعد میں مقتول قبیلہ کا سردار عیینہ بن بدر خون بہا کا مطالبہ لے کر آیا۔ حضورؐ نے ۵۰ اونٹ اسی وقت دیئے۔ اور بڑی ردوکد کے بعد سردار سے منوایا کہ وہ بقیہ ۵۰ اونٹ بعد میں لے لے۔

رجب ۸ ھ میں نبی اکرم ﷺ کے حکم سے ابو عبیدہؓ بن الجراح تین سو سپاہیوں کی جمعیت لے کر سیف البحر گئے۔ اور محض سمندر تک گشت کر کے اور چند روز ساحلی علاقے میں ٹھہر کر واپس آ گئے۔ غالباً اس نقل و حرکت کا منشا ایک طرف شاہراہ کی دیدبانی تھا اور دوسری طرف قریش کو یہ تاثر دلانا کہ آج کل حکومت مدینہ کی توجہ اس طرف ہے۔ واضح رہے کہ قریش کی عہد شکنی کے بعد یہ نقل و حرکت فتح مکہ کی مہم کا پیرایہ آغاز ہوئی۔

چوتھا بڑا معرکہ ------- فتح مکہ:

اوپر قریش اور دوسرے مخالفین کی بڑی بڑی چڑھائیوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں اور واضح ہے کہ بدر احد اور خندق کے بڑے معرکوں میں جاہلی قوتیں خود چڑھائی کر کے مدینہ آئیں اور ساری آویزشیں اسلامی دارالحکومت کے آس پاس ہوئیں ان آویزشوں میں حکومت مدینہ نے محض مدافعانہ پوزیشن اختیار کی۔ معرکہ خندق کے بعد حضورؐ کی سیاسی بصیرت نے بالکل صحیح پیش گوئی کر دی تھی کہ اب قریش کی چڑھائیاں ختم ہو گئیں۔ بلکہ یہ بشارت بھی دے دی کہ اب انشاء اللہ ہم ان کے خلاف دھاوا بولیں گے۔ چنانچہ بیچ میں جب صلح حدیبیہ واقع ہوئی اور قریش کی تلوار نیام میں چلی گئی تو اس موقع پر فائدہ اٹھا کر حضورؐ نے ایک طرف تو شورش پسند غداروں سے مدینہ کی تطہیر کر لی۔ اور دوسری طرف شمال کی جانب یہودی اپنی قوت کے جو مضبوط مراکز بنا کر ان سے جنگی سازشوں کے اڈوں کا کام لے رہے تھے ان کی حضورؐ نے بیخ کنی کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ قبائل کی چھوٹی چھوٹی شورشوں' جنگی تیاریوں اور فتنہ پردازیوں کا پے در پے اس سرگرمی سے نوٹس لیا اور ہر گڑ بڑ کی اس پھرتی سے سرکوبی کی کہ مدینہ کا ماحول دور دور تک خاصا صاف اور پر امن ہو گیا۔ معرکہ خندق سے فتح مکہ تک کے وقفے میں اسلامی ریاست کی دھاک بیٹھ گئی اور تحریک اسلامی نے اپنے سیاسی وجود کو اچھی طرح منوا لیا۔ ہر طرف محسوس ہونے لگا کہ سچائی اور انصاف کی یہ نئی طاقت جو ابھر رہی ہے' تو یہ کوئی ایسا غبار نہیں ہے جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اڑنے لگے۔ اور اسلامی قیادت کا جھنڈا کسی کھوکھلے کھمبے پر نہیں لہرا رہا جسے پھونکوں سے گرا دیا جائے۔ عوامی عناصر کو محسوس ہونے لگا کہ مستقبل قریش کا نہیں' محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے۔

اب چونکہ دشمن سے نجات پانے کا کوئی راستہ ماسوا اس کے نہ تھا کہ اس کے گڑھ کو ختم کیا جائے۔ اور جاہلیت کی قیادت کا چراغ اس کے اپنے گھر میں گل کر دیا جائے' اس لیے دفاعی جدوجہد کی تکمیل کے لیے ایک نہ ایک دن جارحانہ اقدام ضروری تھا۔ قریش کی شامت اعمال کہ انہوں نے خود ہی معاہدہ حدیبیہ کو توڑ ڈالا جو فریقین کے درمیان ایک حفاظتی فصیل امن بنا کھڑا تھا۔

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ بنی بکر اور بنی خزاعہ کے درمیان پہلے سے مخاصمت تھی اور انتقام در انتقام کا چکر چل رہا تھا۔ مگر بیچ میں یکایک اسلامی تحریک ایک تشویش ناک مسئلہ بن کے نمودار ہوئی۔ اور قریش و دیگر مشرک قبائل محض اس کی مخالفت کے لیے ایکا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے جذبات مخاصمت کا لاوہ کچھ دیر کے لیے اندر دب گیا۔ یہاں تک کہ جب صلح حدیبیہ واقع ہوئی' تو اس کی ایک دفعہ سے فائدہ اٹھا کر بنو خزاعہ نے رسول اللہ ﷺ سے حلیفانہ رابطہ جوڑ لیا۔ اور بنو بکر قریش کے ساتھ رہے۔ کچھ مدت تو چپ چاپ گزر گئی۔ لیکن آخر کار پرانے جذبات عناد کی بارود بھڑک اٹھی۔ بنو بکر نے مصالحت کے اس دور کو غنیمت سمجھا جس میں کسی اور جانب سے تصادم کا اندیشہ نہ تھا۔ انہوں نے بنو خزاعہ کا ایک آدمی قتل کیا

اور پھر بھرپور حملہ کر کے خوب ظلم ڈھایا۔ یہاں تک کہ حرم میں بھی ان کے پناہ گزینوں کی جان بخشی نہ کی اور حالت نماز میں بھی درگزر نہ کیا۔ بنو بکر کی اس خونریزی میں قریش نے ان کو پوری پوری مدد دی تھی۔ اور اس احمقانہ حرکت سے انہوں نے معاہدہ حدیبیہ کو پامال کر دیا۔ بنو خزاعہ کی طرف سے عمرو بن سالم نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں جا کر فریاد کی۔ پھر بدیل بن ورقا نے ایک وفد لے جا کر سارا حال سنایا۔ حضورؐ پر حلیفانہ عہد کی وجہ سے واجب ہو گیا کہ بنو خزاعہ کی مدد کریں۔ حضورؐ نے قاصد کے ذریعے قریش تک تین شرطیں صورت حالات کو درست کرنے کے لیے بھجوائیں۔ ایک یہ کہ مقتولین کا خون بہا ادا کریں۔ دوسرے یہ کہ بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔ ورنہ تیسری یہ کہ معاہدہ حدیبیہ کے خاتمہ کا اعلان کر دیں۔ قریش توازن تو کھو ہی چکے تھے۔ کہلا بھیجا کہ صرف تیسری شرط منظور ہے۔ بعد میں پچھتائے۔

اب قریش کے حلقہ قیادت میں تشویش پھیلی۔ لڑنے کی قوت ان میں ختم ہو چکی تھی۔ چند جنگی معرکوں میں ان کے قیمتی افراد ان سے چھن گئے تھے۔ اور ان کی فوجی طاقت کو ناقابل اندمال چرکے لگ چکے تھے۔ ادھر ان کی معیشت کا دامن بری طرح پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ ان کی معاونت کرنے والے یہود کچلے جا چکے تھے۔ اور مدینہ ایک طرف دعوتی ذرائع سے اپنے اثرات اتنے وسیع کر چکا تھا کہ مکہ کے گرد بھی اسلامی ریاست کے حامی قبائل کا ایک حلقہ پیدا ہو چکا تھا۔ دوسری طرف معاہدانہ اور حلیفانہ تعلقات کا دائرہ پھیلایا جا چکا تھا۔ تیسری طرف مفسد قوتوں کو دبا کر ایک وسیع علاقے میں لا اینڈ آرڈر خوب اچھی طرح قائم کر کے نظام نو کی عمارت کو اٹھایا جا رہا تھا۔ اب قریش جارحانہ اقدام تو کیا کر سکتے۔ اب تو درحقیقت ان کے لیے اپنی جگہ پر بھی اپنا دفاع کرنا بہت مشکل تھا۔ ان کے لیے اب جو کچھ بھی بچاؤ تھا' معاہدہ حدیبیہ کے ذریعہ تھا۔ یہ روک بھی انہوں نے خود ہی اپنے سامنے سے ہٹا دی اور گویا از خود مدینہ کو دعوت دی کہ آؤ اور ہمیں کیفر کردار تک پہنچا دو۔

آخر مکہ کا سب سے بڑا جاہلی لیڈر پریشان ہو کر مدینہ روانہ ہوا کہ تجدید عہد کرائے۔ وہاں وہ ایسی حوصلہ شکن فضا سے دوچار ہوا کہ جس کا وہ شاید تصور بھی نہ رکھتا ہو گا۔ وہ اپنی بیٹی ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کے گھر میں جا کر بستر پر بیٹھنے لگا' تو بیٹی نے لپک کر بستر اٹھا دیا کہ تم مشرک ہو کر خدا کے رسولؐ کے پاک بستر پر نہیں بیٹھ سکتے۔ پھر وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ' حضرت عمرؓ اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے ممتاز مسلم لیڈروں سے جا جا کر ملا اور ہر ایک سے مدد حاصل کرنا چاہی۔ حد یہ کہ اس نے حضرت فاطمہ الزہرا کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارش کے لیے کہا اور جب یہ بھی نہ ہو سکا تو چاہا کہ امام حسنؓ (عالم طفلی کے باوجود) ہی کو حضرت فاطمہؓ اس کی اجازت دیں۔ کوئی صورت نہ پا کر بدحواسی میں اس نے حضرت علیؓ کے مشورے کے مطابق مسلمانوں کے مجمع میں اپنی طرف سے یک طرفہ جوار (یعنی مصالحانہ ذمہ داری) کا اعلان کر دیا۔ اور بغیر حضورؐ کی طرف سے جوابی قبولیت حاصل کیے مکہ واپس چلا گیا۔

مکہ والوں نے روداد پوچھی اور اس کے یک طرفہ اعلان جوار کا حال معلوم ہوا۔ تو سب نے کہا کہ یہ تو حضرت علیؓ نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہے۔ دیکھئے کہ انحطاط پذیر حقی طاقتوں کی بصیرت بھی کس طرح ماری جاتی ہے۔

جلد ہی حضورؐ نے اعلان کر دیا کہ مسلم رضاکار تیار ہو جائیں اور اپنے گھر میں بھی حکم دیا کہ ہتھیار تیار کر دیں۔ لیکن یہ امر بالکل راز میں رکھا کہ کدھر کا ارادہ ہے حتیٰ کہ حضرت عائشہؓ کو بھی علم نہ ہو سکا۔ جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے حضورؐ کے لیے اسلحہ تیار کئے تھے۔ غالباً قیاس سے بعض لوگوں نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ مکہ پر چڑھائی ہونے والی ہے۔ کیونکہ اتنا بڑا لشکر کسی اور طرف لے جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

حاطبؓ بن ابی بلتعہ کے اہل و عیال مکہ میں گھرے ہوئے تھے اور چونکہ ان کا کوئی قبیلہ حمایت کے لیے نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے ان کے بچاؤ کے لیے مدینہ کی تیاریوں کا حال ایک خفیہ خط کے ذریعے قریش کو لکھ بھیجا تاکہ وہ احسان کی بنا پر ان کے اہل و عیال سے تعرض نہ کریں۔ اس کے ساتھ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس اطلاع کے باوجود اسلامی فوج کی فتح یقینی ہے اور ان کا خط نتیجہ کے اعتبار سے کوئی بڑا نقصان اسلام کو نہ پہنچا سکے گا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح خارجی حالات اور ذہنی تاثرات میں گھر کر کبھی کبھار کسی صالح ترین آدمی سے بھی انتہائی درجہ کی لغزش ہو سکتی ہے۔ حضورؐ کو اس خفیہ خط کا علم فوق العام ذرائع سے ہوا۔ اور آپؐ کے فرستادوں نے روضہ خاخ میں جا کر مکہ جانے والی ایک عورت کی چوٹی سے اسے برآمد کیا۔ اتنی بڑی خطا سے حضورؐ نے اس لیے درگزر فرمائی کہ حاطبؓ مخلص تھے۔ بدری صحابی تھے۔ ایمان اور حسن کردار رکھتے تھے۔ اور یہ ایک لغزش ان سے بہ تقاضائے بشریت ہو گئی تھی۔

حضورؐ نے دس ہزار سپاہیوں کا لشکر عظیم ساتھ لے کر ۱۰ رمضان کو مدینہ سے کوچ کیا۔ آپؐ نے ایک عظیم فوجی جرنیل کی حیثیت سے ایسا ہیر پھیر کا راستہ اختیار کیا کہ قریش کی جو گشتی ٹولی دیکھ بھال کے لیے نکلی تھی۔ وہ کسی اور طرف ماری ماری پھرتی رہی۔ اور مسلم فوج نے یکایک مکہ کے سامنے جا پڑاؤ ڈالا۔

حضورؐ جحفہ پہنچے تو آپؐ کے چچا عباسؓ مع اہل و عیال آملے۔ پھر مقام ابواء میں پہنچے تو ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب (یہ دوسرے ابوسفیان ہیں جو حضورؐ کے چچا زاد بھائی بھی تھے اور حلیمہ سعدیہ کے واسطے سے رضاعی بھائی ہیں) اور عبداللہ بن ابی امیہ (حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی اور ام المومنین ام سلمہؓ کے سوتیلے بھائی) نے حاضر ہو کر باریابی کی اجازت مانگی۔ انہوں نے قریبی عزیز ہو کر اسلام کی مخالفت میں جو شدید اذیتیں حضورؐ کو دی تھیں ان کی بنا پر آپؐ نے ملنے سے انکار کر دیا۔ ابوسفیان نے عالم یاس میں کہا کہ اگر معافی نہ ملے تو میں بال بچوں کو عرب کے آتشیں ریگستان میں لے جاؤں گا۔ اور ہم سب بھوکے پیاسے رہ کر مر جائیں گے۔ حضرت ام سلمہؓ نے بھائی کی سفارش کی اور حضرت علیؓ نے دونوں کو مشورہ دیا کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے الفاظ میں طلب عفو کریں چنانچہ انہوں نے جا کر وہی کہا "تا اللہ لقد اثرک اللہ علینا و ان کنا لخاطئین" (بخدا! اللہ نے آپؐ کو ہم پر برتری بخشی اور واقعی ہم خطاکار تھے) حضورؐ کا دل

ان الفاظ سے پگھل گیا۔ اور آپؐ نے بھی وہی حضرت یوسفؑ والا جواب دیا۔ لا تثریب علیکم الیوم' یغفراللہ لکم و ھو ارحم الراحمین (تم پر آج کے دن کوئی گرفت نہیں ہے۔ خدا تمہیں معاف کرے اور وہ رحم کرنے والوں سے سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے)

مرالظہران کے مقام میں پہنچ کر جب فوجی کیمپ لگایا گیا تو بطور مصلحت رات کو سرور عالم ﷺ نے حکم دیا کہ ہر سپاہی اپنے لیے علیحدہ آگ روشن کرے۔ ابوسفیان بن حرب' حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقا جیسے اکابر دیکھ بھال کے لیے نکلے۔ بلندی سے دس ہزار چولہوں کو روشن دیکھا تو سکتے میں رہ گئے کہ اتنا بڑا لشکر مکہ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ پاس ہی سے حضرت عباسؓ گزرے' آوازیں پہچان کر ابوسفیان کو پکارا۔ بات چیت ہوئی۔ حضرت عباسؓ نے بتایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فوج لے کر آ پہنچے۔ اب قریش کی خیر نہیں۔ ابوسفیان نے پوچھا کہ اب چارہ کار کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے ساتھ خچر پر بیٹھ جاؤ اور چل کے حضورؐ سے بات چیت کی جائے۔ خچر آگے بڑھا تو فوجی طریق سے قدم قدم پر سپاہیوں نے پوچھا۔ "کون جا رہا ہے؟" حضرت عباسؓ تعارف کراتے تو راستہ مل جاتا۔ قریب پہنچے تو حضرت عمرؓ نے دیکھ لیا اور ابوسفیان کو پہچان کر پکار اٹھے کہ او دشمن خدا آج تجھ پر قابو ملا۔ دوڑے دوڑے قتل کی اجازت لینے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گئے۔ حضرت عباسؓ نے بھی خچر تیز کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے پہلے پہنچ کر اپنی بات کی اور حضرت عباسؓ نے اپنا موقف بتایا کہ میں ابوسفیان کو پناہ دے کر لایا ہوں۔ اس موقع پر یہ بات چیت ہوئی۔

رسولؐ خدا: کیوں ابوسفیان! کیا اب بھی تم کو یقین آیا کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟

ابوسفیان: کوئی اور خدا ہوتا تو آج ہمارے کام آیا ہوتا!

رسولؐ خدا: کیا اس بات میں کچھ شک ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔

ابوسفیان: اس میں قدرے شبہ ہے۔

بہرحال حضورؐ کے چچا نے اس کی کمزور نفسیات کو بھانپتے ہوئے تڑپ کر کہا کہ چھوڑو بھی اب۔ سیدھی طرح اسلام قبول کر لو۔ اور صبح تک مکہ کا سب سے بڑا لیڈر حالات سے مجبور ہو کر اسلام کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اسلامی کیمپ نے مکہ میں فوج کے داخلہ سے قبل ابوسفیان کو ایسے لطیف انداز سے حراست میں رکھا کہ اسے محسوس تک نہ ہوا۔ صبح شہر میں داخلہ کے لیے فوج نے کداء کے راستے مارچ کیا۔ حضرت عباسؓ حضورؐ کے ارشاد سے ابوسفیان کو ایک ٹیلے پر لے گئے تاکہ وہ ایک بار جیش اسلام کی عظمت کا منظر دیکھ لے۔ سب سے پہلے غفار پھر جہینہ' ہذیم' سلیم اور سب سے آخر میں انصاری دستے اپنے اپنے علم لیے گزرتے رہے۔ ابوسفیان ہر دستے کے بارے میں پوچھتا جاتا۔ سعدؓ بن عبادہ اس مقام سے گزرے تو سپاہیانہ جوش میں آ کر جس کے پس منظر میں وسیع تاریخی کشمکش موجزن تھی۔ پکار اٹھے کہ "الیوم یوم الملحمۃ" آج گھمسان کا دن ہے۔ "الیوم تستحل الکعبۃ" آج کے دن کعبہ کا ماحول معرکہ کے

لیے کھول دیا جائے گا۔ آخر میں حضورؐ کی سواری سادگی کی شان کے ساتھ گزری جس کے آگے آگے زبیر بن العوام علم اٹھائے ہوئے تھے۔ حضورؐ کو سعدؓ بن عبادہ کے نعرہ کا علم ہوا تو فوراً ان سے علم واپس لے کر ان کے بیٹے کے سپرد کرا دیا۔ اور فرمایا کہ "آج کا دن کعبہ کی عظمت کا دن ہے"۔ اور بڑو وفا کا دن ہے' اس ایک فقرے میں حضورؐ نے اپنی فاتحانہ پالیسی کا اعلان کیا جو عفو و کرم پر مبنی تھی۔ پھر یہ اعلان عام کر دیا گیا کہ جو کوئی بھی مسجد حرام میں داخل ہو گا۔ یا ابو سفیان کے گھر میں چلا جائے گا اور جو کوئی بھی مقابلہ کے لیے ہتھیار نہ اٹھائے گا۔ اس کے لیے امن ہے------ بشرطیکہ کسی قابل تعزیر جرم کا مجرم نہ ہو۔ خود ابو سفیان ہی نے مکہ میں آگے بڑھ بڑھ کے اس اعلان کو باآواز بلند پکارا۔ یہ سن کر ہند بن عتبہ (زوجہ ابو سفیان) اس کی مونچھ کھینچ کر چلائی کہ اے بنی کنانہ! اس کم بخت کو قتل کر دو۔ یہ کیا بک رہا ہے۔ وہ گالیاں دیتی رہی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ ابو سفیان نے کہا کہ اب ایسی باتوں سے کچھ حاصل نہ ہو گا کیونکہ محمد ﷺ کا مقابلہ کرنے کی تاب اب کسی میں نہیں۔ جب شہر میں حضورؐ کا داخلہ ہوا تو دنیا بھر کے فاتحین کے برعکس سر مارے عجز کے خدا کے سامنے اس طرح جھک رہا تھا کہ پیشانی کجاوے کو چھو رہی تھی اور زبان سورہ فتح کی تلاوت میں مصروف تھی۔

عکرمہ بن ابو جہل' صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو نے خندمہ پہاڑ میں قریش کے چند کوتاہ اندیش اوباشوں کو جمع کر کے آمادہ شرارت کیا۔ حماس بن قیس بن خالد بھی ان لوگوں سے مل گیا۔ دو صحابی کرزؓ بن جابر الفہری اور خنیسؓ بن خالد بن ربیع لشکر سے جدا ہو کر کسی دوسرے راستے جا رہے تھے کہ اس ٹولی نے دونوں کو شہید کر دیا۔ حضرت خالدؓ کو اطلاع ملی تو انہوں نے فوراً ان کی سرکوبی کی۔ بارہ آدمی کھیت رہے اور بقیہ بھاگ نکلے جس میں حماس بھی تھا۔ ایسی ہی ایک اور چھوٹی سی ٹولی شہر میں مزاحمت کرنے کے لیے مجتمع دکھائی دی۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو حضرت ابو ہریرہؓ کے ذریعے انصار کا دستہ طلب کیا۔ ان کو یہ منظر دکھایا کہ دیکھتے ہو ان کی شرانگیزی؟ یعنی ایک طرف تو عفو و رحمت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اور فاتح قوت خون کا ایک قطرہ بھی بہانے سے گریز کر رہی ہے اور دوسری طرف یہ کمینہ لوگ ہیں کہ اسے نیام کردہ تلواروں کو لہرانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ حکم دیا کہ یہ مزاحمت کریں تو ان کا پوری طرح صفایا کر دیا جائے۔ ابو سفیان کو نبی اکرم ﷺ کے اس حکم کی اطلاع ہوئی تو وہ دوڑا دوڑا پہنچا اور التماس کیا۔ "یا رسول اللہ! (ﷺ) قریش پہلے ہی تباہ ہو چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو' کہ ان کا نام و نشان ہی دنیا سے مٹ جائے"۔ ہلکی سی مزاحمت کے بعد اشرار مار کھا کر بکھر گئے۔

حضورؐ کے اس عفو و کرم کو دیکھ کر انصار میں بعض لوگوں نے یہ چہ میگوئیاں پھیلائیں کہ آخر آپؐ پر اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت غالب آ ہی گئی۔ دراصل انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں محسن انسانیتؐ ان سے جدا ہو کر اب مکہ والوں میں نہ رہنے لگیں۔ اور وہ اپنی محبوبؐ ہستی کے قرب سے محروم ہو جائیں۔ آپ نے ان سے خطاب کیا اور فرمایا۔ "خدا کی قسم! ایسا نہیں ہے۔ میں خدا کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہوں۔ میں

نے خدا کی طرف اور تمہاری طرف ہجرت کی۔ اب میرا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہے"۔ انصار پر رقت طاری ہو گئی اور انہوں نے معذرت طلب کی۔ خدا اور رسولؐ نے ان کی معذرت قبول کی۔

لوگوں نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ شہر میں قیام کہاں فرمائیں گے؟ آیا اپنے آبائی مکان میں؟ حضورؐ نے بڑا ہی درد بھرا جواب دیا کہ "عقیل نے ہمارے لیے گھر چھوڑا ہی کہاں ہے کہ اس میں اتروں؟" حضورؐ کا علَم حجون (جنت المعلیٰ) میں نصب ہوا اور یہی قیام گاہ طے پائی۔ پہلے آپؐ اس تاریخی مقام خیف میں گئے جہاں قبیلہ کے ساتھ نظربندی کے دن گزارے تھے۔ پھر حرم پہنچے۔ خاص الخاص رفقاء کا ایک حلقہ ساتھ تھا۔ حجر اسود کا استلام کیا۔ ہاتھ میں قوس لیے حرم میں نصب شدہ ایک ایک بت کے پاس جاکر پکارتے "حق آگیا اور باطل سٹک گیا۔ اور باطل کو تو میدان چھوڑنا ہی ہے" (بنی اسرائیل۔ ۸۱)۔ قوس کے اشارہ سے ایک ایک بت گر گیا۔ پھر کعبہ کی کنجی منگا کر دروازہ کھلوایا۔ اندر حضرت ابراہیمؑ و اسماعیل علیہم السلام کی تصویریں بنی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں پانسے کے تیر دکھلائے گئے تھے۔ ان کو مٹانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ خدا کفار کو غارت کرے۔ یہ دونوں خدا کے پیغمبر تھے اور انہوں نے جوا کبھی نہیں کھیلا تھا۔ بعد میں آپؐ کے حکم سے وہ تمام اصنام بھی توڑ ڈالے گئے جو مدتوں سے آس پاس نصب تھے۔ پھر آپؐ نماز و ذکر میں مصروف رہے۔ مسجد کے سامنے ہجوم عام جمع تھا۔ اور لوگ اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے مضطرب تھے۔ ان سے آپؐ نے خطاب فرمایا:

"ایک خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اس نے اپنے بندے کو مدد دی۔ اسی اکیلے نے تمام لشکروں کو شکست دی!

آج تمام کبر و غرور' خون کے تمام دعوے' مالوں کے تمام مطالبے میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ البتہ حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی کے عہدے اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اے قریش! اب خدا نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور نسب کے فخر کو مٹا دیا۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے۔" پھر قرآن کی آیت پڑھی:۔

"لوگو! میں نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور تمہیں قبیلوں اور خاندانوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے۔ کہ تم باہم دگر پہچانے جاؤ۔ لیکن معزز خدا کے نزدیک وہی ہے جو پرہیزگاری میں پیش پیش ہو۔ بلاشک اللہ دانا اور باخبر ہے" (الحجرات: ۱۳)

پھر ایک قانونی اعلان کیا۔

"خدا نے شراب کی خرید و فروخت حرام کر دی ہے"۔

پھر حضورؐ نے پوچھا:۔

"تم کو معلوم ہے کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟"

ان الفاظ کے گونجتے ہی ظلم' مکر' تشدد اور خونخواری کی وہ ساری گندی تاریخ قریش کی نگاہوں کے

سامنے سے ایک فلم کی طرح گزر گئی ہوگی جسے انہوں نے بیس اکیس برس میں تیار کیا تھا۔ ان کے ضمیر پھٹ جانے کو ہوں گے۔ بے بسی اور ندامت کے عالم میں وہ لوگ پکار اٹھے: "اخ کریم و ابن اخ کریم۔ تو شریف بھائی ہے۔ اور ایک شریف بھائی کا بیٹا ہے"۔ جواباً آواز آئی۔ لا تثریب علیکم الیوم۔ اذھبوا فانتم الطلقاء "تم پر آج کچھ گرفت نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو"۔

کیا قریش کی تاریخ ظلم و جنگ کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی شخص بھی اس جواب کی توقع کر سکتا ہے؟ مگر جو کوئی بھی اس رحمت عالم ﷺ کی شان کریمی کو سمجھتا ہو وہ حضورؐ سے اسی جواب کی امید باندھے گا کوئی اور ہوتا تو آج اکڑ کر مکے میں داخل ہوتا۔ ایک ایک واقعہ کا انتقام لیتا۔ چن چن کے ان افراد کو تلوار کا لقمہ بناتا جنہوں نے ذرا بھی کوئی زیادتی کی ہوتی۔ مفتوح شہر میں قتل عام کرا دیتا۔ لوگوں کے مال اور عورتوں کی عصمتیں نیلام پر چڑھ گئی ہوتیں۔ لیکن فاتح چونکہ محسن انسانیت تھا اس لیے اس نے زمین پر قبضہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کو فتح کرنا چاہا۔ اور جسموں پر قابو پانے سے بڑھ کر دلوں کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ مہاجرین سے کہا کہ وہ اپنے اپنے مکانوں اور املاک سے دست بردار ہو جائیں۔ شان لطف و احسان کا اس سے بڑا مظاہرہ کیا ہوگا کہ کعبہ کی کنجی قیامت تک کے لیے انہی عثمان بن طلحہ کو تفویض فرمائی۔ جن سے ایک بار در کعبہ کھلوانے کی خواہش حضورؐ نے دعوت کے ابتدائی دور میں کی تو انہوں نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ اس موقع پر آپؐ نے مستقبل پر نگاہ جماتے ہوئے عثمان سے فرمایا۔ "ایک دن آئے گا کہ یہ کنجی میرے اختیار میں ہوگی۔ اور میں جسے چاہوں گا تفویض کروں گا۔" عثمان کی نگاہ اتنی دور رس کیسے ہوتی۔ اس نے کہا۔ "شاید اس روز تمام افراد قریش ہلاک ہو چکے ہوں گے"۔ فرمایا۔ "نہیں! وہ تو قریش کی سچی عزت کا دن ہوگا"۔ اس مکالمہ کو ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ تو تصور یہی کہتا ہے کہ حضورؐ کے علاوہ دوسرا کوئی بھی ہوتا تو اپنا اختیار دکھلانے کے لیے لازماً کنجی عثمان سے لے کر کسی اور کو دے دیتا۔ لیکن حضورؐ کلید کعبہ حاصل کرنے کے لیے بنی ہاشم کی طرف سے حضرت علیؓ جیسے جگری عزیز تک کی درخواست سے صرف نظر کر لیتے ہیں اور کلید کعبہ ہمیشہ کے لیے سابق ہاتھوں میں رہنے دیتے ہیں۔ حضورؐ نے کنجی دیتے ہوئے جب عثمان بن طلحہ کو برسوں پہلے کی وہ بات بطور لطیفہ یاد دلائی تو وہ پکار اٹھے۔ کہ "بے شک آپؐ خدا کے رسول ہیں"۔ آپ نے فرمایا۔ "کہ آج کا دن نیکی اور وفا کا دن ہے"۔

اس کے بعد حضورؐ کے حکم سے حضرت بلالؓ نے کعبہ پر چڑھ کر اذان دی۔ یہ اذان گویا اسلامی انقلاب کی کامیابی کا اعلان تھا۔ وہی کعبہ جہاں خدا کے بندوں کے لیے خدا کا نام پکارنا جرم بن گیا تھا اور اس سے روکنے کے لیے کتنی ہی سختیاں حضورؐ اور حضورؐ کے ساتھیوں نے جھیلیں۔ آج اس کی بلندیوں پر سے بآواز بلند اللہ کی بڑائی پکاری جا رہی تھی۔ اور کوئی قوت نہ تھی جو مزاحم ہو سکے۔ اس لمحے ابو سفیان بن حرب' عتاب بن اسید اور حارث بن ہشام جیسے اکابر کعبہ کے متصل ایک گوشے میں بیٹھے اپنی ہری ہوئی بازی کا تصور کر رہے تھے۔ عتاب نے جلے دل سے کہا کہ اچھا ہوا کہ خدا نے اسید کو اس آواز کے سننے کے لیے

زندہ نہ رکھا۔ حضورؐ ان لوگوں کے پاس پہنچے اور جو جو باتیں انہوں نے کی تھیں۔ ان کے سامنے دوہرا دیں۔ یہ لوگ شرمندہ ہو گئے۔

پھر حضورؐ نے ام ہانیؓ کے مکان پر غسل کر کے آٹھ رکعت نماز بطور شکرانہ فتح پڑھی۔

فتح کے دوسرے روز کوہ صفا پر سے حضورؐ نے دوسرا خطاب عام فرمایا۔ پہلے اللہ کی حمد و ثنا کی اور پھر مختصر کلمات میں حرم کی حرمت کو بیان کیا اور اسے ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا اور اس کے احکام بیان کیے۔ واضح رہے کہ مکہ کی حرمت کو اتنی بڑی انقلابی فتح کے لیے صرف ایک دن (بلکہ پورا دن بھی نہیں) مجبوراً کھولا۔ کیونکہ آپؐ کی مرضی کے خلاف مکہ کے چند سر پھرے اوباشوں نے مسلم سپاہ کے خلاف پیش دستی کر کے اسے مجبور کر دیا کہ وہ ان کا قلع قمع کرنے کے لیے قوت سے کام لے۔ لیکن جونہی یہ مجبوری ختم ہوئی۔ حضورؐ نے دوسرے روز حرم کی حرمت کو ہمیشہ کے لیے بحال کرنے کا اعلان فرما دیا۔

یوں تو عام معافی کا اعلان کر دیا گیا اور اس اعلان نے دلوں کو ایسا مسخر کیا کہ کسی میں تاب مقاومت نہ رہی لیکن مجرمین خاص کے بارے میں نام لے کر آپؐ نے فرما دیا کہ یہ لوگ جہاں بھی پائے جائیں قتل کر دیئے جائیں۔ واضح رہے کہ مکہ پر قبضہ کرنے اور اسے زیر نظم لانے کے لیے چند روزہ 'مارشل لاء'[1] نافذ رہا ہے یعنی تمام اختیارات فوجی کمان کے ہاتھ میں تھے اور حضورؐ نے بہ حیثیت سپہ سالار افواج ہی یہ حکم جاری کیا تھا جس کی نوعیت ویسی ہی ہے جیسی کہ آج "دیکھتے ہی گولی مار دو" Shoot at sight کی ہوتی ہے۔ اس فہرست مجرمین میں چند مردوں اور چند عورتوں کے نام شامل تھے۔ لیکن حضورؐ کے عفو و حلم نے ان میں سے بھی اکثر کی جان بخشی کر دی۔ زیادہ سے زیادہ چار مجرمین کو سزائے موت دی گئی۔ ایک تحقیقی رائے یہ بھی ہے کہ صرف ایک شخص عبدالعزیٰ ابن خطل کو ہلاک کیا گیا۔ یہ شخص مسلمان ہوا۔ وصولی صدقات کے لیے ایک اور مسلم ساتھی کی معیت میں اسے بھیجا گیا۔ سفر ہی میں نزاع ہوئی اور مسلم ساتھی کو قتل کر کے بیز صدقہ کے مویشیوں کو بھی ساتھ لے کر بھاگ آیا۔ دوہرے بھاری بھاری فوجداری جرائم

---

[1] زیر جنگ علاقے میں عام شہری نظام کے مکمل قیام سے قبل اسلامی قانون کی رو سے یہ ہر حال فوجی قوت کے ہاتھوں کسی قدر کڑا عبوری نظام قائم کیا جاتا ہے اور اس نظام میں بعض احکام و ضوابط معمول کے شہری نظام سے مختلف نوعیت رکھتے ہیں' میرا خیال ہے کہ جدید اصطلاح میں اسی کو فوجی تسلط (مارشل لاء) کہا جاتا ہے۔ مارشل لاء اسلام کے رو سے علی الخصوص اور ہر مہذب حکومت کے تحت علی العموم زیر جنگ علاقے میں محض ناگزیر حد تک مختصر سے عبوری دور کے لیے نافذ ہوتا ہے اور وہ بھی مفتوح دشمنوں پر مارشل لاء کے نام سے۔ ہمارے اس دور میں کسی ملک کی فوج کا اپنے ہی ملک کے باشندوں کو شہری نظم سے محروم کر کے لیے غیر معین عرصے کے لیے اپنے تسلط میں لینا بالکل دوسری صورت ہے اور متن میں یہ اصطلاح اس نئے مفہوم کے ساتھ استعمال نہیں کی گئی۔ اسلام میں حکومت کا ایسا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

اس کے ذمے تھے۔

صفوان بن امیہ اسلامی تحریک کے کٹر مخالفوں میں تھے۔ بھاگ کر یمن جاتے ہوئے جدہ پہنچے تھے۔ کہ عمیر بن وہب جمحی حضورؐ سے معافی کی منظوری لے کر جدہ سے واپس لائے۔ بعد میں اسلام اختیار کیا۔

عکرمہ بن ابوجہل بھی یمن بھاگ گئے تھے۔ ان کی زوجہ ام حکیمؓ بنت الحارث (ابوجہل کی بھتیجی) خود مسلمان ہوئیں اور اپنے شوہر کے لیے حضورؐ سے معافی کی منظوری لی۔ خود جا کر لائیں۔ عکرمہ کو جب معافی کی خوش خبری ملی تو انہیں سخت تعجب ہوا کہ ان جیسے مخالف کو بھی محمد (ﷺ) نے معاف کر دیا۔ حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح مسلمان تھے اور ان کو کتابت وحی کا موقع بھی ملا تھا۔ مگر منحرف ہو کر مخالف محاذ سے تعاون کرنے لگے۔ یہاں تک کہ استخفاف کے لیے انہوں نے یہ بھی کہا کہ وحی تو دراصل مجھ پر آتی تھی۔ محمد (ﷺ) تو مجھ سے سن کر لکھوا لیتے تھے۔ جرم سخت تھا لیکن حضرت عثمانؓ کی طرف سے باصرار سفارش ہونے پر حضورؐ نے بہ حیثیت حاکم اعلیٰ ان کو معافی دے دی۔ معافی کے بعد پھر یہ مسلمان ہوئے۔

مقیس بن صبابہ (یاصبابت) منافقانہ طور پر اسلامی جماعت میں شریک ہوا اور دھوکے سے ایک انصاری کو قتل کر کے بھاگ آیا تھا۔ اس اقدام کا محرک یہ ہوا کہ مقیس کا بھائی غلطی سے اس انصاری کے ہاتھوں مارا گیا۔ حضورؐ نے اس کی دیت دلوا دی۔ اس کے باوجود اس نے انصاری کو قتل کیا۔ ارتداد اور فریب دہی کے علاوہ تنہا یہ ارتکاب قتل ہی سزائے موت کے لیے کافی وجہ جواز تھا۔

ہبار بن الاسود وہ شخص ہے جس نے دوسری مخالفانہ حرکات کے علاوہ حضرت زینبؓ پر ہجرت کے وقت حملہ کر کے اتنی اذیت دی تھی کہ ان کا حمل ساقط ہو گیا۔ پہلے چھپا رہا' پھر خود ہی پیش ہو کر عاجزی سے اعتراف قصور کیا اور رسول اللہ (ﷺ) کی خدمت میں سخت شرمندگی کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی کلمہ اسلام کی قبولیت کا اعلان کیا۔ حضورؐ نے فرمایا: "میں نے ہبار کو معاف کر دیا"۔

حضرت حمزہؓ کا قاتل اسم بامسمی وحشی سامنے آیا اور اسلام قبول کیا۔ حضورؐ نے اس سے حضرت حمزہؓ کے قتل کا حال سنا۔ اس کا جرم بھی معاف کیا اور اسے مشورہ دیا کہ تم میرے سامنے نہ آیا کرو کہ اس سے زخم تازہ ہوتے ہیں۔ یہ شخص اسلام لانے کے بعد جنگ یرموک میں شریک ہوا اور اس کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ مسیلمہ کذاب کو اس نے تیر سے ہلاک کیا۔ کہتا تھا کہ میں نے سب سے اچھے آدمی کو قتل کر کے جو گناہ کیا ہے' اب سب سے برے آدمی کو قتل کر کے کفارہ ادا کر دیا ہے۔

عبداللہ بن زبعری مشہور جاہلی شاعر جس نے شعری قوت کو اسلام کے خلاف اشتعال پھیلانے میں استعمال کیا تھا۔ پیش ہوا اور اسلام لایا۔ معافی دے دی گئی۔

کعبؓ بن زہیر نے بھی اسلامی تحریک اور اس کے داعی کے خلاف ہجویہ شاعری کا محاذ گرم رکھا تھا۔ ۹ھ

میں اپنے بھائی کے ساتھ حاضر ہوا۔ اسلام قبول کیا اور تلافی کے سچے جذبے سے قصیدہ بانت سعاد پیش کیا۔ حضورؐ نے معافی دی اور اپنی چادر انعام میں عطا فرمائی۔

قیام مکہ ہی کے زمانے میں ایک بار حضورؐ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ فضالہ بن عمیر چھپ کر ارادہ قتل سے آیا۔ حضورؐ خود ہی پاس جا پہنچے اور اس کے دل کی بات بتا دی۔ فضالہ اس گرفت پر شرمسار ہوا۔ آپؐ نے استغفار کے لیے کہا اور اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ معاً اس کے دل کی دنیا بدل گئی۔ ارادہ قتل کے مجرم سے یہ سلوک اور کس سے متوقع ہو سکتا ہے۔

عورتوں میں سب سے بڑی مجرمہ ہند بنت عتبہ تھی۔ جس نے سرگرمی سے مخالفتیں کی تھیں اور حضرت حمزہ کا مثلہ کیا تھا۔ بلکہ ان کا کلیجہ چبا گئی تھی۔ چہرہ چھپانے کے لیے نقاب پہن کر حاضر خدمت ہوئی۔ حالات سے مجبور ہو کر یہ اسلام قبول کرنے آئی۔ لیکن اس لمحے بھی ڈھٹائی سے عجیب عجیب ٹیڑھی باتیں حضورؐ سے کیں' مکالمہ یوں ہوا۔

ہند: اے خدا کے رسول! (ﷺ) آپؐ ہم سے کن باتوں کا اقرار لیتے ہیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو"۔

ہند: یہ اقرار آپؐ نے مردوں سے تو نہیں لیا۔ مگر خیر۔ ہمیں یہ بھی منظور ہے۔

رسول (صلی اللہ علیہ وسلم): "چوری نہ کرو"۔

ہند: میں اپنے شوہر ابو سفیان کے مال میں سے دو چار درہم کبھی کبھار نکال لیتی ہوں۔ معلوم نہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ ناجائز؟

رسول (صلی اللہ علیہ وسلم): "اولادوں کو قتل نہ کرو"۔

ہند: ہم نے تو بچپن میں ان کو پالا۔ بڑے ہوئے تو (جنگ بدر میں) آپؐ نے ہی ان کو قتل کر ڈالا۔ اب آپ جانیں اور وہ!

جیسا کچھ قبول اسلام یہ تھا' ظاہر ہے۔ پھر یہ گستاخانہ انداز کلام' کوئی بھی دوسرا ہوتا تو اسے گوارا نہ کرتا۔ حضورؐ کا بے پایاں حلم تھا جس سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا تھا۔

'قرتنا' ابن خطل کی لونڈی تھی۔ اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہجویں گایا کرتی تھی۔ فتح کے وقت بھاگ گئی۔ بعد میں تائب ہوئی اور اسلام میں داخل ہوئی۔

ایک عورت بہ سلسلہ قصاص قتل ہو گئی۔

چند مردوں اور عورتوں کے متعلق احادیث اور کتب سیرت کی روایات میں خاصا اختلاف ہے۔ لیکن قطعیت سے ان میں سے کسی کا سزائے موت پانا ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

ایسے کٹر دشمنوں کے لیے ایسے عفو عام کی مثال اس درجہ کی فتح کاملہ حاصل کرنے کے بعد کسی اور کی زندگی سے تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

سرزمین مکہ کی فتح سے بڑھ کر عظیم فتح یہ تھی کہ حضورؐ مقام صفا کی بلندی پر بیٹھے تھے اور لوگ جوق در جوق آکر اسلام قبول کر رہے تھے۔ ان سے توحید و رسالت کے اقرار کے ساتھ خصوصی طور پر بعض رائج الوقت خرابیوں سے اجتناب کا عہد بھی لیا جاتا۔ بیعت کے اجزاء یہ تھے۔

○ میں خدا کے ساتھ کسی کو بھی اس کی ذات اور اس کی صفات اور عبادت اور استعانت کے استحقاق میں شریک نہ کروں گا۔

○ چوری نہ کروں گا۔ زنا نہ کروں گا۔ خون ناحق نہ کروں گا۔ لڑکیوں کو ہلاک نہ کروں گا۔ کسی پر بہتان نہ لگاؤں گا۔

○ معروف کے دائرے میں حسب استطاعت خدا کے رسولؐ کی اطاعت کروں گا۔

پندرہ روز یا کم و بیش قیام رکھنے کے بعد جب مکہ سے حضورؐ روانہ ہوئے تو اصل تعمیری کام کے لیے حضرت معاذ بن جبل کو مامور کیا کہ وہ لوگوں کو اسلامی نظام حیات' اسلامی عقائد' اسلامی اخلاق اسلامی قانون اور اسلامی ثقافت کی تعلیم دیں۔ اسلامی عدلیہ کا نظام آپؐ کے اپنے ہاتھوں حد جاری کرنے کے اس مشہور واقعہ سے ہوا۔ جس میں فاطمہ بنت ابی الاسد کو چوری کے جرم میں بڑے سفارشی دباؤ کو مسترد کر کے قطع ید کی سزا دی گئی۔ حنین و طائف سے فارغ ہونے کے بعد مکہ آکر حضورؐ نے عتابؓ بن اسید کو نائب حاکم مقرر کیا۔ اور ایک درہم یومیہ کا معاوضہ ان کے لیے طے کر دیا۔

چند اہم اشارات:

۱۔ فتح مکہ' تحریک اسلامی کی تاریخ کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ اب گویا نظام حق کے راستے سے سب سے بڑی مزاحم طاقت ہٹ گئی تھی۔ عرب کی دیرینہ جاہلی قیادت کا یہ مرکز تھا اور اس قیادت کا ہدم جب تک نہ ہو جاتا۔ اور لوگوں کی ذہنی وابستگی کا یہ قدیمی محور جب تک جگہ سے ٹل نہ جاتا ممکن ہی نہ تھا کہ اسلامی انقلاب کی رو پوری رفتار سے آگے بڑھ سکتی۔ جب جاہلی قیادت کا علم سرنگوں ہو گیا تو پھر نظام جاہلی کا برقرار رہنا اور جاہلیت کے گرد عوام کا سٹے رہنا ممکن نہ رہا۔

عوام الناس کی بہت سی ریچیدگیاں فتح مکہ نے ختم کر دیں۔ بہت سے قبائل اسلام کی طرف بڑھنے سے اس لیے معذور تھے کہ قریش کے ساتھ یا تو ان کے حلیفانہ تعلقات تھے یا معاشی طور پر وہ ان کے دست نگر اور مقروض تھے۔ یا ان کی سماجی برتری سے مرعوب اور مذہبی لحاظ سے ان کی پروہتی سے مسحور تھے۔ قریش کی عظمت کا بت جب ٹوٹ گیا تو ان کے راستے صاف ہو گئے۔

بہت سے عوامی حلقوں میں یہ اعتقاد پھیلا ہوا تھا کہ مکہ میں صرف وہی غالب رہ سکتا ہے جسے خدا کی تائید حاصل ہو۔ اور جو طاقت حق پر نہ ہو اسے مکہ میں فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کا اعتقاد ابرہہ کے حملہ کے بعد سے بہت قوی ہو گیا اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ قریش مقبول الٰہی ہیں۔ چنانچہ لوگ کہا کرتے

تھے۔ کہ "اترکوہ و قومہ فانہ ان ظہر علیھم فھو لی صادق" (اسے اپنی قوم سے نمٹ لینے دو۔ اگر اس نے قوم کو زیر کر لیا تو وہ نبی صادق ہے) اس اعتقاد کے مطابق ہی اب رائے عام کا مرجع اسلامی تحریک بن گئی۔ نہ صرف مکہ کے لوگوں نے بلکہ آس پاس کے قبائل کے وفود نے آکر خوشی خوشی اپنے آپ کو اسلامی تحریک کا خادم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کا پیرو بنایا۔

اب دعوتی اور تعلیمی کام کے لیے میدان بالکل صاف ہو گیا۔ اور ایک ایک مسلمان کے لیے ہر طرف موقع نکل آیا کہ وہ تحریک حق کا پیغام عوام تک پہنچائے۔ اب کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہیں تھا۔

۲۔ مکہ کو حضورؐ جب مہم لے کے چلے تو شروع ہی سے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ خوں ریزی نہ ہونے پائے۔ اپنے ارادہ کو اخفاء میں رکھ کر سفر کیا اور قریش کو کسی تیاری اور آس پاس سے کوئی مدد حاصل کرنے کا موقع دیئے بغیر مکہ کے دروازے پر یکایک جا پہنچے۔ اس طرح مخالف طاقت جو پہلے ہی حد درجہ کمزور ہو چکی تھی۔ بالکل مبہوت رہ گئی۔ پھر ابوسفیان جس کی ذہنی شکست کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا اسے مناسب تدابیر سے بالکل مرعوب کر دیا گیا۔ ابو سفیان کے جھک جانے کی وجہ سے کوئی موقع نہ رہا کہ اہل مکہ مزاحمت کریں۔ یہی مقصد تھا جس کے تحت آپؐ نے ایک فوجی افسر کو محض ایک سخت نعرہ لگانے کی بنا پر دستے کی کمان سے الگ کر دیا۔ اور اہل مکہ کو اطمینان دلایا کہ آج کا دن کعبہ کی حرمت کا دن ہے۔

۳۔ حضورؐ نے تحریک کے کٹر دشمنوں اور خود اپنی ذات پر اور اپنے محبوب ساتھیوں پر کئی سال تک مظالم ڈھانے والوں، تمسخر کرنے والوں، غلاظت پھینکنے والوں، راستے میں کانٹے ڈالنے والوں، قید کرنے والوں، قتل کی سازش کرنے والوں، وطن سے نکالنے والوں، پھر تلوار لے کے میدان جنگ میں اترنے والوں کے گندے اور سنگین جرائم بالکل بھلا دیئے اور عام معافی کا اعلان کر دیا۔ سختی کے بجائے نرم پالیسی کا مدعا ظاہر تھا۔ حضورؐ ایک دنیوی فاتح نہ تھے کہ جبر و قوت سے کچھ لوگوں کو محکوم بنا لینا اور ڈنڈے کے زور سے ڈرا دھمکا کر ان کو اپنے احکام کا پابند بنا لینا کافی ہوتا۔ آپؐ ایک دعوت، ایک مشن، ایک اخلاقی تحریک اور ایک پاکیزہ نظام کے علمبردار تھے۔ آپؐ کے مقصد کے لیے ایسے مفتوحین بیکار تھے جنہیں مارے باندھے اطاعت میں لیا گیا ہو۔ آپؐ کو دلوں کی تبدیلی درکار تھی۔ دلوں کی تبدیلی ہمیشہ نرمی اور احسان اور عفو کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ آپؐ کا مدعا جبھی پورا ہو سکتا تھا کہ اہل مکہ شرمسار اور نادم ہو کر نیا دور شروع کریں۔ ایک نظریہ حق اور تعمیری نصب العین رکھنے والی ہستی کے لیے کوئی دوسری فاتحانہ پالیسی قابل عمل نہ تھی۔

محسن انسانیت ﷺ کی نگاہ اس حقیقت نفس الامری پر بھی تھی کہ قریش بہرحال عربوں میں قیادت کرنے کے لیے موزوں ترین تجربہ کار عنصر ہیں۔ یہ قبائل عرب کے اوراق پریشان کی شیرازہ بندی کے لیے ایک ایسا مضبوط بندھن ہیں کہ اگر ان کو ضائع کر دیا جائے تو آسانی سے کوئی دوسرا بدل فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ اصولاً یہ اسلامی نظریہ برحق اور واجب القبول کہ امامت و قیادت کا مستحق وہ جو ایمان و تقویٰ میں

پیش پیش ہو۔ مگر ایمان و تقوی کے ساتھ قیادت کی ذہنی و عملی صلاحیتوں کا ہونا تو ایک کھلی ہوئی عقلی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے اثر و رسوخ چاہیے۔ حکمرانی اور کمانڈ کا تجربہ چاہیے۔ تدبیر و مصلحت کا شعور چاہیے۔ زبان اور دوسری قوتوں سے کام لینے کی مہارت چاہیے' نفسیات عامہ کا عرفان چاہیے پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ قیادت کرنے والے افراد یا عناصر کامیاب جبھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی برتری عوام میں پہلے سے مسلم ہو۔ اور رائے عام کی سرزمین میں ان کی جڑیں گہری ہوں۔ کسی قیادت کا درخت ہوا میں نصب نہیں ہو سکتا' قریش کی قیادت کی صلاحیتیں جاہلیت کے تابع تھیں تو اسلام کی نگاہ میں مسترد تھیں۔ لیکن اب اگر وہ اسلام کے تحت آکر ایمان و تقوی کا جوہر حاصل کر سکتی تھیں۔ تو اب وہ ایک متاع گراں بہا تھیں۔ حضورؐ نے فاتحانہ سلوک کی ساری پالیسی اسی مدعا کے تحت وضع کی کہ اسلامی نظام اور اسلامی تحریک کو لیڈر اور کار فرما افراد قریش سے مل سکیں۔ جبر سے کچلے ہوئے اور ذلیل شدہ قریش اس ضرورت کو پورا نہ کر سکتے تھے۔

(۴) کسی بھی دنیوی سیاست کے علمبردار سے آپ اس شان خدا پرستی کی توقع نہیں کر سکتے جس کا نمونہ حضورؐ نے پیش فرمایا۔ فاتحانہ داخلہ ہوتا ہے' تو کوئی طبل' دمامہ نہیں' کوئی فخر و مباہات نہیں۔ کوئی دعوی نہیں۔ بلکہ الٹا "وادخلوا الباب سجدا" کی تعمیل میں سر تسلیم بارگاہ الٰہی میں خم ہو جاتا ہے۔ خدا کی حمد کے ترانے زبان سے جاری ہوتے ہیں۔ نعرہ بھی زبان پر آتا ہے تو اللہ کی بڑائی کا آتا ہے۔ اذانیں اور نمازیں اور دعائیں مکہ کی فضا کو نور سے بھر دیتی ہیں۔ اپنا کوئی مفاد حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ اپنے اور مہاجرین کے املاک جو قریش نے غاصبانہ طور پر ہتھیا لیے تھے وہ بھی انہی کی تحویل میں رہنے دیے جاتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے بعض غیر نصفت شعار ناقدین جنہوں نے حضورؐ کی اسلامی تحریک کے خدا پرستانہ رنگ کو محض مصلحت کا مظہر قرار دیا ہے۔ بلکہ بعض نے تو کھلم کھلا اسے (نعوذ باللہ) ایک ڈھونگ ثابت کرنا چاہا ہے' انہوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ ڈھونگ رچانے والوں کو جب بھرپور کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو پھر سارا پول کھل جاتا ہے۔ اور مصلحت کا کچا رنگ اڑ جایا کرتا ہے۔ خدانخواستہ یہ کوئی سیاسی سوانگ ہوتا تو فتح مکہ نے وہ موقع پیدا کر دیا تھا جب کہ اصل حقیقت کھل جاتی اور خدا کی بڑائی پکارنے والے اس دن اپنی بڑائی کا اعلان کرتے دکھائی دیتے۔ مگر وہاں حال یہ تھا کہ حضورؐ اپنے خطبہ فتح میں کامیابی کا سارا کریڈٹ خدا تعالیٰ کو دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ "اس نے اپنے بندے کی مدد کی"۔

(۵) حضورؐ نے فتح مکہ کے موقع پر نہ صرف سیاسی جرائم معاف کر دیئے۔ بلکہ بعض افراد کے ایسے قانونی جرائم جن پر قصاص لیا جانا چاہیے تھا ان کی بھی معافی دے دی۔ ان نظائر کو پیش نظر رکھ کر قانونی نقطہ نظر سے دور حاضر کے حالات میں یہ سوچا جانا چاہیے کہ اسلامی نظام میں صدر حکومت سزاؤں میں معافی یا تخفیف کا اختیار کہاں تک پا سکتا ہے۔

فتح مکہ کی تکمیل:

فتح مکہ صحیح معنوں میں فتح نہ ہوتی اور ہوتی تو اسے قائم رکھنا مشکل ہو جاتا اگر مکہ کے ارد گرد قریش کے دیرینہ حمائیتیوں اور تقریباً مساویانہ شان رکھنے والے مضبوط قبیلوں کے گڑھ بھی مفتوح نہ ہو جاتے۔ مکہ کی جاہلی قیادت جہاں بجائے خود ایک وزن رکھتی تھی' وہاں اس کی مضبوطی میں بنو ہوازن' اہل طائف اور بنو ثقیف کا بھی بڑا حصہ تھا۔ یہ گویا ایک ہی تنے کی شاخیں تھیں۔ عرب کے مقابلے میں مکہ کے یہ ملحقہ قبائل بھی قائدانہ مرتبہ رکھتے تھے ---- اگرچہ قریش کے سامنے یہ مرتبہ ثانوی نوعیت کا تھا۔ مکہ کے ساتھ ان کے حلیفانہ سیاسی تعلقات بھی قدیم تھے ان میں معاشی رابطہ بھی گہرا تھا۔ جنگی ضرورتوں میں بھی یہ اکثر ایک دوسرے کے ساتھی تھے اور کلچر کے اعتبار سے بھی یہ بالائی طبقے کے لوگ تھے۔ فتح مکہ اگر خون ریزی کے بغیر ہوئی تو بالکل معجزانہ طور پر ہوئی۔ ورنہ ہونی بات یہ تھی کہ بنو ہوازن اور بنی ثقیف اور اہل طائف سب کے سب متحدہ قوت سے قریش کی قیادت کا بچاؤ کرتے۔ اس صورت میں یہ معرکہ ایک انتہائی سنگین معرکہ ہوتا مگر نبی اکرم ﷺ کی تدابیر ایسی ماہرانہ تھیں کہ اہل مکہ کو ارد گرد سے کوئی تعاون حاصل نہ ہو سکا اور وہ اکیلے زد پر آگئے۔

قبیلہ ہوازن کے لیڈر پہلے سے اندازہ رکھتے تھے کہ کیا پیش آنے والا ہے۔ بدر سے جس آویزش کی ابتدا ہوئی تھی' اس کی تکمیل کا باب ابھی سامنے آنا باقی تھا۔ پھر قریش کی طرف سے معاہدہ حدیبیہ کے خاتمہ اور حضورؐ کی طرف سے شرائط لانے والے قاصد کا مکہ سے لوٹایا جانا اور پھر ابوسفیان کا تجدید معاہدہ میں ناکام رہنا---- یہ پورا تسلسل واقعات اچھے آثار نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ قبیلہ ہوازن کے سرداروں نے سال بھر سے قوت کی فراہمی کی مہم شروع کر رکھی تھی اور انہوں نے قبائل میں دورہ کر کے اسلام کے خلاف جذباتی حرکت پیدا کر دی تھی۔ مگر جب وقت آیا تو نبی اکرم ﷺ کی پر اسرار نقل و حرکت سے ان کو سخت غلط فہمی ہوئی۔ بنو ہوازن نے سمجھا کہ رخ ان کی طرف ہے۔ انہوں نے اپنے ہی علاقے میں فوجی اجتماع کیا۔ اور جوش و خروش سے تیاریاں ہونے لگیں۔

ادھر واقعات کی رو ان کے اندازوں کے خلاف کسی اور شکل میں چل گی۔ وہ اپنی جگہ بیٹھے رہے اور سقوط مکہ جیسا عظیم تاریخی حادثہ بڑے آرام سے واقع ہو گیا۔ فتح مکہ کا اثر دوسرے قبائل پر تو یہ پڑا کہ ان کے وفود نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آ آ کر اسلامی تحریک کے سایہ دامن میں داخل ہوتے گئے لیکن بنو ہوازن اور بنو ثقیف پر فتح مکہ کا اثر الٹا پڑا۔ کیونکہ ایک طرف انہیں اپنی افرادی کثرت' اپنی معاشی طاقت اور اپنی جنگی مہارت پر بڑا بھروسہ تھا۔ اور دوسری طرف اسلامی انقلاب کے رد عمل میں پڑ کر مسلسل مخالفانہ اور حریفانہ کارروائیاں کرنے کی وجہ سے وہ اب اپنی شان مزاحمت کی تکمیل پر مجبور تھے۔ انہوں نے آخر معرکہ لڑنے کے لیے اپنی ساری قوت حنین یا اوطاس نامی وادی میں (طائف اور مکہ کے درمیان)

سمیٹ لی تھی۔ صرف بنو کعب اور بنو کلاب نے پوری طرح علیحدگی اختیار کی تھی۔

سرور عالم ﷺ کو بنو ہوازن کی ان تیاریوں کا حال معلوم ہوا۔ آپؐ نے عبداللہ بن ابی حدرد کو بطور جاسوس بھیج کر مصدقہ معلومات حاصل کیں۔ اب مقابلہ کے لیے تیاری ہونے لگی۔ جنگی ضروریات کے لیے حضورؐ نے عبداللہ بن ربیعہ سے ۳۰ ہزار درہم کی رقم قرض لی۔ اور صفوان بن امیہ رئیس مکہ سے اسلحہ جنگ (خصوصاً ۱۰۰ زرہیں) مستعار لیے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محسن انسانیت ﷺ کسی غیر معمولی جنگی تیاری کے ساتھ نہیں نکلے تھے۔ اور آپؐ کو پہلے ہی سے کسی خونریزی کا خیال نہ تھا۔ موقع پر نئی تیاریوں کی ضرورت پیش آئی۔ کتنا نادر واقعہ ہے کہ ایک فاتح جس نے مکمل طور پر قریش کو زیر کر لیا تھا اور جو ان سے مال اور اسلحہ بالجبر وصول کر سکتا تھا' اسے اس مقام عظمت پر ہوتے ہوئے بھی اخلاقی اصولوں کا اتنا پاس تھا کہ جو کچھ لیا قرض اور مستعار لیا۔ اسلامی تحریک کا امتیاز اس کی یہی اخلاقی روح ہے۔

شوال ۸ ھ میں مسلم فوج بارہ ہزار کی تعداد میں مکہ سے مارچ کرتی ہے۔ انسان بہرحال انسان ہے۔ حق کے ان سپاہیوں کے دلوں میں کسی نہ کسی نوع سے یہ تاثر ابھرا کہ آج ہم مکہ کے فاتح ہیں۔ ہماری تعداد کثیر ہے اور ہمارے ساتھ سامان جنگ بافراط ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسا احساس کمزور کرنے ہی کا موجب ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو خیال نہ رہا کہ وہ شہنشاہ حقیقی کے سپاہی ہیں جسے اپنے بندوں کی طرف سے غرور کی ایک رمق بھی گوارا نہیں۔ غرور خدا اور بندوں کے درمیان آہنی حجاب بن جاتا ہے اور تائید الٰہی کی وہ تمنائے بے تاب باقی نہیں رہتی جو کسی بھی اسلامی معرکہ کی جان ہوتی ہے۔ اس تاثر پر چند لمحوں کے لیے ایسی گرفت ہوئی کہ تاریخی یادگار بن گئی اور قرآن نے انسانیت کے لیے اسے درست عبرت بنا دیا۔

(ہوا یہ کہ مسلم فوج میں اب کی بار مکہ سے ایک نیا عنصر شامل ہوا تھا۔ مقدمتہ الجیش میں خالد کے زیر کمان نومسلم نوجوان تھے۔ جنہوں نے جوشیلے پن میں پوری طرح مسلح ہونے سے بھی بے نیازی برتی' علاوہ ازیں مکہ کے ۲ ہزار "طلقاء" تھے۔ جو اسلامی حکومت کے مطیع تو ہو چکے تھے لیکن ابھی تک اسلام سے بہرہ مند نہ تھے۔ مخالف فریق کی وجہ فوقیت یہ تھی کہ وہ لوگ فن جنگ کے انتہائی ماہر اور تیر پھینکنے میں عرب بھر میں مانے ہوئے تیر انداز تھے۔ انہوں نے میدان کے بہتر حصے پر قبضہ بھی پہلے جما لیا تھا۔ مناسب مورچے سنبھال رکھے تھے اور ٹیلوں' گھاٹیوں اور غاروں میں تیر اندازوں کے دستے چھپا رکھے تھے۔ •

پہلے ہی حملے میں جب اچانک ہر طرف سے تیروں کا مینہ برسا تو مقدمتہ الجیش بکھر گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ گھبراہٹ میں مسلم فوج کے تمام دستے منتشر ہونے لگے۔ ایک وقت آیا کہ حضورؐ اپنی جگہ پر تن تنہا کھڑے رہ گئے۔ یہ لمحہ ان لمحوں میں سے ایک ہے جن کی نزاکت نے حضورؐ کی عزیمت و پامردی اور یقین و اعتماد کی شہادت بہم پہنچائی ہے۔ ہمت سے ساتھیوں کو پکارا اور سواری سے اتر کر جلال بھرے انداز میں فرمایا:

انا النبی لا کذب   انا ابن عبدالمطلب

حضرت عباسؓ نے قریب ہی سے صدا بلند کی۔ یا معشر الانصار! یا اصحاب الشجرہ! اتنا سننا تھا کہ ہر طرف سے مسلمان لپکے اور اپنے مرکز استقامت کے گرد جمع ہو گئے۔ پھر جو لڑے تو آناً فاناً رنگ بدل گیا۔ دشمن کے ستر آدمی مارے گئے اور جب ان کا علمبردار ہلاک ہو گیا تو ان کے قدم اکھڑ گئے۔ شکست خوردہ فوج کا ایک حصہ قلعہ اوطاس میں جا چھپا۔ ابو عامر اشعری مختصر سا دستہ لے کے گئے۔ دشمن کئی ہزار کی تعداد میں تھا۔ ابو عامر اشعری خود شہید ہو گئے لیکن اسلامی دستے نے بازی جیت لی۔

طائف بڑا ہی محفوظ مقام تھا۔ کیونکہ اس کے گرد فصیل موجود تھی۔ اس فصیل کی مرمت کی جا چکی تھی اور سال بھر کا سامان رسد پہلے سے جمع تھا۔ اسلحہ وافر تھا۔ حضورؐ کا اصل ہدف یہی مرکزی مقام تھا۔ لیکن ترتیب ایسی اختیار کی کہ بنو ہوازن کی مدد سے اہل طائف کو پہلے محروم کر دیا البتہ شکست خوردہ لوگ یہیں آ گئے تھے۔ راستہ میں لیہ نامی گڑھی بھی گرا دی۔ طائف پر حملہ ایسے رخ سے کیا گیا جدھر سے اہل طائف کو گمان نہ گزرا ہو گا۔ حضرت خالد ایک دستہ لے کر پہلے روانہ ہوئے۔ بعد میں حضورؐ بہ نفس نفیس پوری فوج لے کے پہنچے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قلعہ شکنی کے لیے مسلم فوج نے منجنیق اور دبابے استعمال کیے (حضورؐ نے کچھ آدمی جرش نامی مقام پر قلعہ شکن بھاری آلات سے متعلق تربیت حاصل کرنے کے لیے بھجوائے تھے۔ جرش ان آلات کی صنعت کا مرکز تھا۔ اور غالباً یہودی اس صنعت پر قابض تھے) لیکن اندر سے سپاہ پر طوفانی ناوک اندازی کے ساتھ ساتھ قلعہ شکن آلات کو نقصان پہنچانے کے لیے گرم آہنی سلاخیں بھی برسائی گئیں۔ مسلم سپاہی بکثرت زخمی ہوئے اور فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

حضورؐ نے نوفل بن معاویہ سے خصوصی مشورہ طلب کیا۔ اس نے یہ دلچسپ جواب دیا کہ لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے۔ کوشش جاری رکھیں تو قابو میں آ کے رہے گی۔ اور اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں تو کوئی بڑا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ اس صائب مشورے کی روشنی میں حضورؐ نے سوچا کہ طائف اسلام کے زیر نگیں آئے ہوئے عرب کے درمیان ایک جزیرہ اختلاف بن کر تو رہ نہیں سکتا۔ اسے اگر اس وقت مسخر کیا گیا تو دو طرفہ نقصان ہو گا۔ اور اگر چھوڑ دیا گیا تو حالات اہل طائف کے اندر رضاکارانہ جذبہ اطاعت ابھار دیں گے۔ بلکہ دلوں کے دروازے اسلام کے انقلابی نظریے کے لیے کھل جائیں گے۔ چنانچہ آپؐ نے دین کی مصلحت اور اہل طائف کی فلاح کو ملحوظ رکھ کر محاصرہ اٹھا لیا۔ یہ ایک واضح ترین ثبوت ہے کہ حضورؐ خونریزی سے بچنے کی کتنی فکر رکھتے تھے۔

ساتھیوں نے کہا کہ آپؐ ان لوگوں کے لیے بد دعا کیجئے۔ مگر آپؐ نے یہ دعا کی کہ "اللھم اھد ثقیفا وائت بھم" (اے اللہ! تو ثقیف کو راستی کی ہدایت دے اور ان کو ہمارے ساتھ ملا دے) یہ دعا اس طائف کے باشندوں کے لیے کی جا رہی تھی' جس نے پتھر مار مار کر ایک دن حضورؐ کے خون سے اپنی گلیوں کی مٹی کو لالہ زار کیا تھا۔ یہ دعا بھی اسی رحمت بھرے ذہن کی ترجمانی ہے جس نے قوت سے جہاں بھی کام لیا' چارو ناچار لیا۔ مگر جس نے عفو اور احسان کے دریا بہانے میں کہیں بھی کوتاہی نہیں کی۔

جعرانہ میں بے شمار مال غنیمت ــــ ۲۴ ہزار اونٹ' ۴۰ ہزار بکریاں' ۴ ہزار اوقیہ چاندی جمع تھا۔ اس میں سے قرآنی قانون کے مطابق پانچواں حصہ معاشرہ کے حاجت مند طبقوں اور اجتماعی ضرورتوں کے لیے بیت المال میں لیا گیا اور بقیہ فوج میں تقسیم کر دیا گیا۔ علاوہ اس بات کے کہ یہ صورت حریف کی مالی اور جنگی قوت کو گھٹانے کا ذریعہ تھی' قرن ہا قرن سے یکجا سمٹی ہوئی دولت کی یخ بستہ ندی کو پہلی بار کھلے بہاؤ کا موقع ملا۔ اور اونچے اور نیچے قبائل کے پرانے معاشی عدم توازن کا ازالہ ہونے لگا۔

قرآن نے تالیف قلب کی جو مد رکھی ہے' اس کے تحت حضورؐ نے مکہ کے باشندوں اور ان کے لیڈروں کو دل کھول کر بہت سا مال دیا۔ مقصود یہ تھا کہ ان کے زخموں پر مرہم رکھا جا سکے۔ ان سے زیادہ حرماں نصیب اس وقت آسمان کے نیچے کون ہو گا۔ جن کی قیادتوں کے تخت الٹ گئے تھے۔ اور جن کے لیے تاریخ کی ساری فضا ہی نے رنگ بدل لیا تھا۔ ان کے احساسات کا عالم کیا ہوا ہو گا۔ جب وہ سرور عالم ﷺ کے قرابت دار ہوتے ہوئے پچھلی صفوں میں کھڑے تھے۔ اور انصار اور مہاجرین حضورؐ کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ قانون الٰہی کی عدالت نے بیس برس لمبے مقدمے کا فیصلہ سنایا اور اس مقدمے میں اپنا بہت کچھ لگا کر قریش یکسر ہر گئے تھے۔ ان سے بڑھ کر دکھی اس دن کون ہو گا۔ ان کے زخموں پر اگر احسان کا مرہم نہ رکھا جاتا تو ان کی ٹیسیں بار بار دبی دبی انتقامی رو پیدا کرتی رہتیں۔ اور وہ بادل ناخواستہ مطیع رہ کر اسلامی ریاست کے مقاصد کو اندر ہی اندر سے غارت کرنے کا موجب ہوتے۔ کیسا عجیب سماں ہو گا کہ ابوسفیان' حکیم بن حزام' نضر بن حارث' صفوان بن امیہ' اقرع بن حابس اور ان جیسے دوسرے اکابر اسی شخص کے ہاتھوں سے آج عطیات حاصل کر رہے تھے جسے انہوں نے برسوں گالیاں دی تھیں' جھوٹا کہا تھا' مذاق اور طنز کا نشانہ بنایا تھا' بدنی اذیتیں دی تھیں' قید میں ڈالا تھا' قتل کرنا چاہا تھا' گھر سے نکالا تھا اور جس کے خلاف تلوار اٹھا کر اسے امن و چین کا ایک لمحہ بسر کرنے کا موقع نہ دیا تھا۔ انسان نوازی کی ایسی کتنی مثالیں تاریخ کے بے پایاں دفتروں میں ملتی ہیں؟

انصار نے جب دریائے کرم کو قریش کے حق میں اس طرح امڈتے دیکھا تو ان کے بعض عناصر تھوڑی دیر کے لیے ادنیٰ جذبات کی لپیٹ میں آ گئے۔ ان کا تاثر یہ تھا کہ شاید حضورؐ نسلی اور وطنی تعلق کی بنا پر ان لوگوں کو نواز رہے ہیں اور ہمیں پس پشت ڈال دیا ہے۔ کہا گیا کہ حق کی حمایت میں جان جوکھوں میں پڑنے کے لیے تو ہم ہیں اور ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے۔ لیکن داد و دہش کے وقت قریش مقدم ہو گئے ہیں۔

یوں سوچنے والوں نے یہ نہ سوچا کہ حضورؐ نے اپنے اہل بیت پر یہ بارش نہیں کی تھی۔ قربانیاں دینے والے قرابت مند مہاجرین تک کو نہیں نوازا تھا۔ خود کوئی امتیازی استفادہ نہیں کیا تھا۔ تو پھر اگر قریش کے ساتھ یہ خصوصی سلوک ہو رہا تھا تو اس کی بنیاد کسی عظیم مصلحت پر ہو گی۔

بات حضورؐ تک پہنچی تو جیسے کہ ہم پورا واقعہ پہلے بیان کر چکے ہیں' ایک شامیانہ تانا گیا' اور انصار کو جمع

کیا گیا۔ حضورؐ نے ان کے سامنے دل ہلا دینے والی مختصری تقریر کی (یہ تقریر ہم پہلے درج کر چکے ہیں) جس کا آخری جملہ یہ تھا۔ کہ "اے انصار! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ اور لوگ تو اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمد (ﷺ) کو ساتھ لے کر جاؤ۔" انصار کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر ڈاڑھیوں کو تر کر رہے تھے۔ آخری بات سن کر وہ چیخ اٹھے کہ "ہم کو صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) درکار ہیں"۔ پھر آپؐ نے انہیں نرمی سے وہ مصلحت سمجھائی جس کے تحت قریش کی دلجوئی ضروری تھی۔

ادھر ۶ ہزار اسیران جنگ قسمت کے فیصلے کے منتظر تھے۔ حضورؐ پورے دو ہفتے تک منتظر رہے کہ کوئی ان کے بارے میں آکر شاید بات چیت کرے۔ مال غنیمت کی تقسیم بھی اسی لیے روکے رکھی۔ مگر جب کوئی نہ آیا تو تقسیم عمل میں آگئی۔ تقسیم کے بعد حلیمہ سعدیہ (حضور کی رضاعی والدہ) کے قبیلہ کے معززین کا وفد زہیر بن صرد کی سرداری میں قیدیوں کے متعلق بات چیت کرنے حاضر ہوا۔ زہیر نے حضورؐ کو مخاطب بنا کر بڑی موثر تقریر کی اور کہا۔

> "جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں' ان میں تیری پھوپھیاں ہیں۔ ان میں تیری خالائیں ہیں۔ خدا کی قسم! اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان میں دودھ پیا ہوتا۔ تو ان سے بہت کچھ امیدیں ہوتیں۔ تجھ سے تو ہمیں اور بھی زیادہ توقعات ہیں"۔

حضورؐ نے وضاحت کی کہ میں تو خود منتظر تھا کہ کوئی آئے۔ مجبوراً تقسیم کر دی گئی۔ اب جو قیدی بنی ہاشم کے حصے میں آئے ہیں ان کو میں تمہارے حوالے کرتا ہو۔ باقیوں کے لیے مسلمانوں کے مجمع عام میں نماز کے بعد بات کرنا۔ نماز کے بعد زہیر نے اپنی درخواست دہرائی۔ آپؐ نے فرمایا۔ "مجھے صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے' البتہ میں تمام مسلمانوں سے سفارش کرتا ہوں"۔ فوراً مہاجرین و انصار بول اٹھے کہ ہمارا حصہ بھی حاضر ہے۔ صرف بنی سلیم اور بنی فزارہ کے لیے یہ تجربہ بڑا انوکھا تھا کہ لڑ کر مفتوح ہونے والے دشمن کے قیدی مفت میں رہا کر دیے جائیں۔ آخر حضورؐ نے ان کو ۶ اونٹ فی قیدی دے کر بقیہ کو بھی رہا کرا دیا۔ پورے ۶ ہزار قیدی آزاد ہو گئے۔ متعدد قیدیوں کو حضورؐ نے کپڑے بھی دیئے۔ عام فاتحین کے بخلاف نہ صرف قیدیوں کی جان بخشی کی بلکہ بلا فدیہ ان کو بطور احسان کے رہا کر دیا۔ اصل مقصود یہاں لوگوں کو ہلاک کرنا یا غلام جمع کرنا نہیں تھا۔ مقصود تو صرف نظام حق کی اقامت اور دلوں کو اس کے لیے ہموار کرنا تھا۔

اس مہم سے فارغ ہو کر آپؐ نے عمرہ ادا کیا اور عتاب بن اسید کو مکہ کی امارت کا منصب سونپا اور مدینہ واپس تشریف لے گئے۔

فتح مکہ کے بعد:

ہمارے نقطہ نظر سے حرب میں داخلی طور پر مخالف انقلاب تخریبی قوت کا سر اس معرکہ سے پوری

طرح کچلا گیا۔ اب گویا نظام اسلامی قطعی طور پر عرب کے لیے مقدر ہو گیا۔ اور کسی اور کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ نہ رہا۔ چند چھوٹی چھوٹی کارروائیاں بچے کھچے شرپسند عناصر کو دبانے اور لا اینڈ آرڈر قائم کرنے کے لیے کی گئیں۔ لیکن ان کی کوئی ایسی اہمیت نہیں ہے۔

قبیلہ بنو تمیم نے دوسرے قبائل کو بہکا کر اسلامی حکومت کو محاصل کی ادائیگی رکوا دی۔ یہ گویا ایک باغیانہ اقدام تھا۔ عیینہ بن حصن کو ۵۰ سواروں کے ساتھ بھیجا گیا۔ حملہ ہوتے ہی بنو تمیم بھاگ گئے۔ کچھ قیدی مدینہ لائے گئے اور بعد میں چھوڑ دیئے گئے۔

قبیلہ خثعم (بہ جانب تبالہ) نے شورش کی تیاری کی۔ قطبہؓ بن عامر کی سرداری میں ۲۰ سپاہیوں کا مختصر سا دستہ سرکوبی کے لیے گیا۔ شورش پسند منتشر ہو گئے۔ کچھ لوگ اسیر کیے گئے مگر حضورؐ نے بعد میں ان کو رہا کر دیا۔

بنو کلاب کی طرف حضرت ضحاکؓ کو بھیجا گیا تھا۔ ان کے ساتھ اسیدؓ بن سلمہ بھی تھے۔ جو اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اغلباً یہ تعلیمی و دعوتی وفد تھا۔ قبیلہ والوں نے ان کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ اسید کا باپ قتل ہوا۔ مزید تفاصیل نہیں مل سکیں۔

خبر آئی کہ حبشہ کے کچھ بحری ڈاکو جدہ میں جمع ہیں۔ عبداللہؓ بن حذافہ قرشی (یا علقمہ بن مجزز) ۳ سو آدمیوں کا دستہ لے کے روانہ ہوئے۔ ڈاکو بھاگ گئے۔

ربیع الآخر ۹ ھ میں حضرت علیؓ کو قبیلہ بنی طے میں ڈیڑھ سو سواروں کے ساتھ بھیجا گیا کہ وہاں کے بڑے صنم خانے کو گرا دیں۔ یہاں شاید اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری ہو کہ مدینہ کی اسلامی ریاست ایک اصولی اور مقصدی ریاست تھی۔ اور وہ جس اساسی اعتقاد پر قائم تھی اس کے خلاف انفرادی عقیدوں کو تو وہ گوارا کر سکتی تھی لیکن اس اساسی اعتقاد کے خلاف وہ کسی اجتماعی ادارے کو کیسے چلنے دے سکتی تھی۔ پھر جب کہ جاہلی عرب کے مذہبی و تمدنی نظام میں وہاں کے اصنام روح رواں کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے تصور سے وہ ذہنی اکساہٹ پیدا ہوتی تھی۔ جو جاہلیت پسندوں کو اشتعال دلا دلا کر اسلامی حکومت کے خلاف صف آرا کرتی تھی۔ اور ان بتوں کے نام پر بڑی بڑی لڑائیاں لڑی جا چکی تھیں۔ تو اس خاص صورت میں کیسے ممکن تھا کہ جاہلی بت خانوں کو بہ حیثیت اجتماعی ادارات کے قائم رہنے دیا جائے اور مشرکانہ نظام اعتقاد کو موقع دیا جائے کہ وہ بار بار رد عملی مزاحمت کے لیے جذباتی اکساہٹ پیدا کرتا رہے۔

یہ بت دراصل ایک معروف ذہنیت کا تمثل اور ایک باطل نقشہ زندگی کا نشان (Symbol) تھے۔ یہ اقدام کسی مسلمہ مذہبی اقلیت کے حقوق میں دخل اندازی کی نوعیت نہیں رکھتا بلکہ اسلامی ریاست کے مزاحم ہونے والے رجحانات کے مظاہر سے سیاسی فضا کو پاک کرنے کا ایک ناگزیر اقدام تھا۔ پھر معاملہ محض نظریاتی حد تک نہیں، عملاً تھا۔ قبیلہ طے بت پرستانہ تصور زندگی سے سرشار ہو کر باغیانہ رجحانات اپنے اندر پال چکا تھا۔ مدینہ کے خلاف ٹکرانے کے عزائم اندر ہی اندر انگڑائیاں لے رہے تھے۔ اس امر کا واضح

ثبوت یہ ہے کہ حاتم کے نامور گھرانے میں خود عدی بن حاتم نے اسی مقصد کے لیے سواری اور اسلحہ کا بہت قبل از وقت انتظام کر لیا تھا۔ ایسے اور لوگ بھی ہوں گے۔

بہرحال حضرت علیؓ نے فلس کے مقام پر پہنچ کر علی الصباح حملہ کیا۔ عدی بن حاتم شام کو بھاگ گیا تاکہ وہاں سے کچھ قوت فراہم کرے۔ قبیلہ کے لوگوں نے معمولی مزاحمت کی۔ بت خانہ توڑ دیا گیا۔ قیدی اور جانور اور کچھ اسلحہ ہاتھ آئے عدی بن حاتم کی بہن بھی قید میں آئیں۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس نے درد بھرے انداز سے اپنا دکھڑا سنایا کہ "میرا باپ مر چکا' میرا محافظ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ میں ضعیفہ ہوں اور کسی خدمت کے قابل نہیں۔ مجھ پر احسان کیجئے۔ اللہ آپؐ پر احسان کرے گا"۔ حضورؐ نے اس کے حسب خواہش اس کے لیے سواری کا انتظام کیا اور آزاد کر کے روانہ کر دیا۔ اس خاتون نے جا کر بھائی کو حضورؐ کے خلق و مروت کا حال سنایا کہ بالکل تیرے باپ کی سی فیاضی دیکھ کے آئی ہوں۔ فلاں آیا تو اس پر یہ یہ احسان ہوا۔ اور فلاں پیش ہوا تو یہ یہ عنایت فرمائی گئی۔ تم ان سے لڑنے کا خیال چھوڑ دو۔ خود وہاں جاؤ اور فیض پاؤ۔ چنانچہ بعد میں جلد ہی عدی بن حاتم مدینہ آ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

دو غیر ملکی لڑائیاں:

حضورؐ کے دور سعادت میں اصل کام تو ملک کی داخلی وحدت اور انقلاب کی تکمیل ہی کا ہوا۔ لیکن آپؐ نے اردگرد کے حکمرانوں کو دعوتی پیغامات بھیج کر تحریک کے بین الاقوامی دور کا بھی گویا افتتاح کر دیا تھا۔ حضورؐ نے مختلف سلطنتوں میں اپنے سفیر روانہ فرمائے۔ ایک سفیر حارث بن عمیر ازدی شام یا بصریٰ کو بھیجا تھا۔ اسے ہرقل کے نائب عیسائی حاکم شرجیل بن عمرو غسانی نے راستے میں قتل کر دیا۔ یہ بنیادی انسانی اخلاق اور وقت کے بین الاقوامی قانون کی ایسی خلاف ورزی تھی کہ اسے اگر کوئی حکومت چپ چاپ سہار لے تو پھر ایسی حکومت کا کوئی وزن باقی نہیں رہ جاتا۔ ۸ ھ میں حضورؐ نے تین ہزار سپاہیوں کو اپنے آزاد کردہ غلام زیدؓ بن حارثہ کی کمان میں شام کے علاقہ بلقاء کی طرف روانہ کیا۔ یہ واقعہ بجائے خود اسلامی انقلاب کا ترجمان تھا کہ ایک شخص غلامی کے مرتبے سے اٹھ کر فوج کی سپہ سالاری تک جا پہنچے (واضح رہے کہ انہی کے صاحبزادے اسامہؓ کو بھی حضورؐ نے آخری مہم کے لیے سردار لشکر بنایا تھا) اس فوج کو حضورؐ الوداع کہنے کے لیے بہ نفس نفیس ثنیۃ الوداع تک گئے۔ فوج معان کے مقام پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ ان دنوں ہرقل دورے پر آیا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اپنی بھی بہت بڑی فوج ہے اور بنی لخم' بنی جذام اور بلقین اور بہراء کے عیسائی لوگ ہر طرف سے جمع ہیں۔ مجموعی تعداد ایک لاکھ ہو گی۔ صورت حالات پر غور کیا گیا۔ آخر واپس جانے کی تجویز مسترد ہوئی اور نتیجہ کو خدا کے سپرد کر کے معرکہ آرا ہونے کا فیصلہ ہوا۔ آگے بڑھے تو مشارف کے مقام پر دشمن کی بہت بڑی فوج مجتمع تھی۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ زیدؓ بن حارثہؓ شہید ہوئے اور علم حضرت جعفرؓ نے سنبھالا۔ داہنا ہاتھ کٹ گیا تو علم بائیں ہاتھ میں لیا۔ بایاں بھی کٹ گیا تو

سینہ پر اسے سنبھالے رہے۔ آخر ۹۰ زخم کھانے کے بعد شہید ہوئے۔ ان کے بعد رسول خدا ﷺ کی قائم کردہ ترتیب کے مطابق عبداللہؓ بن رواحہ علمبردار بنے۔ جب وہ بھی شہید ہو گئے۔ تو اتفاق رائے سے خالدؓ بن ولید نے علم سنبھالا۔ اور اس بے جگری سے لڑے کہ پے در پے ان کے ہاتھ سے ۹ تلواریں ٹوٹیں۔ آخر دشمن کی فوج پیچھے ہٹی اور حضرت خالد اپنے لشکر کو بچا کر لائے۔ جملہ ۱۲ مسلم سپاہی شہید ہوئے جن میں نہایت قیمتی شخصیتیں شامل تھیں۔

مسلمانوں نے وقتی لحاظ سے اپنی فتح کو غنیمت جانا۔ کیونکہ دشمن کی تعداد زیادہ تھی' غیر ملک تھا حالات نئے تھے۔ رسد کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ کمک کی امید بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے لشکر مدینہ واپس آگیا۔ حضورؐ اور مسلمان مدینہ سے باہر آکر ملے۔ بعض لوگوں نے دل لگی کے طور پر ان لوگوں کو "او فرارو"! کہہ کر پکارا۔ حضورؐ نے فرمایا: یہ فراری نہیں' کراری ہیں۔ یعنی دوبارہ جائیں گے"۔ حضرت خالدؓ نے اس معرکہ میں جو جوہر دکھائے تھے ان کی بنا پر انہیں سیف اللہ کا خطاب ارزانی ہوا۔

اسی سلسلہ کی دوسری کڑی غزوہ تبوک ہے۔

فتح مکہ کے بعد رجب ۹ ھ میں شام سے آنے والے ایک قافلہ نے اطلاع دی کہ قیصر کی فوجیں مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔ قیصر اس بھاری سلطنت کا فرمانروا تھا جو ارد گرد کی آدھی دنیا پر پھیلی ہوئی تھی اور جس نے قریب ہی میں ایران جیسی حکومت کو زک دی تھی۔ محسن انسانیت ﷺ اور مسلمان جنہوں نے دنیا بھر میں ایمان و اخلاق کی روشنی پھیلانے کے لیے ایک مینار تیار کیا تھا' وہ بھلا کیسے کیے کرائے کو غارت ہونے دے سکتے تھے۔ یہی ان کا دین تھا' یہی ان کی دنیا تھی' یہی ان کی برادری تھی' یہی ان کی جائداد تھی' فوراً دفاع کی تیاری شروع ہو گئی۔ طے پایا کہ قیصر کی فوج کو عرب میں گھسنے سے پہلے ہی جا لیا جائے تاکہ اس سرزمین پر تباہی نہ پھیلے۔ گرمی کا موسم' قحط کا زمانہ اور عسرت کا عالم تھا۔ حضورؐ نے جنگی چندہ کی اپیل کی۔ اس اپیل کا ایسا قابل یادگار جواب مسلم جماعت نے دیا کہ اس کی یاد انسانیت کو ایک قیمتی روح سے آراستہ کرتی رہے گی۔ حضرت عثمانؓ نے ۹ سو اونٹ دیئے۔ ایک سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کئے۔ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے ۴۰ ہزار درہم لا حاضر کیے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے مال کا بیشتر حصہ لا کے ڈھیر کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ آئے تو پورا گھر خالی کر کے اپنا سب کچھ حاضر کر دیا اور جذبہ انفاق کی اس مسابقت میں بازی لے گئے۔ لیکن شاید سب سے زیادہ ایثار اس غریب محنت کش انصاری کا تھا جس نے دن بھر پانی کھینچ کھینچ کر ۴ سیر چھوہارے کمائے اور دو سیر چھوہارے اہل و عیال کے لیے رکھ کر دو سیر حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "ان چھوہاروں کو قیمتی اموال کے سارے ڈھیر پر بکھیر دو۔" عورتوں نے جہاد کے فنڈ میں اپنے زیورات پیش کیے۔

۳۰ ہزار فوج دس ہزار گھوڑوں کے ساتھ روانہ ہوئی۔ ثنیۃ الوداع میں دستوں کی ترتیب مقرر ہوئی کمانڈر مقرر کیے گئے اور علم تقسیم کیے گئے۔ تبوک پہنچے تو معلوم ہوا کہ دشمن نے عرب پر حملہ کرنے کا

ارادہ ترک کر دیا ہے۔ دراصل ان کو کسی نے غلط خبر دی تھی کہ مدینہ کے نبیؐ کا (نعوذ باللہ) انتقال ہو گیا اور حملہ کے لیے یہ بہترین وقت ہے۔ اب جب معلوم ہوا کہ نبیؐ بھی زندہ ہے اور مدینہ بھی زندہ ہے تو ان کے عزائم پر اوس پڑ گئی۔ بہرحال اس فوجی پیش قدمی کا سیاسی لحاظ سے بہت ہی اچھا اثر پڑا۔ حضورؐ نے ایک مہینہ تک فوجی کیمپ رکھا۔ اس دوران میں سیاسی اثرات پھیلانے کا کام کامیابی سے جاری رہا۔ ایلہ کا حاکم پیش ہوا اور جزیہ دے کر مصالحانہ تعلقات کا آغاز کیا جربا اور اذرح کے لوگ آئے انہوں نے بھی اطاعت کی علامت کے طور پر جزیہ پیش کیا۔ دومتہ الجندل کا مسئلہ حضورؐ کی نگاہ میں مدتوں سے اہمیت رکھتا تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید کو زائد از ۴ صد سپاہیوں کا دستہ دے کر دومتہ الجندل کے حاکم اکیدر کی طرف روانہ کیا گیا۔ وہ اور اس کا بھائی شکار کر رہے تھے۔ اس کا بھائی مارا گیا اور اکیدر گرفتار ہو کر پیش ہوا۔ اس سے جزیہ لینے پر مصالحت ہوئی۔ حضورؐ نے اسے دومتہ الجندل' تبوک' ایلہ اور تیماء پر حکومت مدینہ کی طرف سے حاکم مقرر کر دیا اور تحریر لکھ دی۔ بعض روایات کے بموجب بغیر لڑے حضرت خالدؓ نے بڑی حکمت سے اس کا قلعہ فتح کیا اور گراں بہا مال غنیمت حاصل کیا۔ حضورؐ واپس آئے تو مدینہ میں شاندار طریق سے استقبال کیا گیا۔ منافقین نے جو جو شرارتیں اس غزوہ کے سلسلے میں کیں ان کو ہم پہلے ایک فصل میں بیان کر چکے ہیں۔ منافقین تعداد کثیر میں (اسی ۸۰ سے اوپر) شہر میں بیٹھے رہے تھے ان سے باز پرس کی گئی تو انہوں نے جھوٹے عذر گھڑ دیے اور حضورؐ نے درگزر کیا۔ لیکن بعض اہل اخلاص بھی رہ گئے تھے۔ ان میں ابو خیثمہؓ بھی شمار ہوتے مگر ان کی روح بروقت چونک گئی۔ حضورؐ کی روانگی کے کئی روز بعد ایک دن شدید گرمی میں اپنی دونوں بیویوں کے پاس ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کرنے آئے جہاں انہوں نے پانی کا چھڑکاؤ کر رکھا تھا اور کھانے پینے کا انتظام تھا۔ یکایک ایک خیال آگیا اور ازواج سے کہا "ہائیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو دھوپ' لو اور گرمی میں ہوں اور ابو خیثمہؓ ٹھنڈی چھاؤں میں حسین عورتوں کے ساتھ مزیدار کھانے کھا رہا ہو۔ یہ انصاف نہیں ہے۔ خدا کی قسم! میں تم دونوں میں سے کسی کے حجرے میں نہ جاؤں گا میرے لیے زاد راہ تیار کرو"۔ اونٹ منگوایا اور سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ دور جا کر لشکر سے مل گئے لیکن تین اہل ایمان کعبؓ بن مالک' ہلالؓ بن امیہ اور مرارہؓ بن الربیع جانے جانے کے ارادوں میں رہ گئے۔ ان سے حضورؐ نے پیچھے رہ جانے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے صاف صاف عرض کیا کہ ہم سے کوتاہی ہوئی ہے۔ حضورؐ نے حکم الٰہی آنے تک ان کو جماعتی زندگی سے الگ رہنے اور اپنی بیویوں سے بے تعلق رہنے کا حکم دیا۔ یہ گویا ایک طرح کی قید تنہائی تھی۔ جس میں نہ زنجیریں استعمال کی گئیں۔ نہ زندان کی کوئی عمارت۔ اجتماعیت سے کٹ کر منفرد ہو جانا انسان کے لیے بڑا سخت عذاب ہے۔ پھر وہ بھی اس حالت میں کہ یہ ساری پابندی اسے اپنے اوپر خود ہی نافذ کرنی ہو۔ مگر ان حضرات نے اطاعت امر کی وہ زریں مثال قائم کی کہ جس سے تاریخ کا ایوان ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ یہاں تک کہ غسانی حاکم کو جب یہ حال معلوم ہوا تو بہترین نفسیاتی موقع تاک کر اس نے کعبؓ بن مالک کو خط لکھا کہ تمہارے آقا نے تم پر جفا کی ہے حالانکہ تم بڑے

قابل قدر آدمی ہو ہمارے پاس چلے آؤ تو ہم تمہارا مرتبہ بڑھائیں گے۔ کتنی بڑی آزمائش تھی۔ مگر کعبؓ نے اس خط کو تنور میں ڈال دیا۔ آخر پورے ۵۰ دن کے بعد وحی الٰہی نے ان کے اخلاص کی بنا پر ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان کیا۔ خوشی کی ایک لہر مدینہ میں دوڑ گئی۔ اور ہر طرف سے لوگ مبارک سلامت کی صدائیں بلند کرتے ہوئے ان تینوں کو بشارت دینے پہنچے۔ حضرت کعبؓ نے قبولیت توبہ کی خوشی میں اپنا بیشتر مال صدقہ کر دیا۔ ایسا تھا وہ انسان جو تحریک اسلامی نے اپنے سانچے میں ڈھالا۔

سفر تبوک میں ہی عبداللہؓ ذوالبجادین کی وفات ہوئی۔ یہ نوجوان حضورؐ کو بہت ہی محبوب تھا۔ یہ بڑے انقلابی جذبے سے اسلام میں داخل ہوا تھا۔ اسلام کی دعوت نو عمری میں ہی اس تک پہنچی اور دل متاثر ہو گیا۔ مگر چچا کے ڈر سے اپنے جذبات کو دبائے رکھا۔ آخر فتح مکہ سے حضورؐ واپس آئے تو اس نے چچا سے کہا کہ:

> "پیارے چچا! مجھے برسوں انتظار کرتے گزر گئے کہ کب آپ کے دل میں اسلام کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ لیکن آپ کا حال جوں کا توں ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جاؤں"۔

سنگ دل چچا نے جواب دیا کہ اگر تم کو محمد (ﷺ) کی دعوت قبول کرنا ہے تو میں نہ صرف سارے مال سے تم کو محروم کرتا ہوں بلکہ تن پر کپڑا بھی نہ رہنے دوں گا۔ عبداللہ نے کہا "چچا! آپ جو چاہیں کریں میں تو اب بت پرستی سے بیزار ہو چکا ہوں۔ اور اب میں ضرور مسلم بنوں گا۔ آپ اپنا سارا مال لے لیجئے"۔ یہ کہہ کر بدن کے کپڑے اتار دیئے اور برہنگی کی حالت میں ماں سے جا کر بیان کیا کہ میں توحید کا علمبردار بن گیا ہوں۔ اور محمد ﷺ کی خدمت میں جانا چاہتا ہوں۔ مجھے تن ڈھانکنے کو کچھ دیجئے۔ ماں نے ایک کمبل دیا۔ پھاڑ کر آدھے کا تہہ بند بنایا۔ اور آدھا اوپر لیا۔ اسی حالت میں مدینہ پہنچا اور اصحاب صفہ کے حلقہ میں شریک ہو گیا۔ یہ انقلابی نوجوان شوق جہاد میں حضورؐ کے ساتھ تبوک روانہ ہوا۔ وہاں بخار آنے سے انتقال ہوا۔ رات کی تاریکی میں تدفین ہوئی۔ بلالؓ چراغ اٹھائے ہوئے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود قبر میں اترے۔ ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) ساتھ تھے ان سے فرمایا "اپنے بھائی کا ادب ملحوظ رکھو"۔ حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے اینٹیں رکھیں۔ پھر دعا کی: "الٰہی آج کی شام تک میں اس سے راضی رہا ہوں' تو بھی اس سے راضی ہو"۔

یہ سماں دیکھ کر ابن مسعودؓ نے حسرت سے فرمایا "کاش! اس قبر میں میں دبایا جاتا"۔

تبصرہ:

ہم نے اس فصل میں ان تمام جنگی اقدامات کو بیان کر دیا ہے جو مدینہ کی اسلامی حکومت کی طرف سے عمل میں آئے۔ ان سارے معرکوں کو سامنے رکھیئے اور ان سیاسی حالات کو بھی نگاہوں میں تازہ کر لیجئے جن

کے تحت یہ کارروائیاں واجب ہو گئی تھیں تو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ ایک ایسے شخص کو جو تصادم سے بچ کر تعمیری کام کرنا چاہتا ہے۔ جو حصول جاہ و جلال کے بجائے محض حق اور سچائی کا فروغ چاہتا ہے۔ جو بزور شمشیر اپنا اثر پیدا کرنے کے بجائے دلیل اور اخلاق سے دنیا کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ جو انتقام کے بجائے درگزر سے اور تشدد کے بجائے لطف و احسان سے کام لیتا ہے جو خون بہانے والی تلوار کے بجائے معاہدہ لکھنے والے قلم سے مسائل حل کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اسے انقلاب دشمن حریفوں نے سخت مجبور کر کے میدان جنگ میں طلب کیا۔ طلب کیا کیا آٹھ نو برس میں کوئی ایک لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ وہ چین سے بیٹھ سکا ہو۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس عالم میں حضورؐ نے کیسے وہ عظیم تعمیری کارنامہ سرانجام دے لیا جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اور انسانیت کو ایک نئے نقشے پر ڈھال دیا (حضورؐ کے تعمیری کارنامہ کی تفصیل ہم کتاب کے ایک مستقل حصہ میں عرض کریں گے۔)

وہی ہستی اس لحاظ سے انسانیت کی عظیم ترین محسن ہے کہ اس نے سلامتی کے پیغام کو پورے عرب میں اور پھر ساری دنیا میں پہنچانے کے لیے تلواروں کی چھاؤں میں سے اپنا راستہ نکالا اور انتہائی جنگ پسند حریفوں کی مزاحمت کو توڑ کر نظام عدل کو برپا کیا اور اسے تکمیل دی۔ ورنہ اگر کوئی اور ہوتا اور مخالفین کے جنگی چیلنج کو سن کر اپنے سیدھے راستے سے کترا جاتا' تو اسلامی نظریہ کا نقش اگر تاریخ سے محو نہ ہوتا تو ہم اسے زیادہ سے زیادہ انفرادی سیرت کی حد تک جلوہ گر دیکھ سکتے۔ لیکن اس کا تصور ایک اجتماعی نظام کی صورت میں کرنا ہمارے لیے ممکن نہ ہوتا۔ اس صورت میں اسلام دنیا کے انفرادی مذاہب کے طرز کا ایک مذہب ہوتا یا صوفیانہ طرز کا ایک روحانی و اخلاقی مسلک ہوتا۔ جسے زندگی اور تمدن کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ ایسے اسلام کے سانچے میں کیسے ہی اعلیٰ درجے کے پاکباز کیوں نہ ڈھلتے وہ بہرحال ہر کفر' ہر تہذیب باطل اور ہر نظام ظلم کے لیے نہایت وفادار پرزے ثابت ہوتے۔ پھر یہ ممکن نہ ہوتا کہ اجتماعی ظلم و فساد کو مٹانے کا جذبہ انسانیت حضورؐ کے پیغام سے اخذ کر سکتی۔

دیکھو کہ ہماری فلاح و بہبود کے لیے حضورؐ کن اذیتوں' کن مشکلوں' کن آویزشوں اور کن طوفانی ہنگاموں سے گزرے اور عزیمت آموز انداز سے گزرے۔ کس شجاعت سے ہر حریف کے چیلنج کو قبول کیا اور ظلم و فساد کی ہر طاقت کی سرکوبی کی۔ بکھرے ہوئے قبائل کو ایک کر دیا۔ ان کو جاہلی قیادت سے نجات دلائی۔ ان کو تعلیم و تزکیہ سے گزارا۔ امن کا ماحول فراہم کیا۔ قانون کی عملداری قائم کی۔ معاشرہ کو اخوت و مساوات کی بنیادوں پر استوار کیا۔ حکومت کے لیے شورائیت کے اصول کو سنگ اساس بنا کر جمہوری دور کا آغاز کر دیا۔

پھر یہ حضورؐ کا کمال حکمت ہے کہ اتنے معرکے لڑے اور اتنی مہمات روانہ کیں۔ مگر انتہائی کم خونریزی ہوئی۔ کم سے کم جانی نقصان ہوا۔ عرب جیسی وسیع متحدہ سلطنت کی ایک اصولی نظریے میں پہلی بار تشکیل اتنے کم صرف خون سے ہونا تاریخ انسانی کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔

حق یہ ہے کہ آج ہم میں سے ہر انسان ---- خواہ وہ اس حقیقت کو جانے یا نہ جانے ---- حضورؐ پاک کا شرمندہ احسان ہے۔ ہمیں زندگی کی فلاح کے جو اصول' جو تہذیبی اقدار' جو اخلاقی روایات اس بارگاہ سے ملی ہیں۔ نیز انسانیت کا جو نمونہ آپؐ کے ذریعے ہمارے سامنے آیا ہے اور پھر تمدن کا جو بہترین متوازن نظام آپؐ نے تعمیر کر کے دکھایا ہے۔ ان ساری نعمتوں سے ہم کبھی بہرہ مند نہ ہو سکتے' اگر حضورؐ ظلم کی تلواروں کے سامنے مٹھی بھر جماعت کو لے کر سینہ سپر نہ ہو جاتے۔ حضورؐ نے اپنے بہترین محبوب ساتھیوں کو مقدس نصب العین کی خاطر قربان کیا۔ اور ان ستاروں کے خون سے صبح نو کا نقش تیار ہوا۔

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی آل محمد !

باب:۶

محسنِ انسانیت ﷺ

اور اجالا پھیلتا چلا گیا

اور اُجالا پھیلتا چلا گیا

اسلامی تحریک اور اسلامی ریاست کا پھیلاؤ

بہت سے لوگ تلوار کے زور سے قطعات ارضی کے عارضی فاتح بنے ہیں۔ بہت سی بادشاہتیں اور آمریتیں جبر کے زور سے قائم ہوتی رہی ہیں اور کشاکش مفاد کے بے شمار فیصلے جنگ کے میدانوں میں طے پاتے رہے ہیں۔ لیکن دنیا کی کوئی بھی انقلابی تحریک ہو' اسے اپنی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ رائے عامہ کے دائرے میں کرنا ہوتا ہے۔ انسانی قلوب جب تک اندر سے کسی دعوت کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوں اور اپنے ذہن و کردار کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے راضی نہ ہو جائیں' محض جبرو تشدد سے حاصل کیے ہوئے علمبردار اس کے لیے مفید نہیں ہو سکتے۔ بلکہ الٹا وہ اس کی کامل بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ پس ہر اصولی تحریک کا اصل مزاج تعلیمی ہوتا ہے۔ اور اس کے چلانے والوں میں مربیانہ اور معلّمانہ شفقت کی روح کام کر رہی ہوتی ہے۔ اصولی تحریکوں کی نگاہ میں زندگی ایک مدرسہ کی نوعیت رکھتی ہے اور افراد انسانی اس مدرسہ کے طلبہ ہوتے ہیں۔ ان طلبہ کی مجموعی فلاح تقاضا کرتی ہے کہ شرارت پسندوں کی اصلاح کے لیے اور ان کے اثر سے شریف اور متوسط عناصر کو محفوظ رکھنے کے لیے تادیب کا عصا بھی کبھی کبھار حرکت میں آتا رہے لیکن مجموعی فضا بہرحال طلبہ کے حق میں رحمت و شفقت کی فضا ہوتی ہے اور خود تادیب کے عصا کی ہر جنبش میں بھی استاد کے مربیانہ جذبات ہی موجزن ہوتے ہیں۔ سچائی کے کلمے اور نیکی کے نظام کو لے کر اللہ کے جو بندگان پاک تاریخ کے مختلف ادوار میں اٹھتے رہے ہیں' انہوں نے چارو ناچار شرو فساد کی سرکوبی کے لیے میدان جنگ میں بھی قدم رکھا ہے۔ اور تلوار سے عصائے تادیب کا کام بھی جزئی حد تک لیا ہے۔ مگر فی الحقیقت ان کا مجموعی کام ہمیشہ مربیانہ و مشفقانہ روح کے ساتھ ٹھیک تعلیمی انداز سے جاری رہا ہے۔ انہوں نے اصل فیصلہ کن معرکہ دلیل کی طاقت سے رائے عام کے وسیع تر دائرے ہی میں لڑا ہے۔ ان کا اصول ہر دور میں یہ رہا ہے کہ جسے بھی زندگی حاصل کرنی ہو وہ دلیل سے حاصل کرے اور

جسے اس زندگی سے محروم رہ کر اپنے آپ کو موت کے گھاٹ اتارنا پسند ہو وہ دلیل ہی کے مارنے سے مرے۔

حضورؐ کے جنگی اقدامات کو دیکھیں تو معرکہ بدر سے لے کر فتح مکہ تک (فتح خیبر سمیت) کل پانچ بڑے معرکے ہوئے۔ جو دراصل حقیقت کے لحاظ سے سارے کے سارے مدافعانہ ہی تھے۔ لیکن ان میں سے اول الذکر تین تو اسی صورت میں لڑے گئے جب کہ دشمن نے چڑھائی کر کے مدینہ پر دھاوا بولا۔ لے دے کے دو ہی کارروائیاں مدینہ سے خود حضورؐ نے پیش قدمی کر کے کیں۔ یعنی ایک فتح مکہ (مع جنگ حنین) کے لیے اور دوسری فتح خیبر کے لیے۔ بس ان دو ہی اقدامات میں فیصلہ ہو گیا۔ مدت کے لحاظ سے دیکھیں تو معرکہ بدر سے فتح مکہ تک کل زمانہ ۶ برس کا ہے۔ حضورؐ نے اپنے عظیم تبلیغی و تعلیمی اور تعمیری و اصلاحی کارنامے میں ۲۳ برس کی لمبی مدت کھپائی اور اس میں سے فقط ۶ برس ایسے ہیں کہ جن میں تعلیم انسانیت کے مختلف کاموں کے ساتھ ساتھ حریفوں کی شمشیرِ جنگ پسند کا مقابلہ بھی مجبوراً کرنا پڑا۔ انتہائی مبالغہ سے اندازہ کریں تو بھی سارے کے سارے معرکوں میں مجموعی طور پر ۱۵ ہزار سے زیادہ افراد حضورؐ کا مقابلہ کرنے نہ آئے ہوں گے' ان میں سے صرف ۷۵۹ جانوں کو راستہ سے ہٹانے کے لیے عرب کی کئی لاکھ کی پوری آبادی سنور سدھر جاتی ہے۔ دس برس کے عرصے میں جو تاریخ کی وسعتوں میں بہت ہی محدود دکھائی دیتا ہے' عرب جیسے صحرا کو زندگی کے ایک مدرسۂ فلاح میں بدل دینا اور تمام بکھرے ہوئے قبائل اور انتہائی وحشی' سرپھرے اور جنگجو افراد کو اس میں داخل کر لینا اور پھر ان کو عظیم سچائیوں اور پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دینے میں کامیاب ہو جانا نہ صرف تعلیم دینا بلکہ نوعِ انسانی کے لیے ان کو معلم و مربی بنا دینا شاید حضورؐ کی نبوت کا سب سے بڑا حسیّ معجزہ ہے۔

پس یہ امر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو جاتا ہے کہ اسلام کی انقلابی تحریک کے خلاف جاہلیت کی کش مکش کا فیصلہ ہونے میں جنگی معرکوں کا کتنا بھی اثر پڑا ہو لیکن بہرحال فیصلہ کا اصل میدان رائے عام کا میدان تھا ---- بلکہ ذرا روحانی زبان میں بات کہیں تو دلوں کا میدان تھا۔ عرب کے لاکھوں مرد و زن مفتوح ہوئے تو اسی میدان میں دلیل اور اخلاق کے اسلحہ سے مفتوح ہوئے۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ہم اپنے مقالہ کی آخری فصل میں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہر جہتی مخالفتوں اور مرد افگن مزاحمتوں کے نت نئے طوفانوں کے باوجود یہ کیسے ممکن ہوا کہ ایک قلیل مدت میں دس بارہ لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی کثیر التعداد اولاد آدم اسلامی نظام حیات کے سائے میں آ گئی۔ تو بر تو تاریکیوں کا سینہ چیر کر کیسے حورِ صبح مسکرائی اور اس کی مسکراہٹوں نے ہر چہار جانب ایک پاکیزہ اجالا پھیلا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت اگر حق ہو' تحریک اگر انسانی فلاح پر مبنی ہو' اور اس کے علمبردار اگر مخلص اور ایثار پیشہ ہوں تو مخالفتیں اور مزاحمتیں ہمیشہ انقلابی قافلہ کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہیں۔ ہر رکاوٹ ایک سنگ میل بن جاتی ہے۔ راستے کا ہر کانٹا رہبری کرنے لگتا ہے۔ درد کی ٹیسیں جب فغاں کا روپ اختیار کرتی ہیں تو فغاں ہی بانگ جرس بن

جاتی ہے۔ پیر لہولہان ہوتے ہیں' تو خون کی ہر بوند کو شرارۂ عشق ایک چراغ روشن میں بدل دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سچائی اگرچہ ایک اقلیت کے ساتھ ابھرتی ہے لیکن اکثریت کو فتح کر لیتی ہے۔ آیئے دیکھیں کہ تحریک اسلامی نے کن کن قوتوں سے کام لے کر رائے عام کے دائرہ میں تیزی سے قدم بڑھانے کے راستے بنائے۔

دلیل کی قوت:

تحریک اسلامی کی سب سے بڑی قوت دلیل کی قوت تھی۔ پیری مریدی کا کوئی نظام ہوتا تو مخاطبوں کی عقلوں کو ششن کرتا۔ روایتی مذہبیت کا کوئی پیغام ہوتا تو اوہام پسندی کے رجحانات کی آبیاری کرتا' رہبانی تصوف کا کوئی سلسلہ ہوتا تو "چشم بند و گوش بند و لب بہ بند" کا افسوں پڑھتا۔ مگر وہاں تو ایسی ذی شعور روحوں کی مانگ تھی جو خدا پرستی کی بنیادوں پر پورا ایک نظام تمدن اٹھا سکیں اور حسن و خوبی سے چلا سکیں۔ اس لیے تحریک اسلامی نے اپنی دعوت پیش کی تو سوتی ہوئی عقلوں کو چونکایا۔ دماغوں کو جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھنے اور کان کھول کر سننے کی تلقین کی۔ نظام کائنات میں تدبر کرنے کی ترغیب دلائی۔ انفس و آفاق کے احوال کا تجزیہ کرنے کا سبق دیا۔ نت نئے سوال چھیڑ چھیڑ کر فکروں میں تحریک پیدا کی۔ ذہنی تقلید کے بندھنوں کو توڑا۔ فضول روایات و رسوم کے جال پارہ پارہ کیے۔ آباء پرستی اور ماضی پرستی کے سحر کو باطل کیا۔ اس نے "کالانعام" قسم کی مخلوق کے اندر سے سوچنے سمجھنے والا انسان برآمد کرنے کی تدبیر کی اس نے "صم بکم عمی" قسم کے افراد کو ٹھوکے لگا لگا کر بے شعوری کی پینک سے نکالا۔ اس نے دماغوں سے زنگ دور کیا۔ الغرض اس نے جاہلیت کے مسلط کردہ عقلی جمود کو توڑ دیا۔ اس طرح جو جو روحیں جاگتی گئیں اور جن لوگوں کی عقلیں انگڑائیاں لے کر اٹھنے لگیں ان کے سامنے زندگی کی بنیادی سچائیاں رکھیں اور اپنے استدلال کے زور سے یکے بعد دیگرے ان کو متاثر کر کے چھوڑا۔

تحریک اسلامی نے خدائے واحد کو خالق' مالک' رازق' حاکم اور ہادی کی حیثیت سے پیش کیا تو اس زور استدلال سے پیش کیا کہ جوابی اوہام کے اسلحہ کند ہو کر رہ گئے۔ اس نے انسانی قوت مشاہدہ کو اکسا کر دعوت دی کہ زمین و آسمان کی نیرنگیوں پر نگاہ ڈالو۔ چاند تاروں کی گردش پر غور کرو۔ موسموں کے چرخے کا گھماؤ دیکھو۔ ہواؤں اور بارشوں کے نظام میں کاوش کرو۔ نباتات کی روئیدگی و بالیدگی کے مناظر سے سبق لو۔ حیوانات کی نشوونما اور ان کے تناسل میں دماغ کھپاؤ۔ انسانی گروہوں کی رنگا رنگی اور تمدنوں کے مد و جزر کا مطالعہ کرو۔ اپنے نفوس و اذہان کی گہرائیوں میں جھانکو ـــــ تم دیکھو گے کہ ہر طرف اٹل قوانین اپنا کام کر رہے ہیں۔ ہر دائرہ وجود میں ایک نظم کی کارفرمائی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے واقعات و حوادث کا رخ کسی غایت کی طرف ہے۔ گوناگوں اضداد باہم دگر تعاون کر رہے ہیں۔ پورے کارخانہ ہستی میں ایک توافق کارفرما ہے۔ کثرت وحدت کے رشتے میں بندھی ہے۔ پھر ہر شے میں ارتقاء ہے۔ ہر چیز

بہتری کی طرف جا رہی ہے۔ ہر علت کسی اہم نتیجہ کو پیدا کر رہی ہے۔ اور پھر ہر نتیجہ خود آگے کے لیے ایک علت بن رہا ہے۔ یہ قانون' یہ نظم' یہ توافق' یہ تعاون' یہ وحدت' یہ ارتقاء آپ سے آپ بطور ایک اتفاقی حادثے کے نمودار نہیں ہوا۔ چیزیں اپنے آپ کو خود تجویز نہیں کرتیں۔ اپنا نقشہ خود نہیں بناتیں۔ بے شعور اور بے جان مادہ اونچے موجودات کی تخلیق آپ سے آپ نہیں کرتا۔ عناصر باہمی مشورے سے توافق نہیں کرتے۔ بلکہ بالاتر ہستی ــــــ فعال و مختار اور حکیم و خبیر ہستی ــــــ ایک ناظم' ایک ڈائریکٹر' ایک حکمران اور ایک قانون ساز کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ تمام قوتیں اور عناصر اسی کی تسبیح کہتے ہیں۔ تمام موجودات اسی کے حضور سجدہ ریز ہیں۔ تمام مخلوق اسی کے طبعی دین کی پابند ہے۔ عظیم سورجوں سے لے کر ننھے سالموں تک ہر شے اس کی بارگاہ میں مسلم کی حیثیت سے سر انقیاد خم کیے ہوئے ہے۔ پھر اسلامی تحریک نے بتایا کہ اگر اتنے بڑے کارخانہ وجود کے اوپر ایک سے زیادہ مالک اور منتظم ہوتے تو ان کے درمیان ٹکراؤ ہو جاتا۔ اور یہ یک رنگی اور ہم آہنگی کسی طرح قائم نہ رہتی جس کا مشاہدہ تم کر رہے ہو۔ گویا کتاب کائنات کا ہر ورق خدا کی ہستی ہی پر نہیں بلکہ اس کی توحید پر اور اس کی مختلف صفات پر محکم دلائل سے بھرا پڑا ہے۔

پھر اسلامی تحریک نے دلیل کے زور سے واضح کیا کہ یہ کائنات جو پوری کی پوری خدا کے دین اور قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور جس کا ہر ذرہ اس کے سامنے مسلم بن کر حاضر ہے' اس میں کسی مخلوق کے لیے خدا کے سامنے بندگی و اطاعت اور اسلام و انقیاد کا رویہ اختیار کیے بغیر کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم خدا کے مسلم بنو گے تو ساری کائنات سے ہم آہنگ ہو جاؤ گے اور تمہارا نظام تمدن ویسے ہی امن و توافق کا مظہر بن جائے گا' جیسے مادہ کی نگری میں کارفرما ہے۔ اور تم اگر خدا سے بغاوت اور کفر کرو گے تو نظام کائنات سے تمہارا نظام تمدن بے ربط ہو جائے گا اور اس میں توازن و توافق نہیں رہے گا جو زمین و آسمان میں کارفرما ہے۔ اور جس کی وجہ سے موجودات سلامتی سے بہرہ مند ہو کر ارتقا کر رہے ہیں۔ اس کائنات میں انسان کے لیے بھی فلاح کی واحد راہ یہی ہے کہ وہ خدا کے دین اور خدا کے قانون کا پابند ہو کر رہے۔ تم جو خدا کے پیدا کرنے سے پیدا ہوتے ہو۔ اس کے رزق پر پلتے ہو۔ اور ہاں تم کہ جن کے بدن کا عضو عضو اور جن کے اعضاء کا ذرہ ذرہ مسلم بن کر خدائی قانون میں جکڑا ہوا ہے' تمہارے لیے زندگی کی کوئی سیدھی راہ ہے تو خدا کی بندگی ہی کی راہ ہے۔ تمہاری فطرت کا خمیر اسی بندگی کے عہد سے اٹھایا گیا ہے اور تمہارے ضمیروں میں احساس عبودیت پیوست ہے۔

پھر اسلامی تحریک نے اسی زور استدلال سے یہ حقیقت بھی اجاگر کی کہ خدا کی طرف سے ہدایت کی احتیاج ہر ہر ذرے کو ہے۔ وہی عناصر کی تقدیریں مقرر کرنے والا ہے' وہی اجرام فلکی کے مدار اور ان کی رفتاریں طے کرتا ہے۔ وہی اشیا کو مختلف خواص دیتا ہے۔ وہی ہر ہر قوت کو اس کے خاص فرائض میں لگاتا ہے۔ اور وہی ہر مخلوق کے لیے راہ عمل معین کرتا ہے۔ دوسرے موجودات کی طرح انسان بھی اس کی

ہدایت کا اسی طرح محتاج ہے جیسے وہ روشنی' ہوا' اور پانی کا محتاج ہے۔ خدا نے اپنی ہدایت سے مخلوق کو بہرہ مند کرنے کے لیے وحی کا نظام مقرر کیا ہے۔ بے جان عناصر کے لیے طبعی جبریت' نباتات کے لیے قوت نمو' حیوانات کے لیے جبلت وحی کا ذریعہ ہے۔ لیکن انسان چونکہ شعور سے بہرہ مند ہے اس لیے اس کے لیے وحی کی وہ تکمیلی صورت مقرر کی گئی ہے جس کے تحت اس کے شعور کو مخاطب کیا جاتا ہے۔

پھر اسلامی تحریک نے اپنی اصولی دعوت کے اس جز کو بھی دلیل ہی کے زور سے قابل قبول بنایا کہ جب اس کائنات میں علت و معلول اور سبب و نتیجہ کا قانون کام کر رہا ہے تو انسان کے اخلاقی اعمال کو بھی اس جامع قانون کے تحت کسی تکمیلی نتیجہ تک پہنچنا چاہیے۔ اس نے قانون مکافات کو تاریخ میں دکھا کر ثابت کیا کہ اس قانون کے احاطے میں انسان کی تمدنی سرگرمیوں کو بھی آنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی دکھایا کہ انسان کی اس محدود امتحانی زندگی میں محدود قانون مکافات کے تحت پورے کے پورے نتائج اعمال سامنے نہیں آتے۔ بلکہ بسا اوقات ایک سلسلہ اعمال ہی کی تکمیل نہیں ہو پاتی' نیز اس سے بھی بڑھ کر بہت سی صورتوں میں بالکل الٹے نتائج سے آدمی کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس خدائی نظام سے توقع کرنی چاہیے کہ ارضی زندگی کے بعد کسی نئے دور حیات میں انسانی اعمال کے نتائج کو بھرپور طریق سے ظہور کرنا ہے۔ خدائی عدل جو ہر طرف کارفرما ہے' اس کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ جو جیسا کرے ویسا بھرے۔ اس طرح اس نے حیات بعد الموت اور محاسبہ آخرت اور جزا و سزا کا تصور دیا۔

پھر ان ساری بنیادی سچائیوں کو ثابت کرنے کے لیے اس نے پچھلی پوری انسانی تاریخ پیش کر دی۔ ایک ایک قوم کی داستان کو لیا اور دکھایا کہ جن انسانی گروہوں نے زندگی کا نظام ان حقائق پر اٹھایا' انہوں نے فلاح پائی۔ اور جنہوں نے ان سے روگردانی کی' وہ خوار و رسوا ہو کر ملیامیٹ ہو گئیں۔ جن افراد نے ان کو قبول کیا' ان کے دل و دماغ روشن ہو گئے اور ان کے کردار جگمگا اٹھے' اور جنہوں نے ان کی مخالفت کی وہ پستیوں میں گرتے چلے گئے۔ دکھایا کہ یہ وہ سچائیاں ہیں جن کی دعوت ہر دور تاریخ میں ہر قوم کے سامنے ایک ہی طرز کے لوگوں نے بار بار پیش کی اور ان کو غالب کرنے کے لیے بے لوث جذبہ اخلاص کے ساتھ جان و مال کی ساری متاع نچھاور کر دکھائی۔

اسلامی تحریک کی یہ اساسی دعوت اپنے پورے استدلالات کے ساتھ قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسے بڑے حسن تکرار سے پیش کیا گیا۔ اسے دلربا تصریف آیات کے ساتھ لایا گیا۔ اس کے لیے بہترین ادبی زبان استعمال کی گئی۔ اس میں جذبات لطیف کا رس گھول دیا گیا۔ مخالفانہ اعتراضات کو ساتھ کے ساتھ صاف کیا گیا۔ منکروں اور حریفوں کی نکتہ آفرینیوں اور طنز و استہزاء کا سنجیدگی سے تجزیہ کیا گیا۔ پھر کہیں عبرت دلائی۔ کہیں تنبیہہ کی۔ کہیں شرم دلائی۔ کہیں چیلنج کیا۔ کہیں نرمی اور لطافت سے دلوں کو پگھلایا۔ کہیں استفہام کا انداز اختیار کیا گیا۔ کہیں استعجاب کا رنگ بھرا۔ غرضیکہ مختلف اسالیب سے انسانی ذہن کو اس طرح گھیرا کہ' ارباب شعور کے لیے کوئی راہ فرار کھلی نہ رہنے دی۔

اگر بازی تلوار کے زور سے فتح کی جانے کی ہوتی تو آخر استدلال کے اتنے اہتمام کی ضرورت ہی کیا تھی جو قرآن کے دو تہائی بلکہ زائد حصے میں پھیلا ہوا ہے۔

درحقیقت اسلامی تحریک کی بے پناہ قوت استدلال نے اپنے مخاطبوں کو بے دم کر دیا۔ اور ان میں سے اہل سعادت نے قبول حق کے لیے دلوں کے دروازے کھول دیئے اور اہل زیغ مجبور ہوئے کہ دلیل کی بازی ختم کر کے تشدد کے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئیں۔ جو بھی دعوت و تحریک اپنے مخاطبوں کو اس مرحلے پر پہنچا دیتی ہے وہ آخر کار میدان مار لے جاتی ہے۔

خیر خواہانہ اپیل:

دلیل بھرو دلیل ہی نہ تھی بلکہ دلیل کے ساتھ دلوں کو پگھلا کر موم کر دینے والی' دور بھاگنے والوں کو قریب کھینچنے والی' روحوں کے بند دروازوں پر دستک دے کر ان کو کھلوا لینے والی اپیل بھی برابر شامل تھی۔ دعوت حق کی اپیل نے چٹانوں میں احساس ابھار دیا۔ لکڑی کے کندوں میں جذبات کی لہریں پیدا کر دیں۔ اور اکثر دشمنوں کو اشک آلود کر دیا۔ اسلامی تحریک کے ساز سے ایسے ایسے روح پرور نغمات اٹھے کہ دلوں میں حیات نو کی رو دوڑا گئے۔ جاؤ' قرآن کھول کے دیکھو کہ کس طرح اس کے ایک ایک جملے میں شعور کے نور کے ساتھ جذبوں کی گرمی گھلی ہوئی ہے۔ یہ دو آتشہ صہبائے طہور تھی کہ جس نے بڑے بڑے سنگ دلوں کو مسخر کر لیا۔ اور جس نے حق کے دشمنوں کو حق کا خادم بنا دیا۔ پھر اس کا ادبی زور ایسا سحر آفرین تھا کہ اس نے چمن فصاحت کی بلبلوں کو ساکت اور وقت کی بزم سخن میں نغمہ آفرین شعراء کو گنگ کر دیا۔ اس نے ایسی عربی مبین میں کلام کیا کہ سارا عرب ویسا کلام پیش کرنے سے عاجز رہ گیا۔ ہم یہاں دعوت حق کے نغمہ کے چند بول پیش کر رہے ہیں۔

> "ان سے کہو (اے پیغمبر! میری طرف سے) کہ اے میرے بندو! جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے ہو' اللہ کی رحمت سے اپنی آس نہ توڑو۔ یقیناً (تم رجوع کرنے والے بنو تو) خدا سارے کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اور یقیناً وہ درگزر کرنے والا مہربان ہے۔ اور تم اپنے رب کی طرف جھکو اور اس کے حضور میں سر تسلیم خم کر دو۔ قبل اس کے کہ تم کو عذاب آگھیرے اور پھر تمہیں کوئی مدد نہ مل سکے اور پیروی کرو اس بہترین توشہ ہدایت کی جو تمہارے رب کی بارگاہ سے تمہاری جانب بھیجا گیا ہے۔ قبل اس کے کہ تمہیں عذاب اچانک آپکڑے جب کہ تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ پھر اس وقت کوئی جان یہ کہتی رہ جائے' کہ ہائے افسوس میری اس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کے حق میں دکھائی اور میں (حقیقت کی) ہنسی اڑاتا رہا۔ یا وہ (مایوس ہو کر) کہے کہ اگر اللہ مجھے راستہ سجھاتا تو میں سنبھل کر چلنے والوں میں شامل ہوتا۔ یا جب وہ عذاب کو دیکھے تو یوں کہے کہ اگر ایک موقع اور ملے تو میں احسان کیش لوگوں میں جا ملوں"۔

(الزمر۔ ۵۳ تا ۵۸)

اس ایک ٹکڑے میں بڑے ایجاز سے وہ ساری بنیادی سچائیاں سموئی ہوئی ہیں جن کی آئینہ دار محسن انسانیت ﷺ کی دعوت تھی۔ پھر اس میں عقلی استدلال بھی موجود ہے۔ اور اس کے ساتھ دل ہلا دینے والی جذباتی اپیل ہے۔ اس میں بشارت بھی ہے اور انتباہ بھی۔ قرآن اس طرح کی رنگا رنگ پکاروں سے بھرا پڑا ہے۔ مٹی سے بنے ہوئے انسانی پتلوں کے بس میں نہ تھا کہ ایسے انقلاب آفرین کلام کی موجوں کے سامنے کھڑے رہ سکتے۔ جب کہ اس کے ریلے مسلسل چلے آرہے تھے --- ہر صبح' ہر شام' ہر آن !! ---- تیئس سال تک متواتر یہ سیل معنی امڈتا رہا۔ تو آخر کیسے تصور میں آسکتا ہے کہ نور اور حرارت کی ان لہروں کی زد پر آنے والے آدم زاد اپنی جگہوں پر جوں کے توں جامد رہ سکتے۔ دو اور الہام پارے جن میں عمومی خطاب ہے ملاحظہ ہوں:

"اے آدم کی اولاد! کیا میں نے تم کو متنبہ نہ کر دیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا' وہ تمہارا کھلا دشمن ہے ---- اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا' یہی ہے راہ راست! وہ (اس کے باوجود) تم میں سے بہت سی خلقت کو بہکا لے گیا۔ پھر کیا تم لوگ سوجھ بوجھ سے کام نہ لے سکتے تھے"۔
(یٰسٓ ۶۰ تا ۶۲)

"کہہ دو (اے پیغمبر!) کہ اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے حق تم تک آچکا۔ سو اب جو کوئی بھی راہ یاب ہو تو اس کا راہ یاب ہونا اس کی اپنی ہی جان کے لیے (سود مند) ہے۔ اور جو کوئی بھٹکے تو اس کا بھٹکنا خود اسی کے لیے (موجب خسران) ہے۔ اور میں تم پر مختار نہیں ہوں"۔
(یونس۔ ۱۰۸)

وہ لوگ جنھوں نے مخالفت کے محاذ کھولے ان کے بھی بہترین احساسات کو پکارا گیا۔ اور زیادہ سے زیادہ موثر اور دل گداز اسلوب سے ان کی اساسی فطرت کو اپیل کیا گیا۔ مشرکین مکہ ہوں یا اہل کتاب ہر گروہ کے بہترین عناصر کو بہترین اسلوب سے خطاب کیا اور ان کے بہترین جذبات کو حرکت میں لانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ منافقین کو بھی اصلاح کی دعوت دی۔ اس سلسلے کی مثالیں بھی الگ الگ پیش کی جاتی ہیں۔

مشرکین مکہ سے خطاب:

"اللہ نے ایک بستی کی مثال دی ہے جو امن چین سے دن گزار رہی تھی اور اس کی روزی ہر چہار جانب سے بافراط چلی آرہی تھی۔ پھر اس (کے باشندوں) نے خدا کے احسانوں کی ناشکری کی۔ سو اللہ نے ان کے کرتوتوں کے بدلے میں انھیں بھوک اور خوف (کی حالت) کا لباس پہنا کر مزہ چکھایا اور ان کے درمیان خود انہیں میں سے پیغمبر مبعوث ہو چکا تھا' پھر انہوں نے اسے جھٹلا دیا۔ پس ان کو عذاب نے آپکڑا اور وہ تھے ہی ظالم!"

اہل کتاب سے خطاب:

"اے اہل کتاب! ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا جو کتاب الٰہی کی ان بہت سی حقیقتوں کو تمہارے سامنے نکھار کرلا رہا ہے۔ جنہیں تم چھپاتے ہو اور وہ بہت ساری چیزوں سے درگزر بھی کرتا ہے۔ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی آچکی اور واضح کتاب پہنچ چکی جس کے ذریعے اللہ ایسے لوگوں کو سلامتی کی راہ پر لاتا ہے جو اس کی مرضیات کے پیچھے چلیں اور انہیں تاریکیوں سے نکال نکال کر اپنے حکم خاص کے مطابق اجالے میں لاتا ہے۔ اور انہیں راہ راست کی طرف رہنمائی دیتا ہے۔" (المائدہ۔ ۱۵، ۱۶)

"کہو! اے پیغمبر! کہ اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق کے مبالغہ سے کام نہ لو اور (اپنے ہاں کے) ایسے لوگوں کے نفسانی رجحانات کے پیچھے نہ چلو جو پہلے سے گمراہ ہیں اور جنہوں نے بہتوں کو بھکا دیا ہے اور جو سیدھی راہ سے دور جا پڑے ہیں۔" (المائدہ۔ ۷۷)

"اے اہل کتاب! رسولوں کے سلسلہ بعثت میں ایک لمبے وقفے کے بعد ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا جو حقیقتوں کو تمہارے سامنے نکھار کرلا رہا ہے ---- (ممکن ہے) کہیں تم (بطور عذر) کہو کہ ہم تک تو کوئی بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا آیا ہی نہ تھا۔ سو اب بشارت دینے والا تمہاری طرف آچکا"۔ (المائدہ۔۱۹)

"اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کے لیے فیصلہ دے دیا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد کرو گے اور بہت بری طرح سرکشی دکھاؤ گے۔ سو (اے بنی اسرائیل) جب پہلے وعدہ کا موقع آیا تو ہم نے تمہارے اوپر اپنے سخت جنگجو بندوں کو مسلط کر دیا۔ پھر وہ شہروں میں پھیل گئے۔ اور وہ وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا۔ پھر ہم نے ان کے مقابلے میں تمہیں ایک موقع دیا اور اموال و اولاد سے تمہیں تقویت دی۔ اور تمہاری تعداد بڑھا دی۔ (اور تمہیں پھر مہلت دی کہ) اگر تم نے بھلائی اختیار کی تو اپنی ہی جانوں کا بھلا کیا۔ اور اگر برائی کی تو وہ بھی اپنے ہی حق میں کی! پھر جب دوسرے وعدہ کا موقع آیا کہ وہ لوگ تمہارے چہروں کو (دکھ اور ذلت کی سیاہی سے) کلونسا دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح گھسیں جیسے وہ پہلے گھسے تھے اور جہاں وہ غلبہ پائیں۔ وہاں تباہی پھیلا دیں (تو تم نے پورا پورا مزہ چکھ لیا)! ـــــ اب (جب کہ دعوت محمدیؐ کے نمودار ہونے سے تمہارے سامنے ایک فیصلہ کن موقع اور پیدا ہوا ہے) تمہارا رب چاہتا ہے کہ تم پر رحم کرے۔ لیکن اگر تم پھر وہی کچھ کرو گے، تو ہم بھی ویسا ہی مزا چکھائیں گے اور (آخرت میں) ہم نے جہنم کو نافرمانوں کے لیے ٹھکانا بنایا ہے"۔ (بنی اسرائیل۔ ۴ تا ۸)

"کہو کہ اے اہل کتاب! اس سیدھے سیدھے کلمہ کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے

درمیان مشترک ہے ـــــ یہ کہ ہم ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اور نہ کسی شے کو اس کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم لوگ اللہ کو چھوڑ کر باہم دگر ایک دوسرے کو رب بنالیں"۔ (آل عمران۔ ۶۴)

عیسائیوں سے خطاب:

"اور تم (یہود کے مقابلے میں) ان لوگوں کو مسلمانوں کی محبت میں قریب تر پاتے ہو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں میں علماء اور درویش ہیں اور اس وجہ سے کہ یہ لوگ تکبر میں مبتلا نہیں ہیں۔ اور یہ لوگ جب اس کلام کو سنتے ہیں جو رسولؐ پر اترا ہے تو ان کے حق کو پہچاننے کے باعث تم ان کی آنکھوں کو دیکھتے ہو کہ آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتی ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے۔ پس ہمیں حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لے"۔ (المائدہ۔ ۸۲ '۸۳)

منافقین سے خطاب:

"کیا یہ (منافق) لوگ سوچتے نہیں کہ یہ ہر سال دو ایک بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔ پھر بھی توبہ نہیں کرتے۔ اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں۔ اور جب کبھی کوئی سورۃ نازل ہوتی ہے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں کہ آیا کوئی تمہاری طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر اٹھ کے چلے جاتے ہیں۔ ان کے دلوں کو خدا نے اس لیے پھیر دیا ہے کہ یہ لوگ سوجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے۔ دیکھو! تمہارے اندر سے رسول تمہارے پاس آچکا ہے' اس کے لیے بار خاطر ہے' ہر وہ چیز جو تمہیں تکلیف دے۔ وہ تمہارا مشتاق ہے اور وہ اہل ایمان کے لیے شفیق اور مہربان ہے"۔

(التوبہ۔ ۱۲۶ تا ۱۲۸)

قرآن دلوں کو پگھلا دینے والے ایسے بولوں سے بھرا پڑا ہے۔ روحوں میں پیوست ہو جانے والے جملے' ضمیروں میں تحریک پیدا کر دینے والے موتیوں جیسے الفاظ' احساسات کے تاروں کو چھیڑ دینے والے ادبی اسالیب! ـــــ کتنی بڑی طاقت ہے قرآن اور کتنی ہنگامہ خیز رہی ہو گی دعوت حق! حقیقت کی یہ شعاعیں جب پے در پے برستی ہوں گی تو اوسط درجے کے انسانوں کے لیے کیسے ممکن رہا ہو گا کہ وہ افکار و کردار کی تاریکیوں کو سینے میں آراستہ کیے رکھیں۔ دلیل کی طاقت کے ساتھ جب اپیل کی طاقت آملتی ہے تو یہ دو دھاری تلوار پتھروں کو بھی کاٹ جاتی ہے۔ پھر جہاں قرآن کی باران کلام کی پھواریں متواتر پڑ رہی تھیں' وہاں صاحب نبوت کا تکلم بھی درسوں' خطبوں' تقریروں اور گفتگوؤں میں ہر آن نور کی لہریں اٹھا رہا تھا۔ زمانے نے اس بحر مواج کے جو موتی محفوظ رکھے ہیں ذرا آج ان کو جانچو۔ چھوٹے چھوٹے بول' تھوڑے لفظوں میں زیادہ معنی' ادبیت و خطابت کا زور' بات میں روح اخلاص گھلی ہوئی' گفتگو حالات پر منطبق' کسی

دوسری شخصیت کا سمندر ایسے موتی پھر پیدا نہ کر سکا۔ پھر اسلامی تحریک کے شعراء اور ادیب اور خطیب تھے کہ جنھوں نے نئے فنی معیارات اور انقلابی اسالیب کے ساتھ جب ساز نطق پر اسلام کے کلمۂ انقلاب کا زخمہ چلایا تو ان کی ہر موج آہنگ نے ریت کے ذروں میں بھی دھڑکتے ہوئے دل پیدا کر دیئے ہوں گے۔ آج بھی اس دور کے دفتر سخن کو اٹھا کر دیکھو' تو حسانؓ بن ثابت اور کعبؓ بن مالک کا حسین تخیل ان کے مخلصانہ جذبوں کے پر لگا کر عجیب عقابی شان سے اڑتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے نغمے جب روز مرہ واقعات سے ہم آہنگ اور کشمکش کے ماحول سے مربوط ہو کر نمودار ہوتے ہوں گے تو آخر انسانی دلوں پر کوئی تو کیفیت گزرتی ہو گی۔ مدعا یہ کہ اصل طاقت قول حق کی تھی۔ جس کے سامنے ممکن نہ تھا کہ باطل میدان میں جما رہ سکے۔ ان الباطل کان زھوقا!

تنقید:

تحریک اسلامی کی دعوت دلیل کے ساتھ محض اپیل ہی نہیں لائی بلکہ اس نے اپیل کے ساتھ بھرپور تنقید سے بھی کام لیا۔ صوفیانہ مذاہب میں تو شاید دعوت کا ایک ہی اسلوب چل سکتا ہے۔ یعنی منت و لجاجت اور خوشامد و التماس کا اسلوب۔ آخر جہاں محض افراد کی ذات اور ان کی محدود نجی زندگی تک ہی سے واسطہ ہو اور نظام اجتماعی کی اصلاح یا تعمیر تو کا کوئی سوال ہی سامنے نہ رہا ہو' وہاں اس اسلوب سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ صوفیانہ مسلکوں اور انفرادی دھرموں میں صرف یہ پیش نظر ہوتا ہے کہ زیر اثر افراد کو کچھ عقیدوں اور کچھ انفرادی خوبیوں سے آراستہ کر دیا جائے اور پھر ان کو برائی کی طاقت سے اپنا آپ بچاتے رہنے کا درس دیا جائے۔ لیکن بدی کی اجتماعی طاقت سے لڑنے اور فاسد ماحول سے ٹکر لینے کا کوئی داعیہ موجود نہیں ہوتا۔ ظلم قیادت کی مسند پر بیٹھا اپنا ڈنکا بجاتا رہے اور انسانیت اس کے قدموں میں ذبح کی جاتی رہے۔ آخر ان دنیوی جھمیلوں سے ایک اللہ مست زاہد کو کیا مطلب! چنانچہ ایسے محدود روحانی نظاموں میں آدمی کی سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات اور سیاست کے جھمیلوں سے الگ تھلگ رہے' ہر کسی کے آگے یکساں انکسار اور لجاجت دکھا دے۔ "با مسلماں اللہ اللہ! با برہمن رام رام!" کا کیش اختیار کرے' تواضع ہر ایک کے سامنے کرے اور درشتی کسی سے بھی نہ برتے۔ ایسے نظاموں میں جنہیں آدمی کو میدان کشمکش میں نہ اتارنا ہو بلکہ اسے تمدن کی جد و جہد سے نکال کر غاروں اور خانقاہوں میں جا بٹھانا ہو' تنقید سے کام لینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ----- کیونکہ تنقید تو ذہنی دنیا میں کشمکش کا آغاز ہوتی ہے۔ چنانچہ محدود روحانیت اور انفرادی مذہبیت کی نگاہوں میں یہ آدمی کی پستیٔ کردار شمار ہوتی ہے کہ وہ کسی طاقت کے خلاف زبان تنقید کھولے۔ جیسے یہ دامن تقویٰ پر دھبے ڈالنے والا کوئی کام ہو۔ اور اس کے کرنے سے روح کی شانتی ماری جاتی ہے۔

لیکن جو نظریے اور دعوتیں تمدن میں انقلاب برپا کرنے اٹھیں ان کے اسلحہ خانہ فکر میں دلیل اور

اپیل کی طرح تنقید بھی درجہ اول کی اہمیت رکھتی ہے۔ صرف احقاق حق پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ابطال باطل بھی واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ ابطال باطل کے بغیر احقاق حق بھی پوری طرح نہیں ہو پاتا۔ یہاں خدا پر ایمان لانا اور طاغوت سے کفر کرنا لازم و ملزوم ٹھہرتا ہے۔ یہاں امر بالمعروف تنہا نہیں کیا جا سکتا بلکہ نہی عن المنکر بالکل متوازی طور پر کرنا پڑتا ہے۔ یہاں "الا اللہ" کہنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے "لا الٰہ" پکارا جائے۔

اسلامی۔ تحریک جب بھی رونما ہوتی ہے تو وہ عوام کے سوچنے کا رخ بدلنے کے لیے وقت کے تمدن' اجتماعی ماحول' سیاسی و معاشی نظام اور پھر خاص طور پر مروجہ افکار و معتقدات اور پیمانہ ہائے قدر پر کڑی تنقید کرتی ہے۔ مذہبی' سیاسی اور معاشی لحاظ سے ان پیش رو طبقوں کے افکار و اعمال کی حقیقت وہ لازما کھول دیتی ہے جو عوام کو اپنی غلامی کے جال میں پھانس کے مزے اڑاتے ہیں۔ اس کے لیے چارہ کار ہی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ زندگی کی قیادت کرنے والوں کا پول وہ عام انسانوں کے سامنے اچھی طرح کھول دے۔ جب تک فاسد کو فاسد' باطل کو باطل اور غلط کو غلط ثابت نہ کر دیا جائے' اس کے مقابلے میں نہ سچائی اور راستی کی کوئی پیاس پیدا ہو سکتی ہے اور نہ تبدیلی کی امنگ ابھر سکتی ہے۔ کسی بھی نبیؑ کی دعوت اور روئداد کار کو لیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ نہ صرف معاشرے کے فاسد تصورات و احوال کو نشانہ تنقید بنایا گیا ہے بلکہ ہر نبی نے وقت کے جبابرہ کو ٹھیک ان کے درباروں میں جا کر للکارا ہے۔ یہاں تو نظام تمدن کی ساخت کو سامنے رکھ کر یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ ہر بستی' قوم اور ملک میں کچھ "اکابر مجرمین" پائے جاتے ہیں جو مکارانہ سیاست سے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں (الانعام۔ ۱۲۳) ان کو ان کے مناصب پر قائم رکھ کر کوئی اصلاح نہیں کی جا سکتی۔

اسلام جب عربوں کے درمیان جاہلیت کے نظام کو مٹانے اور تاریخ میں نئے زریں باب کا افتتاح کرنے اٹھا تو اس نے جھوٹ اور ظلم اور فساد کی ہر ہر شکل پر بغیر کسی رحم کے تنقید کی۔ اور وقت کے جتنے بھی عناصر جاہلی نظام اور طاغوتی ماحول کے رہبر اور پاسبان اور کارپرداز بن کر معاشرے پر مسلط تھے۔ اور جو اپنے مرتبے اور مفاد کے تحفظ کے لیے فلاح انسانی کے پیغام کا مقابلہ کرنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان سب کا پول ایسی چیرہ دستی سے کھولا کہ ان کے ناپاک کرداروں کے بدن پر اعزازات کی مصنوعی پوشاکوں کا ایک تار بھی لگا نہ رہنے دیا۔ جوں جوں انسانیت دشمن طاقتوں کی حقیقت معاشرے پر کھلتی گئی' رائے عام میں ایک بیدار شعور پھیلتی چلی گئی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ تبدیلی کی پیاس تیز ہوتی گئی۔ اسلامی تحریک کے تنقیدی محاذ نے عوام الناس میں سوچنے' سمجھنے' جانچنے' پرکھنے اور موازنہ و تقابل کرنے کی صلاحیتوں کو نشوونما دی۔ دعوت کا یہ وہ پہلو تھا جو حق و باطل' خیر و شر اور درست و نادرست میں فارق بنا۔ "اسی سے قد تبین الرشد من الغی" (البقرہ: ۲۵۶) کا سماں پیدا ہوا۔ اسی کے ذریعے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نتھر گیا۔ اسی کے ذریعے اندھیرے اور اجالے کا فرق کرنے والی بصارت کام کرنے لگی۔ اسی کے ذریعہ زہر اور شکر

کے آمیزے کا تجزیہ ہو گیا۔ فاسد طاقتوں کے مظالم کو تو اسلامی تحریک کے جاں باز اپنی جانوں پر اف کیے بغیر سہتے رہے۔ لیکن ان طاقتوں کے گھٹیا کرداروں سے خوشنما پردے اٹھانے میں انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی' ان کے کام کے خطوط سیاست و تمدن کے دائروں سے باہر ہی باہر سے نہیں گزرتے تھے کہ وہ جاہلی نظام کی مذہبی و سماجی قیادتوں کو یہ اطمینان دلا کر اپنا فرض انجام دے سکتے' کہ تم نچنت ہو کر اپنے منصبوں اور مرتبوں پر بیٹھے رہو' ہم اللہ والے تمہارے کسی مفاد سے تعرض کرنے والے نہیں ہیں۔ ہمیں تو بس خدا کا نام لینا ہے۔ اور اس کا کلمہ لوگوں کو سکھانا ہے۔ ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان قیادتوں کے سامنے شان انکسار سے کچھ خوشامدانہ باتیں کہہ کر' ان کو دم دلاسا دلا کر اور ان کی گرفت سے بچ کر اس انقلابی کلمہ حق کو پکار سکتے جس کا واضح منتہا نظام قسط کی اقامت تھا۔

اسلامی تحریک نے عین اپنے داعیٔ اعظم ﷺ کی زبان مبارک کو اس تلخ فریضہ کی انجام دہی کے لیے استعمال کیا اور سماج کے پھوڑوں کو چیرا دینے کے لیے ٹھیک الہامی الفاظ سے نشتروں کا کام لیا۔ یہ تنقید مجرد اصول و تصورات ہی تک محدود نہ تھی۔ بلکہ مزاحم ہونے والے بااثر طبقات اور حریف افراد بھی اس کی زد پر آئے اور بار بار آئے۔ یہ تنقید روز مرہ کے واقعاتی پس منظر کے ساتھ کی جاتی تھی اور جو کچھ اقدامات اور کارروائیاں مخالف کیمپ کی طرف سے ہوتی تھیں' ان سب کا تجزیہ ساتھ کے ساتھ کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح سے عوامی شعور کو تیار کیا گیا۔ یہ کام اگر نہ کیا جاتا تو کچھ پاکباز افراد اور نیکی کے کچھ مجیر العقول مجسمے ممکن تھا کہ تیار ہو جاتے اور وقت کی دنیا بھی ان کو خراج تحسین پیش کرتی اور بعد کے لوگ بھی عجائب خانۂ تاریخ میں ان کی یادگاری تصاویر دیکھتے تو عش عش کرتے۔ لیکن ماحول کا سارا دریا جوں کا توں یخ بستہ رہتا اور جاہلیت کی اندھیاریاں اس کو بدستور محیط رہتیں۔ نہ اندھیرے کا جگر چیرا جا سکتا اور نہ اس دریا کی زیر آب خوابیدہ موجوں کو جگایا جا سکتا۔ ممکن ہی نہ تھا کہ عوام میں انقلابی شعور پیدا ہوتا۔ اور کارکنان اسلام کے اندر کشمکش کے رجحانات ابھرتے۔ پھر تو بات غار حرا پر ہی ختم ہو جاتی۔ کجا کہ کلمہ حق عرب کا فاتح بن کر مکہ میں داخل ہوتا۔

محسن انسانیت ﷺ نے قرآن کی الہامی زبان میں تنقیدیں کر کے وقت کے اکابر کو نہ صرف عقل و دلیل کے لحاظ سے دیوالیہ ثابت کر دیا۔ بلکہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی زمانے پر یہ راز کھول دیا کہ مرعوب کن اور نظر فریب پردہ ہائے عظمت و سیادت میں نہایت مکروہ غلاظتوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ اسی تنقید نے عوام میں یہ احساس پیدا کیا کہ جب تک تحریک اسلامی سے تعاون کر کے ان طاقتوں کو زندگی کی قیادت سے برطرف نہ کر دیا جائے زندگی سنورنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

قریش کو لیا تو ان کی بت پرستی' ان کے اوہام' ان کے مضحکہ انگیز مذہبی رسوم' ان کی اخلاقی پستی اور ان کے زعم سیادت سارے ہی پہلوؤں سے کھولنے کی ہر بات کھول دی۔ ان کے محبوب معبودوں کی بے بسی کو واضح کرنے کے لیے مثال دے کے بتایا کہ یہ سب کے سب مل کر بھی ایک مکھی تک خلق کرنے

سے عاجز ہیں بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز اڑا لے جائے تو یہ اس سے واپس لینے کی مجال بھی نہیں رکھتے۔
حضرت ابراہیمؑ کے نام لیوا ہونے پر ان کو جو فخر تھا' اس کو یوں توڑا کہ حضرت ابراہیمؑ کے پورے کے پورے زمانہ حیات کو بار بار ان کے سامنے پیش کر کے دکھایا کہ جس مشن کے لیے انہوں نے اپنی پوری زندگی کھپا دی تھی' گھربار چھوڑا' پیری کی گدی پر لات ماری' نمرود کے سامنے بغاوت کے مقدمہ میں ملزم بنائے گئے اور زندہ جلائے جانے کی سزا تجویز ہوئی۔ پھر وہ اپنے رب کے مہاجر اور خانہ بدوش بنے۔ پھر انہوں نے ایک اجاڑ وادی میں آکر اپنی دعوت اور خدا کی عبادت کا یہ مرکز قائم کیا جسے اب تم نے اپنی کمائی اور مذہبی پیشوائی کا ذریعہ بنا رکھا ہے ---- اب تم کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اس موحدِ حنیف کے تم نام لیوا اور جانشین بن کے بیٹھو۔ درآں حالیکہ تمہارا بال بال شرک اور جاہلیت کے بندھنوں میں بندھا ہوا ہے۔ پھر دکھایا کہ کیسے تم لوگوں نے حلال و حرام کی ایک انوکھی شریعت گھڑ رکھی ہے۔ دکھایا کہ تم نے استھانوں پر چڑھاووں کے لیے کیسے کیسے ضابطے بنا رکھے ہیں۔ دکھایا کہ پانسے پھینکنے اور قمار بازی کرنے کو بھی تم نے رنگ تقدس دے رکھا ہے۔ دکھایا کہ کس طرح تم بیٹیوں کی پیدائش پر منہ چھپاتے پھرتے ہو۔ اور سنگدل بن کر ان کو مٹی کے انباروں میں زندہ دفن کر دیتے ہو' اور پھر تمہیں خدا کے ساتھ بیٹیوں کو منسوب کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اسی طرح جب کشمکش چھڑی تو ان کی لایعنی باتوں اور خفیف الحرکتیوں میں سے ایک ایک کو ان کے سامنے رکھ کر دکھایا۔ کہ ذرا اپنے کردار کی شکلیں دیکھو۔ ان کے جرائم ان کے سامنے گنوا کر کہا کہ تم مسجد حرام کی تولیت پر نازاں ہو۔ حالانکہ اپنے کفر و شرک کی بناء پر تم اس منصب کے مستحق ہی نہیں ہو' تم نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا۔ تم نے کعبہ کے دروازے بندگان حق پر بند کیے۔ تم نے اپنے بھائی بندوں کو جلاوطن کیا۔ اور تم نے دین کی راہ میں فتنہ انگیزی کو اپنا شعار بنایا۔

پھر اہل کتاب کو لیا تو ان کا صدیوں کا نامہ اعمال کھول کے ان کے سامنے رکھ دیا کہ کس طرح تم پیروان موسیٰؑ نے خود موسیٰ علیہ السلام کو قدم قدم پر اذیت دی تھی۔ بار بار نافرمانیاں کیں۔ بار بار بگاڑ کے راستوں پر پڑتے رہے۔ تم نے جھگڑے کیے۔ فساد اٹھائے۔ بچھڑے کی پوجا کی۔ جہاد سے جی چرایا۔ پھر آپس میں خون خرابے کیے۔ اپنے بھائی بندوں کو بے خانماں کرتے رہے۔ ان کے خلاف ظلم و عدوان کے ساتھ دھاوا بولتے رہے۔ تم نے کتاب الٰہی میں تحریف کی۔ حق بات کو ہمیشہ چھپایا' اور احبار و رہبان کو اپنا معبود بنا لیا۔ حد یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں سے طرح طرح کی باتیں لکھ کر ان کو خدا سے منسوب کرتے ہو۔ اور خلق خدا کو فریب دے دے کر حرام کمائیاں سمیٹتے ہو۔ نہ خود راہ حق پر چلتے ہو نہ دوسروں کو چلنے دیتے ہو اور کوئی دوسرا اگر انسانی فلاح کا کام کرنے اٹھتا ہے تو اس کے ساتھ تعاون کے بجائے اس کے راستے میں کانٹے بچھاتے ہو۔ کل تک تم خود خدائی نوشتوں کی بنا پر زمانے بھر کو مژدہ سناتے رہے ہو کہ نبی آخر الزمان آنے والا ہے اور جب وہ واقعی آپہنچا تو تم اس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ مسلم جماعت جو بہت سے وجوہ سے تم سے اقرب ہے۔ اور تمہارے انبیاء اور پہلے کی ساری کتابوں کو مانتی ہے اس کے مقابلے میں تمہارا

قارورہ اگر ملتا ہے تو ارباب شرک سے جا کر ملتا ہے۔ ان کرتوتوں کو کرتے ہوئے خدا کی کتاب برابر تمہاری پیٹھوں پر سوار رہی --- بالکل ایسے کہ جیسے کسی گدھے پر علم کے دفتر لدے ہوں۔ اور وہ ان سے بے خبر چلا جا رہا ہو' تم اگر سچے ہوتے تو اپنی زندگیوں پر تورات کو قائم کر کے دکھاتے۔ جب تک تم نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال رکھا ہے تمہارے خوش نما دعووں کی کچھ بھی وقعت نہیں ہے۔ آج تمہاری تعداد کثیر اس پستی میں آ پہنچی ہے کہ ایک دمڑی بھی اگر ان کے پاس امانت رکھوائی جائے تو ان کی خیانت سے بچ کر وہ مشکل ہی سے واپس مل سکتی ہے۔ اپنے اس رویے کی وجہ سے تم نے خدا کا غضب سیہڑا اور تم پر ذلت و مسکنت چپیک دی گئی۔

پھر منافقین کو پکڑا تو ان کا پورا پورا نفسیاتی تجزیہ کر کے انہیں دکھایا کہ تم کس ٹیڑھے زاویے سے ہر معاملے کو سوچتے ہو۔ تنہائی میں بیٹھتے ہو تو تحریک کے حالات و واقعات پر کس انداز سے اپنے تبصرے کرتے ہو۔ مجالس میں آتے ہو تو تمہارا ڈھنگ کیا ہوتا ہے اور کس کس طرح باہم وگر اشارے کرتے ہو۔ کبھی لکڑی کے کندوں کی طرح ساکت ہو جاتے ہو اور تمہاری آنکھیں پتھرائی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی چپکے سے سٹک جاتے ہو' مسلم جماعت میں ہوتے ہو' تو اور طرح سے زبان چلاتے ہو اور پھر دشمنوں میں جا بیٹھتے ہو تو دوسرا ہی راگ الاپتے ہو۔ ہر معاملے میں تمہارا رویہ جماعت سے الگ الگ اور مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ دوسروں کو اگر نغمہ الہام سے درس حیات اور سرمایہ تسکین ملتا ہے تو تمہارے دل اسے سن کر بیٹھنے لگتے ہیں۔ دوسروں کے لیے رسولؐ پاک کا وجود مرکز محبت بنا ہوا ہے۔ اور تم اپنے آپ کو دور دور رکھنا پسند کرتے ہو۔ دوسروں کا جذبۂ دروں انہیں نماز کے لیے کھینچ کھینچ کے لاتا ہے۔ اور تم ہو کہ دل سے کسمساتے ہوئے آتے ہو۔ جیسے مارے باندھے کوئی بیگار آدمی کو پوری کر دیتی ہو۔ دوسرے اپنا سب کچھ تحریک کے قدموں میں نچھاور کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں' اور تم ہو کہ خود بھی خرچ نہیں کر سکتے اور اوروں کو بھی روکتے ہو۔ دوسرے اپنے نصب العین کی خاطر دل کی امنگ سے جہاد کے لیے نکلتے ہیں' لیکن تم ہمیشہ جان بچانا چاہتے ہو اور عذر گھڑ گھڑ کے راہ فرار نکالتے ہو۔ دوسروں کے لیے جس واقعہ میں خوشی کا پہلو نکلتا ہے' اس سے تمہارے دل ملول ہو جاتے ہیں۔ اور دوسروں کو جن حالات میں تکلیف پہنچتی ہے' تم ان پر گھی کے چراغ جلاتے ہو۔ جماعت کے ساتھ کسی طرح بھی تمہارا جوڑ نہیں لگتا۔ گویا اسلامی تحریک نے ہر منافق کے سامنے اس کی تصویر کھینچ کے رکھ دی کہ اپنے خد و خال ملاحظہ فرمائیے۔

جاہلی شعراء جو تحریک اسلامی کے خلاف فن کا محاذ آراستہ کیے ہوئے تھے۔ اور خود اس کے داعی اعظم ﷺ کے بارے میں ہجویہ کلام لکھ لکھ کر اسے شائع کرتے رہتے تھے۔ چند الفاظ میں ان کا ایسا نقشہ کھینچا گیا کہ جو پوری طرح ان پر راست بھی آتا تھا اور جسے دیکھ کر عرب کا عام آدمی فوراً اس نقشہ کی پستی کا اندازہ بھی کر سکتا تھا۔ جاہلی شعراء کی شان یہ بتائی گئی کہ یہ وہ عنصر ہے جس کے گرد جمع ہونے والے اور جس کی امامت میں چلنے والے صرف گم کردہ راہ لوگ ہیں۔ پھر یہ وہ عنصر ہے جو اپنے بے اصولے پن کی

وجہ سے ہر ہر وادی میں آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے۔ پھر یہ وہ عنصر ہے جو زبان سے وہ باتیں کہتا ہے جن کے مطابق اس کا اپنا عملی کردار نہیں ہے۔

پھر اسلامی تحریک نے وقت کے خاص خاص گھناؤنے کرداروں کو چھانٹ کر کسی نام کے بغیر ان کی تصویریں اعلیٰ درجہ کے آرٹ کے ساتھ مطابق حقیقت ادبی رنگوں سے تیار کیں اور سماج کے عوامی شعور کے ایوان میں آویزاں کر دیں۔ تاکہ ہر کوئی ان کو دیکھے ان کو سمجھے اور ان کو واقعاتی دنیا میں خود پہچانے۔ کہیں اس کردار کو دکھایا جو اپنے باتونی پن کے زور سے لوگوں کو مرعوب کر لیتا ہے۔ لیکن عمل کے میدان میں اپنی خوشنما باتوں کو پامال کر کے انسانی سماج میں فتنہ انگیزی کرتا اور تباہی کی آگ لگاتا ہے۔ کہیں اس کردار کو بے نقاب کیا۔ جو خاندانی اور قائدانہ غرور کے نشے میں بدمست رہتا ہے اور اپنی عزت کے حد سے بڑھے ہوئے احساس نے اس کی ناک کو اتنی اہمیت دے دی ہے کہ وہ گویا ہاتھی کی سونڈ کے مماثل ہو گئی ہے ----- اور قیامت کے دن ٹھیک اس سونڈ پر داغ دے کر اسے سزا دی جائے گی۔ کہیں اس انسانی کردار کو دکھایا کہ جس کی ہوس دنیا نے اسے کتے کی سی عادتوں پر لا ڈالا ہے۔ جسے دھتکارو تو بھی زبان لٹکا دیتا ہے چھوڑ دو تو بھی زبان لٹکا دیتا ہے۔ یہ کردار سماج میں موجود تھے۔ اور چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ان ناقدانہ تصاویر کی وجہ سے ان کو پہچاننا اور ان کی پستی کا شعور حاصل کرنا عوام کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

یہ تنقید محض نظری نہ تھی' واقعاتی کشمکش کے ساتھ متعلق تھی۔ اور اس میں بہرحال تحریک اسلامی کے محاذ سے مخالف طاقتوں کو مخاطب کیا جاتا تھا۔ سنانے والے کو بھی معلوم تھا کہ وہ کس کو سنا رہا ہے اور سننے والوں کو بھی اندازہ ہوتا تھا کہ کون ان کی خبر لے رہا ہے۔ یہ تنقیدیں آسمان سے لاؤڈ اسپیکر لگا کر نہیں سنائی جاتی تھیں' بلکہ یہ محمد ﷺ کی زبان سے نشر ہوتی تھیں۔ اور انہیں مسلم جماعت کے ارکان گوشے گوشے تک پہنچاتے تھے۔ اس لیے ان کے جذبات ان میں شامل اور ان کی روحیں ان میں حل ہوتی تھیں۔ یہ واقعاتی مد و جزر پر منطبق کر کے ہی سنائی جاتی تھیں اور سننے والے بھی ان کو زیر تشکیل تاریخ پر منطبق کر کے ہی سمجھتے تھے۔ عوام ان کو اسی حیثیت سے لیتے تھے کہ یہ اس تعمیر پسند انقلابی طاقت کی پکار ہے جو ہمارے درمیان ابھری ہے اور قدیم نظام کو چیلنج کر رہی ہے اور اس کی زد ان حریفوں پر پڑ رہی ہے جو انقلابی رو میں مزاحم ہو رہے ہیں۔ ان کو موقع ملتا تھا کہ وہ دونوں طرف کی باتیں سنیں اور فریقین کو تقابل پر رکھ کر جانچیں۔ اس طریقے سے ان کا شعور بنتا چلا گیا۔

دلیل شعور کی روشنی بن سکتی ہے مگر جذبات کو نہیں پکارتی۔ اپیل جذبات کو حرکت دلا کر دعوت میں کچھ گرمی پیدا کر دیتی ہے۔ مگر وہ تاریخ میں عملی معرکہ پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ تنقید ہی کی طاقت ہے جو دلیل اور اپیل کے ساتھ مل کر جب کام کرتی ہے' تو تمدن کے سارے سالمات گردش میں آجاتے ہیں۔ صرف یہی طاقت ہے کہ وقت کے سمندر میں مد و جزر پیدا کر دیتی ہے۔

خلاصہ مدعا یہ کہ اسلامی تحریک نے محمد ﷺ کے واسطے سے دلیل' اپیل اور تنقید کے سہ گانہ عناصر سے کام لیا۔ اور ۲۳ برس تک مسلسل کام لیا۔ انہی سہ گانہ طاقتوں نے حریفوں کو بھی محسوس کرا دیا کہ تم علمی و عقلی لحاظ سے فرو مایہ' استدلال کے لحاظ سے کمزور' اپنے مقاصد کی جذباتی کشش کے لحاظ سے پس ماندہ اور اپنے کردار کے لحاظ سے بہت ادنیٰ سطح پر ہو۔ مخالفین میں مسلم جماعت کی برتری کا اعتراف اور اپنی کمتری کا احساس غیر شعوری طور پر بڑھتا ہی چلا گیا اور دوسری طرف رائے عام بھی فریقین کو ہر پہلو سے جانچ کر ان کا فرق سمجھتی گئی۔ دعوت کی یہ وہ اصل طاقتیں تھیں جنہوں نے عرب کے لاکھوں باشندوں کو مفتوح کر لیا۔ دعوت اگر برحق نہ ہوتی' روحوں کے لیے جاذب نہ ہوتی' اپنے علمبرداروں کو متحرک کر کے رزم خیر و شر میں اتار نہ سکتی' اور دلیل' اپیل اور تنقید کے ذریعے اپنا لوہا منوا نہ لیتی تو مسلم جماعت نہ سیاسی حکمت کے دائرے میں بازی جیت سکتی تھی اور نہ میدان جنگ میں کوئی معرکہ سر کر سکتی تھی۔ ان جزوی میدانوں میں بھی اگر جیت ہوئی تو اس وجہ سے ہوئی کہ رائے عام کے وسیع محاذ پر اسلام کی پیش قدمی بڑی ہی فاتحانہ تھی۔

مسلم کردار کی اخلاقی قوت:

کوئی دعوت بھی اگر صرف لفظی دعوت ہو' اور اس کے ساتھ اخلاقی زور موجود نہ ہو تو وہ کیسی ہی زریں کیوں نہ ہو۔ اور تھوڑی دیر کے لیے دلوں پر کتنا ہی سحر کیوں نہ طاری کر لے' آخر کار دھوئیں کے مرغولوں کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ تاریخ پر الفاظ سے کبھی کوئی اثر نہیں ڈالا جا سکتا۔ اور اکیلی زبان کبھی انقلاب نہیں اٹھا سکتی۔ الفاظ جبھی موثر ہوتے ہیں جب کہ عمل کے بلند کے رو سے ان کے کچھ معنی ہوں۔ زبان کا جادو صابن کے سے خوشنما جھاگ اور رنگین بلبلے پیدا کر سکتا ہے' مگر یہ بلبلے کسی ایک ذرہ خاک کو بھی اس کی جگہ سے ہلا نہیں سکتے اور ساتھ کے ساتھ مٹتے چلے جاتے ہیں۔ دلیل جب کردار کے بغیر آئے' اپیل جب اخلاص سے خالی ہو' اور تنقید جب اخلاقی لحاظ سے کھوکھلی ہو تو انسانیت اس سے متاثر نہیں ہوا کرتی۔ کردار کی اخلاقی طاقت ہی کسی دعوت میں اثر بھرتی ہے -------- عمل کی شہادت کے بغیر زبان کی شہادت بیکار ثابت ہوتی ہے۔ حق یہ ہے کہ "کبر مقتا عندالله ان تقولوا مالا تفعلون"[1]

اسلامی تحریک کی دعوت نری منطقی دعوت نہ تھی اور وہ اکیڈمک طرز کی نظریاتی بحثیں لے کے نہیں آئی تھی ----- وہ سراسر ایک پیغام عمل تھی اور ایک تحریک اقدام! وہ ایک خاص طرز کا انسان بنانے آئی تھی۔ اور وہ انسان اس نے اول روز سے بنانا شروع کر دیا۔ اس انسان کا طرز فکر' اس کے اخلاقی اوصاف

---

[1] اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔ (الصف۔ ۳)

اور اسی کا من موہنا کردار تھا' جو اس کے دلائل کو حقیقی وزن' اس کی اپیلوں کو سچی جاذبیت اور اس کی تنقیدوں کو گہرا اثر دینے والا تھا۔ تحریک اسلامی کا نیا انسان خود ایک محکم دلیل تھا۔ خود سب سے بڑھ کر موثر اپیل تھا اور اس کا سارا وجود پرانے نظام' حیوانی ساخت کے انسان' فاسد جاہلی ماحول' جامد سماج اور اس کی نااہل قیادت پر ایک بھرپور تنقید تھا۔ جاہلیت کے پاس اس زندہ دلیل' اس زندہ اپیل اور اس زندہ تنقید کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کا کوئی توڑ نہ تھا' وہ اس کے مقابلے میں بالکل بے بس تھی۔ وہ نیا انسان کہ جس کا انتہائی معیاری نمونہ سرور عالم ﷺ کی ذات میں دنیا کے سامنے تھا اور جس کے بے شمار پیکر اپنی اپنی سیرتوں کے چراغ اس قمراً منیراً (الفرقان:۶۱) کی شعاعوں سے روشن کر رہے تھے۔ وہ ایک ایسی قطعی اور ٹھوس حقیقت تھا کہ اس سے آنکھیں بند کرنا بھی اس کی نورانیت پر ایک شہادت تھا۔ اس کا انکار کرنے' اسے ٹھکرانے اور اس سے ٹکرانے والے بھی اپنے رویے سے اس کی عظمت کا اعلان کر رہے تھے۔ مکہ میں اس انسان نے اپنی انفرادیت کی شان دکھائی تھی اور مدینہ میں آکر اس نے اپنی اجتماعیت کا جلوہ دکھایا۔

تحریک اسلامی اور محمد ﷺ نے اس نئے انسان کی تعمیر کے اصل کام سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ دوسروں کی اصلاح کرنے کے جذبے میں اسے کبھی فراموش نہیں کیا۔ اور دوسروں پر تنقید کرنے میں گم ہو کر اس کی کمزوریوں پر گرفت کرنے اور اس کی اصلاح کرنے میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیا۔ وہاں دوسروں کی اصلاح سے مقدم اپنی اصلاح تھی۔ دوسروں پر تنقید کرنے سے زیادہ اہم اپنے اوپر تنقید کرنا تھا۔ باہر تبدیلی رونما کرنے سے پہلے اپنے اندر مطلوبہ تغیرات لانا ضروری تھا۔

ایک ایسے معاشرہ کے درمیان جس کی نگاہوں میں کمانے اور کھانے پینے سے زیادہ اونچا کوئی مقصد نہ تھا' جس کی ہر مجلس ایک میکدہ اور ایک قمار خانہ اور رقص گاہ تھی۔ جہاں شجاعت کا استعمال دنگے فساد' قتل' انتقام در انتقام اور لوٹ مار کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اور جہاں تمدن ایک ایسے جنگل میں بدل گیا تھا جس کے کھاروں میں انسانی درندے دھاڑتے رہتے تھے۔ اور شریف اور مسکین لوگ ان کے لیے سستے شکار بنے ہوئے تھے ------ وہاں جناب محمد ﷺ جب انسانیت کے ایک صالح قافلے کو جلو میں لیے ہوئے نمودار ہوئے تو اس کا وجود اول روز سے ماحول میں انتہائی نمایاں تھا۔ لوگ انسانیت کے اس نئے نمونے کو اچنبھے سے دیکھتے اور اسے ہر پہلو سے مختلف اور ممتاز پاتے۔ پھر اس کی پوری نشوونما ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئی اور اس کی تعلیم و تربیت کا سارا کام از اول تا آخر عوام الناس نے خوب اچھی طرح دیکھا۔

خواص اور عوام ہر صبح اور ہر شام دیکھتے تھے کہ کلمہ اسلام کے بعد دیگرے اچھے اچھے افراد کو کھینچتا چلا جاتا ہے۔ یکایک دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ اٹھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس انقلابی تحریک کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہی جو پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دانتوں اور ناخنوں تک کا زور صرف کر کے لڑ رہے ہوتے ہیں' اچانک وہی سرافگندہ ہو جاتے ہیں' جیسے کسی نے ان پر جادو کر دیا ہو۔ پھر جو کوئی بھی کلمہ

حق کو قبول کرتا ہے آناً فاناً اس کے ذہن و کردار میں خوشگوار تبدیلیاں آنے لگتی ہیں۔ اس کی دوستیاں اور دشمنیاں بدل جاتی ہیں۔ اس کی عادات اور اس کے ذوق میں انقلاب آجاتا ہے۔ اس کے مشاغل نیا رنگ اختیار کرلیتے ہیں۔ اس کی پہلی دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں اور نئی دلچسپیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ معاً انتہائی فعال اور سرگرم شخصیت سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک نئی طاقت ابھر آتی ہے۔ اس کی سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اس کے ضمیر کا چراغ پوری لو دینے لگتا ہے۔ اس کا احساس انگڑائی لینے لگتا ہے۔ اس کے تخیل کو نئے بال و پر مل جاتے ہیں۔ اس کے سینے میں حسن خلق کی کلیاں ایک ایک کرکے چٹکنے لگتی ہیں اور ان کی نکہت فضا میں پھیلتی ہے۔ جو شخص کافر سے مسلم بنتا تھا' اس کے اندر سے گویا بالکل ایک دوسرا آدمی نمودار ہو جاتا۔ وہ خود بھی محسوس کرتا کہ میں اپنے ماحول سے کچھ مختلف اور بالکل نئی چیز ہوں اور ماحول بھی دیکھتا کہ وہ اب ویسا نہیں رہا' جیسا پہلے ہوا کرتا تھا۔ قاتل آتے اور انسانی جان کے محافظ بن جاتے۔ چور آتے اور امین بن جاتے۔ زانی آتے اور عفت و حیا کے پیکر بن جاتے۔ ڈاکو آتے اور صلح و آشتی کے معلم بن جاتے۔ کج خلق آتے اور حلیم اور متواضع بن جاتے۔ سود خوار آتے' اور انفاق کرنے والے بن جاتے۔ کند ذہن آتے اور ان کے اندر سے اعلیٰ قابلیتوں کے سوتے ابل پڑتے۔ ادنیٰ سماجی مرتبوں سے اٹھتے اور شرف کی بلندیوں کو چھو لیتے۔ جیسے یہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق بن گئے ہوں۔ جیسے یہ مٹی کے پتلے نہ ہوں' بلکہ کسی دوسرے جوہر سے انہوں نے وجود پایا ہو۔

یہ خدا کے پرستار' رسولؐ کے دیوانے' شمع صداقت کے پروانے' نیکی کے نقیب' بھلائی کے داعی' بدی کے دشمن' ظلم کے مخالف! ------ یہ رکوع و سجدہ میں قرار پانے والے' یہ قرآن پڑھتے ہوئے گریہ بے تاب میں کھو جانے والے' یہ دنوں کو مقصد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والے اور راتوں کو اللہ سے لو لگانے والے' مسکینوں کو کھانا کھلانے والے' مسافروں کی خبر گیری کرنے والے' یتیموں اور بیواؤں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھنے والے' لہو و لعب سے بے تعلق' تعیشات سے مجتنب' فضول بحثوں سے کنارہ کش' سنجیدگی و وقار کے پیکر' شائستگی و سلیقہ کے مجسمے ---- اور یہ محفل ہستی میں اجنبی بن جانے والے لوگ' یہ اپنی ہی بستیوں میں رہ کر غریب الوطن ---- آخر کیسے ممکن تھا کہ سارے عرب کی نگاہیں ان پر مرتکز نہ ہو جاتیں۔

یہ علمبرداران اسلام! جو بغیر کسی لوث کے ایک مشن کی خدمت میں ہمہ تن محو تھے۔ کسی معاوضے کے بغیر تحریک کے ہمہ وقتی کارکن تھے۔ اور دنیا کی بھلائی کے لیے اپنے مفاد کو بالکل بالائے طاق ڈالے ہوئے تھے۔ یہ اپنے مقدس نصب العین کے لیے دماغوں کی کاوشیں' جسموں کی طاقتیں' جیبوں کے مال اور وقت آنے پر اپنی اور اپنے بچوں کی جانیں تک صرف کرنے والے لوگ تھے۔ نہ ان کو معاش کی فکر تھی۔ نہ تن بدن کا ہوش تھا۔ نہ راتوں کی نیند کا خیال' نہ بیوی بچوں میں مگن رہنے کی مہلت' نہ کھیل تماشوں سے دل بہلانے کی فرصت' بلکہ ان کا پیشہ تھا تو وہی' مشغلہ تھا تو وہی' تفریح تھی تو وہی اور ذریعہ آرام و سکون

تھا تو وہی کہ سچائی کا بول بالا ہو۔ انہوں نے ہنستے' مسکراتے مخالفوں کی گالیاں سنیں۔ بہادرانہ شان سے جبر کے وار سہے۔ خوشی خوشی فاقے کاٹے۔ روحانی مسرت کے ساتھ وطن چھوڑے۔ صبر کے موقع پر انتہا درجہ کا صبر دکھایا اور مقابلہ کرنے کا وقت آیا تو مضبوط ہاتھوں سے مقابلہ کیا۔ احد احد کہتے تپتی ریت پر لوٹ گئے۔ وجد آفرین شعر پڑھتے پڑھتے سولیوں پر لٹک گئے۔ گھائل ہو کر گرے تو مائل پرواز روح جھوم کر پکار اٹھی "فزت برب الکعبۃ" رب کعبہ کی قسم! میں تو مراد پا گیا------ یہ کردار ہو اور پھر بھی دنیا سرنگوں نہ ہو جائے۔

اس مسلم کردار نے ہر موقع پر ایسی زریں مثالیں قائم کیں کہ زندگی کی پیشانی ان کے نور سے یوم آخر تک جگمگاتی رہے گی۔ اس کردار کے مربی نے مقتل سے روانہ ہوتے ہوئے اپنے قاتلوں کی امانتوں کی واپسی کا اہتمام کیا۔ اس کردار نے زنا کا جرم سرزد ہو جانے پر بطور خود پیش ہو کر اقرار جرم کیا۔ اور اسلامی عدالت سے باصرار انتہائی سنگین سزائے موت اپنے لیے قبول کی' تاکہ وہ خدا کے حضور میں پاک ہو کر پیش ہو سکے۔ اس کردار کو قبول اسلام کے چند ہی منٹ بعد جب ایک پیکر حسن نے دعوت عیش دی تو اس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اب میں خدا اور رسولؐ کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ ایک جنگی سفر میں قبیلہ ازد سے فوج کا گزر ہوا تو ایک مسلمان سپاہی نے ضرورتاً وہاں سے ایک لوٹا لے لیا۔ لیکن یہ اس مسلم کردار کی شان تھی کہ باز پرس کی اور فوراً لوٹا واپس کر دیا۔ ایسی صدہا مثالیں' نت نئی مثالیں جس انسانی ماحول میں نمودار ہوتی ہوں گی' اس پر تو ہر روز زلزلہ طاری ہوتا ہو گا۔

کیا دنیا ان کا ایثار دیکھ دیکھ کر مبہوت نہ ہوتی ہو گی کہ انصار نے اپنے گھر بار اور مال و منال آدھوں آدھ بانٹ کر مہاجرین کے سامنے رکھ دیئے؟ کیا عوام کے دل اس مساوات کا سماں دیکھ کر کھنچتے نہ ہوں گے کہ ادنیٰ ترین غلام خاندانی ہستیوں کے ساتھ اور غریب طبقوں کے افراد اہل ثروت کے ساتھ اور گھروں سے اجڑ کر آنے والے لوگ مدینہ کے مقامی باشندوں کے ساتھ صف واحد میں کھڑے ہیں۔ ہر ایک کو اہمیت حاصل ہے۔ ہر ایک کی عزت ہوتی ہے۔ ہر ایک کی رائے وزن رکھتی ہے اور ہر ایک کو ذمہ داریاں اٹھانے اور جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ایک برادری ہے جس کے سارے افراد اچھے حالات میں بھی شریک رہتے ہیں اور تکلیف اور مصیبت میں بھی حصہ دار بنتے ہیں۔ ان کے غم مشترک' ان کی مسرتیں مشترک! ان کا سوچنا مشترک اور ان کے اقدام مشترک' بھوک کا دور ہے تو اس میں سب سے بڑا حصہ دار سوسائٹی کا قائد ہے اور خوشحالی کا دور آتا ہے' تو اس میں سب سے کم حصہ وہ اپنے لیے لیتا ہے۔ جاہلی تصورات کے مطابق اونچے اور نیچے خاندانوں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہوں گے۔ رسوم و رواج کی بوجھل بیڑیاں کاٹ کر سادہ معاشرت کا جو نہج نکالا گیا تھا' اس کی طرف طبائع از خود کھنچتی ہوں گی۔ کتنی محبت بھری زندگی تھی۔ کتنی ہلکی پھلکی' کتنی پر امن اور کتنی اطمینان بخش' صحیح معنوں میں "حیات طیبہ"!۔

پھر ماحول دیکھتا ہو گا کہ کیسی کیسی قابلیتیں ان لوگوں میں ابھر رہی ہیں۔ سچائی کے کلمے کی گھٹا جب کبھی کسی مقام پر برس جاتی ہے تو دلوں اور دماغوں کی سرزمین سے ایسی روئیدگی ہوتی ہے کہ بنجر فضاؤں میں گل و لالہ کے تختے آراستہ ہو جاتے ہیں۔ سارا عرب اس جماعت کو دیکھ رہا ہو گا کہ جس میں بعض لوگ علوم میں ترقی کر رہے ہیں' بعض لوگ قانون میں ماہرانہ مقام حاصل کر رہے ہیں' بعض لوگ اچھے زراعت کار اور تاجر بن رہے ہیں' بعض لوگ اعلیٰ درجہ کے کمانڈر ثابت ہو رہے ہیں' بعض لوگ انتظامی مناصب کی ذمہ داریاں اٹھانے کے اہل بن رہے ہیں۔ کچھ سفارت کے فرائض انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ ہر آدمی کے اندر سے ایک نئی شخصیت رونما ہو کر برگ و بار لا رہی ہے۔

اس کردار کی تصویریں قرآن نے کھینچ کھینچ کر بار بار مخالفین کو بھی اور عوام کو بھی یہ احساس دلایا کہ دیکھو انسانیت کا یہ نمونہ جو نظریہ حق کے نور سے بنتا ہے کتنا افضل ہے۔ اور امن و سلامتی کا حصول اگر ممکن ہے تو اسی کے ذریعے ممکن ہے۔ اس کردار کو تحریک اسلامی نے اپنی دعوت کی سچائی کی دلیل بنا کر سامنے رکھا۔ پھر بار بار اس کردار کا تقابل جاہلی کردار سے بھی کیا۔ اہل کتاب کے کردار سے بھی کیا اور منافقین کے کرداروں سے بھی کیا۔ دونوں کو آمنے سامنے رکھ کر دکھایا کہ دیکھو اور خود رائے قائم کرو۔ میدان واقعہ میں تو یہ تقابل از خود ہو ہی رہا تھا۔ اور زندگی کے ہر دائرے میں ہر ہر پہلو سے ہو رہا تھا۔

کشمکش کی حالت بیک وقت دو بڑے اثرات رکھتی ہے۔ کشمکش میں پڑ کر کردار بنتے بھی ہیں اور کشمکش میں پڑ کر ہی کردار تباہ بھی ہوتے ہیں۔ تحریک اسلامی نے پورا پورا اہتمام کیا کہ مسلم کردار کشمکش میں پڑ کر اور نکھرے اور سنورے' اور اچھی طرح پروان چڑھے۔ چنانچہ تلقین اور تربیت اور تزکیہ کے کڑے اہتمام کی وجہ سے مسلم کردار ترقی کرتا چلا گیا۔ اور دوسری طرف جاہلی کردار کشمکش میں پڑ کر مسلسل پستی کی طرف لڑھکتا گیا۔ اور آخر کار بالکل غارت ہو گیا۔ مسلم کردار کو بار بار صبر کا درس دیا گیا۔ اس میں برداشت کی قوت اور اپنے موقف پر جمے رہنے کی صلاحیت پیدا کی گئی۔ کبھی تاکید کی گئی کہ اشتعال میں نہ آؤ' کبھی نصیحت کی گئی کہ فرزندان جہالت سے نہ الجھو' کبھی ہمت بندھائی گئی کہ ڈھیلے نہ پڑو' مایوسی کا شکار نہ ہو' کبھی سکھایا گیا کہ برائی کا جواب بھلائی سے دو۔ اور زیادتیوں پر عفو و درگزر سے کام لو۔ کبھی تعلیم دی گئی کہ کسی گروہ کی دشمنی کے جذبے میں آ کر انصاف کی راہ سے نہ ہٹو۔ کبھی ہدایت دی گئی کہ دنیا پرستوں سے اصلاح کی امید نہ لگاؤ اور ان کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ کبھی ارشاد ہوا کہ مخالفین کی صف میں اہل جاہ و حشمت کو دیکھ کر ان کے ٹھاٹھ باٹھ سے ذرا بھی مرعوب نہ ہو اور کبھی سبق دیا گیا کہ نتائج تک پہنچنے کے لیے عاجلانہ ذہن سے کام نہ لو۔ ان کے ہر نفسیاتی اتار چڑھاؤ پر نگاہ رکھی گئی اور ساتھ ساتھ ان کو فلاح کی راہ سمجھائی جاتی رہی۔ خود سرور کائنات ﷺ نے اپنی جماعت کے ایک ایک فرد پر پوری طرح توجہ کی۔ اور بہترین موقع پر کبھی نصیحت سے' کبھی گرفت سے' کبھی زجر و توبیخ سے کبھی ناراضی سے' کبھی اظہار خوشنودی سے کام لے لے کر مسلم کردار کو نشوونما دی۔ جس میں جیسی صلاحیتیں دیکھیں اور مزاج کی جیسی

ساخت پائی اس کو اسی کی ضروریات کے مطابق مشورے دیے اور جس میں جس نوعیت کی کمزوری دیکھی' اس کے سامنے دین حق کا ویسا ہی اخلاقی تقاضا بیان کیا۔ پھر اجتماعی عمل و اقدام کے دائرے میں مسلم جماعت نے جو کچھ طرز عمل دکھایا' اس پر ہر اہم واقعہ کے بعد کڑی تنقید کی۔ بدر و احد کے معرکے ہوں۔ یا صلح حدیبیہ کا معاملہ۔ تحویل قبلہ ہو یا واقعہ افک' ہر اہم تاریخی واقعے کے بعد ایک طرف مخالفین کا طرز عمل عوام کے سامنے رکھ دیا۔ اور دوسری طرف اپنی جماعت کا بے لاگ محاسبہ کر کے ساری کمزوریاں سرعام واضح کیں۔ اور ان کے انسداد کے لیے تدابیر بتائیں۔ دشمن کے حق میں اگر اپنے رفقاء کوئی غلط اقدام کر بیٹھے تو اس پر پردہ ڈالنے اور اسے صحیح ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی' بلکہ دشمن کے سامنے غلطی کا اعتراف کیا۔ کوئی جان سہواً لی گئی تو اس کا خون بہا ادا کیا۔ واقعہ نخلہ کے سلسلہ میں اپنے رفقاء پر گرفت کی۔ حضرت خالدؓ نے کلمہ پکارنے والوں کو غیر مخلص سمجھ کر سہواً قتل کر دیا تو ان کے فعل سے بیعت اور بیزاری کا اظہار کیا۔ صورت واقعہ یہ نہ تھی کہ مسلم کردار (باستثنائے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم) معصوم عن الخطا تھا اور کسی سے کوئی سہو یا لغزش نہ ہوتی تھی۔ نہ اسے اس حیثیت سے پیش ہی کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ اپنی مجموعی ساخت کے اعتبار سے پاکیزہ تھا۔ اور اس میں قبول اصلاح کی استعداد اور نشوونما کی صلاحیت تھی۔ وہ بہ حیثیت ایک کل کے جاہلی کردار سے بیّن طور پر فائق و افضل تھا۔ اور برابر پیش قدمی کر رہا تھا۔

کسی جمی جمائی قیادت اور بنے بنائے ماحول کا مقابلہ کرنا کوئی کھیل نہیں ہوتا۔ یہ کام لمبے کام ہوتے ہیں ان میں بڑی مار کھانی پڑتی ہے اور بڑے ٹھنڈے جوش سے ان معرکوں کو سر کیا جا سکتا ہے۔ ماحول کی قوت آگے بڑھنے والوں کو کمر سے پکڑ پکڑ کر برابر کھینچتی رہتی ہے۔ اصلاح کرنے والوں کو از سر نو بگاڑ دینا چاہتی ہے۔ ان کے دلوں میں نفوذ کے لیے رخنے تلاش کر کر کے کوشاں رہتی ہے کہ اپنے سے عقیدوں' اپنی سی رسموں اور اپنی سی عادات کو کسی طرح پھر ان میں گھسا دے اور کوئی راہ ذہنی مصالحت کی نکال کر پیش قدمی کرے۔ ناسازگار حالات میں بھی کشمکش جب قوتوں کو مضمحل کر دیتی ہے اور ہمتوں کو تھکا دیتی ہے تو بڑے بڑے مخلص لوگوں کے قدم پیچھے کھسکنے لگتے ہیں۔ آدمی کچھ انقلابی قدروں کو چھوڑ کر پرانی قدروں کو قبول کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اصول و اعتقاد میں نہ سہی ثقافتی آداب و اطوار' رہن سہن' وضع قطع میں بیرونی اثرات قبول کرنے پر تیار ہوتا ہے۔ بس اتنا سا راستہ کھل جائے تو پھر ماحول اسے آہستہ آہستہ فراخ کرتا چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر اپنے سارے لوازم اندر گھسا لے جاتا ہے ---- تکمیل کار ایک نسل کے دور میں نہ سہی اگلی نسل کے عہد میں سہی' مگر تحریک اسلامی نے مسلم کردار کو تعمیر کرتے ہوئے اس خطرے کا پورا پورا لحاظ رکھا۔ اسے بہت ہی آہنی ساخت دی۔ اور تحفظ کی پوری تدابیر اختیار کیں۔ ایک طرف تو اسے اشدآء علی الکفار (الفتح۔۲۹) یعنی مخالفوں کے مقابلے میں ایک مضبوط چٹان بنانے کے لیے "رحمآء بینھم" (الفتح ۲۹) ہونے کا درس دیا۔ اور دوسری طرف غیروں کی تقلید' غیروں سے مرعوبیت' غیروں سے رازدارانہ تعلقات اور بے تکلفانہ قرابت رکھنے سے بالکل روک دیا۔ یہی ذہنی استحکام جماعت میں پیدا

کرنے کے لیے نومسلموں کو حکم تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ میں آجائیں۔ اور اگر کسی جگہ معتدبہ افراد یکجا ہوتے اور ان سے "بیعت اعرابی" (یعنی ایسی جس سے ہجرت واجب نہ ہو) لی جاتی تو ان کو بھی یہ تاکید ضرور تھی کہ "فارقوا المشرکین" یعنی اہل شرک سے برادری' دوستی' شادی بیاہ کے تعلقات نہ رکھو بلکہ اپنی سوسائٹی الگ اٹھاؤ۔ غیر مسلم والدین کی اطاعت کی تاکید کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کڑا حکم بھی دیا گیا کہ اسلام سے انحراف کے لیے کہیں تو "فلا تطعهما" اسلام کے خلاف کسی کی کوئی اطاعت نہیں کی جاتی۔ اس کردار کی شان یہ تھی کہ وہ نہ ایران کی پر شکوہ تہذیب سے متاثر ہوا اور نہ روم کے ٹھاٹھ دار تمدن کے سامنے اس کا دل پسیجا۔ وہ بڑے بڑے درباروں میں اپنی بدویانہ شان کے ساتھ قالینوں کو روندتا ہوا بغیر اپنی گردن جھکائے پہنچا۔ اور کہنے کی بات اس طرح کہی جیسے وہ بونوں کے درمیان کھڑا بات کر رہا ہو' اس کردار کو جب ذہنی لحاظ سے اتنا مستحکم بنا دیا گیا اور ہر قسم کے احساس کمتری سے اسے بالاتر کر دیا گیا تو پھر اسے حریفوں نے میدان جنگ میں بھی پکارا تو اس نے شجاعت و استقامت کی زندہ جاوید نظیریں قائم کر دیں۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ کردار قلت تعداد اور کوتاہی اسباب کے باوجود نرم چارہ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے آویزش لوہے کے چنے چبانے کے ہم معنی ہے۔

اس مسلم کردار کے بے شمار کٹر مخالفین ہوں گے۔ جو اس کا طنز و استہزاء کرتے ہوئے دل ہی دل میں محسوس کرتے ہوں گے کہ یہ ہم سے ہزار درجہ افضل اور برتر ہے۔ بے شمار حریف ظاہراً مخالفت کرنے کے باوجود باطن میں رشک کرتے ہوں گے کہ کاش کہ ہم بھی اس برادری میں شامل ہوتے۔ اس کردار کو گالیاں دینے والے' اس کی ہجو کرنے والے اور اس کے خلاف پراپیگنڈا کرنے والے' کبھی کبھی لمحہ فکریہ میں پڑ کر اپنے آپ سے کہتے ہوں گے' کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں' اور اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ چنانچہ بے شمار مواقع پر مخالفین نے زبانوں سے بھی اپنا دلی اعتراف بیان کر دیا۔ معرکہ احد کے خاتمہ پر جب پہاڑی پر کھڑے ہو کر ابو سفیان نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ کیا محمد (ﷺ) قتل ہو گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ کہ "بخدا وہ زندہ ہیں اور تمہاری بات سن رہے ہیں"۔ تو ابو سفیان نے کہا کہ اگرچہ ابن قمیئہ کہتا ہے کہ میں نے محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا مگر ہم تم کو اس سے زیادہ سچا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح معاہدہ حدیبیہ سے قبل عروہ بن مسعود سفیر قریش نے مسلم جماعت کا جو منظر دیکھا' اسے جن لفظوں میں اکابر قریش سے بیان کیا' وہ اس تاثر کے گواہ ہیں جو اغیار پر برابر پڑ رہا تھا۔ اس طرح قیصر کے دربار میں ابو سفیان نے جو بیان اسلام کا مخالف ہونے کے باوجود حضورؐ اور آپؐ کی تحریک کے بارے میں دیا' وہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ دشمنی کرنے والے بھی محمد (ﷺ) اور اسلام کی عظمت کا اعتراف رکھتے تھے۔ مدینہ کا تحصیل دار خیبر کے یہودیوں سے وصولی کرنے جاتا ہے تو اس کی تقسیم کی صحت دیکھ کر وہ گواہی دیتے ہیں کہ یہی عدل ہے جس پر آسمان و زمین قائم ہیں۔

آئے دن عرب کے کونے کونے میں نوخیز مسلم سوسائٹی کے انوکھے احوال کے چرچے ہوتے ہوں گے۔

اس کے افراد کے تذکرے رہتے ہوں گے۔ لوگوں کی نگاہیں مدینہ پر لگی رہتی ہوں گی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہوں گے کہ آج تاریخ میں نیا مدو جزر کیا واقع ہوا۔ مسافروں اور قافلوں کے ذریعہ روز مرہ احوال کی اطلاعات دور دور تک پھیلتی ہوں گی۔ اور لوگ ہر آیندو روند سے دریافت کرتے ہوں گے کہ "کوئی نئی بات سناؤ"۔ گویا مدینہ کی ہربات میں حد درجہ کی "خبریت" (News Value) پیدا ہو گئی ہو گی۔ جہاں دو آدمی اکٹھے ہوتے ہوں گے' محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) اور مسلم سوسائٹی اور اسلامی تحریک اور مدینہ کی حکومت گفتگو کے اولین موضوع ہوتے ہوں گے۔ عورتیں مل بیٹھتی ہوں گی۔تو مدینہ کے بارے میں طرح طرح کی افواہوں کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتی ہوں گی۔ ماں باپ کو خوش کرنے' بہلانے اور ڈرانے کے لیے نوجوان نہ جانے مدینہ کے واقعات سے کیا کیا مواد لیتے ہوں گے۔ ہوا کا ہر جھونکا اسی مسلم کردار کی خوشبو لیے لیے نخلستانوں اور صحراؤں اور چشمہ گاہوں سے گزرتا ہو گا۔

اسلامی تحریک کی یہ اخلاقی قوت ہی اس کی دلیل اور اپیل کو موثر اور نتیجہ خیز بنانے والی تھی۔ اور یہ مسلم کردار کی عظمت کا اعتراف تھا' جس نے لاکھوں دلوں کو مسخر کر دیا---- یہاں ہم چند مثالیں بیان کریں گے کہ کس طرح اسلام کا مقناطیس ہر چہار جانب سے بکھرے ہوئے ذرات انسانیت کو اپنی طرف کھینچتا چلا گیا۔

پہلے مکہ کے دور کو لیجیے۔ مشہور شاعر طفیل دوسی آتا ہے اور قریش اسے حضورؐ سے ملنے سے باز رکھتے ہیں۔ آخر وہ خود حاضر ہوتا ہے۔ اور قرآن کی چند آیات سن کر محض ان کے اثر سے اسلام قبول کر لیتا ہے۔ عمروؓ بن عبسہ حضورؐ کا چرچا سن کے آتے ہیں اور اسلام دل میں جگہ پالیتا ہے۔ حضورؐ کے بچپن کے ساتھی ضماد بن ثعلبہ ناصح اور چارہ گر بن کے آتے ہیں' مگر زبان مبارک سے خدا کی حمد کے چند بول سن کر ہی مفتوح ہو جاتے ہیں۔ ایک صحرائی قبیلہ جس کا پیشہ ڈاکہ زنی ہے' اس کا ایک نوجوان ابوذرؓ اسلام کا چرچا سن کے آتا ہے' اور مخالف ماحول سے بچ بچ کر حضورؐ تک پہنچتا ہے۔ دعوت سنتا ہے اور تحریک حق کو اپنا دل دے بیٹھتا ہے۔ اس میں یکایک ایک جذبہ اٹھتا ہے اور وہ حرم میں جا جا کر کلمہ حق کا اعلان کرتا ہے۔ اور پھر اس جرم عشق کی تعزیر کا مزہ چکھتا ہے۔ پھر جو جو شخص تحریک اسلامی کے حلقہ میں داخل ہوتا گیا' وہ اپنے اپنے دائرہ اثر میں خود ایک داعی بنتا گیا۔ بعض کے اثر سے قبیلے کے قبیلے اسلام کو قبول کرتے گئے۔ سوید بن صامت حضورؐ سے ملاقات کرتا ہے اور گہرا اثر لے کے جاتا ہے۔ ایاس بن معاذ مدینہ سے آکر حضورؐ کی دعوت کا قائل ہو جاتا ہے اور پھر مدینہ میں نظام حق کی طلب پیدا کرتا ہے۔ نجران سے ۲۰ عیسائیوں کا وفد آکر حضورؐ سے اسلام کے پیغام کا شعور حاصل کرتا ہے۔ اور باوجودیکہ قریش ان کو ورغلاتے ہیں' یہ لوگ حق کی روشنی کو سینوں میں جذب کر کے رخصت ہوتے ہیں۔ مہاجرین حبشہ سے یمن کے لوگ متاثر ہو کر اسلام کو سینوں میں جگہ دیتے ہیں اور انہی کے ذریعہ شاہ نجاشی کا دل ایمان سے منور ہو جاتا ہے۔

مدینہ میں اوس اور خزرج کے لوگ تو حضورؐ کی آمد سے پہلے ہی تیزی سے اسلام میں آ رہے تھے اور حضورؐ کے ہجرت کر کے آجانے کے بعد تو کوئی گھر خالی نہ رہا جس میں اسلام کی روشنی نہ جا پہنچی ہو۔ حیرت ناک یہ تھا کہ یہود کا ایک عالم عبداللہ بن سلام حضورؐ کے ایک سادہ سے خطاب "یا یھا الناس افشوا السلام و اطعموا الطعام و صلوا الارحام و صلوا باللیل و الناس نیام" [1] کو سن کر قریب آ جاتا ہے۔ اور تھوڑے سے غور و فکر کے بعد فیصلہ کر کے سرور عالمؐ کی خدمت میں شہادت حق ادا کرتا ہے۔ اسی طرح عیسائیوں میں سے ایک نامور راہب و عالم ابو قیس صرمہ بن ابی انس تحریک اسلامی کی پکار پر لبیک کہتا ہے۔ جبیر بن مطعم بدر کے قیدیوں کو چھڑانے آئے تھے' اور حضورؐ کی زبان سے چند آیات کو توجہ سے سننے کا موقعہ ملا۔ حقیقت ایسی منکشف ہوئی کہ انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے دل پرواز کر گیا ہے۔ قریش کے غلام ابو رافع مکہ کی طرف سے سفیر بن کر مدینہ آئے تو سینہ اسلام کے لیے کھل گیا۔ واپس جانے پر تیار نہ تھے۔ حضورؐ نے سمجھایا کہ سفیر کو روکا نہیں جا سکتا۔ تم واپس جاؤ اور پھر اسلام کی کشش ادھر کھینچے تو مدینہ آ جاؤ۔ چنانچہ وہ مکہ گئے اور واپس آ کر اسلامی جماعت میں شریک ہو گئے۔ بنو قریظہ کے خلاف ان کے جرائم کی سزا دینے کے لیے چڑھائی ہوتی ہے' تو اس عالم میں ان کا ایک فرد عمرو بن سعد اسلام قبول کرتا ہے۔

ثمامہ بن اثال حنفی رئیس یمامہ قید ہو کر آتا ہے اور حضورؐ کے طرز عمل سے متاثر ہو کر اسلامی جماعت کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ غزوہ احد برپا ہے۔ کہ عمرو بن ثابت اصیرم (بنی عبدالاشہل) عین اسی لمحے حق کے سامنے سر تسلیم خم کر کے سیدھے معرکہ کار زار میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اور شہادت سے فائز ہوتے ہیں۔ معرکہ خندق کے کٹھن حالات میں نعیم بن مسعود تحریک اسلامی کے قدموں میں آ گرتے ہیں' ابوالعاص' مدینہ آتے ہیں' تو بالکل غیر متوقع طور پر اسلام کا اعلان کرتے ہیں۔ خیبر کے یہود کو جنگی تیاریاں کرتے دیکھ کر ان کا ایک چرواہا اسود معلوم کرتا ہے کہ کس سے جنگ ہے اور کیوں؟ پھر جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تیاریاں ہیں۔ جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے' تو وہ جذبہ بیتاب لیے حاضر ہوتا ہے۔ اور حقیقت معلوم کرتا ہے۔ اور پھر مفتوح ہو جاتا ہے۔ حضرت خالد اور عمرو بن عاص جیسے ممتاز افراد (صلح حدیبیہ اور جنگ موتہ کے درمیان) یکایک قریش سے ٹوٹ کر اسلامی ریاست کے ساتھ آ ملتے ہیں۔ جاہلیت کے محاذ سے لڑتے لڑتے اندر سے دل اکتا چکے تھے' سو یکایک ان کو تحریک اسلامی نے کھینچ لیا۔ فضالہ فتح مکہ کے موقع پر اور شیبہ بن ابی طلحہ معرکہ حنین کے موقع پر حضورؐ کے قتل کے ارادے کر کے پہنچے' مگر خود ہی تیغ حق سے گھائل ہو گئے۔ وفد ہوازن و بنو سعد کے آنے پر حضورؐ نے مالک بن عوف کو یاد کیا اور خواہش کی کہ وہ اسلام لائیں۔ پیغام پہنچنے پر مالک بن عوف ثقیف سے چھپ کر

---

[1] اے لوگو! سلام (کہنے کے طریقے) کو پھیلاؤ اور (ضرورت مندوں کو) کھانا کھلایا کرو۔ اور قرابت داروں سے حسن سلوک کرو۔ اور راتوں کو نماز (نفل) پڑھو' جب کہ دوسرے لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔

اگلے ہی دن حاضر ہو گئے اور اسلامی محاذ پر آ گئے۔ قبیلہ طے پر اسلامی دستہ نے فتح پائی تو حاتم کی بیٹی قیدیوں میں مدینہ لائی گئی۔ اس نے حضورؐ سے حسن سلوک کی درخواست کی۔ جسے قبول فرما کر آپؐ نے اسے سواری کا انتظام کر کے واپس بھجوایا۔ اس نے اپنے بھائی عدی بن حاتم کو جس کے دل میں اسلام کے خلاف غصہ کی آگ مشتعل تھی' سارا حال سنایا اور مدینہ حاضر ہونے کی تلقین کی۔ عدی آیا اور آ کر بچشم خود حالات کا پورا جائزہ لے کر جب محسوس کر لیا کہ حضورؐ خدا کے سچے نبی ہیں تو حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ کعب بن زہیر جس نے حضورؐ اور اسلامی تحریک کے خلاف شاعری کا محاذ کھول رکھا تھا' از خود مدینہ آیا اور عرض کیا کہ تائب ہو کر مسلمان ہوا ہوں' امان دیجئے۔ امان مل گئی۔ پھر اس نے وہ قصیدہ (بانت سعاد) پڑھا جو تاریخی حیثیت اختیار کر گیا۔ عبداللہ ذوالبجادین کو دیکھئے کہ یہ بھولا بھالا نوجوان مدینہ سے چلنے والی نسیم کے جھونکوں سے متاثر ہو جاتا ہے مگر چچا کے ڈر سے اپنے ارمان کو سینے میں کچھ عرصہ دبائے رکھتا ہے۔ چچا سے مایوسی ہو جاتی ہے تو چچا' اس کے مال و جاہ' اس کے دیئے ہوئے لباس اور گھر کے ماحول کو سلام وداع کہہ کر کمبل پوش بنا ہوا مدینہ پہنچتا ہے اور زندگی اسلامی تحریک کے حوالے کر دیتا ہے۔ بحرین کے قبیلہ عبدالقیس کے ایک تاجر منقذ بن حبان کاروباری سفر پر نکلے۔ مدینہ راستے میں پڑتا تھا۔ وہاں کچھ وقت کے لیے ٹھہرے۔ حضورؐ کے پیش نظر یہ نقشہ کار تو رہتا ہی تھا کہ بیرون حجاز کے علاقوں سے رابطہ بڑھانے کے ذرائع پیدا ہوں اور کام کے آدمی وہاں بھی تحریک کو حاصل ہوں۔ اس لیے اطلاع ملتے ہی خود تشریف لے گئے۔ دعوت پیش کی اور منقذ نے قبول کی۔ گھر گئے تو بحث و تحمیص کے بعد ان کے والد بھی حلقہ اسلامی میں آ گئے۔ بعد میں قبیلہ کے عام لوگوں نے بھی ان کی مساعی سے اسلام اختیار کیا۔ متعدد لوگوں نے بادشاہتیں' سیادتیں اور عہدے چھوڑ کر اپنے آپ کو خدا کی عبودیت کے مقام پر لا کھڑا کیا۔

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دعوت حق کی کھیتی کس طرح اگ رہی تھی۔ آج یہاں بیج پھوٹا' کل وہاں سے تخم اخلاص نے کونپل نکالی۔ صبح ادھر کوئی کلی چٹک گئی۔ شام ادھر کسی اکھوے نے آنکھ کھولی۔ جیسے شام کو آسمان پر تارے جگمگاتے ہیں۔ پہلے ایک پھر دو چار پھر دس بیس' پھر سو پچاس' پھر ہزاروں لاکھوں بلکہ ان گنت' گویا ریت کے ذرے خواب جمود سے ایک ایک کر کے چونک رہے تھے۔ ایک نے انگڑائی لی۔ دوسرے نے سر اٹھایا۔ تیسرے نے حرکت کا آغاز کیا' چوتھے نے آنکھ کھولی۔ اور پھر جیسے وہ کرنوں کے پر لگا کے اڑنے لگے۔ اڑ کر باہم گلے مل گئے۔ اور ان سے ایک نئی دنیا وجود میں آ گئی۔

ہم قبول اسلام کی تیز رفتار عوامی رو کا ذکر تو پھر بعد میں کریں گے جو ایک خاص مرحلہ آنے پر چلی اور لوگ جوق در جوق خود آگے بڑھ بڑھ کر تحریک کے دھارے پر بہتے چلے گئے۔ یہاں ہم صرف ان خواص کا ذکر کر رہے ہیں جو اپنے اپنے حلقوں میں پیش رو نکلے۔ ایسے لوگوں میں جب کوئی ایک بھی مسلم بن جاتا تو پھر وہ اپنے قبیلے اور اپنے علاقے میں خود ایک داعی و معلم بھی ہوتا۔ اس کی ذات میں تحریک کا ایک مقامی مرکز کھل جاتا۔ وہ اپنے قول اور اپنے کردار سے کتنے ہی دوسرے ساتھیوں کو ـــــ بسا اوقات پورے کے

پورے قبیلوں کو ---- اسلام کی بارگاہ میں لا پیش کرتا۔ علاوہ ازیں خود مدینہ کے مرکز دعوت کی سرگرمیاں بھی اور اس کے علاقائی کارکنوں کی کوششیں بھی بے شمار ایسے آدمی پیدا کرتی جاتیں جو اگرچہ براہ راست اسلامی تحریک کے حلقہ میں فوراً شامل نہ ہوتے لیکن اس کے ساتھ ہمدردی اور حمایت کا رویہ اختیار کر لیتے۔ اور ایسے لوگوں کی ہمدردیاں اور حمایتیں بھی اپنی جگہ بڑا کام کرتیں۔ ایسے حامیان تحریک غیروں اور مخالفوں میں بھی بیٹھ کر بات کر سکتے تھے اور ان کی بات سننے میں کسی طرح کا تعصب حائل نہ ہوتا۔ ایسے لوگ قریش مکہ کے درمیان بھی بکثرت تھے۔ یہود میں بھی تھے اور بدوی قبائل میں بھی ایسے ہی افراد تھے جنہوں نے صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کو معاہدہ کرنے کے لیے تیار کیا۔ ایسی ہی ایک شخصیت تھی جس نے جنگ احد کے بعد ابو سفیان کو پلٹ کر مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کرنے سے روکا۔ ایسی ہی ایک شخصیت وہ بھی تھی جس نے حضورؐ کے زمانہ نظر بندی میں شعب ابی طالب کو جانے والے غلہ کو رکوانے کی مخالفت کی۔ اور ایسی ہی شخصیتیں تھیں جنہوں نے سرے سے بائیکاٹ کے اس ناپاک معاہدے کو ختم کرایا' جو حضورؐ کے خاندان کے خلاف باندھا گیا تھا۔ ایسی ہی ایک شخصیت مخیریق یہودی کی بھی تھی۔ جس نے یہودی ہوتے ہوئے اپنی جان تحریک اسلامی میں لگا دی۔ اور دوسرے یہودیوں کو بھی احساس دلانے کی کوشش کی۔ غرضیکہ اسلام لانے والی تعداد کے ارد گرد ایک بڑا حلقہ ایسے حمائتیوں کا بھی ہر جگہ بنتا گیا۔ اور وہ بھی تحریک کے فروغ کے ساتھ وسیع تر ہوتا گیا۔ اس عنصر کا بھی اسلام کے لیے راستے ہموار کرنے میں بہرحال حصہ رہا ہے اور اس میں سے بیشتر لوگ بعد میں داخل اسلام ہونے کی سعادت سے بہرہ مند بھی ہوئے۔ غرضیکہ اسلامی انقلاب کے نقیبوں کا ایک جال سا سارے عرب میں از خود پھیلتا گیا۔ مدینہ ان سب کے لیے مرکز تحریک تھا جس سے قوت حاصل کر کے ہر طرف پھیلے ہوئے حق پرست کلمۂ اسلام کی برقی رو اپنے اپنے ماحول میں دوڑا رہے تھے۔ مدینہ گویا دھڑکتا ہوا دل تھا' جس سے افکار و جذبات خون کی موجوں کی طرح عرب کے کونے کونے میں پہنچ رہے تھے۔ وہ ایک سورج تھا اور اس کے گرد دور دور تک پھیلے ہوئے اجرام روشنی حاصل کر کر کے فضاؤں کو منور کر رہے تھے۔

یہاں ہم سرسری طور پر ایسی چند مثالیں بیان کرتے ہیں' جن سے اندازہ ہو گا کہ ایک یا چند افراد نے کس طرح پورے پورے قبیلوں یا علاقوں کو متاثر کر لیا۔ ایک مثال تو خود مدینہ ہی کی تھی۔ اور شاید سب سے بڑی اور شاندار مثال ہے۔ کہ ایک نوجوان سوید بن صامت مکہ جا کر رسول خدا ﷺ سے کلمہ اسلام کی روشنی حاصل کرتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ بہت سی تعداد متاثر ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مدینہ اسلامی تحریک کا مرکز بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ طفیل دوسی اپنے مزاج کی وجہ سے اگرچہ قبیلہ کو جلد متاثر نہ کر سکے' لیکن ان کی وجہ سے یمن میں تحریک اسلامی کا تعارف ہو گیا۔ اور مہاجرین حبشہ سے متاثر ہو کر قبیلہ اشعر نے کسی خارجی تحریک کے بغیر اپنے آپ کو اسلام کے محاذ پر پیش کر دیا۔ ضماد بن ثعلبہ کی دعوت سے پورا قبیلہ ازد شنوہ حلقہ اسلام میں آ گیا۔ حضرت ابوذر غفاری اسلامی نظریہ انقلاب کی روح سے سرشار ہو

کر مکہ سے لوٹے تو ان کی دعوت سے ان کا آدھا قبیلہ نظام حق کا علمبردار بن گیا۔ اور بقیہ آدھا حضورؐ کے مدینہ جانے پر مسلمان ہوا۔ پھر اسی قبیلہ غفار کے اثر سے قبیلہ اسلم میں بھی اسلام نے نفوذ کیا۔ اور آہستہ آہستہ یہ پورا قبیلہ بھی جاہلیت سے کٹ کر اسلامی انقلاب کا علمبردار بن گیا۔ منقذ بن حبان مدینہ سے صداقت کا نور جذب کر کے اپنے وطن بحرین پہنچے تو دعوت حق کا کام شروع کر دیا اور لوگ متاثر ہونے لگے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد یہ ۱۴ مسلم رفیقوں کا وفد لے کر مدینہ حاضر ہوئے۔ غرضیکہ بات وہی انجیل کی سامنے آتی ہے کہ خدا کی بادشاہت (دعوت حق) کی مثال خمیر کی سی ہے کہ ایک عورت نے ذرا سا خمیر آٹے میں ملا دیا اور وہ سارے کا سارا خمیر ہو گیا۔

جہاں کہیں اسلام پہنچتا اور مناسب تعداد متاثر ہوتی' وہاں لازماً مسجد کی بناء ڈالی جاتی۔ مسجد صرف ایک عبادت گاہ ہی کی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ بلکہ وہ اسلام کا تمدنی مرکز ہوتی تھی۔ اور بہ یک وقت تعلیم گاہ' دارالمشورہ' سماجی اجتماع گاہ اور مہمان خانہ کا کام بھی دیتی تھی۔ مسجد درحقیقت اسلامی تحریک کی ایک مرئی علامت (Symbol) ہوتی تھی اور علاقہ بھر میں مسجد کا وجود اس امر کا اعلان ہوتا تھا کہ یہاں اسلام پہنچ چکا ہے۔ اسی لیے حضورؐ ایک طرف تو مسلم قبائل کو ہدایت دیتے تھے۔ کہ وہ مسجدیں بنائیں۔ اور دوسری طرف فوج کو حکم تھا' کہ جہاں کہیں مسجد دکھائی دے اور جس بستی سے اذان کی پکار گونجے وہاں تلوار کبھی حرکت میں نہ لائی جائے۔ یہ گویا مزید ترغیب تھی تعمیر مساجد کی۔ لوگ اپنے نئے انقلابی مسلک کا اعلان و اظہار کرنے کی ایک مناسب شکل یہی پاتے تھے کہ بستی میں مسجد بنائیں۔ اس سے اذان کے پیرائے میں تحریک اسلامی کے عقیدوں کا اعلان کریں۔ اور اس میں نظام نماز قائم کر کے اجتماعیت سے بہرہ مند ہوں۔ حضورؐ کی ترغیب کا نتیجہ تھا کہ خود مدینہ میں آپؐ کے عین حیات میں نو مسجدیں تعمیر ہو گئیں تھیں۔ ایک مسجد اوائل ہی میں بحرین میں بھی موجود تھی۔ اور مسجد نبویؐ کے علاوہ پہلا جمعہ اسی مسجد میں ادا ہوا۔ مساجد جہاں عوامی ادارات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہاں انہیں سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوتی تھی۔ مدینہ سے جن حضرات کو کسی علاقہ یا بستی میں سول افسر بنا کر بھیجا گیا' وہی وہاں کی مسجد کے امام صلوٰۃ بھی ہوتے تھے۔ جو قبائل مدینہ کے ایڈمنسٹریشن سے باہر ہوتے ان کی مسلم آبادی امام کے تقرر کے لیے حضورؐ سے مشورہ لیتی۔ اور پھر حضورؐ کے بتائے ہوئے معیار پر خود کسی آدمی کا انتخاب کر لیتی۔ بہت سی مسجدیں ان تمام تاریخی مقامات پر تعمیر ہوئی تھیں جہاں حضورؐ نے کسی غزوہ یا سفر میں قیام کیا یا نماز ادا فرمائی۔ یا کوئی اہم واقعہ رونما ہوا۔

معاہدانہ روابط:

عوام میں دعوت و تعلیم کا جو وسیع کام مذکورہ بالا براہ راست طریق پر ہوا' اس کے ساتھ جو دوسرے بڑے بڑے اقدامات موثر حد تک محمد ہوئے' ان میں سے ایک مدینہ کے سیاسی اثرات کی توسیع کا کام تھا۔

جو بیشتر معاہدات اور حلیفانہ تعلقات کے ذریعے عمل میں آیا۔ معاہدانہ رابطے کے ذریعے حضورؐ کا حکومت کے دائرہ اثر کو وسیع کرنا اور اس معاملے میں غیر معمولی حد تک توجہ دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ جنگ و جدل سے انتہائی ممکن حد تک بچ کے نکلنا چاہتے تھے اور امن و آشتی کی فضا چاروں طرف قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ ایسی پر سکون فضا میں دعوت حق کا ٹھنڈا کام بخوبی ہو سکے۔ اور جنگی جذبات بیچ میں حائل نہ ہوں۔ جنگی کارروائیاں جہاں کہیں بقائے ریاست' بقائے امن یا بقائے اسلام کے لیے ناگزیر ضرورت بن گئیں' وہاں تو آپؐ نے کسی درجے کی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا۔ لیکن اگر جنگ سے بچ کے نکلا جا سکتا ہو اور ریاست کا سیاسی تحفظ و استحکام اور دعوت کے لیے کھلا میدان امن و آشتی سے حاصل کرنا ممکن ہو تو پھر آپؐ نے لازماً صلح و آشتی کا راستہ اختیار کیا۔ خود ریاست کا وجود تلوار کے زور سے نہیں' بلکہ دستوری معاہدے کے بل پر قائم ہوا۔ اور پھر اس کے تحفظ کے لیے اور اس کے اثرات کی توسیع کے لیے آپؐ نے حلیفانہ روابط کو اتنے بڑے پیمانے پر ذریعہ بنایا کہ جنگی کارروائیاں ان کے مقابلے میں بالکل ہلکا تناسب رکھتی تھیں۔

معاہدات استوار کرنا اور حلیفانہ تعلقات قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ خصوصاً جب کہ مذہبی اختلافات موجود ہوں۔ سیاسی تعصبات پیدا ہو جائیں۔ درمیان میں کھلی کھلی مخالف طاقتیں مداخلت کر رہی ہوں۔ اور معاملہ بالعموم ایسے قبائل اور عناصر سے ہو جو سابق تعلقات نہ رکھنے کی وجہ سے بالکل اجنبی ہوں۔ اس کام کے لیے بڑی سیاسی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مخاطب کے حالات اور رجحانات کو دیکھنا' قوت کو بھانپنا' اس توازن قوت کو سمجھنا جو کسی خاص لمحے مختلف اجزائے معاشرہ کے درمیان کار فرما ہو۔ مخالف طاقتوں کے اثرات کا مطالعہ کرنا۔ شرائط کی وہ خاص درمیانی لکیر تلاش کر لینا جہاں تک کسی قبیلے یا عنصر کو لایا جا سکتا ہو۔ اور پھر نفسیاتی لحاظ سے گفت و شنید میں اثر پیدا کرنا ------ ایسے بے شمار لوازم پورے کرنے پڑتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ محسن انسانیت ﷺ نے اس دائرہ کار میں جس درجے کی سیاسی بصیرت اور قائدانہ مہارت اور ڈپلومیٹک قابلیت کا نمونہ پیش کیا ہے' اس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔ اور اس وجہ سے نہیں مل سکتی کہ حضورؐ نے اتنے وسیع تعلقات مختلف حالات میں پیدا کرتے ہوئے کسی بھی موقع پر نظریہ حق' اپنے اخلاقی اصولوں اور اپنے سیاسی مرتبے کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچنے دیا۔ ورنہ ڈپلومیٹک دائرے میں جس بری طرح سے اصول اخلاق کا قتل عام ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے لفظ "ڈپلومیسی" بدنام ہو کر رہ گیا۔ خود سیاست آج ایک مکروہ مشغلہ اسی لیے بن کر رہ گئی ہے کہ سیاست کا کوئی اخلاق نہیں ہوتا اور یہ ایک ایسا ٹینک ہے کہ جدھر کو حرکت کرتا ہے' انسانیت کی قیمتی قدروں کو روندتا چلا جاتا ہے۔ مگر حضورؐ نے ڈپلومیسی اور سیاست کا بالکل مفہوم بدل کے رکھ دیا۔ اور ان کاموں کو نہ صرف آلائشوں سے پاک کر دیا۔ بلکہ نیکی اور عبادت کی روح سے سجا دیا۔ اسلامی اصولوں کے ساتھ سیاسی اور ڈپلومیٹک سرگرمیوں کو جاری رکھنا اور پھر ان میں غیر معمولی درجے کی کامیابی حاصل کرنا اور اس کے ذریعے بیشمار

بکھرے ہوئے قبائل کو اپنے گرد مجتمع کرلینا آج کتابوں کے اوراق میں پڑھتے ہوئے آسان معلوم ہوتا ہے۔ مگر ریگستان عرب میں جب عملاً یہ سب کام ہو رہا ہو گا' تو کرنے والا ہی جان سکتا ہے کہ کیسی کٹھن مہم ہو گی۔

معاہدانہ روابط کا یہ سلسلہ نہ صرف اس لحاظ سے دعوت کی توسیع میں مد تھا کہ حلیف قبائل میں مسلم داعیوں کو آمدورفت اور عوام سے گھلنے ملنے کے کھلے مواقع حاصل ہو جاتے تھے۔ اور خود ان قبائل کے افراد کا رابطہ بھی مدینہ سے بڑھ جاتا تھا' بلکہ یہ اس لحاظ سے بھی تحریک کے اثرات کی توسیع کا موجب تھا کہ اس کی وجہ سے مسلم طاقت اپنی سیاسی بصیرت کی وجہ سے عوام کی معتمد علیہ بنتی چلی گئی۔ لوگ محدود مذہبی اور صوفیانہ تصورات کے بنائے ہوئے نیک آدمیوں پر کتنے بھی فریفتہ ہوں اور ان کے تقدس سے مرعوب رہیں' لیکن وہ زندگی کی قیادت کی باگ ڈور انہیں کبھی نہیں سونپا کرتے۔ زندگی کی قیادت دنیا میں ہمیشہ ان عناصر کو دی جاتی ہے جن کے بارے میں اندازہ ہو کہ یہ کار پردازی کے لیے ضروری بصیرت رکھتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کسی گروہ کے بارے میں بڑی ستائش سے کام لے کر کہا کرتے ہیں کہ وہ تو بڑے اچھے لوگ ہیں۔ بڑے نیک کام کرتے ہیں۔ بڑی خدمت خلق میں مصروف ہیں۔ لیکن اس ستائش میں یہ تاثر بھی مضمر ہوتا ہے کہ کار دنیا کے لیے یہ سخت ناموزوں بھی ہیں' ایسے گروہ لوگوں کی یہ باتیں سن کر بارہا مغالطوں میں بھی پڑ جاتے ہیں کہ رائے عام ہمارے حق میں اچھی ہے۔ مسلم طاقت اگر ایسا انسانی کردار بنا کے سامنے لائی ہوتی' جو مذہبی رنگ میں نیکی کا پیکر اور روحانی لحاظ سے تقویٰ کا مجسمہ تو ہوتا لیکن معاملات دنیا اور مسائل تمدن و سیاست میں کوئی اہلیت نہ دکھا سکتا تو تاثر یہ تو ہوتا کہ کچھ بھلے لوگ ہیں۔ اللہ والے ہیں۔ اچھی باتیں کہتے ہیں اور لوگوں سے نیک سلوک کرتے ہیں۔۔ لیکن ایسا قطعاً ممکن نہ تھا کہ عوام الناس ان سے کسی نظام نو کی اقامت کی امیدیں باندھ سکتے اور ان کو سلطنت چلانے اور سماج کی قیادت کرنے کا اہل مان سکتے' اسلامی تحریک ایسے "اللہ لوگ" بنانے نہیں آئی تھی جو بحیثیت فرد بہت ہی اللہ والے' بھلے مانس اور مسکین تسلیم کیے جائیں لیکن اجتماعی دائرے میں کار فرما اور کار پرداز بننے کے لیے سیاسی بصیرت کا ضروری سرمایہ نہ رکھتے ہوں۔ لوگ ان کو ایک متبادل مگر صالح تر قیادت کی حیثیت سے قبول نہ کریں۔ اور ان کے ہاتھوں کسی روشن مستقبل کی تعمیر کی توقع نہ رکھیں۔ مسلم کردار جتنا زیادہ خدا پرست اور متقی تھا اتنا ہی زیادہ سیاسی بصیرت سے بھی آراستہ تھا۔ اس معاملے میں اس نے اپنا سکہ اپنی عملی کارگزاری سے منوا لیا۔ جوں جوں لوگ محسن انسانیت ﷺ اور آپؐ کے جو میں اقدام کرنے والی مسلم طاقت کی قائدانہ صلاحیتوں سے متاثر ہوتے گئے' مدینہ ان کی امیدوں کا مرکز بنتا گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے دل بھی اسی تدریج سے اسلام کے لیے کھلتے چلے گئے۔ گویا دین کی دعوت اور سیاسی اثرات کی توسیع دونوں کام ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ اور ایک دوسرے کے لیے مد!

یہ حقیقت ذہن میں رکھ کر ان معاہدانہ تعلقات کا جائزہ لیجیے' جو حضورؐ نے بڑے وسیع پیمانے پر قائم کر

دکھائے۔ اور اس کام میں آپؐ کی رفتار کار حیرت انگیز حد تک تیز رہی —— باوجودیکہ ذرائع رسل و رسائل کے لحاظ سے حالات سخت ناموافق تھے۔

1۔ بیعت عقبہ:

معاہدانہ روابط میں سرفہرست بیعت عقبہ آتی ہے' جو بیک دم ایک پہلو سے مذہبی میثاق ہے' اور دوسرے پہلو سے سیاسی معاہدہ۔ پہلی بار کی مجلس میں محسن انسانیت کے ہاتھ پر انصاری نوجوانوں نے قبول رسالت کی بیعت کی۔ اور دوسری بار آپؐ کی سیاسی قیادت کا عہد بھی شامل کیا۔ مکہ سے منیٰ کو جاتے ہوئے راستے کے دونوں طرف پہاڑوں کی متوازی دیواریں آتی ہیں۔ منیٰ سے کوئی ایک فرلانگ بھر پہلے بائیں ہاتھ کی پہاڑی میں نصف دائرے کا ایک خم ہے اور اس خم کے دامن کے طور پر ایک میدانی قطعہ دکھائی دیتا ہے یہی وہ محفوظ جگہ ہے جہاں راتوں کے پردہ سکوت میں بیعت ہائے عقبہ واقع ہوئیں۔ مدینہ میں یہود کی موجودگی کی وجہ سے انصار الہامی دین کا ذوق رکھتے تھے۔ اور سلسلہ نبوت سے انہیں تعارف حاصل تھا۔ نیز آخری نبیؐ موعود کی پیش گوئیاں ان کے سامنے تھیں اور یہود کا یہ چیلنج بھی کہ جب وہ نبیؐ آجائے گا تو ہم اس کے ساتھ ہو کر تم لوگوں کو مغلوب کریں گے۔ اس طرح انصار میں جہاں الہامی ہدایت کی طلب پیدا ہو چکی تھی وہاں غیر شعوری طور پر یہ جذبہ بھی اثر انداز تھا کہ وہ نبی آجائے تو ہم پہلے لبیک کہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اوس و خزرج کے درمیان باہمی آویزش کا جو سلسلہ چلا آرہا تھا اس سے تھک کر وہ ایک دور امن کے خواہاں تھے مگر رکاوٹ یہ تھی کہ دونوں میں سے کوئی قبیلہ بھی سابق حریفانہ فضا کی وجہ سے دوسرے قبیلہ کی قیادت قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ ان کو تیسری طاقت کی احتیاج تھی۔ یہ سارے وجوہ تھے جن کے زیر اثر مدینہ کے ذہین اور شریف لوگوں کو جو نبی سرور عالم ﷺ سے براہ راست تعارف ہوا۔ اور حضورؐ کی دعوت سننے کا موقع ملا۔ تو قبولیت کے لیے ان کے دل کھل گئے۔ نبوت کے چرچے تو ان تک پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ لیکن بالمشافہ گفتگو نے انہیں قطعی فیصلہ تک پہنچا دیا۔ آنحضورؐ کی وجاہت اور شخصیت کا اثر جب کلمات دعوت میں شامل ہوا ہو گا' تو اس ذہنی انقلاب کی تکمیل ہو گئی ہو گی' جس کے لیے انصار کی فطرت میں پہلے سے آمادگی موجود تھی۔ وہ لمحہ ایک عجیب نازک تاریخی لمحہ تھا' یعنی انصار (پہلی بیعت کے موقع پر) مدینہ سے یہ ارادہ لے کے چلے تھے' کہ قریش سے حلیفانہ رابطہ استوار کریں۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو تحریک اسلامی کی تاریخ کا رخ کچھ دوسرا ہوتا۔ مگر عین وقت پر جماعت انصار کا ارادہ بدلتا ہے اور وہ قریش کا خیال چھوڑ کر اس نئی قوت سے رابطہ جوڑ لیتے ہیں' جو تاریخ کے افق سے اپنی ابتدائی کرنوں کے ساتھ آغاز طلوع کر رہی تھی۔

پہلی مرتبہ کی بیعت میں حضورؐ نے چند اعتقادو اخلاقی امور کا عہد لیا۔ یعنی معاہدہ باندھنے والے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ گردانیں گے۔ چوری نہیں کریں گے۔ زنا نہیں کریں گے۔ اولادوں کو قتل نہیں

کریں گے۔ کسی کے خلاف کوئی بہتان نہیں گھڑیں گے اور معروف کے دائرے میں رسولؐ خدا کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

دوسری بیعت میں انصار نے ان امور کا اضافہ کیا کہ "ہم رسولؐ اللہ کے سامنے ہر حال میں سمع و طاعت سے کام لیں گے۔ چاہے مشکلات درپیش ہوں یا آسانیاں ہوں۔ ہمارے دلوں کو کوئی حکم پسند ہو یا ناپسند اور خواہ کوئی بات ہماری رائے کے خلاف ہو رہی ہو اور یہ کہ ہم اہل قیادت سے کشمکش نہیں کریں گے اور یہ کہ ہم کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔

ان مختصر الفاظ میں گویا محمد ﷺ اور انصار کے درمیان سیاسی رابطہ استوار ہو گیا۔ اور اس جماعت نے واضح طور پر ایک سیاسی جماعت کی حیثیت اختیار کرلی۔ حضورؐ کی قیادت کو انہوں نے سمع و طاعت کے ساتھ پوری طرح قبول کیا۔ یہ اقرار بھی باندھا کہ ارباب قیادت کے خلاف کوئی کشمکش نہ کی جائے گی۔ اور جاہ و منصب کو چھینے جھپٹنے کے لیے کوئی اقدام نہ ہو گا۔ مشاورت کا اصول طے پا گیا کہ ہر موقع پر حق بات پیش کی جائے گی۔ اور اقامت دین کی جدوجہد کے بارے میں پیمان بندھ گیا کہ جو جو کچھ فرائض اور مطالبات اور ذمہ داریاں ہم پر عاید ہوں گی۔ انہیں دنیا بھر کے طعن و ملامت سے بے نیاز ہو کر سرانجام دیں گے۔ یہ ایسی بیعت تھی کہ اس کے بعد جو بھی کوئی قطعہ ارضی (Territory) اس جماعت کے زیر اثر آجائے' جس میں اس کے اوپر کوئی اور سیاسی اقتدار کارفرما نہ ہو بلکہ قیادت اس کے اپنے ہاتھوں میں ہو تو یہ جماعت معاً ایک ریاست میں بدل جائے۔ یا یوں کہئے کہ اسلامی ریاست کا حصہ بن جائے۔

ان امور کے ساتھ مزید یہ بھی طے پا گیا کہ حضورؐ کے مدینہ منتقل ہو جانے پر معاہدہ باندھنے والے انصار حضورؐ کی ایسی ہی حفاظت کریں گے' جیسی کہ وہ اپنی ازواج و اولاد کی کرتے ہیں۔ گویا مدینہ کی اسلامی جماعت اور حضورؐ کے درمیان وفاقی وحدت کا تعلق بھی قائم ہو گیا۔ اور اس لحاظ سے بیعت عقبہ کی سیاسی قدروقیمت اور زیادہ بڑھ کر "انقلابی" ہو جاتی ہے۔

پھر حضورؐ کے ارشاد سے انصار مدینہ کی اسلامی جماعت کی طرف سے بارہ نمائندہ نقیب نامزد کیے جاتے ہیں' جو حضورؐ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ان نقیبوں کے سر دعوت اسلامی کو پھیلانے کے علاوہ سیاسی ذمہ داری بھی ڈالی گئی۔ بقول عبداللہؓ بن ابی بکرؓ حضورؐ نے ان نقیبوں سے فرمایا کہ "تم لوگ اپنی اپنی قوم کے اسی طرح ذمہ دار ہو۔ جیسے حضرت عیسیٰؑ کے سامنے ان کے حواری ذمہ دار تھے' اور میں بھی اپنے گروہ۔۔۔۔ یعنی مکی جماعت۔۔۔۔ کا ذمہ دار ہوں [1]

نقیبوں کے تصور کے ساتھ مدینہ کے لیے جو تنظیمی ہیئت تشکیل دی گئی' وہ فقط مذہبی نہ تھی۔ بلکہ سیاسی و انقلابی تھی۔ ایسی ہیئت کی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ وہ جلد از جلد۔۔۔۔ پہلا موقع ملتے ہی۔۔۔۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۳۹ تا ۷۵۔ عہد نبویؐ کے میدان ہائے جنگ' ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص ۷ تا ۱۰۔

ریاست کی شکل اختیار کرے۔ عالم واقعہ میں ہوا بھی یہی کہ حضورؐ کے جانے کے چند ماہ بعد اسلامی ریاست کی نیو ڈال دی گئی۔

گویا اسلامی تحریک ابتدائی دعوت کا دور پورا کر کے سیاسی تعمیر کے دور میں داخل ہوئی تو معاہدہ کے ذریعے داخل ہوئی' نہ کہ جنگی قوت کا استعمال کر کے۔

۲ ۔ دستوری معاہدہ:

نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں چلنے والی تحریک اسلامی کی تاریخ میں دوسرا عظیم ترین معاہدہ وہ ہے جس پر مدینہ کی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ شاید دنیا بھر کی تاریخ میں مجرد کسی ایک ریاست کا قیام بھی بغیر تھوڑی بہت قوت استعمال کیے نہیں ہوا ہو گا کجاکہ معاملہ ایک نظریاتی ریاست کا ہو جس کے اساسی نظریے نے ماحول میں ہل چل مچا دی ہو۔ پھر اس کا قیام ایک اجنبی ماحول میں اور گوناگوں عناصر کے تعاون سے عمل میں آئے۔ یہ دستوری معاہدہ محسن انسانیت ﷺ کی سیاسی بصیرت اور قائدانہ مہارت کی ایک ایسی مثال پیش کرتا ہے جس کا کہیں جواب نہیں۔ اس معاہدہ کے فریقوں کو دیکھیے تو ان میں مہاجرین شامل ہیں۔ انصار کے دو بڑے قبائل اوس و خزرج کے مسلم افراد شامل ہیں۔ ان کے مشرک اور یہودی افراد شامل ہیں۔ یہود کے متعدد قبائل شامل ہیں۔ درآنحالیکہ ان میں باہمی چپقلش موجود تھی۔

درحقیقت حضورؐ پاک ننھیالی تعلقات کی وجہ سے مدینہ کو بچپن سے جانتے تھے کیونکہ وہاں رہ چکے تھے۔ پھر بہ حیثیت داعی حق آپؐ نے مکہ ہی کے آخری دو تین برس میں مدینہ سے رابطہ قائم ہو جانے کے بعد وہاں کے مخصوص حالات پر سیاسی نقطہ نظر سے اچھی طرح کاوش کی تھی اور ہجرت کے بعد مدینہ آکر تو براہ راست وہاں کے جملہ عناصر کے باہمی معاملات کا فہم حاصل کر لیا تھا۔ مدینہ کی کل آبادی اس وقت اندازاً پانچ ہزار ہو گی اور اس تعداد میں تقریباً نصف یہودی تھے۔ اس ساری آبادی میں مہاجرین اور انصار کو ملا کر مسلم گروہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ پانچ سو ہو گی۔ اسی فعال' بیدار اور منظم اقلیت کے بل پر حضورؐ نے ۵ ہزار کی آبادی کو اپنی قیادت کے حلقہ میں لے لیا۔ انصار کے دونوں قبیلے جو ۱۲ ضمنی قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک تاریخ آویزش رکھتے تھے اور عام آبادی بھی تصادم در تصادم کے چکر سے تنگ ہوئی تھی' کیونکہ ہمیشہ کچھ عرب اور کچھ یہودی ایک طرف اور کچھ عرب اور یہودی دوسری طرف ہو کر جنگ و جدل میں پڑے رہتے تھے۔ اب امن کی پیاس موجود تھی۔ اس مقصد سے ایک تعمیری قیادت کی طلب کار فرما تھی۔ کچھ ہی مدت پہلے قیادت کا خلاء پر کرنے کے لیے عبداللہ بن ابی کی تاجپوشی کی تیاریاں شروع بھی ہو چکی تھیں۔ لیکن یکایک حضورؐ اور آپؐ کی دعوت سے تعارف حاصل ہو جانے پر انصار ادھر متوجہ ہو گئے۔ خود یہودیوں کا حال بھی یہ تھا کہ ان کے دو بڑے گروہ جو داخلی طور پر دس قبیلوں میں منقسم تھے' باہم دگر حریف تھے۔ اور ایک غیر نسل اور غیر علاقے میں انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں مٹ مٹا نہ جائیں۔ پھر جب

یکایک حضورؐ نے انصار کو اپنے ساتھ وابستہ کرلیا اور ان کے سابق حلیفانہ روابط یہودیوں سے ٹوٹنے لگے تو اس وقت یہودیوں نے اپنے پیروں تلے سے زمین سرکتی محسوس کی۔ اس صورت حالات میں نبی اکرمؐ نے یہود کے حق میں وحی الٰہی کے تحت تالیف قلوب کرنے اور ان کے بہترین جذبات کو اپیل کرنے کی سعی بلیغ کی، تو سیاسی وحدت قائم کرنے کے لیے میدان ہموار ہوگیا۔ مدینہ کی آبادی کے جملہ عناصر کو سمجھنا، ان کے مفاد اور مسائل کا شعور حاصل کرنا اور ان کی نفسیات کو مناسب رخ پر ڈھالنا اور پھر اس عظیم سیاسی کارنامہ کو بہت ہی کم مدت میں سرانجام دے لینا محسن انسانیتؐ کی سیاسی عظمت سے ہمیں مرعوب کر دیتا ہے۔

مسلم جماعت جو اعتقاداً اور اخلاقاً محمد ﷺ کی قیادت کے تحت انتہائی مضبوط تنظیم رکھتی تھی۔ اور پھر بیعت عقبہ نے اسے ایک سیاسی انقلابی پارٹی کی حیثیت بھی دے دی تھی۔ نیز یہ اپنی اصولی دعوت کے زور سے نشوونما پانے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔ اس نے مدینہ میں سیاسی لحاظ سے مرکزی اہمیت حاصل کرلی۔ انصار کے قبائل میں نہ کوئی جوابی نظریہ یا ردعمل موجود تھا اور نہ کوئی مقابل کی مثبت یا منفی ذہن کی قیادت ------ کیونکہ ان کے سرداروں کی بیشتر تعداد پہلے ہی اسلامی تحریک کی طرف کھنچ آئی تھی۔ ان کے اندر کے مشرک اور یہودی افراد اچھی خاصی بڑی تعداد رکھنے کے باوجود کوئی مخالفانہ حرکت نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ پر سکون تھے اور سیاسی حیثیت سے سرکردہ مسلم عناصر کے پیچھے چلنے والے تھے۔ یوں بھی کوئی اکا دکا عرب یا یہودی قبیلہ مسلم جماعت کے مقابلے میں کچھ وزن نہیں رکھتا تھا۔ مدینہ کی آبادی کے عناصر کی یہ ترتیب حضورؐ کے نقشہ کار کے لیے بالکل سازگار تھی۔ اور آپؐ نے ابتدائی مسائل سے فارغ ہوتے ہی چند ماہ کے اندر اندر ہیئت سیاسیہ کی تشکیل کرلی۔ مذکورہ بالا معاہدہ جو یورپین مستشرقین کے تجزیہ کے مطابق ۵۳ دفعات پر مشتمل ہے، تاریخی ریکارڈ کی بناء پر اس معاہدے کے متعلق ایک اختلاف یہ ہوا ہے کہ بعض لوگوں نے پوری دستاویز کا ۱ھ میں لکھا جانا بیان کیا ہے۔ اور بعض نے تحقیقی رائے یہ بھی دی ہے کہ اس کا ایک حصہ ۱ھ کا ہے اور دوسرا حصہ اس میں غزوہ بدر کے بعد شامل کیا گیا ہے۔ یعنی مغربی تقسیم کے مطابق دفعات ۱ تا ۲۳ اور ۲۴ تا ۴۷ دو الگ الگ حصے ہیں۔ ہم اگر اس دوسری رائے کو قبول کرلیں تو اس صورت میں بھی رسولؐ خدا کی سیاسی حکمت کار فرما نظر آتی ہے۔ حضورؐ نے پہلے مہاجرین اور جملہ انصار (مسلم + غیر مسلم) پر مشتمل ہیئت سیاسیہ کی تشکیل کردی۔ اس کے وجود میں آجانے کے بعد یہودی قبائل نے اپنے آپ کو الگ رکھتے ہوئے کمزور اور معرض خطر میں محسوس کیا ہوگا۔ کیونکہ سیاسی لحاظ سے وہ بالکل ہوا میں معلق رہ گئے تھے پھر جب انہوں نے مسلم طاقت کو میدان بدر سے اپنی توقعات کے خلاف فاتح بن کر نکلتے دیکھا ہوگا، تو انہیں فکر ہوئی ہوگی کہ ہم کو بروقت مدینہ کی ہیئت سیاسیہ میں اپنی جگہ بنالینی چاہیے۔

یہ دستوری دستاویز جس کی نظیر بقول ڈاکٹر حمید اللہ پہلے کی تاریخ میں قطعاً نہیں مل سکی، اعلیٰ درجہ کے

سیاسی سلیقے سے لکھی گئی ہے۔ نہایت ہی محتاط دستاویزی زبان میں ہے اور اس میں حضورؐ نے اپنی مطلوبہ نظریاتی و سیاسی اقدار کو مختلف عناصر سے تسلیم کرایا ہے' یہ مناسب موقع ہے کہ اس دستاویز کے اہم ترین مندرجات پر نگاہ ڈالیں تاکہ اس کی سیاسی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔

اس دستاویز کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوا۔ اور اس کا سر عنوان ہے "ھذا کتاب من محمد النبی صلی اللہ علیہ و سلم۔" یعنی نوشتہ محمد ﷺ کی طرف سے ہے جو نبی ہیں۔ گویا پیرایہ آغاز ہی میں نظریہ اساسی کی بنیاد رکھ دی گئی۔

اس دستاویز پر مبنی ہیئت اجتماعیہ کا مرکزی عنصر بہرحال مسلم جماعت کو قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً پیرایہ آغاز میں دستوری نوشتہ کا دائرہ یوں نامزد کیا گیا ہے۔ "بین المومنین و المسلمین من قریش و یثرب" اور اس پر اضافہ ہے۔ "و من تبعھم فلحق بھم و جاھد معھم" (دفعہ ۱) گویا ریاست کا مرکزی عنصر مکہ اور مدینہ کے اہل ایمان ہیں اور بقیہ ان کے تابع' لاحق اور حامی ہونے کی صورت میں شہریت سے بہرہ مند ہیں۔ چنانچہ یہود کے قبائل کو شریک معاہدہ کر کے "مومنین کے ساتھ" کے الفاظ سے سیاسی امت واحدہ میں شمار کیا گیا (دفعات ۲۵ تا ۳۵) پھر مندرج ہے کہ "اہل ایمان دوسرے انسانوں کے بالمقابل آپس میں ایک دوسرے سے بھائی چارہ رکھتے ہیں"۔ (دفعہ ۱۵) پھر صلح و جنگ میں تمام مسلمانوں کو مشترک قرار دیا گیا ہے۔ (دفعہ ۱۷) پھر ایمان والوں پر لازم ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ قصاص کے لیے مل کر اٹھیں اور قاتلوں کو پناہ نہ دیں۔ نیز اگر ان پر زیادتی کر کے خون بہایا جائے' تو اس کا انتقام لیں (دفعہ ۱۹۔۲۱۔۲۲) پھر لازم کیا گیا کہ کوئی ایمان والا کسی کافر کے بدلے میں کسی ایمان والے کی جان نہ لے گا۔ اور نہ کسی ایمان والے کے خلاف کسی کافر کی مدد کرے گا (دفعہ ۱۴) مسلمانوں کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے سکتا ہے اور اسے اللہ کے ذمہ کی حیثیت سے سب کو نبھانا ہو گا (دفعہ ۱۵) جب کوئی اختلاف واقع ہو تو خدا اور محمد ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا (دفعہ ۲۳) متقی ایمان والوں پر واجب کیا گیا کہ وہ ہر جرم' گناہ اور تعدی کی صورت میں اس کے انسداد میں متحد ہوں (دفعہ ۱۳) ابتدائی حصہ میں دستور کی نظریاتی روح کو نمایاں کرنے کے لیے بار بار یہ جملہ آتا ہے کہ فلاں فلاں (مسلم) قبیلہ فدیہ وغیرہ کے معاملات میں "معروف" اور "قسط" پر کاربند ہو گا ---- اور وہ بھی اس مفہوم کے ساتھ جو "بین المومنین" مسلمہ ہیں (دفعہ ۳ تا ۱۲) نہایت ہی اہم اسلامی اصطلاح "فی سبیل اللہ" بھی شامل دستور کی گئی (دفعہ ۱۹) اسی طرح "ظلم" اور "بر" اور "اثم" کی اصطلاحات بھی متن میں داخل ہوئیں (دفعہ ۳۶) اس سے بھی بڑھ کر یہ تک شامل دستاویز ہے کہ متقی ایمان والے سب سے سیدھے راستے پر ہیں (دفعہ ۲۰) پھر "و ان النصر للمظلوم" کے الفاظ سے ایک خالص اسلامی کلیہ جو بین الانسانی بھی ہے تسلیم کرا لیا گیا۔ اور یہ بھی کہ "خدا اس کے ساتھ ہے جو اس صحیفہ کے مندرجات کی تعمیل زیادہ سے زیادہ اخلاص و وفا شعاری سے کرے"۔ (دفعات ۴۲۔۴۶۔۴۷)

اس دستاویز میں سیاسی امور کو جس خوبی سے طے کیا گیا ہے اس کا بھی جائزہ لیجیے۔ دستاویز میں شرکاء

کے سکنی علاقے یعنی جوف مدینہ کو جس کا رقبہ تقریباً ایک صد مربع میل تھا۔ (مدینہ کا جغرافیائی ماحول ہم بیان کر چکے ہیں نہ صرف یہ کہ اسلامی ریاست کی ابتدائی سرزمین (Territory) قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اسے حرم مقدس بھی قرار دیا گیا (دفعہ ۳۹) اس معاہدہ کے جملہ شرکاء کو ایک سیاسی وحدت (انهم امة واحدة من دون الناس) قرار دیا گیا (دفعہ ۱) یہ دفعہ سیاسی حکمت کی مظہر ہے کہ پہلے سے طے کر دیا گیا کہ یہود میں جو بھی ہماری اتباع کرے اسے مدد اور مساوات بہ حقوق شہریت حاصل ہو گی۔ یہ گویا پیش بندی بھی تھی۔ اور ترغیب بھی (دفعہ ۱۶) کمال سیاست کا شاہکار یہ ہے کہ اختلاف ہونے پر اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا (دفعہ ۲۳) کوئی جھگڑا یا قتل واقع ہو تو خدا اور خدا کے رسول محمد ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ (دفعہ ۴۲) کسی زخم یا مار کا بدلہ لینے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی (دفعہ ۳۶) ظالم کے ظلم یا قاتل کے جرم کا وبال صرف اس کی ذات یا اس کے گھرانے (خوں بہا میں خاندان شریک ہوتا تھا) پر ہو گا۔ کسی دوسرے پر نہیں (دفعہ ۲۵-۲۶) سیاسی ہیئت کے ابتدائی واحدے قبیلوں کو قرار دیا گیا۔ اور ان کو تسلیم کر کے ان پر مرکزی اقتدار قائم کیا گیا۔

وفاقی سیاست کے لحاظ سے یہ باتیں طے پائیں کہ:- اگر یثرب پر حملہ ہو' تو شرکاء کے لیے باہمی امداد کرنا ضروری ہو گا۔ (دفعہ ۴۴) اگر معاہدہ کے کسی فریق نے کوئی جنگ کرے تو اس کے خلاف سارے شرکاء سچے جذبے سے امداد کریں گے (دفعہ ۳۷) اس دستاویز نے ایک دفعہ کے ذریعے وفاقی بالادستی بھی حضورؐ کے ہاتھ میں دے دی کہ کوئی بھی محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر فوجی کارروائی کے لیے نہیں نکلے گا (دفعہ ۳۶)۔ کسی فریق کی اپنی مذہبی لڑائی کے بارے میں شرکاء کی کوئی ذمہ داری نہ ہو گی (دفعہ ۴۵) اگر شرکاء کو کسی صلح کے لیے مدعو کیا جائے تو سب کے ساتھ وہ بھی صلح کریں گے (ایضاً) قریش کے حلیفانہ تعلقات کا قطعی خاتمہ کرنے کے لیے یہ بھی منوا لیا گیا کہ کوئی مشرک (غیر مسلم شہری) قریش کے جان و مال کو کوئی پناہ نہ دے گا۔ اور نہ اس سلسلے میں کسی مومن کے آڑے آئے گا (دفعہ ۲۰) اور قریش کو کوئی پناہ نہ دی جائے گی اور نہ اس کو جو انہیں مدد دے (دفعہ ۴۳) جنگی مصارف کے متعلق یہ حقیقت پیش نظر رکھتے ہوئے کہ یہودی اپنا حصہ ادا کرنے میں کنجوسی دکھائیں گے اور اگر اجتماعی فنڈ ان کے ہاتھ میں گیا۔ تو وہ خیانت سے کام لیں گے ---- حضورؐ نے کمال بصیرت سے معاملہ یوں طے کیا کہ ہر فریق اپنے اپنے جنگی مصارف خود برداشت کرے گا (دفعہ ۴۴-۳۷)۔

اقتصادی لحاظ سے ایک طرف خوں بہا اور قیدیوں کے فدیہ کا بار عرب کے معروف طریقے پر شخص متعلق کے قبیلے پر پھیلا دیا گیا' غیر مستطیع مقروض کے قرض کی ذمہ داری بھی اجتماعی کر دی گئی۔

مذہبی آزادی کے لیے وضاحت کر دی گئی کہ مسلمانوں کے لیے ان کا دین اور یہود کے لیے ان کا مذہب (دفعہ ۲۵)۔ درحقیقت مسلم جماعت تو سیاست اور دین دونوں کے لحاظ سے ایک وحدت تھی اور اس پر دوہری ذمہ داریاں عاید تھیں مگر خالص سیاسی رابطے کے دائرے میں جملہ شرکاء کو اپنے اپنے مذہب پر

چلنے کی آزادی دی گئی۔ ❶

اب ان نکات کو دستاویز کے خلاصہ کی حیثیت سے زیر نظر لایئے۔ اور پھر ایک ایک جز پر غور کیجئے کہ حضورؐ نے کس حکمت سے اپنی آئیڈیالوجی کو دستور کی اساس اور روح بنایا۔ مسلم جماعت کو مرکزی حیثیت دلائی' اپنی قیادت اور اتھارٹی ـــــ سیاسی' دفاعی' عدالتی ـــــ ہر لحاظ سے منوائی۔ قریش کا مقابلہ کرنے کے لیے سب کو مشترک نکات پر جمع کرلیا۔ اور بے شمار خطرات کے رخنے پہلے سے بند کرا لیے۔ واضح رہے کہ اس معاہدہ کی نوعیت ایک دستوری دستاویز کی ہے۔ جس کے کسی ایک فریق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ جب چاہے علیحدگی اختیار کرلے یا معاہدہ توڑ دے۔ ایسا کرنا سرے سے اس حق شہریت کو ختم کر دیتا ہے جسے اسلامی ریاست کے حدود میں یہی معاہدہ خلق کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جن یہودی قبائل نے بعد میں اس معاہدہ کو پوری طرح پامال کر دیا ان کے خلاف وہ کارروائی کی گئی جو غداروں اور باغیوں کے خلاف کی جاتی ہے۔

یہاں ضمناً فرضیت ہجرت کے اہم نکتہ کو اس دستاویز کی روشنی میں سمجھ لینے کا موقع ہے۔ مدینہ کی ریاست کی اساس جس مسلم جماعت پر رکھی گئی تھی' فرضیت ہجرت کا ایک مقصود یہ تھا کہ یہ جماعت زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو۔ اس میں شک نہیں کہ عرب کے قبائلی نظام میں متفرق اکا دکا مسلمانوں کا پڑے رہنا اس امر کا موجب ہو سکتا تھا کہ وہ تھوڑی بہت کشمکش کر کے بالآخر جاہلی معاشرے میں تحلیل ہو جائیں۔ یا جبر و تشدد کا شکار ہو جائیں اس وجہ سے بھی ایک ایک ذرے کو سمیٹ لینا ضروری تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مدینہ کی اسلامی ریاست کا استحکام بھی پوری اہمیت سے اس کا متقاضی تھا۔ بعد میں جب یہ دونوں ضرورتیں باقی نہ رہیں تو "لا هجرة بعد الفتح" کا اعلان کر دیا۔ یعنی جب سارا عرب دارالاسلام بن گیا۔ اور مدینہ کی قیادت کے زیر نگین آگیا۔ اور اسلام لانے والوں کے لیے کسی علاقے میں بھی مزاحم فضا باقی نہ رہی تو مدینہ ہجرت کر کے آنے کی پابندی اٹھالی گئی۔

اس معاہدے کے مطابق مدینہ کی اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت قائم ہوئی۔ یک صد مربع میل علاقے میں جو ۵ ہزار کی آبادی رکھتا تھا مسلمانوں کو دعوت حق کے لیے بالکل کھلا دائرہ پہلی بار حاصل ہوا۔ جہاں اسلام کا سیاسی اقتدار بھی دعوت کے کام میں از خود ممد تھا۔ پھر اس علاقے کے آس پاس جا کر کام کرنے کے لیے بھی اسلامی حکومت کا وجود کارکنوں کے لیے پشتیبان بن گیا۔

۳ ـ متفرق قبائل سے معاہدات:

مدینہ کو ایک سیاسی واحدہ بنانے اور اسلامی حکومت کی نیو ڈالنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ حضورؐ نے

---

❶ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۲۳۔ ۱۱۹۔ عہد نبویؐ کا نظام حکمرانی' ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص ۷۶ تا ۱۱۱۔

آس پاس کے قبائل کو ساتھ ملانے کی فکر کی۔ دو تین بار صحابہ کی جماعتوں کو مہمات پر بھیجا۔ ہجرت کے بارھویں مہینے یعنی صفر میں فرمانروائے مدینہ صلی اللہ علیہ و سلم نے بہ نفس نفیس ودان (مدینہ سے بجانب مکہ ایک قصبہ ہے) کا رخ کیا۔ یہاں پہنچ کر آپؐ نے قبیلہ بنی حمزہ (یا بن ضمرہ) بن بکر بن عبد مناف سے معاہدہ استوار کیا۔ قبیلہ کی جانب سے عمرو بن مخشی الضمری نے دستخط کیے[1]

اس سے قبل مہاجرین کا ایک وفد اسی جانب عیص کے مقام تک گیا اور حلیفانہ تعلقات کے لیے اچھی فضا پیدا ہو گئی[2] پھر ربیع الاول ۲ ھ (ہجرت کے تیرھویں ماہ) حضورؐ دوبارہ بواط (ینبوع کے علاقے میں جہینہ کے پہاڑوں میں سے ایک) کی جانب تشریف لے گئے۔ یہاں کی آبادی سے بھی گفت و شنید کامیاب رہی اور حلیفانہ تعلقات قائم ہو گئے۔[3]

پھر جمادی الاخری میں بمقام ذوالعشیرہ (علاقہ ینبوع) تشریف لے گئے۔ وہاں بنو مدلج اور ان کے حلیف قبیلہ بنو ضمرہ سے معاہدانہ روابط کے لیے گفت و شنید بہت دنوں جاری رہی۔ ان سے بھی معاہدہ ہو گیا۔[4]

ہمارے پیش روؤں کی ایک رائے یہ ہے کہ ان معاہدات سے یہ قبیلے اور علاقے درحقیقت مدینہ کے سیاسی واحدہ کا جزو بن گئے تھے۔ اور متعلقہ علاقہ مدینہ کی سلطنت کا ایک حصہ ہو گیا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ معاہدات کے بعض اہم اجزاء اور بعض اصطلاحات دستوری معاہدہ سے ملتی جلتی ہیں۔ لیکن اگر بالکل ابتدائی دور کے متعلق ایسا نہ بھی تسلیم کیا جائے۔ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ بعد میں جہینہ سے حلیفانہ تعلقات کا ارتقاء اس نہج پر جاری رہا' کہ یہ لوگ دوسرے عرب قبائل سے بہت پہلے اسلام میں داخل ہوئے۔ اور ایک ہزار کی جمعیت نے مدینہ آکر حضورؐ کی خدمت میں تعاون پیش کیا۔ اور عملاً غزوات میں حصے لیتے رہے۔ اس قبیلہ کی مختلف شاخوں سے اسلامی ریاست کے معاملات کا جو ریکارڈ موجود ہے' وہ اسی کی توثیق کرتا ہے۔ مثلاً بنی الجرمز (جہینہ کی ذیلی شاخ) کو حضورؐ نے امن و سلامتی کا تحریری پروانہ عطا کیا۔ بنی شخ یا شنخ (جہینہ کی ذیلی شاخ) کو ان کا پورا علاقہ بطور جاگیر مستقل طور پر تفویض کر دیا۔ اسی طرح عوسجہ بن حرملہ جہنی کو اس کے مسکن ذوالمرہ (بہ جانب ساحل) کے قریب جاگیر کا پروانہ عطا کیا گیا۔ ابوبصیر اور ان کے ساتھیوں کے لیے جب معاہدہ حدیبیہ کی وجہ سے مدینہ جانے کا موقع نہ رہا۔ تو وہ مکہ سے ہجرت کر کے اسی ساحلی علاقے میں آگئے تھے۔ عین ممکن ہے کہ عوسجہ جیسے سرداروں کی حمایت بھی انہیں حاصل رہی ہو۔ اور وہ مقامی لوگوں کے تعلقات ہی سے قریشی قافلوں کی مزاحمت کرتے۔

---

[1] ابن ہشام جلد ۲ ص ۴۔ ۲۲۳' زاد المعاد جلد ۱ ص ۳۴۲' رحمتہ للعالمین جلد ۱ ص ۱۳۸۔

[2] رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص ۳۵۹

[3] رحمتہ للعالمین جلد ۱ ص ۱۳۹ از زاد المعاد حوالہ ماسبق

[4] ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۳۶' رحمتہ للعالمین جلد ۱ ص ۱۳۹۔

ہوں ❶

تعلقات اور آگے بڑھے' میل جول کی وجہ سے دعوت کا کام جاری رہا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل بہ حیثیت مجموعی اسلامی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ عقبہ جہنی کی بیعت اسلام کا حال ہمارے سامنے ہے۔ حضورؐ کے دور آخر میں ایک نیا پروانہ امن بنی جرمز' بنی الحرقہ اور عمرو بن معبد جہنی کے نام جاری ہوا جس میں دو شرائط ہیں جو مسلم قبائل پر عائد ہوتی تھیں۔ یعنی نماز و زکوۃ کی پابندی' خمس کی ادائیگی' مخالفین اسلام سے انقطاع' قرضوں کے سود کا ترک ان کے لیے لازم کیا گیا تھا ❷ مدینہ میں قبیلہ جہینہ کے نام کی مسجد بھی دور نبوت میں بن گئی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خاصی تعداد میں جہنی لوگ اسلامی جماعت میں شامل ہو کر مدینہ آئے ہوں گے۔

بنو غفار ان چند قبائل میں سے ہیں جنہوں نے بڑی تعداد میں بہت پہلے اسلام قبول کیا۔ یہ قبیلہ اپنے مثالی نوجوان حضرت ابوذرؓ کی دعوت سے متاثر ہوا۔ جنگ بدر کے قریب زمانے میں اس قبیلہ کے لوگوں نے حضورؐ سے معاہدہ کیا۔ جس کی اساس اس جملے پر ہے کہ "انهم من المسلمين و عليهم ما على المسلمين" ہماری رائے میں اگرچہ اس کے ایک جزء میں اس قبیلہ کے غیر مسلم عناصر کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن فی الحقیقت یہ قبیلہ گویا مدینہ کی ہیئت اجتماعیہ کا جزء بن گیا۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کے علاقہ کو مدینہ کے زیر نگین نہ سمجھا جائے۔

بنو ضمرہ جس کی بہت سی شاخوں میں سے ایک بنو غفار کی شاخ تھی۔ اسی کا ایک ذیلی قبیلہ بنو عبد بن عدی بھی تھا۔ جس کا قیام حدود حرم میں تھا۔ اس شاخ نے قریش سے مجبورانہ تعلق مصالحت کے باوجود مسلم حکومت سے دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ صرف قریش کے خلاف جنگ میں شامل ہونے سے استثنیٰ حاصل کر کے بقیہ ہر لحاظ سے حضورؐ کے ساتھ حلیفانہ رابطہ جوڑ لیا ❸

قبیلہ فرینہ مدینہ سے صرف ۲۰ میل کی دوری پر فرع کی سمت میں بجانب شمال مغرب (بقول ابو یوسف) آباد تھا۔ ۵ ھ میں یہ قبیلہ حلقہ اسلام میں شامل ہوا۔ لیکن ان سے حلیفانہ تعلقات لازماً ان کے ہمسایہ قبائل کے ساتھ ہی ساتھ آغاز پا چکے تھے۔ اس قبیلہ کے ایک سردار بلال بن حارث کو تبلیہ (یا قبیل) کی سونے کی کانیں حضورؐ نے بطور جاگیر عطا کیں۔ چنانچہ ایک حالیہ کھدائی میں یہاں کے قبرستان سے جاگیر کے فرمان کا کتبہ ملا ہے۔ فتح مکہ کے بعد سردار مذکور کو بہت سی زرعی زمین بھی بطور جاگیر دی گئی۔ ان باتوں سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ فرمانروائے مدینہ ﷺ نے کتنی زیادہ توجہ ساحلی علاقے کے قبائل پر صرف کی۔ کیونکہ سیاسی

---

❶ رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی' ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی۔ مضمون عام قبائل عرب سے تعلقات۔

❷ ایضاً"

❸ ایضاً"

جغرافیہ کے لحاظ سے یہ خاص کلیدی مقامات پر قابض تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جاگیروں کے فرامین یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ علاقہ شروع ہی میں (ان قبائل کے قبول اسلام سے قبل) حکومت مدینہ کی سرزمین سے سیاسی طور پر ملحق ہو چکا تھا۔ ❶

قبیلہ غطفان کی ایک شاخ بنو اشجع تھے۔ یہ بھی تجارتی شاہ راہ کے متصل آباد تھے۔ شاہراہ کی ناکہ بندی سے جب قریشی سلسلہ تجارت رک گیا۔ تو ان کی معاش پر اس کا اثر پڑا۔ کیونکہ یہ کاروانوں کی خدمت کر کے کمائی کر لیتے تھے۔ معاشی بحران سے مجبور ہو کر ان کا وفد مدینہ پہنچا اور معرکہ خندق سے قبل ہی انہوں نے اسلام قبول کر کے معاہدہ استوار کیا۔ ان کی طرف سے معاہدہ پر دستخط نعیم بن مسعود نے کیے۔ نعیم بن مسعود تو چند ساتھیوں سمیت عین غزوہ خندق کے دوران میں اسلامی تحریک کے دائرے میں آئے۔ اس لیے بوقت معاہدہ سارا قبیلہ داخل اسلام نہ ہوا تھا۔ تاہم معاہدہ کی اساس اس فقرے سے واضح ہوتی ہے کہ "حالفه علی النصر و النصیحة" یعنی حمایت و نصرت اور خیر اندیشی و خیر سگالی کے وسیع تعلقات استوار ہوئے۔ اسی قبیلہ کی ایک شاخ بنو عامر بن عکرمہ نے قافلوں کے پڑاؤ کا کاروبار چلانے کیلئے استحقاق خصوصی کا پروانہ حضورؐ سے حاصل کیا۔ اس شاخ کے ایک سردار کو بھی غزوہ خندق سے قبل جاگیر دی گئی۔ ❷

اب ہم ان چند حلیفانہ رابطوں کا ذکر کرتے ہیں جو غزوہ خندق کے مابعد قائم ہوئے۔ قبیلہ خزاعہ یمن کی قحطانی نسل سے تعلق رکھتا تھا اور بہت سی شاخوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ مکہ کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے۔ بنی مصطلق کے علاوہ اس قبیلہ کی اکثر شاخیں مسلمانوں سے اچھے روابط رکھتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ جناب عبدالمطلب نے ان کے ساتھ مستقل حلیفی رکھی تھی۔ اس قبیلہ نے معاہدہ حدیبیہ کی گنجائش سے فائدہ اٹھا کر علی الاعلان قریش کو چھوڑ کر مدینہ کی اسلامی حکومت سے حلیفی قائم کر لی۔ اسی واسطے کی بنا پر ایک طرف تو اس قبیلے نے جنگ احزاب کے لیے قریش کی تیاریوں کی اطلاع حضورؐ کو پہنچائی اور دوسری طرف حضورؐ نے بھی فتح مکہ سے قبل ان کو ایک مکتوب میں اطمینان دلایا تھا کہ ان کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ نیز اطلاع دی تھی کہ بنو کلاب اور بنو ہوازن نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ لیکن وقت آنے سے قبل یہ بنو بکر کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے اور ان کی مظلومی ہی فتح مکہ کی محرک بنی ❸

خزاعہ کی ایک شاخ بنو اسلم تھے۔ ان کے نام حضورؐ کا جو پروانہ ملتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ نسبتاً پہلے ہی سے اسلام میں داخل اور اسلامی ریاست کے زیر نگین ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو مدینہ میں ہجرت کر کے آبسے تھے۔ اس خاندان کے سردار الحصین بن اوس کو حضورؐ نے جاگیر بھی عطا کی

---

❶ رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی۔ مضمون عام قبائل عرب سے تعلقت۔

❷ ایضاً

❸ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی' از ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی۔ مضمون عام قبائل عرب سے تعلقات۔

تھی۔ جو حلیفانہ تعلقات کی محکمی کی دلیل بھی ہے اور اس سے متعلقہ علاقہ کا الحاق مدینہ سے ہونا بھی متبادر ہوتا ہے۔ ❶

تبوک کے شمالی علاقے میں جذام' قضاعہ اور عذرہ کے قبائل آباد تھے۔ جنہوں نے اپنے مخالفانہ رویہ سے خاصی مشکلات اسلامی حکومت کے لیے پیدا کی تھیں۔ ان لوگوں نے مدینہ کے سفیر کو لوٹ لیا تھا۔ پھر تادیبی مہم ان کے خلاف بھیجی گئی۔ اس مہم کی زد میں غلطی سے بعض بے قصور لوگ بھی آ گئے۔ پس یہ لوگ مدینہ میں فریاد لے کے آئے اور تلافی کی گئی۔ اس طرح تعلقات کی راہیں بھی کھلیں۔ حضورؐ کی دستاویزات میں ایک مکتوب رفاعہ بن زید جذامی کے نام ملتا ہے جس میں بڑا بھاری الٹی میٹم ہے۔ اس سردار کو مخاطب کر کے اس کی ساری قوم کو متنبہ کیا گیا ہے کہ یا تو وہ اسلامی دعوت کو قبول کر کے اللہ اور رسول کی جماعت میں شریک ہو جائے ورنہ روگردانی کرنے کی صورت میں دو ماہ کی امان ہے۔ حالات کا اس نہج سے ارتقاء بالآخر جس صورت پر منتج ہوتا ہے وہ یہ تھی کہ حضورؐ کی تبوک سے واپسی پر ۹ھ مالک بن احمر جذامی نے مدینہ میں آ کر حضورؐ سے ملاقات کی۔ اور پروانہ حاصل کیا۔ اس پروانہ میں وہ شرائط درج ہیں جو معمولاً صرف مسلم قبائل کے لیے ہوتی تھیں' یعنی ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح قضاعہ کا ایک سردار بریدہ بن الحصیب کسی مہم کے دوران میں حضورؐ سے مدینہ کے باہر ہی ملا اور اس نے اپنی قوم کی طرف سے قبول اسلام کا قول دے کر پروانہ حاصل کیا۔ ❷

۶ھ میں قبیلہ کلب کی طرف حضورؐ نے عبدالرحمٰن بن عوف کو ایک دعوتی مہم پر بھیجا۔ نتیجہ حسب منشا نکلا اور سردار نے اظہار وفاداری اور استحکام رابطہ کے لیے اپنی بیٹی کا نکاح عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے کر دیا۔ اسی طرح بارگاہ نبویؐ سے ایک پروانہ کلبیوں کے نومسلم سردار حارثہؓ بن قطن کے نام جاری ہوا۔ جو دومتہ الجندل کے قرب و جوار کے کلبیوں سے متعلق ہے۔ خود اکیدر (والی دومتہ الجندل) سے معاہدہ ہوا۔ اختلاف روایات ہے کہ آیا وہ اسلام لایا یا بغیر اسلام لائے جزیہ دینے کی شرط پر سرداری پر بحال رکھا گیا۔ بہرحال بعد میں اس نے اپنے اسلام یا معاہدہ اطاعت سے انحراف کیا اور حضرت خالد کے ہاتھوں قتل ہوا۔ بعد میں اس کے قلعے اور افتادہ زمینوں کو اسی کلبی سردار حارثہ بن قطن کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ❸

اہل طائف کے عمومی قبول اسلام سے قبل صرد بن عبداللہ یمنی اسلامی تحریک کے علمبرداروں میں آ ملے۔ حضورؐ نے ان کو اس علاقے میں فوجی کارروائیوں کے لیے کمانڈ تفویض کی۔ حضورؐ ہی کے اذن سے انہوں نے جرش کے قلعے کا محاصرہ کیا۔ جو معاہدہ صلح پر منتج ہوا۔ مصالحت کے بعد یہاں کی گورنری ابوسفیانؓ

---

❶ ایضاً

❷ ایضاً

❸ رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی۔ از ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی۔ مضمون۔ عام قبائل عرب سے تعلقات۔

کو سونپی گئی۔ ❶

بنو ازد جو عمان شہر میں آباد تھے اور عبید اور جعفر نامی دو اشخاص ان کے رئیس تھے ان کی طرف عمروؓ بن العاص حضورؐ کا نامۂ دعوت لے کے ۸ ھ میں گئے۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ❷

ہم نے ان قبائل کا تذکرہ آئندہ اوراق کے لیے موخر کر دیا۔ جنہوں نے عام الوفود میں بطور خود مدینہ میں وفود بھیج کر اسلام قبول کیا یا کم سے کم حکومت مدینہ کی سیاسی اطاعت اختیار کی۔

علاوہ ازیں فوجی کارروائی کے نتیجے میں جہاں کہیں کسی گروہ نے اطاعت قبول کرنے یا مصالحت کرنے کی خواہش کی وہاں فوراً اس کے لیے راستہ دیا گیا۔ مدینہ کی مستقل اصولی پالیسی یہ تھی کہ جو محارب بھی صلح کا خواہاں ہو اس کی خواہش امن کا احترام کیا جائے۔ چنانچہ متعدد قبائل نے میدان جنگ میں اترنے کے بعد یا تو سیاسی اطاعت اختیار کی یا اسلام قبول کیا۔ اس سلسلے کی ایک نمایاں مثال خیبر اور ملحقہ علاقہ کے یہودیوں کی ہے کہ مفتوح ہونے پر جب انہوں نے وہیں رہنے کی درخواست کی تو شرائط طے کر کے ان کو رکھ لیا گیا۔

ان سارے واقعات کو سامنے رکھیے تو ماننا پڑتا ہے کہ تصادم سے بچ کر حلیفانہ تعلقات پیدا کرنا حکومت مدینہ کی سرگرمیوں کا اہم ترین شعبہ تھا اور حضورؐ اور آپؐ کے رفقاء نے بہت ساری مہمات اسی شعبہ کار کے لیے اٹھائیں اور متعدد سفر کیے۔ یہ سرگرمیاں اسلامی ریاست کے امن پسندانہ نقطہ نظر کا بڑا بین ثبوت ہیں۔ پھر اس معاملے میں حضورؐ نے ایک اصولی و نظریاتی ریاست کے تقاضے سامنے ہونے کے باوجود پالیسی میں یہاں تک وسعت رکھی کہ اسلام نہ لانے والے قبائل کی طرف سے محض سیاسی حلیفی کو بھی قبول کر لیا۔ اور متعدد صورتوں میں غیر مسلم سرداروں اور حاکموں کو اپنی طرف سے مامور یا بحال فرمایا۔ مدعا یہی تھا کہ تصادم کے مواقع کم سے کم رہ جائیں۔ بعد کا یہ فیصلہ تو بہت سارے تلخ تجربات کی روشنی میں کیا گیا۔ کہ کم سے کم جو سرزمین اسلامی تحریک کے گھر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ماحول کو پاک اور پر امن رکھنے کے لیے اسے مخالف عناصر سے خالی کرا لیا جائے۔ ورنہ ان کی غدارانہ حرکات سارے کام کا ستیاناس کر دیں گی۔

اوپر کے روابط کا تجزیہ کر کے دیکھیں تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جہاں کہیں اسلام پہنچا وہاں سے مدینہ کو سیاسی اطاعت از خود حاصل ہوتی۔ اور اسی طرح جہاں کہیں سیاسی حلیفی کا تعلق قائم ہو گیا' وہاں بھی کچھ ہی مدت میں اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ قبائل کا جب مدینہ سے میل جول بڑھتا ہو گا تو وہ اسلامی نظریہ حیات کے اعجازات کو سر آنکھوں سے دیکھ کر متاثر ہوتے ہوں گے' نیز

---

❶ ایضاً

❷ سیرت النبی ﷺ' شبلی نعمانی ج ۲ ص ۳۳۔

ان کے اندر تحریک کے کارکنوں کو دعوتی کام کرنے کے لیے پر امن فضا حاصل ہوتی گئی۔ دین و سیاست کی یہی وحدت تھی جس نے دس بارہ لاکھ مربع میل علاقے کو چند برس میں اسلام کے رنگ میں رنگ دیا۔

۴ ۔ معاہدہ حدیبیہ:

حضورؐ کی اسلامی تحریک کی تاریخ میں معاہدہ حدیبیہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کے نتیجے میں حالات کے دھارے نے ایک اہم ترین موڑ مڑا۔ اور تحریک حق ایک ہی جست لگا کر اپنی توسیع کے عوامی دور میں داخل ہو گئی۔ محسن انسانیتؐ کی سیاسی بصیرت کی انتہائی معراج کمال اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ درجہ اول کی معاند اور بر سر جنگ طاقت کو حضورؐ نے کس آسانی سے مصالحت پر تیار کر لیا۔ اور اس کے ہاتھ کئی برس کے لیے باندھ دیئے۔ [1]

غداری و بغاوت کے جرم میں جلا وطن شدہ یہود نے جب خیبرؔ تما اور وادی القریٰ میں جا اڈا جمایا تو مدینہ بیک دم دو محاذوں کے درمیان گھر گیا۔ قریش اور یہود کے اتحاد نے لشکر جمع کر کے مدینہ کے سامنے لا کھڑے کیے تھے۔ جنگ احزاب سے بخیریت عمدہ بر آ ہوتے ہوئے حضورؐ کے سامنے یہ پیچیدہ مسئلہ آگیا کہ کیسے اس دوہرے محاذ کو توڑا جائے۔ موجودہ حالت میں مکہ کی طرف اقدام کریں تو خیبر کے یہودی اور بنو غطفان مدینہ پر چڑھائی کر سکتے تھے۔ اور اگر خیبر کی طرف متوجہ ہوں تو قریش دھاوا بول سکتے تھے۔ یہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ دور رس کا کتنا صحیح اندازہ تھا کہ ان دونوں میں سے خیبر کا محاذ ایسا محاذ تھا جسے ایک ہلہ میں توڑا جا سکتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دونوں میں سے قریش مکہ ہی کو بآسانی صلح پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ درحقیقت قریش کی قوت اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اور اگرچہ وہ ظاہراً برابر شورا شوری دکھا رہے تھے۔ لیکن اب تک مقاومت کچھ زیادہ تھی نہیں۔ پھر مکہ اور اس کے آس پاس حضورؐ کے حامی عناصر موجود تھے۔ جن کو آپؐ کے بعض اقدامات نے مضبوط تر کر دیا۔ حضورؐ نے قحط کے دنوں میں مکہ کو غلہ اور نقدی سے مدد دے کر وہاں کے غرباء اور عوام کے دلوں میں گھر کیا تھا۔ چنانچہ ابو سفیان نے کہا بھی تھا کہ اب محمد ﷺ ہمارے لوگوں کو ان طریقوں سے ورغلانا چاہتے ہیں۔ پھر حضورؐ نے ایک اقدام یہ بھی فرمایا کہ مکہ کے سردار اعلیٰ ابو سفیان کی صاحبزادی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ازدواجی رشتہ جوڑا۔ یہ شادی بڑا اہم سیاسی نتیجہ رکھتی تھی۔ بہرحال اب کسی طریقے سے ایک نئے اقدام کی ضرورت تھی۔ جس پر حضورؐ برابر کاوش کرتے رہے۔

---

[1] اس عنوان کا مواد جمع کرنے میں حسب ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا۔ (ا) سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۳۵۵ تا ۳۷۵۔ اصح السیر ص ۲۱۰ تا ۲۲۷۔ سیرت النبی شبلی نعمانی جلد ۱ ص ۴۱۱ تا ۴۴۴۔ رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ص ۱۱۵ تا ۱۲۹۔ المواہب اللدنیہ جلد ۱ ص ۱۲۵ تا ۱۳۳۔ تفسیر ابن کثیر (سورۃ فتح و ممتحنہ)

ادھر ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو مکہ سے بچھڑے ہوئے چھ برس ہونے کو آئے تھے۔ معاملہ محض حب وطن ہی کا نہ تھا بلکہ کعبہ دعوت ابراہیمی کا مرکز تھا۔ اور اسی دعوت ابراہیمی کی تجدید اب مسلم جماعت نے کی تھی۔ اس جماعت کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو اپنے اعتقادی مرکز سے منقطع رکھ سکے۔ قریش اب تک راستہ نہیں دے رہے تھے۔ اور بظاہر کشمکش کا آخری فیصلہ ہونے کے لیے لمبی مدت درکار تھی۔ اس پہلو سے جذبات آہستہ آہستہ مضطرب ہو رہے تھے۔ ضرورت تھی کہ جماعت اسلامی کی طرف سے حرم پر اپنے حق کا اظہار ہو۔

اسی اثنا میں حضورؐ کو ایک رؤیائے صادقہ میں حج کرنے کا اشارہ ہوا۔ بس وہ اشارہ پاتے ہی آپؐ کی بے مثل بصیرت نے بہترین لائحہ عمل بہترین وقت میں اختیار کیا۔ اور اسے بہترین شکل میں جامہ عمل پہنایا۔ آپؐ نے ایک بڑی جماعت کو ساتھ لے کر حج کے حرام مہینوں میں عمرہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۴ سو افراد جو اپنی خوشی سے تیار ہوئے صرف ان کو ساتھ لیا۔ نمیلہ ابن عبداللہ لیثی کو مدینہ میں نیابت سونپ کر مسلمانوں کی کافی تعداد بغرض حفاظت وہیں رہنے دی۔ قربانی کے ستر اونٹ ساتھ لیے۔ جنگی ہتھیار نہیں لگائے گئے۔ روانگی بڑی خاموشی سے ہوئی۔ مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانیوں کو نشان زد کیا گیا۔

یہ سفر ایک طرف مذہبی بھی تھا۔ اور دوسری طرف اس میں بڑا زبردست سیاسی پہلو بھی از خود شامل تھا۔ دین و سیاست کا یہ ایکا تو ہمیں حضورؐ کے سارے کارنامہ حیات میں ملتا ہے۔ پھر حج کے سفر میں دنیوی کاروبار یا سیاسی اقدامات کا شامل کرنا شرعاً بالکل روا ہے۔ سو یہ سفر قریش کے لیے ایک بھاری چیلنج بن گیا۔ اگر وہ ان زائرین حرم کی مزاحمت نہ کریں تو گویا مکہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے لیے کھل گیا۔ پھر حضورؐ اور ان کے رفقاء کے حرم میں آنے سے بہت ہی گہرے اثرات شہر والوں پر پڑ سکتے تھے۔ کیونکہ اسلامی انقلاب کے ان داعیوں کی آمد سے پچھلی تاریخ دعوت کے ان سارے نقوش میں جان پڑ جاتی جو ذرے ذرے پر ثبت تھے۔ پھر عوام میں یہ چرچا بھی پھیل جاتا کہ بس اب قریش ٹائیں ٹائیں فش ہو گئے۔ چنانچہ سہیل بن عمرو (گفتگوئے مصالحت میں مکہ کا نمائندہ) نے کہہ بھی دیا تھا کہ اگر ہم آپ لوگوں کو حرم کعبہ میں داخل ہونے دیں تو سارا عرب یہ کہے گا کہ ہم نے آپ کی قوت سے ڈر کر راستہ کھول دیا۔

حضورؐ کو راستہ ہی میں صورت حالات کا علم ہو گیا تھا۔ ایک خزاعی خبر رساں بشیر بن سفیان نے مقام عسفان پر آکر اطلاع دی کہ قریش مزاحمت کی تیاری میں ہیں۔ اور ان کا فیصلہ یہ ہے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں کبھی داخل نہیں ہو سکتے"۔ آپ کو روکنے کے لیے خالد سواروں کا دستہ لے کر مقام کراع الغمیم تک آچکا ہے۔ حضورؐ نے اس پر فرمایا۔ "یہ قریش کی بدبختی ہے! جنگوں نے ان کا کچومر نکال دیا ہے۔ ان کا کیا حرج ہے کہ وہ بیچ میں سے ہٹ جائیں اور مجھے اور پورے عرب کو نمٹ لینے دیں۔ اگر وہ مجھے ختم کر دیں تو ان کی مراد پوری ہوئی۔ اگر مجھے غلبہ حاصل ہو جائے تو وہ چاہیں تو اپنی تعداد کثیر کے ساتھ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ ورنہ وہ قوت رکھتے ہیں اور اس وقت لڑ لیں۔ ایسا نہ ہو تو پھر خدا کی قسم میں اس حق کو

لے کر جس کے ساتھ مجھے خدا نے اٹھایا ہے آخر دم تک لڑوں گا---- یہاں تک کہ یا تو اس حق کو خدا غالب کر دے یا میری یہ گردن کٹ جائے"۔ گویا آپؐ نے مصالحت کی راہ کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ الٹی میٹم بھی دے دیا۔ اور قریش کی پتلی حالت پر بھی توجہ دلا دی۔

لیکن دوسری طرف زائرین کے قافلے کو روکنے میں بھی قریش کی پوزیشن سخت خراب ہوتی تھی۔ رائے عامہ میں رَو یہ چلتی کہ ان لوگوں نے ایک مذہبی حق میں رکاوٹ ڈالی۔ لڑنے میں پہل کرتے ہیں تو یہ الزام سر آتا ہے کہ حرام مہینوں کی حرمت توڑ دی۔ حضورؐ کی طرف سے پہلے ہی سے حرم کی حرمت کا احترام کرنے اور فقط عمرہ کے لیے غیر جنگی سفر کرنے کا خوب اچھی طرح چرچا ہو چکا تھا۔ پھر جنگی اسلحہ ساتھ نہ تھے اور قربانی کے نشان زد جانوروں کا گلہ نوعیت سفر کی شہادت دے رہا تھا۔ گویا قریش سخت پیچیدگی میں گھر گئے تھے۔ اور اس نازک وقت میں ان کا قائد اعلیٰ ابوسفیان سفر میں تھا۔ یہ حضورؐ ہی کی نگاہ جانتی تھی کہ ساری اکڑ فوں کے باوجود اس وقت قریش کے لیے مصالحت کے ماسوا کوئی چارہ کار نہیں ہے ---- اور یہی اندازوں کی صحت ہی حالات کا رخ بدلتی ہے۔ اور اسی سے کسی کارپرداز کی بصیرت کا معیار سامنے آتا ہے۔

قریش نے پرانی ضدم ضدا کے نشے میں جلد از جلد حلیف قبائل خصوصاً احابیش کی فوجیں بلدح کے مقام پر جمع کر لیں۔

فوراً ہی سفارتی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا۔ سب سے پہلے قبیلہ خزاعہ کے سردار بدیل بن ورقاء (جو اسلام کے لیے حامیانہ جذبات رکھتے تھے) چند اہم ساتھیوں سمیت حضورؐ سے آکر ملے ---- حضورؐ نے بتایا کہ ہم صرف زیارت حرم کے لیے آئے ہیں اور اس کی تعظیم ہمارے مد نظر ہے' جنگ مقصود نہیں۔ قریش جنگ کے بڑے شائق ہیں حالانکہ اس میں سراسر ان کا گھاٹا ہے۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ قریش چند سال کے لیے مصالحت کر لیں۔ اس طرح آپؐ نے اصل مدعا کا بیج شروع ہی میں ڈال دیا۔ انہوں نے قریش سے جا کر بات چیت کی۔ کہ دیکھو جلد بازی نہ کرو۔ محمد ﷺ جنگ کے لیے نہیں' زیارت کے لیے آئے ہیں۔ مگر سر پھرے نوجوان تو پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتے تھے۔ البتہ معمر لوگوں نے ساری بات سنی۔ پھر مکہ سے حلیس بن علقمہ سردار احابیش کو بھیجا گیا۔ اس نے جب قربانی کے جانوروں کا گلہ وادی میں متحرک دیکھا تو متاثر ہوا۔ اس نے قریش کے سامنے جا کر صاف صاف کہا کہ ان زائرین حرم کو روکنا صحیح نہیں اور ہم اس غرض کے لیے نہیں آئے۔ اس سردار کی اشتعالت یہ کہہ کر کی گئی کہ ذرا ہمیں اپنی شرطیں تو منوا لینے دو۔ پھر قریش نے عروہ بن مسعود ثقفی کو نمائندہ بنا کر بھیجا۔ عروہ نے کہا کہ "اے محمد! ﷺ اگر آپؐ نے اپنی ہی قوم کو تباہ کر دیا۔ تو یہ کون سا اچھا کارنامہ ہو گا۔ یہ جو اوباش سے لوگ آپؐ نے اکٹھے کر لیے ہیں یہ چند روز میں چھنٹ چھنٹا جائیں گے تو آپؐ تنہا رہ جائیں گے"۔ یہ بات سن کر حضرت صدیقؓ غضب ناک ہو گئے اور ذرا سخت لفظوں میں عروہ کو ڈانٹا۔ وہ عربوں کے بے تکلفانہ طریق پر بات کرتے ہوئے اپنا ہاتھ حضورؐ کی ڈاڑھی

کی طرف بڑھاتا تو ہر بار حضرت مغیرہ بن شعبہ تلوار کی نوک سے اس کا ہاتھ ہٹا دیتے۔ حضورؐ نے عروہ کے سامنے بھی اپنا موقف رکھ دیا۔ اس شخص نے جو سماں دیکھا اس سے دل میں بے حد متاثر ہو کر واپس ہوا۔ اور جا کے بیان کیا کہ محبت و اطاعت کا جو منظر وہاں میری نگاہوں سے گزرا ہے' وہ تو بڑے سے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں بھی نہیں پایا جاتا۔ محمد ﷺ کے ساتھی تو اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ اور ایک ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہیں۔ اس کے سامنے کوئی شخص اونچی آواز میں بولنے تک کی جرأت نہیں کرتا۔ عروہ کے اس تاثر سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ اسلامی تحریک کی قوت کا ایک راز یہ ہے کہ جماعت اپنی قیادت سے کس درجہ گہری محبت رکھتی ہے۔ اور کس والہانہ طریق سے اطاعت کرتی ہے۔ محبت و اطاعت کے جمع ہو جانے سے ناقابل فتح قوت پیدا ہوتی ہے اور جماعت میں ایسی فضا موجود ہو تو مخالفین کو مرعوب اور کمزور کر دیتی ہے۔ یہاں محض کسی جمہوری ایسوسی ایشن کا سا معاملہ نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے ہیں۔ نہ صدر کو ارکان سے کوئی قلبی تعلق۔ نہ ارکان کو صدر سے کوئی روحانی علاقہ ---- بس دستور اور قاعدے کی ظاہری اطاعت کر دی گئی۔ کیا گندی فضا ہوتی ہے ان جماعتوں کی جو اپنی قیادت پر زہریلی تنقیدیں کرتی ہیں۔ غیبت اور نجویٰ کے محاذ کھولے رہتی ہیں اور طرح طرح کی سازشیں کاشتی رہتی ہیں۔ اسلامی نظام جماعت کی فضا خیر خواہی' وفاداری' اخلاص' محبت اور والہانہ طاعت سے بنتی ہے۔ اس میں ہر رکن کی شخصیت کی اہمیت ہوتی ہے۔ اور قائد کی شخصیت تو سب کے لیے مرکز محبت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نہ رحماء بینھم (الفتح:۲۹) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ علمبرداران حق "بنیان مرصوص" بن سکتے ہیں۔ مسلم جماعت کی یہی فضا اپنی شان کمال کے ساتھ حدیبیہ کے میدان میں جلوہ گر تھی۔ جس نے عروہ کے دل کو مرعوب کر دیا اور اس نے جا کر اسی تاثر کا پرتو مکہ کے خواص پر ڈالا۔

گفت و شنید کے اس سلسلہ کو آگے بڑھانے کے لیے حضورؐ نے خراش بن امیہ کو قریش کی طرف بھیجا۔ مکہ میں لامرکزیت اور انتشار تو تھا ہی۔ کچھ لوگوں نے حضورؐ کے اس اونٹ کو مار ڈالا۔ جس پر سوار ہو کر خراش شہر میں گئے تھے۔ خود ان کی جان بھی مشکل سے بچی اور وہ لوٹ آئے۔ پھر حضرت عثمانؓ کو بھیجا گیا۔ ادھر سر پھرے عناصر کا ایک دستہ دیکھ بھال کے لیے نکلا تھا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں سے چھیڑ خانی کی۔ اور تیر اور پتھر پھینکے۔ ان لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر حضورؐ نے مصلحت کے پیش نظر ان کو رہا کر دیا۔ یعنی قریش کا جنگ پسند عنصر برابر اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح سے جنگی جذبات کی بارود بھڑک اٹھے۔ مگر خدا نے یہ لطف خاص کف ایدیھم عنکم و کف ایدیکم عنھم (الفتح:۲۴) کی فضا کو غالب کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کو قریش نے روک لیا اور واپسی میں دیر ہو گئی' ناخوشگوار واقعات کی وجہ سے فضا ایسی تھی کہ جس میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے۔ حضورؐ نے فوراً جماعت کو اکٹھا کیا اور لڑنے مرنے کی بیعت لی۔ فرمایا کہ "ہم ان لوگوں سے لڑے بغیر نہ پلٹیں گے"۔ حضرت عثمانؓ کی جان اس لمحے بے حد قیمتی ہو گئی تھی۔ کیونکہ بارشاد حضورؐ امر واقعہ یہ تھا کہ "عثمان اللہ اور اس کے رسولؐ کی تفویض کردہ خدمت پر

گئے ہیں"۔ اپنے ایک ہاتھ کو عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیا۔ اور اس پر دوسرا ہاتھ اپنی طرف سے رکھ کر کہا کہ اقرار باندھو! آپؐ کے رفقاء پہلے ہی جذبات سے بھرپور تھے۔ اخلاص سے لپک لپک کر بیعت کرنے لگے۔ یہ اتفاقی لمحہ ازدیادِ ایمان اور تعمیر کردار کا لمحہ تھا۔ اور اس وقت جماعت نے اپنے آپ کو اتنا ارتقاء دے دیا کہ حضورؐ نے فرمایا۔ "آج کے دن تم لوگ تمام زمین والوں سے افضل ہو"۔ اس لمحے کے طفیل ان کو رضائے الٰہی حاصل ہوئی۔ صرف ایک منافق (جد بن قیس) تھا جو اس لمحہ کی سعادتوں سے محروم رہا۔ حق کے علمبرداروں کی راہ میں ایسے بے شمار لمحات آتے ہیں اور اخلاص مند روحیں ان لمحات سے آبیاری حاصل کرتی ہیں۔ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر چودہ سو مسلمانوں کو لڑ مرنے کی جزا مل گئی۔ قریش کو جب اس صورت حالت کا علم ہوا۔ تو انہوں نے فوراً حضرت عثمانؓ کو واپس روانہ کر دیا۔ کیونکہ فی الحقیقت لڑنے سے وہ بھی کتراتا چاہتے تھے۔

پھر مکہ سے مکرز بن حفص آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مردم شناسی ملاحظہ ہو کہ دور ہی سے نظر پڑی تو پکار اٹھے۔ "یہ ایک مکار آدمی ہے"۔ مراد یہ تھی کہ اس کے ذریعے معاملات کبھی بخیر و خوبی طے نہیں ہو سکتے۔

بالآخر قریش نے سہیل بن عمرو کو بھیجا۔ نظام حق کے داعی کی نگاہ حقیقت رس نے دیکھتے ہی اندازہ کر لیا۔ کہ قریش نے اس آدمی کو بھیجا ہے تو پھر وہ صلح پر تیار ہو گئے ہیں۔ شرائط پر ضروری بات چیت ہوئی اور معاہدہ لکھنے کے لیے حضرت علیؓ کاتب بنے۔

معاہدہ ایسے نازک حالات میں لکھا جا رہا تھا کہ بات بات پر کھچاؤ پیدا ہونے لگتا۔ حضورؐ نے پیرایہ آغاز کے طور پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھنے کا حکم دیا۔ سہیل نے کہا۔ کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ رحمٰن و رحیم کیا ہوتا ہے۔ ہمارے معمول کے مطابق "باسمک اللھم" لکھا جائے۔ حضورؐ نے یہ مطالبہ بھی قبول کر لیا۔ پھر فرمایا۔ لکھو۔ ذیل کا معاہدہ محمد رسولؐ اللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے پایا۔ سہیل نے کہا کہ اگر میں یہ مانتا کہ آپؐ خدا کے رسول ہیں تو آپؐ کے خلاف لڑتا ہی کیوں؟ پس اپنا اور اپنے والد کا نام لکھوایئے حضرت علیؓ محمد رسولؐ اللہ کے الفاظ لکھ چکے تھے اور فرط ادب میں اپنے ہاتھ سے "رسول اللہ" کے الفاظ مٹانا ان کو گوارا نہ ہوا۔ حضورؐ نے تحریر لے کر خود یہ لفظ کاٹ دیئے۔ اور ان کی جگہ "محمد بن عبداللہ" لکھا گیا۔

سہیل کی ان زیادتیوں کو نبی پاک ﷺ کے رفقاء دیکھ دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہے تھے مگر احترام رسالتؐ کی وجہ سے دم بخود تھے۔ اب ذیل کی شرائط لکھی جانے لگیں۔

- فریقین دس سال کے لیے جنگ بندی اور صلح رکھیں گے۔
- مسلمان اس سال واپس چلے جائیں اور اگلے سال زیارت کعبہ کے لیے آئیں اور صرف نیام کردہ تلواروں کے ساتھ تین روز حرم میں گزاریں۔

○ قبائل عرب کو آزادی ہو گی' کہ وہ فریقین معاہدہ میں سے جس کے ساتھ چاہیں' حلیفانہ تعلق قائم کریں۔

○ قریش کے تجارتی قافلے حدود مدینہ سے گزریں تو ان کو امان حاصل ہو گی۔

○ قریش کا کوئی آدمی اگر بلا اجازت مدینہ چلا جائے تو وہ واپس کر دیا جائے گا۔ اور اگر کوئی مسلمان مکہ میں آ جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

اس آخری شرط نے جذبات میں سخت بل چل پیدا کر دی۔ پورا ذہنی ماحول سامنے لائیے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ جماعت میں ایسے جذبات کا پیدا ہونا فطری تھا۔ اول تو سرے سے یہی صورت واقعہ کچھ کم نادر نہ تھی کہ وہ قریش جنھوں نے لوگوں کو گھروں سے نکالا۔ جنھوں نے اسلام کے علمبرداروں پر جنگ مسلط کر دی۔ جو آج بھی ان کو حرم سے روک رہے تھے۔ اور قربانیوں کو لوٹا رہے تھے۔ ایسے ظالم اور برسر جنگ مشرکین کے ساتھ یکایک مصالحت کی راہ نکالنا جماعت کے لیے بڑا کاوش طلب واقعہ تھا۔ ان کے سامنے تو ایک ہی کلیہ "بدا بیننا و بینکم العداوۃ والبغضاء ابدا حتی تومنوا باللہ وحدہ" تھا وہ تو ایک ہی موٹے اصول کو جانتے تھے کہ "وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ" (البقرہ۔ ۱۹۳) ان کے سامنے سیدھا سا فارمولا یہی تھا کہ کلمۃ اللہ کو برتر رہنا چاہیے۔ اور کافروں کے کلمہ کا سرنیچا ہونا چاہیے۔ کفر و باطل کے درمیان سمجھوتہ کی گنجائش ان کے ذہنوں میں نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اصولوں کو اگر محض نظریاتی اور فلسفیانہ طور پر لیا جائے تو بات دوسری ہوتی ہے لیکن جب ان کو واقعات کے عملی میدان میں لے کے معرکہ آرا ہوا جائے تو پھر وقت اور مصالح اور حریف اور حامی قوتوں کے حالات کو سامنے رکھ کر مختلف اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہوتا کہ آپ بس آنکھیں بند کر کے سیدھے ہی سیدھے ایک ہی رفتار سے بڑھتے جائیں۔ کہیں رکنا پڑتا ہے' کہیں دو قدم کا ٹھہراؤ اختیار کرنا پڑتا ہے اور کہیں نیا راستہ نکالنے کے لیے دو قدم پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ مختلف دشمنوں کو شکست دینے ہی کے مقصد سے بسا اوقات ان میں سے کسی ایک سے عارضی مصالحت ناگزیر ہوتی ہے۔ تاریخ کے یہ وسیع عملی حقائق حضورؐ کی نگاہوں کے سامنے تو تھے ہی لیکن جماعت کی نگاہ آپؐ کی نگاہ جتنی رسائی نہ رکھتی تھی۔ پھر جب اس جماعت کے سامنے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اور "رسول اللہ" کے الفاظ قلم زد کیے گئے تو جذبات میں خاصا مدوجزر پیدا ہو گیا۔ اس سے بھی بڑھ کر جب وہ غیر مساویانہ اور غیر عادلانہ شرط سامنے آئی تو صبر و ضبط بحال رکھنا مشکل ہو گیا۔ حضورؐ اس معاہدے کے ذریعے جن بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے کی راہ نکال رہے تھے ان پر جہاں قریش کی نظر نہ تھی' وہاں مسلم جماعت بھی پوری طرح ان کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کبھی کبھار بڑی بڑی تحریکوں کے دوران کار میں ایسے نازک لمحے بھی آ جاتے ہیں جب کہ قائد اور جماعت کے درمیان مستقبل کے معاملات کی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ذہنی فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ قیادت کی نگاہ زیادہ فاصلے پر دیکھتی ہے اور جماعت نسبتاً نزدیکی حقیقتوں تک سوچتی ہے یہی مواقع بحران کے مواقع بن جاتے ہیں۔ اور

انھی شاذ مواقع پر ضابطے کی حد سے بڑھی ہوئی جمہوریت خطرناک ہو جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر صرف وہی قیادت اپنا فرض ادا کر سکتی ہے جو رائے عام کا اعتماد و تعاون اس حد تک رکھتی ہو کہ اس کا کوئی بدل نہ پیدا کیا جا سکے۔ ایسی مخلص اور مستحکم قیادت جماعت کو اہم مصالح کی راہ پر مجرد اپنی اخلاقی قوت سے کھینچ کر لے جاتی ہے اور عقلی اطمینان جماعت کو بعد کے حالات و واقعات کو دیکھ لینے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔

غضب یہ ہوا کہ عین اسی حالت میں نمائندہ قریش سہیل کے صاحبزادے ابو جندلؓ بیڑیاں پہنے ہوئے موقع پر آپہنچے۔ ان کو مارا پیٹا گیا تھا اور وہ مظلومی کا ایک مجسمہ تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو سرور عالم ﷺ اور مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ مجوزہ شرط کے مطابق یہی پہلا شخص ہے جسے آپؐ کو واپس کرنا ہو گا۔ حضورؐ نے معاملہ سلجھانے کے لیے فرمایا۔ کہ ابھی معاہدہ لکھا نہیں جا چکا۔ سو ابو جندل کو مستثنیٰ رہنے دو۔ سہیل نے کہا تو پھر کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ پھر آپؐ نے نرمی سے یہ بھی فرمایا۔ کہ اچھا اسے میری خاطر میرے ساتھ آنے دو' نہیں مانا۔ مجبوراً حضورؐ نے اس ظالمانہ مطالبہ کو بڑے مصالح کی خاطر قبول کر لیا۔ اب ابو جندل نے جماعت کو مخاطب کر کے فریاد کی۔ مسلمانو! تم مجھے مشرکوں کو حوالے کر رہے ہو جو مجھے ایمان سے ہٹانے کے لیے مجھ پر تشدد کریں گے۔ یہ اپیل اپنے ماحول میں بڑی اشتعال انگیز تھی۔ مگر حضورؐ اس وقت ٹھنڈے مزاج کا ایک بے مثل نمونہ تھے۔ ابو جندل کو نرمی سے سمجھایا۔ کہ ہم نے معاہدہ میں ایک بات تسلیم کر لی ہے۔ تو اب ہم عہد شکنی نہیں کر سکتے۔ تمہارے لیے اور دوسرے مظلوموں کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی راہ نجات نکالے گا' ذرا صبر سے کام لو۔

جماعت کا اضطراب اس وقت آخری حد کو چھو رہا تھا اور قریش کے خلاف ساری جماعت کے جذبات مجتمع ہو کر جس شخص کے اندر کھول رہے تھے وہ حضرت عمرؓ تھے۔ ان کا کوئی ذاتی اور نفسانی معاملہ نہیں تھا ان کے اندر حمیت حق ہی کام کر رہی تھی۔ پیچ و تاب کے عالم میں انھوں نے پہلے حضرت ابو بکرؓ سے اور رسول اکرم ﷺ سے یوں مکالمت کی:

حضرت عمرؓ: "اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں"؟

رسولؐ خدا: "کیوں نہیں؟"

حضرت عمرؓ: "پھر کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟"

رسولؐ خدا: "کیوں نہیں!"

حضرت عمرؓ: "اور کیا وہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟"

رسولؐ خدا: کیوں نہیں!

حضرت عمرؓ: "پھر ہم دین کے معاملے میں دب کر کیوں معاملہ کریں؟"

رسولؐ خدا: "میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں اس کے کسی حکم کو توڑ نہیں رہا۔ اور نہ وہ مجھے اپنی مدد سے محروم رکھے گا"۔

حضرت عمرؓ چپ تو ہو گئے لیکن جذبات میں دیر تک ٹھہراؤ نہیں آسکا۔ معاہدہ لکھا گیا اور اس پر حضرت عمرؓ نے بطور گواہ دستخط ثبت کر کے اطاعت کی یہ زریں مثال بھی پیش کر دی کہ شرائط پر دل مطمئن نہیں مگر حضورؐ نے فیصلہ کر دیا تو پھر سرکشی بھی نہیں۔

معاہدہ ہو چکا تو حضورؐ نے جماعت کو نحر (اونٹ ذبح کرنے) اور حلق (سر مونڈوانے) کا حکم دیا۔ مگر اضطراب اور غم و اندوہ کی وجہ سے جماعت میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ دوبارہ حکم ہوا تو بھی کوئی نتیجہ نہیں۔ سہ بارہ فرمایا تو بھی وہی حالت طاری رہی۔ اندازہ کیجیے کہ خود حضورؐ کی تربیت یافتہ جماعت میں اس وقت کیسا ذہنی بحران طاری تھا ـــــ اور سبق لیجیے کہ انسانی سرگرمیوں میں کیسے گوناں گوں عالم پیش آتے ہیں۔ حضورؐ کو یہ رنگ دیکھ کر صدمہ ہوا' قیام گاہ پر آئے۔ اور حضرت ام سلمہؓ سے شکایت کی کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ میں نے حکم دیا اور تعمیل نہیں ہوئی' حضرت ام سلمہؓ نے تسلی دلائی کہ معاہدہ کی شرائط سے وہ اندوہ گین ہیں۔ آپؐ باہر نکل کر خود نحر و حلق کیجیے۔ سرور عالم (ﷺ) اٹھے اور باہر آکر قربانی کی اور بال اتروائے۔ اس عملی اقدام نے جماعت کو جادۂ اطاعت پر بحال کر دیا۔ لیکن پھر بھی عالم یہ تھا کہ جیسے یہ لوگ ایک دوسرے کو کچا چبا جائیں گے۔ تاہم یہ رو وقتی رو تھی اور گزر گئی۔

اندازہ کیجیے کہ جنگ سے ہٹ کر مصالحت کی فضا حاصل کرنے کے لیے حضورؐ نے کتنی کٹھن صورت حالات سے گزرنا گوارا کر لیا۔ بلکہ اپنی محبوب جماعت کے نہایت ہی گہرے' پاکیزہ اور مخلصانہ جذبات تک کی قربانی اس مقصد کے لیے دی۔

آپؐ نے اس معاہدہ کے ذریعے عظیم مقاصد حاصل فرمائے۔ ایک یہ کہ مسلم جماعت اور مشرکین مکہ اور عرب کے درمیان ہر طرح کے میل جول کے راستے کھل گئے۔ لوگوں کی آمد و رفت ہوئی۔ برسوں کے بچھڑے ہوئے عزیز و اقارب اکٹھے ہو کر بیٹھے۔ مکہ میں جو غلط فہمیاں حضورؐ اور مسلم جماعت کے بارے میں ہوں گی وہ مشرکین کی طرف سے سامنے آنے لگیں۔ اور مسلمان ان کو صاف کرتے۔ لوگوں کے سوالات کے جوابات دیتے۔ انہیں اپنی روحانی' ذہنی' علمی' اخلاقی اور مادی ترقیوں کا حال بتاتے' دعوت حق اور نظریہ اسلامی گھر گھر زیر بحث آنے لگا۔ اور امن کے حالات میں اسلام اس تیزی سے پھیلا کہ صلح حدیبیہ کے بعد کے دو برس میں اتنی تعداد خوشی خوشی حق کے محاذ پر آکھڑی ہوئی' جتنی اس سے قبل کے اٹھارہ انیس برسوں میں مجموعی طور پر حاصل ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ خالد اور عمرو بن العاص جیسے کام کے نوجوان بھی اسی مصالحت کے بعد حلقہ اسلامی میں آداخل ہوئے۔

دوسرا مقصود یہ حاصل ہوا کہ جنگ و جدال سے نجات پا کر جماعت کی ذہنی و اخلاقی اصلاح اور خود ریاست کے نظم و نسق کی تعمیر کا کام انجام دینے کے لیے یکسوئی حاصل ہو گئی۔ علاوہ ازیں غیر ملکی حکومتوں کو دعوت دینے کا موقع نکل آیا۔

تیسرا فائدہ یہ پہنچا کہ حکومتِ مدینہ خیبر کے معاندانہ محاذ کا قلع قمع کرنے کے لیے قریش کی طرف سے

بالکل بے فکر ہو گئی۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد فوراً ہی اسلامی حکومت اس قضیے سے فارغ ہو گئی۔

چوتھا مفاد یہ حاصل ہوا کہ عرب کے قبائل کو آزادی حاصل ہو گئی کہ ان میں سے جو بھی چاہے حکومت مدینہ کا ساتھ دے۔ یہ ایسا دروازہ کھلا کہ جس میں سے گزر کر نئے نئے عناصر مسلم جماعت کو تعاون بہم پہنچا سکتے تھے اور قریش کوئی روک ٹوک نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ بنو خزاعہ نے توعین موقع ہی پر اسلامی حکومت سے تعلق جوڑ لیا۔

اور پانچواں نتیجہ یہ بھی نکلنا ہی تھا کہ ایک ہی سال بعد بڑے ٹھاٹھ سے یہی جماعت زیارت حرم کے لیے مکہ میں داخل ہوئی اور اس وقت قرآن کی پیش گوئی کے مطابق۔ "لا تخافون" کی فضا میسر تھی۔

سو کہنا چاہیے کہ قریش جیسے کڑے دشمنوں کو مصالحت پر لے آنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست کاری کا ایک نمایاں معجزہ تھا۔ اور ایک شرط میں بظاہر ذرا سا دب کر حضورؐ نے وہ فوائد اور نتائج حاصل کر لیے جن کا تصور بھی قریش اس وقت نہ کر سکے ہوں گے۔ انہیں کب یہ خیال آسکا ہو گا کہ اب ایک طرف ان کے حامی یہودیوں کا جنگی اڈا اکھڑ جانے والا ہے اور وہ اکیلے رہ جائیں گے۔ اور دوسری طرف اسلام لوگوں کو اتنی بڑی تعداد میں کھینچ لے جائے گا' بلکہ خود ان کے شہر میں اتنے اثرات پھیلا دے گا کہ ان کی طاقت موجودہ معیار سے بھی گر جائے گی۔ در حقیقت اس معاہدہ نے وہ راستہ بنا دیا جس پر چل کر اسلامی انقلاب کی طاقت چند برس کے اندر اندر اسی مکہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہونے والی تھی۔

واپسی پر راستے میں ہی سورہ فتح کی آیات نازل ہوئیں۔ جن میں پچھلے واقعات پر تبصرہ تھا اور مستقبل کے مصالح کی جھلک دکھا کر مسلم جماعت کو اللہ تعالیٰ نے بشارتیں دیں۔ ان کو بتایا کہ تم عنقریب ایک ایسے معرکے (یعنی خیبر) میں فتح حاصل کرو گے' جس میں تم کو بہت سا مال غنیمت ملے گا۔ اور اس کے بعد وہ کچھ حاصل ہو گا جو اس وقت تمہاری طاقت سے باہر ہے اور جس کو اللہ ہی نے گرفت میں لے کر محفوظ کر رکھا ہے۔ پھر بتایا کہ اگرچہ مشرکین مکہ کو تم آج بھی شکست دے سکتے تھے' اور وہ یقیناً پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ لیکن ان کے درمیان ایسے مرد و زن گھرے ہوئے ہیں جو مخفی طور پر دین حق کو مان چکے ہیں۔ اور جن کے دل تمہارے ساتھ ہیں۔ اب اگر جنگ ہو جاتی تو وہ مجبوراً تمہارے مقابلے پر آتے اور تم انہیں نہ جاننے کی وجہ سے نشانہ بناتے۔ پس اللہ تعالیٰ کی یہ خاص مہربانی ہوئی کہ اس نے دونوں گروہوں کو ٹکراؤ سے روکا۔ خصوصاً وہ لمحہ یاد دلایا جب کہ کفر کی جانب سے حمیت جاہلیہ کا بڑا کڑا مظاہرہ کیا گیا تھا اور "الرحمٰن الرحیم" اور "رسول اللہ" کے الفاظ تک کی کتابت گوارا نہ کی گئی۔ نیز ابو جندلؓ کے معاملہ میں انتہائی ضد سے کام لیا گیا۔ ایک فریق جب اس طرح کا ٹیڑھا رویہ اختیار کر لیتا ہے تو پھر دوسری طرف بھی نرم اور ٹھنڈے جذبات بر سر کار نہیں آسکتے۔ لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ رسولؐ اور تم مسلمانوں کے اوپر اس نے سکینت اتاری' تمہیں جذبوں پر قابو دیا اور تمہیں تقویٰ اور احتیاط کے اصول پر کاربند رکھا---- اور تم لوگ مشرکین کے مقابلے میں اسی شان کے مستحق اور اہل تھے۔ ورنہ اگر ادھر سے بھی اشتعال سے کام

لیا جاتا تو تصادم ہو جاتا اور وہ سارے مصالح ختم ہو جاتے جو نہایت آسانی سے حاصل ہو رہے تھے۔

سورۂ فتح کا آغاز اس کلمے سے ہوتا ہے کہ "انا فتحنا لک فتحا مبینا" حضرت عمرؓ نے حیرت سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ فتح مبین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ہاں یہ فتح مبین ہے۔ گویا واقعات کی روشنی میں عقلی اطمینان خاصی دیر بعد پیدا ہوا۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے حمیت حق کے مخلصانہ جذبے میں جو جذباتی مظاہرہ کیا تھا اس کی تلافی کے لیے وہ مدتوں نفل عبادات انجام دے دے کر خدا سے عفو طلبی کرتے رہے۔ اخلاص کی شان یہی ہے۔ دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ صدیق کی شان یہ تھی کہ اس عمومی لمحہ اضطراب میں ان کو پورا پورا اطمینان رہا۔ اور انسانی جماعتوں کو مزاجوں کی یہی رنگا رنگی ایک خاص ترکیب دیتی ہے۔ ان کا ایک سرا اگر صدیقی رجحان سے بنتا ہے تو دوسرا سرا فاروقی انداز سے۔

اب سنئے کہ کیسے معاہدہ کی وہی دفعہ قریش کے لیے وبال جان بن گئی' جسے تسلیم کرا کے وہ اپنا پلڑا جھکتا محسوس کر رہے تھے۔ اول تو اس کی وجہ سے مکہ میں خفیہ طور پر اسلام قبول کرنے والوں کا حلقہ اندر ہی اندر بڑھتا گیا اور ان کی وجہ سے قریش کی اجتماعیت کھوکھلی ہوتی گئی۔ دوسری طرف ایک بہت ہی سنگین واقعہ پیش آیا۔ ابو بصیرؓ عتبہ بن اسید کسی نہ کسی طرح مکہ سے نکلے اور مدینہ جا پہنچے۔ ان کو لینے کے لیے قریش نے دو آدمیوں کا وفد بھیجا۔ حضورؐ پابندی عہد کے اٹل اصول سے مجبور تھے۔ سو ابو بصیرؓ کو لوٹا دیا گیا۔ آپ نے ابو بصیرؓ کو بھی وہی تاکید کی کہ تم لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی راستہ نکالے گا۔ چار و ناچار ابو بصیر لوٹ گئے۔ راستہ میں موقعہ پا کر انہوں نے دو میں سے ایک نگران کو اسی کی تلوار سے قتل کر دیا اور خود بھاگ کر مدینہ آ گئے۔ دوسرا نگران پھر شکایت لے کر آ موجود ہوا۔ ابو بصیرؓ نے حضورؐ کے سامنے وضاحت کر دی کہ آپؐ نے اپنا عہد نبھا دیا اور مجھے دشمنوں کے سپرد کر دیا۔ لیکن میں اپنے آپ کو مشرکوں کے سپرد کر کے ایمان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ سو میں نے اپنی ذمہ داری پر یہ اقدام کیا ہے۔ آپؐ پر کوئی ذمہ داری ہے ہی نہیں۔ خدا نے مجھے بچا لیا۔ حضورؐ نے بڑے پر معنی طریق سے فرمایا "اسے کچھ آدمی مل جائیں تو یہ تو جنگ بھڑکا دے گا"۔ ابو بصیرؓ کو اندیشہ ہوا کہ شاید مجھے پھر مکہ روانہ کر دیا جائے اس لیے وہ چپکے سے مدینہ سے نکل کر ساحل سمندر کی طرف مقام عیص (قریب بہ ذوالمرہ) جا پہنچے۔ اور وہاں ڈیرہ ڈال دیا۔ بعد میں ابو جندلؓ بھی وہیں آ گئے۔ پھر مکہ سے اور لوگ بھی نکلتے اور سیدھے ساحل کا رخ کرتے۔ ہوتے ہوتے ستر جوانوں کا دستہ یہاں جمع ہو گیا۔ مکہ والوں سے ان کی اصولی کشمکش بھی تھی۔ اور ذاتی مظلومی کا جذبہ انتقام بھی تھا۔ اور یہ حکومت مدینہ کے شہری بھی نہ تھے کہ ان پر معاہدہ کی ذمہ داری ہوتی۔ یہ گویا ایک "آزاد اسلامی محاذ" تھا۔ ان لوگوں نے قریش کے قافلوں کی مزاحمت شروع کی۔ یہاں تک کہ قریش عاجز آ گئے۔ سو انہوں نے خود ہی درخواست کر کے معاہدہ سے اپنی محبوب شرط نکلوائی۔ بعد ازیں ان نوجوانوں کو حضورؐ نے مدینہ بلا لیا اور نو مسلموں کے لیے مکہ سے ہجرت کرنے کا راستہ بالکل کھل گیا۔

ایک اہم مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب ام کلثوم جو کہ سردار عقبہ ابن ابی معیط کی صاحبزادی تھیں'

ہجرت کر کے مدینہ آ پہنچیں۔ ان کو واپس لے جانے کے لیے ان کے دو بھائی عمارہ اور ولید بھی ساتھ آگئے۔ معاملہ حضورؐ کے سامنے آیا۔ تو بحکم الٰہی آپؐ نے ام کلثوم کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک اصولی مسلک کی خواتین کو دشمن یا مخالف کے سپرد کرنے کا معاملہ مردوں سے بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ اس انکار میں ایک ایسا اخلاقی وزن موجود تھا اور معاہدہ کے الفاظ بھی ایسے عمومی سے تھے کہ عورتوں کے مسئلہ میں تعبیری اختلاف کی گنجائش نکلتی تھی۔ اس لیے جب دونوں بھائی واپس پہنچے تو قریش نے اس صورت کو قبول کر لیا۔ حضورؐ نے سورہ ممتحنہ کے احکام کے تحت اسی انکار کے ساتھ چونکہ چند اور فیصلے کیے تھے۔ کہ ایک تو مسلمان اپنی ان سابق کافرہ بیویوں کو طلاق دے دیویں' جو مکہ میں تھیں اور دونوں طرف سے مہرادا کیے جائیں۔ اس لیے بحیثیت مجموعی یہ معاملہ قریش کو بھی اچھا معلوم ہوا۔

یہ تھا وہ تاریخی معاہدہ جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بجائے خود فتح عظیم کی حیثیت رکھتا تھا اور جس تک قریش کو لانے اور اس سلسلے کے جملہ پر پیچ مراحل کو طے کرنے میں حضورؐ نے ایسی سیاسی حکمت اور قائدانہ بصیرت کا مظاہرہ کیا جس سے بعد والوں کو تاقیامت رہنمائی ملتی رہے گی۔ یہ مصالحت حضورؐ کی سیاست کاری کا ایک بے مثل شاہکار ہے۔

عمرۃ القضا:

معاہدہ میں طے تھا کہ اس سال مسلمان واپس چلے جائیں اور اگلے سال آکر زیارت کر لیں۔ چنانچہ دوسرے سال ۷ ھ میں حضورؐ نے رفقاء سمیت مکہ کا رخ کیا۔ یہ سفر بھی اگر مرتبہ اول میں دینی تھا تو مرتبہ دوم میں سیاسی۔ اس سے گہرے اثرات فضا میں مترتب ہوئے۔ اور اس کی وجہ سے اسلام کا نفوذ نہ صرف مکہ میں بڑھ گیا۔ بلکہ سارے عرب میں بھی مسلمانوں کا حرم میں آزادانہ داخلہ نہایت اچھے ذہنی اثرات کا موجب ہوا۔

دو ہزار افراد سو گھوڑوں اور قربانی کے ساٹھ (یا اسی) اونٹوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اسلحہ کا ذخیرہ بند حالت میں ساتھ لیا گیا۔ مگر آگے جا کر مقام یاجج میں رکھ دیا گیا۔ بروئے معاہدہ قریش کو تین دن کے لیے مسلمانوں کے لیے حرم بالکل کھول دینا پڑا۔ بعض کٹر مخالفین تو شہر چھوڑ کر دور جبل قعیقعان وغیرہ کی طرف چلے گئے تاکہ اس منظر کو دیکھنے نہ پائیں۔ لیکن عام باشندے' عورتیں اور بچے دارالندوہ کے پاس صف باندھے کھڑے تھے اور اس انقلابی طاقت کا نظارہ کر رہے تھے۔ جس نے مکہ ہی کی فضاؤں میں ابتدائی نشوونما پائی تھی۔

داخلہ اس شان سے ہوا کہ عبداللہ بن رواحہ حضورؐ کی سواری کی باگ تھامے ہوئے آگے آگے ایک رجزیہ گیت الاپ رہے تھے چند بول یہ تھے۔

باسم الذی لا دین الا دینہ   باسمک الذی محمد رسولہ

اس ہستی کا نام لے کر ہم داخل ہوتے ہیں جس کے دین کے علاوہ کوئی دین نہیں۔ اس ہستی کا نام لے کر ہم داخل ہوتے ہیں۔ محمد ﷺ جس کے رسول ہیں۔

خلو بنی الکفار عن سبیلہ قد نزل الرحمن فی تنزیلہ

اے کفار کی اولاد' اس کے راستے سے ہٹ جاؤ الرحمٰن نے اپنی نازل کردہ کتاب میں یہ تعلیم دی ہے۔

بان خیر القتل فی سبیلہ یا رب انی مومن بقیلہ

کہ بہترین جنگ وہ ہے جو خود اس کی راہ میں لڑی جائے۔ اے میرے پروردگار! میں تیرے نبیؐ کے قول پر ایمان رکھتا ہوں۔

گیت ہی گیت میں پوری دعوت حق بیان ہو رہی تھی۔ جس کی گونج سے مکہ کی فضائیں برسوں سے خالی ہو چکی تھیں۔ اس میں جہاد تک کا رجز شامل تھا۔ اس میں رحمٰن کے اسی پیارے نام کی پکار ہو رہی تھی' جس سے قریش کو چڑ تھی۔ اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان ہو رہا تھا۔ اسلام دشمن طاقت کو پر معنی انداز سے کہا جا رہا تھا کہ اس رسولؐ کے راستے سے ہٹ جاؤ مزاحمت چھوڑ دو۔ آج کوئی نہ تھا جو مکہ میں رکاوٹ ڈال سکے۔ معاہدے نے ہاتھوں اور زبانوں کو باندھ رکھا تھا۔

حضورؐ نے داخلہ کے وقت جماعت کو حکم دیا کہ خوب مونڈھے کھول کر اور سینہ تان کر چلو اور چھیل چھیل کر طواف کرو۔ تاکہ اس پروپیگنڈے کی تردید ہو جائے کہ مہاجرین کی حالت بھوک اور بخار نے پتلی کر رکھی ہے۔ اس وقت دشمنوں کو مرعوب کرنا ضروری تھا۔ حضورؐ نے کیا خوب فرمایا کہ: خدا کی رحمت ہو اس شخص پر جو آج کفار کے سامنے قوت کا اظہار کرے"۔ اسی مصلحت سے آپ استلام رکن یمانی سے استلام رکن اسود تک نرم چال (مشی) چلتے اور اس حصے میں دیکھنے والا مجمع او جھل ہو جاتا۔ پھر بعد کے دور میں ہلکی دوڑ (ہرول) لگاتے اور یہی حصہ مجمع کے سامنے تھا۔ معلوم ہوا کہ مخالف حلقوں میں علمبرداران اسلام کی کمزوری (خواہ وہ جسمانی ہو) کے چرچوں کا روکنا اور ان پر قوت و شوکت کے مظاہرہ سے رعب ڈالنا اسلامی سیاست کی ایک اہم حکمت ہے۔ یہ اتنی اہم حکمت ہے کہ عین حرم میں اور عین دوران طواف میں بھی اس کو ملحوظ رکھا گیا۔ یہ مظاہرہ قوت کبر و غرور کی تعریف میں نہیں لایا جا سکتا۔ بلکہ یہ عین کار ثواب ہے۔ ایسے موقع پر اگر فروتنی اور انکسار دکھایا جائے تو وہ بالکل الٹا پڑے۔ ان چھوٹے چھوٹے امور سے شہادت ملتی ہے کہ حضورؐ وقت کے سیاسی تقاضوں پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے۔ اور ان کو پورا کرنے کا کتنا اہتمام کرتے تھے۔ آخر یہ سیاست ذاتی جاہ کے لیے نہ تھی۔ خدائی نظام عدل کی سربلندی کے لیے تھی۔ اس لیے سراسر دین تھی۔ اور اس کا ہر اقدام ایک عبادت تھا۔

غور کیجئے کہ نظام حق کے داعیوں کی اس جماعت کو جب مکہ کا مجمع دیکھ رہا ہو گا تو مردوں اور عورتوں اور بچوں پر کیسے کیسے اثرات پڑ رہے ہوں گے۔ خیال آتے ہوں گے کہ یہ اسی دین کی فصل ہے جس نے

مکہ سے آغاز کیا تھا ------ اور پھر غار حرا' خانہ ارقم' شعب ابی طالب اور الندوہ اور غار ثور کے تاریخی مقامات ان کے سامنے سر اٹھا اٹھا کر کہتے ہوں گے کہ دیکھو نیکی کی یہ طاقت کتنی عظیم ہے اور تم اس کے مقابلے میں کتنے فروتر ہو کے رہ گئے ہو۔ مکہ کی گلیوں کے ذرے تڑپ کے اٹھے ہوں گے اور ان لوگوں سے کہتے ہوں گے کہ یہ وہ صبر کیش لوگ ہیں جن کو تم نے بغیر کسی جرم کے کئی سال تک دکھ دیئے تھے' دیکھو کہ آج وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ کتنے ہی کانٹوں نے سر اٹھا کر کہا ہو گا کہ تم نے ہماری نوکوں سے ان جسموں کو اذیت دی تھی۔ پھر کہیں سے حضرت ابوذرؓ کی کلمہ کی وہ پہلی پکار کعبہ سے گونجنے لگی ہو گی۔ جس پر ہنگامہ مچ گیا تھا۔ کہیں سے حضرت بلالؓ کی احد احد کی صدائیں بلند ہونے لگی ہوں گی' جو تپتی ریت کے بستر پر پڑ کر دل سے اٹھتی تھیں۔ دارالندوہ چیخنے لگا ہو گا کہ تم لوگوں نے جس کے قتل کی سازشیں کی تھیں اس کا پیغام گوشے گوشے میں تبدیلی لا رہا ہے۔ تیرہ برس کی تاریخ ہر چہار جانب سے امڈ پڑی ہو گی۔ اور پھر بدر اور احد میں کام آنے والوں کی یادیں خونیں پیراہن سجائے نمودار ہوئی ہوں گی ----- اور ان کی روحوں سے صدا اٹھی ہو گی کہ تم بھی جاگو۔ تم بھی بدلو' تم بھی آگے بڑھو اور اس سیل رواں میں شامل ہو جاؤ۔

ایک طرف اس جماعت کے طرز عبادت کا مظاہرہ ہوا ہو گا۔ اور دوسری طرف یہ اخلاقی مثال قائم ہوئی ہو گی کہ اتنی بڑی تعداد شہر مکہ میں تین دن تک موجود رہی لیکن باوجود سخت عناد کے کسی کے جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ گھر جس طرح مقفل کر کے مشرکین باہر نکل گئے تھے' اسی طرح صحیح سلامت رہے۔

اسلام کے حامی عناصر جو مکہ میں ایمان چھپائے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں اس نظارے سے کیسی ٹھنڈی ہوئی ہوں گی۔ ان کے جذبوں کو ایک نئی طاقت ملی ہو گی۔ ان کے اندر تازہ امیدیں ابھر آئی ہوں گی۔ مخالفین اپنے آپ کو کتنا پِستا ہوا محسوس کر رہے ہوں گے۔ اور ان کی آنکھوں کے سامنے کتنا تاریک مستقبل ہو گا۔

تین دن تک شہر کی فضاؤں میں یہ گھٹا موتی برساتی رہی۔ چوتھے روز سہیل بن عمرو اور خویطب بن عبدالعزیٰ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے۔ جب کہ آپؐ انصار کے درمیان بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ سہیل نے کہا کہ تین دن پورے ہو چکے اب میری زمین سے نکل جاؤ۔ سعد بن عبادہ اس طرز خطاب پر ضبط نہ کر سکے۔ انھوں نے کہا "زمین نہ تیری ہے نہ تیرے باپ کی۔ ہم ہرگز نہ نکلیں گے"۔ حضورؐ نے فوراً ہی فضا کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ذرا لطیف انداز گفتگو اختیار کیا۔ حضورؐ نے حضرت میمونہؓ سے اسی موقع پر نکاح فرمایا تھا۔ فرمایا کہ دیکھو ہم نے یہاں سے نکاح کیا ہے۔ کیا حرج ہے کہ ذرا کھانا وانا پک جائے۔ ہم بھی کھائیں اور آپ لوگ بھی شریک ہوں۔ اس فقرے میں کئی پہلو تھے۔ مگر ان کی کثافت مزاج میں فرق نہ آیا۔ کہا گیا کہ ہمیں کھانے وانے کی ضرورت نہیں۔ بس آپ چلے جایئے۔ وہ بے چارے بھی کیا کرتے۔ دیکھ رہے تھے کہ ساری فضا متاثر ہو رہی ہے۔ ان کے اصرار کی وجہ سے حضورؐ نے جماعت کو کوچ کا حکم

دیا۔ چلتے وقت حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی چھوٹی سی بچی "یا عم! یا عم!" پکارتی دوڑی آئی اور آپؐ سے لپٹ گئی۔ کیا ہی رقت آمیز سماں ہو گا۔ حضورؐ نے اس بچی کو ساتھ لے لیا۔ اور کسی قدر نزاع کے بعد اپنی خالہ کے سپرد کر دیا۔ جو زیدؓ بن حارثہ کی اہلیہ تھیں۔

اب یاد کیجئے اس واقعہ کو کہ حدیبیہ سے واپسی میں حضورؐ پر اعتراض ہوا تھا کہ آپؐ نے تو فرمایا تھا کہ ہم حرم میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے (سوال کا مدعا یہ تھا کہ ایسا ہوا تو نہیں!) حضورؐ نے جواب دیا۔ "میں نے یہ کب کہا تھا کہ اسی سال"! ---- اور اگر واقعی ۶ ھ میں وہ بات پوری بھی ہوتی تو اس شان سے نہ ہوتی بلکہ خون خرابے کے ساتھ ہوتی۔ ایک سال کا فاصلہ تحریکوں کی تاریخ میں ایک لمحہ کی سی نوعیت رکھتا ہے۔ ذرا سے وقفے کے بعد بے خوفی کی حالت میں اور پوری آن بان سے حرم میں داخلہ اور عمرہ کا ہونا بے حد برکات رکھتا تھا۔

پھر جب اس واقعہ کا قبائل عرب میں چرچا ہوا ہو گا تو رائے عام اس تبدیلی احوال سے بہرحال متاثر ہوئی ہو گی۔ لوگ محسوس کرتے ہوں گے کہ جس مکہ سے مسلمانوں کو نکالا گیا تھا' اس میں وہ سینہ تانے اور مونڈھے کھولے داخل ہوئے۔ جو قریش مسلم جماعت کو مٹا دینے کے درپے تھے' انہوں نے اسی سے مصالحت کر کے اپنے آپ کو بے بس کر لیا۔ اس سے یہ اندازے لازماً باندھے گئے ہوں گے کہ مستقبل مدینہ کا ہے! ظاہر بات ہے کہ دلوں کے دروازے اسلام کے لیے اور زیادہ کھل گئے ہوں گے۔

مختصر یہ کہ عمرۃ القضا بھی اسلام کے فروغ میں بہت مد ہوا۔

جہاد کا اثر رائے عام پر:

جیسا کہ ہم اوپر پورے زور سے یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ تحریک اسلامی اور جاہلیت کے درمیان اصل معرکہ رائے عام کے وسیع میدان میں ہوا' مسلسل اٹھارہ بیس برس جاری رہا اور اسی وسیع میدان میں آخری فیصلہ بھی ہوا۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مسلم جماعت کے معرکہ ہائے جہاد کا سرے سے اس فیصلے کے ہونے میں کوئی دخل ہی نہ تھا۔

اصلاح و تعمیر کے کام میں قوت بجائے خود ایک اہم ضرورت ہے لیکن اجتماعی دائرے میں کوئی انقلاب آج تک بجز اس صورت کے نہیں آیا کہ اس کے علمبردار اپنے آپ کو مضبوط اور غالب و برتر ثابت کر دیں۔ اور راستہ کی رکاوٹوں کو ہٹانے اور شرپسندانہ مزاحمتوں کو ختم کرنے کے لیے بوقت ضرورت قوت کا استعمال کامیابی سے کر دکھائیں۔ مجرد مذہب جسے انسانی زندگی کے صرف ایک چھوٹے سے خانے سے واسطہ ہوتا ہے' اسے لے کر چلیئے تو وعظ اور فیضان نظر سے بڑھ کر کسی سرگرمی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اوپر کوئی سا نظام سایہ پھیلائے ہوئے ہو اور معیشت و معاشرت کے معاملات کسی بھی نہج پر چل رہے ہوں' لوگوں کے ذہنوں میں کچھ بھلے سے عقائد کی جگہ بھی نکالی جا سکتی ہے۔ ان کو کچھ جاپ اور منتر اور ---- وظیفے

سکھائے جاسکتے ہیں۔ اور ان کو مسکینی و تواضع اور رحم دلی و ہمدردی جیسی خوبیوں سے بھی کسی نہ کسی حد تک آراستہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک فاسد اور ظالمانہ نظام میں اپنی خدمات کھپاتے ہوئے اور اس کے بنائے ہوئے نہایت ہی انسانیت کُش راستوں سے رزق اور مفادات حاصل کرتے ہوئے ضمیر میں جو گھاؤ پڑتے رہتے ہیں' صوفیانہ طرز کے انفرادی مذاہب اور ان کے بنائے ہوئے پیری مریدی کے ادارے ان کو ساتھ کے ساتھ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیتے رہتے ہیں۔ اور ان پر مرہم لگے پھاہے رکھتے ہیں۔ بدترین تمدن کے اندر چھوٹا سا گوشہ عافیت نکال لینے والے مذاہب بھی درحقیقت انسان کے ذوق فراریت کی تخلیق ہیں۔ وہ اجتماعیت کے دائرے میں بڑے بڑے جرائم کرنے اور خوفناک مظالم میں حصہ لینے کے بعد انفرادیت کی کٹیا میں بیٹھ کر اپنے خدا کو راضی کرتا اور اپنے روٹھے ہوئے ضمیر کو مناتا ہے۔ لیکن جو دین غیر الٰہی نظام زندگی کے گاڑھے میں یاد خدا کے مخمل کا ذرا سا پیوند لگا کر مطمئن نہ ہوتا ہو' بلکہ جسے پوری زندگی کو اپنے ہی رنگ میں رنگنا ہو اس کا کام نرے لجاجت آمیز وعظوں' خلوت پسندانہ ریاضتوں اور خدمت خلق کے محدود جذبوں سے نہیں چل سکتا۔ اسے باطل کے قفس کو توڑنے' ظلم کے دست و پا کو باندھ دینے اور امن و انصاف کے دور تمدن کی طرح ڈالنے کے لیے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اجتماعی تبدیلیاں' بغیر مزاحمتوں کے نہیں واقع ہو جاتیں اور مزاحمتیں توڑنے کے لیے نرے وعظ کافی نہیں ہوتے۔ جن کے جمے جمائے سلسلہ ہائے مفادات کو اکھیڑا جاتا ہے۔ اور جن کے ڈھب پر کام کرنے والی ترتیب معاشرہ کو بدلا جاتا ہے' وہ اپنا سارا زور تخریبی اقدامات میں کھپا دیتے ہیں۔ کوئی تحریک ان کو جب تک زور بازو سے کام لے کر راستہ سے نہ ہٹائے' اجتماعی اصلاح کے خوش آئند خوابوں کی تعبیر کبھی برآمد نہیں ہو سکتی۔

اسلام جب اٹھا اور اس نے عین اس اساسی تصور حیات پر ضرب لگائی جس پر عرب کا جاہلی معاشرہ چل رہا تھا۔ اور نیم مشرکانہ' نیم مادہ پرستانہ ذہنیت کو لا الٰہ الا اللہ کی زد پر لیا' تو بالکل ابتدا ہی میں جاہلی نظام کے علمبردار سمجھ گئے کہ یہ تو ایک شاہ ضرب ہے' جو پوری عمارت کو توڑ کر نئی تعمیر کے لیے لگائی گئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی بھرپور مخالفت و مزاحمت کی گئی۔ اساسی انقلاب اور ہمہ گیر تبدیلی کی ایسی دعوت جب بھی کبھی رونما ہوتی ہے تو معاشرہ بالعموم تین بڑے بڑے عناصر میں منقسم ہو جاتا ہے۔ وقت سے آگے ہو کر چلنے والے اور دور تک کے مستقبل کو دیکھنے والے ذہین ترین اور فعال ترین لوگ جن کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے انقلابی دعوت پر آہستہ آہستہ لبیک کہتے ہیں۔ ان کے بالمقابل پرانے نظام میں رہنمائی کرنے والے اور بڑے بڑے مفاد رکھنے والے عناصر متحرک ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے زیر اثر طبقوں میں سے بہت بڑی تعداد اپنے حامیوں کی نکال لیتے ہیں۔ ان دونوں قوتوں کے درمیان جن میں سے اول الذکر نشوونما پاتی ہوئی اقلیت ہوتی ہے اور موخر الذکر سکڑتی اور پارہ پارہ ہوتی ہوئی اکثریت ہوتی ہے۔ لمبی کشمکش ہوتی ہے۔ یہ دونوں فعال قوتیں تو فکری اور سیاسی اکھاڑے میں آجاتی ہیں اور عوام کا انبوہ کثیر باہر تماشائی بن کر یہ دیکھتا رہتا ہے کہ کب پلڑا کدھر جھکتا ہے اور اس کھیل کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس تیسرے عنصر میں

جتنے بھی ذہین اور متحرک کردار موجود ہیں وہ بھی آہستہ آہستہ میدان کارزار میں اترتے جاتے ہیں۔ لیکن بہت بھاری اکثریت آخری نتیجہ کا انتظار کرتی ہے۔ ان میں بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جو پرانے نظام کے اندھے پرستار ہوتے ہیں۔ اور یہ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ وہ کبھی ٹوٹ سکتا ہے اور جب تک وہ انہیں ٹوٹتا دکھائی نہ دے ان کے اندر ذہنی تبدیلی آ ہی نہیں سکتی۔ ان میں سے بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جو آہستہ آہستہ نئی قوت کے دلائل سے بھی اور اس کے اخلاقی اوصاف سے بھی متاثر ہوتے جاتے ہیں۔ اور بعض تمنا کرنے لگتے ہیں کہ کاش کہ یہ قوت غالب ہو جائے۔ مگر وہ پرانی طاقت سے مرعوب ہوتے ہیں۔ بعض دعوت انقلاب سے متاثر ہو کر قدم آگے بڑھانا بھی چاہتے ہیں لیکن سابق قیادت نے ان کو اس بری طرح اپنے پنجے میں جکڑ رکھا ہوتا ہے کہ وہ ہلنے جلنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی حد تک حق و باطل کا معیار ہی اس چیز کو بنا لیتے ہیں کہ دو نظریوں میں غالب و برتر کون سا رہتا ہے۔ خصوصیت سے جب دعوت اسلامی ہو تو یہ طرز فکر عوام میں زیادہ بڑے پیمانے پر پھیلتا ہے۔

عوام کی یہ وہ ذہنی و نفسیاتی کیفیات ہوتی ہیں جو کسی تعمیری و اصلاحی پیغام کی قبولیت میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ اور کشمکش کے مدوجزر سے ان کیفیات میں جیسی جیسی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں' دعوت کو انہی کے مطابق اپنے فروغ میں سہولت یا دقت پیش آتی ہے پس کسی بھی نئی دعوت کے علمبرداروں کے لیے راستہ جبھی کھل سکتا ہے جب کہ وہ کش مکش میں اتنی ثابت قدمی دکھائیں اور مزاحم قوت پر اتنے کاری وار کریں کہ عوام ایک طرف یہ محسوس کرنے لگیں' کہ پرانی قیادت کو بدلنا اور پرانے نظام کو توڑنا کوئی ناممکن عمل نہیں ہے اور دوسری طرف وہ نئی قوت سے امیدیں وابستہ کر لیں کہ اس کے بازوؤں میں اتنا بل بوتا ہے کہ یہ ظلم اور جاہلیت کے علمبرداروں کو اچھی طرح جھنجھوڑ سکے۔ پس جب بھی رائے عام کی فضا میں ایسا تاثر چھا جاتا ہے تو ایک اصلاحی و تعمیری دعوت کے لیے دلوں کے دروازے پوری طرح کھل جاتے ہیں۔

مدینہ کی اسلامی حکومت نے قریش اور یہود کے جنگی چیلنج کا جواب جس جرأت اور شجاعت سے دیا' اور بھرپور طریق سے دیا' اس کا مقصود یہ نہیں تھا کہ تلوار کے زور سے کچھ لوگوں کو میدان جنگ میں اسلام کا قائل کر لیا جائے۔ بلکہ جنگ جویانہ مزاحمتوں سے اپنا بچاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ مطلوب یہ تھا کہ عامتہ الناس کے حوصلے بڑھیں' ان کی امیدیں مدینہ کی انقلابی قوت سے وابستہ ہوں' وہ نظریہ اسلامی سے ایک روشن مستقبل کے ظہور کی توقع کریں۔ اور جاہلی نظام کے ٹوٹ جانے کا امکان کم سے کم ان پر واضح ہو جائے۔

چنانچہ بدر کا اولین معرکہ ہوا تو ہر چہار جانب سے نگاہیں زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے پر لگی تھیں کہ دیکھیں پہلے تصادم میں کون کس کو پچھاڑتا ہے۔ اب جب یہ منظر عوام کے سامنے آیا ہو گا کہ مٹھی بھر مسلم سپاہی جن کے پاس ضرورت کا سامان کم سے کم حد تک بھی مکمل نہ تھا' انہوں نے اپنے سے تین گنا تعداد کے لشکر جرار کو بری طرح زک دے دی ہے۔ اور مکہ کے نامی گرامی سرداروں کا مع ابوجہل کے

صفایا کر دیا ہے تو کیا سارے عرب میں اس محیرالعقول واقعہ کی دھوم نہ مچ گئی ہو گی۔ اس کے چرچے اور تذکرے گھر گھر نہ ہوئے ہوں گے اور اس نے رائے عام پر گہرا اثر نہ ڈالا ہو گا۔ اس واقعہ سے پہلی بار عرب میں یہ امید پیدا ہوئی ہو گی کہ مدینہ کی اسلامی طاقت محض کچھ ایسے اللہ والوں پر مشتمل نہیں ہے جو ساری عمر مار کھا کھا کر خدا کی رضا اور روح کی شانتی حاصل کرنے کے لیے بھگت بن گئے ہوں۔ بلکہ اس طاقت کے ہاتھوں ایک نہ ایک دن کایا پلٹ جانے والی ہے۔

پھر احد میں معاملہ برابر برابر کا رہا' تو اثرات بھی بین بین قسم کے رہے ہوں گے۔ اس کے بعد خندق کا معرکہ پیش آیا۔ تو عرب نے دیکھا کہ چاروں طرف سے لشکر ایک تباہ کن طوفان کی مانند امڈ کر آئے۔ اور مہینہ بھر مدینہ کا محاصرہ کرنے کے لیے چمٹے چھٹنا گئے۔ جیسے مٹھی بھر بھوسے کو کوئی پھونک مار کر اڑا دے۔ اس واقعہ سے یہ اثر بہرحال پھیلا ہو گا کہ مسلم طاقت کی جڑیں اب اتنی مضبوط ہیں کہ مخالفین کی متحدہ قوت بھی ان کو نہیں ہلا سکی۔

ان بڑے معرکوں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی قبائلی قیادتوں کی طرف بھی مدینہ نے پوری توجہ رکھی۔ یہ مقامی قیادتیں چونکہ ملک گیر جاہلی نظام قیادت کی لمبی زنجیر ہی کی کڑیاں تھیں اور ایک ایک کر کے ان کو توڑے بغیر اس لمبی زنجیر سے عوام کو رہائی دلانا ممکن نہ تھا۔ اس لیے اس کی کچھ کڑیاں تو دعوت کے اثر سے از خود ٹوٹ گئیں۔ کچھ کو معاہدانہ اور حلیفانہ روابط کے ذریعے زنجیر جاہلیت سے کاٹ لیا گیا۔ اور بقیہ نے جدھر سے بھی مزاحمت کے لیے سر اٹھایا اسلامی حکومت نے فوراً ادھر توجہ کی' اور وقت کے وقت سرکوبی کر دی۔ باغیوں' چوروں' ڈاکوؤں' جنگجوؤں' شورش پسندوں کی ایسی متواتر اور بروقت خبر لی گئی' جیسی کہ ملاء اعلیٰ کی طرف شیاطین کے رخ کرنے پر شہابوں سے ان کی تواضع کی جاتی ہے۔ مدینہ کے آس پاس لا اینڈ آرڈر پوری طرح جما دیا گیا۔ اور پر امن ماحول پیدا کر دیا گیا۔ ورنہ اگر چو طرفہ بکھرے ہوئے اعرابی قبائل کو ذرا بھی ڈھیل ملتی تو مدینہ کی پہلی منظم حکومت کا تجربہ ابتدا ہی میں ناکام ہو گیا ہوتا۔ تاریخی ریکارڈ دیکھئے تو ہجرت کے پہلے سال سے لے کر فتح مکہ تک کا دور نت نئی بغاوتوں' شورشوں اور اجتماعی فسادات سے بھرا پڑا ہے۔ کل ادھر جنگی اجتماع ہو رہا تھا' آج ادھر ڈاکوؤں کی ٹولیاں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ایک دن اس جانب کسی جتھے نے غارت ڈالی' دوسرے دن اس جانب کسی دستے نے مدینہ کے شہریوں کو گھائل کر دیا۔ کوئی جنگی سازش ادھر ہو رہی ہے۔ کوئی باغیانہ منصوبہ ادھر بن رہا ہے۔ مگر مدینہ خوب چوکس تھا۔ کہیں طلایہ گردی کو ٹولیاں نکل رہی ہیں۔ کہیں فوجی مہم کی ترسیل کی جا رہی ہے اور کہیں پولیس کارروائی کے لیے کوئی ٹیم روانہ ہو رہی ہے۔

ان سارے حالات نے عرب پر بہرحال یہ اثر ڈالا ہو گا کہ مسلم طاقت "لب بہ بند و چشم بند و گوش بند" قسم کی طاقت نہیں ہے۔ وہ ایک زندہ' بیدار اور فعال حکومت ہے جو چوکھی لڑ کر مخالف قبائل کے بے شمار محاذوں سے نمٹ رہی ہے۔ ایک نہ ایک دن یہ بازی لے جائے گی۔

پھر جب مدینہ میں یہودی اثر کا خاتمہ کر دیا گیا ہو گا۔ اور اس کے بعد موزوں وقت آتے ہی خیبر کا مخالف محاذ توڑ دیا گیا تھا۔ تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رائے عام کی فضا قبول دعوت کے لیے ان واقعات سے کس طرح ساز گار ہوتی گئی ہو گی۔

اور فتح مکہ کے زلزلہ افگن واقعہ نے عرب کو اس سرے سے اس سرے تک جھنجوڑ کر جاہلیت کی نیند سے جگا دیا ہو گا۔ اور تحریک اسلامی نے نئے دور کی اذان پکار کر پیغام دیا ہو گا کہ اٹھو! اجالا ہو گیا۔ اب ہر اندھے نے بھی دیکھ لیا ہو گا کہ جاہلیت مٹنے والی تھی' اور مٹ گئی۔ اب انتہائی قدامت پسند' مقلد اور مرعوب ذہن کے نچلے طبقوں کو بھی یقین آگیا ہو گا کہ قریش کی فرسودہ قیادت کا دور ختم ہو گیا۔ اب ہر بلید ترین بدو نے بھی سمجھ لیا ہو گا کہ محمد ﷺ کا پیغام' علم' کردار' زندگی' حرکت' ترقی' تعمیر' نظم' امن' انصاف اور قوت سے آراستہ کرنے والا پیغام ہے۔ اور عوامی ذہن نے اپنے کواڑوں کی کنڈیاں کھول دی ہوں گی اور اپنے روزنوں سے پردے ہٹا دیئے ہوں گے' تا کہ اسلامی تحریک کی شعاعیں اندر آسکیں۔

پھر ان جنگی کارروائیوں کے اندر خود اسلام کی دعوت کام کر رہی ہوتی تھی۔ یہ لڑائیاں محض تلواروں اور تیروں کی لڑائیاں نہ تھیں۔ یہ عقیدوں اور نظریوں اور کرداروں کی لڑائیاں بھی تھیں۔ ان لڑائیوں میں مسلم طاقت تکبیر کا نیا نعرہ لے کے آئی تھی۔ وہ میدان جنگ میں بھی ذوق رکوع و سجود اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ دشمن کے خلاف اگر پورے جوش قوت سے حملہ آور ہوتی تھی تو دوسری طرف دشمن کے سامنے وہ اپنے خدا کے حضور عاجزی سے سر رکھتی تھی۔ پھر اس کا نئی طرز کا ڈسپلن تھا۔ اور اس کے قواعد تھے اور اس کے مخصوص اطوار تھے۔ پھر وہ شہادت اور جنت اور رضائے الٰہی اور حیات ابدی کے تصورات لے کے آئی تھی۔ جن کی مستی میں اس کے سپاہی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آگے بڑھتے تھے اور ہنستے مسکراتے اپنی متاع حیات اپنے نصب العین کے قدموں میں نچھاور کر دیتے تھے۔ پھر ان کا ایک درخشاں جنگی اخلاق تھا۔ دوسرے لوگ موسیقی کی تانوں پر حرکت کرتے تھے۔ اور اسلامی تحریک کے جانباز فقط نغمہ توحید کی تانوں سے تحریک لیتے تھے۔ دوسرے لوگ شرابیں پی پی کر شجاعت کا مظاہرہ کرتے اور اسلام کے سپاہی فقط احساس فرض کی مقدس صہبا سے سرشار ہوتے تھے۔ دوسرے لوگ مال غنیمت کی ہوس لے کر جوہر دکھاتے تھے۔ اور محسن انسانیتؐ کے پیرو صرف رضائے الٰہی کی طلب میں خاک و خون میں لوٹ جاتے تھے۔ دوسرے لوگ قوم' قبیلے اور نسل کی عصبیت میں بھک کر حملہ آور ہوتے تھے مگر اللہ کے مجاہد صرف دین' حق اور سچائی کی حمایت میں معرکہ آرا ہوتے تھے۔ دوسرے لوگ قتال کے دوران میں نہایت درجہ کی وحشیانہ کارروائیاں کرتے تھے۔ مثلاً مخالفین کو آگ میں جلانا یا باندھ کر مارنا' ان کے مقتولوں کی لاشوں کی بے حرمتی کرنا' ان کی کھوپڑیوں میں شرابیں پینا' کلیجہ چبانا' عورتوں اور بچوں کو ذبح کرنا' حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑ دینا' لیکن مسلم طاقت ایسی انوکھی فوج تیار کر کے میدان میں لائی جو قتال میں بھی انسانیت کی اخلاقی حدوں کا احترام کرنے والی تھی۔ جس نے نہ کبھی کسی کو وحشیانہ طریق سے قتل

کیا' نہ لاشوں کی بے حرمتی کی' نہ عورتوں اور بچوں پر اپنی تیغ شجاعت کو آزمایا' بلکہ اس پہلو سے اخلاق باختہ مخالفین کی چیرہ دستیوں پر صبر کر کے اپنی طرف سے بہترین نمونہ پیش کیا۔ دوسرے تو قیدیوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرتے تھے۔ مگر مسلم طاقت نے ان کو اپنے شہریوں کے ساتھ بھائی بھائی بنا کر رکھا۔ دوسرے قول و قرار کر کے پھر جاتے تھے۔ مگر مسلم طاقت نے نازک ترین مواقع پر ہر نقصان اٹھا کر بھی اپنے عہد کو نبھایا۔ اور اگر ذمہ اٹھایا تو اس کا حق ادا کر دیا۔ دوسرے مفتوح شہروں میں گھس کر سول آبادی کو ظلم کا نشانہ بناتے تھے۔ مگر مسلم طاقت نے اپنی سپاہ کو ہمیشہ کے لیے اس بات سے روک دیا کہ گھروں میں گھس کر کسی شہری کو نہ مارا جائے۔ اور نہ کسی کے ذاتی سامان کو قبضہ میں لیا جائے بلکہ دشمن کی سول آبادی سے جبراً رسد تک حاصل کرنا حرام کر دیا گیا۔ دوسروں کے لیے لڑائی ایک دنیوی کارروائی تھی۔ لیکن مسلم جماعت نے اسے انتہائی بلند عبادت قرار دیا۔

پھر محسن انسانیت ﷺ کے حکم سے عین میدان جنگ میں بھی دشمن کے سامنے دعوت اسلام پیش کی جاتی تھی۔ تین راستے مخالف کیلئے کھلے ہوتے۔ اولاً اسلام میں آؤ' اور بھائی بھائی بن جاؤ۔ ثانیاً سیاسی اطاعت قبول کر لو۔ ثالثاً میدان جنگ میں مقابلہ کر لو۔ حالانکہ دوسروں کے ہاں ایسی کوئی اصولی دعوت نہ ہوتی۔ ان کی طرف سے دو ہی راستے کھلے ہوتے کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو یا میدان جنگ میں آؤ۔

دو قوتوں کا یہ عظیم الشان فرق میدان جنگ کے اسکرین پر کتنا نمایاں ہو جاتا ہو گا۔ اور اس فرق سے آگاہ ہو کر سارا عرب متاثر ہوتا ہو گا۔ یعنی مدینہ کی اسلامی قوت کا ایک طرف تیزی سے نشوونما پانا اور دوسری طرف اپنے کردار سے اپنے نظریے کی صداقت اور بالاتری کو ثابت کرنا۔ یہ دو گونہ اثرات تھے جو جنگی کارروائیوں کے ذریعے عرب کی رائے عام پر برابر پڑتے رہے۔ ان اثرات نے جوں جوں دعوت حق کے لیے راستہ صاف کیا۔ لوگ اسلام سے وابستہ ہوتے گئے۔ یہ اثرات' صلح حدیبیہ کے بعد خاصے نمایاں ہو گئے تھے' اس لیے اس دور میں عوام تیزی سے اسلام کی طرف بڑھے۔ پھر فتح مکہ کے بعد یہ اثرات پوری طرح غالب ہو گئے اس لیے پورے کا پورا عرب بیک دم اصلاحی تحریک کے سایہ رحمت میں آگیا۔ ان دونوں ادوار میں عوام نے جس تیزی سے اپنے آپ کو اسلام کے حوالے کیا ہے اسے دیکھ کر یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ قریش کی قیادت عوام کے راستے میں کتنی بڑی رکاوٹ تھی۔ اور اس رکاوٹ کے ہٹتے ہی ذہنی انقلاب رونما ہو گیا۔ جہاں کہیں بھی کوئی غالب طبقہ اس طرح سے رکاوٹ بنا موجود رہتا ہے وہاں عوام میں وعظ و نصیحت کا اثر کسی بڑے پیمانے پر کبھی رونما نہیں ہو سکتا۔ اجتماعی فضا کو بدلنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ایسی رکاوٹ کو ہٹایا جائے۔ اور اس کے لیے پوری پوری سیاسی جدوجہد کی جائے۔ اسلامی دعوت کی تکمیل سیاسی جدوجہد کی تکمیل ہی پر منحصر ہے۔

حکومت خود معلم انقلاب تھی:

پھر جو علاقے متعلقہ قبائل کے اسلام لانے، معاہدانہ تعلقات قائم کرنے یا سیاسی اطاعت قبول کرنے سے مدینہ کی اسلامی حکومت کے زیر نگین آئے تھے ان کو یونہی چھوڑ نہیں دیا گیا کہ وہ جس حال میں پڑے ہوں پڑے رہیں اور جو بھی خیالات و کردار ان میں رائج ہوں ہوتے رہیں۔ بلکہ ان تک دعوت پہنچانے اور ان کی تعلیم و تربیت کرنے کے لیے موثر انتظامات کیے جاتے۔ معاملہ صرف اتنا نہ تھا کہ قوت کی لاٹھی گھما کر کسی علاقے کو زیر نگین کیا اور پھر انسانوں کو اندر سے تبدیل کیے بغیر بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کی طرح ہانکتے پھرے۔ اگر ہر چیز تلوار کی نوک سے منوائی جاتی اور ہر تبدیلی ڈنڈے کے زور سے کی جاتی تو یہ جباری چار دن چل سکتی تھی لیکن دل بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور پھر عوام کی بیزاری کا لاوہ پھٹتا تو سارا کیا کرایا ہُوا ہو جاتا۔ قوت کے استعمال کا جزء تحریک اسلامی کے کام میں دوسرے ہر نظام کے مقابلے میں انتہائی قلیل تھا۔ اور دعوت اور تعلیم و تربیت کا عنصر بہت ہی غالب تھا۔

اصولی نظریوں پر قائم ہونے والی حکومتیں اپنے اندر تبلیغی روح رکھتی ہیں اور ان کی ساری سرگرمیوں میں مقدم ترین مقصود یہ ہوتا ہے کہ عوام کے دل اس اصول اور اعتقاد کو سمجھیں اور اخلاص سے قبول کریں جس پر نظام حیات کی اساس قائم ہے۔ ان کے تمام کے تمام محکموں کو اپنے مخصوص کاموں کے ساتھ ساتھ اس مرکزی فرض کو بھی انجام دینا ہوتا ہے۔ ایسی حکومتیں ہر اس مفید ترین چیز کو مسترد کر دیں گی جو ان کے اساسی نظریہ کو نقصان پہنچائے اور ہر اس نقصان دہ صورت کو بھی اختیار کر لیں گی جو لوگوں کے ذہنوں میں بنیادی اصول کو راسخ کرے۔ ان کے سامنے تمام مصلحتوں میں سے اہم ترین مصلحت یہی ہوتی ہے کہ شہری نئے نظام کی روح کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں اور ہم آہنگ رہیں۔ اور اس کے دستُ بازو بن کر اپنے اندرونی جذبے سے کرنے کے کام کریں اور مٹانے کی چیزوں کو مٹائیں۔

چنانچہ مدینہ کی اسلامی حکومت نے ایک طرف تو یہ اہتمام کیا کہ سخت ترین جنگی حالات میں بھی ملحقہ علاقوں میں دعوتی اور تبلیغی وفود روانہ کیے۔ کم از کم چار مواقع ایسے ہیں کہ جن میں مدینہ سے جانے والے داعیان حق کو شرپسند عناصر نے شہید کر دیا۔ دعوت کی راہ میں انتہائی مظلومی کے ساتھ شہید ہونے والوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ جنگ بدر، جنگ احد اور جنگ خندق کے جملہ مسلم شہدا سے زیادہ تھی۔ بہر حال انتہائی نازک اور مشکل حالات (Emergency) میں بھی اس بنیادی فریضہ سے غفلت نہیں برتی گئی، بلکہ قربانیاں دے دے کر اسے جاری رکھا گیا۔ پھر بعض اصحاب کو مدینہ میں کچھ تربیت دے کر انہی کے قبائل میں داعی کے طور پر مامور کر دیا گیا۔ ایسے چند نام ہمارے سامنے ہیں (۱) طفیلؓ بن عمرو دوسی (قبیلہ دوس) (۲) عروہؓ بن مسعود (ثقیف) (۳) عامرؓ بن شہر (ہمدان) (۴) ضمامؓ بن ثعلبہ (بنو سعد) (۵) منقذؓ بن حبان (بحرین) (۶) ثمامہؓ بن اثال (نجد)۔ علاوہ ازیں بعض قبائل یا افراد کی طرف خصوصی اصحاب دعوت کو مامور کر کے روانہ

کیا گیا۔ جیسے حضرت علیؓ کو ہمدان۔ حزیمہ۔ اور مذحج کی طرف۔ مغیرہؓ بن شعبہ کو نجران کی طرف' دبرؓ بن نحیس کو ابنائے فارس (فارس کے رؤساء جو یمن میں مقیم ہوئے) کی طرف۔ محیصہؓ بن مسعود کو فدک کی طرف۔ احنفؓ کو قبیلہ سلیم کی طرف۔ خالدؓ بن ولید کو علاقہ مکہ کی طرف' عمروؓ بن عاص کو عمان کی طرف اور مہاجرؓ بن ابی امیہ کو حارث بن کلال شہزادہ یمن کی طرف روانہ کیا گیا۔

لیکن اس سے بہت بڑے پیمانے پر اسلامی حکومت نے اپنے سول حکام سے اسلام کی اشاعت اور تحریک اسلامی کے فروغ کی خدمت لی۔ اسلامی حکومت کے افسر کچھ نوکری پیشہ لوگ نہ تھے اور نہ وہ روٹی کمانے کے خیال سے بھرتی ہوتے تھے۔ وہاں تو مقصود صرف کلمتہ اللہ کو سربلند کرنا اور انسانوں کو بھلائی کے راستے پر ڈالنا تھا۔ یہ کام تنخواہ کے پجاریوں کے کرنے ہی کا نہ تھا۔ یہ تو صرف اس نورانی انقلاب کے بے لوث خادموں ہی کی دلچسپی کی چیز ہو سکتی تھی۔ اور انہی کے ہاتھوں یہ ہو بھی سکتا تھا۔ وہ لوگ نہ تو کسی عہدے کا لالچ رکھتے تھے اور نہ گریڈوں اور ترقیوں کے چکر میں پڑتے تھے۔ ان کو تو عہدے خود پکارتے تھے اور فرائض خود چن چن کر بلاتے تھے اور گزر بسر کے معاوضے پر ان سے انتہائی اونچی خدمات لی جاتی تھیں۔ یہاں ایک ہی مثال کافی ہو گی۔ کہ عتابؓ بن اسید کو مکہ کا گورنر مقرر کیا گیا تو ایک درہم یومیہ تنخواہ مقرر کی۔ اس گورنر نے تقریر میں خود کہا۔ کہ "خدا اس شخص کو بھوکا رکھے جو ایک درہم روزانہ پا کر بھی بھوکا رہا" (ابن ہشام)۔ یہ لوگ اپنے عقیدے اور اپنے محبوب نظام کے داعی پہلے تھے اور کچھ اور اس کے بعد تھے۔ پس مدینہ کی حکومت جن لوگوں کو بھی کسی جگہ گورنر' جج' تحصیلدار اور مال افسر مقرر کرتی تھی۔ وہ اپنے اپنے حدود عمل میں توحید کے داعی' اسلام کے معلم اور اخلاق عامہ کے معمار بھی ہوتے تھے۔ ان حضرات کو جب ان کے فرائض سے آگاہ کیا جاتا تھا تو اس وقت حضورؐ اس اساسی فرض پر بھی ان کو متوجہ فرما لیتے تھے۔ مثلاً حضرت معاذؓ بن جبل کو جند (یمن) میں مالی' انتظامی اور عدالتی فرائض سونپ کر افسر مقرر کیا تو ان کو یہ تلقین بھی فرمائی کہ "لوگوں کو قرآن کی تعلیم دو۔ اور انہیں اسلام کے احکام سکھاؤ"۔ پھر انہیں اہل کتاب مخاطبین کو ملحوظ نظر رکھ کر تفصیل سے دعوت کا اسلوب سمجھایا کہ انہیں توحید کی دعوت دینا۔ اسے مانیں تو پھر نماز کے لیے کہنا اور اس کے بعد زکوٰۃ کے لیے۔ یہی افسر اکثر و بیشتر اپنے ہیڈ کوارٹر میں امام صلوٰۃ بھی ہوتے تھے۔ البتہ بڑی آبادیوں میں جہاں تقسیم فرائض ناگزیر ہوتی وہاں انتظامی افسروں کے ساتھ مستقل آئمہ صلوٰۃ کا تقرر بھی کیا جاتا جیسے کہ عتابؓ بن اسید مکہ میں۔ عثمانؓ بن ابی العاص طائف میں اور ابو زیدؓ انصاری عمان میں مامور ہوئے۔

سول افسروں کی تعداد چونکہ خاصی زیادہ ہے اس لیے ہم یہاں فہرست نہیں دے رہے لیکن اس تعداد کو دیکھا جائے اور ان کے علاقہ ہائے تقرر کو دیکھا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ اسلامی حکومت کی سول سروس نے اسلام کی روشنی کو پھیلانے میں کتنا بڑا کام کیا ہو گا۔ پھر یہ داعیان حق اپنی افسری میں اس عام تصور سے بالکل مختلف تھے۔ جو اس وقت پھیلا ہوا ہو گا۔ نہ وہ خدا سے بے خوفی' نہ وہ ٹھاٹھ باٹھ نہ وہ جور

و تعدی' نہ وہ عوام سے دور دور رہتا' نہ لوگوں کی ضروریات و حاجات سے غفلت' نہ ہٹو بچو کی صدائیں' نہ دربانوں اور چاؤشوں کا ہنگامہ' نہ محلات و قصور' نہ سلب و نہب' نہ رشوت ستانی' نہ خوشامدیوں کے حلقے' نہ اندھی داد و دہش' نہ شرابوں کے دور' نہ موسیقی کے زیر و بم' نہ رقاصاؤں کے ہجوم ---- یہ سول افسر بالکل نئی قسم کے افسر تھے۔ یہ حاکم نئے انداز کے حاکم تھے۔ لوگوں کے لیے ان کی حکومت کا تجربہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ کم تنخواہیں لینے والے' سادہ گزر بسر کرنے والے' دیانتداری سے فرائض ادا کرنے والے۔ رعایا سے رحم و کرم رکھنے والے' بے لاگ انصاف پر چلنے والے اور پھر اپنے خدا کے سچے پرستار ---- یہ نیا حاکمانہ کردار دلوں کو مسحور کر کر کے قریب لاتا ہو گا۔ اور پھر جب یہ لوگ سچائی کا پیغام دیتے ہوں گے تو وہ سیدھا سینوں میں جاگزیں ہو جاتا ہو گا۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو علاقہ زبید و عدن کا حاکم مقرر کیا گیا تو ان کی دعوت سے وہاں کے سارے لوگ بہت جلد مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح جریرؓ بن عبداللہ بجلی کو یمن کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے حمیریوں (ذوالکلاع حمیری) پر افسر مقرر کیا گیا تھا۔ انہوں نے اتنا اثر ڈالا کہ وہ لوگ اسلامی تحریک میں شامل ہوئے اور اسی خوشی میں انہوں نے ۴ ہزار غلام آزاد کیے۔

گویا حکومت کے سول محکمے اس سرگرمی اور یک جہتی سے متواتر کام کر رہے تھے۔ اور اسی وسیع پیمانے کی تعلیمی مہم کا نتیجہ تھا کہ عرب کی بعید ترین آبادیوں میں صرف سیاسی نہیں ذہنی اور قلبی انقلاب رونما ہوتا چلا گیا۔ اور اسی کے ساتھ اخلاقی لحاظ سے کایا پلٹ گئی۔ بالآخر عرب کا اجتماعی انسان بدل کر بالکل نئے روپ میں ابھرا۔

عوام کی معاشی فلاح:

عرب کی کثیر التعداد بدوی آبادی تو بالعموم بالکل ہی خستہ حال تھی اور بیشتر صحرائی قبائل خانہ بدوش رہتے اور مویشیوں سے حاصل شدہ قلیل معیشت کے ساتھ مسلح لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر لیتے۔ شہروں سے دور اعرابیوں کے مقیم قبائل کی حالت بھی پتلی تھی۔ ان کے اندر کے شیوخ اور سردار معاشی جد و جہد کے بیشتر ثمرات لے اڑتے۔ شہر تھے ہی کتنے ---- مکہ' مدینہ' طائف' صنعاء' حضرموت وغیرہ۔ پھر یہ بھی بہت بڑے شہر نہ تھے۔ قلیل آبادیاں تھیں۔ یہ قلیل آبادیاں بہ حیثیت مجموعی خوش حال تھیں۔ مگر خود ان میں بھی بالائی اور زیریں طبقات تھے۔ بالائی طبقے زیریں طبقات سے بھی ان کا حق نچوڑ لے جاتے تھے۔ مدینہ میں یہودی تجارت اور زراعت کے ساتھ ساتھ سود خواری کے جال پھیلائے ہوئے تھے۔ اسی طرح مکہ اور طائف کے بڑے بڑے مال دار لوگ بھی دوسرے ذرائع کے ساتھ ساتھ مہاجنی کاروبار کرتے تھے۔ اوپر کے چند خاندانوں کے اسراف کا یہ عالم تھا کہ شرابیں پی کر چاہیں تو پچاسوں اونٹوں کی گردنیں کاٹ دیں اور پھر فیاضی کا سکہ جمائیں۔ گانا بجانا' معاشقے' بدکاریاں ان کے کلچر کے نمایاں ابواب تھے۔ لیکن

دوسری طرف عوام عرب کا یہ حال تھا کہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے گوہ تک کا شکار کرتے۔ ٹڈی دل آتے تو ٹڈیاں کھاتے۔ چھپکلیاں تک چٹ کر جاتے۔ مردہ جانوروں کا گوشت اور جما کر خشک کیا ہوا خون اور سوکھا ہوا چمڑہ تک بھون لیتے۔ زندہ جانوروں کے بدن سے ٹکڑے کاٹ کر کھالیتے۔ سرے سے حلال و حرام اور طیب و مکروہ کی تمیز ہی نہ تھی۔ لباس اور غذا اور مسکن ہی کا مسئلہ حل نہ ہو پاتا تھا تو تعلیم اور صحت اور اس سے اوپر کے مسائل کا کیا ذکر۔ علاج کے لیے وہاں بتوں کے حضور پر ارتھنا ہوتی اور کچھ ٹونے ٹوٹکے چلتے تھے' کاہنوں اور نجومیوں کی چاندی ہو جاتی تھی۔ تعلیم نہایت محدود پیمانے پر شہروں کے صرف اعلیٰ خاندانوں کے اندر بھی تھوڑے سے افراد کو حاصل ہوئی۔ بقیہ سارا عرب جو کچھ بھی علم حاصل کرتا تھا' اپنی روز مرہ کی عملی زندگی کے مدرسہ سے حاصل کرتا تھا۔ بہر حال وہاں کا ایک بنیادی اور ٹھوس سوال روٹی تھا۔ جس قوم کی عظیم اکثریت ہر وقت "کھائیں گے کیا" کے سوال پر سوچتی رہتی ہے اسے نہ تو اعلیٰ تر حقیقتوں کا ذوق دیا جا سکتا ہے۔ اور نہ وہ بڑے بڑے مقاصد کے لیے کوئی عظیم کارنامہ انجام دے سکتی ہے۔ معاشی محرومی کی پستی میں گرے ہوؤں کو اگر سہارا دے کر کوئی نظریہ اوپر نہ اٹھا سکتا ہو اور ان کی تواضع فقط وعظوں سے کرے تو کبھی بھی بڑے پیمانے پر وہ عوام کو حرکت میں نہیں لا سکتا۔ پھر اگر وہ تلوار کے زور سے اپنی حکومت بھی جما لے۔ لیکن وہ حکومت زندگی کے اولین معاشی مسئلے کا کوئی حل نہ دے سکے' تو ایسی صورت میں محض اخلاقی مفہوم میں تعمیر و اصلاح کو قبول کرنے پر عام لوگ کبھی تیار نہیں ہو سکتے بلکہ ایسے تعمیر و اصلاح کو ایک مصیبت اور عذاب سمجھ کر اس سے نجات پانے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔ انسانیت نظریہ حق سے جبھی مفتوح ہوتی ہے۔ جب کہ وہ عاقبت کے ساتھ دنیا کو بھی سنوارے اور اخلاقی اصلاح کے ساتھ معاش کے قضیے کا حل بھی نکالے۔ لوگ اسی قوت کی زبان سے وعظ سن کر متاثر ہوتے ہیں' بلکہ اس کے عصائے تادیب کی ضربیں بھی ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں' جس کے ہاتھوں سے ان کے مسئلہ رزق کا قفل کھلے۔ جس طرح نرا مسئلہ معاش لے کے اٹھنا انسانیت کو اخلاقی لحاظ سے ہلاکت میں ڈالنا ہے' اسی طرح اخلاقی اصلاح کے کام کو زندگی کے معاشی تقاضوں سے الگ کر کے لینا سرے سے اخلاقی اصلاح ہی کو ناکام بنا دیتا ہے۔ اسلام دونوں ضرورتوں کا جامع ہے۔ محسنؐ انسانیت نے جو تحریک چلائی وہ جہاں دلوں کو نور ایمان اور روحوں کو اخلاقی اقدار دیتی تھی۔ وہاں وہ پیٹ کی روٹی بہم پہنچانے کے لیے بھی بہترین تدابیر عمل میں لاتی تھی۔ عین آغاز ہی میں اسلام کے مختصر سے اخلاقی ضابطہ میں "اطعام مساکین" بڑی اہمیت کے ساتھ شامل تھا' پھر یتیموں' بیواؤں اور مسافروں کی خبر گیری کرنا ہر مسلم پر لازم تھا۔

عرب جیسے کم پیداوار ملک میں دولت ـــــ سیم و زر اور اجناس کی شکل میں بھی' زرعی اراضی کی شکل میں بھی اور مویشیوں کی شکل میں بھی ـــــ نہایت محدود حلقوں میں سمٹی ہوئی تھی۔ دولت کی ان جھیلوں اور تالابوں کے بند کاٹ کر اس کو عوامی طبقوں کی طرف بہاؤ میں لانا بڑا ہی ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ اور اس مسئلے کا حل کیے بغیر زندگی کے بڑے بڑے معاملات کی درستی ممکن نہ تھی۔ اسلام کے معاشی قوانین (جو

تدریجاً نازل ہوئے) ایک متوسط حالت میں تو دولت کو گردش میں رکھنے کے لیے بالکل کافی تھے۔ لیکن ان قوانین کے نفاذ سے بھی قبل بڑا مسئلہ دولت کی ان جھیلوں کا تھا جو عرب کے صحرا میں پائی جاتی تھیں۔ یہ ادق مسئلہ سرگرمی جہاد سے از خود اس خوبی سے حل ہوا کہ کوئی متبادل صورت اتنی کامیاب مشکل ہی سے ہو سکتی۔

دنیا کے ہر دینی اور لادینی قانون میں ---- اس دور سے لے کر موجودہ دور تک ---- مغلوب دشمن کے اسلحہ اور ساز و سامان کو بطور غنیمت قبضے میں لینا ایک مسلمہ حق رہا ہے۔ جنگ کو روکنے کے لیے انسانی جانیں لینے سے زیادہ کارگر تدبیر یہ ہے کہ حلیف کو اسلحہ اور ساز و سامان اور رسد سے محروم کر دیا جائے۔ نیز فی الجملہ اس کی جنگی معیشت کو کمزور کر دیا جائے۔ اسلام نے بھی غنیمت کا حق برقرار رکھا اور اس کے لیے اپنے خاص اخلاقی ضوابط نافذ کر دیے۔ یہاں ہم کوئی نظری بحث نہیں کر سکتے۔ لیکن عملاً اس حق کے تحت مدینہ کی اسلامی فوج نے جگہ جگہ سے سمٹی ہوئی دولت کو قید سے نکالا اور گردش میں ڈال دیا۔ یہودی سود خواروں کی دولت جو عوام میں سے نچوڑی گئی تھی' قانون غنیمت کے تحت بہاؤ میں آئی۔ ثقیف والوں کی دولت ان کے قبضے سے نکلی اور عرب بھر میں پھیل گئی۔ اسی طرح مدینہ کے گرد و نواح کے جن جن شر پسند قبائل نے شورش اٹھائی' ان کے شیوخ اور دولت مندوں کے اموال کا ایک بڑا حصہ اسلامی فوج نے ان کے قبضے سے نکالا اور گردش میں ڈال دیا۔

جاہلی ریت مال غنیمت کے متعلق یہ تھی کہ میدان میں جس کے ہاتھ جو کچھ پڑ گیا وہ اڑا لے گیا۔ کسی نے چوری کر لی' کسی نے فریب دے لیا اور پھر جو جتنا زیادہ بڑا اور زور آور ہوا اس نے اپنی بڑائی کی دھونس سے اتنا ہی زیادہ حصہ چھینا اور جو کچھ بہترین ہوا' وہ ہتھیا لایا۔ اسلامی نظام جنگ بالکل نیا اخلاق ساتھ لایا۔ اس کے تحت سارا مال سوئی سوئی اور پائی پائی یک جا ہونے کے بعد کمانڈر کے حکم سے تقسیم ہوتا۔ پھر اس میں سے بیس فیصدی حصہ اسلامی خزانہ میں جاتا اور بڑی حد تک غربا اور حاجت مند طبقوں تک پہنچایا جاتا۔ اس طرح ملکی دولت میں ایک عمومی حرکت آ گئی اور بعد میں جوں جوں معاشی قانون نافذ ہوتے گئے اس کے بہاؤ کو انضباط میں لے لیا گیا۔

پھر اسلامی ریاست نے تمام ان طبقوں سے جو زمینوں' مویشیوں یا تجارتی سرمایہ کے مالک تھے۔ مسلم ہونے کی صورت میں زکوٰۃ اور غیر مسلم ہونے کی صورت میں خراج اور جزیہ کی آمدنیاں حاصل کیں اور ان آمدنیوں (خصوصاً زکوٰۃ) کا ایک عظیم حصہ غریب طبقوں کے لیے مخصوص کر دیا۔ ہر سال غلے' کھجوروں اور مویشیوں کی ایک بھاری مقدار امراء سے غربا کی طرف منتقل ہونے لگی۔

سلجھانے کی تدبیر کی گئی۔ مدینہ کی مرکزی سوسائٹی میں سماجی مساوات کے ساتھ اقتصادی اخوت (Economic Brother hood) کا انتہائی کامیاب تجربہ محسنؐ انسانیت نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ سارا عرب دیکھ

رہا تھا کہ گھروں سے اکھڑے ہوئے لوگ' تہی دست غلام' فاقہ مست بدو اور اللہ مست قسم کے نوجوان جب اسلام کے سایہ رحمت میں چلے جاتے ہیں تو ایک طرف تو وہ بڑے بڑے خاندانی اشراف کے شانے سے شانہ ملا کے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور پھر وہ کس بے خوفی سے متکبر ترین مخالفین کو چیلنج کرتے ہیں اور دوسری طرف ان کی ساری پریشانیوں کا مداوا ہونے لگتا ہے۔ ٹھکانا بھی مل جاتا ہے' روزگار بھی پیدا ہو جاتا ہے' اسلحہ بھی مہیا ہو جاتا ہے۔ سواری بھی کبھی نہ کبھی ہاتھ آجاتی ہے اور نکاح کے لیے بھی راستے نکل آتے ہیں۔ پھر اسلامی نظام اخوت کی یہ برکات صرف مدینہ ہی تک محدود نہ تھیں۔ بلکہ چاروں طرف آہستہ آہستہ پھیلنے لگیں اور ایک دن آیا کہ سارا عرب ان سے یکساں فیض یاب تھا۔

اس سماجی مساوات اور اقتصادی اخوت کے نئے نظام کو عرب کے عوام دور سے اس طرح محسوس کرتے ہوں گے جیسے وہ آسمانی دنیا کی کوئی جنت ہو جس میں عقیدہ توحید کی کنجی سے داخلہ ملتا ہے۔ آخر وہ سماجی اور معاشی کبریائیوں تلے پسنے والے لوگ کیسے ارمان نہ کرتے ہوں گے کہ وہ بھی اس جنت میں جگہ پائیں۔

محسن انسانیت ﷺ نے عرب کے عام انسان کی مشکلات کو ملحوظ رکھ کر ذاتی طور پر بھی حد درجہ کے جود و سخا کا مظاہرہ کیا اور بہ حیثیت صدر ریاست بھی بڑی فراخ دلانہ اور کریمانہ پالیسی اختیار کی۔ ذاتی ملک میں کبھی کوئی مال جمع نہ رہنے دیا۔ بلکہ جلد سے جلد اسے مقامی حاجت مندوں اور بیرونی سائلوں میں تقسیم فرما دیتے۔ حکمران کی حیثیت میں بیت المال میں کبھی کوئی رقم پڑی نہ رہنے دی۔ بلکہ جب کوئی حاجت مند سامنے آیا تو جو کچھ ممکن ہوا' اسے دلوا دیا۔ حضورؐ کی نگاہ میں اصل اہمیت انسان کی تھی۔ اور دولت کو انسانیت کی خادمہ قرار دیا۔ حد یہ تھی کہ بسا اوقات بیت المال اور ذاتی ملک میں کچھ نہ ہوا تو سائلوں کی امداد کے لیے قرض تک لیا۔ (شمائل ترمذی) دور دور سے مصیبت کے مارے دیہاتی اور صحرائی ان فیاضیوں کا چرچا سن کر مدینہ آتے۔ اور اس دریائے سخاوت سے جام بھر بھر کے رخصت ہوتے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار ایک بدو آیا اور حضورؐ کی چادر کھینچ کر اکھڑ پن سے کہنے لگا۔ "محمد (ﷺ) یہ مال خدائی مال ہے۔ تمہیں کچھ اپنے مال یا اپنے باپ کے مال میں سے نہیں دینا ہے۔ لاؤ ایک بار شتر مجھے لدوا دو"۔ اس مجسمہ رحمت نے قدرے سکوت کے بعد ٹھنڈے انداز میں فرمایا۔ "بے شک یہ مال خدا کا مال ہے اور میں اس کا غلام ہوں"۔ پھر حکم دیا کہ ایک بار شتر جو اور ایک بار شتر کھجوریں بدو کو دی جائیں۔ وہ خوش خوش رخصت ہوا۔ ایک مرتبہ بحرین سے خراج کی بڑی کثیر دولت آئی کہ اس سے زیادہ مال کبھی مرکز حکومت میں نہ آیا تھا۔ حضورؐ نے صحن مسجد میں اس کا ڈھیر لگوایا اور پھر جو جو آتا گیا اسے دیتے گئے۔ یہاں تک کہ کپڑے جھاڑ کر اٹھے۔ اور گھر تشریف لے گئے۔ داد و دہش کے ایسے واقعات مدینہ میں نت ہوتے اور مختلف اطراف سے مسافر' سائل اور حاجت مند آآ کر مستفید ہوتے۔ یہ لوگ جب علاقوں میں جاتے ہوں گے' تو اسلامی حکومت کی غریب پروری کی مجسم داستانیں بن کے جاتے ہوں گے۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ ان

داستانوں سے کتنے دلوں نے اثر قبول کیا ہو گا اور کتنے سینے اسلام کے لیے کھل گئے ہوں گے۔

اسلامی ریاست کے سربراہِ اعلیٰ کی فیاضانہ پالیسی کے ذہنی اثرات کا اندازہ دوسری ایک مثال سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ایک شخص آیا اور اس نے اپنی معاشی بدحالی کا دکھڑا رونے کے بعد سوال کیا۔ حضورؐ نے پہاڑیوں کے درمیان چرتی ہوئی بکریوں کا ایک ریوڑ اسے عنایت فرمایا۔ وہ یہ عطیہ پا کر جامے میں پھولا نہ سماتا تھا اور قبیلہ میں جا کر کہتا پھرا۔ کہ "اے لوگو! اسلام قبول کرو! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ایسی سخاوت کرتے ہیں کہ تنگ دستی کا خطرہ باقی نہیں رہتا" (المواہب اللدنیہ)۔ اسی طرح صفوانؓ بن امیہ کا خود اپنا بیان ہے کہ حضورؐ نے مجھے کچھ مال عطا کیا (جس میں تین سو بکریاں تھیں) تو اس عنایت کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ جہاں اس سے قبل آپؐ سے بڑھ کر کوئی شخص مجھے ناپسند نہ تھا وہاں اب آپؐ سے زیادہ کوئی محبوب نہ رہا۔ ذیل کا شعر اسی واقعہ سے متعلق ہے۔

هو الذی لا یتقی فقرا اذا　　یعطی ولو کثر الانام و داموا

یہ وہ ہستی ہے جو عطا و بخشش پہ آتی ہے تو اسے تہی دست ہو جانے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ خواہ اس کے سامنے کتنی ہی کثیر مخلوق کیوں نہ سائل بن کے آگئے اور متواتر یہ تانتا بندھا رہے۔

سخاوت کے اسی عام چرچے کا نتیجہ تھا کہ حنین کے اموال تقسیم کر کے آپؐ واپس ہوئے' تو آس پاس کے بدو دوڑے دوڑے آئے۔ اور آکر لپٹ گئے کہ ہمیں بھی کچھ عنایت ہو۔ حضورؐ نے پریشانی کے عالم میں ایک درخت کے تنے کا سہارا لیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا کہ "اگر ان جنگلی درختوں کے برابر بھی میرے پاس اونٹ ہوتے تو میں سب تم میں بانٹ دیتا۔ تم مجھے نہ بخیل پاتے' نہ غلط گو اور نہ کم حوصلہ"۔

(بخاری)

ممکن ہے کہ ایک گھٹیا ذہن اس عطا و بخشش کو یہ معنے پہنائے کہ مال و دولت کے زور سے ذہن فتح کیے گئے (نعوذ باللہ) اور رشوت دے کر لوگوں کو حامی بنایا گیا۔ مگر حقیقت بالکل دوسری تھی۔ معاشی بدحالی میں پسے ہوئے لوگوں کو سنبھالنا اور ان کو ذہنی پستی سے نکالنا اسلام کے بالکل اصولی تقاضوں میں شامل تھا۔ انسانیت کے وہ طبقات تو بڑے ہی قابل رحم ہوتے ہیں جو معاشرہ کے ظلم کی وجہ سے پیٹ کے مسئلے میں اس بری طرح گھر جاتے ہیں کہ زندگی کے اعلیٰ تقاضوں پر توجہ تک کرنے کا انہیں موقع نہیں ملتا۔ ایسے مصیبت کے ماروں کو تو شاید عنداللہ بھی کچھ رعایت مل جائے۔ عرب کی بیشتر آبادی اسی حال میں تھی۔ اور ان کو جہاں کلمہ طیبہ کی ضرورت تھی وہاں روٹی کپڑے کی بھی محتاجی تھی۔ مدینہ کے لیے نئے معاشی نظام اخوت سے بہرہ مند ہونے والوں کو شاید پہلی بار موقع ملا ہو گا کہ وہ بدن کی ابتدائی ضروریات کے لیے گھٹیا الجھاوؤں سے بالاتر ہو کر زندگی کے اعلیٰ مسائل پر سوچیں۔ عظیم حقیقتوں کو سینے میں جگہ دیں۔ اور قیمتی اخلاقی اقدار کو اپنے اندر نشوونما دیں۔ لامحالہ اقتصادی اصلاح نے اسلام کے پھیلاؤ کے لیے راستے ہموار کیے ہوں گے۔ اسلام کا معاشی نظام تو بعد میں تکمیلی شکل تک پہنچا ہو گا جب کہ اس کے سارے اصول نافذ ہو

کر کام کرنے لگے ہوں گے۔ لیکن ابتدائی آثار ہی سے عوام کی امیدیں مدینہ سے وابستہ ہو گئی ہوں گی۔ کہ یہاں سے ہمیں نور حق کے ساتھ ساتھ معاشی مسئلے کا حل بھی حاصل ہونے والا ہے۔

قائد ریاست کے وسیع تعلقات:

کوئی بھی نصب العین لے کے چلیے اور کتنا بھی اعلیٰ درجہ کا اصولی کام کیجیے' ذاتی تعلقات اور روابط کی وسعت بہرحال اس کی کامیابی میں اثر انداز ہوتی ہے۔ معمولی کاروبار سے لے کر نظریاتی انقلاب تک کے مختلف کام جو اجتماعی دائرے میں سرانجام پاتے ہیں' ان میں کوئی بھی ایسا شخص مشکل سے کامیاب ہو سکتا ہے جو عام انسانی تعلقات کے لحاظ سے کوتاہ ہو۔ خلوت گزیں اور بے نیاز خلائق ہو۔ نسبی اور رحمی رابطے ازدواجی رشتے' خود پیدا کردہ دوستیاں اور علائق' غموں اور مسرتوں کی شرکت' ملاقاتیں اور سلام و پیام ایک انسان کی قوت نفوذ کو بڑھاتے ہیں۔ ذاتی تعلقات اور شخصی لحاظ داریاں غیر شعوری طور پر بڑے بڑے اصولی معاملات کا رخ بدل دیتی ہیں اور ان کی وجہ سے کتنے ہی سیاسی فیصلے کسی خاص صورت میں طے پا جاتے ہیں۔ بالعموم انسانی قیادت میں وہی شخصیت کامیاب رہتی ہے جس کے علائق کا دائرہ وسیع ہو اور جو خود وسیع تر کرے۔ اور ہر تعلق کے حقوق ادا کرے۔

اس پہلو سے جب ہم محسن انسانیت ﷺ کی مقدس شخصیت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو نسبی' خونی' صہری' رضاعی اور ولائی علائق کا دائرہ بڑا وسیع پاتے ہیں۔ نیز اس کے ساتھ ساتھ دوستی اور رفاقت اور عام شخصی تعلقات کا حلقہ روز افزوں دیکھتے ہیں۔ پھر ان گوناگوں علائق سے حضورؐ کسی انسان گریز برتر شخصیت کی طرح بے نیازی نہیں برتتے اور ان کو بار گراں اور درد سر نہیں سمجھتے بلکہ ان کو حسن و خوبی سے نبھاتے ہیں۔ ان کے حقوق ادا کرتے ہیں اور ان کو استحکام دیتے ہیں۔ بعید ترین رشتوں کا بھی اتنا احترام اور لحاظ حضورؐ کو تھا کہ جماعت کو تاکید کی کہ جب تم مصر کو فتح کرو تو اس کے باشندوں سے حسن سلوک کرنا کیونکہ ان کی طرف سے تم پر صلہ رحمی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وضاحت فرمائی کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ انہی میں سے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان وسیع ذاتی تعلقات نے بھی اسلامی تحریک کے فروغ اور دعوت حق کے عوامی نفاذ کو بڑھانے میں بڑا بھاری اثر ڈالا ہے۔

موضوع تقاضا کرتا ہے کہ ان علائق کا بھی اجمالی تذکرہ کیا جائے اور دکھایا جائے کہ یہ علائق کس طرح تحریک اسلامی کے حق میں مفید ثابت ہوئے۔ اور انہوں نے انقلاب کے سیاسی عمل کو کتنا آسان اور کامیاب بنایا۔ ہم مختلف علائق کو الگ الگ کر لیتے ہیں:۔

۱ ۔ نسبی علائق:

نبی اکرم ﷺ کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے:

محمدؐ[۱] (ﷺ) بن عبداللہ[۲] بن عبدالمطلب[۳] بن ہاشم[۴] بن عبد مناف[۵] بن قصی[۶] بن کلاب[۷]

؎ بن مرہ۸ ؎ بن کعب۹ ؎ بن لوی۱۰ ؎ بن غالب۱۱ ؎ بن فہر۱۲ ؎ (قریش) بن مالک ۱۳ ؎ بن نضر۱۴ ؎ بن کنانہ ۱۵ ؎ بن خزیمہ ۱۶ ؎ بن مدرکہ ۱۷ ؎ بن الیاس ۱۸ ؎ بن مضر۱۹ ؎ بن نزار ۲۰ ؎ بن معد ۲۱ ؎ بن عدنان ۲۲ ؎ بن اد ۲۳ ؎ بن مقوم ۲۴ ؎ بن ناحور ۲۵ ؎ بن تیرح ۲۶ ؎ بن یعرب ۲۷ ؎ بن یشجب ۲۸ ؎ بن نابت ۲۹ ؎ بن اسماعیل ۳۰ ؎ بن ابراہیمؑ ۳۱ ؎۔

حضورؐ کے اپنے ارشاد کے بموجب عدنان سے اوپر حضرت اسماعیلؑ تک کے نام کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ چنانچہ نسابوں اور روایات نسب کو پیش کرنے والوں نے ان ناموں میں اختلاف کیا ہے۔ عدنان کے ساتھ حضورؐ کا تعلق اکیسویں نسبی درجے پر آتا ہے۔ زمانی فاصلہ ۱۱۵۸ برس کا ہے۔ قبائل عرب کا تعلق کسی نہ کسی مرتبے پر حضورؐ کے سلسلہ نسب سے جڑ جاتا ہے۔

عک بن عدنان (برادر معد نمبر۲۱) نے علاقہ غسب (یمن) میں جا کر سلطنت قائم کی۔ اور اشعریین کے خاندان میں ازدواجی تعلق قائم کیا۔ ان اطراف میں اسلام نے بہت جلد جگہ پیدا کی۔ اور پھر سرعت سے اپنا سایہ رحمت پھیلایا۔ یمن کے مختلف علاقوں سے وفود مدینہ پہنچے جن میں خود اشعریین کا وفد بھی تھا۔ نزار (نمبر۲۰) کے چار بیٹے تھے جن میں سے انمار کی اولاد تہامہ اور اطراف حجاز میں بسی۔ ایاد کی اولاد نے شفور اور اس کے اطراف کو مسکن بنایا اور مضر (نمبر۱۹) اور ربیعہ وسط عرب میں فروکش ہوئے۔

اب مشہور قبائل کو لیجئے۔ جو حضورؐ کے ہم نسب ہیں اور ان قبائل کے نام سیرت، تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں کثرت سے آتے ہیں۔

بنو تمیم ----- تمیم بن مرو بن عد بن طابخہ بن الیاس (نمبر۱۸)

بنو غطفان ---- غطفان بن سعد بن الیاس (ایضاً)

بنو اشجع ----- اشجع بن غطفان بن سعد بن الیاس (ایضاً)

بنو ذبیان ----- ذبیان بن بغیض بن رائس بن غطفان تا الیاس۔

بنو فزارہ ----- فزار بن ذبیان تا الیاس۔

بنو ہوازن ---- ہوازن بن منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس عیلان بن الیاس (نمبر۱۸)

بنو سعد ----- سعد بن بکر بن ہوازن ---- تا الیاس۔

بنو ثقیف ---- ثقیف بن ہوازن ---- تا الیاس۔

بنو سلیم ---- سلیم بن منصور ------- تا الیاس

ہذلی ---- ہذیل بن مدرکہ (نمبر۱۷)

بنو ہون ---- ہون بن خزیمہ (نمبر۱۶)

دیشی ---- دیش بن قارہ بن ہون بن خزیمہ

عضلی ---- عضل بن قارہ ---- تا خزیمہ۔

بنو اسد ------ اسد بن خزیمہ ----- تا خزیمہ

بنو نضر

بنو کنانہ --- نضر بن کنانہ (نمبر۱۵)

بنو مصطلق ---- مصطلق (خزیمہ) بن عبد مناۃ بن کنانہ (نمبر۱۵)

الاحابیش ----- احابیش بن کنانہ۔

بنو مالک ----- مالک (نمبر۱۳) بن نضر بن کنانہ۔

قریشی ----- فہر یا قریش (نمبر۱۲) بن مالک -----

بنو محارب ---- محارب بن فہر

بنو تیم ----- تیم بن غالب (نمبر۱۱) بن فہر -----

بنو عوف ------ عوف بن لوی (نمبر۱۰) بن غالب۔

بنو عامر ------ عامر بن لوی۔

بنو حرث ------ حرث بن لوی۔

بنو ھصیص ---- ھصیص بن کعب (نمبر۹) بن لوی

بنو سہم ---- سہم بن کعب۔

بنو جمح ---- جمح بن کعب

بنو عدی ----- عدی بن کعب

بنو کلاب ---- کلاب (نمبر۷) بن مرہ (نمبر۸)

بنو تیم ---- تیم بن مرہ (نمبر۸)

بنو مخزوم ---- مخزوم بن مرہ۔

بنو قصی ---- قصی (نمبر۶) بن کلاب۔

بنو زہرہ ---- زہرہ بن کلاب۔

اسدی ----- اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی (نمبر۶)

مطلبی ----- مطلب بن عبد مناف (نمبر۵)

بنو امیہ ----- امیہ بن عبدالشمس بن عبد مناف۔

نوفلیون ----- نوفل بن عبد مناف

بنوہاشم ------ ہاشم بن عبد مناف

یہ وسیع نسبی تانا بانا اتنی دور تک پھیلا ہوا ہے کہ مراتب اعلیٰ پر فائز ہونے والے بے شمار رفقائے نبی اکرم ﷺ اس سے مربوط ہیں۔ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ کا نسب زراح بن عدی بن کعب (نمبر۹) اور حضرت

ابو عبیدہؓ کا نسلی رشتہ جراح بن عدی سے ملتا ہے۔ سیدہ آمنہ (والدہ حضورؐ) وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب (نمبر۷) کی اولاد ہیں کلاب بن مرہ ہی کے بھائی تیم کی اولاد میں سے حضرت ابو بکر ہیں۔ سعدؓ (یکے از عشرہ مبشرہ) مالک بن اہیب بن مناف کے واسطے سے حضورؐ کے تعلق دار ہیں عثمانؓ بن طلحہ کلید بردار کعبہ عبدالدار بن قصی (نمبر۱) کے صلب سے ہیں۔ حضرت زبیرؓ (یکے از عشرہ مبشرہ) عوام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزی بن قصی (نمبر۱) کے فرزند ہیں۔ اسی طرح حضرت خدیجہؓ طاہرہ خویلد بن اسد بن عبدالعزی بن قصی کی صاحبزادی تھیں اور ورقہ بن نوفل بن اسد ان کے بھائی تھے۔ حارث بن مطلب بن عبد مناف (نمبر۵) کے تین بیٹے ابو عبیدہؓ شہید بدر) طفیلؓ اور حسینؓ مشہور صحابی تھے۔ امام شافعیؒ کا نسب بھی مطلب ہی سے جا کر ملتا ہے۔ حضرت عثمانؓ امیہ بن عبدالشمس بن عبد مناف کی لڑی میں شامل ہیں۔

حضورؐ کے چچاؤں کی تعداد میں روایات کا اختلاف ہے۔ دو کے حالات ہی محفوظ نہیں ہیں۔ ایک چچا ضرار نے بہت پہلے وفات پائی۔ آپؐ کے چچاؤں میں حسب ذیل شخصیتیں بہت نمایاں تھیں۔ جن کا تعلق اسلامی تحریک کی تاریخ سے ہے اور جن کے حالات بھی محفوظ ہیں۔

ایک چچا حارث تھے جو دور اسلام سے قبل ہی فوت ہوئے۔ ان کے چاروں بیٹے نوفل' عبداللہ' ربیعہ اور ابو سفیان دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور اسلامی تاریخ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہی ربیعہ بن حارث ہیں جن کے خون کا مطالبہ اپنی طرف سے حضورؐ نے سب سے پہلے ساقط کر کے فتح مکہ کے موقع پر اعلان کیا تھا کہ جاہلیت کے مطالبہ ہائے خون آج ختم کیے جاتے ہیں۔

ایک چچا ابو طالب تھے جنہوں نے حضورؐ کی حمایت کا حق ادا کیا اور اسلامی تحریک میں باوجود باہر رہنے کے دل و جان سے پوری پوری مدد پہنچائی۔ ان کے چار بیٹوں میں سے تین اسلام میں آئے اور ہر ایک نے مقام بلند حاصل کیا۔ آج کون عقیلؓ بن ابی طالب' جعفرؓ طیار اور علیؓ ابن ابی طالب کے ناموں سے ناواقف ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ابو طالب کی دونوں صاحبزادیوں ام ہانیؓ اور جمانہؓ بھی نور اسلام سے بہرہ مند ہوئیں۔ ام ہانیؓ کا نام واقعہ معراج کی وجہ سے بہت ہی نمایاں ہوا۔

ایک چچا حمزہؓ تھے جنہوں نے معرکہ احد میں شہادت پائی اور ان کی نعش کے ساتھ ہندہ نے نہایت درندگی کا سلوک کیا۔ جس کا حضورؐ کو سخت صدمہ ہوا۔ یہی تھے جنہوں نے حضورؐ کے خلاف ابوجہل کی بدسلوکی پر غیرت دکھائی اور اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اور بڑے چیلنج کے ساتھ اسلام قبول کیا۔

ایک چچا عباس بن عبدالمطلب تھے۔ انہوں نے بھی شروع سے سرپرستانہ طرز عمل رکھا۔ خصوصاً بیعت عقبہ کے وقت گفتگو میں بڑا اہم حصہ لیا۔ اور انصار کو ان کی ذمہ داری کی نزاکت پر توجہ دلائی۔ علاوہ ازیں مکہ میں رہ کر حضورؐ کو حالات سے باخبر رکھا۔ اور جب کشمکش کے نازک مراحل سے تحریک گزر گئی تو پھر اپنے اسلام کا اعلان کیا اور مدینہ چلے گئے۔

ایک چچا زبیر بھی بعثت سے قبل انتقال کر گئے تھے۔ نیک دل تھے اور حلف الفضول کے قیام میں انہوں

نے بڑی جدوجہد کی تھی۔

ایک چچا ابولہب تھا۔ یہ نہ صرف کٹر مخالف تھا بلکہ مخالفانہ محاذ کا سرگرم کمانڈر تھا۔ اس کی بیوی بھی پکی دشمن اسلام تھی اور حضورؐ کو اذیت دینے میں پیش پیش رہتی۔ اس شخص کا انجام بڑا ہی عبرت ناک ہوا۔ طاعون سے موت ہوئی۔ تین دن لاش پڑی سڑتی رہی۔ لوگ قریب نہ جاتے تھے۔ آخر دیواروں پر سے اتنے پتھر پھینکے گئے کہ لاش ان کے ڈھیر میں دب گئی اور یہ ڈھیر قبر بنا دیا گیا۔ ابولہب کی بیوی بھی رسی کا پھندہ گلے میں پڑنے سے عبرت کی موت مری۔ ابولہب کے دو بیٹے بحالت کفر مرے اور دو نے جنگ حنین کے موقع پر حضورؐ کی اطاعت اختیار کی۔ درہ بنت ابی لہب کو بھی اسلام لانے کی سعادت ملی۔

حضورؐ کی پھوپھیوں میں ایک ام حکیم بیضا تھیں۔ کرز بن ربیعہ (نسل عبد مناف) کی زوجہ تھیں۔ ان کے فرزند عامر فتح مکہ کے دن اسلام میں داخل ہوئے اور پھر عبداللہ بن عامر بھی صحابی ہوئے اور دور عثمانؓ میں والی خراسان بنے۔ انہی ام حکیم کی دختر اروی حضرت عثمانؓ ذوالنورین کی والدہ ہیں۔ دوسری پھوپھی امیمہ تھیں جن کا نکاح جحش بن رباب سے ہوا۔ ان کی ایک صاحبزادی ام حبیبہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی اہلیہ تھیں۔ دوسری صاحبزادی حمنہؓ کا پہلا نکاح مصعبؓ بن عمیرؓ دوسرا طلحہؓ بن عبداللہ سے ہوا۔ دوسرے نکاح سے محمدؓ اور عمرانؓ دو فرزند اسلام کے علمبردار بنے۔ عبداللہؓ بن جحش معرکہ احد میں شہادت پا کر اپنے ماموں حمزہؓ کے ساتھ مدفون ہوئے۔ تیسری پھوپھی عاتکہؓ تھیں جنہوں نے جنگ بدر سے قبل رویائے صادقہ دیکھا اور اس سلسلے میں طنز کیا گیا کہ اب تو بنوہاشم کی لڑکیاں بھی نبوت کرنے لگیں۔ چوتھی پھوپھی حضرت صفیہؓ تھیں جو اولاً حارثؓ بن حرب بن امیہ کے نکاح میں تھیں۔ بعد میں بیوہ ہو کر عوامؓ بن خویلد کے ازدواج میں گئیں۔ اس نکاح سے زبیرؓ (یکے از عشرہ مبشرہ) متولد ہوئے۔ سائبؓ بن العوام بھی ان کے بطن سے ہیں جنہوں نے معرکہ ہائے جہاد میں نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے حمزہؓ جیسے بھائی کی لاش خاک و خون میں پڑی دیکھی اور درندگی کا جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھا گیا تھا' اس پر انتہائی صبر کا مظاہرہ کر کے انہوں نے ایک زریں مثال قائم کی۔ پانچویں پھوپھی برہ تھیں' جو عبدالاسدؓ بن ہلال کی زوجہ تھیں۔ ابو سلمہؓ انہی کے فرزند ہیں۔ جو ام المومنین ام سلمہؓ کے پہلے شوہر تھے۔ ایک پھوپھی جن کا نکاح عمیر بن وہیب سے ہوا تھا اروی ہیں۔ ان کے فرزند طلیب نے جب انہیں اپنے قبول اسلام کی اطلاع دی تو انہوں نے کس والہانہ جذبہ سے کہا کہ:

> "تیرے لیے تیرے ماموں کا بیٹا سب سے بڑھ کر خدمت اور مدد کا حق دار ہے۔ بخدا اگر ہم عورتوں کو بھی مردوں جیسی طاقت ہوتی تو ہم ان کا بچاؤ کرتیں' اور اس کے دشمنوں کو جواب دیتیں۔ [1]

ان لفظوں میں ایمان بھی موجزن ہے۔ اور ایک پھوپھی کی سچی محبت بھی بول رہی ہے۔ حضورؐ کے

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد ۲ ص ۹۶ بہ حوالہ سیرت مصنفہ مولوی کرامت علی دہلوی۔

وسیع نسبی تعلقات کے اور بہت گوشے ہیں۔ مگر یہاں ہم صرف قریب ترین دائرے کی ایک محدود جھلک دکھا کر یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حضورؐ کی ان قرابتوں نے مختلف مراحل پر تحریک کے حق میں مفید اثرات دکھائے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ چونکہ کشمکش اصولی' اساسی اور ہمہ گیر ہونے کی وجہ سے بڑی سنگین تھی اور قریش نے بڑا مضبوط مخالفانہ محاذ دیر تک جمایا۔ لیکن اندر ہی اندر قرابتیں اپنا کام کرتی رہیں۔ بنو ہاشم نے بحیثیت مجموعی دوسروں کے مقابلے میں حامیانہ رویہ کا ثبوت دیا۔ قرابت مندی کی وجہ سے ابوجہل کے ظلم پر حضرت حمزہؓ کا خون کھول گیا۔ اور وہ جاہلی محاذ چھوڑ کر حضورؐ کے ساتھ ہو گئے۔ ابوالبختری نے محصوری کے زمانے میں ابوجہل کو اس زیادتی پر ٹوکا کہ وہ کسی غذائی ہدیہ کو شعب ابی طالب میں جانے سے روکے' حضرت عباسؓ نے خاموشی سے مکہ میں رہ کر حضورؐ سے تعاون کیا۔ قریش کی مجالس میں بارہا گفتگوؤں میں اپنی قرابتوں کی وجہ سے حامیانہ رنگ پیدا ہو جاتا رہا۔ اور لوگوں نے یہ تک سوچا کہ محمد (ﷺ) کو کم از کم مکہ سے باہر عرب میں کام کرنے دیا جائے اور کامیابی ہو جائے۔ تو اس کی کامیابی ہماری ہی کامیابی ہو گی۔ پھر برسوں تک صدم ضدا کا چکر چلانے کے بعد جب مکہ فتح ہو گیا تو لوگ حضورؐ سے یہ کہتے سنائی دیئے۔ کہ "تو ایک شریف بھائی ہے' اور شریف بھائی کا بیٹا ہے"۔ پھر یہی قرابتیں دوسری جانب سے بھی برابر اثر انداز ہوتی رہیں۔ حضورؐ کے اعزہ و اقربا قیدی بنا کر لائے گئے تو راتوں کو بندھنوں کی سختی کی وجہ سے ان کی کراہیں آپؐ کی نیند اڑانے کا باعث بنیں۔ مکہ میں قحط پڑا تو بھی حضورؐ کا دل پسیجا' اور غلہ اور نقدی سے مدد کی۔ مکہ فتح کیا تو اس کے باشندوں پر احسانات کی بارش فرما دی۔

۲ - مدینہ میں ننہالی تعلقات:

حضورؐ کے والد جناب عبداللہ کی والدہ فاطمہ بنت عمرو مدینہ کے مشہور خاندان بنو نجار میں سے تھیں۔ اس سے پہلے حضورؐ کے پردادا ہاشم نے بھی قبیلہ خزرج کی ایک خاتون ہند بنت عمرو بن ثعلبہ سے نکاح کیا تھا۔ اور جناب عبداللہ کی شادی بھی مدینہ کے بنو نجار میں حضرت آمنہ بنت وہب سے ہوئی۔ اس واسطے سے حضورؐ کے والد جناب عبداللہ کے روابط بھی مدینہ میں خاصے گہرے تھے۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ ایک تجارتی سفر میں وہیں آپؐ کے والد کی وفات ہوئی اور قبر بنی۔ حضورؐ کی والدہ مدینہ کے اقرباء کو ملنے اور اپنے شوہر کی قبر کو دیکھنے کے لیے آپؐ کو لے کر (بعمر ۶ سال) یثرب گئیں۔ وہاں ایک ماہ تک حضورؐ کا قیام رہا۔ دارالنابغہ مستقر تھا۔ ہجرت کر کے تشریف لے گئے تو ۴۷ برس قبل کا وہ دور آنکھوں میں پھر گیا۔ مجالس میں کبھی کبھار ذکر فرماتے۔ کہ یہاں ایک لڑکی انیسہ ہوتی تھی جو ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ فلاں قلعہ کے اوپر ایک پرندہ برابر بیٹھا کرتا تھا اور بچے اسے اڑایا کرتے تھے۔ اس گھر میں میری والدہ فلاں جگہ بیٹھا کرتی تھی۔ اور والدہ کی قبر فلاں جگہ بنائی گئی تھی۔ حضورؐ نے یہ بات بھی بیان کی کہ بنو عدی بن النجار کی باؤلی (تالاب) میں میں نے تیرنا اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔ اسی سفر میں واپسی پر حضورؐ کی والدہ کا انتقال ابواء کے مقام

پر ہوا۔

ظاہر بات ہے کہ مدینہ سے آپؐ کے تحریکی تعلقات بعد میں جب نشوونما پانے لگے ہوں گے تو اس تعلق نے بھی اپنا اثر ڈالا ہو گا۔ مدینہ کے لوگ خصوصاً بنو نجار آپؐ کو اپنا قریبی عزیز سمجھتے ہوں گے۔ آپؐ کا استقبال کرنے میں بنو نجار پیش پیش تھے۔ اور ان کی بچیاں بڑے والہانہ انداز میں خیر مقدم کے ترانے الاپ رہی تھیں۔

۳ ۔ رضاعی تعلقات:

ابولہب کی ایک کنیز ثوبیہ کا دودھ آپؐ نے چند روز تک پیا تھا۔ اس کا اتنا لحاظ تھا کہ ثوبیہ کے لیے مدینہ سے کپڑے بھجوایا کرتے تھے۔ مستقل رضاعت حلیمہ سعدیہؓ کے حصے میں آئی جو بنو ہوازن سے تعلق رکھتی تھیں۔ بڑی لڑکی حذافہؓ (جن کا لقب الشیماءؓ تھا) نے بچپن میں حضورؐ کی خدمت کی تھی۔ غزوہ حنین کے موقع پر گرفتار ہو کر آئیں۔ انہوں نے فوجی نگرانوں سے کہا کہ میں تو تمہارے قائد کی بہن ہوں۔ یہ آپؐ کے سامنے لائی گئیں تو حضورؐ نے بڑی مسرت سے استقبال کیا۔ اور اعزاز کے لیے چادر بچھائی۔ اور آپؐ پر رقت طاری ہو گئی پھر فرمایا۔ اگر چاہو تو میرے پاس رہو اور چاہو تو تمہیں قبیلے میں پہنچا دیا جائے۔ انہوں نے واپس جانے کی خواہش کی۔ آپؐ نے بہت کچھ دے کر رخصت کیا۔ انہیں اسلام لانے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

رضاعت کا یہی رشتہ تھا جس کا واسطہ معرکہ حنین کے بعد بنو ہوازن کے وفد نے اپنے قیدی چھڑانے کے لیے آپؐ کے سامنے دیا۔ اور آپؐ نے بنی ہاشم کے سارے قیدیوں کو فوراً رہا کر دیا۔ اور آپؐ کی تقلید میں ساری جماعت نے بنو ہوازن کے قیدی چھوڑ دیے۔

۴ ۔ اپنی صاحبزادیوں کے نکاح:

سیدہ زینبؓ کا نکاح مکہ ہی میں ابوالعاصؓ بن ربیع سے ہو گیا تھا۔ ابوالعاصؓ کی والدہ حضرت خدیجہؓ کی سگی بہن تھیں۔ یعنی حضور ان کے خالو تھے۔ سیدہ زینب نے والدہ کے ساتھ ہی اسلام قبول کیا تھا۔ وہ ہجرت کر کے مدینہ آ گئیں۔ بعد میں ابوالعاصؓ بھی ایمان لائے اور مدینہ آ گئے۔ سابق نکاح بحال رہا۔ میاں بیوی میں دلی تعلق بڑا گہرا تھا۔ چنانچہ مکہ والوں کی طرف سے ابوالعاصؓ کو مجبور بھی کیا گیا کہ وہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں۔ مگر وہ نہ مانے۔ اسی تعلق کی وجہ سے بہ حالت کفر ابوالعاصؓ کو مسلمانوں کے اذن سے بغیر فدیہ کے رہا کیا گیا اور ایک بار قبضے میں آیا ہوا ان کا تجارتی مال بھی واپس کیا گیا۔

سیدہ رقیہؓ کا نکاح بھی مکہ میں حضرت عثمانؓ بن عفان سے ہوا تھا یہ پہلا جوڑا ہے جس نے حضورؐ کی تحریک اسلامی کے تقاضے سے راہ خدا میں پہلے پہل اکٹھے ہجرت کی۔ ۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بعد ۳ھ میں حضورؐ نے اپنی صاحبزادی ام کلثومؓ کا نکاح بھی باشارہ الٰہی حضرت عثمانؓ ہی سے کر دیا۔ اسی دوہرے

تعلق کی بنا پر وہ ذوالنورین کہلائے۔
سیدہ فاطمہؓ کو حضورؐ نے حضرت علیؓ کے نکاح میں دیا۔ گویا ابوالعاصؓ کے علاوہ تحریک اسلامی کے دو بڑے لیڈر اور حضورؐ کے رفقائے خاص نسبی تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ ان ازدواجی رابطوں کے ذریعے حضورؐ کے ساتھ گہری قرابت رکھتے تھے۔ یہ قرابت اسلام کے عظیم کام کو چلانے میں مد تھی۔

۵ - حضورؐ کے ازدواجی تعلقات:

حضورؐ کے ازدواجی تعلقات کے موضوع پر چونکہ متعصب مستشرقین نے اعتراضات کا ایک خارزار پیدا کر دیا ہے۔ اور ان کی وجہ سے ہمارے اندر کا ایک عنصر اس حقیقت واقعی پر مارے شرم کے زمین میں گڑ گڑ جاتا ہے کہ حضورؐ نے متعدد نکاح کیے اور اسلام نے تعدد ازدواج کو روا رکھا۔ اس لیے ایک مختصر تمہیدی نوٹ میں ہمیں بعض توضیحات کرنی ہیں۔
پہلی بات یہ ذہن نشین کرنے کی ہے کہ انسانیت کا پہلا دور تاریخ (جسے ہم حضورؐ کے زمانے تک پھیلا ہوا پاتے ہیں) تکثیر نسل کا دور ہے۔ زمین کے قطعات جب ویران پڑے تھے۔ جہاں آبادی تھی وہاں بھی چھدری تھی۔ اور رزق کے ذرائع و وسائل کا میدان بھی کھلا پڑا تھا۔ بالکل فطری طور پر نوع انسانی میں ازدیاد نسل کا رجحان پورے زور سے کام کر رہا تھا۔ اسی لیے اس دور کے کسی بھی تمدن کو لیں اور کسی بھی مذہب کو دیکھیں۔ انسانی معاشروں میں تعدد ازدواج بہت بڑے بڑے پیمانوں پر پوری طرح مروج رہا۔ خود شرائع الہیہ نے بھی اس کی اجازت دی اور بہت سے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام جن میں خود انبیائے بنی اسرائیل نمایاں ہیں' نے کئی کئی نکاح کیے۔ اکا دکا انبیاء نے ذاتی رجحان اور مخصوص حالات کی بنا پر گھربار کے بکھیڑوں سے کنارہ کش اور جتی ستی بن کر اپنے آپ کو ہمہ تن دعوت حق کے کام میں بھی لگایا ہے۔ مگر اکثریت نے متاہل زندگی اختیار کی اور بھرپور طریقے سے اختیار کی۔ حضورؐ تکثیر نسل اور تعدد ازدواج کے اسی دور کے آخر میں آتے ہیں۔ اور آپؐ ہی کے ذریعے پہلی مرتبہ فرمان الٰہی سے تعدد ازدواج پر پابندی عائد ہوئی۔ [1] حضورؐ نے جو بھی شادیاں کیں وہ اسی رخصت و اجازت سے کیں۔ جو شریعت الہیہ میں چلی

---

[1] اس پابندی کی حقیقت بھی اتنی ہے کہ تعدد ازدواج کی ایک طرح تو آخری حد (چار تک) مقرر کر دی گئی اور اس کے ساتھ عدل کی بھاری ذمہ داری کا احساس دلا کر یک زوجگی کے حق میں ترغیبی انداز اختیار کیا گیا۔ لیکن تعدد ازدواج کو حرام نہیں ٹھہرایا گیا۔ اس انتہائی گنجائش کی ضرورت بعض اہم وجوہ سے تھی اور رہے گی۔ مثلاً اولین وجہ یہ ہے کہ اسلام شہوت رانی اور بدکاری کا کاملاً سدباب کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کڑے اہتمام کرتا اور سنگین سزائیں مقرر کرتا ہے۔ ایسے نظام میں ان لوگوں کے لیے راستہ رکھنا ضروری تھا جو جسمانی یا ذہنی ساخت کی وجہ سے تیز جنسی رجحان رکھتے ہوں۔ اس حقیقی ضرورت کو مغربی تمدن میں نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یک زوجگی کے ساتھ نہ صرف =

آرہی تھی۔

دوسری بات یہ سامنے رہے کہ حضورؐ کے اکثر و بیشتر نکاح جنسی داعیہ کے زیر اثر نہیں بلکہ تحریک اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے پیش نظر عمل میں آئے۔ ان کی نوعیت سیاسی ہے۔ حضورؐ کا اپنا ارشاد محفوظ ہے کہ "مالی فی النساء من حاجة (داری۔ روایت سہل بن سعد) یعنی میرے اندر عورتوں کے لیے کوئی جنسی طلب موجود نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں شادیاں حضورؐ نے دو ہی کی ہیں۔ ایک حضرت خدیجہ سے' دوسری حضرت عائشہ سے۔ بقیہ نکاحوں کے لیے بعض اہم اجتماعی مصالح داعی ہوتے رہے۔ اور ان مصالح کی خاطر حضورؐ نے اپنی مصروف ترین زندگی اور انتہائی فقیرانہ معاشرت پر بھاری بوجھ ڈال کر انسانیت کے لیے قربانی دی ہے۔

خیال کیجیے کہ ایک نوجوان جو ۲۵ برس تک عفت مآبی اور حیاداری کا نمونہ اس معاشرے میں پیش کرتا ہے جس میں شراب اور زنا کلچر کے جزے قابل فخر پہلو بنے ہوئے تھے۔ ۲۵ برس کی عمر کو پہنچ کر بھی عمومی حسن پسندی کا عام معیار چھوڑ کر کسی نو عمر حسینہ کے بجائے ۴۰ سال کی ایک بیوہ کا انتخاب کرتا ہے کیونکہ اس کے نصب العین میں وہی زیادہ مدد ہو سکتی ہے۔ اور پھر ازدواجی لحاظ سے عمر کے بہترین ۲۵ برس اسی ایک خاتون کے ساتھ گزار کر پچاس سال پورے کر لیتا ہے۔ کیا اس کے بارے میں وہ گھٹیا باتیں سوچی جا سکتی ہیں۔ جن کا چرچا معترضین نے کیا ہے۔ پھر ازدواج کی کثرت کا دور ۵۵ سے ۵۹ سال کا دور ہے۔ عرب جیسے گرم ملک کے لحاظ سے اس عمر میں جنسی رجحانات انحطاط کی طرف جا چکے ہوتے ہیں۔ پھر خود ازدواج کی عمروں کو دیکھیے تو دو کے علاوہ بقیہ کی عمریں بوقت نکاح ۲۰ سال سے اوپر تھیں۔ اور پانچ کی عمریں تو ۳۶ تا ۵۰ برس تھیں۔ کیا حضورؐ کے لیے نوجوان ترین اور حسین ترین لڑکیوں کی کمی تھی؟

پھر ایسا گھٹیا اعتراض اٹھانے والوں کو سوچنا چاہیے تھا کہ وہ ہستی جس نے اپنے سر پر اتنے بڑے کام کا بوجھ اٹھایا تھا۔ کہ نہ دن کو سکون میسر تھا اور نہ رات کو آرام کا کوئی لمحہ اور وہ مجسمہ عفت و حیا کہ جس

== داشتائیں رکھنے کی گنجائش نکالی گئی۔ بلکہ قحبہ گری کا نظام بھی قائم ہوا اور اتنا پھیل چکا ہے کہ اس سے نجات پانا مشکل ہو گیا ہے۔ نیز "آزاد محبت" کے نام سے زنا بالرضا کا ایک طوفان اٹھ رہا ہے۔ اس حالت کو محدود تعدد ازدواج کے اسلامی قانون کے مقابلے میں دیکھیے کہ کون سی صورت بہتر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اولاد کی فطری خواہش یک زوجگی سے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تیسری وجہ ایک عورت کی مستقل مریضانہ حالت ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے اسے طلاق دے کر مصیبت میں ڈالے بغیر اس کا شوہر فطری تقاضوں کو پورا کر سکے۔ چوتھی وجہ اس گنجائش کو چھوڑنے کی یہ ہے کہ بسا اوقات خاندانوں کی سیاست' انتقاموں کے چکر' وراثت کے جھمیلے' یتیموں اور بیواؤں کی کفالت کے مسائل کسی خاص صورت نکاح ہی سے حل ہو پاتے ہیں۔ مثالیں موجود ہیں (قدیم بھی اور تازہ ترین بھی) کہ سلطنتوں' وزارتوں' قیادتوں کے استحکام کے لیے بھی کبھار کوئی رشتہ ازدواج ہی واحد ذریعہ بنتا ہے۔

نے انسانیت کو پردے کا عظیم بابرکت قانون عطا کیا (خود اس قانون پر بھی یورپ کے لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں) اور آدم زاد کو قلب و نظر پر قابو رکھنا سکھایا۔ اور وہ ہستی کہ جس کے اوقات کا زیادہ حصہ ریاست اور معاشرہ کے وسیع مسائل میں کھپ جاتا تھا اور جس کے نجی اوقات پیروں کو متورم کر دینے والے لمبے لمبے قیام صلوٰۃ میں صرف ہوتے تھے۔ آخر کیسے اس کے بارے میں وہ فضول باتیں سوچی جا سکتی ہیں۔ پھر لذت پسند بادشاہوں اور فاتحوں کی سی کوئی بات اس میں نہیں دکھائی دیتی۔ نہ وہ جابر و ظالم ہے' نہ اسے شراب اور موسیقی اور فاخرہ لباسوں سے دلچسپی ہے۔ بلکہ الٹا اس نے معاشرہ کو ان نفسانیت انگیز تفریحات سے پاک کیا۔ نہ اس نے ازواج کو دنیوی عیش و عشرت کے سامان فراہم کر کے دیئے اور نہ ریشم اور سونے سے ان کے بدنوں کو سجایا۔ بلکہ اپنی درویشانہ زندگی کے رنگ میں ان کو بھی رنگ دیا۔ پھر ان کی ایسی ناز برداری کبھی نہیں کی کہ ان کی خوشنودی تحریک کے مفاد پر مقدم ہو جائے یا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اصول بھی ترک کرنا پڑے' بلکہ ایسے موقعوں پر ان کی سختی سے تادیب کی۔ اور ایک موقع پر تو نان و نفقہ کا معیار بلند کرنے کے مطالبے پر ہی صاف صاف ان سے کہہ دیا کہ اس فقیری میں ساتھ دے سکو تو بہتر' ورنہ میں رخصت کیے دیتا ہوں۔ کیا یہ سارے احوال مل جل کر ان لغو اعتراضات کا پوری طرح قلع قمع نہیں کر دیتے؟

حضورؐ کے متعدد نکاح جن خاص ضرورتوں پر مبنی تھے وہ یہ تھیں:

○ قبائلی نظام کا خاصا ہے کہ دائرہ عصبیت بڑا محدود ہوتا ہے اور اس کی سرحدات بہت ہی مضبوط رکھی جاتی ہیں۔ قبائلی ذہن اپنے اور پرائے میں پورے تعصب کے ساتھ فرق کرتا ہے۔ اندریں حالات بکھرے ہوئے بے شمار قبائل کو جوڑنے کے لیے جہاں انسانیت گیر نظریہ کی ضرورت تھی وہاں قائد کی ایسی شخصیت بھی مطلوب تھی جو سب کے لیے نہیں تو بیشتر اہم قبائل کے لیے اپنائیت رکھتی ہو۔ عرب میں عملاً اصلاح و تعمیر کا کوئی کام کرنا کسی ایسے شخص کے لیے تو سرے سے ممکن ہی نہ تھا جس کا اپنا کوئی قبیلہ نہ ہو۔ بلکہ معزز قبیلہ نہ ہو۔ لیکن کام کو کامیابی سے تکمیل تک لے جانے کے لیے بین القبائلی روابط کی ضرورت تھی۔ یہ سیاسی ضرورت بعض ازدواجی علائق کے لیے داعی بنی۔

مثلاً ام المومنین حضرت جویریہؓ کے معاملے کو لیجیے۔ یہ بنو مصطلق کے قبیلے کی خاتون ہیں۔ پورا قبیلہ نہایت طاقتور تھا اور ڈاکہ زنی اور لوٹ مار میں معروف۔ خود حضرت جویریہؓ کا والد نامی رہزن تھا۔ اسلامی حکومت سے اس قبیلہ نے شروع ہی سے سخت عداوت اختیار کی۔ یہ نہ نظم کو قبول کرنے پر تیار تھے' نہ معاہدانہ روابط کے لیے آمادہ۔ بلکہ مخالفت کے ہر محاذ پر موجود۔ آخر اس قبیلہ کو فوجی طاقت سے دبایا گیا۔ حضرت جویریہؓ قیدیوں میں آئیں۔ حضورؐ سے ان کا نکاح ہوا تو جماعت کے لوگوں نے پورے قبیلہ کے قیدیوں کو رہا کر دیا کہ یہ لوگ رسولؐ خدا کے سسرالی رشتہ دار بن گئے ہیں اور اب ہم ان کو قید میں نہیں رکھ سکتے۔ اس نکاح کی برکت دیکھیے کہ پورا قبیلہ رہزنی چھوڑ کر امن پسند اور مطیع نظام بن گیا۔ اب مدینہ

کی حکومت کا قائد ان کا اپنا عزیز تھا۔

اسی طرح ام المومنین حضرت میمونہؓ کے معاملہ کو لیجئے۔ نجد کا علاقہ جہاں انتہائی سیاسی اہمیت رکھتا تھا (کیونکہ قریش کا ایک تجارتی راستہ عراق جانے کے لیے ادھر سے بھی گزرتا تھا) وہاں دعوت کے لیے اس کی زمین بے حد سنگلاخ ثابت ہوئی۔ یہاں کے لوگوں نے ایک دعوتی و تعلیمی وفد کے ستر قیمتی افراد کو شہید کر دیا تھا۔ پھر متعدد بار اہل نجد نے اسلام کے خلاف فتنہ انگیزیاں کی تھیں۔ حضرت میمونہؓ سردار نجد کی اہلیہ کی بہن تھیں۔ حضورؐ سے اس نکاح کے ہوتے ہی فضا بدل گئی۔ اور نجد مدینہ کے زیر اثر ہوتا گیا۔ علاوہ ازیں ان کی متعدد بہنیں نہایت ممتاز سرداروں سے بیاہی ہوئی تھیں۔

پھر ام المومنین ام حبیبہؓ کے بارے میں غور کیجئے۔ کہ یہ قریش کے سردار اعلیٰ ابوسفیان کی صاحبزادی تھیں۔ اس نکاح کے بعد ابوسفیان پھر کبھی حضورؐ کے مقابلے پر میدان میں نہیں آیا اور اس کا زورِ مخالفت ٹوٹ گیا۔ بڑی حد تک اس نکاح نے فتح مکہ کا راستہ ہموار کر دیا۔

اسی طرح حضرت صفیہؓ کو لیجئے۔ یہ ایک اونچے یہودی سردار (حیی بن اخطب) کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے خاندانی مرتبے کے پیش نظر یہ کسی طرح موزوں نہ ہوتا کہ ان کو کسی معمولی گھر میں جگہ ملتی۔ حضورؐ نے ان سے نکاح کیا' تو پھر یہود کبھی مخالفانہ محاذ کا احیاء کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ حضرت صفیہؓ حضورؐ کے اذن سے یہودی اعزہ کی مالی خدمت بھی کرتی رہتی تھیں۔

حضرت حفصہؓ کے نکاح کے پس منظر میں دوسرے محرکات کے علاوہ ایک سبب یہ بھی کام کر رہا تھا کہ اسلامی معاشرہ کے لیے جن رفقائے خاص کو حضورؐ نے اپنا مشیر بنا کر قیادت کی ترتیب دی۔ ان میں سے چار سرکردہ ساتھیوں سے آپؐ نے گہرے ذاتی علائق قائم کیے۔ حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے آپؐ نے نکاح کیا۔ حضرت عثمانؓ کو یکے بعد دیگرے دو صاحبزادیاں نکاح میں دیں۔ حضرت علیؓ کے گھر کو جناب فاطمہؓ سے زینت بخشی۔ اندریں صورت حضرت عمرؓ کو اس حلقہ قرابت سے باہر نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ حضورؐ نے ان کی صاحبزادی کو بھی اپنے نکاح میں لے لیا۔ اس طرح حضورؐ نے مرکزی کڑی بن کر مستقبل کے ان قائدین کو باہم دگر مربوط کر دیا۔

اسی طرح حضرت سودہؓ بنت زمعہ کا تعلق بنو عدی بنو نجار (مدینہ) سے تھا۔ ان کا پہلا نکاح سکران بن عمرو سے ہوا تھا۔ اور سہیل بن عمرو جو معاہدہ حدیبیہ کے وقت قریش کے نمائندے تھے' سکران کے بھائی تھے' سکران نے حبش میں انتقال کیا تو حضورؐ نے ایک طرف تو ان کی تالیف قلب کے لیے اور دوسری طرف حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے نکاح کر لیا۔ یہ واقعہ دسویں سال نبوت کا ہے حضرت سودہؓ کی عمر بوقت نکاح حضورؐ کے برابر یعنی ۵۰ برس تھی۔ بعد میں انہوں نے ازدواج کے جسمانی مدعا سے بے نیازی اختیار کر لی تھی۔

---- حضورؐ نے ازدواجی رابطوں کو قائم کرنے میں ایک اور اہم بلکہ ناگزیر ضرورت کو پورا کرنے کا

خاص خیال بھی رکھا ہے۔ تحریک اسلامی کامیابی سے اپنے مراحل جبھی طے کر سکتی ہے جب کہ مردوں کے حلقے کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حلقے میں بھی متوازی طور پر کام جاری ہو۔ یہ کام بغیر اس کے کیسے ہو سکتا تھا کہ عورتوں کی رہنمائی اور تعلیم کے لیے خود انہی کی صنف میں سے کچھ ذہین خواتین کو بطور قائد اور کارکن کے تیار کر دیا جائے۔ اسلامی نظام حجاب کے ساتھ یہ ضرورت صرف دائرہ ازدواج ہی میں پوری ہو سکتی ہے یعنی جہاں ہر مسلم فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھر کی مستورات کو تحریک اسلامی کی خدمات کے لیے تیار کرے۔ وہاں پیغمبر اور قائد کے لیے زیادہ بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھر کو نمونہ کا گھر بنائے۔ اور اپنے اہل بیت کو خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے تیار کرے۔ یہی ضرورت ہے جس کے تحت خود قرآن میں حضورؐ کی ازواج و بنات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے علاوہ حضرت حفصہؓ اور ام سلمہؓ خواتین میں علمی اور ذہنی قیادت کے قابل بنیں اور بقیہ ازواج نے بھی اخلاقی حیثیت سے اپنے آپ کو قابل تقلید نمونہ بنایا۔

۔۔۔ بسا اوقات ازدواجی روابط میں حضورؐ کو دوسرے فریق کی تالیف قلب کا غیر معمولی اہتمام بھی کرنا پڑا۔ مثلاً اپنی پھوپھی زاد حضرت زینبؓ بنت جحش کا نکاح خود آپؐ ہی نے باصرار زیدؓ بن حارثہ سے کیا تھا اور مقصود یہ تھا کہ خاندانی امتیازات کی تنگ حد بندیاں ٹوٹ جائیں۔ نکاح بدقسمتی سے ناکام ہو گیا اور نوبت طلاق تک پہنچی۔ حضرت زینبؓ کی دل شکستگی ظاہر ہے اور حضورؐ اس میں اپنی ذمہ داری بھی محسوس کرتے ہوں گے۔ اپنے نکاح میں لے کر بہترین شکل میں تلافی فرما سکتے تھے۔ مگر جاہلیت کی ایک غلط روایت حائل تھی۔ زید بن حارثہ کو آپؐ نے منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا اور رواجاً ایسی صورت میں باپ بیٹے کے سے حقوق ہر معاملے میں آڑے آتے تھے۔ اس ریت کو خداوند تعالیٰ نے توڑ دیا۔ اور باذن خاص حضرت زینبؓ کو آپ کے نکاح میں دیا۔

اوپر ہم نے ام حبیبہؓ بنت ابوسفیان کے نکاح کی سیاسی مصلحت بیان کی ہے مگر اس کی بھی ایک وجہ تالیف قلب تھی۔ یہ عبیداللہ سے بیاہی ہوئی تھیں اور انہی کے ساتھ ہجرت کر کے حبش گئیں۔ وہاں شوہر نصرانی ہو گیا اور شراب نوشی میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ ام حبیبہؓ نے اسلام پر بڑا ثبات دکھایا۔ بہرحال غریب الوطنی میں شوہر کا ترک اسلام کرنا اور پھر مر جانا دوہرا صدمہ تھا۔ حضورؐ نے قاصد خاص (عمرو بن امیہؓ الضمری) کو شاہ نجاشی کے پاس نکاح کا پیغام دے کر بھیجا۔ ام حبیبہؓ کو اطلاع پہنچی تو اتنی خوشنود ہوئیں کہ مژدہ سنانے والی شاہی لونڈی کو اپنے زیور دے دیئے۔ شاہ نجاشی نے خود نکاح پڑھایا۔ ام حبیبہؓ نے اپنے ماموں کے لڑکے خالدؓ بن سعید بن ابی العاص کو وکیل بنایا۔ چار سو دینار مہر شاہ نجاشی نے اپنے ہاں سے ادا کیا اور ضیافت کی۔ بعض روایات کے بموجب مدینہ میں تجدید نکاح کی گئی اور ولیمہ بھی ہوا۔

اسی طرح ام المساکین زینبؓ بنت خزیمہ بن الحارث ہلالیہ (بن بکر بن ہوازن) حضورؐ کے پھوپھی زاد عبداللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں۔ ان کی شہادت (غزوہ احد) میں ہوئی تو حضورؐ نے ان کو بیوگی سے نکال

کر اپنے حرم میں لے لیا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ خالص گھریلو معاملہ تھا اور تالیف قلب کے ساتھ اس میں خاندانی پہلو بھی ملحوظ ہوں گے۔

بروئے تحقیق جملہ گیارہ نکاح حضورؐ نے کیے۔ اس سے زائد کی کمزور روایات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔ ان میں سے حضرت خدیجہؓ قبل ہجرت (دسویں سال نبوت میں) اور زینب بنتؓ خزیمہ صرف ۳ ماہ ازدواج نبوی میں رہ کر ۳ ھ میں فوت ہوئیں۔ حضورؐ کی عمر کا بالکل آخری دور ہے جس میں کل ۹ ازواج مطہرات بیک دم حرم میں تھیں اور ان میں سے بھی ایک (حضرت سودہؓ) دنیوی رغبتوں سے بالکل بے نیاز ہو گئی تھیں۔ لیکن جب قانون الٰہی نے پابندی عائد کر دی تو اس کے بعد پھر آپؐ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔ عام مسلمانوں کے مقابلے میں قانون نے ایک استثنیٰ آپ کو دیا۔ عام مسلمانوں کو تو یہ حکم تھا کہ اگر چار سے زیادہ کسی کی بیویاں ہوں تو وہ زائد تعداد کو طلاق دے دے۔ لیکن حضورؐ کو اجازت دی گئی کہ زائد ازواج کو پاس رکھیں۔ اس استثنیٰ کی وجہ یہ تھی کہ ازواج النبیؐ کو ضروریات دینی کے تحت امہات المومنین قرار دے کر محرمات میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اب اگر ان میں سے کچھ کو حضورؐ سے طلاق دلوائی جاتی تو وہ بالکل تنہا ہو کے رہ جاتیں۔

اب حضورؐ کے ازدواجی علائق کی سیاسی اہمیت کو دیکھیے کہ ان کی وجہ سے ایک طرف مکہ کے قبائل اور مہاجر برادری سے اور دوسری طرف عام قبائل عرب سے قائد نظام کو جو رشتہ یگانگت حاصل ہوا اس کی وسعت ظاہر کرنے کے لیے ہم متعلقہ خاندانوں اور قبائل کے نام درج کرتے ہیں۔ بنی اسد بن عبدالعزیٰ۔ (۲) بنی عامر بن لوی۔ (۳) بنی تمیم۔ (۴) بنی عدی۔ (۵) بنی مخزوم۔ (۶) بنی امیہ (۷) بنی اسد بن خزیمہ۔ (۸) بنو مصطلق (۹) یہود عرب (۱۰) بنو کلاب۔ کلب و سلیم (۱۱) بنو کندہ۔

ان قبائل کے علاقوں کو اگر جغرافیائی تقسیم کے لحاظ سے دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ فی الواقع حضورؐ کی شخصیت بین القبائلی درجہ پر آگئی تھی جو تمام بڑے بڑے قبائل کے لیے مرکزی حیثیت رکھنے کی وجہ سے اس عظیم وحدت کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی جس کا تقاضا اسلامی تحریک کرتی تھی۔ بے شمار مزاحمتوں اور باغیانہ عزائم کو ان تعلقات نے ختم کر دیا۔ بلکہ بہت ہی دیرینہ تاریخی عداوتیں تک بے اثر ہو گئیں۔ سوچیے کہ ایک عظیم نصب العین جس سے ساری انسانیت کو بہرہ مند ہونا تھا ــــــ ایک نظام عدل و امن اور ایک عالمگیر رابطہ اخوت کیا اتنی قیمتی چیز نہ تھا کہ اس کے لیے اگر تعدد ازدواج سے عرب کے قبائلی ماحول میں راستہ ہموار ہوتا ہو تو کیا جائے۔ پھر پورے عرب کو وحدت اور نظم اور امن اور تمدن کی راہ پر ڈالنے کے لیے اگر یہ تدبیر بین طور پر مفید رہی تو آخر اس پر لے دے کیوں؟

درحقیقت دیکھا جائے تو یہ حضورؐ کا ایثار عظیم تھا کہ آپؐ نے انسانی بھلائی کے مشن کو کامیاب کرنے کے لیے اپنی وسیع مصروفیات کے ساتھ آخری عمر میں عیالداری کا اتنا بوجھ اٹھایا۔ اور اپنے عالم فقر میں کن مشکلوں سے اہل بیت کے نان و نفقہ کے انتظامات کیے اور گھرداری کے کتنے جھمیلوں کو اپنے سر لیا۔ کوئی

آدمی تصور نہیں کر سکتا کہ ان سارے حالات کی یکجائی سے کسی آدم زاد کو کوئی لمحۂ عشرت تو کجا، سکون کی کوئی گھڑی بھی ہاتھ آ سکتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اپنے اعلیٰ مقصد کی خاطر حضورؐ کا یہ ایثار تھا کہ تعدد ازدواج کا بار اٹھایا۔

گویا جہاں تک تحریک اسلامی کے سیاسی پہلو کا تعلق ہے محسنؐ انسانیت کے وسیع ذاتی تعلقات نے ضرور راستے صاف کیے ہوں گے۔ اور عوام کے لیے اسلام کی طرف بڑھنا آسان کر دیا ہو گا۔

عوام خود آگے بڑھتے ہیں:

کسی بھی اصولی انقلابی تحریک کی طرح محسنؐ انسانیت کے کارنامے کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ دور جب کہ اسلامی تحریک خود عوام کے قریب جا جا کر ان کو پکارتی تھی۔ دوسرا وہ دور جب کہ عوام خود آگے بڑھنے لگے۔ اور اسلام کے دروازے پر خود دستک دینے لگے کہ ہم اندر آنا چاہتے ہیں۔ یہ دوسرا دور دور توسیع ہوتا ہے۔ اور یہ جب آ چکتا ہے تو پھر تمام مزاحمتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور تمام منفی رجحانات میدان چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر اس دور تک پہنچنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں نے بڑے بڑے جتن کیے اور خون پسینہ ایک کر دیا۔ ایک طرف فکری دعوت کے میدان میں ثابت کر دیا کہ دلیل کی قوت ہمارے ساتھ ہے۔ دوسری طرف اخلاقی دائرے میں دھاک بٹھا دی کہ اسلام کا بنایا ہوا انسان بہترین نمونہ انسانیت ہے۔ تیسری طرف سیاسی بصیرت کے لحاظ سے اپنا سکہ جما دیا کہ ہم لوگ معاملات کی گرہوں کو کھولنا باندھنا جانتے ہیں۔ اور چوتھی طرف میدان کارزار میں اپنا لوہا منوا لیا کہ ہم مزاحمتوں سے نمٹ سکتے ہیں اور ظلم و جور کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔ دماغوں کو متاثر کیا۔ دلوں کو جھنجوڑا۔ جذبات کو ساتھ لیا۔ سعادت مند روحوں کو شفیق بنا کر گلے لگایا۔ غیر جنگ پسند قبائل کو معاہداتی نظام میں منسلک کیا اور جنگ جو مخالفین کا جنگی زور توڑ کر راستہ صاف کیا۔ تب کہیں جا کر وہ وقت آیا کہ عوام ہر چہار جانب سے نئے مرکز امید ------ مدینہ ------ کی طرف گامزن ہوئے۔

یہ دور اس سال سے شروع ہوتا ہے جسے "عام الوفود" کا عنوان دیا گیا ہے۔ یعنی وہ سال جس میں عرب کے گوشے گوشے سے قبائل نے اپنے وفود مدینہ بھیجے ---- قبول اسلام کے لیے' سیاسی اطاعت کا عہد باندھنے کے لیے' محض تحقیق و تفتیش اور حالات کو سمجھنے کے لیے!! ہر طرف اسلام کی پیاس پیدا ہو گئی۔ ایک حرکت اور ایک ہل چل کا آغاز ہو گیا۔ یہ دور فتح مکہ کے بعد کے تین سالوں ۸۔۹۔۱۰ھ پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ گویا محسنؐ انسانیت کی کاشت کردہ فصل کے برگ و بار لانے کا موسم تھا۔ گو اجمال ہمیں ملحوظ ہے۔ لیکن سیرت کا یہ باب اتنا اہم ہے کہ وفود کا تذکرہ سامنے آنا چاہیے۔ کیونکہ وفود کی آمد اور ان کی بات چیت اور ان کے تاثرات میں نہایت ہی مفید اسباق ملتے ہیں۔ پھر یہی بیان اس حقیقت کو واضح کر سکتا ہے کہ کس طرح عوام الناس چاروں طرف سے آ آ کر اسلام کے قدموں میں گرے۔ سیرت کی مختلف قدیم

کتابوں میں مدینہ آنے والے وفود کی تعداد کم سے کم ۱۵ اور زیادہ سے زیادہ ۱۰۴ ملتی ہے۔ ہم ان میں سے صرف اہم اور نمایاں وفود کا تذکرہ کریں گے۔ ان میں سے بھی تفصیل صرف دو چار وفود کے متعلق دی جا رہی ہے۔ عام الوفود سے قبل ۵ھ میں ہی اکادکا وفود آنے لگے تھے۔ سو وہیں سے آغاز کرتے ہیں۔

۱ ۔ وفد قبیلہ مزینہ:

یہ بہت بڑا قبیلہ تھا اور اوپر جا کر اس کا سلسلہ نسب قریش سے مل جاتا تھا۔ مشہور صحابی نعمان بن مقرن اسی قبیلے سے تھے۔ ۵ھ میں اس قبیلہ کے چار سو افراد کا عظیم وفد نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اسلام کا پیمان باندھا۔ غالباً مدینہ آنے والا سب سے پہلا نمائندہ عوامی وفد یہی تھا۔ مدینہ سے واپسی پر ان کو زاد راہ کے طور پر کھجوریں دی گئیں۔

۲ ۔ وفد قبیلہ بنو تمیم:

یہ وفد بھی ابتدائی دور میں آیا اور بڑے کروفر سے آیا۔ قبیلہ کے بڑے بڑے رؤسا (اقرع بن حابس' زبرقان' عمرو بن الاہتم' نعیم بن یزید اور عیینہ بن حصن فزاری) خود شریک وفد تھے۔ اس وفد کی وجہ سے خاصی رونق رہی۔ اس وفد کے افراد مسجد میں داخل ہوئے تو بڑے اکھڑ طریقے سے حجرے کے قریب آواز دی۔ محمد اے محمد! (ﷺ) باہر آؤ! چنانچہ وحی الٰہی (سورۃ الحجرات) نے ان کو شائستگی کا درس بھی دیا۔ یہ لوگ یوں تو اسلام کو دل دے کے ہی گھروں سے چلے تھے۔ مگر ابھی عربی مفاخرت کا رنگ مزاجوں میں باقی تھا۔ انہوں نے خواہش کی کہ فریقین کے خطیب اور شعراء مجمع میں فصاحت اور معنی آفرینی کے جوہر دکھائیں۔ در حقیقت عرب کے بعض اونچے قبائل کسی قیادت کو جبھی قبول کر سکتے تھے کہ اس کی ذہنی برتری کے وہ قائل ہو جائیں۔ حضورؐ نے بھی اس مجابت و مفاخرت کی دعوت کو مصلحت دیکھ کر قبول کر لیا۔

عطارد بن حاجب بنو تمیم کا نامور خطیب تھا۔ اس نے اپنے قبیلہ کی قیادت و سیادت اور دولت و جاہ کو تقریر میں پیش کیا۔ اور کہا کہ "ہماری ہمسری کا جسے دعوی ہو وہ ایسے خصائص و اوصاف سامنے لائے"۔

نبی اکرم ﷺ کے اشارے سے اسلامی تحریک کے ایک خطیب ثابت بن قیس جوابی تقریر کے لیے اٹھے۔ انہوں نے ایک پر زور خطبہ میں ہلکے سے رنگ مفاخرت کے پردے میں دعوت کا پہلو نمایاں کیا۔ اور اسی کو اسلامی معاشرہ کا سرمایۂ افتخار قرار دیا۔ چند جملے اصل عربی میں دیکھیے۔ کیا بانکی ہے:۔

"الحمدلله الذی السموات والارض خلقه فقضی فیهن امره و وسع کرسیه علمه ! ---- ثم کان من قدرته ان جعلنا ملوکا و اصطفی من خیر خلقه رسولا ۔ اکرمه نسبا ۔ و اصدقه حدیثا و افضله حسبا --- ثم دعا الناس الی الایمان به فامن برسول الله المهاجرون من قومه و ذوی رحمه ' اکرم الناس حسبا و احسن الناس وجوها و خیر الناس فعالا ----- فنحن انصار الله وزراء

رسولہ ......"

پھر تمیم کے ممتاز شاعر زبرقان بن بدر نے قصیدہ پڑھا۔ رنگ یہ تھا۔

نحن الکرام فلاحی یعادلنا   من الملوک و فینا تنصب البیع

ہم اشراف ہیں اور کوئی قبیلہ ہماری ہمسری نہیں کر سکتا۔ ہم میں تاجدار ہیں اور ہم لوگ معبد تعمیر کرتے ہیں۔

اسلامی تحریک کے انقلابی شاعر حضرت حسان موجود نہ تھے۔ ڈھونڈ کرلائے گئے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "اٹھو حسان! اس شخص کی شاعری کا جواب پیش کرو"۔ ابن ہشام نے ان کا قصیدہ نقل کیا ہے۔ وفد نے اعتراف کیا کہ ہمارے خطیب اور شاعر سے رسولؐ خدا کے خطیب اور شاعر برتر ہیں۔ اس اعتراف کے بعد تمام افراد اسلام کے سایہ رحمت میں آگئے۔

۳ ۔ وفد بنی عبدالقیس:

علاقہ بحرین میں دعوت اسلامی کا آغاز بذریعہ منقذ بن حبان ابتداء ہی میں ہو گیا۔ حلقہ اثر وسیع ہونے لگا۔ ۵ ھ میں تیرہ آدمیوں کا وفد مدینہ آیا۔ حضورؐ کے پوچھنے پر انہوں نے جب بتایا کہ ہم خاندان ربیعہ کے افراد ہیں۔ تو حضورؐ نے "مرحبا! لا خزایا ولا ندامی" کہہ کر ان کی عزت افزائی کی۔ وفد کی طرف سے درخواست کی گئی کہ چونکہ ہمارا علاقہ زیادہ دور ہے۔ اور راستے میں کفار مضر کی آبادیاں ہیں۔ اس لیے ہم چار مہینوں کے علاوہ سفر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہمیں چند متعین باتیں بتا دیجئے۔ جن پر ہم کاربند رہیں۔ اور اپنے لوگوں کو بتائیں۔ نبی اکرم ﷺ نے توحید' نماز' روزہ اور ادائے خمس کی تلقین فرمائی اور شراب سازی سے اجتناب کے لیے چار قسم کے مروج ظروف۔ دباء' حنتم' نقیر' مزفت کا استعمال ممنوع ٹھہرایا۔ وفد کے لوگ بحرین کی جاہلی ثقافت کے متعلق حضورؐ کی معلومات سن کر بڑے حیران ہوئے۔ لیکن آخر نظام حیات کو زیر و زبر کر دینے والی تحریک کا سربراہ کار زیر دعوت علاقوں کے حالات سے بے خبر رہ کر کام کیسے چلا سکتا ہے۔ حضورؐ کی معلومات کچھ تو ذاتی سفروں سے ماخوذ تھیں۔ اور پھر مکہ اور مدینہ کے مرکزی مقامات پر گوشے گوشے کے لوگ آتے تھے۔ اور ان سے بہت کچھ حالات علم میں آتے تھے۔

اس وفد میں ایک شخصیت جارود بن العلاء کی بھی تھی۔ جارود مسیحی تھا۔ اس نے عرض کیا کہ میں ایک مذہب پر چل رہا ہوں۔ اسے چھوڑ کر اگر آپؐ کے دین پر آؤں تو کیا آپؐ ضامن بنتے ہیں۔ (یعنی کوئی اخروی وبال تو نہ آئے گا) حضورؐ نے فرمایا۔ "ہاں میں ضامن ہوں۔ کیونکہ جس دین کی طرف میں دعوت دیتا ہوں۔ یہ تمہارے مذہب سے افضل ہے"۔ جارود فوراً مسلمان ہو گیا اور اس کے ہم مذہب ساتھی بھی حلقہ اسلامی میں داخل ہو گئے۔

۴ ۔ نمائندہ بنو سعد (بن بکر):

قبیلہ نے ضمام بن ثعلبہ کو نمائندہ بنا کر بھیجا۔ یہ شتر سوار عجب سادہ بدویانہ انداز سے مسجد نبویؐ میں آیا۔ اور اصحاب نبیؐ سے پوچھا۔ "تم میں سے عبدالمطلب کا فرزند (یعنی اولاد) کون ہے؟ لوگوں نے حضورؐ کی طرف اشارہ کیا۔ کہ وہ گورے چہرے والے ہیں رسولؐ خدا! پاس پہنچا اور کہا " اے عبدالمطلب کے بیٹے! کچھ باتیں سختی سے پوچھوں گا۔ برا نہ منانا"۔ حضورؐ نے اجازت دی۔ پھر اس نے قسم دلا دلا کر دین کی چند بنیادی باتوں (توحید' رسالت' نماز' حج ● زکوٰۃ وغیرہ) کے بارے میں پوچھا۔ کہ کیا آپؐ ایسا کہتے ہیں؟ حضورؐ تصدیق فرماتے گئے۔ سارے جواب لے کر کہا۔ "میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے۔ مجھ کو میری قوم نے بھیجا ہے۔ میں جاتا ہوں۔ اور جو کچھ تم نے بتایا ہے اس میں نہ میں ذرہ بھر اضافہ کروں گا' نہ کمی" ---- اونٹ پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد حضورؐ نے فرمایا۔ کہ "اگر یہ سچ کہتا ہے تو اس نے فلاح پائی"۔

واپس جا کر اس نے قوم میں طوفانی انداز سے دعوت دی کہ لوگو! میں خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لایا ہوں۔ لات و عزیٰ وغیرہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ لوگوں نے ڈرایا کہ تم پر ایسی باتوں کی وجہ سے ان بتوں کی مار نہ پڑے اور جنون یا جذام نہ ہو جائے۔ ضمام نے کہا "خدا کی قسم! یہ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر!" شام ہونے سے پہلے پہلے سارا قبیلہ اسلامی تحریک میں شامل ہو گیا۔

۵ ۔ وفد اشعریین (یمن):

یمن کا یہ ایک معزز قبیلہ تھا اور ابو موسیٰ اشعری اسی کے ایک فرد تھے۔ ان تک دعوت حق کی دور میں (طفیل دوسی اور مہاجرین حبشہ کے واسطے سے) پہنچ چکی تھی۔ متاثرین میں سے تین اشخاص ہجرت کا عزم باندھ کر مدینہ چلے کہ حضورؐ سے فیضان حاصل کریں گے اور تحریک حق کو تعاون بہم پہنچائیں گے۔ بحری سفر تھا۔ راستے میں مخالف ہوا چلی اور جہاز حبش کے ساحل سے جا لگا۔ وہاں یہ لوگ ہجرت اولیٰ کی سعادت پانے والی اسلامی جماعت سے جا ملے۔ کچھ زمانہ وہاں رہ کر جعفر طیار کی رفاقت میں چند نو مسلم حبشیوں کو بھی ساتھ لے کر یہ مدینہ کو روانہ ہوئے۔ اور فتح خیبر کے موقع پر (۷ ھ) بارگاہ رسالت میں جا حاضر ہوئے۔ ان کے جذبہ بے اختیار کا یہ عالم تھا کہ منزل مقصود پر پہنچے تو یہ نغمہ مسرت زبانوں سے ابلا پڑتا تھا کہ:۔

غدا نلقی الاحبۃ محمدًا و حزبہ

کل ہم اپنے رفیقوں سے جا ملیں گے۔ یعنی محمد (ﷺ) سے اور ان کی جماعت سے۔

● محققین کی رائے ہے کہ راویوں کے تسامح سے حج کا ذکر یہاں شامل ہو گیا ہے۔ کیونکہ حج کی فرضیت بعد میں ہوئی۔ بصورت دیگر اس وفد کا وقت آمد بعد کا ہونا چاہیے۔

حضورؐ کو اطلاع ہوئی تو احباب سے کہا: "تمہارے ہاں یمن سے کچھ لوگ آتے ہیں (خیال رہے کہ) یہ لوگ بہت رقیق القلب اور نرم دل ہوتے ہیں۔" پھر فرمایا۔ "ایمان ہے تو یمن کا! حکمت ہے تو یمن کی!"

پھر ملاقات ہوئی' باتیں ہوئیں' سوالات سامنے آئے' جوابات دیے گئے۔ اور مدینہ کی فضا میں ایک نیا رنگ چھا گیا۔

۶ - وفد دوس (یمن):

ہم بتا چکے ہیں کہ طفیل دوسی مکہ کے ابتدائی دور دعوت میں اسلام لائے تھے۔ انہوں نے جاتے ہی زور شور سے کام کیا۔ اور ان کے والد اور بیوی تو فوراً ان کے ساتھ ہو گئے۔ کچھ دوسرے افراد بھی متاثر ہوئے۔ مگر قبیلہ بڑے بھاری اخلاقی انحطاط میں پڑ گیا تھا۔ اور بدکاری پھیل گئی تھی۔ ایسے حالات میں ان کی تندی مزاج اور جوشیلے پن کی وجہ سے کام آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ حضورؐ سے آکر ملے۔ اور قوم کی شکایت کر کے دعا کی تمنا کی۔ آپؐ نے ان کو نرم انداز دعوت کی تلقین کی اور دوس کی اصلاح کے لیے خدا سے دعا کی۔ اب جو طفیل نے جا کر کام شروع کیا تو راستے کھلتے گئے اور ۵ ھ میں بہت سے گھروں میں اسلام کی شعاعیں داخل ہو گئیں یہاں تک کہ ۷ ھ میں ۸۰ خاندان ہجرت کر کے مدینہ آگئے۔ اور انہی مہاجرین میں حضرت ابوہریرہؓ جیسی گراں قدر شخصیت بھی تھی۔

۷ - وفد صداء:

اس قبیلہ میں سے پہلے پہل زیاد بن حارث صدائی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا تھا۔ پھر اس نے جا کر کچھ اثر ڈالا۔ ۸ ھ میں ۱۵ آدمیوں کا ایک وفد پورے قبیلے کا نمائندہ بن کر حاضر ہوا۔ سعد بن عبادہ ان کے میزبان تھے۔ انہوں نے کھانے کے علاوہ ان کے لیے کپڑوں کا انتظام بھی کیا۔ ان لوگوں نے حضورؐ کے ہاتھ پر اسلامی تحریک میں شرکت کی بیعت باندھی۔ اور قبیلہ کی طرف سے بھی تعاون کی پیش کش کی۔ اس وفد کے واپس جانے پر کام تیزی سے ہوا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر اس قبیلے کے یک صد افراد مکہ پہنچے۔

فتح مکہ سے قبل کے دور میں یہی وفود ایسے سامنے آتے ہیں کہ جن کا تذکرہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ فتح مکہ کے بعد تو گویا ایک عوامی سیلاب تھا۔ جو ہر چہار طرف سے اسلام کا ساتھ دینے کے لیے امڈ پڑا۔ ۹ ھ اور ۱۰ ھ میں کثیر تعداد میں وفود مدینہ پہنچے ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۸ - وفد ثقیف (طائف):

حضورؐ جب فتح مکہ کے سفر سے واپس ہوئے تو عروہ بن مسعود ثقفی حاضر ہو کر حلقہ اسلامی میں داخل ہوئے اور بنو ثقیف میں دعوت پھیلانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضورؐ نے ثقیف کے کبر و غرور کے پیش نظر احتیاط کا مشورہ دیا۔ اور اندیشہ ظاہر کیا کہ وہ لوگ تمہیں قتل نہ کریں۔ حضرت عروہؓ کو اپنے اثر و رسوخ پر بڑا اعتماد تھا۔ لہٰذا باصرار کام کرنے کی اجازت لی۔ واپس جاتے ہی مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر اسلام کی

پکار بلند کی۔ ان کی توقع کے خلاف ہر طرف سے ناوک اندازی شروع ہو گئی اور ایک تیر کھا کر وہ شہید ہو گئے۔ بنو ثقیف کرنے کو تو یہ حرکت کر بیٹھے۔ مگر اس ظالمانہ اقدام نے ان کے ضمیروں میں حرکت بھی پیدا کر دی۔ وہ معاملہ کو ٹھنڈے دل سے سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ مہینہ بھر بعد انہوں نے ایک اجتماع کیا۔ جس میں صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر اس سوال پر غور کیا گیا کہ آیا ہم لوگ پورے عرب کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جو اسلام کے زیر نگین ہو چکا ہے۔ بالآخر طے پایا کہ مدینہ میں کسی نمائندہ کو بھیجا جائے۔ بعد میں پورا وفد تیار کیا گیا۔ عثمانؓ بن ابی العاص' اوسؓ بن عوف اور نمیرؓ بن خرشہ (بنی مالک میں سے)' حکمؓ ابن عمرو بن وہب اور شرجیلؓ ابن غیلان (حلیف قبیلوں کی طرف سے) وفد میں شریک ہوئے۔ عبدیالیل سردار طائف ان کو لے کے مدینہ گیا۔ یاد کیجئے کہ یہ وہی عبدیالیل ہے جس نے بارہ سال قبل حضورؐ کی دعوت سننے سے انکار کر دیا تھا اور اوباشوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا تھا۔

تبوک سے رسول اکرم ﷺ کی واپسی پر یہ وفد مدینہ پہنچا۔ ان کے لیے مسجد کے متصل خیمہ نصب کیا گیا۔ خالد بن سعید بن العاص فریقین کے درمیان ذریعہ گفتگو بنے۔ ان لوگوں نے عجب عجب شرطیں پیش کیں۔

ایک شرط یہ تھی کہ تین برس تک ان کا بت "لات" منہدم نہ کیا جائے۔ پھر اس مدت کو گھٹاتے گھٹاتے وہ ایک مہینہ تک لائے۔ یہ بت جس جامد ذہنیت کا مظہر تھا۔ وہ اندر سے مان نہیں رہی تھی۔ انہوں نے یہ اندیشہ پنہاں ظاہر کر دیا کہ ہمارے بتوں کو اگر کہیں معلوم ہو گیا کہ ان کو توڑا جانے والا ہے تو ممکن ہے کہ وہ تمام باشندوں کا خاتمہ کر دیں۔ حضرت عمرؓ یہ سن رہے تھے۔ ان سے چپ نہ رہا گیا۔ عبدیالیل کو مخاطب کر کے کہا۔ "کیسی جہالت کی باتیں کر رہے ہو۔ تمہارے یہ معبود تو محض پتھر ہیں"۔ عبدیالیل نے بھنا کر کہا کہ اے ابنؓ خطاب ہم تم سے بات کرنے نہیں آئے۔ ہمارا معاملہ رسول اللہ سے ہے۔ بہرحال حضورؐ نے یہ شرط جب کسی قیمت پر قبول نہ کی۔ تو وہ اس پر راضی ہو گئے کہ انہدام کی کارروائی ہم سے نہ کرائی جائے۔ بلکہ حضورؐ اپنے آدمی بھیجیں۔ چنانچہ ابو سفیانؓ بن حرب اور مغیرہؓ بن شعبہ کو نامزد کر دیا گیا۔

پھر انہوں نے کہا کہ ہمیں نماز ادا کرنے سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "جس دین میں نماز نہیں اس میں کوئی بھلائی نہیں"۔

ایک رکن وفد نے یہ بھی درخواست کی۔ کہ رسول خدا! ہمیں زنا کی اجازت دیجئے۔ اس کے بغیر تو ہمارے لیے کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ پھر وہ کہنے لگے۔ کہ اچھا ہمارے لیے سود کی لین دین کی تو گنجائش چھوڑیے۔ اسی طرح شراب پینے کی چھوٹ مانگی۔

انداز ایسا تھا گویا کہ رسولؐ خدا نے کوئی دکان لگا رکھی تھی۔ کہ جس میں سے ہر ایک اپنی اپنی پسند کا سودا خرید سکتا تھا۔ کہ جو چیز چاہے چھوڑے اور جو چیز چاہے لے۔ حضورؐ ان مطالبوں کے جواب میں قرآن کی آیات پڑھ کر بتاتے گئے کہ یہ تو خدائی ضابطہ ہے۔ نہ کہ کسی کا من گھڑت۔ جب یہ فضول شرائط مسترد ہو

گئیں تو پھر اہل وفد مشورہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے۔ کہ اگر ہم اسلام کے مطالبات نہیں مانتے تو ہمارا حشر بھی ایک دن مکہ والوں کا سا ہو گا۔ مجبوراً سر اطاعت خم کیا۔ اور معاہدہ لکھا گیا۔ حضورؐ نے صرف دو باتوں میں ان کو ڈھیل دے دی۔ یعنی کچھ مدت کے لیے ان سے زکوٰۃ کی وصولی نہ کی جائے گی اور ان کو جہاد میں شرکت پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ لیکن حضورؐ کی توقع کے مطابق جب اسلام نے دلوں میں گھر کر لیا تو یہ تقاضے از خود پورے ہونے لگے۔

وفد میں ایک مخلص نوجوان عثمانؓ بن ابی العاص شریک تھے۔ یہ فارغ اوقات میں اسلام کی حقیقت شریعت کے احکام اور نظام اسلامی کے تقاضوں کا علم حاصل کرتے۔ انہیں کو امیر مقرر کیا گیا۔ یہ لوگ جب واپس پہنچے تو پہلے تو انہوں نے ڈرامائی طریق سے مخالفانہ تاثر بیان کیا۔ کہ محمد (ﷺ) نے بڑی ناقابل قبول شرطیں پیش کی ہیں لہٰذا جنگ کی تیاری کرو۔ دو روز تک خاصی جوشیلی فضا قائم رہی۔ آخر کار لوگ خود ہی کہنے لگے کہ بھلا ہم محمد (ﷺ) سے کیا لڑیں گے۔ جب کہ سارا عرب اس کی اطاعت کر رہا ہے جاؤ جو کچھ وہ کہے اسے قبول کرو۔ یوں فضا تیار کر کے اہل وفد نے پھر اپنا حقیقی تاثر بیان کیا۔ ہم نے محمد (ﷺ) کو تقویٰ' وفا' رحم اور صدق میں بہت اونچا پایا ہے اور ہمارا سفر بہت ہی بابرکت رہا۔

بتوں کے انہدام کے لیے ابو سفیانؓ بن حرب اور مغیرہؓ بن شعبہ بھی وفد کے ساتھ ہی روانہ ہوئے۔ ان حضرات نے جب کارروائی شروع کی۔ تو عورتوں اور بچوں کا ہجوم یہ دیکھنے کے لیے اکٹھا ہو گیا کہ ان پر کیا گزرتی ہے۔ بعض عورتیں ڈر کے مارے رو رہی تھیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ زمین و آسمان کا نظام نہ ٹوٹ جائے۔ انہوں نے شعر گا گا کر بین بھی کیے کہ "لوگوں پر روؤ کہ ان بزدلوں نے اپنے بت دشمنوں کے حوالے کر دیئے اور آڑے نہ آسکے"۔

وہی طائف جو ایک دن داعی حق پر پتھر پھینک رہا تھا' آج اسی کے اشارے سے ان کا جاہلی نظام خود ان کی آنکھوں کے سامنے مسمار کیا جا رہا تھا۔

دیکھیے کہ طائف عرب کے جاہلی نظام کا ایک خاصا گڑھ تھا اور حضورؐ نے محاصرہ کرنے کے بعد محض اس خیال سے چھوڑ دیا تھا کہ اسلام کے ملک گیر ماحول کے اندر اب بنو ثقیف اپنا الگ جزیرہ بنا کے تو رہ نہیں سکتے۔ لہٰذا خونریزی کیوں ہو۔ مکہ اگر نظام حق کے آگے سرنگوں ہو گیا تو طائف جو مکہ کے تابع رہا ہے۔ اس کی گردن تا بہ کے اکڑی رہ سکتی ہے۔ اگر کوئی جنگ پسند فاتح ہوتا تو ایک بار فوج کشی کرنے اور طائف کو محاصرہ میں لینے کے بعد کم سے کم اپنے وقار ہی کی خاطر معرکہ کی تکمیل کرتا۔ لیکن حضورؐ کو بے مدہ قوت کا استعمال بجز ناگزیر صورتوں کے ناپسند تھا' اس لیے محاصرہ اٹھا لیا۔ اور مہم نامکمل چھوڑ دی۔ مقصود یہی تھا کہ بعد میں جب ثقیف حالات کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کریں گے۔ تو رغبت سے اطاعت کا راستہ اختیار کر لیں گے۔ اور ایک تعمیری اصلاحی انقلاب کے لیے یہی صورت زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔ ۔ر میں یہی ہوا۔

۹ - وفد بنی حنفیہ :

یہ لوگ علاقہ یمامہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تک اسلام ثمامہ بن اثال کی دعوت سے پہنچا۔ اور پھر یہ لوگ خود مدینہ آکر نبی اکرم ﷺ سے ملے۔ اور اسلامی تحریک کے سائے میں داخل ہوئے۔

اسی وفد کے ساتھ مسیلمہ کذاب بھی آیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر کی باتیں کیں کہ اگر محمدؐ (ﷺ) یہ بات طے کریں کہ اپنا جانشین مجھے بنائیں گے تو میں بیعت کروں گا۔ دراصل نبوت محمدیؐ کی عظیم الشان کامیابیوں کو دیکھ کر اس شخص کے منہ میں پانی بھر آنے لگا تھا۔ اور اس نے نہ جانے کب سے یہ سوچنا شروع کر دیا ہو گا کہ کچھ ادبی عبارات کو اگر بطور الہام پیش کیا جائے اور مقابلے پر ایک علم نبوت بلند کر دیا جائے تو کچھ کھیل بنایا جا سکتا ہے۔ مگر وہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ کردار کی وہ قوت کہاں سے آئے گی جو بیس برس سے مخالفتوں کی زہر گداز وادیاں طے کر رہی تھی۔ انہی خیالات کی وجہ سے اس کا ذہن سوداگرانہ بن گیا تھا۔ اس کا منشاء یہ تھا کہ یا تو مجھ سے سودا کر لو۔ ورنہ پھر میں پورا زور لگا کر رہ جاؤں گا۔

حضورؐ نے اس کا ذہن پڑھ لیا۔ اور کھجور کی جو چھڑی اس وقت ہاتھ میں تھی اسے آگے کر کے فرمایا۔ کہ میں تو اس چھڑی کے دینے کی شرط پر بھی بیعت نہیں لینا چاہتا۔ یعنی اسلام کوئی بنئے کی دکان نہیں ہے۔ کہ جس کی جنس تجارت کو بیچ کر کسی کو ذاتی نفع کمانا ہو اور سودے کر کر کے بیعت لے اور لوگوں کو جماعت میں شریک کرے۔ جو حق کو حق مانتا ہو' وہ اس کی علمبرداری کو اپنا ذاتی فرض مان کے آئے۔ کسی پر احسان دھرنا کیا معنی!

وفد واپس چلا گیا۔ واپس جا کر مسیلمہ نے واقعی علم نبوت بلند کر دیا۔ اس کی شریعت میں نماز معاف تھی اور شراب اور زنا حلال۔

۱۰ - وفد بنی طے :

قبیلہ طے کے لوگ زید الخیل کی سرکردگی میں حاضر ہوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے سامنے اسلام کا کلمہ حق پیش کیا۔ اور الٰہی نظام حیات کی دعوت دی۔ سردار سمیت وفد نے دل و جان سے اسے قبول کیا۔ زید الخیل (جن کا نام حضورؐ نے زید الخیر کر دیا) شاعر و خطیب بھی تھے۔ اور بہادر بھی۔ حضورؐ نے ان کی تعریف میں فرمایا۔ کہ عرب کے جس بھی شخص کی تعریف میرے سامنے کی گئی۔ وہ دیکھنے پر اس سے کم ہی نکلا۔ مگر یہ شخص مستثنیٰ ہے کہ جو کچھ سنا تھا اس سے اسے بڑھ کر پایا۔

عدیؓ بن حاتم بھی اسی قبیلے کے سرداروں میں سے تھے۔ مذہباً عیسائی تھے۔ اور حضورؐ کے خلاف ان کے دل میں ایک طوفان عناد بھرا تھا۔ مقابلہ کی تیاری میں تھے۔ لیکن اچانک اسلامی فوجیں یمن کے علاقے میں جا پہنچیں تو بھاگ کے شام چلے گئے۔ ان کی بہن گرفتار ہو کر مدینہ پہنچیں تو رسول اللہ ﷺ کے حسن سلوک اور مجموعی کردار سے بے حد متاثر ہوئیں۔ انہوں نے عدی کو باصرار مدینہ بھجوایا اور تاکید کی کہ

جلد از جلد رسول اللہ ﷺ سے جاملو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھی وفد طے کے ساتھ ہی مدینہ پہنچے تھے۔ ان کے سامنے اب سوال یہ تھا کہ یہ شخص محض ایک بادشاہ ہے یا نبی؟ پہنچے تو مسجد میں ہی حضورؐ سے ملاقات ہوئی۔ آپؐ اٹھے اور عدی کو اپنے گھر کی طرف لے چلے۔ راستے میں ایک بڑھیا نے رسولؐ خدا سے بات کرنی چاہی۔ تو آپؐ نے کافی وقت اسے دیا۔ اور پوری توجہ صرف کی۔ پھر گھر پہنچے۔ تو خود زمین پر بیٹھے اور عدی کو باصرار گدے پر بٹھایا ان دو باتوں سے عدی کو یقین ہو گیا کہ یہ اللہ کے رسولؐ ہیں اور محض دنیوی بادشاہ نہیں ہیں۔ پھر حضورؐ کی باتوں نے مزید وثوق دلایا۔

دوران گفتگو میں حضورؐ نے بھانپ لیا کہ عدیؓ کے ذہن میں اب کیا الجھنیں باقی ہیں۔ اور پھر ان کو بڑی خوبی سے صاف کیا۔ عدیؓ ان لوگوں میں سے تھے جو حق کو جلد پہچان لینے کے بعد یہ اطمینان بھی چاہتے ہیں کہ اس کی کامیابی کے عملی امکانات کافی حد تک موجود ہیں۔ اور جلد کوئی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ یہ اندازہ کر کے حضورؐ نے فرمایا۔ شاید تمہیں اسلام میں داخل ہونے سے روکنے والی چیز اس کے ماننے والوں کی تنگ حالی ہے! سو خدا کی قسم! عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ ان لوگوں کے اندر دولت کے فوارے چھوٹیں گے۔ یہاں تک کہ اسے لینے والے نہیں ملیں گے۔ اور اگر تم کو یہ چیز اسلام میں آنے سے روکتی ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ اور ان کے مخالفین بہت ہیں" تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ خدا کی قسم! وہ وقت آنے والا ہے کہ تم سن لوگے کہ ایک عورت تنہا اپنے اونٹ پر سوار ہو کر قادسیہ سے اس مسجد کی زیارت کے لیے چلی اور بخیریت پہنچی۔ یا شاید تمہارے لیے یہ خیال مانع ہے کہ سلطنت اور اقتدار دوسروں کے پاس زیادہ ہے۔ سو خدا کی قسم! ایسا عنقریب ہو گا کہ تم خود سن لوگے کہ سرزمین بابل کے قصور ابیض مسلمانوں نے فتح کر لیے۔ اس پہلو سے جب عدیؓ کے شبہات کا ازالہ ہو گیا تو انہوں نے فوراً اپنے آپ کو تحریک اسلامی کے حوالے کر دیا۔ اس گفتگو سے ذیل کے اہم نتائج نکلتے ہیں۔

اسلام صرف اخلاقی اصلاح ہی کی دعوت نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے پروگرام میں معاشی فلاح بھی شامل ہے اور سیاسی انقلاب بھی۔ وہ آخرت کی بھلائی کو دنیوی معاملات کی درستی سے الگ کر کے نہیں لیتا۔

حضورؐ تحریک اسلامی کے بعید ترین مستقبل کا ٹھیک تصور رکھتے تھے اور شروع سے آپؐ کے سامنے یہ بات تھی کہ کن مرحلوں سے ہو کر کدھر کو جانا ہے۔

تحریک اسلامی کی ایک ضرورت یہ ہے کہ وہ لوگوں پر اپنی عملی کامیابی کے امکانات واضح کرے اور ان کو مطمئن کرے کہ پیش نظر انقلاب واقع ہو سکتا ہے ورنہ عوام کا ایک بڑا عنصر اس کی دعوت کی صداقت کو جاننے کے باوجود بھی باہر رکا کھڑا رہے گا۔

اسلامی تحریک اگر تکمیلی مدارج تک پہنچ جائے۔ تو اس سے لازماً یہ نتیجے نکلنے چاہئیں کہ

(۱) معاشی ذرائع و وسائل اتنی ترقی کر جائیں اور ان کو ایسے صحیح عادلانہ طریق سے تقسیم کیا جائے کہ معاشرے میں کوئی محتاج نہ رہے۔

(۲) سیاسی لحاظ سے اتنی مضبوط حکومت پیدا ہو کہ مخالفین اسے تر نوالہ نہ بنا سکیں۔ بلکہ الشاوہ ہر مخالف طاقت کا زور توڑ سکے۔

(۳) داخلی امن کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ اگر ایک عورت بھی ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تنہا سفر کرے اور انسانی آبادیوں اور ویرانوں سے گزرے تو اس کی جان' عزت اور مال کو کسی طرف سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ یہی ایک اسلامی نظام سلطنت کی خوبیاں ہیں۔

۱۱۔ وفد بنی الحرث (یا بنی الحارث) بن کعب:

یہ علاقہ نجران کے لوگ تھے۔ ان اطراف میں حضرت خالد بن ولید نے ۱۰ھ میں بہ طور خاص جا کر اسلام کی دعوت دی تھی۔ انہوں نے ان کے سامنے اعلان کیا کہ اسلام لاؤ تو امن پاؤ گے۔ انہوں نے دعوت قبول کرلی۔ حضرت خالد ان کو معتقدات اور احکام کی تعلیم و تربیت دینے کے لیے کچھ عرصہ ٹھہرے اور حضورؐ کو بذریعہ ❶ خط کامیابی کی اطلاع دی۔ مدینہ سے اس خط کے جواب میں حکم گیا کہ واپس آجاؤ اور قبیلے کے چند سرکردہ افراد کو ساتھ لے آؤ۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔

یہ قبیلہ اپنے دور جاہلیت میں بھی کچھ اچھی اقدار رکھتا تھا۔ چنانچہ وفد آیا تو حضورؐ نے بات چیت کے دوران میں پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ "تم لوگ اپنے دشمنوں کے خلاف میدان جنگ میں ہمیشہ کامیاب ہوتے رہے ہو اور تمہیں کبھی شکست نہیں ہوئی۔" انہوں نے بتایا کہ "ہم لوگ کسی کے خلاف خود جارحانہ اقدام نہیں کرتے۔ لڑنے کے لیے مجتمع ہو جائیں تو پھر تفرقہ میں نہیں پڑتے بلکہ اتحاد رکھتے ہیں اور اپنی طرف سے کبھی کسی ظلم کی ابتداء نہیں کرتے"۔ حضورؐ نے ان کی اس حکمت عملی کی تصدیق کی۔

وفد کے ایک ممتاز فرد قیس بن حصین کو ان لوگوں پر امیر مقرر کیا گیا۔

---

❶ اس خط کا جو متن ابن ہشام نے دیا ہے۔ اس میں حضرت خالدؓ اپنے ٹھہرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے۔ حضورؐ کے فرمان کا حوالہ دیتے ہیں۔ اور اسی ضمن میں یہ فقرہ آتا ہے۔ کہ "میں ان کو اسلام کی باتیں سکھاؤں' اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کی تعلیم دوں ـــــ" اور پھر وہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق میں یہ کام کر رہا ہوں۔ اس طرح دوبارہ لکھا ہے کہ "میں ان کو اسلام کی باتیں سکھا رہا ہوں۔ اور اس کے نبیؐ کی سنت کی تعلیم دے رہا ہوں۔" مطالعہ کرتے ہوئے خیال آیا کہ دور صحابہ کا اس قسم کا جتنا ریکارڈ ملتا ہے وہ سنت رسولؐ کو اسلام کے ایک اساسی ادارے کی حیثیت سے واجب القبول بتاتا ہے۔ بعض دوسرے مقامات پر بھی اس قسم کے اہم حوالے بکثرت بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۲ - وفد نجران:

محسن انسانیت ﷺ نے قلم کو بھی بڑے پیانے پر ذریعہ دعوت بنایا۔ اور خاص خاص لوگوں کو مکاتیب روانہ فرمائے۔ چنانچہ نجران کے عیسائیوں کو بھی خط کے ذریعے کلمہ حق پہنچایا۔ نامہ مبارک میں ایجاز ممتنع سے کام لے کر پہنچانے کی بات حضورؐ نے ان لفظوں میں پہنچائی کہ "ابراہیم' اسحاق اور یعقوب کے الٰہ (معبود) کے نام سے آغاز کرتا ہوں۔ پھر اس کے بعد میں تم کو بندوں کی عبادت سے خدا کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں۔ اور تمہیں بندوں کی آقائی سے خدا کی آقائی کی طرف پکارتا ہوں۔ اگر تم اس سے انکار کرو۔ تو تم پر جزیہ (یعنی سیاسی اطاعت) لازم ہے۔ اور اگر اس سے بھی انکار کرو۔ تو اعلان جنگ ہے"۔ اسقف نے خط پڑھا تو اس کے بدن میں کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اس نے پہلے خاص خاص اکابر کو بلا کر رائے لی۔ پھر پوری وادی کے عوام کا اجتماع طلب کیا۔ وادی میں تہتر بستیاں تھیں اور آبادی اتنی تھی کہ ایک لاکھ سپاہ نکل سکتی تھی۔ بہت بھاری اجتماع منعقد ہوا۔ یہ امکان اکابر کے پیش نظر تھا کہ شاید یہ وہی آخری نبی موعود ہیں جو بنو اسمٰعیل میں سے اٹھنے والے ہیں۔ مشورہ عام کے بعد قرار داد یہ ہوئی کہ اکابر کا ایک وفد مدینہ جائے اور صاحب مکتوب سے بات چیت کرے اور جائزہ لے۔ چنانچہ شرجیل' عبداللہ اور جبار کو خصوصیت سے نامزد کیا گیا۔ یہ پہلا وفد تھا جو سیاسی اطاعت اور ٹیکس ادا کرنے کے وعدے پر ایک فرمان امن و حقوق حاصل کر کے واپس ہوا۔

وفد فرمان حاصل کر کے واپس ہوا تو اسقف اور اعلیٰ سردار اس کے استقبال کے لیے بہت دور تک آئے۔ فرمان راستے ہی میں اسقف کو پیش کر دیا اور وہ اسے چلتے چلتے پڑھنے لگا۔ اس کا چچیرا بھائی بشر بن معاویہ بھی فرمان کی طرف اس درجہ متوجہ ہوا کہ اونٹنی سے گر پڑا۔ اس کی زبان سے نکلا۔ "برا ہو اس شخص کا جس کی وجہ سے ہم مصیبت میں پڑ گئے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ اس کا اشارہ کدھر تھا۔ اسقف نے سختی سے کہا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو۔ خدا کی قسم! وہ تو نبی مرسل ہے"۔ اب بشر کے دل میں انقلاب آگیا۔ اور اس نے یہ عزم ظاہر کیا کہ "اچھا تو اب خدا کی قسم میں ناقہ کا پالان اس کی بارگاہ میں جا کر ہی اتاروں گا"۔ اسقف اس کے پیچھے پیچھے اونٹنی دوڑاتا ہوا پکارتا رہا۔ کہ میری بات تو سنو۔ میرا مدعا تو سمجھو' میں نے کسی مصلحت سے وہ فقرہ کہہ دیا تھا۔ بشر نے ایک نہ سنی اور کہا تو یہ کہا کہ "تمہارے ذہن سے اتنی بڑی غلط بات نکل ہی نہیں سکتی"۔ اپنی دھن کا پکا بشر محسنؐ انسانیت کی خدمت میں جا کر اسلام لایا۔ وہیں مقیم ہو گیا۔ اور خدا تعالیٰ نے اس کو مرتبہ شہادت نصیب کیا۔ اس سے ملتا جلتا واقعہ کرزؓ بن علقمہ کے نام سے بھی مذکور ہے۔

وفد مقامی سرداروں سمیت واپس پہنچا تو وہاں کے ایک اور تارک الدنیا راہب کے کانوں میں سارے حالات و واقعات کی بھنک پڑی۔ اور اسے معلوم ہوا کہ ایک نبی ایسا اٹھا ہے۔ یہ بھی والہانہ جذبے سے

سرشار ہو کر مدینہ کو روانہ ہو گیا۔ ایک پیالہ' ایک عصا' ایک چادر حضورؐ کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کر کے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا۔ پھر مدینہ میں کچھ عرصہ ٹھہر کر اسلام کے نظام فکر و عمل کی تعلیم حاصل کی۔ اور حضورؐ سے اجازت لے کر واپسی کا وعدہ کر کے نجران گیا۔ لیکن حضورؐ کی زندگی میں واپس پہنچ نہ سکا۔

کچھ مدت بعد نجران کا اسقف ابوالحارث جو شاہ قسطنطنیہ کی نگاہ میں بہت محترم تھا۔ اور عیسائیوں میں اس کی کرامات کے چرچے رہتے تھے' پھر ایک وفد لے کر مدینہ پہنچا جس میں علاقہ کا عیسائی مفتی و جج ایہم نیز عبدالمسیح عاقب اور ۲۴ دوسرے اکابر شامل تھے۔ واضح رہے کہ یہ اسقف در حقیقت ہو بکر بن وائل کا ایک عربی فرد تھا۔ مگر نصرانیت میں داخل ہو کر اس نے علم اور عبادت کے لحاظ سے اتنی ترقی کی کہ یہ خود عیسائیوں کا معتمد ترین پیشوا بن گیا۔

یہ لوگ چند روز مدینہ میں مقیم رہے۔ ان کو مسجد نبوی میں اپنے مذہب کے مطابق ادائے نماز سے بعض صحابہ نے روکا لیکن حضورؐ نے اجازت دی۔

ان کی آمد پر مقامی یہودیوں نے بھی بڑی سرگرمی دکھائی اور بیچ میں دخل انداز ہو ہو کر مختلف بحثیں اٹھائیں۔ عقیدہ تثلیث اور مسیح علیہ السلام کی حیثیت تو زیر بحث آئی ہی تھی اور قرآن نے ان مسائل میں وفد کو روشنی بہم پہنچائی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہود نے یہ شوشہ اٹھالیا کہ حضورؐ خود عیسیٰ علیہ السلام کی جگہ لے کر اپنی پرستش کرانا چاہتے ہیں۔ اس کا جواب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ نے دیا کہ کوئی شخص جسے اللہ نے کتاب' حکم اور نبوت سے سرفراز کیا ہو' لوگوں سے یہ کہنے کا مجاز نہیں ہے کہ میرے بندے بن جاؤ- پھر یہود اور اہل وفد کے درمیان یہ بحث بھی چلی کہ ابراہیم علیہ السلام کس مذہب پر تھے۔ ایک فریق کہتا عیسائی تھے۔ دوسرے فریق کا دعویٰ تھا' یہودی تھے (نعوذ باللہ) کلام الٰہی نے اس کی تردید بڑے سادہ اور غیر مناظرانہ طریق سے کر دی کہ "ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ناحق کیوں الجھتے ہو تورات اور انجیل دونوں ہی ان کے بعد نازل ہوئیں (جن سے یہودیت اور نصرانیت کا سلسلہ تھا) وہ تو نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ پورے خلوص کے ساتھ مسلم تھے۔ اور وہ مشرکوں میں کبھی شامل نہ تھے...... ابراہیم کے طریقہ پر صحیح معنوں میں کاربند ہیں تو نبی اور ان پر ایمان لانے والے لوگ ہیں"۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقام کو واضح کیا کہ "عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم علیہ السلام کی طرح ہے"۔

عیسائیوں میں خود بھی کسی قدر اپنے تصورات کے لیے تعصب موجود ہو گا۔ اور بسا اوقات بڑی نیک نیتی سے بھی پرانے غلط نظریات سے دل چمٹتا ہے۔ لیکن یہود کی شرانگیزیوں نے اس کیفیت کو بڑھا دیا ہو گا۔ فضول بحثیں اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی ہٹ دھرمی قبول حق میں آڑے آ رہی ہو گی۔ اسی لیے قرآن نے ایک انتہائی فیصلہ کن صورت ان کے سامنے مباہلہ کی رکھی۔ حضورؐ کو حکم ہوا کہ ان لوگوں سے یہ کہہ دو۔ کہ "آؤ ہم اپنی اولادوں اور اپنی مستورات کو بلالیں اور خود بھی میدان میں آجائیں پھر خدا سے

اپنے بارے میں فیصلہ چاہیں اور جھوٹے کے خلاف خدا کی لعنت کی دعا کریں" (آل عمران۔ ۶۱)۔ جب کبھی کسی پیکر راستی پر جھوٹ کا الزام چپکایا جائے تو اس کے لیے اس سے بڑھ کر اذیت ناک صورت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہی وہ لمحہ تھا۔ جب کہ حق تعالیٰ نے یہ صورت فیصلہ تجویز کی کہ فریقین علیٰ رؤس الاشہاد خدا کا فیصلہ طلب کریں۔ اگلی صبح کو حضورؐ اپنی پیاری بچی فاطمہ اور معصوم نواسوں اور حضرت علیؓ کو ساتھ لے کے نکلے۔ مدینہ کے لیے یہ کتنا بڑا واقعہ ہو گا کہ ایک داعی حق اپنی کل کائنات مباہلہ کی بساط پر لے آیا۔ کتنے بڑے یقین کا مظاہرہ تھا۔ عیسائی ارکان وفد بھانپ گئے کہ اگر واقعی یہ خدا کے نبی ہوئے تو ہمارا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ انہوں نے سیاسی طاعت کی پیش کش کی اور حضورؐ کے اختیار پر چھوڑا کہ ٹیکس (جزیہ) کی جو مقدار آپؐ مناسب سمجھیں راست راست میں تجویز فرما دیں۔ انہوں نے حضورؐ کی شان حلیمی پر پورا بھروسہ کیا۔ اگلے روز فرمان لکھ دیا گیا۔ جس میں ان کو پوری فراخ دلی سے مذہبی آزادی اور سماجی خود مختاری دی گئی کہ ان کے افراد اور املاک جن حالات پر ہیں اسی پر قائم رہیں گے۔ ان کے موجودہ حقوق میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے گی۔ ان کے مذہبی پیشواؤں (اسقف اور راہب) میں سے کسی کو نہ بدلا جائے گا۔ اور نہ ان کے قبضے سے مذہبی اموال و اوقاف کو نکالا جائے گا۔ جاہلیت کے گزشتہ دور کے جرائم پر کوئی گرفت نہ ہو گی۔ فوج ان کی زمین میں داخل نہ ہو گی۔ دنیوی بادشاہتوں کے طریق پر ان سے کوئی بیگار نہیں لی جائے گی۔ ظالم و مظلوم کے درمیان انصاف ہو گا۔ کوئی شخص سود کمائے تو اس فعل کی ذمہ داری نہیں لی جا سکتی۔ کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم میں ماخوذ نہ ہو گا۔ اتنی بڑی آبادی سے صرف دو ہزار اوقیہ مالیت کے حلے (لباس) بطور سالانہ ٹیکس مقرر کیے گئے۔

ان دونوں وفود کے حالات کچھ گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ بظاہر زیادہ گرماگرمی دوسرے ہی وفد کی آمد پر ہوئی ہو گی۔ لیکن مذکور بالا فرمان غالباً پہلے وفد نے ہی حاصل کیا ہو گا۔ کیونکہ دوسرا فرمان سیاسی سے زیادہ مذہبی حقوق سے متعلق ہے اور اس میں خطاب اسقف اور کاہنوں اور راہبوں سے ہے۔ اس فرمان میں اہل نجران کو زیادہ سے زیادہ حد تک مذہبی آزادی دی گئی اور ان کے کلیسائی نظام میں عدم مداخلت کی ضمانت دی گئی۔ یہ فرمان بھی منجملہ ان شہادتوں کے ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ سیاسی دائرے میں صرف نظام حکومت کی اطاعت کا تقاضا رکھتے تھے اور نہ کسی گروہ کو اس کے مذہب سے باز رکھتے تھے۔ اور نہ اسلامی عقائد جبراً منواتے تھے۔ بلکہ اقلیتوں کو زیادہ سے زیادہ حد تک مذہبی آزادی عطا فرماتے تھے۔ تحریک اسلامی افراد میں ایمان و نظریات کی تبدیلی تو صرف دلیل کے زور سے چاہتی تھی' البتہ اپنا نظام اجتماعی وہ سیاسی قوت سے نافذ کرتی تھی۔ چنانچہ دیکھیے کہ فرمان اول میں سود خواری کو ذمہ سے باہر رکھا گیا۔ اور اس کی حیثیت قانون ملکی کے خلاف جرم کی رہی۔ مذہب اس کا اصل موضوع بحث ہی نہ تھا۔ کیونکہ وہ مذہب سے بہت زیادہ بڑی چیز تھی۔ اس فرمان سے جو خود حضورؐ نے صادر کیا اور جس کی حیثیت آئندہ کے لیے رسولؐ خدا کی قائم کردہ ایسی نظیر کی ہے جو امت کے لیے واجب الاتباع قانون کا مقام رکھتی ہے۔ یہ بات

بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب پر چلنے والی اقلیتوں کے لیے کتنا زیادہ فیاض ہے۔ مشکل ہی سے کوئی دوسرا نظامِ تمدن اقلیتوں کے لیے اتنی فیاضی کی مثال پیش کر سکے گا۔

دوسرے وفد نے روانگی کے وقت حضورؐ سے درخواست کی کہ اپنا کوئی قابل اعتماد افسر جزیہ کی وصولی کے لیے ہمارے ساتھ روانہ فرمایئے۔ حضورؐ نے ابوعبیدہؓ بن جراح کو بھیجا اور فرمایا کہ یہ شخص امین امت ہے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے جزیہ کی فراہمی کے ساتھ ساتھ علاقہ میں دعوت حق کو پھیلانے کا کام بھی سرگرمی سے کیا اور لوگ بکثرت اسلامی حلقہ میں شریک ہو گئے۔

واضح رہے کہ نجران کی آبادی کے دو بڑے گروہ تھے۔ ایک نصاریٰ، دوسرا امیین۔ نصاریٰ نے سیاسی اطاعت پر معاملہ کر لیا۔ لیکن امی لوگ اسلام کے سایہ رحمت میں آ گئے۔

قیاس یہ ہے کہ پہلا وفد ۹ ھ کے اواخر میں اور دوسرا ۱۰ ھ کے اوائل میں آیا ہو گا۔ کیونکہ تاریخی ماخذ میں دونوں ہی سال مذکور ہیں۔

۱۳ ۔ وفد بنو اسد:

بنو اسد نامی قبیلہ جنگی مہمات میں قریش کا بڑا اہم دست و بازو تھا۔ ۹ ھ میں اس قبیلہ کی سفارت مدینہ پہنچی اور انہوں نے اپنا اسلام پیش کیا۔ عربوں کے انداز غرور کی بو اس میں موجود تھی۔ اس لیے احسان دھرنے کے انداز میں ارکان وفد نے حضورؐ سے کہا کہ آپؐ نے کوئی مہم تو ہماری طرف بھیجی نہ تھی۔ ہم تو از خود اسلام لائے ہیں۔ اس ذہنیت کو توڑنے کے لیے وحی الٰہی نے حضورؐ سے کہلوایا کہ لا تمنوا علی اسلامکم یعنی اپنے اسلام لانے کا احسان میری ذات پر نہ دھرو۔ یہ تو اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان نصیب کیا۔ پھر اس وفد نے پرندوں سے فال لینے، کہانت (امورِ آئندہ کی پیشگوئیاں کرنا) اور ضرب الحصی (یعنی قیمت یا نرخ مقرر کرنے کے بعد گاہک جنس یا زمین کو دور سے کنکری مارتا اور جس مال کو کنکری لگ جاتی وہ اس کا ہو جاتا) کے بارے میں حکم دریافت کیا۔ حضورؐ نے تینوں امور کی مخالفت فرمائی۔ آخر میں انہوں نے خط یا تحریر کے بارے میں سوال کیا کہ یہ جائز ہے یا ناجائز۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ تو کسی نہ کسی نبی ہی کا آغاز کردہ فن ہے اور اس سے اچھا علم اور کیا ہو گا۔

اس قبیلہ سے بھی نبوت کا ایک مدعی کاذب طلیحہ بن خویلد خلافت صدیقیؓ کے دور میں اٹھا تھا۔

۱۴ ۔ وفد بنو فزارہ:

یہ ایک مضبوط اور سرکش قبیلہ تھا۔ عیینہ بن حصن اسی کے ایک فرد تھے۔ ۹ ھ میں حضورؐ جب تبوک سے واپس آ رہے تھے تو ان کے وفد نے آ کر اسلام کی بیعت کی۔ رسولِ خدا نے ان لوگوں سے علاقہ کے عام حالات پوچھے تو انہوں نے قحط سالی کا رونا رویا۔ اور درد بھرے انداز میں کہا کہ "یا رسولؐ اللہ ہماری بستیاں تباہ ہو گئیں، مویشی ہلاک ہو گئے۔ باغ اجڑ گئے۔ بال بچے سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ خدا سے آپؐ ہمارے لیے

سفارش کیجیے۔ اور خدا آپؐ سے ہماری سفارش کرے"۔

حضورؐ نے ٹوکا کہ خدا کے پاس تو میں سفارش کرتا ہوں۔ مگر وہ کون ہو سکتا ہے کہ جس کے آگے خدائے ذوالجلال سفارش کرے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کی عظمت جلال سارے آسمان و زمین کو احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔ پھر آپؐ نے ان کے لیے باران رحمت کی دعا کی۔ جو قبول ہوئی۔

۱۵ ۔ وفد بنو عامر:

یہ خاندان عرب کے مشہور قبیلہ قیس عیلان کی شاخ تھا۔ اس میں تین بڑے سردار تھے۔ عامر بن طفیل' اربد بن قیس اور جبار بن سلمٰی۔ اچھا خاصا بڑا وفد ان سرداروں کی معیت میں آیا۔ اول الذکر دونوں سردار جاہ طلب تھے۔ خصوصاً عامر پہلے ہی شرپسندی دکھا چکا تھا۔ اس وقت بھی یہ دونوں باہم ایک خوف ناک سازشِ قتل بنا کے آئے تھے۔ وفد حضورؐ کی خدمت میں پہنچا۔ تو حضورؐ کو "سیدنا" کہہ کر مخاطب کیا۔ حضورؐ نے اس انداز تکلم کی تردید کرتے ہوئے فرمایا۔ "السید اللہ" (آقا تو خدا ہی ہے)۔ انہوں نے پھر کچھ تعریفی کلمات کہے۔ حضورؐ نے پھر متنبہ کیا کہ دیکھو بات کرتے ہوئے خیال رکھنا چاہیے کہ شیطان کہیں بہکا نہ لے جائے۔ کتنا اہتمام تھا وہاں کہ تملق و ستائش کے دروازے نہ کھلنے پائیں۔ عامر بن طفیل نے حضورؐ کے کام کو مجرد ایک سیاسی ملک گیری اور سلطنت سازی کا کام سمجھتے ہوئے باقاعدہ سودا کرنے کے لیے شرائط رکھیں کہ:

(۱) اہل بادیہ پر آپؐ حکومت کریں اور شہر میرے زیر اقتدار ہوں۔

(۲) یا اپنے بعد مجھے جانشین نامزد کیجیے۔

(۳) ورنہ میں غطفان کو لے کر چڑھائی کروں گا۔ عامر نے اربد کو اس پر تیار کر رکھا تھا کہ میں تو محمد (ﷺ) کو باتوں میں لگا رکھوں گا۔ اور تم موقع پا کر کام تمام کر دینا۔ مگر رعب نبوت کے سبب سے اربد بالکل ساکت و صامت رہا۔ دونوں ناکام واپس ہوئے۔ حضورؐ کی نگاہ نے ان دونوں کے دلوں کو پڑھ لیا تھا۔ سو آپؐ نے دعا کی کہ اے خدا! ان کے شر سے بچائیو۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ عامر طاعون کے حملہ کا شکار ہو گیا۔ اور اربد بن قیس پر بجلی گری اور اسے خاکستر کر گئی۔

۱۶ ۔ وفد عذرہ:

صفر ۹ھ میں اس قبیلہ کے بارہ افراد حاضر ہوئے۔ حمزہؓ بن نعمان بھی ان میں شامل تھے انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ کہ ہم لوگ عذرہ کی اولاد میں سے ہیں۔ جو ماں کے واسطے سے قصی کے بھائی تھے۔ رسول خدا ﷺ نے بڑی مسرت سے اھلاً و سھلاً کہہ کر خیر مقدم کیا۔ ان سب نے اپنے سینے اسلام کے لیے کھول دیے۔ ان کو حضورؐ نے مژدہ سنایا کہ شام ختم ہو جائے گا۔ اور ہرقل ملک کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ان لوگوں کو حضورؐ نے کاہنوں سے اخبار غیب دریافت کرنے سے منع کیا۔ اور بجز ابراہیمی قربانی کے دوسری تمام رسمی

اور اونچی قربانیوں سے روک دیا۔ روانگی کے وقت وفد کو معمول کے مطابق زاد راہ دیا گیا۔

۱۷ - وفد بلی:

اس قبیلے کا علاقہ بڑی سیاسی اہمیت رکھتا تھا۔ یہ لوگ ۹ ھ (ربیع الاول) میں مدینہ حاضر ہوئے۔ یہ اپنے فرد قبیلہ رویفع بن ثابت بلوی کے ہاں ٹھہرے اور انہی نے حضورؐ کے سامنے تعارف کرایا۔ محسن انسانیتؐ نے ان کو مرحبا کہا۔ اور یہ سب داخل اسلام ہوئے۔ تین دن تک یہ وفد مقیم رہا۔ پھر روانگی کے وقت حضورؐ نے ان کو زاد راہ اور کھجوریں عنایت فرمائیں۔

۱۸ - وفد کندہ:

علاقہ یمن کا ایک ممتاز قبیلہ تھا۔ حضرت اشعث ابن قیس اسی (یا ساٹھ) سواروں کا وفد لے کے حاضر ہوئے۔ یہ ایک اعلیٰ درجہ کے ریشمی جبے پہن کر بزم نبوت میں پہنچے۔ باتیں ہو گئیں۔ حضورؐ نے دریافت کیا۔ کیا تم لوگ مسلمان ہو چکے ہو؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ حضورؐ نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ پھر یہ ریشم کیوں؟ سچے ایمان کی یہ درخشاں مثال دیکھیے کہ ان لوگوں نے فوراً ریشم کو پارہ پارہ کر کے اپنے لباسوں سے الگ کر دیا۔

۱۹ - وفد ازد:

بنی ازد بھی علاقہ یمن میں رہتے تھے۔ ان کا وفد صرد بن عبداللہ ازدی کی قیادت میں آیا۔ ان لوگوں نے دعوت اسلام پر لبیک کہی۔ حضرت صرد قبیلہ کے امیر مقرر ہوئے۔

۲۰ - وفد جرش:

یمن کے اکثر علاقے اور اضلاع اسلامی سلطنت کا حصہ بن چکے تھے۔ لیکن بیچ بیچ میں سرکش عناصر بھی تھے۔ شہر جرش ایسے ہی قبائل کے قبضے میں تھا۔ اور یہاں مضبوط حفاظتی قلعہ موجود تھا۔ سرکش طاقتوں کو ہموار کرنے کے لیے حضرت صرد ازدی کو جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے' قبیلہ کی فوجی قیادت بھی سونپی اور ملحقہ علاقہ کے قبیلوں کو نظام اسلامی کا مطیع بنانے کے لیے فوجی کارروائی کی اجازت بھی دی۔ انہوں نے جرش والوں کو لمبے محاصرے کے بعد شکست دی۔ اس کارروائی کے بعد جرش والوں کا وفد مدینہ آیا۔

۲۱ - وفد ہمدان:

یہ وفد ایک سو بیس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اور اس میں مالک بن نمط' ابو ثور' مالک بن ایفع سلمانی' عمیر بن مالک خارفی (یا عمرو بن مالک) اور ضمام بن مالک جیسے نمایاں افراد شامل تھے۔ مالک بن نمط نے بارگاہ نبوت میں رجزیہ اشعار پڑھ کر وفد کی طرف سے خراج عقیدت پیش کیا۔ حضورؐ نے انہی کو قبیلہ کی مسلم جماعت کا امیر مقرر کیا۔ ہمدان کے علاقہ میں پہلے حضرت خالدؓ کو دعوتی اور تعلیمی مشن پر مقرر کیا گیا مگر چھ ماہ تک

کامیابی نہ ہوئی۔ پھر حضرت علیؓ کو حضورؐ نے اپنا خصوصی خط دے کر بھیجا۔ جاتے ہی حضرت علیؓ نے نماز کے بعد خط مجمع عام میں سنایا۔ اور اسے سنتے ہی کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ حضرت علیؓ نے بذریعہ خط حضورؐ کو روداد لکھ بھیجی۔ اسے پڑھ کر حضورؐ سجدے میں گر گئے۔ سر اٹھایا۔ تو فرمایا۔ "السلام علی ھمدان"

۲۲۔ قاصد فروۃ الجذامی:

فروۃ معان کے مقام پر سلطنت روم کی طرف سے علاقے کے گورنر تھے اور اس علاقہ میں شام اور عرب دونوں طرف کے حصے شامل تھے۔ ان تک دعوت پہنچی تو اپنے عہدہ و جاہ کو خطرے میں ڈال کر داخل اسلام ہوئے۔ قاصد کے ذریعے اپنے اسلام کی اطلاع بھی حضورؐ کو دی۔ اور ایک سفید خچر بطور ہدیہ روانہ فرمایا۔ جب رومی حکومت کو اطلاع ہوئی تو ان کو گرفتار کر کے مقام عفرا میں صلیب پر لٹکا دیا گیا۔ مگر اتنا مضبوط ایمان خدا نے اپنے اس بندے کو عنایت کیا کہ ظالمانہ تخت حکومت سے اٹھ کر تختہ دار پر جا کھڑا ہوا۔

۲۳۔ وفد تجیب: ●

یہ یمن کے خاندان کندہ کا ایک ذیلی وفد تھا۔ یہ پہلے سے اسلام لا چکے تھے۔ اور اپنے آپ کو اس کے تقاضوں کے سانچے میں عملاً ڈھال رہے تھے۔ تیرہ افراد شریک وفد ہو کر آئے اور اپنے ساتھ زکوۃ کے اموال اور مویشی بھی از خود لائے۔ عرض کی کہ اللہ کا حق حاضر ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اموال واپس لے جاؤ۔ اور مقامی مستحقین پر صرف کرو۔ انہوں نے بیان کیا کہ مقامی مستحقین کو دے دلا کر یہ اموال بچ رہے ہیں۔ اس موقع پر حضرت صدیق اکبرؓ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "یا رسولؐ اللہ! عرب کا کوئی وفد وفد تجیب کی شان کا نہیں آیا۔" حضورؐ نے فرمایا۔ "ہدایت خدا کے اختیار میں ہے وہ جس کے لیے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے۔ اس کا دل ایمان کے لیے کھول دیتا ہے"۔

ان لوگوں نے کچھ سوال کیے۔ اور ان کے جواب بارگاہ رسالت سے لکھوا لیے۔ پھر یہ اس شوق میں جلد جلد واپس ہو گئے کہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو یہاں کی معلومات اور اخبار و احوال جا کر بتائیں۔

ان کے ساتھ بنی ابدی کا ایک نوجوان بھی تھا۔ جسے وفد نے اپنے اسباب اور سواریوں پر نگران بنا کے چھوڑا تھا۔ اسے حضورؐ نے بطور خاص بلایا۔ اس نے عرض کی کہ میری صرف ایک تمنا ہے کہ آپؐ میرے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں۔ حضورؐ نے بطور خاص دعا فرمائی۔ یمن میں جب آگے چل کر ارتداد پھیلا۔ تو اس

● اس قبیلہ کا ایک بدبخت فرزند کنانہ بن بشر حضرت عثمانؓ کا قاتل ہوا۔ ملتے جلتے نام کا دوسرا قبیلہ تجوب ہے جس کا تعلق حمیر کے خاندان سے ہے اور حضرت علیؓ کا قاتل ابن ملجم اس دوسرے قبیلہ سے تھا۔ کتابوں میں ان ناموں کا التباس پایا جاتا ہے۔

نوجوان نے پورے قبیلے کو سنبھالے رکھا۔

اس وفد کو بھی زاد راہ بطور ہدیہ عطا ہوا۔

۲۴ ۔ وفد بنی سعد ہذیم (قضاعہ):

اس قبیلہ کے چند آدمی وفد کی صورت میں مدینہ پہنچے۔ ان میں بعض افراد اخلاص اور شعور سے مسلمان ہوئے تھے۔ اور بعض سیاسی حالات کی وجہ سے تابع ہوئے تھے۔ بہرحال انہوں نے دست نبوت پر بیعت کی۔ حضورؐ کے حکم سے حضرت بلالؓ نے چاندی کی صورت میں زاد راہ دیا۔ ان کی واپسی پر سارے قبیلہ نے دعوت اسلام قبول کی۔

۲۵ ۔ وفد بہراء:

یہ بھی علاقہ یمن کا ایک قبیلہ تھا۔ تیرہ آدمیوں کا وفد مرکز اسلام میں بھیجا۔ یہ لوگ پہلے سے متاثر تھے۔ وہاں نبوت کے انوار دیکھ دیکھ کر یقین سے مالا مال ہوئے اسلام قبول کیا اور کچھ دن قیام کر کے فرائض و احکام سیکھے اور پھر واپس چلے گئے۔ ان کو بھی معمول کے مطابق زاد راہ عنایت ہوا۔

۲۶ ۔ وفد ذی مرہ:

اس قبیلہ سے بھی تیرہ افراد کا وفد اسلامی دارالحکومت میں پہنچا جس کے سردار حارث بن عوف تھے۔ انہوں نے حضورؐ سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بیان کیا کہ ہم لوی بن غالب کی اولاد ہیں۔ اور آپؐ سے نسبی تعلق رکھتے ہیں۔ حضورؐ نے ان کے علاقے کا حال پوچھا تو انہوں نے قحط سالی کا خوف ناک نقشہ کھینچ کر دعا کی درخواست کی۔ واپس پہنچنے پر معلوم ہوا کہ عین دعائے رسولؐ ہی کے دن بارش ہوئی۔ اور زمین سرسبز و شاداب ہو گئی۔ نظام اسلامی کا علم حاصل کرنے کے لیے یہ وفد بھی چند روز مقیم رہ کر رخصت ہوا۔ اور زاد راہ سے نوازا گیا۔

۲۷ ۔ وفد خولان:

دس آدمیوں کا یہ وفد ایمان سے مالا مال ہو کر بڑے مخلصانہ جذبات کے ساتھ بارگاہ نبوت میں پہنچا۔ یہ لوگ جاہلیت میں "عم انس" نامی بت کی پوجا کرتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اب صرف معمر نسل کے کچھ لوگ عم انس سے عقیدت رکھتے ہیں لیکن ہم واپس جا کر اس بت کا خاتمہ کر دیں گے۔ پھر انہوں نے پرانے قصے بیان کیے کہ عم انس کے نام پر کتنی کتنی بڑی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ اور کیا کیا رسوم ادا ہوتی تھیں۔ دوران قیام میں انہوں نے نئی اسلامی زندگی کے بارے میں ضروری علم حاصل کیا اور جاتے ہوئے ان کو بھی زاد راہ عطا ہوا۔

۲۸ ۔ وفد محارب:

یہ لوگ اسلام سے قبل نہایت تند خو اور بداخلاق تھے۔ ابتدائی دورِ دعوت میں جب حضورؐ نے قبائل میں جا جا کر پیغام حق دیا تھا۔ تو ان کے ہاں بھی پہنچے اور انہوں نے ناشائستہ رویہ اختیار کیا تھا۔ دس افراد کا وفد تائب ہو کر حاضر ہوا۔ ایک مجلس میں حضورؐ نے بغور ایک شخص کو دیکھ کر پہچانا تو اسے "تنبّہ ہوا" وہ خود ہی بولا کہ حضورؐ شاید میرے بارے میں کچھ خیال فرما رہے ہیں۔ آپؐ مجھ سے ایک بار عکاظ میں ملے تھے اور میں نے آپؐ سے بڑی گھٹیا گفتگو کی تھی۔ اور آپؐ کا پیغام بھونڈے طریقے سے رد کر دیا تھا۔ یا رسولؐ اللہ! ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی ہم سے زیادہ آپ کا اور اسلام کا دشمن نہ تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایمان و اطاعت کی توفیق دی۔ پھر اس نے اپنی سابق غلطی کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ کہ اسلام دورِ کفر کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

۲۹ ۔ وفد غسان:

غسان اگرچہ نسلاً عربوں کا قبیلہ تھا۔ مگر مذہب نصرانیت اختیار کر کے قیصر کی طرف سے عربی علاقہ پر حکمران تھا۔ ۱۰ ھ میں اس قبیلہ کے تین افراد مدینہ آ کر حضورؐ کے دست مبارک پر اسلام لائے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے خاندان کے لوگ تو موجودہ جاہ و حشم کو چھوڑ کر مشکل ہی سے قبول حق کریں گے۔ حضورؐ نے انہیں زادِ راہ دے کر رخصت کیا۔ انہوں نے جا کر دعوت دی۔ مگر بے نتیجہ رہی۔ تینوں نے حالات سے مجبور ہو کر اپنا اسلام پوشیدہ رکھا۔ ان میں سے ایک صاحب جنگ یرموک کے موقع پر حضرت ابوعبیدہؓ سے ملے اور اپنے اسلام پر قائم ہونے کی خبر دی۔ بقیہ دونوں کا پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا۔

۳۰ ۔ وفد سلامان:

سات آدمیوں کا وفد مدینہ آیا جس میں حبیبؓ ابن عمر بھی شامل تھے۔ ان کے دریافت کرنے پر حضورؐ نے بتایا کہ نماز کو ٹھیک وقت پر ادا کرنا سب سے بہتر عمل ہے۔ انہوں نے بھی قحط سالی کا حال بیان کر کے دعا کی درخواست کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور بعد میں تصدیق ہوئی کہ اسی روز بارانِ رحمت کا نزول ہوا۔

۳۱ ۔ وفد بنی عبس:[1]

یہ بھی علاقہ یمن کا قبیلہ تھا۔ ان کا وفد بھی ۱۰ ھ میں آیا۔ ان لوگوں نے دریافت کیا کہ ہم نے معلمین اسلام سے سنا ہے کہ جو ہجرت نہ کرے اس کا اسلام قبول نہیں ہوتا۔ ہم لوگوں کا حال یہ ہے کہ مال مویشی

---

[1] زاد المعاد' حصہ ۳ (ذکر وفود) کے مطابق تعداد سات ہے۔ یہی تعداد المواہب اللدنیہ میں ہے۔ رحمۃ للعالمین میں تعداد ۱۷ ہے۔

ہی ہمارا ذریعہ معیشت ہیں۔ اب اگر ہجرت کرنا ضروری ہو تو ہم ان کو بیچ کر آجائیں۔ جذبہ ایمان دیکھئے کہ ایک اشارے پر اپنے اموال اور اپنا علاقہ چھوڑنے پر تیار ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جہاں رہو خدا سے ڈرتے رہو۔ درحقیقت صورت معاملہ یوں تھی کہ ابتدائی دور میں جب مرکز اسلام کو مضبوط کرنے کے لیے قوت کو یکجا کرنا اور ملک بھر میں کام کرنے کے لیے افراد کا تیار کرنا مطلوب تھا۔ تو ہجرت کر کے مرکز میں آنا فرض کیا گیا۔ یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ اور بعد میں قوت کا ملک بھر میں پھیلے رہنا اور اپنے اپنے علاقہ میں دعوت کو پھیلانا ضروری ٹھہرا تو ہجرت کی فرضیت ساقط ہو گئی۔ "لا ھجرۃ بعد الفتح" کا حکم اسی دوسرے دور سے متعلق ہے۔

۳۲ ۔ وفد غامد:

۱۰ھ میں غامد کا وفد آیا جو دس افراد پر مشتمل تھا۔ یہ سب کے سب اسلام میں داخل ہوئے۔ حضرت ابیؓ ابن کعب کو حضورؐ نے مامور فرمایا کہ ان کو قرآن کی تعلیم دیں۔ پھر ان کو زاد راہ دے کر رخصت فرمایا۔

۳۳ ۔ وفد بنی المنتفق:

اس قبیلہ میں سے نہیک بن عاصم اور لقیط بن عامر بصورت وفد مرکز اسلام میں پہنچے۔ مسجد میں پہنچے تو حضورؐ خطبہ دے رہے تھے۔ خطبہ کے ختم ہونے پر لقیط نے کھڑے ہو کر قیامت اور جنت و دوزخ کے متعلق کچھ سوالات کیے اور حضورؐ نے تفصیل سے جواب دیئے۔ پھر انہوں نے انبیاء اور اسلاف کے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں۔ ایک سوال براہ راست حضورؐ سے یہ کیا کہ آیا آپ کو علم غیب حاصل ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا کہ مفاتح غیب خدا تعالیٰ ہی کے قبضے میں ہیں۔

۳۴ ۔ وفد عبدالقیس نمبر۲:

پہلے وفد عبدالقیس کا ذکر ہو چکا ہے جو ۵ھ میں آیا تھا۔ ان کا دوسرا وفد جو چالیس افراد پر مشتمل تھا ۱۰ھ میں مدینہ حاضر ہوا۔

۳۵ ۔ طارق بن عبداللہ اور اس کے ساتھی:

یہ طارق بن عبداللہ وہ شخص ہیں جنہوں نے سوق المجاز میں وہ منظر بھی دیکھا تھا کہ حضورؐ قبائل میں دعوت دیتے پھر رہے ہیں اور آپؐ ہی کا سگا چچا پیچھے پیچھے کنکریاں پھینکتا ہوا کہتا جاتا ہے کہ 'لوگو! اس پر ایمان نہ لانا۔ یہ (نعوذ باللہ) جھوٹا ہے۔ پھر یہی طارق بن عبداللہ ربذہ سے ایک گروہ کے ساتھ کھجوروں کی خریداری کے لیے مدینہ آئے۔ ان کی اقامت گاہ پر حضورؐ کا گزر ہوا۔ آپؐ نے ان کا اتا پتا پوچھا اور مدعائے سفر معلوم کیا' پھر ایک اونٹ کا سودا کیا۔ اور قیمت بھجوا دینے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔ بعد میں طارق اور اس کے ساتھیوں کو کھٹکا ہوا کہ بغیر جان پہچان کے ہم نے اونٹ دے دیا۔ نہ جانے کیا صورت ہو۔ اس قافلے کی ایک معزز خاتون نے کہا کہ اس شخص کا چہرہ روشن میں نے دیکھا تھا۔ وہ کبھی دھوکا کرنے والا نہیں

ہو سکتا۔ اگر وہ قیمت ادا نہ کرے تو میں ضامن ہوں۔ تھوڑی دیر میں آدمی آیا اور اونٹ کی قیمت کی کھجوریں الگ ادا کیں اور ہدیہ کی الگ دیں۔ ان لوگوں کے دل مفتوح ہو گئے۔ بعد میں یہ شہر میں آئے تو مسجد میں حضورؐ خطبہ دے رہے تھے۔ اور صدقہ کی تاکید فرما رہے تھے۔ اس طرح ان کے دلوں میں اسلام کی دعوت کو راستہ ملا۔

۳۶ ۔ عمرو بن معدیکرب نمائندہ بنی زبید:

بنی زبید کے لوگوں تک جب اسلام کے چرچے پہنچے تو انہوں نے اپنے سردار عمرو بن معدی کرب سے کہا کہ ہم سنتے ہیں کہ قریش میں سے محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) نامی نبی بن کر حجاز میں اٹھا ہے۔ تم جاؤ اور جا کر معلوم کرو۔ اگر وہ تمہاری رائے میں واقعی نبی ہو تو پھر ہم سب ایمان لائیں۔ چنانچہ یہ شخص آیا اور اس نے اسلام قبول کیا۔ حضورؐ کے انتقال کے بعد اس نے ارتداد کیا [1]

۳۷ ۔ قاصد من جانب ملوک حمیر:

حمیر ایک شاہی خاندان تھا۔ اس کی طرف سے قاصد ایک خط لایا۔ اس خط میں حارث بن عبد کلال، نعیم بن عبد کلال، نعمان قیل ذورعین، معافر اور ہمدان کے قبول اسلام اور ترک شرک کی اطلاع تھی۔ حضورؐ نے اس کے جواب میں ایک تفصیلی فرمان ملوک حمیر کے نام بھجوایا۔ اس میں ان کو بنیادی احکام لکھوائے۔ مسلمانوں سے زکوٰۃ لینے اور غیر مسلموں سے ٹیکس (جزیہ) وصول کرنے کی ہدایات درج کرائیں۔ نیز لوگوں کی مذہبی آزادی کا حق ثبت فرمایا اور وضاحت کی کہ جو لوگ یہودی یا نصرانی رہنا چاہیں ان کا مذہب جبراً تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ فرمان میں لکھوایا کہ زرعہ ذویزن کی طرف ہمارے نمائندہ افسر ---- معاذؓ بن جبل، عبداللہؓ بن زیدؓ، مالکؓ بن عبادہ، عقبہؓ بن نمر، مالکؓ بن مرہ اور کچھ دوسرے لوگ روانہ کیے جا رہے ہیں۔ اس جماعت کے سربراہ معاذ بن جبل ہیں۔ یہ ہمارے احکامات پہنچائیں گے اور صدقہ و جزیہ کی رقوم جمع کر کے لائیں گے۔

۳۸ ۔ وفد نخع:

یہ بھی یمن ہی کا ایک قبیلہ تھا۔ یہ اکثر روایات کے بموجب آخری وفد ہے جو ۱۱ھ (محرم) میں مدینہ آیا۔ اس میں دو سو آدمی شریک تھے۔ دراصل یہ لوگ حضرت معاذؓ بن جبل کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کر چکے تھے۔ دلوں کے انقلاب نے تقاضا کیا تو یہ مرکز اسلام میں پہنچے۔ رسول اکرم ﷺ کے سامنے اپنا اسلام پیش کیا۔ ایک رکن وفد نے اپنے خوابوں کی تعبیریں دریافت کیں اور مختصر قیام کے بعد واپس ہو گئے۔

ان وفود کی آمد اس کثرت سے اور اتنی پے در پے ہوئی ہے کہ صحیح معنوں میں یدخلون فی دین اللہ

---

[1] حوالہ سیرت ابن ہشام ج ۴۔ ص ۲۵۳۔ طبع قاہرہ۔

افواجا (سورہ النصر: ۲) کا مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ درحقیقت انسانی فطرت خود حق کی طرف جھکاؤ رکھتی ہے۔ اور پھر محسن انسانیت ﷺ نے نہ صرف قرآن کے استدلالی زور اور دل گداز اسلوب بیان کے ساتھ حق کو پیش کیا تھا۔ بلکہ اپنی مقدس سیرت اور عملی زندگی سے اس کی صداقت کا ایسا کامل مظاہرہ کیا تھا کہ انسانیت رام ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ عوام الناس کے راستے میں رکاوٹ تھی تو سابق جاہلی قیادت تھی۔ وہ جب ہٹ گئی اور ساتھ ہی جب ان کو یہ اطمینان ہوگیا کہ مدینہ کی اسلامی طاقت ایک مضبوط طاقت ہے اور اس کے ہاتھوں سے واقعی خیر و فلاح پھیل رہی ہے اور کوئی سیلِ سبک سیر کے آگے جم نہیں سکتا' تو پھر ان کے سینے سچائی اور نیکی کے پیغام کے لیے پوری طرح کھل گئے۔ انہوں نے خود اپنے اندر سے اس نور صداقت کی پیاس محسوس کی۔ اس پیاس سے بیتاب ہو ہو کر مدینہ کی طرف لپکے۔ وہاں سے ساغر بھر بھر کے پیئے۔ اور پھر جاکر اپنے اپنے علاقوں اور قبیلوں میں خم کے خم لنڈھا دیے۔

یوں اجالا پھیلتا چلا گیا۔ اور ظلمتیں کافور ہوتی چلی گئیں۔

بین الاقوامی دعوت کا آغاز:

نبی اکرم ﷺ کی قائم کردہ جس جماعت کو تحریک اسلامی چلانے کی سعادت حاصل ہوئی اس کا دائرہ قومی و ملکی ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ ایسی خیر امتہ تھی۔ جو "اخرجت للناس" کے مرتبے پر فائز کی گئی تھی۔ اور جسے "شہداء علی الناس" قرار دیا گیا تھا۔ یعنی تمام انسانیت کو حق اور راستی' عدل اور اخوت کے نظام کا راستہ دکھانے والی جماعت ----- اہل عرب کی اصلاح و تربیت اور ان کی ریاستی سطح پر تنظیم فی نفسہٖ آخری مقصود نہ تھی۔ بلکہ پیش نظر یہ تھا کہ ایک اسلامی ریاست اٹھے اور تمام ذرائع و وسائل کو کام میں لا کر دنیا بھر کی قوموں اور مملکتوں کو نظام حق کی دعوت دے۔ آخر وہ کروڑوں بندگان خدا جو اس دور بادشاہت میں چھوٹے چھوٹے طبقوں اور خاندانوں کے اقتدار تلے پس رہے تھے اور جنہیں نہ سوچنے کی آزادی میسا تھی' نہ معاشی فراغت حاصل تھی اور نہ جن کے کچھ سیاسی حقوق تھے۔ ان کی مظلومانہ حالت سے کوئی بھی تحریک اصلاح کیسے آنکھیں بند کر سکتی ہے۔ کسریٰ کے نام ارسال کردہ خط میں حضورؐ نے خود ہی اپنی دعوت کے بین الانسانی پیمانے کو ان الفاظ سے اجاگر کر دیا ہے' کہ "فانی انا رسول اللہ الی الناس" یعنی میری حیثیت یہ ہے کہ میں سارے انسانوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

حق تعالیٰ نے بادشاہتوں اور مذہبی طبقوں کے ہاتھوں علاقائی قومیتوں میں بٹی ہوئی انسانیت کے لیے بین الاقوامی دور کا افتتاح خود محسن انسانیتؐ ہی کے ہاتھوں کرایا۔ اور ایک کلمہ صداقت جغرافی' نسلی' لسانی اور سیاسی حدبندیوں کو توڑتا ہوا بہت جلد وقت کی معلوم و مربوط دنیا کے تینوں براعظموں پر چھا گیا۔ سلسلہ انبیاء کے خاتم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بین الانسانی دعوت کے ساتھ ٹھیک ایسے زمانے میں کھڑے کیے گئے جب کہ زمانے کی چند ہی کروٹوں کے بعد بارود' پریس اور بھاپ کی طاقتوں کا ظہور ہونے والا تھا۔ اور معمورۂ

ارضی نئے ذرائع و وسائل کے بل پر ایک شہر کی طرح مربوط ہو جانے والا تھا۔ پانچ سات سو سال تاریخ کی وسعتوں میں کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتے۔ حضورؐ ایسے زمانے میں مبعوث ہوئے کہ جس کے چند ہی صدیوں بعد دنیا کے سرے مادی لحاظ سے مل جانے والے تھے۔ اس موقع کے آنے سے مناسب وقت پہلے اسلام کے نظام حق کی بین الاقوامی دعوت اٹھا دی گئی۔ تا کہ انسانیت جوں جوں مادی طور پر قریب ہوتی جائے۔ ذہنی اور نظریاتی اور اخلاقی و مقصدی لحاظ سے بھی ایک رشتے میں پروئی جا سکے۔ بیچ کا یہ وقت دعوت کے پھیلانے اور اقوام عالم کے دور نو کے لیے تیار کرنے کو بمشکل کافی ہو سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بین الاقوامی دور کا دھارا مسلم انقلابی قوت کے قبضے سے نکل کر مادہ پرستی کی رو دو گاہ میں چلا گیا۔ کیونکہ یہ قوت اس وقت تک تاریخ میں ایک موثر مقام رکھنے کے باوجود اپنی انقلابی دعوت کا زور کھو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی نئے دور کو انسانیت کے احترام' بنی نوع آدم کی مساوات' اجتماعی رابطے کے لیے جمہوری تصورات' عقلی و تجربی علوم کی قدر و قیمت کا احساس' تسخیر قوٰی کا جذبہ' بین الاقوامی حقوق اور معاہدات کا احترام' خیال اور رائے کی آزادی' اقلیتوں کے حقوق کا شعور' انصاف کے اساسی اصول اور بعض دوسری قیمتی اقدار بالواسطہ اسلامی تحریک سے ہاتھ آئیں ---- اگرچہ وہ مادہ پرستانہ ذہنیت کی زد میں آ کر دھندلا بھی گئیں۔ پھر بھی دور حاضر کے تمدن میں خیر و خوبی کا جو تھوڑا بہت عنصر پایا جاتا ہے۔ وہ محسن انسانیت ﷺ کے کیے ہوئے کام کا مرہون منت ہے۔ اس کا اعتراف بعض انصاف پسند مستشرقین نے خود بھی کیا ہے۔

پس تحریک اسلامی اپنی اصولی فطرت کے لحاظ سے تقاضا کرتی تھی کہ اس کی دعوت کی کرنیں عرب کی حدود میں پابند نہ رہیں۔ بلکہ زمین کے گوشے گوشے تک پہنچیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عملی ضرورت بھی یہی تھی کہ اسلام عرب کے ارد گرد بھی نور افگن ہو۔ ورنہ نظریہ حق کی اساس پر ایک نظام کا مجرد عرب میں سلامتی سے چلتے رہنا ممکن نہ تھا۔ جب کہ اسلامی ریاست اس نظریہ کی مخالف طاقتوں کے گھیرے میں گھری رہے۔ خصوصاً یہ امر سامنے رہے کہ رومی اور ایرانی حکومتیں ہمیشہ عرب پر سیاسی ہوس کی نگاہ جمائے رہیں۔ اس ملک کے بعض علاقے ان کے قبضے میں رہے اور عرب قبائل کو انہوں نے خرید کر استعمال میں رکھا۔ رومی حکومت سے تو مدینہ کا تصادم شروع بھی ہو چکا تھا۔

محسنؐ انسانیت ﷺ کی رفتار کار ہمارے لیے حیران کن ہے کہ تیرہ برس کی مدت میں ابتدائی دعوت دے کر افراد کار تیار کرنے کا کام مکمل فرمالیا۔ اور پھر آٹھ برس کے اندر اندر اسلامی ریاست عملاً زمین کے نقشے پر کھڑی کر کے مخالفت کے سارے محاذ توڑ دیئے اور پھر اپنی زندگی ہی میں دعوت کی لہریں آس پاس کی سلطنتوں میں پہنچا دیں۔

صلح حدیبیہ (۶ ھ) نے اندرون ملک کے تصادموں سے فراغت دے کر حضورؐ کے لیے یہ موقع فراہم کیا کہ عرب سے باہر بھی کام کی ابتداء کر دی جائے۔ عمرۃ القضاء ادا کرنے کے فوراً بعد یعنی یکم محرم ۷ ھ کو حضورؐ نے ملحقہ سلطنتوں کے حکمرانوں کو اسلامی نظام کا پیغام خصوصی قاصدوں کے ذریعے بھجوایا۔ یہ بات

آج کے دور میں قابل غور معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ نے دوسرے ملکوں کے عوام تک کلمہ حق پہنچانے کے بجائے آخر شاہی درباروں کو کیوں مخاطب فرمایا۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ عوام الناس کے کوئی شہری حقوق اس دور کے بادشاہوں کے مقابلے میں نہ تھے اور انہیں وہ اساسی آزادی ہی میسا نہ تھی جس سے کام لے کر وہ اپنے بارے میں خود کوئی فیصلہ کر سکیں۔ پھر یہ بادشاہتیں اس امر کا موقع دینے پر بھی قطعاً تیار نہ تھیں کہ دوسرے ملک کے اجنبی لوگ آکر ان کی رعیت سے میل جول رکھیں اور ان کو موجودہ مذہب سے برگشتہ کریں۔ ان کے سیاسی اقتدار مروجہ مذاہب کے بل پر ہی چل رہے تھے۔ اور وہ مذہبی پیشواؤں کے طبقوں کا تعاون حاصل کر کے حکمرانی کر رہے تھے۔ پھر جہاں صرف تبدیل مذہب کا معاملہ نہ ہو۔ بلکہ انسان کو من حیث الکل بدلا جاتا ہو۔ اس کے پیمانے اور اقدار اس کے ذوق اور معیارات ہی یکسر تبدیل کیے جاتے ہوں۔ اور جہاں دعوت حق قبول کرنے والوں میں مروجہ نظام کے خلاف باغیانہ رجحان پیدا کر کے نئے نظام کی اقامت کا انقلابی داعیہ ابھارا جاتا ہو۔ وہاں کیسے ممکن تھا کہ بادشاہتیں اپنے عوام میں اسلامی دعوت کو چپ چاپ پھیلنے کا موقع دیتیں۔ اس دور کی بادشاہی قیادت تو گویا خداوند بنی بیٹھی تھی اور پیچے ایک پتہ بھی اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہل سکتا تھا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر نہ صرف یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے اسلامی دعوت کا مخاطب خود فرماں رواؤں کو بنایا بلکہ اپنے نامہ ہائے مبارک میں صراحت سے ان کو پوری قوم کا نمائندہ قرار دے کر عوام کے برے اور بھلے کی ذمہ داری ان پر ڈالی۔ حضورؐ نے مختلف تاجداروں کو "عظیم الروم" "عظیم فارس" "عظیم القبط" یعنی فلاں اور فلاں قوم کے سربراہ کار کہہ کے مخاطب فرمایا۔ پھر کسریٰ اور مقوقس کو صراحتاً لکھا کہ اگر تم دعوت قبول نہ کرو' تو علیک اثم المجوس' علیک اثم اہل القبط یعنی تم پر پورے مجوسیوں اور تمام قبطیوں کی غلط روی کا وبال عائد ہو گا۔

تاجداروں کو خطوط لکھتے ہوئے حضورؐ نے ایک طرف مروجہ آداب کا اہتمام کیا۔ یعنی بطور خاص مہر کرنے کے لیے انگوٹھی بنوائی اور اس میں "محمدؐ رسول اللہ" کے الفاظ کندہ کرائے۔ دوسری طرف اپنا ایک خاص اسلوب و نہج پیدا کیا۔ ہر خط کا آغاز خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے فرمایا۔ پھر مرسل کی حیثیت سے اپنا اسم مبارک لکھوایا۔ پھر مکتوب الیہ کا نام۔ پھر کم سے کم اور انتہائی محتاط اور نپے تلے الفاظ میں مدعا بیان فرمایا۔ اس دور کے لحاظ سے جو سفارتی زبان آپؐ نے خطوط کے لیے اختیار کی ہے وہ حضورؐ کی ذہنی برتری کو ہمارے سامنے واضح کر کے آج بھی حیران کر دینے والی ہے۔ مثلاً انہی خطوط میں کمال ایجاز دکھاتے ہوئے یہ جملہ آپؐ نے لکھوایا۔ "اسلم تسلم" "اسلام لاؤ' سلامتی پاؤ گے"۔ بلاغت کا کمال یہ ہے کہ اس کے معنی وہ بھی ہیں' اور یہ بھی ہیں کہ اطاعت کرو تو سلامتی پاؤ گے۔ خود سلامتی پاؤ گے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ یہی سلامتی کا مسلک ہے اور دوسرا مفہوم اچھی خاصی سیاسی دھمکی اپنے اندر رکھتا ہے۔ یعنی اگر نہ مانو گے تو پھر خیر نہیں' صرف دو لفظ ہیں اور ان کے معانی کی وسعتوں کو دیکھیے۔ اسی طرح فعلیک اثم المجوس یا اثم اہل القبط کے جملے میں لفظ اثم کا دوہرا مفہوم ہے۔ مذہبی بھی سیاسی بھی- ایک یہ کہ تم پر قوم کا وبال

عنداللہ ہو گا یا آخرت میں ہو گا۔ دوسرا یہ کہ سیاسی حیثیت سے تمہیں کیفر کردار سے دو چار ہونا پڑے گا۔ ان ذو معنی الفاظ کے استعمال سے حضورؐ کا منشا ہرگز یہ نہیں تھا کہ بات غیر واضح رہے اور (نعوذ باللہ) کسی ہیر پھیر سے کام لیا جائے۔ بلکہ دونوں کلمات سے بیک دم ہر دو مفہوم سامنے رکھنے مطلوب تھے۔ یہ فصاحت و بلاغت کا کمال ہے کہ اتنے کم الفاظ سے اتنے وسیع معانی حاصل ہوں۔ علاوہ ازیں ہر حکمران کو مخاطب کرتے ہوئے اس کا مذہب اور اس کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر مختلف مہارات سے کام لیا۔ یہ نہیں کہ ایک ہی سپاٹ مضمون نقل کر دیا گیا ہو۔ پھر آپؐ نے ہر حکمران کی طرف اس کی قومی زبان جاننے والا سفیر نامزد کر کے روانہ کیا[1]

دعوت کے علاوہ ان خطوط کی ترسیل کا ایک بڑا مدعا یہ بھی تھا کہ آس پاس کے حکمرانوں کو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اب عرب پہلے کی طرح کی کوئی کھلی چراگاہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک باضابطہ حکومت کے زیر نظام ہے۔ ایک کار فرما طاقت موجود ہے۔ جو ہر لحاظ سے چوکس اور مضبوط ہے۔ وہ کسی پرانی سلطنت سے دبنے والی بھی نہیں۔ بلکہ وہ چیلنج کر رہی ہے۔ اور چیلنج کرنے کا دم خم اس میں موجود ہے۔

اب ہم مجملاً روداد بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ایک ایک حکمران تک نامہ دعوت پہنچایا گیا اور نتیجہ کیا نکلا۔

۱ - اصحم (یا اصحمہ) بن ابجر نجاشی' شاہ حبش کے دربار میں عمرؓو بن امیہ ضمری کے ہاتھ حضورؐ نے ایک مکتوب دعوت بھیجا۔ اس مکتوب میں مہاجرین حبش کو خط سے پہلے حبش روانہ کرنے کا حوالہ بھی ہے۔ خصوصاً حضرت جعفر طیارؓ کا ذکر ہے۔ اور ان کو آرام سے رکھنے کی تلقین فرمائی ہے۔ پھر اس میں اسلام کی دعوت شاہ کو بھی دی گئی ہے۔ اور اس کے معرفت عمائد سلطنت (جنود ک) کو بھی۔

نجاشی پہلے ہی اسلام سے متاثر تھا۔ حضرت جعفرؓ کے ہاتھ پر بھی علی الاعلان اسلام کی بیعت کی اور اس کی اطلاع ایک تفصیلی خط کے ذریعے حضورؐ کو بھجوائی۔ اپنے بیٹے ارہا کو سفیر بنا کر بھیجا۔ یہ پیش کش بھی کی کہ اگر ارشاد ہو تو میں خود حاضر بارگاہ ہو جاؤں[2]

۲ - منذر بن ساوی بحرین کے علاقے کا حکمران تھا۔ اور شہنشاہ فارس کا باجگزار علاء بن حضرمیؓ کے ہاتھ

---

[1] تجارتی سفروں میں ہمیشہ آمد و رفت رکھنے کی وجہ سے ملحقہ ممالک کی بولیاں جاننے والے صحابی موجود تھے۔ بعض کو حضورؐ نے حکم خاص سے کسی زبان کے سیکھنے پر مامور بھی فرمایا۔

[2] اغلب یہ ہے کہ یہ وہ نجاشی اوّل نہیں ہے جس کے سامنے مہاجرین کا معاملہ پیش ہوا تھا۔ اور وہ مسلمان ہوا۔ اور اس کی غائبانہ نماز جنازہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی' یہ اصحم اس کے بعد تخت نشین ہوا۔ بہرحال یہ محل اختلاف ہے۔

حضورؐ نے نامہ دعوت بھیجا۔ منذر نے اسلام کے نور کو قبول کیا اور اس کی رعیت میں سے بھی ایک تعداد حلقہ اسلامی میں داخل ہوئی۔ اس نے بھی جوابی خط میں اپنا اسلام پیش کیا اور رعیت کے بارے میں بتایا کہ کچھ لوگوں کے دل اسلام کے لیے کھل گئے ہیں۔ لیکن بعض مخالف ہیں اور یہودی و نصرانی رہنا چاہتے ہیں۔ مدینہ سے دوبارہ فرمان گیا کہ جو لوگ یہودی و نصرانی رہنا چاہیں ان پر ٹیکس عائد ہو گا اور وہ اپنے مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں۔

(۳) جیفر اور عبد' جلندی کے دو بیٹے تھے۔ جن کا اقتدار عمان میں چلتا تھا۔ عمرو بن عاص کے ہاتھ نامہ دعوت بھیجا گیا۔ عمرو بن عاص پہلے چھوٹے بھائی عبد سے ملے تو اس نے بڑی طویل گفتگو کی۔ اور ان سے خاصی معلومات حاصل کیں کہ نجاشی مسلمان ہو گیا ہے اور پھر بھی اس قوم نے اسے بادشاہت پر قائم رکھا ہے۔ بشپ پادری بھی رکاوٹ نہیں ڈال سکے۔ اور ہرقل روم نے بھی اس واقعہ کا علم ہو جانے کے باوجود کوئی اقدام نہیں کیا۔ بلکہ نجاشی نے اسلام لانے کے بعد ہرقل کو خراج دینا بھی بند کر دیا ہے۔ پھر حضرت عمرو بن عاص سے اس نے نبی اکرم ﷺ کی خاص خاص تعلیمات دریافت کیں۔ اس گفتگو سے اس کے اندر ایک ولولہ تو پیدا ہو گیا اور اس نے بحسرت کہا کہ کاش کہ میرا بڑا بھائی بھی مان جائے۔ اور ہم دونوں مدینہ جا کر اسلام میں داخل ہوں۔ پھر دربار لگایا گیا۔ اور دونوں بھائیوں کی موجودگی میں سفیر مدینہ نے سربمہر خط پیش کیا۔ دونوں بھائیوں نے پڑھا۔ پھر کچھ سوالات کیے۔ جن کے جواب میں حضرت عمروؓ بن عاص نے بتایا کہ قریش نے چارو ناچار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اختیار کر لی ہے اور حضورؐ کی جماعت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے غور و فکر' شعور اور فہم کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کو اور ان کی دعوت کو قبول کیا ہے۔ اور پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حضورؐ کے گرد اکٹھے ہوئے ہیں پھر دو ایک روز تک جیفر بادشاہ حیص بیص میں رہا۔ بالآخر یہ دونوں بھائی اسلام کے سایہ رحمت میں داخل ہوئے اور ان کے ساتھ رعیت کا ایک حصہ بھی صداقت کے نور سے بہرہ مند ہوا۔

۴ - منذر بن حارث بن ابو شمر دمشق کا حاکم تھا۔ شجاع بن وہب الاسدی اسلامی حکومت کے سفیر بن کے اس تک پہنچے۔ پہلے تو نامہ مبارک کو دیکھ کر وہ بھنایا۔ مگر بعد میں توازن بحال کر لیا۔ مصلحتاً سفیر مدینہ کو باعزاز رخصت کیا۔ البتہ اسلام قبول نہ کیا۔

۵ - ہوذہ بن علی یمامہ کا حاکم تھا۔ اور عیسائیت کا پابند۔ مدینہ سے سلیطؓ بن عمرو دعوتی خط لے کے گئے۔ اس نے بھی حضورؐ کے کام کو دنیوی سیاست کا مفہوم دیا اور سودا کرنے کے لیے شرط رکھی کہ اسلامی حکومت میں آدھا حصہ میرا ہو۔ بعد میں جلد ہی اس کا پیمانہ عمر لبریز ہو گیا۔ حضورؐ تک روداد پہنچی تو فرمایا کہ وہ ایک انگل بھر یا ایک کھجور برابر زمین مانگے تو میں نہیں دے سکتا۔ اسلامی نظام جس سرزمین پر قائم ہوتا ہے۔ اس کا تو ذرہ ذرہ ایک مقدس امانت ہوتا ہے۔

(۶) جریج بن متی مقوقس اسکندریہ و مصر کا تاجدار تھا اور مذہبا عیسائی۔ حاطب بن ابی بلتعہ کو حضورؐ نے

اس کے دربار میں روانہ کیا۔ انہوں نے خط پہنچانے کے بعد گفتگو بھی کی۔ اور ایسے بے باکانہ انداز میں کی کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس مضبوط ذہن و کردار کی ہستیاں حضورؐ نے اسلام کے سانچے میں ڈھال کر پیدا کیں۔ حاطب نے مقوقس کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سرزمین میں پہلے بھی ایک شخص گزرا ہے جو "انا ربکم الاعلی" کا نعرہ لگایا کرتا تھا۔ آخر وہ خدا کے غضب کا شکار ہوا۔ پس لازم ہے کہ آپ لوگ دوسروں سے عبرت پکڑیں۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے آپ لوگوں سے عبرت حاصل کریں۔ پھر عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کی برتری دلائل دے کر واضح کی۔ پھر یہ بھی کہا کہ ہم آپ کو حضرت مسیحؑ ہی کے پیش کردہ صحیح دین کی طرف بلا رہے ہیں۔ یعنی یہ کوئی نئی راہ نہیں۔ مقوقس اسلام قبول کرنے پر تو آمادہ نہ ہوا۔ مگر اس نے نامہ نبوت کا بڑا احترام کیا۔ اسے ہاتھی دانت کے ڈبے میں رکھوا کر خزانے میں محفوظ کر دیا۔ حضورؐ کے لیے تحائف بھجوائے۔ جن میں دلدل نامی مشہور خچر بھی شامل تھا۔ خط کے جواب میں یہ بھی لکھا کہ مجھے معلوم ہے کہ نبی آخر زمان کی آمد باقی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ملک شام میں اٹھیں گے۔

(۷) ہرقل یا قیصر روم سلطنت روم کے مشرقی حصے کا تاجدار تھا اور قسطنطنیہ اس کا دارالحکومت تھا دحیہ بن خلیفہ کلبی کو حضورؐ نے نامہ مبارک دے کر اس کے دربار میں بھیجا۔ دحیہ بیت المقدس کے مقام پر جا کر اس سے ملے۔ سفیر مدینہ کے اعزاز میں ہرقل نے بڑا بھاری دربار منعقد کیا اور نبی اکرم کے بارے میں بہت سی تفصیلات دریافت کیں۔ پھر دریافت کرایا کہ اگر مکہ کا کوئی اور آدمی اس علاقے میں آباد ہو تو اسے پیش کیا جائے۔ اتفاق کی بات کہ حضورؐ کے مخالف محاذ کا قائد ابوسفیان انہی دنوں تجارت کے سلسلہ میں شام میں پہنچا تھا۔ اسے مع تجارتی ساتھیوں کے دربار میں لایا گیا۔ ہرقل نے ان لوگوں سے کہا کہ میں ابوسفیان سے کچھ سوالات کروں گا۔ اگر کوئی بات غلط ہو تو تم لوگ بتا دینا۔ ابوسفیان کا اپنا قول تھا کہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ساتھی میرے جھوٹ کو ظاہر کر دیں گے تو شاید میں اس موقع پر کچھ باتیں گھڑتا۔ لیکن خدا نے صورت حالات ایسی پیدا کر دی کہ رسولؐ خدا اور اسلام کے دشمن کی زبان سے بھی سچ نکلا۔ پھر قیصر نے حضورؐ کے خاندان، نسب، اخلاق، حضورؐ کے رفقائے تحریک کے حالات اور ان کی رفتار ترقی، جنگوں میں مسلم جماعت کی پوزیشن اور اسلام کی تعلیمات اور دوسری چیزیں دریافت کیں۔ ساری باتیں سن کر کہا کہ "ابوسفیان! اگر تم نے سچ سچ جواب دیئے ہیں تو وہ شخص ایک روز اس جگہ کا مالک ہو گا۔ جہاں میں بیٹھا ہوا ہوں۔ کاش میں حاضر خدمت ہو سکتا۔ اور اس نبیؐ کے پاؤں دھویا کرتا۔" اس کے بعد نامہ مبارک پڑھا گیا جس پر درباری بہت سٹپٹائے۔ کیونکہ ہرقل کی ذہنی کیفیت نے انہیں بوکھلاہٹ میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے مکہ والوں کو جلدی جلدی باہر نکال دیا۔

اس مکالمہ نے خود ابوسفیان کے دل پر اسلام کی عظمت کا نقش ثبت کر دیا۔

(۸) خسرو پرویز کسریٰ ایران کی بہت بڑی سلطنت کا حکمران تھا۔ یہ زرتشت کے مذہب کا پیرو تھا۔ حضورؐ نے عبداللہ بن رواحہ کو سفیر بنا کر اس کی طرف نامہ دعوت بھجوایا۔

خسرو کسریٰ کے جس تخت پر بیٹھا تھا' بمشکل ہی سے نشہ پندار اس کی بصیرت کو کام کرنے کا موقع دے سکتا تھا۔ غصے میں بپھر گیا اور نامہ نبوت کو یہ کہہ کر چاک کر دیا کہ ہماری رعیت کا ایک فرد یہ جرأت دکھاتا ہے۔ کم بخت کو پوری طرح معلوم نہ تھا کہ عرب کتنے بڑے انقلاب سے گزر رہا ہے۔ اور کیسی بھاری نظریاتی قوت نشوونما پا رہی ہے۔ اس نے اپنے گورنر یمن باذان کو مامور کیا کہ مکتوب نگار کو فوراً گرفتار کر کے حاضر کرو۔ باذان نے ایک فوجی دستہ اس مہم پر روانہ کیا۔ یہ جب طائف پہنچا تو وہاں کے اکابر بہت خوش ہوئے کہ اب ان کے محبوب جاہلی نظام کے حریف کا (نعوذ باللہ) خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ دستہ مدینہ پہنچا اور ان کے سردار نے حضورؐ تک مدعا پہنچایا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کل صبح آ کر پھر ملو۔ صبح یہ لوگ حاضر ہوئے تو حضورؐ نے ان کو خبر دی کہ آج رات خدا نے تمہارے بادشاہ کی مہلت حیات ختم کر دی ہے اور وہ اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ جاؤ اور جا کر تحقیق کر لو۔ اس پیش گوئی کی صحت معلوم ہونے اور محسن انسانیتؐ کی تعلیم اور کردار کا حال جاننے پر باذان اسلامی نظام اخوت میں شریک ہو گیا۔ اور اس کی ساتھ دربار اور علاقے کے بہت سے لوگ بھی ایمان سے مالا مال ہوئے۔

حضورؐ نے کسریٰ کے رویے کی روداد سن کر فرمایا۔ "مزق ملکه" یعنی اس نے میرے خط کو چاک چاک کر کے درحقیقت اپنی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ حضورؐ کے الفاظ میں قضائے الٰہی بول رہی تھی۔ دس پندرہ برس کے اندر اندر چار پانچ ہزار برس کی قدیمی سلطنت ----- مضبوط اور وسیع اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ رکھنے والی سلطنت ----- اسلام کے قدموں میں مفتوح پڑی تھی۔ اور فی الواقع طوائف الملوکی ہی نے اسے اس انجام تک پہنچایا۔

علاوہ ازیں جن دوسرے چھوٹے چھوٹے والیوں تک دعوت بھیجی گئی۔ ان میں سے ایک تو فروہ بن عمرو رومی سلطنت کا گورنر تھا۔ جس نے اسلام قبول کر کے نہ صرف عہدہ و جاہ پر لات ماری بلکہ جان بھی شہادت حق میں لگا دی۔ دوسرا نجد کا حکمران ثمامہ تھا جو ۶ھ میں اسلام میں داخل ہوا۔ تیسرا جبلہ غسانی ۷ھ میں اسلام لایا۔ چوتھا دومتہ الجندل کا حاکم اکیدر بھی مسلمان ہوا۔ پانچواں ذوالکلاع حمیری جو قبیلہ حمیر کا بادشاہ تھا اور اپنے آپ کو خدا کہلاتا اور لوگوں سے سجدے کراتا تھا۔ آخر کار یہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔ اور دور فاروقی میں بادشاہت چھوڑ کر راہبانہ زندگی بسر کرنے کے لیے مدینہ آ گیا۔ اس نے اسلام لانے کی خوشی میں اٹھارہ ہزار غلام آزاد کیے تھے۔

اوپر کے واقعات سے ظاہر ہے کہ دعوت حق کے اس قلمی محاذ سے بھی بڑے اہم نتائج پیدا ہوئے اور یہ تدبیر فروغ اسلام میں بہت ممد ہوئی۔ اولاً یہ ہوا کہ اردگرد کی سلطنتوں میں اسلام کا پیغام بہ حیثیت ایک موضوع اور مبحث کے جا پہنچا اور محدود حلقوں میں سہی' اس پر سوچا جانے لگا۔ پھر یہ اسلام کی صداقت اور اس کے مطابق فطرت ہونے کا ایک ثبوت ہے کہ اہل جاہ و اقتدار کی ایک اچھی خاصی تعداد ایسی حالت میں مسلمان ہوئی' جب کہ مسلم جماعت تمدنی لحاظ سے بہت پیچھے تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ ان کے زیر اثر

عوام میں بھی اسلام کو راستہ ملنے لگا۔ مکاتیب نبویؐ کے جو مخاطب اسلام میں نہیں آ سکے۔ ان کے ذہنوں پر بھی خاصے اچھے اثرات پڑ گئے۔ پھر اس بین الاقوامی دور کے افتتاح سے خود اندرون ملک بھی فضا ہموار ہونے میں مدد ملی۔ سب سے بڑا فائدہ اس مہم کا یہ ہوا کہ مسلم جماعت کے سامنے ایک وسیع دائرہ کار شروع ہی سے آگیا اور اسے یہ نصب العین قومی و ملکی پیمانے سے بہت بڑا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب میں اسلامی سلطنت کے چھا جانے کے باوجود ان لوگوں نے کمریں نہیں کھولیں۔ عیش و تنعم میں نہیں پڑے۔ ان میں یہ اطمینان پیدا نہ ہوا کہ کرنے کا کام ہم نے مکمل کر دیا۔ کلمہ حق سے ان کی لگن گھٹنے نہیں پائی۔ بلکہ ان کا شرار آرزو پہلے سے زیادہ چمکنے لگا۔ پھر سفارتی معاملات میں اپنے رفقاء کو ڈال کر حضورؐ نے ان کو آنے والی ذمہ داریوں کے لیے اچھی خاصی تربیت دے لی۔ وہ اجنبی حلقوں میں پہنچے۔ ٹھاٹھ دار تمدنوں کے دائروں میں داخل ہوئے۔ مرعوب کن شاہی درباروں میں پہنچے' بھری مجلسوں میں انہیں مکالمہ و بحث کا تجربہ ہوا' وقت کے حکمرانوں اور درباریوں کی نفسیات سمجھنے کا ان کو موقع ملا اور پھر جس اطمینان' مضبوطی' اپنے مسلک کی برتری کے شعور' اپنی سادگی اور بدویت کے ساتھ اپنی عزت کے احساس اور بیان حق کے لیے جس جرأت اظہار کا انہوں نے مظاہرہ کیا' اس نے ان کی صلاحیتوں کو اور زیادہ اجاگر کر دیا۔ اور ان کا کردار اور زیادہ نکھر گیا۔

بین الاقوامی دعوت کی یہ مہم جس کا حضورؐ نے آغاز فرمایا تھا۔ اسے تکمیل دینے کی سعادت آپؐ کے جانشین' رفقاء اور آپؐ کی تربیت دادہ جماعت کے حصے میں آئی۔

رد عمل کی آخری لہر:

کوئی انقلاب سارے مراحل کشمکش کو پار کر کے اور پرانی قیادتوں کا زور توڑ کر جب فیصلہ کن کامیابی کے دور میں داخل ہوتا ہے تو اس کامیابی پر مارے حسد کے بعض دوں ہمت لوگ اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہیں۔ پھر کوئی موقع آتا ہے' جب یہ آخری جسارت سے کام لے کر سیلاب تغیر کے آگے تنکوں سے بند باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی ہی صورت اسلامی انقلاب کو پیش آئی۔ قریش اور یہود اور صحرائی قبائل کی مقامی قیادتوں کا زور جب ٹوٹ گیا۔ عوام اسلام کی طرف بڑھنے لگے اور اسلام عوام میں نفوذ کرنے لگا تو مخالفت کی ایک آخری رد عملی لہر بالکل ایک نئی صورت میں اٹھی۔ کچھ لوگوں نے یوں سوچا کہ ایک شخص اٹھا اور اس نے نبوت کا دعوی کیا' کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ لیا' کشمکش کی' اور آج وہ سارے عرب کا حکمران بن بیٹھا ہے۔ تو کیوں نہ ہم بھی یہی سکہ چلا دیکھیں۔ خصوصاً جب یہ لوگ صدقہ زکوۃ کے اموال کثیر کو مدینہ جاتے دیکھتے ہوں گے تو ان کے مونہوں میں پانی بھر بھر آتا ہو گا۔ ان کے سامنے ایسے عناصر تھے۔ جو چارو ناچار مطیع نظام ہو گئے تھے۔ مگر ان کے دلوں میں مخالفانہ لاوہ ابھی کھول رہا تھا۔ ان کو سمیٹ کر انہوں نے بازی کھیلنا چاہی۔ وہ یہ بات خوب سمجھتے تھے کہ اب جاہلی تصورات اور مشرکانہ یا بت

پرستانہ نظریات کے بل پر تو کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ فضا میں توحید باری تعالیٰ اور وحی اور نبوت اور آخرت کے عقائد پوری طرح چھا گئے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی دکانوں میں انہی لیبلوں کے ساتھ سودا رکھ کر لوگوں کو ورغلانے کی کوشش کی۔ مگر یہ بے وقوف نہ جانتے تھے کہ سکہ چلانے کے لیے صرف ایک نقلی نقش کافی نہیں ہوتا اس کے لیے کھری دھات کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اسلام کے سکہ میں جو دھات استعمال ہوئی تھی' وہ فی نفسہ بھی بہترین تھی (خیارکم فی الاسلام' خیارکم فی الجاھلیہ اور پھر اسے دس بیس برس تک بھٹیوں اور کٹھالیوں میں سے گزارا گیا تھا۔ مگر بندگان ہوس کی نگاہیں کبھی گہرائی تک نہیں جاتیں۔ وہ اپنی پسند کے مفاد کو دیکھتی ہیں۔ اور اس قیمت میں جو قربانیاں دینی پڑتی ہیں' ان پر بھی توجہ نہیں کرتیں۔ غرض تاریخ میں یہ جو ہوتی آئی ہے کہ ہر عظیم شخصیت کا منہ چڑانے کے لیے کچھ دوں فطرت لوگ نمودار ہو جایا کرتے ہیں۔ اور ہر عروج پذیر تحریک کے آسمان گیر علم کے مقابلے پر بعض سفلہ عناصر چیتھڑوں کی جھنڈیاں بنا کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بالکل ایسا ہی تجربہ عرب میں بھی پیش آیا۔ ایسے شرپسندوں کا مختصر تذکرہ کیا جانا ضروری ہے۔

۱ - پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ایک وفد کے ساتھ مسیلمہ بن حبیب (جو کذاب کہلاتا ہے) مدینہ آیا تھا۔ مرکز اسلام کی ہماہمی کو دیکھ کر اس کی ہوس اقتدار میں ابال آیا ہو گا۔ اس نے حضورؐ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں وہی شرکت اقتدار کا معاملہ چھیڑا۔ اور دھمکی بھی دی۔ حضورؐ نے سختی سے اسے مسترد کیا۔ بھنا کر اس نے نبوت کا علم بلند کر دیا۔ ادیب وہ تھا ہی۔ قرآن کی آیات کے طرز کو سامنے رکھ کر مقفی عبارتیں گھڑ گھڑ کے صحرائی عوام کو سناتا اور چونکہ بعض لوگ ابھی تک جاہلیت سے ذہنی وابستگی رکھتے تھے۔ اور ان کی تعلیم و تربیت اسلامی نظام کے مطابق نہیں ہو پائی تھی۔ نیز علاقائی اور قبیلوی عصبیت بھی ابھی باقی تھی اس لیے اسے کچھ نہ کچھ پیروکار بھی مل گئے۔ پھر چونکہ اس کی وحی نے نماز معاف کر دی اور اس کی شریعت نے زنا اور جوئے کو جائز کر دیا تھا۔ اس لیے تمام کا تمام فاسق مزاج عنصر اس کے گرد جمع ہو گیا۔ خیال کیجئے کہ یہ طاقت تھی جو اسلامی تحریک کے مقابلے پر لائی جا رہی تھی۔ دور صدیقیؓ میں اس کا خاتمہ ہوا۔

۲ - ایک عورت مسیلمہ کے علاقے کے پڑوس میں سے اٹھی جس کا نام سجاح تھا۔ اس نے بھی زنانہ* نبوت کا اولین علم بلند کیا۔ مسیلمہ نے اس سے ملاقات کی۔ اور افہام و تفہیم کے لیے تنہائی میں گفتگو قرار پائی۔ مسیلمہ نے شیطانی وحی کے ایسے فحش پارے پیش کیے کہ سجاح جنس کی رو میں بہہ گئی۔ اس کا وجود مسیلمہ میں ضم ہو گیا۔ بعد میں مسیلمہ قتل ہوا تو وہ تائب ہو کر مرتے دم تک اسلام پر قائم رہی۔

۳ - حجۃ الوداع کے بعد یمن کے زرخیز اور سیاسی اہمیت رکھنے والے علاقے میں اسود عنسی نے ادعائے نبوت کے پیرائے میں علم بغاوت بلند کیا۔ اس کا اصل نام ذوالحمار عبہلہ بن کعب تھا۔ قبیلہ مذحج سے اسے پیروکار ملے۔ اور نجران میں بھی اس کے اثرات پھیلے۔ اس کے اثر کی بڑی وجہ اس کے جادو منتر وغیرہ

کا چلن تھا۔ اسلامی حکومت کے بعد سول افسروں اور دعوتی اور تعلیمی کارکنوں کو اس نے تہ تیغ کرایا۔ اور بعض کو اپنے علاقے سے نکال دیا۔ حضورؐ نے آس پاس کے افسروں کو قوت اکٹھی کر کے اس بغاوت کے فرو کرنے کا فرمان بھیجا۔ اس نے ایک ایرانی النسل مسلمان کو قتل کرا کے اس کی خوب رو بیوی کو زبردستی گھر میں ڈال لیا تھا۔ یہ خاتون اپنے ایمان میں پختہ تھی۔ اور اسی کی امداد سے اسلامی حکومت اسود پر قابو پانے میں کامیاب ہوئی۔ حضورؐ کے سفر آخرت سے دو ایک روز قبل یہ فتنہ گر ہلاک ہوا اور پھر اس کی بن سری فوج کو باسانی ختم کر دیا گیا۔ لیکن اس کے پھیلائے ہوئے فتنے کے اثرات حضرموت سے طائف تک پھیلے اور ان کا ازالہ بھی دور صدیقیؓ ہی کے آغاز میں ہوا۔

۴ - ان مثالوں کو دیکھ کر طلیحہ بن خویلد اسدی کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اور اس نے بھی جعلی نبوت کے بل پر بازی مار لینا چاہی۔ اپنے قبیلے بنو غطفان میں سے اسے پیروکار ملے۔ اس نے بھی حضورؐ کو خط لکھ کر اقتدار میں سے حصہ مانگا تھا۔ اس کے فتنے کا قلع قمع بھی دور صدیقیؓ میں ہوا۔

۵ - عمان کے لقیط بن مالک ازدی کو جب ہوذہ بن علی کی جانشینی ملی تو اس کے دماغ میں بھی کیڑا کلبلانے لگا تھا۔

دراصل یہ مختلف افراد مختلف علاقوں میں اس لیے اٹھے کہ ان کو اپنے اردگرد جاہلیت پرستوں' بطور نفاق اسلام قبول کرنے والوں' پرانے جرائم پیشہ فاسقوں' زنا' شراب' جوئے اور سود خواری کے متوالوں' ایک مرکزی نظام کی اطاعت کے مقابلے میں اپنے قبیلے کی سربلندی چاہنے والوں' پھر زکوۃ دیتے ہوئے اور زکوۃ کے اموال کو مدینہ جاتے دیکھتے ہوئے اندر ہی اندر کڑھنے والوں' نیز اپنی چھوٹی موٹی قیادت کے ماتمیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد دکھائی دیتی تھی۔ اس تعداد کو یہ لوگ حرکت میں لے آئے اور ان کے طفیل جاہلیت کی دم توڑتی ہوئی قوت نے ایک آخری سنبھالا لیا۔

لیکن حضورؐ کی تیار کردہ قیادت نے حالات کی خوف ناک نزاکت کے باوجود بڑے مضبوط ہاتھوں سے ان فتنوں کا سر کچلا اور عرب کے ایک ایک متنفس کو نظم میں کس دیا۔

تحریک اسلامی کا اجتماع عظیم:

حج اسلام کی ایک عظیم درجے کی بنیادی عبادت ہے۔ حرم پاک جو دعوت ابراہیمی کا مرکز تھا اور جس کے ذرے ذرے پر دین کی تاریخ کے قیمتی نقوش ثبت ہیں' جس کی فضا میں ابراہیم خلیل اللہ علیہ اسلام کی دعائیں رچی بسی ہیں اور پھر جس کے پورے ماحول میں خود محسن انسانیت ﷺ کے کارنامہ حیات کے ابواب بکھرے ہوئے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے اسلامی دعوت اور تحریک کا عالمی مرکز اور قبلہ قرار پایا۔ ہر صاحب توفیق مسلمان کے لیے عمر بھر میں کم از کم ایک بار اس مرکز پر مقررہ ایام حج میں حاضری دینا' شعائر و مناسک ادا کرنا' قربانی کی سنت ابراہیمی کو تازہ کرنا' انبیاءؑ کی تاریخ کے نقوش اور برکات سے بہرہ اندوز ہونا' دنیا بھر

سے آنے والے نظریہ حق کے علمبرداروں اور اسلامی نظام اخوت کے رفقاء سے رابطہ پیدا کرنا' اور ہر طرف سے منہ موڑ کر کامل عاجزی کے ساتھ اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینا فرض ہے۔ فرضیت حج کا یہ حکم ۹ ھ میں نازل ہوا۔

حضورؐ نے اسی سال حضرت ابوبکر صدیق کو امیر حج بنا کر تین سو رفقاء کے ساتھ مکہ روانہ فرمایا کہ وہ ان کو اپنی امارت میں حج ادا کرائیں۔ برسبیل تذکرہ اس حج کے بارے میں چند اہم باتیں درج کی جاتی ہیں۔ کیونکہ دینی اور سیاسی دونوں لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت تحریک اسلامی کی تاریخ میں ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امارت کے ساتھ حضرت علیؓ کو ایک دوسری ذمہ داری سونپی کہ وہ سورہ التوبہ (پہلی ۴۰ آیات) حج کے اجتماع میں سنائیں اور حکم خداوندی کے مطابق ضروری اعلانات لوگوں تک پہنچا دیں۔ قابل اعلان امور یہ تھے۔ کہ ایک تو سابق جاہلانہ شرک پر قائم رہ کر جن لوگوں نے حضورؐ یا اسلامی ریاست سے معاہدہ کر کے مفادات محفوظ کر رکھے تھے۔ ان کے سامنے اعلان کر دیا گیا کہ چار ماہ کی مہلت ہے۔ اس کے بعد تمام ایسے معاہدات بحکم خداوندی کالعدم ہو جائیں گے۔ اس دوران میں وہ اپنے لیے راہ عمل طور طے کر لیں کہ آیا ان کو اس ریاست کی شہریت ترک کر دینی ہے یا جنگ کرنی ہے یا پھر اسلامی ریاست کے اندر بہ حیثیت مسلم کے رہنا ہے۔ یعنی اب ریاست در ریاست کا کوئی موقع نہ تھا۔ اور اسلامی حکومت اپنے حدود میں خود مختاری کے جزیرے قائم رکھ کر اپنے تقاضے پورے نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے معاہدات کو ختم کرتے ہوئے بھی برسرعام اعلان کرایا جانا ضرور ہوا اور پھر چار مہینے کی کافی مہلت دوسرے فریقوں کو دی گئی۔ یہ رعایت بھی دی گئی کہ اگر کوئی مشرک اس مدت میں مدینے آکر اسلام کو سمجھنا چاہے تو اس کو بحفاظت آنے جانے کا موقع ہو گا۔ پھر مشرکین میں سے بھی ان لوگوں کو الگ رعایت دی گئی جنہوں نے دیانت داری سے ایفاء عہد کیا تھا۔ ان کے معاہدات کو ان کی مقررہ مدتوں تک کے لیے بحال رکھا گیا۔ اصل زد ان مشرکین پر تھی جنہوں نے اسلام کے مخالف دشمنی اور جنگ کے خوف ناک محاذ بنائے۔ تصادم کرتے ہوئے ساری اخلاقی حدیں توڑ دیں۔ پھر قول و قرار سے بار بار پھرے اور ہر قسم کے لحاظ و مروت کو بالائے طاق رکھ دیتے رہے۔ یہ وہ مشرک تھے جنہوں نے راہ حق کو روکنا چاہا۔ جنہوں نے دین حق میں عیب نکالے۔ جنہوں نے رسول پاک ﷺ کو گھر سے نکالنے کے منصوبے باندھے اور جنہوں نے جنگ و جدل میں پہل کی۔ دوسرا اعلان یہ کیا گیا کہ آئندہ حرم پاک اور مساجد کی تولیت کسی مشرک کو نہ سونپی جائے گی۔ تیسرا اعلان یہ تھا کہ آئندہ کوئی مشرک حدود حرم میں داخل نہ ہو۔ اسی ضمن میں حضرت علیؓ نے حضورؐ کی یہ توضیح بھی پہنچا دی کہ اب سے کوئی شخص سابق مشرکانہ طریق پر عریاں ہو کر طواف کعبہ نہیں کر سکے گا۔ چوتھا اعلان خدا کی طرف سے چار مہینوں کی حرمت کے ثابت ہونے کا کیا گیا۔ اور ان مہینوں میں من مانی تبدیلیاں کرنے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ سلسلہ کلام میں یہ حقیقت پوری طرح کھول کر سنا دی گئی کہ خدا نے اپنے رسولؐ کو اس لیے بھیجا ہے کہ وہ اس دین حق کے نظام کو زندگی کے تمام گوشوں پر پوری

طرح غالب کر دے اور یہ کام اسے مشرکین کی ناگواری کے علی الرغم سرانجام دینا ہے۔

بعض لوگ حضرت علیؓ کی اس ماموریت سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں۔ حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ حضورؐ نے جہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دائرہ امارت میں اپنا نائب بنایا تھا۔ وہاں حضرت علیؓ کو ذاتی نمائندہ، مخصی سیکرٹری یا بطور سفیر خصوصی ایک اہم دینی و سیاسی اعلان کے لیے مامور کیا تھا۔ جن لوگوں کی نظر حکومت کے معاملات پر ہے وہ جانتے ہیں کہ بعض صورتوں میں یہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ حکومتوں کے وائسرائے یا گورنر موجود ہوتے ہیں۔ مگر کسی خصوصی ضرورت کے لیے الگ سے سفیر روانہ کرنے پڑتے ہیں۔

اب ہم اس عظیم الشان اجتماع حج کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں محسن انسانیتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ اور جس میں اسلامی تحریک کی انسانی قوت کا ایک سمندر حضورؐ کی نگاہوں کے سامنے موجزن ہوا۔ ۱۰ھ میں جب حضورؐ نے حج کا ارادہ باندھا تو تمام علاقوں میں اس کی اطلاع بھیج دی گئی۔ اسلامی انقلاب کے علمبرداروں کے قافلے ہر طرف سے مدینہ میں اکٹھے ہونے لگے۔ بندگان الٰہی کا یہ قافلہ چلا تو راستے میں بھی مختلف قبائل کی جماعتیں آ آ کر اس دریائے رواں میں شامل ہوتی گئیں۔ ازواج مطہرات سب کی سب حضورؐ کے ساتھ تھیں۔ حضورؐ نے ذو الحلیفہ سے احرام باندھا۔ اور پھر یہیں سے وہ پکار بلند کی جو بارگاہ الٰہی میں حاضری دینے والے حجاج کی روحوں کی صدا ہوتی ہے۔

لبیک اللھم لبیک........!

> "ہم حاضر ہیں! اے ہمارے اللہ! ہم حاضر ہیں! تیرا کوئی شریک نہیں۔ ہم تیری بارگاہ میں حاضر ہیں۔ حمد تیرے لیے ہے۔ نعمت تیرے قبضے میں ہے۔ بادشاہی تیری ہے تیرا کوئی شریک نہیں"۔

پھر راستے بھر جب بھی کسی ٹیلہ سے چڑھنے اترنے کا موقع آیا۔ تو بار بار حضورؐ کی معیت میں ان مخلص موحدین کا کارواں صدا بلند کرتا........ "ہم حاضر ہیں" .... "اے اللہ تو ہی بڑا ہے"!

مکہ کے قریب جا کر ذی طویٰ میں کچھ دیر قیام فرمایا۔ پھر اس کثیر التعداد مسلم جماعت کو ساتھ لیے ہوئے مکہ کی بالائی جانب سے داخل ہوئے۔ طواف کیا۔ صفا و مروہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے کعبہ کی طرف رخ کر کے خدا کی توحید کی پکار پھر بلند کی۔ نویں ذوالحجہ کو وادی نمرہ میں اترے۔ دن ڈھلنے کے بعد عرفات تشریف لے گئے۔ پہاڑی پر چڑھ کر قصواء نامی اونٹنی پر سوار ہو کر خطبہ نشر فرمایا۔ چاروں طرف مکبر کھڑے تھے جو ایک ایک جملہ کو دہراتے جاتے تھے اور اس تدبیر سے حضورؐ کے ارشادات سارے مجمع کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔

غور کیجئے۔ کیا سماں ہو گا۔ نبی اکرم ﷺ کا دل اس منظر کو دیکھ کر کیا کیفیت محسوس کرتا ہو گا۔ آج گویا ساری عمر کی کاشت کاری کے نتیجہ میں ایک فصل پورے جوبن کے ساتھ لہلا رہی تھی۔ ایک لاکھ چوالیس

ہزار یا بعض روایات کے بموجب ایک لاکھ چوبیس ہزار) کا یک آہنگ مجمع زمین پر اپنی مثال آپ تھا۔ جماعت کے لوگوں کی آنکھیں جب اس محبوب ہستی کو پہاڑی کی بلندیوں پر اتنے مجمع کثیر کے درمیان دیکھتی ہوں گی تو ان کے دلوں کی پرواز کہاں تک نہ ہو رہی ہو گی۔

اسلامی تحریک کا بین الانسانی منشور:

نبی اکرم ﷺ نے دو خطبے اس موقع پر دیئے۔ پہلا عرفات کی پہاڑی سے ۹ ذی الحجہ کو' دوسرا ۱۰ ذی الحجہ کو منا میں۔ ان خطبوں کے بعض مضامین روایات میں باہم دگر مل جل گئے ہیں۔

یہ خطبات کئی حیثیتوں سے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اولاً حضورؐ نے جماعت کے سب سے بڑے دینی اجتماع میں خطاب فرمایا اور ایسے دور میں فرمایا جب کہ آپ کا پیش کردہ کلمہ حق تناور درخت بن کر برگ و بار لانے لگا تھا۔ شدید مخالفتوں سے گزر کر اتنی عظیم کامیابی بجائے خود سیرت و کردار کا ایک امتحان ہوتی ہے۔ اگر اس موقع پر کوئی دنیا پرست شخصیت ہوتی اور محض ایک سیاسی بازی کھیلنے والی کوئی فاتح طاقت ہوتی تو عیش و عشرت کے اسباب جمع کر کے ان سے حصول لذت کے علاوہ آج اس کے سر میں غرور کی ایسی ہوا بھر جاتی کہ وہ اپنی خدائی جتانے اور اپنی بڑائی کا کلمہ بلند کرنے پر اتر آتا۔ حضورؐ کے بجائے کوئی دوسرا نفسانیت زدہ شخص اس مقام پر پہنچتا تو مذہبیت کا سارا جھوٹا ملمع اتر جاتا اور کامیابی کی اس منزل میں اس کی روح پنہاں بے نقاب ہو جاتی۔ مگر یہاں پہلے سے بڑھ کر عجز تھا اور پہلے سے زیدہ خدا کے لیے حمد و شکر کے ترانے تھے۔ ثانیاً چونکہ حضورؐ کی فراست نبوت سمجھ رہی تھی کہ جماعت سے خطاب کا یہ آخری موقع ہے۔ اس لیے گویا الوداعی وصیتیں فرمائیں جن کا ہر ہر لفظ بیش قیمت ہے۔ ثالثاً ملکی کام کے اس تکمیلی مرحلے پر آجانے کے بعد یہی موقع تھا کہ تحریک اسلامی کی طرف سے انسانیت کے نام کوئی پیغام اور کوئی منشور دیا جاتا۔ سو آپؐ نے اس فریضے کو باحسن وجوہ ادا کیا۔ رابعاً یہ خطبے حضورؐ کے کمال خطابت اور آپؐ کی شان فصاحت کے بھی نادر نمونے ہیں۔ اور ان کے ذریعے اس مقدس شخصیت کی عظمتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ پیش نظر رہے کہ ان خطبوں کا ایک حصہ مخصوص ملکی حالات و مسائل سے متعلق ہے اور ایک حصہ بین الانسانی منشور پر مشتمل ہے۔ نفس مضمون خود ہی اس تقسیم کو واضح کر دے گا۔

خطبہ عرفات:

----- تمام تعریفیں صرف اللہ ہی کے لیے ہیں۔ ہم اسی کی حمد کرتے ہیں۔ اسی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اسی سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ اور اسی کے حضور اظہار ندامت کرتے ہیں۔ ہم اپنے دلوں میں فتنہ انگیزیوں اور اپنے اعمال کی برائیوں کے مقابلے میں اسی کی پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دے اسے کوئی دوسرا گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہی ہدایت کی توفیق نہ دے اسے کوئی راہ

راست پر نہیں چلا سکتا۔

---- اور میں اعلان کرتا ہوں اس حقیقت کا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں اعلان کرتا ہوں اس حقیقت کا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہے۔

---- اللہ کے بندو! میں تم کو اسی کی عبادت کی نصیحت کرتا ہوں اور ترغیب دلاتا ہوں۔

---- میں آغاز کلام اس بات سے کرتا ہوں جو باعث خیر ہے۔

---- اس (تمہید) کے بعد (میں کہتا ہوں کہ) ---- اے لوگو! میری باتیں غور سے سنو۔ میں تم کو وضاحت سے بتاتا ہوں۔ کیونکہ میں ایسا نہیں سمجھتا کہ اس سال کے بعد میں تم سے اس مقام پر ملاقات کر سکوں۔

---- اے لوگو! تمہارے خون اور تمہارے مال تمہارے لیے (باہم دگر) حرام کر دیئے گئے ہیں تا آنکہ تم اپنے رب کے حضور جا کے پیش ہو جاؤ ---- جیسے کہ تمہارے اس مہینے میں اور تمہارے اس شہر میں تمہارا یہ دن حرام ہے۔

---- آگاہ رہو کہ میں نے بات پہنچا دی! اے اللہ تو خود گواہ رہیو!

---- سو جس کسی کے قبضے میں کوئی امانت ہو تو اسے اس کے مالک کو ادا کر دے۔

---- دور جاہلیت کی سودی رقمیں کالعدم کر دی گئیں۔ اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کے سودی مطالبات کو کالعدم کرتا ہوں۔

---- دور جاہلیت کے تمام خونوں کے مطالبات قصاص کالعدم کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں عمار بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کے خون کا مطالبہ ساقط کرتا ہوں ---- دور جاہلیت کے تمام اعزازات اور مناصب کالعدم کیے جاتے ہیں ماسوائے سدانہ (کعبہ کی دیکھ بھال کا شعبہ) اور سقایہ (حاجیوں کے لیے شعبہ آب رسانی) کے۔

---- قتل عمد کا قصاص لیا جائے گا۔ شبہ قتل عمد جو لاٹھی یا پتھر (کی ضرب) سے وقوع میں آئے اس کی دیت سو اونٹ مقرر کی جاتی ہے۔ جو اس میں اضافہ کرے۔ سو وہ اہل جاہلیت میں شامل ہو گا۔

---- اے لوگو! شیطان (نظام حق کے چھا جانے کے بعد) اس بات سے تو ناامید ہو گیا ہے کہ اب تمہاری اس سرزمین میں اس کی عبادت کی جائے گی۔ لیکن وہ اس پر بھی خوش ہو گا کہ اس کے علاوہ ان دوسرے گناہوں میں اس کی اطاعت کی جائے۔ جن کو تم ہلکا سمجھتے ہو۔

---- اے لوگو! مہینوں (یعنی حرام مہینوں) کا ادل بدل کفر کے طرز عمل میں اضافہ ہے۔ اور اس کے ذریعے کفار اور زیادہ گمراہی میں پڑتے ہیں کہ ایک سال کسی مہینے کو حلال کر دیتے ہیں اور دوسرے سال حرام ٹھہرا لیتے ہیں۔ تا کہ (آگے پیچھے کر کے) خدا کے حرام کردہ مہینوں کی فقط گنتی پوری کر دیں۔

یقیناً آج زمانہ پھر پھرا کر اسی حالت پر آگیا ہے۔ جو اس وقت تھی۔ جب کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ یعنی اللہ کی بارگاہ میں مہینوں کی تعداد قطعی طور پر بارہ ہے۔ اور جب سے اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے یہ تعداد اس کی کتاب (نوشتہ تقدیر) میں اسی طرح ثبت ہے۔ ان میں چار مہینے حرام ہیں --- تین متواتر' یعنی ذو قعدہ' ذی الحجہ اور محرم' اور ایک اکیلا الگ' یعنی رجب جو جمادی الاخری اور شعبان کے درمیان ہے۔

----- آگاہ رہو کہ میں نے بات پہنچا دی اے اللہ تو خود بھی گواہ رہیو!!

----- اے لوگو! تمہاری خواتین کو تمہارے مقابلے میں کچھ حقوق دیے گئے ہیں۔ اور تمہیں ان کے مقابلے میں حقوق دیے گئے ہیں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ تمہاری خواب گاہوں میں تمہارے علاوہ کسی کو نہ آنے دیں۔ اور کسی ایسے شخص کو (گھر میں) تمہاری اجازت کے بغیر داخل نہ ہونے دیں جس کا داخل ہونا تمہیں پسند نہ ہو۔ اور کسی بے حیائی کا ارتکاب نہ کریں۔ اگر وہ کوئی ایسی بات کریں تو تم کو اللہ نے اجازت دی ہے کہ (ان کی اصلاح کے لیے) ان کو جدا کر سکتے ہو۔ خوابگاہوں سے الگ کر سکتے ہو۔ اور ایسی بدنی سزا دے سکتے ہو جو نشان ڈالنے والی نہ ہو۔ پھر اگر وہ باز آجائیں اور تمہاری اطاعت میں چلیں تو قاعدے کے مطابق ان کا نان و نفقہ تمہارے ذمہ ہے۔ یقیناً خواتین تمہارے زیر نگین ہیں جو اپنے لیے بطور خود کچھ نہیں کر سکتیں۔ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر اپنی رفاقت میں لیا ہے۔ اور ان کے جسموں کو اللہ ہی کے قانون کے تحت تصرف میں لیا ہے۔ سو خواتین کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔ اور بھلے طریق سے ان کی تربیت کرو۔

----- آگاہ رہو کہ میں نے بات پہنچا دی۔ اے اللہ تو خود بھی گواہ رہیو!!

----- اے لوگو! مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کسی شخص کے لیے اس کے بھائی کا مال (لینا) اس کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں!

----- آگاہ رہو کہ میں نے بات پہنچا دی۔ اے اللہ! تو خود بھی گواہ رہیو!!

----- سو میرے بعد کہیں (اس اخوت کو ترک کر کے) پھر کافرانہ ڈھنگ اختیار کر کے ایک دوسرے کی گردنیں نہ کاٹنے لگنا۔

----- میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ جب تک اس پر کاربند رہو گے کبھی راہ راست سے نہ ہٹو گے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب"!!

----- "آگاہ رہو کہ میں نے بات پہنچا دی۔ اے اللہ تو خود بھی گواہ رہیو"!!

----- اور تم لوگوں سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا۔ تو اب تم بتاؤ کیا کہو گے؟

لوگوں نے پکار کر کہا: "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے پیغام پہنچا دیا امت کو نصیحت کرنے کا حق ادا کر دیا۔ حقیقت سے سارے پردے اٹھا دیے۔ اور امانت الٰہی کو ہم تک کما حقہ پہنچا دیا"!

----- اے اللہ! تو گواہ رہیو! اے اللہ! تو گواہ رہیو!! اے اللہ! تو گواہ رہیو!!!
----- جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ باتیں غیر حاضر لوگوں تک پہنچا دیں۔ ممکن ہے کہ بعض سامعین کے مقابلے میں بعض غیر حاضر لوگ ان باتوں کو زیادہ اچھی طرح یاد رکھیں اور ان کی حفاظت کریں۔
----- اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے میراث میں سے ہر وارث کے لیے حصہ مقرر کر دیا ہے۔ اور ایک تہائی مال سے زائد کی وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔
----- بچہ اس کا جس کے بستر پر (نکاح میں) تولد ہو اور بدکار کے لیے پتھر!!
----- جس نے اپنے باپ کے بجائے کسی دوسرے کو باپ قرار دیا۔ یا جس غلام نے اپنے آقا کے علاوہ کسی اور کو آقا ظاہر کیا۔ تو ایسے شخص پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی طرف سے لعنت ہے' اس سے (قیامت کے دن) کوئی بدلہ یا عوض قبول نہ ہو گا۔
----- تم پر اللہ کی طرف سے سلامتی ہو۔ اور اس کی رحمتیں نازل ہوں۔

خطبہ منیٰ:

----- اے لوگو! میرے بعد کوئی نیا نبی آنے والا نہیں ہے اور نہ تمہارے بعد کوئی اور امت برپا کی جانے والی ہے۔ پس غور سے سنو اور اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو۔ نماز پنجگانہ قائم کرتے رہو۔ ماہ رمضان کے روزے رکھتے رہو۔ اپنے اموال کی زکوٰۃ دلی رغبت سے ادا کرتے رہو۔ اپنے رب کے حرم پاک کا حج کرتے رہو اور اپنے امراء و حکام کی اطاعت پر کاربند رہو ----- تاکہ اپنے رب کی جنت میں جگہ پا سکو"۔

بین الانسانی منشور ہونے کے لحاظ سے ان خطبوں میں جو کچھ محسنؐ انسانیت نے پیش فرما دیا ہے' انسانی کاوشیں اس سے آگے کچھ سوچ نہیں سکیں۔ بلکہ کوئی دوسرا نظام تمدن وہ معیار انسانیت عملاً پیدا نہیں کر سکا جو اس منشور میں دیا گیا ہے۔ اس میں خدا کی توحید کے انقلابی عقیدے کا اعلان ہے۔ اس کی عبودیت کو نظام حیات کی روح کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مسلمانوں کے لیے ایک دوسرے کے جان و مال محترم ٹھہرائے گئے ہیں اور قتل کا قصاص لینا لازم کر دیا گیا ہے۔ اس میں سود خواری کے جاہلی نظام کو ملیا میٹ کر دینے کا فیصلہ ہے۔ اس میں دور اسلام سے قبل کے انتقامی چکر کو توڑ دیا گیا ہے۔ اس میں جاہلیت کے اعزازات اور مناصب کو ختم کیا گیا ہے۔ اس میں زوجین کے حقوق ہیں۔ اس میں خاندانی نظام کی بنا محکم کی گئی ہے۔ اس میں خواتین کو اللہ کی امانت قرار دے کر ان سے حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے اور ان کے زیر تمکین ہونے کا لحاظ دلایا گیا ہے۔ اس میں دین حق کے علمبرداروں کے درمیان اخوت کا رشتہ لازم قرار دیا گیا ہے۔ کتاب الٰہی کو نظام اسلامی کا ضابطہ اساسی قرار دیا گیا ہے۔ وحدت رب اور وحدت آدم علیہ السلام کی بنا پر وحدت انسانیت کا تصور دیا گیا ہے اور وطنی و نسلی تفریقوں کو بے وقعت بنا دیا گیا ہے اور اس میں عزت و عظمت کا معیار خدا پرستانہ اور متقیانہ کردار کو معین کیا گیا ہے۔

جب کبھی بھی اور جہاں کہیں بھی اسلامی تحریک چلے گی اور نظام حق استوار ہو گا اس کی بنیادیں بہر حال انہی اٹل نظریات و تصورات پر رکھی جائیں گی۔ یہ منشور اسلام کا بنیادی منشور ہے۔ اور اس کی طرف انسانیت کو بلایا جا سکتا ہے۔ ان کلمات حقیقت افروز سے ہٹ کر زندگی کا جو نقشہ بھی بنایا جائے گا وہ غیر اسلامی ہو گا۔ اور کوئی سچا مسلمان اس پر مطمئن اور راضی نہیں ہو سکتا۔ یہی منشور کسوٹی ہے جس پر ہم مسلمان اپنی ہر قیادت کے کارنامے کو پرکھ سکتے ہیں اور اپنی ایک ایک حکومت کے اقدامات کی جانچ کر سکتے ہیں۔ یہ منشور آئینہ ہے جس میں ہمیں اپنے چہرے بھی دکھائی دے سکتے ہیں اور جس میں ہم غیر اسلامی تمدنوں کی حقیقت کا عکس بھی دیکھ سکتے ہیں۔

یہ ہمارے محبوب نبیؐ کا آخری پیغام ہے اور اس میں ہم ہی مخاطب بنائے گئے ہیں۔ اس کی نوعیت پیغمبر پاک کی وصیت کی سی ہے۔ اس کے ایک ایک بول پر حضورؐ نے درد بھرے انداز سے آواز بلند کی ہے کہ میں نے بات پہنچا دی ہے۔ چاہیے کہ اسے پڑھ کر ہماری روحیں چونک جائیں۔ ہمارے جذبے جاگ اٹھیں۔ ہمارے دل دھڑکنے لگیں۔ اور ہم اپنی اب تک کی روش پر نادم ہو کر اور کافرانہ نظاموں کی مرعوبیت کا قلادہ گردنوں سے نکال کر محسن انسانیت کا دامن تھام لیں۔ اس مشن کو لے کے اٹھ کھڑے ہوں جس کی کامیابی کے لیے حضورؐ نے وہ وہ اذیتیں بھگتی ہیں کہ اتنے بڑے صبر اور حلم کی مثال نہیں ملتی۔

حضورؐ نے حج کے تمام ارکان و مناسک باطمینان ادا فرمائے۔ جماعت کے عام لوگوں سے بکثرت میل جول رہا۔ لوگوں نے اس موقعہ پر کثرت سے مسائل پوچھے۔ اور بالآخر طواف وداع کے بعد اس مبارک سفر سے واپسی ہوئی۔

یہ تھا نظام دینی کی تکمیل کا منظر اور یہ تھا اتمام نعمت کا واضح سماں!! ---- یہ سوا ڈیڑھ لاکھ انسانوں کا انبوہ جس رضاکارانہ اور والہانہ جذبہ سے آیا تھا اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہو گی اس بات کی کہ اسلامی تحریک نے اصل معرکہ رائے عام کے میدان میں سر کیا۔ اور قلوب کے اندرون بنے تبدیلی پیدا کر کے باہر کا سارا نقشہ زندگی بدل دیا۔

محسن انسانیتؐ کے بعد:

یہاں تک تو اس کام کا نقشہ ہم نے عرض کیا ہے جو حضورؐ نے اپنی قیادت میں سر انجام دیا۔ اس کے جلد ہی بعد حضورؐ کا وصال ہوا۔ مگر آپؐ کی تربیت دادہ جماعت نے اسے جاری رکھا' اور اسلامی تحریک دس پندرہ برس میں وسیع خطوں میں چھا گئی۔

حجتہ الوداع میں جس انداز سے نبی اکرم ﷺ نے حصہ لیا۔ اپنی جماعت سے جس طرح خطاب فرمایا۔ لوگوں کو جس طرح مختلف تاکیدیں اور وصیتیں کیں وہ سب بتا رہی تھیں کہ حضورؐ اجتماعی طور پر الوداع کہہ رہے ہیں۔ واپسی میں غدیر خم (ایک تالاب) کے پاس پڑاؤ ڈالا اور وہاں پھر ایک خطاب خاص رفقاء سے کیا۔

اس میں وہی الوداعی رنگ اور زیادہ ابھر آیا۔ بول ایسے ہیں کہ ان کو سن کر دلوں پر رقت طاری ہو گئی ہو گی۔ پہلے اپنی محکم سنت کے مطابق خدا کی حمد و ثنا کی۔ پھر فرمایا:

"اس کے بعد (کہنا یہ ہے کہ) اے لوگو! میں بہرحال ایک انسان ہوں۔ شاید جلد ہی میرے پاس خدا کا (بلاوا لے کر) قاصد آپہنچے اور میں لبیک کہوں۔ میں ذمہ داری کے دو بوجھ تمہارے اندر چھوڑے جا رہا ہوں۔ ان میں سے ایک خدا کی کتاب ہے۔ جس میں ضابطہ ہدایت اور روشنی و حکمت ہے سو خدا کی کتاب کو تھام لو۔ اور اسی سے رہنمائی حاصل کرو"۔ (پھر قرآن کی طرف بہت ہی ترغیب و تشویش دلائی) پھر فرمایا۔ "اور دوسرے میرے گھر کے لوگ ہیں اپنے گھر کے لوگوں کے بارے میں میں تمہیں خدا ہی کی یاد دلاتا ہوں"۔

اس خطبہ میں حضورؐ نے ایک تو ان ضلالتوں کا دروازہ بند کیا۔ جو انبیاء کو فوق البشر اور غیر بشر قرار دینے والوں نے پیدا کیں۔ اور جن کی انتہا یہ ہوئی کہ جو ہستیاں خدا کو "لم یلد و لم یولد" کی شان صمدیت کے ساتھ منوانے آئی تھیں' غلو پسندوں نے انہی کو اٹھا کے خدا کی اولاد اور خدائی میں شریک بنا ڈالا۔ نیز ان کو قانون موت سے ماوراء فرض کر کے غیوبیت کے تصورات تراشے اور ان کے لیے حیات جسمانی و عنصری کے دوام کے عقیدے پیدا کیے۔ حضورؐ نے رخصت کا لمحہ آنے سے قبل رفقاء کو آگاہ کر دیا کہ میں انسان ہوں اور انسانوں کی طرح موت کا قانون مجھ پر بھی نافذ ہو گا۔ پھر تاکید یہ فرمائی کہ کتاب الٰہی کو اساسی ضابطہ حیات کی حیثیت سے قائم رکھنا' اسی سے رہنمائی لے کر زندگی کا نظام چلانا۔ یہ تم لوگوں کے لیے بہت بوجھل ذمہ داری ہے۔ اس لیے اس ذمہ داری کا اچھی طرح احساس کرو۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنے اہل و عیال' اپنے گھر والوں اور اپنے ان قریبی عزیزوں کے بارے میں بغیر کسی صراحت کے توجہ دلائی کہ ان سے متعلق بھی تم پر کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ ایک طرف حضورؐ کے اہل و عیال' آپؐ کی نجی زندگی کے شاہد اور آپؐ کے معمولات کو قریب سے دیکھنے والے اور آپؐ کی تعلیمات کے پوری طرح امانت دار تھے۔ اور اس لحاظ سے وہ امت کے لیے ایک قیمتی ذریعہ تعلیم تھے۔ دوسری طرف حضورؐ نے نہ ان کے لیے خزانے جمع کیے۔ نہ میراث سمیٹی۔ نہ جائیداد بنائی بلکہ زندگی میں بھی ان کو درویشانہ معاشرت سے گزارا۔ اور ان کا مستقبل بھی بغیر کسی سرو سامان کے اللہ کے حوالے کر دیا۔ ظاہر بات ہے کہ حضورؐ کے بعد ان کے بارے میں جماعت پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ مگر حضورؐ کو فقر غیور نے اجازت نہ دی۔ کہ بات اشارے سے آگے جائے۔

اسی خطبے میں یا اس کے بعد جماعت سے ایک بات اور بھی حضورؐ نے فرمائی جس کے لیے ایک غیر معمولی ضرورت داعی ہوئی تھی۔ قصہ یوں ہوا کہ جو حضرات صحابہ جناب علی مرتضیٰؓ کے ساتھ یمن بھیجے گئے تھے۔ کسی بات پر ان کا حضرت علیؓ سے کھچاؤ ہو گیا۔ درحقیقت بڑے بڑے کام کرنے کے دوران میں مزاجوں کے فرق کے ساتھ رایوں کے اختلاف کے بہت ہی سخت مواقع آتے ہیں۔ کبھی بحثوں میں تلخی بھی

آجاتی ہے اور اس کی وجہ سے دلوں پر کچھ دیر کے لیے تکدر بھی رہ جاتا ہے۔ انسانوں سے بنی ہوئی جماعتیں چاہے وہ خالص دینی خدمات کے لیے بنی ہوں اور چاہے ان کی قیادت پر انبیاءؑ جیسی منتخب روزگار ہستیاں کیوں نہ موجود ہوں' یہ ممکن نہیں ہے کہ انسانی فطرت اپنے گوناگوں داعیات و محرکات سے خالی ہو کر بالکل سپاٹ بن جائے۔ اختلافات آراء کی نیرنگیاں اور جذبات کے مد و جزر بہترین اور صالح ترین معاشروں میں بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اسی لیے بڑے بڑے کام وہی عالی ظرف لوگ انجام دے سکتے ہیں جو ناگواریوں کے باوجود ایک دوسرے سے سازگاری کر سکیں۔ ناگواریاں صحابہ کرام کی جماعت میں کبھی کبھار ابھریں۔ مگر یہ انہی ہستیوں کے ظرف تھے کہ پھر بھی ان میں سازگاری قائم رہی۔ اور تکدر آیا تو عارضی نوعیت کا آیا۔ کچھ ایسی ہی صورت اس معاملہ میں بھی پیش آئی تھی۔ خصوصاً حضرت بریدہؓ کے دل پر اختلاف کا اثر اتنا شدید تھا کہ انہوں نے بارگاہ رسالت میں شکایت کر دی۔ مگر حضرت علیؓ جیسی درجہ اول کی شخصیت کے بارے میں شکایت کا پیدا ہونا' دیر تک قائم رہنا' پرورش پانا' ذاتی رنج میں بدل جانا اور پھر حضورؐ کے سامنے پیش بھی ہونا ذرا سخت نوعیت رکھتا تھا۔ سن کر حضورؐ کو دلی اذیت ہوئی اور چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس پس منظر کے ساتھ آپؐ نے اپنے معمول کے مطابق کسی کا نام لیے بغیر جماعت سے فرمایا:

> جس کا میں رفیق ہوں' علیؓ بھی اس کا رفیق ہے۔ اے اللہ! جو علیؓ کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو علیؓ سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ"!

بڑی صاف بات تھی کہ حضورؐ جس پاک تحریک میں تن من دھن لگائے بیٹھے تھے عین اسی میں حضرت علیؓ نے بھی متاعِ حیات کی بازی لگا رکھی تھی۔ ایک ہی دعوت کے داعی' ایک ہی مشن کے علمبردار' ایک ہی ذہن سے سوچنے والے' ایک ہی رخ پر چلنے والے ---- اور پھر وہ باہم دگر ایسے عزیز و قریبی بھی کہ دونوں کے درمیان پانی نہ گزر سکتا ہو ---- کیسے اس بات کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ دونوں میں سے ایک سے تو محبت رکھی جائے اور دوسرے سے تکدر ہو۔ ٹھیک وہی دلیل جو مشہور پنجابی کہاوت "ماں دی سوکن' دھی دی سہیلی" ❶ میں پائی جاتی ہے۔ وہی تو حضورؐ اور آپؐ کے قریب ترین تربیت یافتہ صحابیوں کے بارے میں پائی جاتی ہے۔ آخر وہ پوری جماعت جو عقیدہ' اصول اور مقصد کے رشتہ اخوت میں پروئی ہوئی تھی اور پھر اس میں سے وہ صف اول جسے حضورؐ نے اپنے گرد جمع کر کے قیادت کے لیے تربیت خاص دی جاتی تھی۔ اس میں تفریق کر کے کسی کے ساتھ محبت اور کسی کے ساتھ رنج رکھنے کا موقع کیسے نکل سکتا تھا۔ حضورؐ کو اذیت اس بات سے ہوئی کہ جس جماعت کو آپؐ نے برسوں تربیت دی تھی اگر اس میں جذبہ اخوت کی اساسی قدر ہی اتنی کمزور رہے کہ اس کے بہترین اور ممتاز افراد سے رنجشیں رکھی جانے لگیں'

---

❶ ضرورتاً پنجابی کی ایک کہاوت کو استعمال کیا گیا ہے جو خوبی سے چسپاں ہوتی ہے اور مدعا کو واضح کرتی ہے۔ (مؤلف)

نیز راویوں کا اختلاف ذاتی کدورتوں پر منتج ہونے لگے اور کدورتیں طول کھینچنے لگیں' تو پھر اس عظیم نصب العین کو لے کر آگے کیسے چلا جائے گا۔ حضورؐ کو اپنا وقت رحلت قریب دکھائی دے رہا تھا۔ اور آپؐ اسی کاوش میں تھے کہ اب سارا بارِ گراں جماعت کے کندھوں پر رکھا جانے والا ہے۔ اور آئندہ جماعت کو حضورؐ کے بجائے قیادت کی اس صف کے پیچھے چلنا ہو گا۔ جس میں حضورؐ نے اپنے معتمد ترین ساتھیوں کو شریک کر کے بڑی لمبی تربیت دی تھی اور جس کے ایک ایک فرد سے حضورؐ کو دلی محبت تھی۔ بنا بریں آپؐ نے بڑے سخت انداز میں تنبیہہ کی۔ لوگوں نے نہ جانے اس میں سے کیسے جانشین کی نامزدگی کا فلسفہ برآمد کر لیا۔

ضمناً یہ بات چل نکلی۔ ورنہ ہمارا اصل منشاء یہ دکھانا تھا" کہ حضورؐ پر حجتہ الوداع کے پورے سفر میں یہ احساس طاری رہا کہ اب ادھر کا بلاوا جلد آنے والا ہے۔ اسی تاثر کے ساتھ آپؐ مختلف تاکیدیں اور وصیتیں فرماتے رہے۔

ماہ صفر ۱۱ھ کے آغاز ہی سے سفر آخرت کے لیے محسن انسانیتؐ کی روح پاک نے تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک روز احد تشریف لے گئے اور شہدائے احد کے لیے سربسجود ہو کر دعا کی۔ واپس آکر حسب ذیل کا خطبہ دیا۔

"لوگو! میں تم سے پہلے رخصت ہونے والا ہوں۔ اور خدا کے سامنے تمہارے متعلق شہادت دینے والا ہوں۔ واللہ! میں حوض کوثر کو یہاں سے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے سلطنتوں کے خزانوں کی کنجیاں تفویض کر دی گئی ہیں (یعنی مختلف ممالک دعوت حق کے نتیجے میں فتح ہونے والے ہیں) مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ تم میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے۔ ڈر یہ ہے" کہ دنیوی مفاد کی کشمکش میں نہ پڑ جاؤ۔"

پھر آدھی رات کو گورستان بقیع میں جا کر اہل قبور کے لیے دعاء مغفرت فرمائی اور فرمایا کہ "ہم بھی جلد ہی تم سے آملنے والے ہیں"۔ پھر ایک روز بطور خاص رفقائے جماعت کو جمع کیا اور خطاب فرمایا کہ:

"مرحبا! اے مسلمانو! اللہ تمہیں اپنی رحمت میں رکھے۔ تمہاری شکستہ دلی دور فرمائے۔ تمہیں رزق دے' تمہاری مدد کرے' تمہیں عروج دے' تمہیں باامن و امان رکھے۔ میں تم کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔ اور تم کو اللہ ہی کی نگرانی میں سونپتا ہوں' تم کو اسی سے ڈراتا ہوں کیونکہ میں کھلا کھلا متنبہ کرنے والا ہوں۔ دیکھو' اللہ کی بستیوں میں اس کے بندوں کے درمیان تکبر اور سرکشی کی روش اختیار نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اور تمہیں فرمایا ہے (آیت "تلک الدار الاخرۃ ......" الخ القصص۔ ۸۳ تلاوت فرمائی) کہ یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے خاص کریں گے۔ جو زمین میں سرکشی اور فساد مچانے کی نیت نہ رکھتے ہوں۔ اور عاقبت (کی کامیابی) تو ہے ہی متقین کے لیے! ..... سلام ہو تم سب پر اور ان سارے لوگوں پر

جو اسلام قبول کر کے میری بیعت میں داخل ہوں گے"۔

گورستان بقیع سے واپسی پر ہی ہلکا ہلکا درد سر شروع ہوا۔ پھر صفر کی انتیسویں تاریخ کو ایک جنازہ کے ساتھ جاتے آتے ہوئے اس میں شدت آئی۔ مرض کے ابتدائی ہلکے حملے کے دوران میں گیارہ روز تک مسجد میں تشریف لا کر خود ہی نماز کی امامت فرماتے رہے۔ شدت مرض میں گھر کے اندر بالکل صاحب فراش رہنے کی مدت ایک ہی ہفتہ ہے۔ تکلیف بڑھنے پر ازواج سے اجازت لے کر حضرت عائشہؓ ہی کے حجرے میں آ گئے۔

مرض الموت میں بھی تحریک حق کی ذمہ داریاں پوری طرح سامنے رہیں۔ تبوک اور موتہ کے معرکے حصول مقصد کے لحاظ سے ابھی تکمیل طلب تھے۔ اگر ذرا بھی ڈھیل برتی جاتی تو مخالف سلطنت شیر ہو جاتی۔ اس لیے اسی حالت میں بتاریخ ۲۶ صفر لوگوں کو غزوہ روم کی تیاری کا حکم دیا اور دوسرے دن حضرت اسامہؓ بن زید کو اس مہم کا افسر اعلیٰ مقرر فرما دیا' فرمایا۔ جاؤ اللہ کے نام سے ------ اپنے باپ کے مقام شہادت تک پہنچو۔ اور جو خدا کا انکار کرے۔ اس پر حملہ کرو۔ اپنے ہاتھوں سے علم تیار فرما کر بریدہؓ بن خصیب اسلمی کو سونپا۔ دو ایک آدمیوں نے حضرت اسامہؓ کی کم عمری (اور کچھ خاندانی مرتبے) کی بناء پر چہ میگوئیاں کیں کہ ایسے ایک لڑکے کو بڑے بڑے مہاجرین و انصار پر امیر کیوں مقرر کیا گیا ہے۔ حضورؐ نے سنا تو سخت رنجیدہ ہوئے اور سخت تکلیف کے باوجود سر پر پٹی باندھ کر مسجد میں تشریف لائے۔ اور ٹھیک غدیر خم کے سے انداز میں خطاب کیا کہ:

"مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے اسامہؓ کے متعلق ایسی ایسی باتیں کہی ہیں۔ اس سے پہلے اسکے باپ کے امیر مقرر ہونے پر بھی تم لوگ اعتراض اٹھا چکے ہو---- حالانکہ خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا۔ اور اسکے بعد اس کا بیٹا بھی اسکا اہل ہے۔ وہ (زید بن حارثہؓ) بھی ہم کو سب سے زیادہ محبوب تھا۔ اور اسکے بعد اسکا بیٹا (اسامہؓ بن زید) بھی ہمیں سب سے زیادہ محبوب ہے"۔

اس سے قبل (وفات سے پانچ یوم پہلے) سات مشک پانی ڈلوایا۔ اس غسل سے طبیعت ذرا ہلکی ہوئی تو سہارا لے کر مسجد میں تشریف لے گئے اور وہاں مقصد کے ساتھیوں سے آخری خطاب فرمایا:

"تم سے پہلے ایسے لوگ گزرے ہیں۔ جنھوں نے انبیاءؑ و صلحاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔ تم ایسا نہ کرنا۔ میری قبر کو میرے بعد سجدہ گاہ نہ بنا لینا۔ اس گروہ پر اللہ کا سخت غضب مقدر ہوا جس نے قبور انبیاءؑ کو سجدہ گاہ بنا دیا۔ میں تمہیں اس سے منع کر رہا ہوں۔ دیکھو' میں نے بات پہنچا دی۔ الٰہی تو خود اس کا گواہ ہے"۔

پھر نماز پڑھائی اور نماز کے بعد پھر فرمایا:

"میں تم کو انصار کے حق میں خاص تاکید کرتا ہوں۔ یہ لوگ میرے جسم کے پیرہن اور میرے لیے زاد راہ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے حصے کی ذمہ داریاں پوری کر دیں اور اب (تم پر)

ان کے حقوق باقی ہیں۔ دوسرے لوگ پھیلیں گے اور یہ جوں کے توں ہی رہ جائیں گے۔ ان میں سے اچھا کام کرنے والوں کی قدر کرو اور لغزش کرنے والوں سے درگزر کرو۔

خدا نے اپنے بندے کو اختیار دیا۔ کہ وہ چاہے تو دنیا و مافیہا کو قبول کرلے اور چاہے تو وہ کچھ قبول کرے جو خدا کی بارگاہ میں ہے تو اس بندے نے وہی کچھ انتخاب کرلیا جو اس کے لیے خدا کی بارگاہ میں ہے۔"

یوں تو اس زمانے کی ساری گفتگوؤں میں الوداعی رنگ جھلک رہا تھا۔ لیکن آخری فقرے میں اشارہ بڑا ہی صریح تھا۔ جسے حضرت ابوبکر صدیقؓ فوراً پا گئے۔ اور زار و قطار رونے لگے۔

نماز کی جماعت میں شرکت سے جب معذوری ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ کو اپنی جگہ امامت پر مامور فرما دیا۔ مرض کی شدت بڑھنے سے جماعت میں اضطراب بڑھتا گیا۔ اور لوگ پریشانی میں بار بار مسجد کا چکر لگاتے۔ تسکین دہانی کے لیے حضورؐ حضرت علیؓ اور حضرت فضل ابن عباسؓ کے کندھوں کا سہارا لے کر پاؤں گھسیٹتے ہوئے مسجد میں تشریف لائے۔ اور منبر سے نچلے زینے پر بیٹھ کر بالکل آخری خطاب یہ فرمایا کہ:

"لوگو! مجھے خبر ملی ہے۔ کہ تم میری موت سے ڈرتے ہو۔ جتنے بھی انبیاءؑ مبعوث ہو چکے ہیں کیا کوئی بھی ان میں سے ہمیشہ زندہ رہا۔ میں خدا سے ملنے والا ہوں۔ اور تم بھی خدا سے ملنے والے ہو۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ مہاجرین اولین کے ساتھ بھلائی کرو۔ اور میں وصیت کرتا ہوں کہ مہاجرین آپس میں حسن سلوک کریں"۔ پھر سورہ عصر پڑھ کر فرمایا: "تمام معاملات خدا کے حکم پر چلتے ہیں۔ جس کام میں تاخیر ہو اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ کسی کی عجلت پسندی کی وجہ سے خدا جلدی نہیں کرتا۔ اور میں وصیت کرتا ہوں کہ انصار کے ساتھ بھلائی کرو۔ انہوں نے تم سے پہلے مدینہ کو اپنا وطن بنایا اور ایمان کو اپنے اوپر لازم کرلیا۔ کیا انہوں نے پھلوں میں تم کو اپنا شریک نہ بنایا؟ کیا انہوں نے تمہاری خاطر مکانوں میں وسعت نہ دی؟ کیا انہوں نے باوجود احتیاج کے تم کو اپنے آپ پر ترجیح نہ دی؟ دیکھو اپنے آپ کو ان پر ترجیح نہ دو۔ سنو کہ میں پہلے جاتا ہوں اور تم بھی مجھ سے آملو گے۔ حوض پر ملنے کا وعدہ ہے"۔

ان خطبات کو مختلف روایات میں مختلف اوقات سے متعلق کیا گیا ہے۔ مگر ایک رائے یہ بھی پائی جاتی ہے اور شاید امر واقعہ یہی ہو کہ یہ ساری باتیں ایک ہی خطبہ میں کہی گئی ہیں۔

سوموار کے روز[1] مزاج اقدس نے آخری بار سنبھالا لیا۔ مسواک کی۔ پردہ اٹھا کر صحابہ کی جماعت کو

---

[1] تاریخ کے بارے میں بڑا قابل بحث اختلاف ہے۔ ۱۔ ۲۔ ۱۲: ۱۳ ربیع الاول کی روایات ہیں۔ لیکن ہجری اور عیسوی کیلنڈروں کے لحاظ سے جب دوسرے اہم واقعات کی تاریخوں اور دنوں سے تطبیق دی جاتی ہے تو حسابی پیچیدگیاں سامنے آتی ہیں۔ مشہور عام ۱۲ ربیع الاول ہے۔

دیکھا اور مسکرائے ---- اس کے چند ہی لمحوں بعد "اللھم الرفیق الاعلی" (یانی الرفیق الاعلی) تین بار فرمایا۔ اور حضرت عائشہؓ کی آغوش میں سر رکھے رکھے خدائے حی و قیوم سے جا ملے۔ "آہ! ہم سب کے سب خدا ہی کے مملوک ہیں اور ہمیں بھی پلٹ کر اسی کے حضور جانا ہے"۔

آج وہ ہستی دنیا سے رخصت ہو رہی تھی جس نے انسانیت کو حیات نو سے مالا مال کیا۔ اور جس نے زندگی کے قافلے کو راہزنوں کے نرغے سے نکال کر صراط مستقیم پر ڈالنے کے لیے خوفناک اذیتیں سہیں۔ کشمکش کے سنگین مراحل پار کیے۔ مشکلات کے پہاڑ کاٹنے اور پھر اس کارنامے کا کوئی صلہ وصول نہیں کیا۔

یہ سانحہ کتنا بڑا ہو گا۔ ان رفیقوں کے لیے ---- عمر بھر کے ساتھیوں کے لیے ---- جو حضورؐ کو ایک نظر دیکھنے سے بھی نئی طاقت حاصل کرتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں زمین و آسمان گھوم گئے ہوں گے۔ تاریخ میں زلزلہ آگیا ہو گا! حضرت عثمانؓ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ حضرت علیؓ بے حس و حرکت ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن انیس کا دل ایسا شق ہوا کہ اسی صدمہ سے انتقال کر گئے۔

یہ عظیم صدمہ یوں بھی ایک کوہ غم تھا، مصیبت یہ کہ یہ نہایت ہی خطرناک حالات میں پیش آیا۔ جب کہ ایک طرف رومی حکومت کی طرف سے جنگ کا خطرہ موجود تھا اور اسی لیے جیش اسامہ روانہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف فتنہ ارتداد اور مانعین زکوٰۃ کی شورش تھی۔ تیسری طرف تحریک اسلامی اردگرد کی سلطنتوں کو دعوت دینے کے ساتھ ساتھ ہلکا سا چیلنج بھی دے چکی تھی۔ اور داخلی مشکل یہ کہ نفاق کی دبی ہوئی رو کے ابھر آنے کا اندیشہ تھا۔ مگر حضورؐ کی تربیت کا کمال تھا کہ آپؐ کی تربیت دادہ جماعت نے اپنے جذبات پر فوراً قابو پا لیا۔ اور یاس اور انتشار کا شکار ہونے سے بچ کر اپنی اہم ذمہ داریوں کی انجام دہی کی فکر کی۔ محسنؐ انسانیت جیسی ہستیوں کی وفات پر رنج و غم کرنے سے زیادہ عظیم ذمہ داری جانشینوں پر یہ ہوتی ہے کہ وہ اس تحریک اور نظام کے تحفظ و استحکام کی فکر کریں جس کا شیرازہ ایسے ہی لمحوں پر غفلت اور کوتاہی کرنے سے بکھر بھی سکتا ہے۔ وہ ہستی جو برسوں پورے کام کی روح رواں بنی رہتی ہے۔ اور تمام ساتھیوں کے کامل اعتماد اور گہری محبتوں کا مرکز ہوتی ہے، اس کے اٹھ جانے سے بڑا بھاری خلا اچانک پیدا ہو جاتا ہے۔ جسے اگر بروقت ٹھیک سے نہ بھر لیا جائے تو بڑے خوف ناک نتائج پیش آسکتے ہیں۔ حضورؐ کی تیار کردہ جماعت نے اپنے احساس ذمہ داری اور اپنی مضبوطی کردار کا بے مثال ثبوت اس واقعہ سے پیش کیا کہ فوراً اس خلاء کو بھر لیا۔ اور نظم کے بندھن ڈھیلے نہ پڑنے دیے۔ جانشینی کے لیے کوئی کشمکش نہیں ہوئی۔ تلوار نہیں چلی۔ شور و ہنگامہ نہیں ہوا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں جماعت کے ارباب حل و عقد کے درمیان ایک مختصر سی گفتگو کے بعد ---- جس نے اتنا بھی طول نہیں کھینچا اور جس میں اختلافی رنگ اتنی دیر بھی قائم نہیں رہا جتنا کہ آج معمولی معمولی نوعیت کی انجمنوں کے عہدوں کے لیے ہوتا ہے ---- اسلام کی شورائی جمہوریت کے تحت حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب عمل میں آیا۔ جس کی توثیق مسجد نبویؐ کے اجتماع عام میں پوری جماعت کے عوامی اجتماع نے بشرح صدر کر دی۔

حضورؐ کے بعد حضورؐ کے عظیم دعوتی نصب العین کو پھیلانے اور حضورؐ کی آغاز کردہ مہمات کو تکمیل تک پہنچانے میں جس عزم و بصیرت اور حسن کردار کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زریں خدمات انجام دیں۔ اور جس شان سے حضرت فاروقؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ اور صف قیادت کے دوسرے اکابر صحابہ نے اپنا بھرپور تعاون حضورؐ کے جانشین امیر جماعت کو بہم پہنچایا' اس کی مثالیں انسانیت کے پاس کم ہی ہوں گی۔ محسن انسانیتؐ کے تیار کردہ انسان نے ثابت کر دیا کہ وہ بہترین نمونہ انسانیت ہے۔ وہ بے لوث کردار رکھتا ہے۔ وہ ذہانت و بصیرت میں اپنا نمونہ آپ ہے۔ اور سخت ترین حالات میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہونے والا نہیں۔

چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ حضورؐ کی تربیت دی ہوئی اس جماعت اور اس کی قیادت نے چند ہی برس میں اسلامی تحریک کی شعاعیں دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیں اور اسلامی نظام عدل کا سایہ رحمت جس رفتار سے حضورؐ نے خطہ ارضی پر پھیلایا تھا۔ اس میں قطعاً کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

اللھم صل علی محمد!

دنیا میں اگر آج ہم مسلمانوں کا وجود ہے تو یہ اس ہستی کی جانفشانیوں کے طفیل ہے۔ آج اگر سچائی اور نیکی کا کلمہ ہمارے سینوں میں نور افگن ہے تو یہ اسی مقدس وجود کا فیضان ہے۔ آج اگر زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے ایک اصولی ضابطہ انسانیت کے سامنے موجود ہے تو یہ محمد ﷺ کی جدو جہد کا ثمرہ ہے۔ آج اگر زندگی کا ایک بہترین نمونہ و معیار ہماری نگاہوں کے سامنے پرتو انداز ہے۔ تو یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم ہی کا پیش کردہ ہے۔ آج اگر ہمارے سینوں میں تحریک اسلامی کے احیاء کے ولولے کروٹ لے سکتے ہیں' تو اسی محبوب شخصیت کی قربانیوں کی جذبہ انگیز یاد ہی سے لے سکتے ہیں۔ آج اگر ہم اسلامی انقلاب برپا کرنے کا انداز و اسلوب سیکھ سکتے ہیں تو اسی خدائی رہنما کی کشمکش کی روداد ہی سے سیکھ سکتے ہیں۔ آج اگر ابنائے آدم کو حقیقت کی شعور افزا کرنیں' اخلاق کی لازوال قدریں اور زندگی کی فلاح کے اٹل اصول ہاتھ آسکتے ہیں تو محمد ﷺ کی بارگاہ ہی سے ہاتھ آسکتے ہیں۔ محسنؐ انسانیت جیسا داعی اور معلم اور مربی اور قائد اگر نہ مبعوث ہوا ہوتا تو کبھی وہ کار عظیم اس دور ظلمت و جہل میں سرانجام نہ پا سکتا۔ حضورؐ ہی ہمارے انقلاب کی روح تھے۔

ہمارے لیے اور تمام انسانوں کے لیے محسنؐ انسانیت نے اپنے آپ کو جن زہرہ گداز مخالفتوں کے سامنے کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف کشمکش کرتے ہوئے جان جوکھوں کے جو مراحل طے کیے اور کوئی قیمت وصول کیے بغیر اپنا سب کچھ جس طرح اسلامی نظام کی اقامت میں لگا دیا ـــــــ اور پھر ایک دور تاریخ پیدا کیا۔ ایک پاکیزہ تمدن کو وجود دیا۔ ایک عظیم الشان امت برپا کی۔ افکار و علوم کی نئی دنیائیں پیدا کر دیں۔ اس کارنامے کے لیے ہمارا رونگٹا رونگٹا اپنے اور انسانیت کے محسن اعظم کا ممنون ہے۔ ہمارے بس میں نہیں

کہ اس جذبہ ممنونیت کے مطابق اتنے بڑے احسان کا کسی ادنیٰ درجے میں بھی کوئی بدلہ حضورؐ کو ادا کر سکیں۔ اس لیے اے خداوند برتر ہم عاجز بندے تجھی سے یہ درخواست کرتے ہیں تو ہمارے جذبہ امتنان کو قبول فرما کر اپنے خزانہ رحمت سے ہمارا بدلہ ادا فرما۔ حضورؐ کی روح پر رحمتیں نازل فرما۔ برکات بھیج' سلامتی کی پھواریں برسا' درجات و مراتب کو بلند فرما' حضورؐ کی دعوت' پیغام اور تحریک کو پھر عروج دے' اسے توسیع عطا فرما۔ اور اپنے زیادہ سے زیادہ بندوں کو اسلامی نظام کے سایہ رحمت سے بہرہ مند کر۔ تجھی سے یہ درخواست بھی ہے کہ راقم الحروف کو' اور ایک ایک مسلم بندے کو اس سعادت کی توفیق دے کہ حضورؐ کی دعوت کی مقدس امانت کے سچے امانت دار بنیں۔ اسے بنی نوع انسانی تک پہنچائیں۔ حضورؐ کی جاری کردہ تحریک حق کو پھر ایک زندہ حقیقت بنائیں۔ اور تن من دھن صرف کر کے حضورؐ کے پیش کردہ نظام عدل کو زمین پر استوار کر دیں۔ حضورؐ کے مشن کی تکمیل میں حصہ لینا بھی حضورؐ کی ممنونیت کا بہترین اظہار ہے۔

اللھم صل علی محمد و علی ال محمد و بارک و سلم:

بقیہ مراحل کار

یہ اللہ ہی کا احسان ہے کہ اس نے مجھ جیسے ادنیٰ بندے سے یہ مبارک خدمت لی کہ میں اس اعلیٰ ترین بندے کی سیرت اور کارنامۂ حیات کی ایک جھلک پیش کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس خدمت کی انجام دہی میں میں اپنے فاضل پیش رووں کا بے حد شرمندۂ احسان ہوں کہ جنھوں نے اس موضوع پر نہایت اعلیٰ معیار کی وسیع تصانیف چھوڑی ہیں۔ علاوہ ازیں دور حاضر کے دو اصحاب تحقیق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا بہت ہی زیادہ ممنون ہوں کہ ان کے ہاں سے مجھے وہ خاص تحریک انگیز نقطۂ نظر ہاتھ آیا۔ جس نے سیرت کے بہت سے نئے پہلو میرے سامنے منکشف کیے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین کے سامنے فکر و کاوش کی کچھ نئی راہیں کھل سکیں گی۔ علاوہ ان اصحاب کے میں اپنے ان خاص محبوں کا بار احسان بھی اپنے کندھوں پر محسوس کرتا ہوں جنھوں نے بار بار ہمت افزائی کی۔ اور متواتر مجھے اس خدمت کے لیے اکسایا۔ انہی خاص محبوں میں سے ایک شخصیت اس کتاب کے ناشر کی ہے جو بالکل غیر کاروباری ذہن کے ساتھ بار بار اس کی تکمیل کی تمنائے بے تاب لیے ہوئے مجھ سے ملتے رہے۔ اور راہوار قلم کو رواں کراتے رہے۔ خدا ان سارے بزرگوں اور احباب کو جزائے خیر دے۔

اب تک یہ کام جن حالات میں ہوا ہے وہ بالکل ناگفتنی ہیں۔ کتنی ہی بار اسے ہاتھ میں لیا۔ لیکن چند روز کے کام کے بعد تعطل کے لیے لیے وقفے حائل ہوتے رہے۔ بسا اوقات مہینوں ایک حرف نہیں لکھا جا سکا۔ مگر مسافر شوق تھا کہ جسے بار بار گرنے پر کوئی غیر مرئی طاقت پھر اٹھا دیتی رہی۔ ایک دن یکایک ذہن میں یہ خیال القاء ہوا کہ غالباً اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوئی کہ جس عظیم ہستی کی زندگی کا عکس دنیا کو دکھانے چلے ہو۔ اس کے تجربوں کا سواں ہزارواں حصہ تو تمہیں بھی چکھنا چاہیے۔ ورنہ تحریر میں وہ روح کیسے آئے گی۔ اس خیال نے ارادے کو اتنی مضبوطی دی کہ جب بھی اپنے آپ سے کام لینا ممکن ہوا، ہر طریق سے لیا۔ کتاب کا نصف آخر ایسا ہے کہ جس کا بیشتر حصہ بستر پر لیٹ کر لکھا گیا ہے۔ گویا میں نے اپنی ہستی کو اس کام میں بالکل نچوڑ نچوڑ کر صرف کیا ہے۔ بنا بریں توقع ہے کہ خدا اسے قبول فرمائے گا۔ اور ذریعۂ خیر و فلاح بنائے گا۔ اور خدا کا بغایت شکر گزار ہوں کہ اس نے میری التجا کو شرف قبولیت بخشا۔

کام جو ہو چکا یہ اس سے بہت کم ہے کہ جو مجوزہ خاکہ کے مطابق کرنا باقی ہے۔ غالباً دو تین جلدوں تک پھیلے گا۔ اس وقت درحقیقت ایک ہی طویل بحث پیش کیا ہے جو اپنی جگہ مفصل اس لحاظ سے تو ہے کہ اس میں نبی اکرم ﷺ کی روداد کشمکش بڑی حد تک آگئی ہے مگر یہ دوسرے پہلوؤں سے تشنہ بھی ہے کیونکہ سیرت پاک کے بہت سے اہم گوشوں کو سرے سے اس میں چھیڑا ہی نہیں گیا۔ اس کے سلسلے میں ایک خاکہ سامنے ہے۔ مجوزہ خاکہ پر میں تو کام نہیں کر سکتا' کچھ نئے لوگ شرف حاصل کریں گے۔ خاکہ حسب ذیل ہے:

------ اس جغرافیائی و تمدنی ماحول کی عکاسی جس میں حضورؐ کی بعثت ہوئی۔

------ حضور کے پیغام اور نصب العین کی وضاحت ---- اس حقیقت کی تفصیل کہ آپؐ انسانی زندگی میں کیا بنیادی تبدیلیاں کرنے اٹھے تھے۔ نیز حضورؐ کی دعوت کی نوعیت اور دائرہ کار کیا تھا؟

------ حضورؐ کی قائدانہ بصیرت اور سیاسی حکمت کا مطالعہ۔

------ حضورؐ کی دعوت کے نتیجے میں کیسا انسان تیار ہوا۔

------ خواتین نے کس کس طرح حضورؐ کی جدوجہد میں تعاون کیا۔

------ ایک مستقل جلد میں حضورؐ کے پورے تعمیری کارنامہ کی روداد اس انداز میں پیش کرنے کا پروگرام ہے کہ دور حاضر میں اس سے عملی رہنمائی حاصل کی جاسکے۔ زندگی کے ایک ایک شعبے کو جن نئے اصولوں پر' جس حکمت اور تدریج سے حضورؐ نے استوار کیا۔ اسے متعدد مقالات میں لایا جائے۔ مثلاً الہامی حکمت کی اشاعت۔ معاشرے کے بالغوں اور نئی نسلوں کے لیے نظام تعلیم کی تاسیس' اخلاق عامہ کی تعمیر۔ معاشی اصلاح و ترقی' دفاعی تنظیم اور اس کے استحکامات۔ سیاسی ہیئت کی تشکیل نو' معاشرت اور ثقافت کی تجدید۔ اسلامی نظام عدل کا نفاذ۔ صف قیادت کی تربیت' بین الاقوامی تعلقات کی استواری اور دوسرے مختلف تعمیری اقدامات کو ان کی اصولی روح اور ان کی عملی تدابیر کے ساتھ کھول کر بیان کیا جائے۔

------ حضورؐ کی اسلامی حکومت کی دفاعی اور فوجی کارروائیوں کی تفصیلی روداد

------ ضرورت ہے کہ ایک مستقل جلد میں معترضین کے اعتراضات پر بحث کی جائے۔ نیز واقعات اور شخصیتوں اور اہم تاریخوں کے تعین میں روایات کے جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان پر تحقیقی نظر ڈالی جائے۔

------ سیرت نبویؐ کے ماخذ اور اس موضوع پر اب تک کے علمی کاموں پر کسی قدر ناقدانہ نظر ڈالی جائے۔

------ اردو زبان میں سیرت نگاری کا تحقیقی جائزہ

------ ساتھ کے ساتھ متعدد اہم نقشوں کی تیاری مد نظر رہے جن کو سامنے رکھنے سے واقعات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اس میدان میں کچھ نہ کچھ کام ---- اور خاصا قیمتی کام ---- ہو چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے اور آگے بڑھایا جائے۔ بعید نہیں کہ محسن انسانیت (ﷺ) کی سیرت اور تحریک

اسلامی کے پورے تاریخی دور کے متعلق ایک مستقل اٹلس مرتب ہو جائے۔ کتاب میں شامل ہونے والی متفرق معلومات کو ایک بڑے دیواری نقشہ سیرت میں یکجا کر دینے کی حسرت بھی ہے۔

---- اس کتاب کے تراجم کم سے کم انگریزی۔ عربی۔ بنگلہ اور ہندی میں کرانے کی تمنا ہے اس طرح اس کا دائرۂ اثر وسیع ہو جائے گا۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ ان ارادوں کو جامۂ عمل پہنانے کی راہ نکالے۔ اور اس عظیم کام کے لیے جن حالات و اسباب کی ضرورت ہے وہ اپنے خزانۂ رحمت سے بہم پہنچائے۔

نعیم صدیقی ---- جمعۃ المبارک۔ مارچ ۱۹۶۰ء

نظرثانی ----- چہار شنبہ۔ نومبر ۱۹۹۸

باب : ۷

محسنِ انسانیت ﷺ

واقعاتِ سیرتِ پاک کی ترتیبِ زمانی

ضمیمہ ۱:

واقعاتِ سیرتِ پاک کی ترتیبِ زمانی

کتاب کے اصل مباحث میں جہاں بڑے پیمانے پر فی الجملہ ترتیب زمانی ملحوظ رہی ہے۔ وہاں تفاصیل میں اسے نظرانداز کر کے موضوعات و مباحث کے تحت مختلف زمانوں کا واقعاتی مواد اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ لیکن تاریخ اور سیرت و سوانح کے میدان میں واقعات کی ترتیب زمانی کو بجائے خود بڑی اہمیت حاصل ہے' لہٰذا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ذیل کا نقشہ بطور ضمیمہ شامل کتاب کیا جا رہا ہے۔ اس نقشہ کی بڑی افادیت یہ ہے کہ ایک نظر میں سیرت پاک کے جملہ اہم واقعات سامنے آجاتے ہیں۔

واضح رہے کہ مختلف اہم تاریخوں اور دنوں کے تعین میں حسب ذیل وجوہ سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔

بعثت سے قبل کے واقعات کو عام الفیل یا حضورؐ کے سال میلاد سے بیان کیا جاتا ہے اور ان سالوں کو عیسوی شمسی سال سے تطبیق دی جاتی ہے۔ عام الفیل ۱ء اور سال میلاد ۱ء اگرچہ فی الجملہ منطبق ہیں لیکن عام الفیل کا آغاز واقعہ فیل کے دن (۱۷ محرم بروز جمعرات) سے ہوتا ہے اور سال میلاد سے ۵۰ یا ۵۵ روز (تقریباً دو ماہ بعد) شروع ہوتا ہے' ہر دو سنین کے اس فرق کو مورخین اور راویان یا تو سرے سے نظرانداز کر جاتے ہیں یا یہ واضح نہیں کرتے کہ انہوں نے سال کا کون سا آغاز اختیار کیا ہے۔ پھر ایک طرف سال کا

آغاز ربیع الاول سے ہو رہا ہے اور دوسری طرف مروجہ قمری سال محرم سے محسوب ہوتا ہے۔ اس طرح حسابی الجھنیں بڑھ جاتی ہیں۔ مثلاً اگر میلادی سلسلہ سنین محرم سے شمار کریں تو ہجرت چودھویں میلادی سال میں ہوئی۔ لیکن اگر سال ربیع الاول سے محسوب کریں تو تیرھویں سال میلاد میں ہوئی' مورخین نے دونوں ہی سال لکھے ہیں۔

ہجری تقویم کو باقاعدہ طور پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں (بتاریخ ۲۰ جمادی الاخری ۱۷ھ بروز جمعرات) اختیار کیا۔ اس سے قبل ہجری تقویم نہ تو منضبط تھی اور نہ واقعات کا تعین وقت اس کے مطابق کرنے کا اہتمام تھا۔ چنانچہ صحاح کے دفاتر ہجری تقویم سے بے نیاز ہیں۔ ہجری تقویم کو اختیار کرنے کے بعد سابق واقعات کی ترتیب زمانی اس کے تحت متعین کی جانے لگی۔

پھر ہجرت سے جو قمری سال شروع ہوتا ہے وہ بھی دو طرح محسوب کیا جا سکتا ہے:- ایک یوں کہ ماہ ہجرت (ربیع الاول) سے شمار کریں اور دوسرے یوں کہ سالوں کی گنتی اگرچہ ہجرت کے سال سے کی جائے لیکن سال کی ابتداء قمری سال کے مروجہ ماہ آغاز (محرم) ہی سے کی جائے' یعنی اولین سال ہجرت صرف دس ماہ کا گنا جائے (ربیع الاول تا ذی الحجہ) محدثین' سیرت نگاروں اور تاریخی ماخذ میں سال ہجری کو ان دونوں صورتوں میں لیا گیا ہے۔ لیکن اس امر کی تصریح کم ہی صورتوں میں کی گئی ہے کہ سال کو کس نہج سے محسوب کیا گیا ہے۔

پھر بعض روایات میں تاریخ کے ساتھ جو یوم مذکور ہے ان کا باہمی انطباق نہیں ہوتا۔ دونوں میں سے جس پہلو سے وثوق یا روایات کا اتفاق پایا جاتا ہے اسے بنیاد بنا کر دوسرا پہلو حساب سے طے کیا جاتا ہے۔

سب سے بڑی مشکل تقویموں اور مختلف سلسلہ' سنین کے انطباق سے پیدا ہوتی ہے' کیونکہ ماخذ میں کسی ایک تقویم یا سلسلہ سنین کی پابندی نہیں کی گئی۔ تقویموں کا یہ ہیر پھیر اس وجہ سے بھی بڑھ جاتا ہے کہ متعدد شمسی تقویموں کے علاوہ خود عیسوی تقویمیں بھی دوہری رائج رہ چکی ہیں ---- ایک 'شمسی' دوسری قمری۔ مزید مشکل یہ کہ عیسوی اور دوسری تقویموں کے نظام تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ اب کئی صدی بعد جب تاریخوں اور دنوں کی تطبیق کا حساب لگایا جاتا ہے تو متعدد پہلوؤں سے اختلاف کی راہیں نکل آتی ہیں۔

بعض واقعات اور اقدامات کو زمانی تعین کے ساتھ اہم روایات میں بیان ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ قرآن اور حدیث شریف کے دفاتر کی روشنی میں صرف اتنی ہی بات طے ہو سکتی ہے کہ کوئی واقعہ فلاں واقعہ سے پہلے یا بعد رونما ہوا۔ لیکن متعدد واقعات (مثلاً تیمم کی اجازت' خمر کی حرمت' احکام حجاب کے نفاذ اور بعض غزوات و سرایا یا معاہدات) کے متعلق بلا تعین تاریخ محض سرسری ترتیب زمانی قائم کرنے میں بھی روایات متباین ہیں۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیرت پاک کے جملہ تفصیلی واقعات کی ترتیب زمانی کو قطعی تعین تاریخ کے

ساتھ پیش کرنا مشکل ہے۔ بڑے بڑے محققین جن میں صرف سیرت نگار ہی نہیں، مفسرین، محدثین اور فقہاء سبھی شامل ہیں، بکثرت اختلافات رکھتے ہیں اور ہر نقطہ نظر کے حق میں اور اس کے خلاف لمبی چوڑی مدلل بحثیں موجود ہیں۔

مولف محسن انسانیتؐ نے اپنے مطالعہ کی حد تک ان اختلافات اور تقویمی حسابات میں کاوش کر کے کوئی ایک صورت اس نقشے میں طے کر دی ہے اور اہم اختلافات کو اشارۃً درج کر دیا ہے لیکن نہ تو پورے اختلافی نقطہ ہائے نظر کو یہاں درج کر کے قاری کو پریشان کرنا مناسب تھا اور نہ یہی گنجائش تھی کہ متقدمین اور متاخرین کی تفصیلی بحثیں پیش کی جائیں۔ یہ کام اگر کیا بھی جائے تو بالکل الگ سے کرنے کا ہے۔

اس نقشہ میں ہجرت سے قبل کے واقعات کو یا تو عام الفیل اور سال میلاد کے حساب سے درج کیا گیا ہے یا سال بعثت کے حساب سے۔ کہیں کہیں حضورؐ کی عمر مبارک ہی کو تعین وقت کا پیمانہ بنایا گیا ہے۔

(۱) پیدائش حضور

موسم بہار میں دو شنبہ کے روز (اس دن پر اتفاق ہے)۔ بتاریخ ۹ ربیع الاول ۱ عام الفیل (واقعہ فیل سے ۵۰ روز بعد) مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء، یکم جیٹھ سمت بکرمی بوقت صبح صادق (قبل از طلوع آفتاب) مشہور عام ۱۲ ربیع الاول ہے۔

طبری و ابن خلدون نے ۱۲ ربیع الاول اور ابوالمتداو نے ۱۰ تاریخ کی روایت کی ہے مگر چونکہ دن کے دو شنبہ ہونے پر اتفاق ہے اور دو شنبہ ۹ ہی کو آتا ہے اس لیے محمد طلعت بک عرب (مولف تاریخ دول العرب والاسلام) کی تائید میں قاضی سلیمان منصور پوری (مولف رحمتہ للعالمینؐ) نے تقویموں کے حساب میں عرق ریزی کرتے ہوئے ۹ ہی کے حق میں رائے دی ہے۔ مصر کے مشہور ہیئت دان محمود پاشا نے ریاضیاتی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حضورؐ کا یوم ولادت ۹ ربیع الاول ہے جسے پاشائے موصوف نے ۲۰ اپریل ۵۷۱ء سے مطابقت دی ہے۔ علامہ شبلی نے بھی اسی تحقیق کو قبول کیا ہے۔

۲۲ اپریل کا تعین گریگورین رول کے مطابق ہے جس کے تحت ستمبر ۱۷۵۲ء سے نئی عیسوی تقویم کا حساب چلا۔ قدیم تقویمی قاعدہ کے مطابق اس دن ۱۹ اپریل ۵۲۸۴

سن جولین کی تاریخ متعین ہوئی ہے۔ ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ ولادت حضورؐ واقعہ عام الفیل سے ۵۰ روز بعد ہوئی یا ۵۵ روز بعد۔ بظاہر حساب ۵۰ روز کے حق میں ہے۔

مولانا عبدالرؤف داناپوری (مؤلف اصح السیر) نے ۸ یا ۱۲ ربیع الاول دو تاریخیں لکھی ہیں۔ مگر نہ تو مآخذِ روایت پر گفتگو کی ہے نہ تقویموں کے سلسلہ میں تفحص پیش کیا ہے۔ بعض نے یکم محرم کا تعین بھی کیا ہے اور عیسوی تقسیم کے لحاظ سے ۱۲ اور ۱۵ فروری کی تاریخیں ذکر کی ہیں۔

ابن اسحاق کے نزدیک ربیع الاول کی بارھویں رات گزرنے پر حضورؐ کی ولادت ہوئی۔

ہماری رائے میں محققین کا پلہ ۹ تاریخ کے حق میں بھاری ہے۔

(۲) رضاعت	بہ عمر چار ماہ	پیدائش کے ۲، ۳ روز بعد سے ثوبیہ (جو ابولہب کی کنیز تھی) کا دودھ حضورؐ نے کچھ وقت پیا۔ باقاعدہ دور رضاعت آپؐ نے دائی حلیمہ سعدیہ کے صحرائی گھر میں گزارا۔
(۳) حضورؐ کی والدہ کا انتقال	بہ عمر ۶ سال	
(۴) حضورؐ کے دادا کا انتقال	بہ عمر ۸ سال ۲ ماہ ۱۰ دن	
(۵) پہلا سفر شام (بمعیت جناب ابو طالب)	بہ عمر ۱۲ سال ۲ ماہ	بحیرا راہب کا واقعہ اسی سفر سے متعلق مشہور ہے۔

(۶) حرب فجار میں شرکت بار اول	بہ عمر ۱۵ سال (یا کچھ زائد)	
(۷) حرب فجار میں شرکت بار دوم	کچھ عرصہ بعد، وقت کا تعین نہیں۔	
(۸) حلف الفضول (ایک اصلاحی انجمن) میں شرکت	بہ عمر ۲۰ سال	
(۹) دوسرا سفر شام تاجرانہ حیثیت میں	بہ عمر ۲۳ یا ۲۴ سال	
(۱۰) ازدواج (حضرت خدیجہؓ سے)	بہ عمر ۲۵ سال ۲ ماہ ۱۰ دن	
(۱۱) غیبی اسرار کے ظہور کا آغاز	۷ سال قبل بعثت بہ عمر ۳۳ سال	
(۱۲) تحکیم	بہ عمر ۳۵ سال	تعمیر حرم کے سلسلے میں حجر اسود نصب کرنے پر جھگڑا ہوا، تو سب نے حضورؐ کو امین قرار دیتے ہوئے حَکَم بنایا اور معاملہ بخوبی طے ہو گیا۔
(۱۳) بعثت	بہ عمر ۴۰ سال ۱۱ دن ۹ ربیع الاول ۴۱ سال میلاد مطابق ۱۲ فروری ۶۱۰ء بروز دو شنبہ	اس تاریخ کے تعین میں بھی خاصا اختلاف ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ بہ عمر ۴۰ سال ۶ ماہ ۱۲ دن (قمری تقویم) اور ۳۹ سال ۳ ماہ ۲۰ دن (شمسی تقویم) بعثت کا فرمان حرا میں نازل ہوا۔ چنانچہ بعض نے ۲۵ رمضان اور بعض نے ۱۳ ربیع الاول کی تاریخیں دی ہیں اور عیسوی تقویم کے لحاظ سے ۱۲ فروری کے بالمقابل ۶ اگست ۶۱۰ء کی تاریخ بھی مذکور ہے۔ مگر یہ سارے اختلافات تقویمی حسابات کی پیچیدگی سے پیدا ہوئے ہیں۔ نیز التباس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فرمان

بعثت اور آغاز نزول قرآن کے زمانے روایات میں گڈمڈ ہو گئے ہیں، صاحب زاد المعاد نے ۸ تاریخ لکھی ہے۔ مگر دو شنبہ تقویمی حسابات سے ۹ تاریخ کو پڑتا ہے۔
فرمان بعثت کی صورت یہ ہوئی کہ روح الامین نے غار میں سامنے آکر مخاطب کیا کہ "بشارت قبول فرمایئے! آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبرائیل ہوں۔" اسی واقعہ پر آپؐ کو اضطراب ہوا اور حضرت خدیجہؓ نے تسکین دی۔

(۱۴) فرضیت نماز (فجر و عصر کی دو دو رکعتیں)	۹ ربیع الاول بروز بعثت	
(۱۵) آغاز نزول قرآن	۱۸ رمضان ا سال بعثت بروز جمعہ (بوقت شب) مطابق ۱۷ اگست ۶۱۰ء	اس موقع پر سورہ علق نازل ہوئی۔ طبری نے ۱۷ یا ۱۸ دونوں تاریخیں لکھی ہیں۔ مگر تقویمی حساب سے جمعہ ۱۸ ہی کو آتا ہے۔
(۱۶) خفیہ دعوت کا دور	۱ تا ۳ بعثت	خانہ ارقم مخزومی واقع کوہ صفا تحریک اسلامی کا مرکز بنا اور تقریباً ۴۰ افراد اس دور میں اسلام لائے۔ نماز شہر سے باہر خفیہ طور پر پڑھی جاتی۔
(۱۷) اعلان نبوت (پہلا خطاب عام)	۳ بعثت (اواخر میں)	
(۱۸) مخالفت کا پہلا دور (استہزاء و پروپیگنڈہ اور ہلکا تشدد)	۳ تا ۵ بعثت	اس دور میں ابو طالب پر دباؤ ڈالنے کے لیے قریش کے وفود گفت و شنید کرتے رہے اور مخالفت کے لیے مجالس خاص میں تدابیر سوچی جاتی رہیں۔
(۱۹) شدید مخالفت کا دوسرا دور (عام مظالم)	۵ تا ۷ بعثت	
(۲۰) ہجرت حبشہ	رجب ۴۵ میلاد ۵ بعثت	

(۲۱) حضرت حمزہؓ و حضرت عمرؓ کا قبول اسلام	۶ بعثت	حضرت عمرؓ حضرت حمزہؓ کے تین روز بعد اسلام لائے۔ بقول بعض حضرت حمزہؓ ۲ بعثت میں ایمان لائے۔
(۲۲) حضورؐ کی خاندان بنو ہاشم سمیت نظر بندی (مقاطعہ) شعب ابی طالب میں	یکم محرم ۴۷ میلاد ۷ بعثت بروز سہ شنبہ۔	
(۲۳) مقاطعہ و نظر بندی کا خاتمہ	۹ بعثت کا اواخر یا ۱۰ بعثت کے اوائل میں	
(۲۴) عام الحزن۔ جناب ابو طالب و حضرت خدیجہؓ کی وفات	۱۰ بعثت	ابوطالب کی وفات کے ۳ یا ۵ روز بعد حضرت خدیجہؓ نے ماہ رمضان میں داعی اجل کو لبیک کہی۔
(۲۵) سفر طائف	جمادی الاخری ۵۰ میلاد ۱۰ بعثت	دوسری روایت ۲۶-۲۷ شوال ۱۰ بعثت کی ہے۔
(۲۶) معراج	۲۷ رجب ۵۰ میلاد ۱۰ بعثت بروز دو شنبہ (شب)	
(۲۷) فرضیت نماز پنجگانہ	۲۷ رجب ۵۰ میلاد ۱۰ بعثت بروز دو شنبہ (شب)	
(۲۸) مدینہ میں اسلام کا آغاز	ذی الحجہ ۵۰ میلاد ۱۰ بعثت	ایاس بن معاذ نے اسلام قبول کیا۔
(۲۹) وفد مدینہ (۶ افراد) کا قبول اسلام	ذی الحجہ ۵۱ میلاد ۱۱ بعثت	
(۳۰) بیعت عقبہ اولیٰ (۱۲ افراد)	ذی الحجہ ۵۲ میلاد ۱۲ بعثت	
(۳۱) بیعت عقبہ ثانیہ (۷۵ افراد)	ذی الحجہ ۵۳ میلاد ۱۳ بعثت	
(۳۲) ہجرت		

ا۔ مکہ سے غار ثور	۲۷ صفر (شب) ۵۳ھ میلاد ۱۳ بعثت	واضح رہے کہ حضورؐ کی عمر مبارک اس واقعہ کے وقت ربیع الاول میں ۵۳ سال پوری ہوئی اور سال ۵۴ شروع ہوا۔ اسی طرح تیرھواں سال بعثت تکمیل پا کر چودھویں کا آغاز کیا۔
(ب) غار ثور سے روانگی	یکم ربیع الاول بروز دو شنبہ مطابق ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء	
(ج) قبا میں ورود	۸ ربیع الاول ۵۳ھ میلاد ۱۳ بعثت مطابق ۲۳ ستمبر ۶۲۲ بعثت بروز دو شنبہ	
(د) قبا سے مدینہ کو روانگی۔ مدینہ میں داخلہ	۱۲ ربیع الاول ۱ھ ۱۴ بعثت بروز جمعہ	جمعہ جو سالم کی بستی میں ادا کیا گیا۔ ایک قوی روایت یہ بھی ہے کہ قبا میں ۱۴ روز قیام رہا۔ صحیح بخاری میں قیام مدت "بضع عشرۃ لیلۃ" مذکور ہے۔ چنانچہ بعض روایات میں مدینہ پہنچنے کی تاریخ ۲۲ ربیع الاول آتی ہے۔
(۳۳) تاسیس مسجد نبوی	ربیع الاول ۱ھ	
(۳۴) فرض نماز میں اضافہ	ربیع الثانی ۱ھ	ظہر، عصر اور عشا کی چار چار رکعتیں فرض ہوئیں۔
(۳۵) مہاجرین و انصار میں مواخات	پہلی سہ ماہی ۱ھ	اجتماع مواخات بر مکان حضرت انس اس میں حضورؐ کے سامنے ۹۰ مہاجرین و انصار حاضر تھے۔
(۳۶) اسلامی ریاست کا قیام مدینہ کی آبادی کا دستوری معاہدہ	وسط ۱ھ	
(۳۷) نظام دفاع بر سر عمل ہوا	وسط ۱ھ ہجرت کے ساتویں ماہ کے شروع میں	فوجی مظاہرہ اور طلایہ گردی کے لیے پے درپے تین دستے روانہ کیے گئے (۱) ساتویں

ماہ ۳۰ افراد کا دستہ، حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی سرکردگی میں مقام سیف البحر تک گیا (۲) آٹھویں ماہ (شوال) ۶۰ یا ۸۰ سواروں کا دستہ عبیدہ بن الحارث کی سرداری میں بہ جانب رابغ بھیجا گیا۔ (۳) نویں ماہ (ذی قعدہ) سعد بن وقاص ۲۰ سواروں کا دستہ لے کر خرار تک گئے۔ اس کے بعد ودان کی جانب حضورؐ بہ نفس نفیس ایک جماعت کے ساتھ تشریف لے گئے۔ اس عملی و واقعاتی صورت حالات کے پیش نظر ہم اس نظریہ سے اتفاق نہیں کر سکے۔ کہ اذن جہاد کی مشہور آیت ۲ھ میں نازل ہوئی۔ درحقیقت ۲ھ میں عملاً قتال کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس سے قبل عملی تصادم سے اجتناب رہا۔ لیکن نظام دفاع کی تشکیل کے لیے کسی نہ کسی فرمان الٰہی کو لازماً محرک اول ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اذن جہاد کی آیت کا نزول ہجرت سے قبل قرار دیتے ہیں۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ اسلامی جماعت کا ذہن دعوت کے دور صبر سے آنے والے دور جہاد کی ذمہ داریوں کی طرف منتقل ہو اور وہ نئے مرکز میں پہنچ کر فوراً دفاعی تنظیم کا آغاز کر دیں۔

(۳۸) حضورؐ کے حرم میں حضرت عائشہؓ کی تشریف آوری — شوال ۱ھ

(۳۹) دواکابر کا قبول اسلام

۱۔ عبداللہؓ بن سلام (سابق یہودی)	۱ھ	
۲۔ ابو قیسؓ صرمہ بن ابی انس (سابق عیسائی راہب)		
(۴۰) فرمان جہاد (عملی کارروائی کرنے کی اجازت)	۱۲۔ صفر ۲ھ یا ہجرت کے ۱ سال ۲ ماہ ایک یوم بعد	
(۴۱) حضورؐ کا اولین فوجی و سیاسی سفر غزوہ ودان	صفر ۲ھ ہجرت کے بارھویں ماہ میں۔	
(۴۲) بیرونی قبائل سے معاہدانہ تعلقات بنی ضمرہ، باشندگان بواط، بنو مدلج	صفر تا جمادی الاخری ۲ھ	مورخین کے بیانات سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ مجدی جہنی رئیس جہینہ سریہ بنی ضمرہ سے قبل مدینہ سے حلیفانہ رابطہ رکھتا تھا۔
(۴۳) کرز بن جابر فہری کی ڈاکہ زنی (دشمن کی اولین دراز دستی)	ربیع الاول ۲ھ	
(۴۴) واقعہ نخلہ (اسلامی فوجی دستے کی پہلی سرحدی جھڑپ)	اواخر رجب ۲ھ	ایک کافر عمرو بن حضرمی مارا گیا۔ دو قیدی اونٹوں اور اسباب سمیت مدینہ لائے گئے۔ حضورؐ نے اس تصادم پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔
(۴۵) سلمان فارسی کا اسلام	۲ھ	
(۴۶) اذان کا آغاز	۲ھ	
(۴۷) فرضیت زکوٰۃ	۲ھ	
(۴۸) تحویل قبلہ	۱۵ شعبان ۲ھ بروز شنبہ	

(۴۹) فرضیت صوم ماہ رمضان	یکم رمضان ۲ھ چہار شنبہ	چونکہ معرکہ بدر کی تاریخ یعنی ۱۷ رمضان کو زیادہ تر روایات سے جمعہ کا دن ثابت ہے اس لیے حساب سے یکم کو چہار شنبہ ہونا چاہیے۔ اسی لیے ہم نے وہ روایت چھوڑ دی ہے جس میں یکم رمضان کو یک شنبہ محسوب کیا جاتا ہے۔
(۵۰) عیدالفطر کی نماز با جماعت کی ادائی و صدقۂ فطر کے حکم کا نفاذ	یکم شوال ۲ھ	
(۵۱) معرکہ بدر (پہلی باقاعدہ جنگ) --- مدینہ سے روانگی، معرکہ کارزار، مدینہ میں فاتحانہ داخلہ	۸ رمضان ۲ھ بروز چہار شنبہ یا ۱۲ رمضان ۲ھ بروز جمعہ ۲۰ (یا ۱۷) رمضان ۲ھ بروز دوشنبہ	عجیب الجھن ہے کہ معرکہ کے دن اور تاریخ پر تو زیادہ تر اتفاق ہے لیکن مدینہ سے روانگی کی تاریخ بعض نے ۱۲ قرار دی ہے، بعض نے ۸۔ جنہوں نے ۸ تاریخ لکھی ہے وہ دو شنبہ (پیر) کا دن ذکر کرتے ہیں حالانکہ ۱۷ کو جمعہ ہو تو ۸ کو کسی طرح پیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم نے ۸ رمضان کی روایت میں چہار شنبہ اور ۱۲ کی روایت میں یک شنبہ درج کیا ہے۔ البتہ اگر اس روایت کو اہمیت دی جائے جس کی رو سے ۱۷ رمضان کو سہ شنبہ قرار دیا گیا ہے تو یکم اور آٹھ کو یک شنبہ کا دن ہونا چاہیے۔
(۵۲) ازدواج حضرت علیؓ و فاطمہؓ	جنگ بدر کے بعد ۲ھ	
(۵۳) محاصرہ بنو قینقاع	وسط شوال تا اوائل ذیقعدہ ۲ھ	
(۵۴) حضورؐ کا نکاح حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ		

سے	۳ھ	
(۵۵) ازدواج حضرت عثمان و ام کلثوم بنت محمد ﷺ	۳ھ	
(۵۶) امتناع شراب کا ابتدائی حکم	۳ھ	
(۵۷) کعب بن اشرف کا خاتمہ	۳ھ	
(۵۸) ولادت جناب امام حسنؓ	۳ھ	
(۵۹) غزوہ احد — مدینہ سے روانگی، معرکہ کارزار، حمراء الاسد تک	۵ شوال ۳ھ بعد نماز جمعہ ۶ شوال بروز شنبہ	
لشکر ابوسفیان کا تعاقب	۷ شوال بروز یک شنبہ	
(۶۰) سود خواری کے ترک کے لیے ابتدائی نصیحت	غزوہ احد کے متصلاً بعد	ملاحظہ ہو: آل عمران ۱۳۰؛
یتامیٰ کے بارے میں احکام	غزوۂ احد کے متصلاً بعد	
(۶۱) وراثت کے مفصل قانون کا اجراء	۳ھ معرکہ احد کے بعد	
(۶۳) قانون ازدواج، حقوق الزوجینؓ مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت	۳ھ	
(۶۴) حضورؐ کا نکاح		

زینب بنت خزیمہ ام المساکین سے	آواخر ۳ھ	یوم احد کو بیوہ ہوئی تھیں' ان کی عدت ۳ھ میں جبھی پوری ہو سکتی ہے جب کہ حمل کی صورت ہو۔
(۶۵) حادثہ رجیع (دس ارکان کے دعوتی و تعلیمی وفد کا قتل)	صفر ۴ھ	
(۶۶) غزوہ بنو نضیر	ربیع الاول ۴ھ	
(۶۷) ام المومنین زینب بنت خزیمہ کا انتقال	۴ھ اوائل	ازدواج نبویؐ میں صرف دو تین ماہ رہیں۔
(۶۸) حکم حجاب کا نفاذ	یکم ذیقعدہ ۴ھ بروز جمعہ	
(۶۹) حرمت شراب کا قطعی قانون نافذ ہوا۔	۴ھ	
(۷۰) غزوہ بدر الاخری	ذیقعدہ ۴ھ	ابوسفیان اپنے چیلنج کے مطابق مقابلہ پر نہ آیا۔ تصادم نہیں ہوا۔
(۷۱) غزوہ دومتہ الجندل	ربیع الاول ۵ھ	
(۷۳) حکم تیمم کا نزول	غزوہ بنو مصطلق کے سفر میں	
(۷۴) حضورؐ کا ازدواج حضرت جویریہ سے	شعبان ۵ھ	
(۷۵) واقعہ افک	شعبان ۵ھ	
(۷۶) زنا۔ قذف اور لعان کے فوجداری قوانین نیز پردے کے تفصیلی احکام (واقعہ افک کے بعد)	۵ھ	
(۷۷) غزوہ احزاب	شوال یا ذی قعدہ ۵ھ	
(۷۸) وفد دوس کی		

مدینہ میں آمد	۵ھ	یہ ۷۰، ۸۰ مسلم خاندانوں کا عظیم وفد تھا
(۷۹) بنو قریظہ کی سرکوبی	ذوالحجہ ۵ھ	
(۸۰) حضورؐ کا ازدواج جناب زینب بنت جحش سے	۵ھ	
(۸۱) ثمامہ بن اثال حنفی رئیس نجد کا قبول اسلام	۶ھ	
(۸۲) معاہدہ حدیبیہ	ذیقعدہ ۶ھ	
(۸۳) حدیبیہ سے مدینہ میں واپسی	ذی الحجہ ۶ھ	
(۸۴) خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کا قبول اسلام	۶ھ	
(۸۵) بین الاقوامی دعوت کا آغاز (سلاطین کے نام خطوط)	یکم محرم ۷ھ بروز چہار شنبہ	
(۸۶) غزوہ خیبر	محرم ۷ھ	
(۸۷) حضورؐ کا نکاح حضرت صفیہؓ سے	محرم ۷ھ	
(۸۸) مراجعت مہاجرین حبشہ فتح خیبر کے موقع پر ۷ھ		
(۸۹) آزاد مسلم کیمپ کا قیام (بمقام سیف البحر)	۷ھ کے آغاز میں	مکہ میں جو مسلم نوجوان ستائے جا رہے تھے معاہدہ حدیبیہ کے مطابق ان کو حضورؐ مدینہ میں جگہ نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ پہلے ابوجندل و ابوبصیر۔ اور بعد میں دوسرے

لوگ بھاگ کر سیف البحر کے مقام پر جا پہنچے اور وہاں آزاد مسلم کیمپ قائم کیا۔

(۹۰) سیف البحر کا قریشی قافلے پر چھاپہ	صفر ۷ھ
(۹۱) عمرۃ القضاء	ذی قعدہ ۷ھ
(۹۲) نکاح و طلاق کے تفصیلی قوانین کا نفاذ	۷ھ
(۹۳) حضورؐ کا نکاح حضرت میمونہ سے (مکہ میں)	۷ھ
(۹۴) جبلہ غسانی کا اسلام	۷ھ
(۹۵) غزوہ موتہ	جمادی الاولیٰ ۸ھ
(۹۶) مشرکین مکہ کی طرف سے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی	رجب ۸ھ
(۹۷) غزوہ فتح مکہ -- مدینہ سے روانگی	۱۰ رمضان ۸ھ بروز چہار شنبہ
-- مکہ میں فاتحانہ داخلہ	۲۰ رمضان
سریہ خالدؓ برائے ہدم بت خانہ عزّیٰ نخلہ واقع ۸ھ	اغلباً ۲۵ رمضان
-- سریہ عمرو بن العاص برائے ہدم بت	

دوسری طرف خاص مضبوط روایت یہ بھی ہے کہ حضورؐ ۱۸ رمضان تک مدینہ میں تھے۔ اس حساب سے داخلہ مکہ ۲۹ یا ۳۰ کو ہونا چاہیے۔

خانہ سواع	رمضان ۸ھ	
-- سریہ سعد اشہلی برائے ہدم بتخانہ مناۃ		
-- قیام مکہ	۹ شوال تک	بروایت دیگر ۱۸ شوال تک
--- غزوہ حنینؑ (طائف پہنچنے تک)	بہ ماہ شوال ۸۔ ۱۰ روز کی مدت	
-- محاصرہ طائف	اواخر شوال تا اوائل ذیقعدہ تقریباً ۱۸ یا ۲۰ روز	مکحول کی روایت کے مطابق ۴۰ روز محاصرہ جاری رہا۔
-- جعرانہ میں تقسیم غنائم کے بعد عمرۂ جعرانہ	ذی قعدہ ۸ھ	
(۹۸) سود کے قطعی انسداد کا قانون	بہ موقع فتح مکہ ۸ھ	سودی مطالبات قانوناً کالعدم کر دیئے گئے۔ (ملاحظہ ہو: البقرہ ۲۷۸)
(۹۹) وفد صداء کی مدینہ میں آمد	۸ھ	
(۱۰۰) حضرت زینب بنت حضورؐ کا انتقال	۸ھ	
جناب ابراہیم فرزند حضورؐ کا انتقال	۸ھ	
(۱۰۱) تنظیم زکوٰۃ:۔ محصلین صدقہ کا اولین تقرر	ابتدائے محرم ۹ھ	
(۱۰۲) غزوۂ تبوک : جیش عسرت کی روانگی	رجب ۹ھ مطابق نومبر ۶۳۰ء مدینہ سے روانگی بروز جمعرات	
(۱۰۳) جزیہ کا حکم ،	بہ زمانہ تبوک	ایک روایت کے مطابق ۸ھ میں غزوۂ تبوک سے قبل یہ حکم آیا۔
(۱۰۴) مسجد ضرار جلا دی گئی	غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد	

(۱۰۵) اکیدر گوائی دومۃ الجندل کا اسلام	۹ھ	
(۱۰۶) کعب بن زہیر کی عفو طلبی اور قبول اسلام	۹ھ	قصیدہ "بانت سعاد" لکھ کر پیش کیا۔
(۱۰۷) چند وفود جو اس سال مدینہ آئے —	صفر ۹ھ	
وفد عذرہ		
-- وفد بلی	ربیع الاول ۹ھ	
-- وفد خولان	شعبان ۹ھ	
-- وفد ثقیف	۹ھ	
(۱۰۸) فرضیت حج: اولین حج (بامارت حضرت ابوبکر صدیقؓ	۹ ذی الحجہ ۹ھ دو شنبہ یا سہ شنبہ	فرضیت حج کے تعین وقت میں بھی روایات ۶ھ، ۷ھ، ۸ھ، ۹ھ، ۱۰ھ کے بارے میں موجود ہیں مگر ہم نے اپنی دانست میں مرجح صورت کو لے لیا ہے۔ ایک دلچسپ صورت یہ بھی ہے کہ یہ حج کفار کے تقویمی نظام کے تحت نوں (یا نوند) کے مہینوں کی وجہ سے ذی قعدہ میں ہوا تھا۔ لیکن اس روایت کا پہلو کمزور ہے۔ اعلان برأت سے متعلق بھی اختلاف ہے کہ یوم عرفہ کو ہوا یا یوم نحر کو: ہمارے نزدیک یوم الحج الاکبر کے قرآنی الفاظ کافی ہیں۔ احادیث کو دیکھیں تو بھی یوم النحر کے حق میں پلڑا بھاری ہے۔
(۱۰۹) اعلان برأت بذریعہ حضرت علیؓ کفار کے غیر مؤقت معاہدات کا خاتمہ	۱۰ ربیع الثانی ۱۰ھ	

(اعلان برات کے مطابق)		
(۱۱۰) وفد محارب، وفد محامد	۱۰ھ	بقیہ وفود میں سے اکثر ۱۰ھ میں اور کچھ ۹ھ میں مدینہ آئے مگر ان کی آمد کے وقت کا صحیح تعین مشکل ہے۔
وفد خولان	شعبان ۱۰ھ	
وفد نیسان	رمضان ۱۰ھ	
وفد بنی حارث بن کعب	شوال ۱۰ھ	
وفد سلامان	شوال ۱۰ھ	
(۱۱۱) حضورؐ کا آخری رمضان میں ۲۰ روزہ اعتکاف	رمضان ۱۰ھ	
(۱۱۲) حضورؐ سے مسیلمہ کذاب کی مراسلت	۱۰ھ	
(۱۱۳) حجۃ الوداع:۔ --- مدینہ سے روانگی	۲۶ ذی قعدہ ۱۰ھ بروز شنبہ ما بین ظہر و عصر	(اس معاملے میں بھی اختلاف ہے مگر ہم نے صحیح ترین روایت اختیار کی ہے۔)
-- ذوالحلیفہ میں قیام	شنبہ و یک شنبہ کی درمیانی شب	
-- احرام بندی	یک شنبہ (بوقت ظہر)	
-- ذی طویٰ میں نزول و قیام	شب یک شنبہ ۴ ذی الحجہ	
-- ذی طویٰ سے مکہ کو روانگی	۵ ذی الحجہ۔ نماز صبح کے بعد۔	ثنیہ العلیا کی طرف سے جو حجون کی بلندی پر ہے حضورؐ مکہ میں داخل ہوئے۔
-- مسجد حرام میں داخلہ	۵ ذی الحجہ بوقت ضحیٰ	باب بنی عبد مناف (باب بنی شیبہ) سے حضورؐ داخل ہوئے۔
-- مکہ سے باہر قیام	۸ ذی الحجہ تک	جملہ اصحاب حضورؐ کے ساتھ مقیم رہے۔ قیام شبانہ منیٰ میں فرمایا۔

-- منیٰ کو روانگی	۸ ذی الحجہ بروز جمعرات بوقت ضحیٰ	
-- منیٰ سے عرفہ کو روانگی	۹ ذی الحجہ بروز جمعہ۔ طلوع آفتاب کے بعد	براستہ ضب قریہ نمرہ (عرفات سے بجانب مشرق) تشریف لے گئے وہیں قبہ کھڑا کیا گیا۔ قصویٰ نامی ناقہ پر سے یہ عظیم خطبہ نشر فرمایا۔
خطبہ حج (عرفہ)	۹ ذی الحجہ بروز جمعہ بعد زوال آفتاب	
-- وقوف عرفہ	۹ ذی الحجہ بروز جمعہ بعد نماز ظہر و عصر	یہاں حضورؐ نے گریہ و زاری سے مغرب تک دعا فرمائی۔
-- عرفہ سے روانگی بجانب مزدلفہ	۹ ذی الحجہ بروز جمعہ بعد غروب آفتاب	مازمین کے راستہ سے واپسی فرمائی۔
مزدلفہ سے مشعر حرام	۱۰ ذی الحجہ بروز شنبہ نماز صبح کے بعد	یہاں حضورؐ نے گریہ و زاری کے ساتھ تسبیح، تکبیر اور تہلیل فرمائی۔
-- مشعر حرام سے منیٰ کو روانگی	۱۰ ذی الحجہ قبل طلوع آفتاب	
-- رمی جمار	۱۰ ذی الحجہ بعد طلوع آفتاب تا بہ ضحیٰ	اس دوران میں دھوپ میں تیزی آ گئی تھی۔
-- خطبہ منیٰ (یوم النحر)	۱۰ ذی الحجہ بوقت ضحیٰ	
-- قربانی	بعد خطبہ	قربانی کے یک صد اونٹوں میں سے ۶۳ اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح کیے اور بقیہ کو حضرت علیؓ کے سپرد کیا۔ اس کے بعد حلق راس کرایا۔
-- منیٰ سے مکہ کو روانگی	۱۰ ذی الحجہ بعد حلق راس	مکہ میں پہنچ کر ظہر سے قبل طواف افاضہ فرمایا شب منیٰ میں گزاری۔
-- مکہ سے منیٰ کو واپسی	آخر یوم	

دوسرا خطبہ منیٰ	یوم الرؤس (۱۱ ذی الحجہ)	اس خطبہ کا ذکر ابوداؤد کی روایت میں ہے۔
-- منیٰ سے محصب یا ابطح کو روانگی	۱۳ ذی الحجہ بروز سہ شنبہ	رات کو مکہ جا کر طواف وداع ادا فرمایا۔
-- مکہ سے واپسی	۱۳، ۱۴ کی درمیانی شب	
(۱۱۴) وفد نخع	وسط محرم ۱۱ھ	یہ آخری وفد تھا جو حضورؐ کی زندگی میں آیا
(۱۱۵) جیش اسامہ کی ترسیل کا حکم	۲۶ صفر ۱۱ھ	یہ آخری فوجی مہم ہے جس کے لیے حضور نے حکم دیا۔
(۱۱۶) حضورؐ کے مرض وفات کا آغاز	اواخر صفر ۱۱ھ (اغلباً ۲۹ کو)	مختلف روایات میں سے صحیح ترین یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ کی مدت علالت ۱۳ روز تھی۔
(۱۱۷) اشتداد مرض کا زمانہ (حضرت عائشہؓ کے حجرے میں وفات تک کے سات دن اقامت)		
(۱۱۸) مسجد میں آخری نماز باجماعت و آخری خطاب	وفات سے ۵ روز قبل بروز جمعرات نماز ظہر۔	روایات میں متعدد خطابات کا ذکر ہے مگر اغلب یہ ہے کہ مختلف امور اسی خطبہ میں ارشاد فرمائے گئے۔
(۱۱۹) وصال	۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ دو شنبہ بوقت چاشت	پیر کا دن متفق علیہ ہے مگر تاریخوں میں اختلاف ہے یکم و ۲ بھی مروی ہیں اور ایک حساب سے ۱۳ بھی نکلتی ہے۔ اصل اشکال یہ ہے کہ ۹ ذی الحجہ کو جمعہ کا دن قطعاً ثابت ہے۔ اور اس لحاظ سے حساب لگائیں تو ۱۲ ربیع الاول کو ماسوا اس نادر صورت کے دو شنبہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ کہ متواتر تین مہینے تیس تیس دنوں کے ہوں۔ لیکن ایک رائے یہ ہے کہ بطور شاذ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور دوسری تاویل یہ ہے کہ مکہ

		اور مدینہ میں موسمی وجوہ سے رویت ایک دن آگے پیچھے ہو سکتی ہے۔
(۱۲۰) تدفین	۱۳ ربیع الاول بروز سہ شنبہ و ۱۴ ربیع الاول چہار شنبہ کی درمیانی شب	حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں قبر مبارک بنی۔

باب: ۸

محسنِ انسانیت ﷺ

اوّلیات و تقدمات

اوّلیات وتقدمات

پہلا حکم بعثت ـــــ

مورخہ ۹ ربیع الاول ۴۱ سال میلاد

اولین نزول قرآن ـــــ

سورہ علق مورخہ ۱۸ رمضان ۱ سال بعثت کو نازل ہوئی۔

راہ حق میں حضورؐ کا اولین حلقہ رفاقت ـــــ

(۱) خواتین میں سے حضرت خدیجہؓ طاہرہ کو مقام سبقت حاصل ہوا۔

(۲) پختہ شعور آزاد مردوں میں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اولیت کا شرف پایا۔

(۳) نوخیز جوانوں میں سے حضرت علی ؓ پیش پیش رہے۔

(۴) زیر تمکین طبقے میں سے حضرت زیدؓ بن حارثہ (حضورؐ کے آزاد کردہ غلام) کو تقدم ملا۔

حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلی خاتون جو اسلامی تحریک کے دائرہ میں داخل ہوئیں۔

لبابہ بنت الحارث زوجہ حضرت عباسؓ۔

دار ارقم کے دور دعوت میں اولین بیعت اسلام کرنے والے صحابی ـــــ

عاقل بن بکیرؓ

اولین مرکز تحریک ـــــ

دار ارقم واقع بہ کوہ صفا۔

سب سے پہلا خطاب عام -----

کوہ صفا پر (۴ سال بعثت)

سب سے پہلی آیت جس پر کفار میں شدید برہمی پیدا ہوئی -----

"انکم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم" ۔

حضورؐ کے بعد سب سے پہلے اسلام کا اظہار کرنے والے صحابی ----

حضرت خبابؓ بن الارت تمیمی۔

سب سے پہلا اسلامی گھرانا۔

خانہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

سب سے پہلی خاتون جو مسلم والدین کے سائے میں بچپن ہی سے اسلام کی اٹھان اٹھیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

اسلام کی حمیت کے تحت پہلا اتفاقی قتل۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے ہاتھوں ہوا۔ واقعہ یہ تھا کہ شہر سے باہر مسلم جماعت مصروف نماز تھی اور کفار نے شرارت کی۔ حضرت سعدؓ نے ایک ہڈی اٹھا کر ان کی طرف پھینکی' وہ ایک کافر کو جا کر لگی اور وہ ختم ہو گیا۔

سب سے پہلا جوڑا جو (بالفاظ حضورؐ حضرت لوط و ابراہیم علیہم السلام کے بعد) خدا کی راہ میں ہجرت کے لیے نکلا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و حضرت رقیہؓ رضی اللہ عنہا اسلام کی خاطر حبشہ روانہ ہوئے۔

اسلامی تحریک کی تاریخ میں اولین جھنڈا لہرایا گیا۔

بریدہ اسلمی کے ہاتھوں' سفر ہجرت میں۔

کعبۃ اللہ میں سب سے پہلے کلمہ اسلام کو بآواز بلند پکار کر مار کھانے والے صحابی ---

حضرت ابو ذرؓ غفاری۔

وہ ہستی جس نے پہلی بار اپنے اسلام کا پر زور طریق سے اعلان کرایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ

وہ ہستی جس کے قبول اسلام سے پہلی بار کعبۃ اللہ میں ادائے نماز کا آغاز ہوا ----

حضرت عمر رضی اللہ عنہ

وہ ہستی جس کے قبول اسلام پر کفار نے پہلی بار محسوس کیا کہ تحریک اسلامی زور پکڑ گئی ہے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ

سب سے پہلا مسلم انصاری سردار جس نے مکہ والوں کے ہاتھوں مار کھائی۔

حضرت سعدؓ بن معاذ

اولین جان جو مسجد الحرام میں راہ حق میں قربان ہو گئی۔

حارث بن ابی ہالہ۔

اولین خاتون جو انتہائی مظلومانہ انداز سے اسلام پر قربان ہوئی۔

حضرت سمیہؓ (حضرت یاسرؓ کی اہلیہ اور حضرت عمارؓ کی والدہ)

سب سے پہلا شخص جس نے بنو ہاشم کے مقابلے میں قریش کے معاہدہ مقاطعہ کو ختم کرانے کی تحریک کی ---

ہشام بن عمرو بن ربیعہ۔

اولین مرد مومن جس نے اپنی ایک آنکھ صداقت کے لیے قربان کر دی۔

عثمانؓ بن مظعون (قریش کی مجلس میں انہوں نے لبید کے سامنے اس کے ایک مصرعہ سے اختلاف کیا۔ اس پر ان کی آنکھ پھوڑ دی گئی)

سب سے پہلا مہاجر مدینہ

حضرت ابو سلمہؓ

اولین حادثہ ارتداد

عبید بن جحش حبشہ میں ہجرت کر کے جانے کے بعد عیسائی ہو گیا۔

اسلام کے لیے سب سے پہلا تیر چلانے والے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے سریہ عبدالحارث میں بمقام ثنیہ المرہ دشمن پر تیر پھینکا' مگر دشمن بچ نکلا۔

اسلام کی حمایت میں سب سے پہلے تلوار اٹھانے والے۔

حضرت زبیرؓ بن العوام

ہجرت حبشہ ثانیہ میں اولین مہاجر ---

حضرت جعفرؓ بن ابی طالب۔

مدینہ کا پہلا نوجوان جو حضورؐ کی دعوت سے متاثر ہوا۔

سویدؓ بن صامت

اولین انصاری صحابی جن کا مدینہ میں (ہجرت کے بعد) انتقال ہوا۔

کلثومؓ بن الہدم جن کے مکان واقع قبا میں حضورؐ نے ہجرت کے بعد چند روز قیام فرمایا تھا۔

سب سے پہلے مہاجر جن کا مدینہ میں انتقال ہوا۔

حضرت عثمانؓ بن مظعون

حمیت اسلام کے تحت پہلا شخصی قتل ــــــ (عورت)

اسماء بنت مروان خطمیہ قبیلہ کو نبی اکرم ﷺ کے خلاف بھڑکاتی تھی اور بدگوئی کرتی تھی۔ اس کے نومسلم بھائی حضرت عمیرؓ بن عدی الخطمی نے کسی موقع پر جوش میں آ کر اس کا خاتمہ کر دیا (رمضان ۲ھ)

حمیت اسلام کے تحت پہلا شخصی قتل ــــ (مرد)

ابو عفلہ یہودی حضورؐ اور مسلمانوں کے خلاف بد زبانی کر کے لوگوں کو اشتعال دلاتا تھا۔ عالمؓ بن عمیر انصاری نے غیرت میں آ کر اس کا خاتمہ کر دیا۔

مدینہ میں اولین معلم اسلام کی ماموریت

حضرت مصعب بن عمیرؓ کو (ابن ام مکتومؓ کی معیت میں) حضورؐ نے وفد انصار کے ساتھ روانہ کیا (۱۳ سال بعثت)

بیعت عقبہ ثانیہ میں سب سے پہلے بیعت کرنے والے انصاری صحابی۔

براءؓ بن معرور

مدینہ میں پہلا اجتماعی درس قرآن۔

مسجد بنی زریق میں دیا گیا (غالباً یہ باقاعدہ مسجد نہ تھی بلکہ عبادت کے لیے ایک جگہ مقرر کر لی گئی تھی)

سب سے پہلی باقاعدہ مسجد کی تعمیر۔

مسجد قبا جو مورخہ ۸ تا ۱۱ ربیع الاول ۱۴ سال بعثت/۱ھ میں تعمیر ہوئی۔

اولین جمعہ جو حضورؐ کی امامت میں ہوا۔

مورخہ ۱۲ ربیع الاول ۱ھ کو بنی سالم کی آبادی میں پہلا جمعہ پڑھا گیا جس میں یک صد علمبرداران اسلام شریک تھے۔

مدینہ کا قبیلہ جو پورے کا پورا یکدم اسلام میں داخل ہوا ــــ

بنی عبدالاشہل (صرف ایک آدمی اس سعادت سے بعد میں ہمکنار ہوا)

سب سے پہلا فوجی دستہ جو اسلامی ریاست کی طرف سے طلایہ گردی کے لیے نکلا۔

حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی کمان میں پہلا دستہ ہجرت کے ساتویں ماہ کے اوائل میں بھیجا گیا اور سیف البحر تک گیا۔

نظام دفاع کے تحت پہلا فوجی علم اٹھانے والے صحابی۔

ابی مرثد الغنوی برائے سریہ سیف البحر(مذکورہ بالا)

حضورؐ کی رکاب میں اولین شرف علمبرداری۔

حضرت حمزہؓ (بہ غزوہ ودان)

قریش کی طرف سے اسلامی ریاست پر پہلی بار دراز دستی—

کرز بن جابر فہری کا فوجی ڈاکہ (ربیع الاول ۲ھ)

پہلی سرحدی جھڑپ جس میں اسلامی فوجی دستے کے ہاتھوں ایک دشمن فرد ہلاک ہوا-----

سریہ نخلہ وقوعہ ماہ رجب ۲ھ (واقد بن عبداللہ تمیمی کے تیر سے)

پہلا موقع جب کہ مال غنیمت اور قیدی مدینہ میں لائے گئے۔

سریہ نخلہ (مذکورہ بالا)

طریق اذان کا آغاز۔

سنہ ۲ھ

کعبۃ اللہ میں سب سے پہلی اذان۔

فتح مکہ (۸ھ) کے موقع پر حضرت بلالؓ نے کہی۔

سب سے پہلا کذاب جس نے حضورؐ کے مقابلے پر جھوٹی نبوت کا علم بلند کیا۔

مسلیمہ کذاب۔

اولین تحریری امان نامہ جو حضورؐ کی طرف سے جاری ہوا۔

سراقہ بن مالک جعشم کے لیے (سفر ہجرت میں)

دنیا کا پہلا باقاعدہ تحریری وفاقی دستور۔

۱ھ مدینہ میں حضورؐ کی قیادت میں مرتب و نافذ ہوا۔

مدینہ سے باہر اسلامی ریاست کا پہلا حلیفانہ معاہدہ۔

بنی ضمرہ کے سردار عمرو بن مخشی ضمری سے --یا--- قبیلہ بنی ضمرہ بن بکر بن عبد مناف سے۔

اولین صلیب جو قبول اسلام کے مقدس جرم میں دی گئی۔

حضرت خبیبؓ بن عدی و زید بن دثنہ کو (بمقام تنعیم متصل بہ مکہ)

مدینہ میں یہود کی پہلی باغیانہ و غدارانہ کارروائی۔

بنو قینقاع نے ایک مسلم خاتون کو سربازار برہنہ کر دیا اور بلوہ ہو گیا۔

پہلا آزاد اسلامی کیمپ۔

سیف البحر میں حضرت ابو بصیرؓ و ابو جندلؓ نے قائم کیا۔

فتح مکہ کے موقع پر اولین شخص جو اسلام میں داخل ہوا۔
ابو سفیانؓ بن حارث بن عبدالمطلب
پہلا غزوہ جس میں مہاجرین کے ساتھ انصار بھی شامل تھے۔
غزوہ بدر
میدان بدر میں اسلامی لشکر کے تین اولین مبارز ----
حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت عبیدہؓ بن حارث بن عبدالمطلب
معرکہ بدر کا سب سے پہلا دشمن مقتول ----
اسود بن عبدالاسد (مبارزت سے قتل)
معرکہ بدر کا سب سے پہلا مسلم شہید
مہجع مولا عمرؓ بن الخطاب۔
مدینہ میں فتح بدر کا مژدہ پہنچانے والا اولین قاصد ---
زیدؓ بن حارثہ
پہلی بار دوگانہ عید الفطر پڑھا گیا-----
یکم شوال ۲ ھ
اسلامی ریاست کا پہلا سفیر جسے راستہ میں شہید کیا گیا۔
حارثؓ بن عمیر ازدی کو موتہ کے شاہی حاکم شرجیل بن عمرو غسانی نے قتل کر دیا۔
بہادری کا اولین خطاب جو حضورؐ کی طرف سے ارزانی ہوا-----
حضرت خالدؓ کو "سیف اللہ" کا خطاب دیا گیا (جنگ موتہ جمادی الاولی ۸ ھ)
سرکاری مکاتیب اور دستاویزوں پر مہر کے استعمال کی ابتداء-----
یکم محرم ۷ ھ
اسلامی نظام کے تحت پہلا سیاسی واقعہ تحکیم-----
اسلامی ریاست اور بنو قریظہ کے درمیان (۵ ھ)
اسلامی دور میں پہلے صحابی جو حکم بنائے گئے------
سعدؓ بن معاذ
حضورؐ کے لیے اولین شاہی ہدیہ-----
شاہ نجاشی نے روانہ کیا۔
مشرکین عرب میں سے اولین شخص جس کا ہدیہ حضورؐ نے قبول فرمایا-----
ابو سفیان (بہ زمانہ صلح حدیبیہ)۔

پہلا سابق غلام جسے سالار لشکر بنایا گیا——
زیدؓ بن حارثہ (سریہ موتہ)۔
پہلا غزوہ جس میں بیت المال کا خمس نکلا——
غزوہ بنو قینقاع یا غزوہ بنو قریظہ۔
لا الہ پکارنے والے دشمن کے قتل کا اولین حادثہ——
سریہ جہینہ (رمضان ۷ ھ) میں اسامہؓ بن زید کے ہاتھوں نہیک بن مرداس کی جان گئی۔
پہلا موقع جب کہ جماعت کی بھاری اکثریت وقتی طور پر بے اطمینانی میں مبتلا ہوئی ——
صلح حدیبیہ۔
حضورؐ کے ہاتھوں پہلا زخمی و مقتول——
حارث بن الصمہ (غزوہ احد)
پہلا شہید جنتی جس نے نہ کوئی نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا——
اصیرمؓ (بنی عبدالاشہل) غزوہ احد کے روز ایمان لا کر سیدھے شریک جہاد ہوئے اور شہادت پائی۔
پہلا شہید راہ حق جس نے موت سے قبل نماز ادا کرنے کی سنت کا آغاز کیا——
حضرت خبیبؓ
واقعہ بئر معونہ کے سب سے پہلے شہید ——
حرامؓ بن ملحان (حضرت انسؓ کے ماموں)
سب سے پہلی صلوٰۃ خوف پڑھی گئی——
غزوہ عسفان —— یا —— غزوہ ذات الرقاع
پہلا نمازی جس نے تین تیر کھائے مگر نماز نہیں توڑی——
عبادؓ بن بشر (غزوہ ذات الرقاع)
مدینہ میں ارتداد کا اولین حادثہ——
حارث بن سوید بن صامت اگرچہ معرکہ احد میں بہ حیثیت مسلم شریک ہوا مگر مجذر بن زیاد بلوی کو قتل کر کے مکہ بھاگ گیا۔ بعد میں مدینہ آیا اور گرفتار ہو کر قتل ہوا۔
پہلا مسلمان جو غلطی سے میدان جنگ میں مسلمان کے ہاتھ سے مارا گیا——
ہشامؓ بن اصابہ (عبادہؓ بن صامت کے ہاتھوں)
پہلی بار دشمن کا جاسوس گرفتار کر کے قتل کیا گیا——
غزوہ بنی مصطلق میں

پہلا نوجوان جس نے اپنے منافق باپ کو قتل کرنے کی پیش کش حضور کے سامنے کی----

طلحہ بن عبداللہ بن ابی

حضرت عائشہؓ کو قصہ افک سے مطلع کرنے والا اولین ذریعہ ----

ام مسطحؓ بن اثاثہ۔

حضرت عائشہؓ کی عصمت و عفت کی پہلی شہادت-----

مردوں میں سے -------- اسامہ بن زیدؓ

عورتوں میں سے -------- بریرہؓ

ازواج میں سے -------- حضرت زینبؓ بنت جحش

قذف کی اولین حد جاری کی گئی-----

حسانؓ بن ثابت، مسطحؓ بن اثاثہ، حمنہؓ بنت جحش پر

معرکہ جس میں پہلی بار متعدد نمازیں پے در پے قضا ہوئیں----

غزوہ خندق۔

دشمن کا زور توڑنے کے لیے پہلی بار کامیاب سفارتی تدبیر----

نعیمؓ بن مسعود کے ذریعے غزوہ خندق میں زیر عمل آئی۔

پہلا تیر انداز جس نے تن تنہا ڈاکوؤں کی جماعت کو بے بس کر دیا۔ جدید اصطلاح میں پہلے اسلامی گوریلا سپاہی یا کمانڈو-----

سلمہؓ بن الاکوع

پہلا موقع جب کہ حضورؐ کی زبان سے بے ساختہ رجز صادر ہوا۔

غزوہ حنین میں لشکر میں سراسیمگی پھیلی اور حضورؐ تنہا رہ گئے تو سفید خچر کی پشت پر سے آپ نے پکارا۔

"انا النبی لا کذب

انا ابن عبدالمطلب"

پہلی بار مستقل عاملین صدقہ کا تقرر۔

محرم ۹ھ میں۔

پہلی بار اسلامی فوج نے قلعہ شکنی کے لیے منجنیق کا استعمال کیا-----

غزوہ طائف میں۔

قیدیوں کا اولین تبادلہ جو اسلامی حکومت اور اہل مکہ کے درمیان ہوا-----

سریہ نخلہ کے دو مشرک قیدیوں عتاب بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کے بدلے میں
سعدؓ بن ابی وقاص اور عتبہؓ بن غزوان کو رہائی دلوائی گئی۔

پہلا غزوہ جس میں گھوڑوں کے سہام مجاہدین کو دیئے گئے-----
غزوہ بنی قریظہ-----

پہلی بار جزیہ لینے کا حکم نازل ہوا-----
غزوہ تبوک سے کچھ قبل

جزیہ کا اولین معاملہ طے پایا-----
حاکم دومتہ الجندل سے (بہ سفر غزوہ تبوک)

جزیہ کی پہلی بڑی مقدار طے پائی-----
نجران کے عیسائیوں نے اسلامی حکومت کو دو ہزار حلہ سالانہ اور بوقت ضرورت جنگی
سامان عاریتہ دینے کا معاملہ طے کیا۔

اولین اور واحد ہستی جسے صلح حدیبیہ کے معاملہ میں پورا اطمینان حاصل رہا۔
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

اولین ہستی جس نے صلح حدیبیہ کے بعد نحر و حلق میں جماعت کے تامل کرنے پر حضورؐ کی ہمت بندھائی۔
ام المومنین حضرت ام سلمہؓ

اولین موقع جب کہ بارگاہ رسالت سے شاعر نے انعام حاصل کیا-----
فتح مکہ کے بعد کعب بن زہیر نے حاضر ہو کر عفو طلبی کے لیے قصیدہ بانت سعاد پڑھا
اور حضورؐ نے اپنی ردا عطیہ کے طور پر دی۔

اولین موقع جب کہ حضورؐ نے قنوت نازلہ پڑھی-----
رجیع اور بئر معونہ کے حادثوں کے بعد جن میں تعلیمی وفود کے بیش قیمت افراد کو
دشمن نے شہادت کے گھاٹ اتار دیا تھا (۴ ھ)

پہلا موقع جب کہ مسلم خواتین میدان جنگ میں پہنچیں-----
غزوہ احد ۳ ھ

پہلا حکمران جو حلقہ بگوش اسلام ہوا-----
اصحم بن ابجر شاہ حبش

پہلا شخص جو حضور کی نگاہ میں سنی ہوئی تعریفوں سے بھی بلند تر نکلا-----
قبیلہ طے کا سردار زید الخیر (سابق نام زید الخیل)

پہلا غیر عرب نو مسلم افسر جو اسلام لانے کی وجہ سے صلیب پر لٹکایا گیا-----

فروہ بن عمرو الجذامی' گورنر حکومت روم برائے شمالی عرب مامور بہ مقام معان۔

معرکہ احد کی مبارزت میں مسلمانوں کے اولین فاتح۔۔۔۔۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص۔

معرکہ احد میں مبارزت کا چیلنج قبول کرنے والا پہلا مجاہد۔۔۔۔۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ

احد کا پہلا دشمن مقتول۔۔۔۔۔

طلحہ بن ابی طلحہ۔

پہلا اظہار فخر جو حضورؐ کی نگاہ میں مقبول ٹھہرا۔

احد میں ابو دجانہ کا حضورؐ کی تلوار لے کر اکڑ کر چلنا۔

اسلام میں پہلا حج۔۔۔۔۔

۹ھ بامارت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

پہلی غیر ملکی جنگ

جنگ موتہ۔ جمادی الاخری ۸ھ۔۔۔۔۔

ثقیف میں سے اسلام کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اولین شخص جو مدینہ آیا۔۔۔۔۔

عروہؓ بن مسعود ثقفی۔

اللھم انزل رحمة واسعة علی جمیع اصحاب النبی صلی اللہ علیہ و سلم من المھاجرین والانصار علی الذین اتبعوھم باحسان۔

ضمیمہ : ۳

تحریک اسلامی کا عددی نشوونما

☆ حضورؐ کی اسلامی تنظیم کا اولین حلقہ رفاقت۔

(۱) حضرت خدیجہؓ (۲) حضرت ابوبکرؓ (۳) حضرت علیؓ (۴) حضرت زیدؓ بن حارثہ

☆ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی مساعی دعوت سے مرحلہ اول میں قبول کرنے والے پانچ رفقاء۔

(۱) حضرت زبیرؓ بن العوام (۲) حضرت عثمانؓ بن عفان (۳) حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف (۴) حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ (۵) حضرت سعدؓ بن ابی وقاص۔

☆ دعوت کے ابتدائی سہ سالہ دور میں حلقہ اسلامی میں داخل ہونے والے ۴۶ سابقون الاولون۔

(۱) خباب بن الارت تمیمی (۲) سعیدؓ بن زید ❶ (۳) فاطمہؓ بنت الخطاب (۴) لبابہ بنت الحارث ❷ زوجہؓ حضرت عباسؓ (۵) عبداللہؓ بن مسعود ❸ (۶) عثمانؓ بن مظعون ❹ (۷) ارقم بن ابی الارقم ❺ مخزومی ❻ (۸)

---

❶ دار ارقم کے دور سے پہلے مسلمان ہوئے۔

❷ حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلے اسلام لانے والی خاتون۔

❸ قبول اسلام میں بعض روایات کے بموجب چھٹا نمبر تھا۔

❹ قبول اسلام میں چودھواں نمبر تھا۔

❺ قبول اسلام میں گیارھواں نمبر یا بارھواں نمبر مگر حاکم کی روایت کے لحاظ سے ساتواں نمبر۔

❻ درحقیقت یہ صحابی عثمانؓ بن مظعون' عبیدہ بن الجون' عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور ابو سلمہؓ کے ساتھ اکٹھے ہی دار ارقم میں اسلام لائے تھے (بروایت ابن حجر)۔

ابو سلمہؓ بن عبدالاسد مخزومی (۹) ابو عبیدہؓ بن عامر بن الجراح ❶ (۱۰) قدامہؓ بن مظعون (۱۱) عبیدہؓ بن حارث بن عبدالمطلب (۱۲) جعفرؓ بن ابی طالب (۱۳) اسماءؓ بنت عمیس (۱۴) عبداللہؓ بن جحش (۱۵) ابو احمدؓ بن جحش (۱۶) سائبؓ بن عثمانؓ بن مظعون (۱۷) مطلبؓ بن ازہر (۱۸) رملہ بنت ابی عوف اہلیہ مطلب بن ازہر (۱۹) حضرت عمیرؓ بن ابی وقاص (سعد بن ابی وقاص کے بھائی) (۲۰) اسماءؓ بنت ابی بکر (۲۱) عائشہؓ بنت ابی بکر (۲۲) حضرت عیاشؓ بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے بھائی) (۲۳) اسماءؓ اہلیہ عیاش (۲۴) سلیطؓ بن عمرو ❷ (۲۵) مسعودؓ بن ربیعہ ❸ (۲۶) خنیسؓ بن حذافہ (۲۷) عامرؓ بن ربیعہ (۲۸) حاطبؓ بن الحرث جمحی (۲۹) فاطمہؓ بنت محلل اہلیہ حاطب (۳۰) خطابؓ بن الحارث (۳۱) فکیہہؓ اہلیہ خطاب (۳۲) معمرؓ بن حارث ❹ (۳۳) نعیمؓ بن عبداللہ اخو بنی عدی ❺ (۳۴) خالدؓ بن سعید ابن العاص ❻ (۳۵) امینہؓ (یا ھمینہ) بنت خلف اہلیہ خالدؓ بن سعید (۳۶) حاطبؓ بن عمرو (۳۷) ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ ❼ (۳۸) واقدؓ بن عبداللہ حلیف بنی عدی (۳۹) خالدؓ بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) (۴۰) عامرؓ بن مالک ❽ (۴۱) عاقلؓ بن بکیر ❾ (۴۲) خالدؓ بن بکیر (۴۳) عامرؓ بن بکیر (۴۴) عمارؓ بن یاسر ❿ (۴۵) سمیہؓ والدہ عمارؓ (۴۶) صہیبؓ بن سفان رومی مولی بن جدعان

☆ ہجرت حبشہ اولیٰ کے لیے مکہ سے جانے والوں کی تعداد

۱۲ مرد اور ۴ خواتین' جملہ ۱۶ نفوس۔

☆ ہجرت حبشہ ثانیہ کے وقت کل تعداد مہاجرین۔

۸۳ نفوس۔

اس وقت مکہ میں رہ جانے والوں کی تعداد کم سے کم مہاجرین حبش کے برابر ضرور ہو گی اس لیے مجموعی

---

❶ حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمان ہوئے۔

❷ حضرت ابوبکرؓ کی روایت کے بموجب دار ارقم کے دور سے پہلے اسلام لائے۔

❸ بروایت ابن اسحاق دار ارقم کے دور سے قبل مسلمان ہوئے۔

❹ حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمان ہوئے اور یہی ان کی ہمشیرہ کو قرآن پڑھاتے تھے۔ واقدی کی روایت کے بموجب دس آدمیوں کے بعد اور بروایت ابن خزیمہ ۳۸ افراد کے بعد ایمان سے بہرہ ور ہوئے۔

❺ چوتھے یا پانچویں نمبر پر اسلام لائے مگر باپ کے ڈر سے ایمان کو مخفی رکھا۔

❻ بروایت امام زہری اسلام لانے میں ۴۳ واں نمبر۔

❼ گیارہواں نمبر۔

❽ دار ارقم میں سب سے پہلی بیعت انہوں نے کی۔

❾ ۳۵ واں یا ۳۶ واں نمبر۔

❿ انہوں نے اپنے والد یاسر کے ساتھ ہی بیعت کی۔

تعداد سوا سو ہو گی۔
☆ مدینہ میں دعوت حق کے اولین علمبرداروں کا حلقہ۔
یہ کل ۸ افراد تھے جنہوں نے پہلے پہل حضورؐ سے بیعت کی (۱) براءؓ بن معرور (۲) کعبؓ بن مالک (۳) ابوالہیثمؓ مالک بن تیہان (۴) اسعدؓ بن زرارہ (۵) رافعؓ بن مالک بن عجلان (۶) قطبہؓ بن عامر بن حدیدہ (۷) عقبہؓ بن عامر بن زید (۸) جابرؓ بن عبداللہ۔
(عام روایت کے بموجب عقبہ کے مقام پر اولین بیعت اسلام ۶ افراد نے کی تھی۔ واقدی کی روایت ہے کہ اسعدؓ بن زرارہ اور ذکوانؓ بن عبدالقیس عقبہ اولیٰ سے قبل اسلام لا چکے تھے۔
☆ دوسری بیعت عقبہ کے شرکاء۔
کل ۱۲ افراد اس مبارک موقع پر فیض یاب ہوئے۔ بجز جابر بن عبداللہ کے مذکورہ بالا انصاری بھی دوبارہ آئے اور اپنے ساتھ مزید پانچ افراد کو لائے۔ نئے آنے والے یہ تھے (۱) معاذ بن حارث (۲) عوف بن حارث (۳) ذکوان بن عبدالقیس (۴) یزید بن ثعلبہ (۵) عویمر بن مالک۔
☆ تیسری بیعت عقبہ کے شرکاء۔
اس موقع پر ۷۳ مرد و زن حضور کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلامی تحریک کے علمبردار بنے۔
☆ مکہ کے آخری دور (بہ زمانہ بیعت عقبہ ثالثہ) میں علمبرداران حق کی کل تعداد (تقریباً) --- مہاجرین حبشہ ۸۳ اور بیعت عقبہ کے انصاری شرفاء ۷۳ کے علاوہ مسلمانوں کی کچھ تعداد مکہ میں موجود تھی۔ اسی طرح مدینہ میں چند ایسے مسلمان بھی ہو سکتے ہیں جو ۱۳ سال بعثت کے حج میں شریک نہ ہو سکے ہوں۔ اس طرح اندازاً کل تعداد دو اڑھائی سو قرار پا سکتی ہے۔ اس میں اگر نجران اور قبیلہ غفار (آدھا قبیلہ جلد ہی اسلام میں داخل ہوا) اور یمن کے نو مسلمانوں کی تعداد بھی شامل کر لی جائے تو سرزمین عرب میں اسلامی انقلاب کے داعی کسی طرح تین صد سے کم نہ ہوں گے۔
☆ ہجرت کے فوراً بعد مدینہ کی جماعت اسلامی کی تعداد (اندازاً)۔
یہ ثابت ہے کہ بنو سالم کی آبادی میں اولین جمعہ پڑھا گیا تو یک صد مسلمان اس میں شریک ہوئے تھے۔ شریک نہ ہو سکنے والوں (خصوصاً عورتوں اور مریضوں) کی تعداد کا تصور بھی رکھیں تو کم سے کم تین صد مسلمان مدینہ کی آبادیوں میں موجود ہونے چاہئیں۔
یہ بھی ثابت ہے کہ حضورؐ نے مہاجرین و انصار کی مواخات بالکل ابتدائی دور میں قائم کی اور اس کے لیے پہلا اجتماع جو طلب کیا گیا اس میں ۹۰ افراد شریک تھے۔ جن میں دونوں فریق تقریباً نصف نصف شریک تھے۔ اس اجتماع میں انصار میں سے اغلباً صاحب حیثیت رفقاء کو لیا گیا تھا جو اپنے معاشی حالات میں ایک ایک مہاجر کے لیے گنجائش نکال سکتے ہوں۔ علاوہ ازیں اس میں خواتین شریک نہ تھیں۔ اس اجتماع سے بھی اوپر ہی کے اندازے کی تصدیق ہوتی ہے۔

☆ غزوہ بدر کے وقت مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ۔

یہ معلوم ہے کہ انصار میں اسلام نہایت تیزی سے پھیلا اور کوئی خاص مزاحمت اوس و خزرج کے قبائل میں موجود نہ تھی' نیز یہ بھی معلوم ہے کہ ہجرت سے غزوہ بدر تک کے درمیانی عرصے میں اکا دکا مہاجرین برابر آتے رہے اور ان کی تعداد بھی کچھ نہ کچھ رہی۔ یہاں تک کہ غزوہ بواط (یا بواق) میں دو صد مہاجرین حضورؐ کے ہم رکاب تھے۔ اسی طرح غزوہ ذوالعشیرہ میں بھی روایات کی رو سے تعداد ڈیڑھ اور دو صد کے درمیان تھی۔ ان ابتدائی مہمات میں حضورؐ صرف مہاجرین ہی کو لے کے نکلا کرتے تھے۔ کیونکہ بیعت عقبہ کے ماتحت انصار صرف مدینہ میں بچاؤ کرنے کے مکلف تھے۔ ظاہربات ہے کہ اگر مہاجرین میں سے دو صد مجاہد نکلتے تھے تو جملہ تعداد کچھ زائد ہو گی۔ کم از کم ڈھائی سو کا اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے [1] انصار کی تعداد مقابلتاً دگنی ہونی چاہیے۔ یعنی جملہ تعداد ۷' ۸ صد ہو گی۔ [2]

غزوہ بدر کے شرکاء کی تعداد بعض اصحاب کے لیے مغالطہ کا موجب ہو سکتی ہے۔ ہماری تحقیق کے بموجب حضورؐ جب مدینہ سے چلے تو کوئی باقاعدہ جنگی معرکہ پیش نظر نہ تھا۔ بلکہ اصل مدعا قافلہ کی مزاحمت تھا۔ نیز جلدی میں اقدام کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سواریوں کی تعداد کے علاوہ اسلحہ کی مقدار انتہائی کم تھی ---- حالانکہ مدینہ کی مسلم آبادی اس سے کئی گنا زیادہ سواریوں اور اسلحہ کا انتظام بآسانی کر سکتی تھی۔ پس فوجی دستہ بھی ممکن الحصول تعداد سپاہ سے بہت کم تھا۔ یہ حقیقت اسی بات سے ظاہر ہے کہ اس میں کل ۸۶ مہاجر شریک تھے۔ حالانکہ طلایہ گردی کی سابق مہمات میں ان کی تعداد ۲۰۰ تک سامنے آتی ہے۔ پس

---

[1] یوں تو کسی آبادی کے مردوں کا حربی تناسب ۴:۱ اور ۵:۱ ہونا چاہیے۔ مگر دو اہم امتیازی حقیقتیں مہاجرین اور مدینہ کے معاملے کو مختلف بنا دیتی ہیں۔ اولاً یہ کہ عرب میں یوں بھی قبائل کے مردوں میں سے ہر کوئی سپاہی ہوتا تھا۔ اور استثنیٰ بہت کم نفوس کو حاصل ہوتا تھا۔ پھر مہاجرین تو ایک ایمانی و انقلابی روح سے مالا مال تھے جس کی خاطر وہ اپنے آپ کو زندگی و موت کی فیصلہ کن کشمکش سے دو چار پاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں مستثنیٰ افراد کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہو گی۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ جملہ مہاجرین کے پورے اہل و عیال ساتھ نہ تھے' خواتین کا تناسب بھی کم تھا۔ اور بڑے بوڑھے بھی زیادہ تر مکہ میں رہ گئے تھے۔ ان وجوہ سے ہم نے اوپر کا اندازہ قائم کیا ہے۔

[2] مورخین کی روایات مدینہ میں تین مردم شماریوں کا پتہ دیتی ہیں جو حضورؐ نے وقتاً فوقتاً کرائی تھیں۔ پہلی مرتبہ تعداد ۵ سو تھی۔ دوسری مرتبہ ۷' ۸ سو اور تیسری مرتبہ ہزار یا قدرے زائد۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اولین مردم شماری یا تو مہاجرین کی نو آباد کاری کے وقت کی گئی ہو گی یا دفاعی تنظیم کا آغاز کرنے کے وقت۔ اس کے بعد کوئی بڑا عملی اقدام کرنے سے پہلے (جس کا وقت قریش کے شامی قافلہ سے تعرض کرنے کا ہی ہو سکتا ہے) پھر قوت کا جائزہ لیا گیا ہو گا۔ تیسرا جائزہ غالباً ایک سال بعد (جب کہ ابو سفیان کی طرف سے انتقامی حملے کے چیلنج کا وقت قریب ہو گا) لیا گیا ہو گا۔ واللہ اعلم۔

ہمارے اندازے کے مطابق غزوہ بدر کے متصل زمانے میں مدینہ میں مسلم آبادی کی تعداد ۷'۸ سو کے لگ بھگ تھی۔ جس میں سے ۴'۵ سو مردان جنگی نکالے جاسکتے تھے۔ لیکن معرکہ بدر میں پوری جنگی تعداد اس لیے شریک نہ ہو سکی تھی کہ نفیر عام نہ تھی۔ بلکہ فوری طور پر ایک دستہ نسبتاً محدود مقصد کے لیے حضورؐ کے ساتھ روانہ ہوا۔

ہمارے اس تخمینے کا ثبوت غزوہ بنو قینقاع سے بھی ملتا ہے۔ غزوہ بدر کے فوراً بعد (شوال ۲ ھ) اس گستاخ اور بغاوت پسند یہودی قبیلہ کا محاصرہ کیا گیا اور عاجز ہو کر انہوں نے حدود مدینہ سے نکل جانا قبول کیا۔ روایات سے ظاہر ہے کہ اس قبیلہ کی جنگی قوت ۷۰۰ جوانوں پر مشتمل تھی۔ ان کو پندرہ روز محاصرے میں رکھ کر پوری طرح زچ کر دینے کے لیے اسلامی فوج ایک مناسب تعداد پر مشتمل ہونی چاہیے۔ کم سے کم اندازہ ۴'۵ سو مردان جنگی کا لگایا جاسکتا ہے۔

☆ معرکہ بدر کے دور میں کرہ ارضی پر مسلمانوں کی مجموعی تعداد (تخمیناً)

مدینہ کے سات آٹھ سو نفوس کے ساتھ اگر ہم حبشہ میں مقیم مہاجرین حبشہ کے تھوڑے سے نو مسلموں' نجران' یمن' قبیلہ غفار' بحرین اور دوسرے قبائل میں پائے جانے والے متفرق مسلمانوں کی تعداد سامنے رکھیں تو اغلباً جملہ عددی قوت ایک ہزار یا اس سے کچھ زائد ہو گی۔

☆ مختلف معرکوں اور مہمات میں علمبرداران اسلام کی عددی قوت [1]

غزوہ احد ۶۵۰ تا ۷۰۰ (باختلاف روایات [2])

غزوہ بدر الاخری (تصادم کے بغیر) ۱۵۰۱

غزوہ دومتہ الجندل (تصادم کے بغیر) ۱۰۰۰

غزوہ احزاب ۳۰۰۰

سفر حدیبیہ ۱۴۰۰

غزوہ خیبر ۱۴۲۰ (۲۰ خواتین شریک تھیں)

سریہ موتہ ۳۰۰۰

غزوہ فتح مکہ ۱۰۰۰۰

غزوہ حنین و محاصرہ طائف ۱۲۰۰۰

غزوہ تبوک ۳۰۰۰۰

---

[1] اسلامی تحریک کی عددی قوت کا اندازہ بعد کے ادوار میں مہمات اور معرکوں کے شرکاء کی تعداد ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔

[2] عبداللہ بن ابی کے تین سو نفاق زدہ ساتھیوں کے الگ ہو جانے کے بعد۔

شرکائے حجتہ الوداع ۱۲۴۰۰۰ یا ۱۴۴۰۰۰ ❶

تحریک اسلامی کے عددی نشوونما کا جائزہ لیتے ہوئے اس اہم پہلو پر لازماً توجہ جاتی ہے کہ حضورؐ کی انقلابی جد وجہد میں خواتین شروع سے حصہ دار رہی ہیں اور انہوں نے تاریخ کا رخ موڑنے کے لیے ہر مرحلے میں اپنا فرض سرانجام دیا ہے۔ مکہ کے سنگین ابتلاء میں وہ شریک تھیں' ہجرتوں میں مردوں کے ہم سفر رہیں' معرکہ ہائے جہاد میں انہوں نے اپنا سا حصہ ادا کیا۔ بلکہ خواتین کے لیے یہ بات بہت بڑا سرمایہ فخر ہے کہ حضورؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے' حضورؐ کی ڈھارس بندھانے اور حضورؐ کو پورا تعاون پیش کرنے والی ہستی بھی ایک خاتون ہی کی تھی' یعنی حضرت خدیجہؓ! حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ جس ہمہ گیر اساسی تبدیلی کو رونما کرنے اٹھے تھے وہ بغیر خواتین کے تعاون کے پوری شان سے بہ مشکل ہی پیدا ہو سکتی تھی۔ گھروں کا محاذ اگر کسی جد و جہد سے بے تعلق ہو تو کام کی رفتار بے حد گر جاتی ہے۔ حضورؐ کی تحریک اسلامی نے مردوں کی طرح عورتوں سے جذبات' اموال' محنتوں اور قربانیوں کا بھرپور خراج وصول کیا۔ ابتدائی ۳ سال کے سابقون الاولون' (کل تعداد ۵۶) میں سے ۱۲ خواتین تھیں۔ ہجرت حبشہ اولیٰ و ثانیہ میں علی الترتیب ان کی تعداد ۵' ۱۷ تھی۔ بیعت عقبہ ثالثہ کی مجلس میں ۲ انصاری خواتین شامل تھیں۔ حضورؐ سے قبل مدینہ کو ہجرت کرنے والے مہاجرین میں کم از کم ۱۰ خواتین کا شامل ہونا ثابت ہے۔

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

---

❶ بعض روایات میں اس سے بھی زائد تعداد بیان کی گئی ہے۔